بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾

فتاوی دار العلوم زکریا

جلد سوم

کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم کتاب الحج

کتاب النکاح، مع مفید ضمیمہ

افادات

حضرت مفتی رضاء الحق صاحب مدظلہ

شیخ الحدیث وصدر مفتی دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

زیر اہتمام

حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی صاحب مدظلہ

مہتمِ دار العلوم زکریا، لینیشیا، جنوبی افریقہ

تہذیب وتحقیق

محمد الیاس بن افضل شیخ، گھلا، سورت عفی عنہ

معین دار الافتاء دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

کتاب کا نام؛..........**فتاویٰ دارالعلوم زکریا**، جلدِ سوم، تصحیح واضافہ شدہ جدید ایڈیشن۔

اشاعتِ اول؛..........نومبر ۲۰۰۹ء زمزم پبلشرز، کراچی، پاکستان۔

اشاعتِ دوم؛..........جنوری ۲۰۱۵ء زمزم پبلشرز، کراچی، پاکستان۔

اشاعتِ سوم؛..........اپریل ۲۰۱۶ء دہلی، ہندوستان۔

کتابت وکمپوزنگ؛......دارالافتاء دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ۔

تعدادِ صفحات:......۸۸۵۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجمالی فہرست

صفحہ نمبر

فہرستِ کتب وابواب

متفرقات الجنائز

کتاب الزکاۃ

کتاب الصوم

کتاب الحج

کتاب النکاح

فہرستِ عنوانات

فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلد سوم

کتاب الزکاۃ

باب (۱)

وجوبِ زکوٰۃ کا بیان

فصلِ اول

سونا، چاندی اور زیورات پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم

فصلِ سوم

اموالِ تجارت اور کرایہ داری پر زکوٰۃ کے احکام

فصل چہارم

جانوروں کی زکوٰۃ کا بیان

باب ...... ﴿۲﴾

عشر اور خراج کا بیان

باب ...... ﴿۳﴾

زکوٰۃ ادا کرنے کا بیان

باب......(۴)

مصارفِ زکوٰۃ کابیان

باب ﴿۵﴾

صدقۃ الفطر کا بیان

کتاب الصوم

باب……۱

رؤیتِ ہلال اور اختلافِ مطالع کا بیان

﴿رسالہ﴾

﴿لمعات الأدلة فی اختلاف الأهلة﴾

باب......﴿۲﴾

نیت کے احکام

باب......﴿۳﴾

روزہ کے مفسدات ومکروہات کا بیان

باب ...... (۴)

قضا اور کفارہ کا بیان

باب......﴿۵﴾

نفل روزوں کا بیان

باب......﴿۶﴾

اعتکاف کا بیان

باب......﴿۷﴾

متفرقات الصوم

کتاب الحج

باب......﴿۱﴾

حج کے شرائط اور ارکان وغیرہ کا بیان

باب......﴿۲﴾

بغیر احرام کے میقات تجاوز کرنے کا بیان

باب……﴿۵﴾

حجِ بدل کا بیان

باب……﴿۶﴾

جنایات کا بیان

باب ﴿۷﴾

حرمین شریفین کے احکام کا بیان

فصل اول

حرم مکی سے متعلق احکام

فصل دوم

حرم مدنی، اور روضۂ مبارکہ کی زیارت اور توسل کے احکام

کتاب النکاح

باب ﴿۱﴾

منگنی اور خطبۂ نکاح کا بیان

فصل دوم

خطبۂ نکاح اور اس کے متعلقات کا بیان

باب ......﴿۲﴾

فیما ینعقد به النکاح وما لا ینعقد

فصل اول

نکاح کے ارکان، شرائط وغیرہ کا بیان

باب……(۳)

فی الأولیاء والأکفاء

فصل اول

ولایتِ نکاح کا بیان

فصل دوم

کفاءت کا بیان

فصل سوم

وکالتِ نکاح کا بیان

باب ...... ﴿۴﴾

مہر کا بیان

باب ...... ﴿۵﴾

ولیمہ کا بیان

باب......﴿۶﴾

نکاح کے متفرق مسائل

﴿ضمیمہ﴾

زکوٰۃ، صوم، حج اور نکاح

سے متعلق متفرق مسائل:

ابواب الزکوٰۃ سے متعلق متفرق مسائل؛

ابواب الصوم سے متعلق

متفرق مسائل:

ابواب النکاح سے متعلق
متفرق مسائل؛

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی تیسری جلد بفضل اللہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، ماشاء اللہ جلد اول ودوم کو اچھی خاصی قبولیت حاصل ہوگئی، اور پہلا اڈیشن تقریباً ختم ہوگیا، نیز پاکستان کے بعد ہندوستان دہلی سے بھی یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور بزرگوں کی دعا ہے۔

جب فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی پہلی جلد منصۂ شہود پر آگئی تو بعض معاصر ماہناموں نے اس پر تعریفی کلمات تحریر فرما کر تبصرہ کیا، چنانچہ ماہنامہ ''بینات'' کراچی، ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک نے اس کو شاندار و جاندار بتلایا، لیکن ایک ماہنامہ کے تبصرہ نگار نے کتاب پر کچھ اشکالات فرمائے، یہ تبصرہ کافی مدت کے بعد ہمیں ملا، جی چاہتا ہے کہ ان کے اشکالات کو مختصراً رفع کیا جائے اور ان کی معقول باتوں کا آئندہ لحاظ رکھا جائے۔

اشکال (۱): پہلے اشکال کا خلاصہ یہ ہے کہ فتاویٰ کی کتابوں میں دارالعلوم کے نام کی ترکیب کا فتاویٰ کی کتاب کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں؟

الجواب: عرض ہے کہ جب مدرسہ اور فتاویٰ کے ٹائیٹل پر فتاویٰ کی نسبت دارالعلوم زکریا کی طرف ہے تو نام کی تحقیق کے لیے اتنا جوڑ کافی ہے، بلکہ یہ ترکیب یہاں کے بعض اساتذہ اور طلبہ میں گشت کرتی رہی اس لیے اس کو موضوع سخن بنایا گیا، فتاویٰ کی کتابوں میں نحو صرف کے مباحث تبعاً زیر بحث آتے رہتے ہیں، فتاویٰ شامیہ میں اشتقاق کے اقسام، حمد کی تعریف اور حمزہ پر الف لام داخل ہونے نہ ہونے کا بیان کسی ماہر فن پر مخفی نہیں۔

اشکال (۲): دوسرا اشکال یہ فرمایا گیا کہ دارالعلوم زکریا کی ترکیب میں زکریا سے پہلے مضاف مقدر ماننا بے تکی بات ہے، بلکہ یہ ترکیب امتزاجی یا فارسی ترکیب کی اضافت ہے؟

الجواب: چونکہ دارالعلوم زکریا میں مقصود حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت واضافت ہے

اس لیے اس کو ترکیب اضافی تسلیم کیا گیا، نیز ایک جملہ کی کئی ترکیبیں ہوسکتی ہیں، تو تبصرہ نگار کو یوں فرمانا چاہئے تھا کہ میری بیان کردہ تراکیب کا بھی احتمال ہے، لیکن ہماری ترکیب کو بے تکی قرار دینا محل نظر اور باعث تعجب ہے، جب کہ تبصرہ نگار کو معلوم ہوگا تراکیب میں نحوی علماء بعید سے بعید ترکیب کو بھی ذکر کرتے ہیں، تفاسیر میں ایسی ترکیبوں کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں، مثلاً ﴿کبرت کلمة تخرج من أفواههم﴾ میں کلمۃً جو منصوب ہے، ایک ترکیب میں اس سے پہلے "من" مقدر مان کر اس کو فاعل بتلایا گیا ہے، حاشیہ جلالین میں یہ ترکیب دیکھی جاسکتی ہے، لہٰذا تراکیب میں تعارض وتصادم کا نظریہ درست نہیں، چونکہ ہماری ترکیب میں حضرت شیخ کی طرف نسبت واضافت ظاہر تھی اس لیے دار کا لفظ مقدر مانا گیا، اہل فن اس ترکیب کو اختیار کرتے ہیں جو موقع اور محل کے مناسب ہو، بعض جگہ مرکب امتزاجی جس کو مرکب منع صرف بھی کہتے ہیں اختیار کرنا مناسب بلکہ ضروری ہوتا ہے، کیونکہ وہاں نسبت اضافی مراد لینا قبیح ہوتا ہے، مثلاً لوگ سوال کرتے ہیں کہ فضل محمد یا انعام الحسن شرکی نام ہیں یا شرعی؟ اس میں اضافت کے معنی لیں تو قباحت ظاہر ہے، حالانکہ یہ بڑے اکابرؒ کے نام ہیں۔ تو جواب میں کہا جائے گا کہ یہاں اضافت مقصود نہیں، بلکہ ترکیب امتزاجی کے طور پر دو ناموں کو ایک بنایا گیا، فضل اور انعام ایک لفظ ہے جس کے معنی فضل وانعام خداوندی ہے، اور محمد اور الحسن یا صرف حسن الگ نام ہے، دونوں کو ایک نام بنا کر بطور مرکب امتزاجی نہ بطور اضافت نام رکھا گیا، یاد رہے کہ مولانا انعام الحسن کے پورے خاندان میں الحسن کا لفظ گردش کرتا ہے تو یہ نام بعلبک کی طرح بن گیا، اور عجمی ناموں میں مرکب نام بکثرت پائے جاتے ہیں، جیسے محمد یعقوب، محمد یوسف وغیرہ بے شمار نام ایسے ہیں، لیکن چونکہ دارالعلوم زکریا میں اضافت کے معنی مقصود ہیں جیسے بیت اللہ اور ناقۃ اللہ میں اس لیے اضافی ترکیب کو اختیار کیا گیا، ورنہ صاحب فتاویٰ مرکب اضافی، مرکب بنائی، امتزاجی، صوتی، وغیرہ سے کچھ نہ کچھ واقفیت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے رکھتا ہے، نیز تبصرہ نگار کی خدمت میں یہ بھی عرض ہے کہ اگر یہ بقول آپ کے ترکیب امتزاجی ہو تو ترکیب امتزاجی دو مفرد کلمات سے بنتی ہے، جب کہ دارالعلوم زکریا میں پہلا لفظ مضاف اور مضاف الیہ ہے۔

النحو الوافی بمعہ تعلیقات میں ہے:

"المركب المزجي وهوما تركب من كلمتين امتزاجاً، ولايصح مزج أكثر منهما، لأن العرب لم تركب ثلاث كلمات وقد صرح به الأشموني". (النحو الوافي: ۱/ ۳۰۰).

نیز فرماتے ہیں: والمراد بالتركيب المزجي كل كلمتين امتزجتا، بأن اتصلت ثانيتهما بنهاية الأولىٰ حتى صارتا كالكلمة واحدة . (النحو الوافي: ۴/ ۲۲۷).

پھر لمبی بحث کے بعد فرماتے ہیں: **يجري الإعراب على آخر الجزء الثاني وحده، فيعرب إعراب الممنوع من الصرف إلى قوله كالشأن في كل اسم ممنوع من الصرف، مجرد من أل والإضافة**". (النحو الوافي "الكلام على الاسم الممنوع من الصرف": ٤/٢٢٩).

مرکبِ امتزاجی کی سب مثالیں دو مفرد کلمات کو ایک بنا کردی گئیں، جیسے: برسعید، نیویارک، طبرستان، خالویہ، حضرموت، بعلبک وغیرہ۔(النحو الوافي "الكلام على الاسم الممنوع من الصرف": ٤/٢٢٨).

اشکال (۳): تبصرہ نگار نے تیسرا اشکال یہ فرمایا کہ ضرورت سے زائد عربی عبارات لکھی گئی ہیں، اس کے متعلق عرض ہے کہ چونکہ اس فتاویٰ میں بہت سے مسائل معرکۃ الآراء اور نایاب اور نادر آئے ہیں اس لیے ایک دو حوالوں پر اکتفا نہیں کیا گیا، مثلاً محراب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہے یا عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانے سے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج میں عرش پر تشریف لے جانا یا نہ لے جانا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیبر کا دروازہ اٹھانا یا نہ اٹھانا، مسح علی الجوربین، جمعہ کو انتقال کرنے والے پر عذاب کا ہونا یا نہ ہونا وغیرہ، بہت سارے مسائل اس قسم کے ہیں، ایسے مسائل میں ایک دو حوالوں سے تشفی نہیں ہوتی اس لیے زیادہ حوالے دئے گئے، تاہم اگر بعض عام مسائل میں زیادہ حوالے لکھے گئے ہوں تو اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں، اور آئندہ عام مسائل میں حوالوں کی کثرت سے اجتناب برتیں گے، تاکہ کتاب کا حجم نہ بڑھے، لیکن پھر بھی معرکۃ الآراء مسائل میں زیادہ حوالے درکار ہوں گے۔

اشکال (۴): تبصرہ نگار نے یہ بھی فرمایا کہ عربی حوالے حاشیہ پر الگ ہونے چاہئیں؟

الجواب: اردو کے تمام فتاویٰ کا یہی طریقہ ہے کہ فتاویٰ کے متن میں حوالے ہوتے ہیں، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند قدیم، امداد الاحکام، امداد الفتاویٰ، فتاویٰ رحیمیہ، احسن الفتاویٰ وغیرہ سب کا یہی طریقہ ہے، ہاں اگر کسی کتاب پر تحقیق وتعلیق کا کام ہوتا ہے تو پھر حوالے حاشیہ میں درج کیے جاتے ہیں۔

اشکال (۵): تبصرہ نگار نے زبان وبیان کی کمزوری کی بھی شکایت فرمائی ہے، جواباً عرض ہے کہ مقصد پر نظر رکھتے ہوئے زبان کی نوک پلک سنوارنے پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی، اور صرف مطلب سمجھانے اور مقصد بیان کرنے کو سامنے رکھا گیا، نیز چونکہ فتاویٰ افریقہ، انگلینڈ وغیرہ میں بھی طلبہ کے زیر مطالعہ رہیں گے اس لیے زبان آسان سادہ اور عام فہم رکھی گئی، اس سلسلہ میں ادب نواز طبقہ سے قبول معذرت کی بھیک ہی مانگ سکتے ہیں، بہر حال ہمیں اقرار ہے کہ فتاویٰ میں صحافتی انشا پردازی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا، اگر تبصرہ نگار کو ادب کی کتاب پڑھنے کا شوق ہے تو ان سے قرارِ دل پڑھنے کی درخواست ہے۔

اشکال (٦): تبصرہ نگار کے خیال میں یہ فتاویٰ طلبہ کے ہیں،تو اطلاعاً عرض ہے کہ فتاویٰ تو کتاب وسنت اور فقہ کی روشنی میں بندہ کی فکر کا نتیجہ ہے،ہاں تخصص کے طلبہ نے حوالے جمع فرمائے ہیں،لیکن جو حوالے میرے خیال میں صحیح نہ ہوتے یا بے محل ہوتے ان کو میں قلم زد کرتا،اور صحیح حوالہ کی طرف توجہ دلاتا،اور مکرر حوالے بھی حذف کرتا،ہاں جہاں تفصیل مطلوب تھی وہاں تکرار سے گریز نہیں کیا گیا،ہاں اس مرتبہ دارالافتاء کے مکرر فتاویٰ کو حذف کیا گیا اور صرف ایک فتویٰ پر اکتفا کیا گیا،جہاں تکرار نظر آئے وہاں سابقہ مسئلہ اور بعد والے مسئلہ میں کچھ فرق ہوگا،الا ماشاءاللہ۔

حوالوں کی تلاش میں مولوی اویس بن مولانا یعقوب صاحب پنجابی،گودھروی نے زیادہ تعاون کیا،اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں ترقی عطا فرمائے،اور مولانا مفتی محمد الیاس شیخ تو اس کام کے لیے روح رواں کا درجہ رکھتے ہیں۔(پروف ریڈینگ کے لیے دارالافتاء کے طلبہ سے مدد لی گئی ہے)۔

ناسپاسی ہوگی اگر مہتمم مدرسہ مولانا شبیر احمد صاحب کی سرپرستی اور توجہات کو فراموش کیا جائے،اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی کبریائی کے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائیں۔اور اس کام کو قبول فرمائیں۔

خادم دارالافتاء (حضرت مفتی) رضاءالحق (صاحب مدظلہ)

دارالعلوم زکریا،لینیشیا،جنوبی افریقہ

مؤرخہ: ۲۸/ رجب ۱۴۳۰ھ

مطابق: ۲۱/ جولائی ۲۰۰۹م

﴿فتاویٰ دارالعلوم زکریا پر تعارف وتبصرے﴾

تبصرہ از ماہنامہ ”الحق“ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک:

فتویٰ اور افتاء کا تاریخی سلسلہ بہت ہی قدیم ہے۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آج تک علماء صالحین اس عظیم منصب پر فائز ہوتے چلے آرہے ہیں۔اور اکثریت کے صادر کردہ فتاویٰ کا مجموعہ کتابی شکل میں اس وقت دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود ہے۔جن سے اربابِ علم وکمال استفادہ کرتے ہیں اور اہل فتویٰ،فتویٰ نویسی میں رہنمائی لیتے ہیں۔فتاویٰ دارالعلوم زکریا بھی اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے، جو حضرت مفتی رضاء الحق شاہ منصوری مدظلہ کے جاری کردہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے، حضرت مفتی صاحب ایک باکمال، جامع صفاتِ علمی شخصیت ہیں اور آپ مدظلہ کا تعلق ضلع صحابی صوبہ سرحد کے ایک مشہور ومعروف گاؤں شاہ منصور کے زہد وتقویٰ،علم وفضل کے پیکر خاندان سے ہے،اور جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے ان فرزندان میں سے ہیں جن پر جامعہ فخر کرتی ہے۔اللہ پاک جزاء دے مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا محمد الیاس شیخ صاحب کو جنہوں نے حضرت مفتی صاحب کے ان گرانقدر علمی اور تحقیقی فتاویٰ کو جمع کر کے بہترین انداز میں مرتب کیا اور زمزم پبلشرز کراچی نے دیدہ زیب ٹائٹل،عمدہ کتابت اور شاندار طباعت کے ساتھ علماء اور طلباء بلکہ ہر خاص اور عام پر احسان کرتے ہوئے اس گنجینہ علم کی پہلی جلد کو شائع کیا۔فتاویٰ کی یہ پہلی جلد کتاب الایمان والعقائد، کتاب التفسیر والتجوید، کتاب الحدیث والاثار، کتاب السلوک والطریقہ اور کتاب الطہارۃ پر مشتمل ہے۔فتاویٰ میں استفتاء کا ہر جواب انتہائی تدقیق اور تحقیق کے ساتھ دیا گیا، جس کے لئے ہر مذہب کے علماء،محدثین اور فقہاء کی کتابوں کی طرف مراجعت کی گئی ہے اور ہر کتاب کا مکمل حوالہ مع عبارت کے درج ہے،بعض ایسے جوابات بھی ہیں جو دوسرے فتاویٰ میں نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اجمالی ہے،اس لئے یہ فتاویٰ ہر خاص وعام کی علمی پیاس بجھانے کے لئے انتہائی مفید ہے اور ہر لائبریری کی زیب ہے، کتاب کا مطالعہ کر کے دل سے یہ دعاء نکلتی ہے کہ خدا کرے کہ یہ عظیم فقہی انسائیکلوپیڈیا پایۂ تکمیل تک پہنچ کر شائع ہو جائے۔(ماہنامہ ”الحق“ دارالعلوم حقانیہ،اکوڑہ خٹک)۔

تبصرہ از ماہنامہ ''البینات'' جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن:

ایک دور تھا جب افریقہ، امریکہ، کنیڈا اور دوسرے یورپی ممالک میں دینی مدارس کا خاطر خواہ نظام نہیں تھا اور وہاں کے متلاشیانِ علم وہنر ہندو پاک کا رخ کرتے تھے اور یہاں کے اربابِ فضل وکمال اور اصحابِ علم و تحقیق کی خدمت میں زانوئے تلمذ طے کرکے علم ومعرفت کے جام لنڈھاتے تھے۔

یہاں سے اکتسابِ فیض کے بعد مختلف ممالک کے مخلصین نے جب ضرورت محسوس کی تو انہوں نے اپنے اپنے علاقوں اور ممالک میں دینی مدارس کا جال بچھانا شروع کر دیا، چنانچہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے نامور فاضل تلامذہ میں سے حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی مدظلہ اوران کے رفقاء نے جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں دارالعلوم زکریا کے نام سے ادارہ قائم کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ترقیات کے مدارج طے کئے تو انہون نے اپنی سرپرستی اور اپنے دینی ادارے کی ترقی کے لئے اپنی مادرِ علمی سے ایک بڑے استاذ ومفتی اور شیخ الحدیث کی درخواست کی، اس پر اربابِ جامعہ علوم اسلامیہ نے اپنے ایک لائق، فائق، عظیم محقق مدرس اور مفتی حضرت مولانا رضاء الحق صاحب کو جنوبی افریقہ بھیج کر ایثار وقربانی کا ثبوت دیا۔ حضرت مولانا مفتی رضاء الحق دامت برکاتہم کی فیض رساں شخصیت نے افریقہ کو تعلیم وتدریس، علم وتحقیق اور فقہ وفتویٰ کے اعتبار سے بجا طور پر مستغنی کر دیا۔

پیش نظر فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی جلد اول انھیں کی علمی تحقیقات کا منہ بولتا ثبوت ہے، جس میں نہایت خوبصورت انداز میں کتاب الایمان، کتاب التفسیر، کتاب الحدیث والآثار، کتاب السلوک والطریقۃ اور کتاب الطہارۃ کو مرتب اور مدون کر کے کتابی شکل دی گئی ہے۔

بلاشبہ فتاویٰ میں درج مسائل واحکام اہل حق اسلاف اور اکابر دیوبند کی تحقیق کی ترجمانی کے علاوہ ان کے ذوق ومزاج کا آئینہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس فتاویٰ کے مرتبین مولانا مفتی عبدالباری اور مولانا مفتی محمد الیاس شیخ کو جزائے خیر عطا فرمائے، جنہوں نے اس اہم خدمت کو سرانجام دیا۔ امید ہے کے اہل ذوق اس کی قدردانی میں بخل سے کام نہیں لیں گے، خدا کرے کہ فتاویٰ جلد از جلد مکمل ہوکر متلاشیانِ علم وتحقیق کی پیاس کو بجھائے، آمین۔ (ماہنامہ ''بیّنات'' رجب المرجب ۱۴۲۹ھ، اگست ۲۰۰۸ء)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿دارالعلوم زکریا پر ایک طائرانہ نظر﴾

۞ ۱۹۸۱ء میں حضرت برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ نے جنوبی افریقہ تشریف لاکر دعا فرمائی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور حضرت ہی کے نام پر دارالعلوم زکریا کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

۞ ۱۹۸۳ء دسمبر میں حضرت قاری عبدالحمید صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب اوران کے رفقاء کی سرپرستی میں مدرسہ کا باقاعدہ افتتاح ہوا، اور ۱۹۸۵ء تک مہتمم قاری عبدالحمید صاحب رہے۔

۞ قاری عبدالحمید صاحب کے ہندوستان تشریف لے جانے کے بعد مولانا شبیر احمد سالوجی صاحب مہتمم اور حافظ بشیر صاحب ناظمِ مدرسہ مقرر ہوئے، اور تاہنوز خدمت انجام دے رہے ہیں، اور انھیں کی توجہات وشبانہ روز محنت سے دارالعلوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ فجزاهم الله تعالیٰ أحسن الجزاء۔

﴿دارالعلوم زکریا کے مختلف شعبے﴾

۞ شعبۂ تحفیظ القرآن: اکابرین کی توجہ اور دعا کی برکت اور اساتذۂ کرام کی محنت سے ماشاء اللہ خوب رو بہ ترقی ہے۔ اساتذۂ درجاتِ حفظ کی تعداد: ۱۳، اور طلبائے عزیز کی تعداد: ۲۸۳، اور درسگاہوں کی تعداد: ۱۰ ہے۔

۞ درسِ نظامی: طلبائے کرام علومِ عالیہ وآلیہ سے تشنگی کی آگ بجھارہے ہیں۔ اساتذۂ کرام کی تعداد ۲۱ ہے۔ اور طلبائے کرام کی تعداد ۳۹۶ ہے، مقامی ان میں سے ۲۹۷، اور دیگر ۵۵ ممالک کے تقریباً ۳۸۲ طلباء تحصیلِ علم میں مشغول ہیں۔

۞ شعبۂ افتاء واستفتاء: ۱۹۸۷ء سے حضرت مفتی رضاء الحق صاحب کی نگرانی میں رواں دواں ہے ابتدا میں حضرت بذاتِ خود تحریر فرماتے تھے پھر ۱۹۹۲ء میں مستقل دارالافتاء کا نظام شروع ہوا۔

۞ شعبۂ قراءت وتجوید: ۱۹۸۸ء میں قراءت وتجوید کا مستقل شعبہ شروع ہوا۔

۞ شعبۂ ''النادی العربی'': طلبائے عزیز کا عربی ادب سے ذوق وشوق بڑھا اور تقریراً وتحریراً اس میں حصہ لیا اور مستقل شعبہ ''النادی العربی'' کے نام سے شروع ہوا۔

۞ دارالعلوم زکریا کی شاخ: برائے حفظ منتظمین حضرات نے مدرسہ ہذا سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ۲۰۰۰ء میں جناب عبدالرحمٰن میاں صاحب کی درخواست پر ان کی والدہ کی خواہش پر انھیں کی زمین پر ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا ہے جس میں تقریباً ۹۶ طلباء اور ۵، اساتذۂ کرام ہیں، اور ۵ درسگاہیں ہیں۔

۞ اللہ تعالیٰ تمام اساتذۂ کرام و منتظمین اور کارکنانِ مدرسہ ہذا کو جزاءِ خیر عطا فرمائیں۔ نیز دارالعلوم کو اور دیگر علمی اداروں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقیات سے نوازے اور ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ فرما کر اپنی رحمتِ خاصہ نازل فرمائیں۔آمین۔

۞ اکابرین وائمہ اور دیگر مہمانانِ کرام کے قدوم میمنت لزوم سے یہ وادی خوشنما اور دلرُبا بنتی گئی۔ان میں سے:حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ مفتی دارالعلوم دیوبند۔حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ۔حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ۔حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ۔ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب۔حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ۔حضرت حاجی فاروق صاحبؒ۔حضرت مولانا عمر صاحب پالنپوریؒ۔حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ۔بھائی پاڈیا صاحبؒ۔حضرت مولانا عمر جی صاحبؒ۔حضرت مولانا عبد الحفیظ مکی صاحب۔حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب۔حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی۔حضرت مولانا ادریس صاحب میرٹھیؒ۔شیخ عبد الفتاح ابوغدہ صاحبؒ۔شیخ عبدالرحمٰن السدیس۔شیخ شریم۔شیخ صالح بن حمید۔شیخ عبدالرحمٰن حذیفی۔شیخ سبیل۔شیخ صلاح بدیر۔شیخ محمد علی صابونی۔حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب۔حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب۔حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب۔حضرت مولانا ارشد صاحب مدنی۔حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب۔دکتور عبداللہ عمر نصیف صاحب۔حضرت مولانا سید رابع صاحب۔حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب۔حضرت مولانا سلمان صاحب۔حضرت حکیم اختر صاحب۔حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری۔حضرت مفتی فاروق صاحب میرٹھی۔حضرت مولانا یونس صاحب پوناؒ۔ حضرت مولانا ابراہیم صاحب دیولا۔شیخ الحدیث مولانا یونس صاحب۔حضرت مولانا بدیع الزمان صاحبؒ۔حضرت مولانا سالم صاحب۔حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ۔حضرت بھائی طلحہ بن حضرت شیخ الحدیثؒ۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ کشمیری صاحب۔حضرت مولانا ابوالقاسم بنارسی۔

بندۂ عاجز محمد الیاس بن افضل شیخ گھلا،سورت،عفی عنہ
رفیقِ دارالافتاء دارالعلوم زکریا لینیشیا،جنوبی افریقہ
مؤرخہ:۱۰/رجب ۱۴۲۹ھ مطابق:۱۴/جولائی ۲۰۰۸ء

متفرقات الجنائز

نمازِ جنازہ کرسی پر بیٹھ کر پڑھانے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے انتقال سے پہلے وصیت کی کہ میرے انتقال کے بعد میرے جنازہ کی نماز فلان محترم شخصیت پڑھادیں، جب کہ وہ محترم بزرگ معذور ہونے کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں، ظاہر ہے کہ جنازہ بھی بیٹھ کر ہی پڑھائیں گے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: امام اگر عذر کی وجہ سے بیٹھ کر جنازہ کی نماز پڑھائے تو نمازِ جنازہ صحیح اور درست ہے لہذا صورتِ مسئولہ میں بھی محترم شخصیت عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نمازِ جنازہ پڑھادیں تو نماز صحیح ہوجائے گی۔

شامی میں ہے:

ولو كان الولي مريضاً فصلى قاعداً والناس قيام، أجزأهم عندهما، وقال محمدؒ: تجزئ الإمام فقط. (الشامي:٢/٢٠٩،سعيد، مطلب هل يسقط فرض الكفاية بفعل الصبي).

الجوہرۃ النیرۃ میں ہے:

وإن كان ولي الميت مريضاً فصلى قاعداً وصلى الناس خلفه قياماً،أجزأهم عندهما...

(الجوهرة النيرة:١/١٢٩،باب الجنائز،امداديه ،ملتان).

مراقی الفلاح میں ہے:

وغير قاعد بلا عذر ، لأن القيام فيها ركن، فلا يترك بلا عذر، وفي الطحطاوي: أما بالعذر فتصح كما إذا كان مريضاً ، ولو إماماً فصلى قاعداً والناس خلفه قياماً أجزأه عندهما ... ولا فرق في المصلي قاعداً بعذر بين كونه ولياً أو لا، لأن كون الولي له حق التقدم لا يمنع سقوط الفرض بغيره ، ولو بدون إذنه ، وإنما الولي له حق الإعادة ، وحينئذٍ فلا فرق

بسقوط الفرض غير الولي بين أن يكون قائماً ، أو قاعداً لعذر. (مراقی الفلاح مع حاشية الطحطاوی:ص ۵۸۳، قديمی).

طحطاوی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شامی میں ولی کی قید اتفاقی ہے،اس لیے کہ علامہ طحطاویؒ نے فرمایا عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھانا جائز ہے، چاہے ولی ہو یا غیر ولی، نیز ولی کی اجازت سے ہو یا بغیر اجازت کے،ہاں ولی کی اجازت کے بغیر پڑھادی تو ولی کو اعادہ کا حق ہوگا،لیکن دوسروں کی نماز صحیح ہے،اس کی وجہ سے ان کی نماز میں کوئی خلل نہیں پڑیگا۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: البحر الرائق:۲/۱۷۹،کوئٹہ۔ و تبيين الحقائق:۱/۲٤۲،وبدائع الصنائع:۱/۳۱۵، سعيد، و الفتاوی الهندية:۱/۱٦٤)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

اکیلے شخص کی نمازِ جنازہ کا حکم:

سوال: اگر ایک شخص نے اکیلے کسی کی نمازِ جنازہ پڑھ لی ،اور کوئی نہیں تھا تو نماز واجب الاعادہ ہے یا نہیں؟

الجواب: ایک آدمی کی نمازِ جنازہ صحیح ہے چاہے مرد ہو یا عورت ،لہذا صورتِ مسئولہ میں اعادہ واجب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

فلو أم بلا طهارة و القوم بها(أی بالطهارة) أعيدت وبعكسه لا،أي لا تعاد كما لو أمت امرأة أو أمة لسقوط فرضها بواحد . و في الشامية: قوله لسقوط فرضها بواحد،أي بشخص واحد رجلاً كان أو امرأة،فهو تعليل لمسألة العكس،و مسألة المرأة قال في البحرو الحلية: و بهذا تبين أنه لا تجب صلاة الجماعة فيها، ومثله في البدائع. (الدرالمختارمع الشامی: ۲/۲۰۸، مطلب فی صلاة الجنازة،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

والصلاة على الجنازة تتأدى بأداء الإمام وحده، لأن الجماعة ليست بشرط الصلاة على الجنازة ، كذا في النهاية. (الفتاوی الهندية:۱/۱٦۲،الفصل الخامس فی الصلاة على الميت).

مزید ملاحظہ ہو: البحر الرائق:۲/۱۷۹، کوئٹہ،وبدائع الصنائع:۱/۳۱۵،سعيد)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

نمازِ جنازہ میں بچہ کی امامت کا حکم:

سوال: اگر بچہ نمازِ جنازہ پڑھادے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں بچہ کی امامت تو درست نہیں، البتہ اگر بچہ اکیلا نماز پڑھ لے تو دوسروں سے وجوب ساقط ہو جائے گا، علامہ شامیؒ اور محقق ابن ہمامؒ کا یہی رجحان ہے۔ اگرچہ دیگر بعض حضرات نے فرمایا کہ بچہ کی نماز جنازہ سے وجوب ساقط نہ ہوگا، ملاحظہ ہو علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں:

درمختار میں ہے:

وبقي من الشروط بلوغ الإمام، تأمل. وقال الطحطاوي: قوله تأمل: أشار بذلك إلى وجه اشتراط البلوغ وذلك أن صلاة الجنازة لايتنفل بها، والصبي لايقع فعله فرضاً، فلا تصح صلاة من اقتدى به لعدم صحة اقتداء المفترض بالمتنفل، ولاصلاته لعدم وقوعها فرضاً. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۱/ ۳۷۱، کوئٹہ).

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ بچہ کی امامت درست نہیں کیونکہ امامت کے لیے بلوغ شرط ہے، لہذا مقتدیوں کی نماز صحیح نہیں ہوگی، ہاں اکیلے بچہ کی نماز صحیح ہے اور وجوب ساقط ہو جائے گا، اس لیے کہ شریعت میں ایسے بہت سے نظائر موجود ہیں جن میں بچہ کے کر لینے سے دوسروں سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے، یعنی بچہ ادائے وجوب کا اہل ہے۔ چند نظائر مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) چند لوگوں پر سلام کیا گیا تو بچہ کا جواب دینا کافی ہے۔

(۲) اذان کو بعض نے واجب کہا ہے اور مشہور قول سنتِ مؤکدہ کا ہے، پھر بھی فقہاء نے فرمایا کہ مراہق کی اذان صحیح ہے۔

(۳) بچہ جمعہ کا خطبہ دے اور بالغ شخص نماز پڑھادے تو درست ہے جب کہ خطبۂ جمعہ صحتِ صلاۃ کے لیے شرط ہے۔

(۴) بچہ میت کو غسل دے تو وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔

(۵) بچہ کا اقرار بالشہادتین معتبر ہے۔

(۶) بچہ کا ذبیحہ کھایا جائے گا، جب کہ بچہ ذبح اور تسمیہ کو سمجھتا ہو۔

اسی طرح بچہ کی نمازِ جنازہ بھی صحیح ہے اور وجوب ساقط ہو جائے گا۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قال الأستروشني: الصبي إذا أم في صلاة الجنازة ينبغي أن لا يجوز وهو الظاهر لأنها من فروض الكفاية، وهو ليس من أهل أداء الفرض، لكن يشكل برد السلام إذا سلم على قوم فرد صبي جواب السلام . أقول: ويشكل على ذلک ما مر من مسألة السلام ، وتصريحهم بجواز أذان الصبي المراهق بلاكراهة مع أنه قيل بأن الأذان واجب، والمشهور أنه سنة مؤكدة قريبة من الواجب في لحوق الإثم، وتصريحهم بأنه لو خطب صبي له منشور يوم الجمعة ، وصلى بالناس بالغ جاز ، وتصريحهم بأنه تحل ذبيحته إذا كان يعقل الذبح والتسمية أي يعلم أنها مأمور بها ، وكذا ما صرح به الأستروشنى من أن الصبي إذا غسل الميت جاز، ولعل معنى قولهم إنه ليس من أهل الوجوب، إنه غيرمكلف به، ولاينافي ذلک وقوعه واجباً، وسقوط الوجوب عن المكلفين بفعله يؤيد ذلک ما صرح به في الفتح من باب المرتد ، من أنهم اتفقوا على أن الصبي لو أقر بالشهادتين يقع فرضاً ويلزمه تجديد إقرار آخر بعد البلوغ حتى على قول من ينفي وجوب الإيمان على الصبي، فصار كالمسافر لا تجب الجمعة عليه، ولوصلاها، سقط فرضه. . . .والاكتفاء بأذانه وخطبته، وتسميته ورده السلام دليل على الاكتفاء بصلاته على الجنازة...و من هذا يظهر أنه لا تصح إمامته في الجنازة أيضاً و إن قلنا بصحة صلاته وسقوط الواجب بها عن المكلفين ، لأن الإمامة للبالغين من شروط صحتها البلوغ ، هذا ماظهر لي في تقرير هذا المحل، فاغتنمه فإنک لا تظفر به في غير هذا الكتاب ، والحمد لله الملک الوهاب. (الشامی:۱/۵۷۷، مطلب الواجب كفاية هل يسقط بفعل الصبي وحده؟ سعيد۔ و۲/۲۰۸، مطلب هل يسقط فرض الكفاية بفعل الصبي؟ سعيد۔وكذا فی جامع احكام الصغار علی هامش جامع الفصولين:۱۶،اسلامی کتب خانہ).

علامہ ابن ہمامؒ ''التحریر فی اصول الفقہ'' میں فرماتے ہیں:

واعلم أنه إذا قيل صلاة الجنازة واجبة أي فرض على الكفاية كما صرح به غير واحد من الحنفية والشافعية وحكوا الإجماع عليه فقد يستشكل بفعل الصبي، والجواب عن هذا بما تقدم من أن المقصود الفعل وقد وجد، لا يدفع الوارد من لفظ الوجوب فإنه لا وجوب على الصبي. (التحريرفی اصول الفقہ مع التقريروالتحبير:۲/۱۷۶،باب فی الاحكام،بيروت).

نیز علامہ شامیؒ ’’منحۃ الخالق‘‘ میں فرماتے ہیں:

أقول: وظاهر كلام التحرير السقوط أي (سقوط الوجوب) حيث ذكر الحكم ولم يعزه للشافعية ، تأمل. (منحة الخالق حاشية على البحر الرائق: ۲/۱۷۹،فصل السلطان احق بصلاته، کوئٹه).

بہشتی گوہر میں ہے:

اگر ایک شخص جنازے کی نماز پڑھ لے تو فرض ادا ہو جائے گا، خواہ وہ عورت ہو یا مرد بالغ ہو یا نابالغ۔(بہشتی گوہر گیارہواں حصہ:۹۳).

نیز ملاحظہ ہو: لامع الدراری:۲/۱۲۳)۔واللہ ﷻ اعلم۔

میت کے ایصالِ ثواب کے لیے طعام، نقد رقم، تلاوتِ قرآن وغیرہ کا حکم:

سوال: میت کے ایصالِ ثواب کے لیے طعام، نقد رقم، تلاوتِ قرآن وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اہل سنت والجماعت کے نزدیک انسان اپنی عبادت وغیرہ کا ثواب میت کو پہنچا سکتا ہے، لہذا میت کی طرف سے کھانا کھلانا، نقد رقم صدقہ کرنا، اور تلاوت وغیرہ سب جائز اور اچھی چیزیں ہیں۔ہاں رسمی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہئے، مثلاً تیجہ، چالیسواں، برسی، وغیرہ۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

الأصل في هذا الباب أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاةً أو صوماً أو صدقةً أو غيرها عند أهل السنة والجماعة ، لماروى عن النبي ﷺ أنه ضحى بكبشين أملحين أحدهما عن نفسه والآخر عن أمته ممن أقر بوحدانية اللّٰه تعالىٰ وشهد له بالبلاغ.

(الهداية: ۱/۲۹٦،باب الحج عن الغير).

شامی میں ہے:

قوله بعبادة ما: أى سواء كانت صلاةً أو صوماً أو صدقةً أو قراءةً أو ذكراً أو طوافاً أو حجاً أو عمرة ، أو غير ذلک من زيارة قبور الأنبياء عليهم الصلاة و السلام والشهداء والأولياء والصالحين، وتكفين الموتى، وجميع أنواع البركما في الهندية. وقدمنا في الزكاة عن التاترخانية عن المحيط الأفضل لمن يتصدق نفلاً أن ينوي لجميع المؤمنين و المؤمنات لأنها تصل إليهم ولا ينقص من أجره شيء. (الشامی:۲/۵۹۵،مطلب فی اهداء ثواب الاعمال للغير،سعيد).

حدیث شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالیٰ عنها أن رجلاً قال للنبي ﷺ إن أمي أفتلتت نفسها وأراها لو تكلمت تصدقت أفأصدق عنها ؟ قال: نعم، تصدق عنها. (رواہ البخاری: ۱/۱۸٦و ۱/۳۸٦۔ ومسلم: ۲/٤۱/۱۰۰٤).

ابوداود شریف میں ہے:

عن معقل بن يسار ؓ قال: قال رسول الله ﷺ: اقرء وا يٰسٓ على موتاكم. (رواه أبو داود: ۲/٤٤٥، باب القرء ة عندالميت).

ارشادالساری میں ہے:

اعلم أن الأصل في هذا أن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره من الأموات والأحياء حجاً أو صلاة أو صوماً أو صدقةً أو غيرها كتلاوة القرآن وسائر الأذكار، فإذا فعل شيئاً من هذا، وجعل ثوابه لغيره جاز بلا شبهة، ويصل إليه عند أهل السنة والجماعة. (ارشادالساری الی مناسك الملا علی القاری: ص٤٧٥، باب الحج عن الغير، بيروت).

الفقہ الاسلامی میں ہے:

رأي الحنفية والحنابلة ومتأخري الشافعية والمالكية بوصول القراء ة للميت إذا كان بحضرته أو دعا له عقبها ولو غائباً. (الفقه الاسلامی وادلته: ۲/٥٥۱، دارالفكر).

من مر على المقابر وقرأ قل هو الله أحد إحدى عشرة مرة ثم وهب أجره للأموات أعطى من الأجر بعدد الأموات. (من فضائل سورة الاخلاص وما لقارئها: ۱/۱۰۲/٥٤).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

ایصالِ ثواب بہت اچھی چیز ہے، خواہ نماز، قرآن شریف، تسبیح وغیرہ پڑھ کر ہو یا غرباء کو کھانا، کپڑا وغیرہ کچھ دیکر ہو، لیکن تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں شرعاً ثابت نہیں۔ (فتاوی محمودیہ: ۹/۲۷۱، مبوب ومرتب)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کی حالت میں وفات پانے کی فضیلت:

سوال: روزہ کی حالت میں وفات پانے کی کوئی فضیلت ہے یا نہیں؟ لوگ اسے باعثِ اجر وسببِ مغفرت سمجھتے ہیں، اس کی کیا اصل ہے؟

الجواب: روزہ کی حالت میں وفات پانا باعثِ ثواب اورسببِ مغفرت ہے اوراس کی فضیلت میں چنداحادیث موجود ہیں، حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

حدیث شریف میں ہے:

من مات صائماً أوجب اللّٰہ تعالیٰ له الصيام إلى يوم القيمة. (الفردوس بماثور الخطاب: ۳/۵۰۴/۵۵۵۷، عن عائشةؓ).

مسندابی یعلی میں ہے:

عن أبي هريرةؓ أن عائشة رضي اللّٰہ تعالیٰ عنها حدثتهم أن النبيﷺ كان يصوم شعبان كله قالت، قلت: يارسول اللّٰہ أحب الشهور إليک أن تصومه شعبان؟ قال: إن اللّٰہ يكتب على كل نفس ميتة تلک السنة، فأحب أن يأتيني أجلي وأنا صائم. (مسندابی یعلی الموصلی: ۴/۴۳۹/۴۸۹۵).

قال في المجمع: فيه مسلم بن خالد الزنجي فيه كلام، وقد وثق، وفي الصحيح طرف منه. (مجمع الزوائد: ۳/۱۹۲، باب الصیام فی شعبان، دارالفکر).

علامہ سیوطیؒ نے شرح الصدور میں چندروایات ذکر کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ صوم میں وفات پانا باعثِ ثواب ومغفرت ہے۔

ملاحظہ ہوشرح الصدور میں ہے:

باب أحسن الأوقات للموت: أخرج أبونعيم عن ابن مسعودؓ قال: قال رسول اللّٰہﷺ: من وافق موته عند انقضاء رمضان دخل الجنة، ومن وافق موته عند انقضاء عرفة دخل الجنة، ومن وافق موته عند انقضاء صدقة دخل الجنة. (حلیۃ الاولیاء: ۵/۲۳۔ وکنزالعمال: ۱۵/۶۸۷/۴۲۷۰۱۔ وفیض القدیر: ۶/۳۰۵/۹۰۷۱) **وأخرج أحمد عن حذيفةؓ قال: قال رسول اللّٰہﷺ من قال: لا إله إلا اللّٰہ ابتغاء وجه اللّٰہ، ختم له بها، دخل الجنة ومن صام يوماً ابتغاء وجه اللّٰہ، ختم له به دخل الجنة، ومن تصدق بصدقة ابتغاء وجه اللّٰہ ختم له بها دخل الجنة. وأخرج أبونعيم عن خيثمة قال: كان يعجبهم أن يموت الرجل عند خير يعمله إما حج وإما عمرة وإما غزوة وإما صيام رمضان.** (حلیۃ الاولیاء: ۴/۱۱۵)۔ (شرح الصدور بشرح احوال الموتی والقبور: ۳۰۶).

نیز یہ بات بھی ثابت ہے کہ جس حالت میں وفات ہوتی ہے اسی حالت میں اٹھایا جائے گا۔

ملاحظہ ہو مسند احمد میں ہے:

عن جابر ﷺ قال :قال رسول اللّٰه ﷺ :يبعث كل عبدعلى ماما ت عليه.

(مسنداحمد:۳/۳۳۱،مسند جابرؓ).

فتاویٰ واحدی میں ہے:

سوال: ما حكم الصائم إذا مات في الصوم؟

جواب:الظاهر أن الصائم إذا مات حالة الصوم يكتب صائماً إلى يوم القيمة،لما في الحديث عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها قالت: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم:" من مات صائماً أوجب اللّٰه له الصيام إلى يوم القيمة ".رواه الديلمي، وكان السلف يعجبهم الموت عند الصوم...هذا وأنت خبير بأن موت الصائم في سبيل اللّٰه لكونه في طاعة اللّٰه ففي البحر فسره أي في سبيل اللّٰه في البدائع بجميع القرب فيدخل فيه من سعى في طاعة اللّٰه وسبيل الخيرات، وقد ورد في الحديث من مات في سبيل اللّٰه فهو شهيد.رواه مسلم.فعلى هذا إذا مات الصائم يصدق عليه اسم الشهيد كما لا يخفى... (فتاوی واحدی:جلداول:۳۱٤،کتاب الصوم، کوئٹه).

کتنا ہی خوش قسمت ہوگا وہ شخص جو قیامت کے دن روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا،اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی ہی موت نصیب فرمائے۔آمین۔واللہ ﷻ اعلم۔

قبر پر اذان دینے کا حکم:

سوال: بعض علاقوں میں قبر پر اذان دینے کا طریقہ رائج ہے شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: آنحضرت ﷺ اور صحابۂ کرام وتابعین سے قبر پر اذان دینا ثابت نہیں ہے،اسی وجہ سے فقہاء اہل سنت نے اس کو بدعت کہا ہے۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

ويكره... كل ما لم يعهد من السنة والمعهود منها ليس إلا زيارتها والدعاء عندها قائماً كما كان يفعل ﷺ في الخروج إلى البقيع. (فتح القدير:۲/۱٤۲،قبيل باب الشهيد،دارالفكر۔وكذا في

الهندية:١/١٦٦ـ والبحر الرائق:٢/١٩٦، كوئته).

شامی میں ہے:

في الاقتصار على ما ذكر من الوارد إشارة إلى أنه لايسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجرؒ في فتاويه بأنه بدعة وقال: من ظن أنه سنة قياساً على ندبهما للمولود إلحاقاً لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب. (الشامي:٢/٢٣٥،سعيد).

احسن الفتاوی میں ہے:

اذان علی القبر کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں اس لیے بدعت ہے... "توشيح شرح تنقيح لمحمود البلخي" میں بھی اذان علی القبر کو "ليس بشيء" لکھا ہے۔(احسن الفتاوی:۱/۳۳۷).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

قبر پر اذان دینا بے اصل ہے، آنحضرت ﷺ اور آپ کے جانشین خلفائے راشدین وصحابہؓ اجمعین اور تابعین تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداود، وغیرہ رحمہم اللہ سے ثابت نہیں، یہ سنت رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے مبارک طریقہ کے موافق نہیں، بدعتِ مخترعہ اور واجب الترک ہے۔(فتاوی رحیمیہ:۶/۱۹۷).

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی رحیمیہ:۶/۱۹۷۔۲۱۱۔ وراہِ سنت:۲۲۴۔۲۳۸۔ واللہ ﷻ اعلم۔

جنازہ کے موقعہ پر حیلۂ اسقاط کا حکم:

سوال: بعض علاقوں میں جنازہ کے موقعہ پر حیلۂ اسقاط رائج ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ کئی حضرات حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں اور اپنے سامنے کچھ روپے اور صابن وغیرہ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو بخشتے ہیں یہ عمل چند بار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس حیلہ سے میت کے ذمہ ہزاروں نمازیں اور بہت سے روزے ساقط ہو جاتے ہیں اور اس کے لیے عالمگیری وغیرہ کا حوالہ پیش کرتے ہیں، کیا یہ عمل مفید ہے یا نہیں؟

الجواب: حیلہ اسقاط بذاتِ خود مشروع ہے، اس کے لیے اصل موجود ہے، البتہ حیلہ مروجہ شرائط معتبرہ کی عدم رعایت کی وجہ سے حیلہ استحصال بن گیا ہے، لہٰذا میت کا ذمہ فارغ ہونے کے لیے مروجہ حیلہ اسقاط بے سود ہے۔ البتہ اس حیلہ کی مشروعیت کے لیے کچھ شرائط ہیں جن کی رعایت رکھنا نہایت ضروری ہے:

(۱) اول یہ کہ وصیت کے نہ ہونے کی صورت میں ورثاء میں نابالغ اور غائب نہ ہوں کیونکہ ان کے مال سے تبرع

جائز نہیں ہے۔
(۲) یہ کہ قطار یا دائرہ میں مساکین ہوں، غنی کو دینے سے فراغت ذمہ نہیں ہوتی۔
(۳) یہ کہ اس مسکین کو حقیقتاً مالک بنادے، محض زبانی تملیک نہ کرے۔

کما صرح به ابن عابدين في منة الجليل حيث قال: ويجب أن يدفعها حقيقة لا تحيلاً ملاحظاً أن الفقير إذا أبى عن الهبة إلى الوصي كان له ذلك ولا يجبرعلى الهبة. (رسائل ابن عابدين:۱/ ۲۲۵، منة الجليل لبيان اسقاط ما على الذمة من كثير و قليل۔(فتاوی فریدیہ:۲/۶۰۵، ۶۱۰).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

إذا مات الرجل وعليه صلوات فائتة فأوصى بأن تعطى كفارة صلواته يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر...وإن لم يترك مالاً يستقرض ورثته نصف صاع ويدفع إلى مسكين ثم يتصدق المسكين على بعض ورثته ثم يتصدق ثم وثم حتى يتم لكل صلاة ما ذكرنا كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۲۵،الباب الحادى عشر فى قضاء الفوائت،مسائل متفرقة).

درمختار میں ہے:

ولو مات وعليه صلوات فائتة وأوصى بالكفارة يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر كالفطرة ... و لو لم يترك مالاً يستقرض وارثه نصف صاع مثلاً و يدفعه لفقير ثم يدفعه الفقير للوارث ثم وثم حتى يتم . (الدرالمختار:۲/ ۷۲، باب قضاء الفوائت ، سعيد)۔**واللہ تعالیٰ اعلم۔**

پندرہ شعبان کو زیارتِ قبور کا حکم:

سوال: پندرہ شعبان کو زیارتِ قبور ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پندرہ شعبان کو زیارتِ قبور کے لیے تشریف لے جانا ضعیف روایت سے ثابت ہے، چنانچہ اگر کوئی کبھی کبھار چلا جائے تو ٹھیک ہے، لیکن اس کا التزام اور اس پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔

نیز زیارتِ قبور شبِ براءت کی خصوصیات میں سے نہیں ہے بلکہ دوسری صحیح روایات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رات کے آخری حصہ میں قبرستان جانا ثابت ہے لہذا جب بھی موقعہ ملے بغیر کسی تخصیص کے موت کی یاد اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی خاطر زیارتِ قبور کا معمول بنانا چاہئے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں ہے:

عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها قالت: فقدت رسول اللّٰه ﷺ ليلة فخرجت فإذا هو بالبقيع فقال: أكنت تخافين أن يحيف اللّٰه عليك ورسوله؟ قلت: يارسول اللّٰه ظننت أنك أتيت بعض نسائك فقال: إن اللّٰه تبارك وتعالىٰ ينزل لنصف من شعبان إلى سماء الدنيا فيغفر لأكثر من عدد شعر غنم كلب. قال أبوعيسىٰ: حديث عائشة لانعرفه الا من هذ الوجه من حديث الحجاج وسمعت محمداً يضعف هذا الحديث وقال: يحيى بن ابى كثيرلم يسمع من عروة وقال محمد: والحجاج لم يسمع من يحيى بن ابى كثير۔(رواه الترمذي:۱/۱۵۶، باب ماجاء في ليلة النصف من شعبان)

پندرہ شعبان کی بنسبت عام راتوں میں زیارتِ قبور صحیح روایات سے ثابت ہے۔

ملاحظہ ہو مسلم شریف میں ہے:

عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها أنها قالت: كان رسول اللّٰه ﷺ كلما كان ليلتها من رسول اللّٰه ﷺ يخرج من آخر الليل إلى البقيع فيقول:" السلام عليكم دار قوم مؤمنين وأتاكم ما توعدون غداً مؤجلون وإنا إن شاء اللّٰه بكم لاحقون، اللّٰهمّ اغفر لأهل بقيع الغرقد". (رواه مسلم:۱/۳۱۳).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وأفضل أيام الزيارة أربعة :يوم الإثنين، والخميس، والجمعة ، والسبت...وكذا الليالي المتبركة لاسيما ليلة براءة. (الفتاوى الهندية:۵/۳۵۰).

مفتی تقی صاحب اپنے والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: جو چیز رسول اللہ ﷺ سے جس درجہ میں ثابت ہو اسی درجہ میں اسے رکھنا چاہئے، اس سے آگے نہیں بڑھانا چاہئے، لہذا ساری حیاتِ طیبہ میں رسول کریم ﷺ سے ایک مرتبہ جنت البقیع جانا مروی ہے کہ آپ ﷺ شبِ براءت میں جنت البقیع تشریف لے گئے، چونکہ ایک مرتبہ جانا مروی ہے اس لیے تم بھی اگر زندگی میں ایک مرتبہ چلے جاؤ تو ٹھیک ہے، لیکن ہر شبِ براءت میں جانے کا اہتمام کرنا التزام کرنا اور اس کو ضروری سمجھنا اور اس کو شبِ براءت کے ارکان میں داخل کرنا اور اس کو شبِ براءت کا لازمی حصہ سمجھنا اور اس کے بغیر یہ سمجھنا کہ شبِ براءت نہیں ہوئی، یہ اس کو اس کے درجے سے آگے بڑھانے والی بات ہے۔ (رسالہ "شبِ براءت کی حقیقت" ص:۱۰-۱۱).

لیکن جلسہ اور دھوم دھام کی شکل اختیار کر کے قبرستان جانا منع ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

سماعِ موتی کے بارے میں تحقیق:

سوال: اگر کوئی قبرستان جا کر مردوں کو سلام کرے یا اس کے علاوہ مردوں کو خطاب کرے تو مردے سنتے ہیں یا نہیں؟ اس میں احناف کا کیا مسلک ہے؟

الجواب: سماعِ موتی کے مسئلہ میں اختلاف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قلیبِ بدر کے پاس آواز دی ''هل وجدتم ما وعد ربكم حقاً'' پھر ان کے بارے میں فرمایا: ''إنهم الآن يسمعون ما أقول''، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے جب اس کا تذکرہ کیا گیا تو فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''إنهم ليعلمون'' فرمایا (نہ کہ يسمعون) گویا ابن عمر رضی اللہ عنہ کی بات کی تردید کی، پھر یہ آیتِ کریمہ پیش فرمائی ﴿إنک لا تسمع الموتی...﴾ کوئی حدیث پیش نہیں کی، معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نزدیک سماعِ موتی ثابت نہیں۔

احکام القرآن میں ہے:

وحكى السفاريني في البحور الزاخرة أن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها ذهبت إلى نفي سماع الموتى ووافقها طائفة من العلماء على ذلك ورجحه القاضي أبويعلىٰ من أكابر أصحابنا يعني الحنابلة في كتابه الجامع الكبير. (احكام القرآن:۳/۱۶۴، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ، تكميل الحبور بسماع اهل القبور، ادارة القرآن).

لیکن اس کے باوجود بعض حضرات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے رجوع کے قائل ہیں۔

فتح الباری میں ہے:

ومن الغريب أن في المغازي لابن إسحاق رواية يونس بن بكير بإسناد جيد عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها مثل حديث أبي طلحة، وفيه: ما أنتم بأسمع لما أقول منهم، وأخرجه أحمد بإسناد حسن، فإن كان محفوظاً فكأنها رجعت عن الإنكار لماثبت عندها من رواية هؤلاء الصحابة لكونها لم تشهد القصة. (فتح الباری:۷/۳۰۳).

ترمذی شریف کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ملاحظہ ہوترمذی شریف میں ہے:

فلما قدمت عائشة رضي الله تعالىٰ عنها أتت قبرعبد الرحمٰن بن أبى بكر رضی اللہ عنہ فقالت:... إلى قوله ثم قالت: والله لوحضرتک ما دفنت إلا حيث مت ولو شهدتک مازرتک. (رواہ الترمذی:۱/۲۰۳).

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک سماعِ موتی ثابت ہے۔

نیز دیگر حضرات کے نزدیک بھی ثابت ہے، ملاحظہ ہو احکام القرآن میں ہے:

وذهبت طوائف من أهل العلم إلى سماعهم في الجملة وقال ابن عبدالبر: إن الأكثرين على ذلک وهو اختيار ابن جرير الطبري وكذا ذكر ابن قتيبة وغيره. (احکام القرآن:۳/۱۶۵).

منکرین سماعِ موتی دلیل میں آیاتِ قرآنیہ پیش کرتے ہیں:

(۱)﴿ **إنک لا تسمع الموتى**﴾(سورۃ النمل:۸۰)۔

(۲)﴿**وما أنت بمسمع من فى القبور**﴾(سورۃ فاطر:۲۲)۔

قائلین سماعِ موتی دلیل میں بخاری شریف کی روایت پیش کرتے ہیں:

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

باب الميت يسمع خفق النعال...عن النبي صلى الله عليه وسلم قال :العبد إذا وضع في قبره وتولى وذهب أصحابه حتى أنه يسمع قرع نعالهم...الحديث. (رواہ البخاری:۱/۱۷۸).

وفي الترمذي باب ما يقول الرجل إذا دخل المقابر: عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: مر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بقبور المدينة فأقبل عليهم بوجهه فقال: السلام عليكم يا أهل القبور...الحديث.

(رواہ الترمذی:۱/۲۰۳).

احکام القرآن میں ہے:

من أشهر ذلک مارواه ابن عبد البر مصححاً له عن ابن عباس رضی اللہ عنہ مرفوعاً : ما من أحد يمر بقبر أخيه المسلم كان يعرفه فى الدنيا فيسلم عليه إلا رد الله عليه روحه حتى يرد عليه السلام. (احکام القرآن:۳/۱۶۵، ادارۃ القرآن).

آیاتِ قرآنیہ کا جواب:

یہ حضرات آیات کی توجیہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان میں سماع ''سننے'' کی نفی نہیں ہے، بلکہ اسماع

''سنانے'' کی نفی ہے، یا انتفاعِ سماع کی نفی ہے، یعنی مردے زندوں کے کلام سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں، اگر ان سے کہا جائے کہ نماز پڑھو تو نہیں پڑھ سکتے، روزہ رکھو تو نہیں رکھ سکتے۔

فیض الباری میں ہے:

وأجاب السيوطي:

سماع موتى كلام الخلق قاطبة قد صح فيها لنا الآثار بالكتب

وآية النفي معناها سماع هدي لا يسمعون ولا يصغون للأدب

(فیض الباری:٢/٤٦٧، باب قول الميت وهو على الجنازة قدمونی).

بہر حال یہ اختلاف چونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ سے چلا آرہا ہے اس لیے اس میں غلو ٹھیک نہیں ہے، جو انکار کرتے ہیں وہ حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اتباع میں، اور جو قائل ہیں وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق، لہٰذا ایک دوسرے کی تفسیق وتکفیر سے بچنا چاہئے ورنہ بالآخر یہ الزام کسی نہ کسی صحابی پر ضرور لگے گا۔ لیکن روایات سے سلام کا سماع ثابت ہے تو اس کو ثابت مانا جائے اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے سنانا چاہے تو سنا دے نہ چاہے تو نہ سنائے۔

البتہ احناف کا اصل مذہب تو یہی ہے کہ مردے نہیں سنتے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وأما الكلام فلأن المقصود منه الإفهام والموت ينافيه ولايرد ما في الصحيح من قوله ﷺ لأهل قليب بدر: هل وجدتم ما وعد ربكم حقاً فقال عمر: أتكلم الميت يا رسول اللّٰه فقال عليه الصلاة والسلام: والذي نفسي بيده ماأنتم بأسمع من هؤلاء أو منهم، فقد أجاب عنه المشايخ بأنه غير ثابت يعني من جهة المعنى وذلک لأن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنهاردته بقوله تعالىٰ وما أنت بمسمع من في القبور، إنک لا تسمع الموتى، وأنه إنماقاله على وجه الموعظة للأحياء وبأنه مخصوص بأولئک تضعيفاً للحسرة عليهم، وبأنه خصوصية له عليه الصلاة والسلام معجزة، لكن يشكل عليهم ما فى مسلم: أن الميت ليسمع قرع نعالهم إذا انصرفوا، إلا أن يخصوا ذلک بأول الوضع في القبر مقدمة للسوال جمعاً بينه وبين الآيتين فإنه شبه فيهما الكفار بالموتى لإفادة بعد سماعهم وهوفرع عدم سماع الموتى، هذا حاصل ماذكره في الفتح. (الشامی:٣/٨٣٦، مطلب فی سماع الميت الكلام،

سعید۔و کذا فی فتح القدیر:۲/ ۱۰٤،دارالفکر).

لیکن علامہ شامیؒ اور محقق ابن ہمامؒ اول وضع میں بھی سماع کے قائل انہی مواقع میں ہیں جہاں وارد ہے، مطلق سماع کے قائل نہیں ہیں۔

ملاحظہ ہو فیض الباری میں ہے:

و أما الشيخ ابن الهمامؒ فجعل الأصل هو النفي وكل موضع ثبت فيه السماع جعله مستثنیٰ ومقتصراً على المورد. (فیض الباری:۲/ ٤٦٧).

کفایت المفتی میں ہے:

اکثر صوفیہ سماعِ موتی کے قائل ہیں لیکن علمائے حنفیہ کے نزدیک ثابت نہیں، ہاں میت کو قبر میں رکھنے کے بعد اس قدر حیات اس میں ڈالی جاتی ہے کہ وہ آرام یا تکلیف کو محسوس کرے۔ (کفایت المفتی:۱/۲۰۱).

حضرت شاہ صاحبؒ نے فیض الباری میں نقل کیا ہے کہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ احناف میں سے کسی نے بھی سماعِ موتی کا انکار نہیں کیا۔ ملاحظہ ہو:

وفي رسالة غير مطبوعة لعلي القاريؒ: أن أحداً من أئمتنا لم يذهب إلى إنكارها وإنما استنبطوها من مسألة في باب الأيمان وهي حلف رجل أن لايكلم فلاناً فكلمه بعد ما دفن لايحنث قال القاريؒ: ولادليل فيها على ماقالوا فإن مبنى الأيمان على العرف وهم لايسمونه كلاماً. (فیض الباری:۲/ ٤٦٧).

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحبؒ لکھتے ہیں:

حضرت ابوحنیفہؒ سے اس بارے میں کچھ منقول نہیں، فتاوی غرائب کا جو حوالہ منکرین سماعِ موتی حضرت ابوحنیفہؒ کی طرف نسبت کرتے ہیں، وہ بے اصل ہے۔ (سماع الموتی:۸۹).

مزید ملاحظہ فرمائیں: فتاوی دارالعلوم دیوبند: جلد پنجم۔ امداد المفتین: جلد دوم: ۴۳۹، کتاب الجنائز۔ وامداد الفتاوی: ۵/ ۴۳۹۔ وفتاوی عثمانی: ۱/ ۶۷۔ ورسالہ سماع الموتی از حضرت مولانا سرفراز خان صفدر۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

والدین کے قاتل کی نمازِ جنازہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنے باپ کو وراثت کے لیے قتل کیا اس کے بعد وہ قاتل کچھ مدت کے بعد مر گیا اس کا جنازہ پڑھا جائے گا یا نہیں، اور قاتل وراثت کا مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب: والدین یا ان میں سے کسی ایک کا قاتل اگر قصاص میں قتل کیا جائے تو اس کا جنازہ نہیں پڑھا جائے گا، اور اگر اپنی موت مرجائے تو جنازہ پڑھا جائے گا۔ اور قاتل میراث کا مستحق نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو امداد الفتاح میں ہے:

لايصلي على قاتل أحد أبويه عمداً إهانة له وزجراً لغيره. (امدادالفتاح: ٦٣١، بيروت).

شرح منیۃ المصلی میں ہے:

ومن قتل أحد أبويه لايصلي عليه إهانة له ذكره في جوامع الفقه. (شرح منية المصلى: ٥٩١).

شامی میں ہے:

لايصلي على قاتل أحد أبويه إهانة له وألحقه في النهر بالبغاة، الظاهر أن المراد أنه لايصلي عليه إذا قتله الإمام قصاصاً، أما لو مات حتف أنفه يصلي عليه كما في البغاة ونحوه.

(الشامي: ٢/ ٢١٢، سعيد).

قاتل کو وراثت سے محروم کر دیا جائے گا۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أبي هريرة ﷺ أن رسول الله ﷺ قال: " القاتل لايرث ". (ابن ماجه: ١٩٠).

سراجی میں ہے:

المانع من الإرث أربعة الرق وافراً كان أوناقصاً والقتل الذي يتعلق به وجوب القصاص أوالكفارة. (السراجي في الميراث: ص٥)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

میت کے گھر طعام ضیافت کا حکم:

سوال: میت کے گھر تین دن تک دعوتوں کا سلسلہ جاری رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بعض علاقوں میں یہ دستور ہے کہ میت کے گھر ضیافت کا کھانا تیار کرتے ہیں اور برادری وغیرہ کو دعوت دیتے ہیں، یہ قبیح رسم ہے اس سے اجتناب کرنا چاہئے، علامہ شامیؒ نے فرمایا اس کے ناجائز ہونے میں کوئی شک نہیں۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت لأنه شرع في السرور لا في الشرور

وهـي بـدعة مستقبحة ، وروى الإمام أحمدؒ وابن ماجه بإسناد صحيح عن جرير بن عبد الله قال:" كنا نعد الاجتماع عند أهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة ".وفي البزازية:ويكره اتـخـاذ الـطـعـام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم ، واتـخـاذ الـدعـوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخـلاص، والـحـاصـل: أن اتـخـاذ الـطعام عند قراءة القرآن لأجل الأكل يكره وفيها من كتـاب الاستـحـسـان: وإن اتـخـذ للفقراء كان حسناً ، وأطال في ذلك في المعراج وقال : وهـذه الأفـعـال كـلهـا لـلسـمـعة والـرياء فيتحرز عنها،لأنهم لايريدون بها وجه الله تعالىٰ.

(الشامی:۲/ ۲٤٠ ، مطلب فی کراهة الضیافة من اهل المیت، سعید).

وفي الفقه على المذاهب الأربعة:

ومن البدع المكروهة مايفعل الآن من ذبح الذبائح عند خروج الميت من البيت أوعند الـقبـر وإعـداد الـطـعـام لمن يجتمع للتعزية كما يفعل ذلك في الأفراح ومحافل السرور.

(الفقه على مذاهب الاربعة:۱/ ٤٣٤، مبحث ذبح الذبائح،وعمل الاطعمة فی المآتم،القاهرة).

احکام میت میں ہے:

ایک رسم یہ کی جاتی ہے کہ دفن کے بعد میت کے گھر والے، برادری وغیرہ کو دعوت دیتے ہیں کہ فلاں روز آ کر کھانا تناول فرمائیں، یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دعوت اور اس کا قبول کرنا دونوں ممنوع ہیں، ہرگز جائز نہیں اس قبیح رسم سے اجتناب لازم ہے، علامہ شامیؒ نے اس دعوت کے متعلق لکھا ہے: اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں، اور علاوہ حنفی مذہب کے دیگر فقہی مذاہب مثلاً شافعیہ وغیرہ کا بھی اس کے ناجائز ہونے پر اتفاق بیان کیا ہے۔ (احکام میت: ص ۱۸۸، از مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحی صدیقی).

ہاں میت کے ایصالِ ثواب کے لیے کھانا بنا کر فقراء کو بلا تعیینِ ایام کے کھلا دے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جب کہ مندرجۂ ذیل شرائط پائے جائیں:

(۱) رسم ورواج کی نیت نہ ہو محض ایصالِ ثواب کی نیت ہو۔

(۲) ریا اور نمود و نمائش کے لیے نہ ہو۔

(۳) تقسیمِ ترکہ کے بعد ہو، اور اگر تقسیم سے پہلے ہو تو ورثاء عاقل بالغ ہوں نیز سب کی طرف سے بطیبِ خاطر اس کی اجازت بھی ہو۔

(۴) حلال مال سے ہونا ضروری ہے۔
(۵) ایام کی تخصیص کے بغیر ہونا چاہئے، ورنہ بدعت شمار ہوگی۔ (مستفاد از فتاوی حقانیہ: ۲/۴۹).
فتاوی بزازیہ میں ہے:
ویکره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع... (الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ٤/ ٨١)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میت کے گھر طعامِ حاجت کا حکم:

سوال: اگر میت والے اپنے اہل وعیال اور جو قریبی رشتہ دار دور سے آئے ہوں ان کے لیے گھر میں ادنی یا متوسط درجے کا کھانا پکائیں، تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟
کیونکہ باہر کے رشتہ دار جب اہل میت کے لیے کھانے کا انتظام کرتے ہیں اور میت کے گھر کھانا بھیجتے ہیں تو اس میں درجِ ذیل خرابیاں پائی جاتی ہیں:
(۱) دکھاوے کے لیے کئی قسم کا کھانا پکاتے ہیں۔
(۲) وہ ادلے بدلے کا کھانا ہوتا ہے جس میں مساوات قائم رکھنا مشکل ہے، اور تفاوت کی صورت میں غیبت اور بدگوئی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔
(۳) اگر میت کے گھر کھانا آجائے تو گھر میں موجود عورتیں اپنے گھروں اور اعزہ کے لیے ان میں سے کچھ بھیجتی ہیں جس کی وجہ سے بسا اوقات کھانا کم پڑ جاتا ہے اور کھانا بھیجنے والوں کے لیے شرمندگی ہوتی ہے۔
(۴) کھانا بھیجنے والوں پر فکر سوار رہتی ہے کہ کتنے کھانے والے ہونگے، کھانا پورا ہوگا یا نہیں، یہ فکر بخار کی طرح سوار رہتی ہے اور کھانا پورا ہونے تک پریشان رہتے ہیں۔

الجواب: باہر کھانے کا انتظام کرنے میں مذکورہ بالا خرابیاں ہوں، اور میت کے رشتہ دار وغیرہ دور و دراز سے آئے ہوں تو ان کے لیے گھر میں ادنی یا متوسط درجے کا کھانا پکانے کی شرعاً اجازت ہے، جب کہ اس میں درج ذیل شرائط پائے جائیں:
(۱) عام اجتماع نہ ہو۔ **وروى الإمام أحمدؒ وابن ماجه بإسناد صحيح عن جرير بن عبدالله قال: "كنا نعد الاجتماع عند أهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة".**
(۲) ادنی یا متوسط کھانا پکائیں جس طرح عام دنوں میں پکاتے ہیں اعلی درجے کا کھانا نہ پکائیں۔ **لأنهـا أيـام**

تأسف فلا يليق بها ما كان للسرور. (فتاوی خانیہ).

(۳) ایام کی تخصیص نہ ہو۔ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ... (الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ٤/ ٨١).

تخصیصِ ایام کی وجہ سے فقہاء نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ (فتاوی حقانیہ: ۲/ ۴۹).

اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ گھر میں تعزیت کے ایام میں ضرورت اور حاجت کا کھانا پکانے کا شریعت میں کیا ثبوت ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ درجِ ذیل روایات سے اس کا ثبوت ملتا ہے:

(۱) حضرت ابوذرؓ کی وفات کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے ساتھی حاضر ہوئے تو حضرت ابوذرؓ کے فرمانے پر ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا۔

عبارت ملاحظہ فرمائیں:

فبينماهم كذلك لايقدرون على دفنه إذ قدم عبد الله بن مسعود رضي الله تعالىٰ عنه من العراق في جماعة من أصحابه فحضروا موته و أوصاهم كيف يفعلونه وقيل قدموا بعد وفاته فولوا غسله ودفنه، وكان قد أمر أهله أن يطبخوا لهم شاة من غنمه ليأكلوه بعد الموت. (البداية والنهاية: ۷/ ۱۷۷، طبعة ملونة، بيروت).

(۲) تاریخ مدینہ دمشق میں ہے:

... واطبخي هذا اللحم، فإنه سيشهدني قوم صالحون يلون دفني فأقريهم، فلما دفنا دعينا إلى الطعام، فأكلنا. (تاريخ مدينة دمشق: ٦٦/ ٢١٨، وفي اسناده مجهول).

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اہل وعیال ان کی تدفین پر قادر نہیں تھے اسی اثنا میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقاء عراق سے آئے اور حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو تکفین وتجہیز کی وصیت کی اور ایک روایت میں ہے کہ ان کی وفات کے بعد آئے، اور ان کے غسل وتدفین کا انتظام کیا اور انہوں نے اپنی اہلیہ سے فرمایا تھا کہ ان کے لیے بکریوں میں سے ایک بکری ذبح کرنا تاکہ ان کی وفات کے بعد وہ حضرات کھالیں۔ (البدایہ والنہایہ).

تاریخ دمشق میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیوی سے کہا گوشت پکالیں، کیونکہ میری تدفین میں نیک لوگ حاضر ہوں گے تو ان کو مہمانی کھلادیں، جب ہم دفنانے سے فارغ ہوئے تو ہمیں (یعنی ابن

مسعودرضی اللہ تعالیٰ عنہ اوران کے رفقاء کو)طعام کے لیے بلایا گیا اور ہم نے کھالیا۔ (تاریخ دمشق).

(۳)ترمذی شریف میں ہے:

عن عبد اللّٰہ بن جعفر رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: لماجاء نعي جعفر رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اصنعوا لأهل جعفر طعاماً فإنه قدجاء هم مايشغلهم. (رواہ الترمذی وقال: هذا حدیث حسن:١/١٩٥، باب ماجاء فی الطعام یصنع لاهل المیت).

ابن ماجہ شریف میں ہے:

قال: إن آل جعفر قد شغلوا بشأن ميتهم فاصنعوا لهم طعاماً قال عبداللّٰہ: فما زالت سنة حتى كان حديثاً فترك. (رواہ ابن ماجہ:١١٥،باب ماجاء فی الطعام یبعث الی اهل المیت).

شامی میں ہے:

ویستحب لجیران أهل المیت والأقرباء الأباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم ولیلهم لقوله صلی اللّٰہ علیہ وسلم:" اصنعوا لآل جعفر طعاماً فقد جاء هم مایشغلهم. (حسنه الترمذی وصححه الحاکم۔(الشامی:٢/٢٤٠،مطلب فی الثواب علی المصیبة، سعید۔وکذا فی الفقه علی المذاهب الاربعة:١/٤٣٤).

ایک روایت میں تین دن کا ذکر ہے، ملاحظہ ہو مرقات میں ہے:

وقیل: یحمل لهم طعام إلی ثلا ثة أیام مدة التعزیة. (مرقات:٤/٩٢،امدادیه ،ملتان).

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر کے لوگ اہل میت کے لیے کھانا بھیج سکتے ہیں،لیکن جب اس میں خرابیاں ہوں تو اہل میت خود اپنے لیے اور دور و دراز سے آنے والے رشتہ داروں کے لیے کھانا پکا سکتے ہیں کیونکہ مطلقاً کھانا پکانا منع نہیں بزازیہ میں ہے: **وإن اتخذ طعاماً للفقراء کان حسناً.** (الفتاوی البزازیة:٦/٣٧٩) اس سے معلوم ہوا کہ فقراء کے لیے کھانا پکانا مستحسن ہے،اسی طرح المغنی لابن قدامہ کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت دور و دراز سے آنے والے رشتہ داروں کے لیے کھانا تیار کرنا جائز ہے، ملاحظہ ہو: **فإن دعت الحاجة إلی ذلک جاز فإنه ربما جاء هم من یحضر میتهم من القری والأماکن البعیدة ویبیت عندهم.** (المغنی لابن قدامة الحنبلی:٢/٤١٣) یعنی اگر پکانے کی ضرورت ہو تو پکانا جائز ہے کیونکہ کبھی دور سے اور دیہات سے تعزیت اور جنازہ کے لیے لوگ آئیں گے اور ان کے پاس رات گزاریں گے تو ان کے کھانے کا انتظام جائز ہے۔

(۴) بخاری شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها زوج النبي صلى الله عليه وسلم، أنها كانت إذا مات الميت من أهلها، فاجتمع لذلك النساء ثم تفرقن إلا أهلها وخاصتها، أمرت ببرمة من تلبينة، فطبخت، ثم صنع ثريد فصبت التلبينة عليها ثم قالت: كلن منها فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "التلبينة مجمة لفؤاد المريض تذهب ببعض الحزن".

(بخاری شریف:٢/٨١٥/٦٠٢٠٥، باب التلبينة ـ ومسلم شريف:٢/٢٢٧، باب لكل داء دواء واستحباب التداوی).

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جب ان کی برادری میں کوئی میت ہوجاتی تھی اور عورتیں جمع ہوجاتی تھیں پھر جب عورتیں چلی جاتی تھیں اور صرف گھر کی عورتیں اور خاص عورتیں رہ جاتی تھیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تلبینہ پکواتی تھیں اور اس میں روٹی توڑ کر ثرید بنایا جاتا تھا پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ کھاؤ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ مریض کے دل کو سکون اور راحت پہنچاتا ہے اور غم کو کچھ ہلکا کرتا ہے۔ (تلبینہ: بھوسی یا شہد یا گڑ ملا ہوا آٹے کا پتلا حلوہ).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

طعام اہل میت وہ ہے جو رواجاً اہل میت کے ذمہ تیجہ، چہلم وغیرہ کے طور پر لازم کردیا جائے، اہل میت کو میت کی تجہیز وتکفین اور غم وحزن کی وجہ سے پکانے کی فراغت نہیں تو ایک دن دو وقت کا کھانا قرابت دار لوگ ان کے پاس بھیج دیں، اگر اہل میت خود بھی پکائیں تب بھی منع نہیں، جو شخص بطور مہمان تعزیت کے لیے آیا ہے، اہل میت اس کو اپنے ساتھ کھلائیں گے وہ منع نہیں، یہ خیال کہ تین روز تک اہل میت کے گھر کوئی چیز نہ پکائی جائے اغلاط العوام میں سے ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:٩/٢٧٨، مبوب ومرتب).

پاکستان میں پنج پیری حضرات میت کے گھر میں طعام پکانے اور لوگوں کے کھلانے میں بہت متصلب ومتشدد ہیں، لیکن وہ بھی طعام حاجت کو جائز کہتے ہیں نشر المرجان مولانا افضل خان پنج پیری کی کتاب ہے اس پر مولانا عبداللہ پنج پیری کی تعلیقات ہیں وہ لکھتے ہیں: **و يجوز لأهل الميت صنع الطعام لأنفسهم إذا لم يحمل لهم أحد من الجيران والأقارب طعاماً أيام مدة التعزية.** (حاشية نشر المرجان:ص ٤٣٠، اصل کتاب پر مولانا محمد طاہرؒ پنج پیری کی تقریظ ہے)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ کا حکم:

سوال: خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: خودکشی ایک سنگین گناہ ہے مگر وہ شخص کافر نہیں ہے لہذا نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، ہاں مقتدیٰ اور سربراہِ قوم اگر شرکت نہ کریں گناہ کی سنگینی کا اظہار کرتے ہوئے تو مناسب ہے۔
مسلم شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی کرنے والا کافر نہیں ہے۔

روایت ملاحظہ ہو:

فلما هاجر النبي صلى الله عليه وسلم إلى المدينة هاجر إليه الطفيل بن عمرو رضي الله تعالىٰ عنه و هاجر معه رجل من قومه، فاجتووا المدينة فمرض فجزع فأخذ مشاقص له فقطع بها براجمه فشخبت يداه حتى مات، فرآه الطفيل بن عمرو رضي الله تعالىٰ عنه في منامه فرآه في هيئة حسنة ورآه مغطياً يديه، فقال له: ماصنع بک ربک فقال: غفر لي بهجرتي إلى نبيه صلى الله عليه وسلم فقال له: مالي أراک مغطياً يديک قال: قيل لي: لن نصلح منک ما أفسدت فقصها الطفيل رضي الله تعالىٰ عنه على رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "اللّٰهمّ وليديه فاغفر". (مسلم شريف: ۱/۷۴).

وقال النووي في شرح هذا الحديث: فيه حجة لقاعدة عظيمة لأهل السنة أن من قتل نفسه أو ارتكب معصية غيرها ومات من غير توبة فليس بكافر. (شرح المسلم: ۱/۷۴، باب الدليل ان قاتل نفسه لايكفر).

درمختار میں ہے:

من قتل نفسه ولو عمداً يغسل ويصلى عليه به يفتى. وفي الشامية: لأنه فاسق غير ساع في الأرض بالفساد وإن كان باغياً على نفسه كسائر فساق المسلمين. (الدرالمختار مع الشامي: ۲/۲۱۱، سعيد).

شرح منیۃ المصلی میں ہے:

وعندهما يصلى عليه واختاره شمس الأئمة الحلواني لأن دمه هدر فصار حتف أنفه ولأنه مسلم عاصٍ غير ساعٍ في الأرض فساداً فلا يقاس على البغاة وقطاع الطريق. (شرح منية المصلي: ص ۵۹۱، سهيل).

فتاوی مفتی محمود میں ہے:

اس شخص پرنمازِ جنازہ ضرور پڑھی جائے گی،لحدیث: صلوا علی کل بر وفاجر .(فتاوی مفتی محمود:٣/٧٨)۔

مزید ملاحظہ ہو: (امدادالفتاح:ص٦٣١،فصل فیمن لایصلی علیہ،بیروت۔کتاب الفتاوی:٣/١٨٣)۔واللہ ﷻ اعلم۔

رمضان المبارک میں انتقال کرنے کی فضیلت:

سوال: اگرکسی شخص کا رمضان المبارک میں انتقال ہوجائے تو اس کی کوئی فضیلت ہے یانہیں؟

الجواب: رمضان میں وفات پانا ان شاء اللہ تعالیٰ باعثِ اجروثواب اورسببِ مغفرت ہے، کیونکہ ماہِ مبارک کوعام مہینوں سے یکتا فضیلت حاصل ہے،اس ماہ میں فرض ونفل غرض ہرنیک کام کا اجروثواب بڑھ جاتاہے،اس ماہ کے اول حصہ میں رحمٰن کی جانب سے رحمتیں سایہ فگن رہتی ہیں،اوردرمیانی حصہ میں مغفرت کا اعلان ہوتاہے،اورآخری حصہ میں جہنم سے خلاصی ملتی ہے،لہذا رمضان میں وفات پانے والا بھی قبرکی تنگی سے محفوظ رہتاہے،اور بروزِ قیامت اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ اپنی رحمت ومغفرت کے سایہ میں ڈھانپ کر جنت میں داخلہ نصیب فرمادیں۔

چندروایات ملاحظہ فرمائیں:

(١) صحیح ابن خزیمہ میں ہے:

عن سلمان رضی اللہ عنہ قال: خطبنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم في آخر یوم من شعبان فقال: ...إلی قولہ... وھو شھر أولہ رحمۃ ، وأوسطہ مغفرۃ ، وآخرہ عتق من النار" (صحیح ابن خزیمۃ:٤/٦٨/١٨٨٧،باب فضائل رمضان...، المکتب الاسلامی۔وکذا فی شعب الایمان للبیھقی:٣/٣٠٥/٣٦٠٨،دارالکتب العلمیۃ،بیروت).

(٢) حلیۃ الاولیاء میں ہے:

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من وافق موتہ عند انقضاء رمضان دخل الجنۃ ، ومن وافق موتہ عند انقضاء عرفۃ دخل الجنۃ ، ومن وافق موتہ عند انقضاء صدقۃ دخل الجنۃ. (حلیۃ الاولیاء:٥/٢٣، دارالفکر۔وفیض القدیر:٦/٣٠٥).

(٣) **وعن خیثمۃ قال: کان یعجبھم أن یموت الرجل عند خیر یعملہ إما حج وإما عمرۃ وإما غزوۃ وإما صیام رمضان.** (حلیۃ الاولیاء:٤/١١٥).

(۴) عن أنس بن مالک ﷺ :"إن عذاب القبر يرفع عن الموتى في شهر رمضان وكذلك فتنة القبر ترفع عمن مات يوم الجمعة أو ليلة الجمعة". (احكام الميت والقبور لابن رجب ،باب اهل القبور، واسناده ضعيف).

(۵)مصنفِ عبدالرزاق میں ہے:

عن عطاءؒ قال : إذا مرض الرجل في رمضان فلم يصح حتى مات ، فليس عليه شيء غلب على أمره وقضاءه. (مصنف عبدالرزاق:٤/٢٣٧/٧٦٣٣).

(۶)مسلم شریف میں ہے:

عن أبي هريرة ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:"الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة ورمضان إلى رمضان مكفرات ما بينهن إذا اجتنبت الكبائر". (رواه مسلم:١/١٢٢)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

اولیائے کرام کے مزارات پر گنبد بنانے کا حکم:

سوال: اولیائے کرام کے مزارات پر گنبد بنانے اور غلاف ڈالنے یا چراغ جلانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اولیائے کرام کے مزارات پر گنبد بنانا یا غلاف ڈالنا یا چراغ جلانا یا پھول وغیرہ ڈالنا، یا چومنا چاٹنا یہ سب امور خلافِ شرع اور حرام ہیں فقہاء نے ان تمام چیزوں کو بدعت اور ممنوع قرار دیا ہے، لہذا اس قسم کی بدعات وخرافات سے اجتناب کرنا لازم اور ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن جابر رضي الله تعالىٰ عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم:أن يجصص القبر وأن يقعد عليه وأن يبنى عليه. (رواه مسلم:١/٣١٢)۔

قال الملا علي القاريؒ في المرقات : "من ابتدع بدعة ضلالة لا يرضاها الله ورسوله ...": وهي ما أنكره أئمة المسلمين كالبناء على القبور وتجصيصها. (مرقات:١/٢٤٦، امداديه ،ملتان).

شرح منیۃ المصلی میں ہے:

ويكره تجصيص القبر وتطيينه وبه قالت الأئمة الثلاثة ،لما روي عن جابر رضي الله

تعالیٰ عنه: نهي رسول الله صلى الله عليه وسلم عن تجصيص القبور وأن يكتب عليها وأن يبنى عليها. رواه مسلم .... **وعن أبي حنيفةؒ أنه يكره أن يبنى عليه بناء من بيت أو قبة أو نحو ذلک لما مر من الحديث آنفاً** .(شرح منية المصلی:ص۵۹۹،سهيل).

ومثله في الفتح القدير:۲/۱٤۰،دارالفكر۔والفتاوى الخانية على هامش الهندية:۱/۱۹٤۔والفتاوى السراجية على هامش قاضيخان:اولين ص۱٤۱).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ويسنم القبر قدر الشبر، ولا يربع ، ولا يجصص...ويكره أن يبنى على القبر. (الفتاوى الهندية:۱/۱٦٦).

مالابدمنہ میں ہے:

آنچہ برقبورِ اولیاء عمارت ہائے رفیع بنا کنند و چراغاں روشن می کنند واز یں قبیل ہر چہ می کنند، حرام است یا مکروہ۔(مالابدمنه:۹۱، کتب خانه محموديه ،ديوبند).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

پلستر اور بنا کی ممانعت صراحۃً حدیث میں وارد ہے۔(احسن الفتاوی:۴/۱۸۹).

الغرض قبور حضراتِ اولیاء پر عمارت اور گنبد بنانے پر کوئی صحیح روایت اور عقلی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف دلائل اور براہین کا انبار موجود ہے،وفيها كفاية لمن له هداية۔(مستفاد ازراہِ سنت:ص۱۸۰۔۱۸۵).

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی فریدیہ:۱/۳۱۵،۲۸۸۔واحکام میت:۱۸۲،۱۹۱،از مولانا ڈاکٹر عبدالحی صدیقی۔ وامداد الاحکام:۱/۲۰۱۔وفتاوی رحیمیہ:۵/۹۸۔ومأۃ مسائل:ص۷۱،مسئلہ۲۷۔

یہ بھی یاد رہے کہ فقہاء جہاں مطلق مکروہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے مکروہِ تحریمی مراد ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

اختلف أصحاب الشرع في معنى المكروه ، فروي عن محمدؒ أنه نص على أن كل مكروه حرام ، إلا أنه لما لم يجد فيه نصاً قاطعاً لم يطلق عليه لفظ الحرام فكان نسبة المكروه إلى الحرام عنده كنسبة الواجب إلى الفرض في أن الأول ثابت بدليل قطعي والثاني ثابت بدليل ظني، وروي عن أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ أنه إلى الحرام أقرب. (نتائج الافكار تكملة فتح القدير:۱۰/٤،كتاب الكراهية،دارالفكر۔وكذا في البحرالرائق:۸/۱۸۰،كتاب الكراهية،كوئته).

اگر چہ دیگر بعض کتب میں جواز مرقوم ہے مثلاً درمختار: ۲/ ۲۳۷، تقریراتِ رافعی: ۲/ ۱۲۳، وغیرہ، لیکن یہ مرجوح اور نا قابل اعتبار ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: فتاوی دارالعلوم زکریا جلد اول ص ۱۹۳، باب (۷) ردِ بدعت۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دیوانہ کی نمازِ جنازہ میں نابالغ کی دعاء پڑھنے کا حکم:

سوال: ایک شخص دیوانہ تھا، اس کا انتقال ہوگیا، اس کے جنازہ میں بالغ کی دعاء پڑھی جائے گی یا نابالغ کی؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نابالغ کی دعاء پڑھی جائے گی، ہاں بالغ کی پڑھ لے تب بھی نماز درست ہوجائے گی۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

ولا يستغفر فيها لصبي ومجنون ومعتوه لعدم تكليفهم، بل يقول بدل دعاء البالغين: "اللّٰهم اجعله لنا فرطاً، وجعله لنا ذخراً وشافعاً مشفعاً". (الدرالمختار: ۲/ ۲۱۵، سعيد).

مراقی الفلاح میں ہے:

ولا يستغفر لمجنون وصبي إذ لاذنب لهما، ويقول في الدعاء: اللّٰهم اجعله فرطاً ...

(مراقی الفلاح: ۲۱۵، باب احكام الجنائز، بيروت۔ ومثله فی البحر الرائق: ۲/ ۱۸٤، كوئته)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بے جان پیدا ہونے والے بچہ کے لیے غسل، کفن اور نماز کا حکم:

سوال: ایک بچہ ماں کے پیٹ سے مرا ہوا پیدا ہوا اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں پیدائش کے وقت زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو صحیح قول کے مطابق غسل دیا جائیگا اور کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے گا، نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

ملاحظہ ہو حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

وإن لم يستهل غسل وإن لم يتم خلقه في المختار لأنه نفس من وجه وأدرج في خرقة ويسمىٰ و دفن ولم يصل عليه. قوله في المختار: وظاهر الرواية منع الكل، وكذا لا يرث، ولا يورث، اتفاقاً لأنه كجزء الحي كما في الزيلعي والحموي، وحاصل ما في المصنف أنه بالنظر لكونه نفساً من وجه يغسل، ويصلى عليه، وبالنظر لكونه جزء آدمي لا ولا، فاعملنا

الشبهين ، فقلنا : يغسل عملاً بالأول ، ولا يصلي عليه عملاً بالثاني، ورجحنا خلاف ظاهر الرواية ، وقوله لأنه نفس من وجه ، الأولىٰ ما في ملتقى الأبحر حيث قال: إكراماً لبني آدم ، وإنما كان نفساً لأنه يبعث وإن لم ينفخ فيه الروح على أحد القولين. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح:ص۵۹۸،قدیمی۔وکذا فی الدرالمختار مع الشامیة:۲/۲۲۸،سعید)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

پیدائش کے وقت انتقال کرنے والے بچہ کا نام رکھنے کا حکم:

سوال: اگر بچہ پیدا ہوتے ہی مرگیا تو اس کا نام رکھا جائے گا یا نہیں؟ بہتر کیا ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں بچہ زندہ پیدا ہو یا مردہ، تام الخلقت ہو یا ناتمام، بہرصورت بچہ کا نام رکھا جائے گا،اس لیے کہ یہ بچہ والدین کے لیے دخولِ جنت کا سبب بنے گا۔

ملاحظہ ہو مراقی الفلاح میں ہے:

وإن لم يستهل وإن لم يتم خلقه في المختار لأنه نفس من وجه وأدرج في خرقة وسمي و دفن ولم يصل عليه ويحشر إن بان بعض خلقه هو الذي يقتضيه مذهب أصحابنا لأنه يثبت له حرمة بني آدم بدليل ثبوت الأحكام الشرعية له كاستيلاد، وانقضاء عدة، نهر، وقد قالوا: إن السقط يحيى في الآخرة، وترجى شفاعته. (مراقی الفلاح مع حاشیة الطحطاوی:۵۹۸،قدیمی).

شامی میں ہے:

ووجهه أن تسميته تقتضي حشره إذ لا فائدة لها إلا في ندائه في المحشر باسمه وذكر العلقمي في حديث " سموا أسقاطكم فإنهم فرطكم " الحديث... (الشامی:۲/۲۲۸،سعید).

یعنی ناتمام بچوں کے نام رکھو وہ جنت میں جانے کے لیے آپ کے پیش رو ہیں۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

بغیر وضو کے نمازِ جنازہ پڑھانے پر اعادہ کا حکم:

سوال: اگر امام نے جنازہ پڑھایا بعد میں معلوم ہوا کہ امام کا وضوء نہیں تھا تو اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟ یہ بھی یاد رہے کہ مقتدی حضرات باوضوء تھے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نمازِ جنازہ کا اعادہ ضروری ہے۔

ملاحظہ فرمائیں بدائع الصنائع میں ہے:

إنهم لو صلوا على جنازة والإمام غير طاهر فعليهم إعادتها لأن صلاة الإمام غير جائزة

لعدم الطهارة فكذا صلاتهم لأنها بناء على صلاته. (بدائع الصنائع:۲/۳۱۵،سعید).

درمختار میں ہے:

الطهارة... شرط في حق الميت والإمام جميعاً فلو أم بلا طهارة والقوم بها أعيدت.

(الدرالمختار مع الشامی:۲/۲۰۸،سعید).

البحر الرائق میں ہے:

ولو صلى الإمام بلا طهارة أعادوا لأنه لاصحة لها بدون الطهارة فإذا لم تصح صلاة الإمام لم تصح صلاة القوم. (البحرالرائق:۲/۱۷۹،کوئٹه)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

جنازہ پر صرف تین تکبیریں کہنے سے نماز کا حکم:

سوال: امام صاحب نے نمازِ جنازہ میں تین تکبیرات کہہ کر سلام پھیر دیا اس وقت کسی نے کچھ نہیں کہا، جب جنازہ قبر میں اتارا گیا تو سب لوگوں نے کہا کہ تین تکبیریں ہوئی تھیں، اب کیا کرنا چاہئے اور اگر مٹی ڈالنے کے بعد تین تکبیرات پر یقین ہو تو پھر کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: جنازہ میں چار تکبیرات فرض ہیں، لہذا تین تکبیرات والا جنازہ نہیں ہوا۔ اب اگر میت کو قبر میں نہیں اتارا اور مٹی بھی نہیں ڈالی تو میت کو باہر نکال کر اس کا جنازہ دوبارہ پڑھ لیں۔ اور اگر مٹی ڈالی گئی تو چونکہ میت تھوڑی دیر پہلے ہی قبر میں اتاری گئی لہذا اس کی قبر پر چار تکبیرات کے ساتھ دوبارہ جنازہ پڑھ لیا جائے۔

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

أن الإمام إذا اقتصر على ثلاثة فسدت فيما يظهر، وإذا فسدت على الإمام فسدت على المأموم لترك ركن من أركانها. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح:ص۵۸۷،فصل الصلاة علیه،قدیمی)

درمختار میں ہے:

وركنها شيئان (التكبيرات) الأربع.....(والقيام). (الدر المختار:۲/۲۰۹،سعید).

نیز درمختار میں ہے:

وإن دفن وأهيل عليه التراب بغير صلاة أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له صلى على قبره استحساناً ما لم يغلب على الظن تفسخه. وفي الشامي: قوله وأهيل عليه التراب، وإن لم يهل أخرج وصلى عليه كما قدمناه. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۲/۲۲٤،سعید).

البحر الرائق میں ہے:

فإن دفن بلا صلاة صلى على قبره ما لم يتفسخ ، لأن النبي صلى الله عليه وسلم صلى على قبر امرأة من الأنصار. (البحر الرائق: ۲/ ۳۱۹، کوئٹہ)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

غیر ثابت النسب بچے کی نماز جنازہ اور کفن دفن وغیرہ کا حکم:

سوال: ایک مسلمان آدمی نے کسی غیر مسلم نصرانی عورت سے کاغذی نکاح کیا یعنی زبان سے ایجاب وقبول نہیں ہوا، نکاح بھی چرچ میں ہوا پھر عورت سے بچہ پیدا ہوا، یا ایک مسلمان شخص نے ہندو عورت سے برائے نام نکاح کیا اور بچہ پیدا ہوا، یا کسی مسلمان نے غیر مسلم عورت کے ساتھ زنا کیا اور اس سے بچہ پیدا ہوا، ان تینوں صورتوں میں بچہ نابالغی کی حالت میں مرگیا، کیا اس بچہ کا جنازہ اور کفن دفن وغیرہ اسلامی طریقہ پر کیا جائیگا یا نہیں؟

الجواب: دوسری اور تیسری صورت میں تو بچہ کا ولد الزنا ہونا ظاہر ہے، نیز پہلی صورت کا بھی یہی حکم ہے اس لیے کہ فقط بذریعہ کتابت نکاح نہیں ہوتا، لیکن بچہ کو خیر الابوین کے تابع یعنی مسلمان باپ کے تابع بنا کر مسلمان شمار کیا جائیگا اور اسلامی طریقہ پر نماز جنازہ اور کفن دفن کی اجازت ہوگی۔

ملاحظہ ہو ''الفقہ الاسلامی'' میں ہے:

عقد الزوج لا يصلح انعقاده بالكتابة إذا كان العاقدان حاضرين في مجلس واحد إلا حال العجز عن النطق كالخرس، لأن الزواج يشترط لصحته حضور الشهود وسماعهم كلام العاقدين، وهذا لايتيسر في حال الكتابة. (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۴/ ۱۰۴، دار الفکر)۔

درمختار میں ہے:

ورأيت في فتاوى الشهاب الشلبي قال: واقعة الفتون في زماننا مسلم زنى بنصرانية فأتت بولد فهل يكون مسلماً؟ أجاب بعض الشافعية بعدمه وبعضهم بإسلامه، وأفتىٰ قاضي القضاة الحنبلي بإسلامه أيضاً و في الشامي : قلت: يظهر لي الحكم بالإسلام لحديث الصحيح" كل مولود يولد على الفطرة حتى يكون أبواه هما اللذان يهودانه أو ينصرانه" فإنهم قالوا: إنه جعل اتفاقهما ناقلاً له عن الفطرة فإذا لم يتفقا بقي على أصل الفطرة أو على ما هو أقرب إليهما ولأن الكفر أقبح القبيح فلا ينبغي الحكم به لشخص بدون أمر صريح.

(الدر المختار مع الشامی: ۳/ ۱۹۷، سعید)۔

امدادالفتاح میں ہے:

(إلا أن يسلم أحدهما) ثم يموت الصبي لأنه يتبع خيرهما ديناً فيصلى عليه.

(امدادالفتاح:٦٢٨،بیروت).

نیز بخاری میں جریج والی حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ زانی باپ پر بھی اب کا اطلاق ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہو بخاری میں ہے:

وقال الليث: حدثني جعفر ابن ربيعة عن عبد الرحمن بن هرمزقال: قال أبوهريرة رضي الله تعالىٰ عنه:قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: نادت امرأة ابنها وهو في صومعته قالت: ياجريج قال: اللّٰهمّ أمي وصلا تي، فقالت: ياجريج قال: اللّٰهمّ أمي وصلا تي،قالت: ياجريج قال: اللّٰهمّ أمي وصلا تي، قالت: اللّٰهمّ لايموت جريج حتى ينظر في وجوه المياميس، وكانت تأوي إلى صومعته راعية ترعى الغنم فولدت، فقيل لها: ممن هذا الولد؟ قالت: من جريج، نزل من صومعته، قال جريج :أين هذه التي تزعم أن ولدها لي قال: يابابوس من أبوک؟ قال: راعي الغنم.(رواه البخاري:١/١٦١)۔واللہ ﷻ اعلم۔

تدفین کے بعد قبر پر نصیحت کرنے کا حکم:

سوال: بعض علاقوں میں تدفین کے بعد قبر کے پاس کھڑے ہوکر مختصر بیان کرنے کی عادت ہے، کیا یہ شریعت کے موافق عمل ہے یا نہیں؟

الجواب: امام بخاریؒ نے باب قائم کیا ہے "باب موعظة المحدث عند القبر"،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدث کا وعظ قبر کے پاس عام ہے تدفین کے انتظار کے وقت ہو یا تدفین کے بعد ہو گنجائش نکلتی ہے، نیز حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میری قبر پر کچھ دیر رک جاؤ تا کہ میں مانوس ہو جاؤں اور اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا جواب دیدوں۔

ملاحظہ ہو امام بخاریؒ فرماتے ہیں:

باب موعظة المحدث عند القبروقعود أصحابه حوله...عن علي رضي الله تعالىٰ عنه قال: كنا في جنازة في بقيع الغرقد فأتانا النبي صلى الله عليه وسلم فقعد وقعدنا حوله ومعه مخصرة فنكس فجعل ينكت بمخصره ثم قال:ما منكم من أحد أومن نفس منفوسة إلا

كتب مكانها من الجنة والنار وإلاقدكتبت شقية أوسعيدة فقال: رجل يارسول الله أفلا نتكل علـى كتابنا وندع العمل فمن كان منامن أهل السعادة فسيصيرإلى عمل أهل السعادة وأما من كان منامن أهل الشقاوة فسيصيرإلى عمل أهل الشقاوة، قال: أماأهل السعادة فيسيرون لعمل السعادة و أما أهل الشقاوة فيسيرون لعمل الشقاوة ، ثم قرأ : ﴿ فأما من أعطى واتقى﴾ الآية . (رواه البخاري:١/١٨٢،باب موعظة المحدث عندالقبر،فيصل).

مسلم شریف میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے:

...فإذا أناْ مت فلا تصحبني نائحة ولا نار، فإذا دفنتموني فسنوا علي التراب سناً ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحرجزور ويقسم لحمها حتى أستأنس بكم وأنظر ماذا أرجع به رسل ربي. (رواه مسلم :١/٧٦، باب كون الاسلام يهدم ما قبله، فيصل).

ابوداؤد شریف میں ہے:

عن عثمان بن عفان رضى الله تعالىٰ عنه كان النبى صلى الله عليه وسلم إذا فرغ من دفن الميت وقف عليه، فقال: استغفروا لأخيكم واسألوا له بالتثبيت فإنه الآن يسأل.

(ابوداؤد شریف: ٢/١٠٣،باب الاستغفار عند القبر للميت فى وقت الانصراف،سعيد).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ويستحب إذا دفن الميت ان يجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ينحرجزور ويقسم لحمها. (الفتاوى الهندية:١/١٦٦).

جب دفن سے فارغ ہونے کے بعد بیٹھنا بہتر ہے تو اس وقت تلاوت کرنا یا دین کی باتیں سنانا بھی جائز ہے۔

تدفین کے بعد قبر پر سورۂ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا ثابت ہے۔

ملاحظہ ہو مجمع الزوائد میں ہے:

عن عبد الرحمن بن العلاء بن اللجلاج قال: قال أبي: يا بني إذا أناْ مت فالحد لي لحداً فإذا وضعتني في لحدي فقل: بسم الله وعلى ملة رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم سن التراب علي سناً ثم اقرأ عندرأسي: بفاتحة البقرة وخاتمتها، فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ذلك . رواه الطبراني في الكبيرورجاله موثقون.(مجمع الزوائد :٣/٤٤).

مشکوٰۃ شریف میں ہے:

عن عبد الله بن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إذا مات أحدكم فلا تحبسوه وأسرعوا به إلى قبره وليقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجليه بخاتمة البقرة. رواه البيهقى فى شعب الايمان ،وقال: والصحيح انه موقوف عليه. (مشكاة شريف: ١٤٩/١، باب دفن الميت).

مغنی میں امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ مذکور ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

روى عنه (أحمد) أنه قال: القراءة عند القبر بدعة وروى ذلك عن هشيم قال أبوبكر: نقل ذلك عن أحمد جماعة ثم رجع رجوعاً أبان به عن نفسه، فروى جماعة أن أحمد نهى ضريراً أن يقرأ عند القبر وقال له: إن القراءة عند القبر بدعة، فقال له محمد بن قدامة الجوهرى: يا أباعبد الله ما تقول فى مبشر الحلبى؟ قال ثقة، قال فأخبرنى مبشر عن أبيه أنه أوصى إذا دفن يقرأ عنده بفاتحة البقرة وخاتمتها، وقال سمعت ابن عمر يوصى بذلك، قال أحمد بن حنبل فأرجع فقل للرجل يقرأ. (المغنى: ٤٢٥/٢، بيروت). **واللہ ﷻ اعلم۔**

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر اشکال:

اشکال: حضرت عمر بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ پر کہ میری قبر پر کچھ دیر رک جاؤ تا کہ میں مانوس ہو جاؤں، سلفی حضرات اشکال کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اس حدیث کے خلاف ہے جس میں منکر نکیر کا سوال و جواب کے لیے آنا لوگوں کے جانے کے بعد مذکور ہے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن أنس رضى الله تعالىٰ عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: العبد إذا وضع فى قبره وتولى وذهب أصحابه حتى أنه يسمع قرع نعالهم أتاه ملكان... الحديث. اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ میں " تولى " سے " فرغوا عن دفنه " مراد ہے " أى تولى أصحابه عن التدفين وذهبوا عن التدفين " اگر اس سے لوگوں کا جانا مراد ہو تو اگر کسی کی قبر پر لوگ ایک سال بیٹھے رہیں تو کیا سوال و جواب نہیں ہوگا؟ واللہ ﷻ اعلم۔

صاحبِ قبر کی بعض کرامات کا ثبوت:

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں قبر کے اوپر نور کے شعلے دیکھے گئے، یا جانور اس کے روندنے سے اجتناب کرتے ہیں، یا اس کے قریب دفن ہونے کو بہتر خیال کرتے ہیں کیا یہ باتیں درست ہیں یا نہیں؟

الجواب: بہت سی مرتبہ بعض اللہ والے بزرگوں کی قبروں سے خلافِ عادت چیزیں نمودار ہوتی ہیں، جن کا انکار کرنا مشاہدہ کے انکار کے مترادف ہے، حتی کہ شریعتِ مطہرہ میں خوردبیں سے بدعت تلاش کرنے والے حضرات بھی ان کو تسلیم کرتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں اقتضاء الصراط المستقیم میں ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

وكذلك ما يذكر من الكرامات، وخوارق العادات التي توجد عند قبور الأنبياء والصالحين، مثل نزول الأنوار والملائكة عندها وتوقي الشياطين، والبهائم لها، واندفاع النار عنها وعمن جاورها، وشفاعة بعضهم في جيرانه من الموتى، واستحباب الاندفان عند بعضهم، وحصول الأنس والسكينة عندها، ونزول العذاب بمن استهانها؛ فجنس هذا حق، ليس مما نحن فيه .

وما في قبور الأنبياء والصالحين، من كرامة الله ورحمته، وما لها عند الله من الحرمة والكرامة فوق مايتوهمه أكثر الخلق، لكن ليس موضع تفصيل ذلك. (اقتضاء الصراط المستقيم:۲/۲۵۵،مكتبة الرشد،الرياض). **واللہ ﷻ اعلم۔**

لاوارث میت کے مال کا حکم:

سوال: ایک شخص کا انتقال ہوا اور جس کے ہاں انتقال ہوا اس کو میت کے ورثہ کا کوئی علم نہیں، تو اس کے مال کے ساتھ کیا کرے؟ اور اس نے کوئی وصیت بھی نہیں کی۔

الجواب: اگر خود فقیر ہے تو وہ خود استعمال کرلے ورنہ فقراء میں تقسیم کرے۔

ملاحظہ ہو فتاوی سراجیہ میں ہے:

غريب مات في بيت رجل و ليس له وارث معروف و صاحب الدار فقير، فله أن يتصدق على نفسه كذا ذكره في فتاویٰ سمرقند. (فتاوى السراجية على هامش الخانية:۲/۴۹، كوئته)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

تلاوت وغیرہ سے ایصال ثواب کا حکم مذاہبِ اربعہ کی روشنی میں:

سوال: ہمارے ہاں لوگ مقابر جاتے ہیں اور کھڑے ہو کر تلاوت کرتے ہیں اور اس کا ثواب میت یا اہلِ مقبرہ کو ہبہ کرتے ہیں، بعض سلفی حضرات اس پر معترض ہیں، مذاہبِ اربعہ اس کے بارے میں کیا لکھتے ہیں۔ یعنی میت کے لیے تلاوتِ قرآن کے ایصال ثواب کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مذاہبِ اربعہ میں یہ عمل جائز اور مفید ہے احناف کی مشہور کتاب ''کنز الدقائق'' کی شرح میں علامہ زیلعی نے باب الحج عن الغیر میں لکھا ہے:

الأصل في هذا الباب أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره عند أهل السنة والجماعة صلاةً كان أو صوماً أو حجاً أو صدقةً أو قراءةَ القرآن أو الأذكار إلى غير ذلك من جميع أنواع البر، يصل ذلك إلى الميت وينفعه. (شرح كنز الدقائق:۲/۸۳).

ہدایہ باب الحج عن الغیر (۱/۲۹۶) میں بھی یہی مضمون ہے۔

ابن الحاج المالکیؒ نے المدخل میں لکھا ہے:

لو قرأ في بيته وأهدى إليه لَوَصَلَتْ، وكيفية وصوله أنه إذا فرغ من تلاوته وهب ثوابها له أويقول: اللّٰهم اجعل ثوابها له فإن ذلك دعاء بالثواب والدعاء يصل بلا خلاف. (المدخل ۱: /۲۶٦).

علامہ محمد بن خلیفۃ وشتانی ابی مالکیؒ شرح مسلم میں تسبیح جریدتین کے ذیل میں فرماتے ہیں:

وأخذت منه تلاوة القرآن على القبر لأنه إذا رجى التخفيف بتسبيح الشجر فالقرآن أولى. (إكمال إكمال المعلم شرح مسلم للأبيّ:۲/۱۲۵ ،باب الدليل على نجاسة البول،بيروت).

شوافع کے سرخیل امام نوویؒ فرماتے ہیں:

ويستحب للزائر يعني زائر القبور أن يسلم على المقابر ويدعو لمن يزوره ولجميع أهل المقبرة و الأفضل أن يكون السلام والدعاء بما ثبت في الحديث ويستحب أن يقرأ من القرآن ما تيسر و يدعو لهم عقبها نص عليه الشافعي و اتفق عليه الأصحاب. (المجموع شرح المهذب:۵/۳۱۱،دارالفكر).

حنابلہ میں موفق الدین ابن قدامہ نے فرمایا:

وأي قربة فعلها وجعل ثوابها للميت المسلم نفعه ذلك إن شاء الله. (المغني: ۲/۴۲۵)۔

حافظ ابن قیم حنبلی کتاب الروح میں فرماتے ہیں:

واختلفوا في العبادة البدنية كالصوم والصلاة وقراءة القرآن والذكر فمذهب الإمام أحمدؒ وجمهور السلف وصولها وهو قول بعض أصحاب أبي حنيفةؒ، نص على هذا الإمام أحمدؒ في رواية محمد بن يحيى الكحال قال: قيل لأبي عبد الله الرجل يعمل الشيء من الخير من صلاة أو صدقة أو غير ذلک فيجعل نصفه لأبيه أو لأمه قال: أرجو أو قال الميت يصل إليه كل شيء من صدقة أو غيرها، وقال أيضاً: اقرأ آية الكرسي ثلاث مرات وقل هو الله أحد، وقل إن فضله " أي ثوابه " لأهل المقابر. (كتاب الروح: ص١٤٩،المسألة السادسة عشرة،دار الفكر بيروت)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اہل سنت والجماعت کی نظر میں:

سوال: یہ بات تو مسلم ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ربیع الاول کے مہینہ میں ہوئی، لیکن اس کے بعد آپ کے روضہ میں آپ کے جسد اطہر کے ساتھ آپ کی روح کا تعلق ہے یا نہیں؟ اگر روح کا تعلق جسد کے ساتھ ہو تو اس تعلق کی وجہ سے صلاۃ وسلام سماعت فرماتے ہیں یا نہیں؟ اس کو احادیث اور اقوالِ مشائخ کی روشنی میں واضح فرمائے؟

بعض حضرات کہتے ہیں:

﴿لا يسمعوا دعائكم، ولو سمعوا ما استجابوا لكم، ويوم القيٰمة يكفرون بشرككم، ولا ينبئک مثل خبير﴾. (سورة الفاطر:الآية:١٤).

اس آیتِ کریمہ نے واضح کیا ہے کہ جن مدفون بزرگوں کو کفار یا کوئی اور پکارتا ہے، وہ بات نہیں سنتے یعنی آیت نے ان سے سننے کی نفی کی ہے۔

الجواب: تمام اہل سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام، بالخصوص سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں حیاتِ قبری برزخی حاصل ہے اور حیات کے تمام لوازمات کے ساتھ متصف ہے، اور ان کی زندگی حضراتِ شہداء کی زندگی سے بھی اعلیٰ اور ارفع ہے، چنانچہ تقریباً ۱۵۰/ احادیث (جن میں قبر میں عذاب وثواب وحیات کا تذکرہ ہے) سے انبیاء کرام کی حیات دلالت النص سے بطریق اولیٰ ثابت ہے۔ نیز بہت سی احادیث میں صراحۃً یہ الفاظ مذکور ہیں کہ ’’انبیاء کرام اپنی قبور میں زندہ ہیں‘‘۔

آپ علیہ السلام کی وفات کے بعد روح کا تعلق جسد سے موجود ہے، اور یہ حیات (بقول حضرت بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ) دنیوی حیات کے مماثل بلکہ اس سے اقویٰ ہے، دنیا میں ہمیشہ جسم کو روح کی خاصیت حاصل نہیں ہوتی اور برزخ میں ہوتی ہے، اس لیے وہ حیات دنیوی کی طرح بھی ہے، اور برزخی بھی، لہٰذا دنیوی حیات کے مماثل، بلکہ اس سے بھی اقویٰ ہے، انتہیٰ۔

اور اس حیات کی وجہ سے آپ علیہ الصلاۃ والسلام سماعت فرماتے ہیں اور اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔

حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر دلائل حسبِ ذیل درج ہیں:

قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر حیات الانبیاء کا ثبوت اشارۃً، ودلالۃً موجود ہے۔

(۱) قال اللہ تعالیٰ: ﴿ واسئل من أرسلنا من قبلک من رسلنا، أجعلنا من دون الرحمن آلهة يعبدون﴾. (سورة الزخرف: الآية: ٤٥).

اس آیت کے ذیل میں ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إنه لما أسري به جمع الأنبياء فصلى بهم، ثم قال له جبريل: سل من أرسلنا قبلک، الآية. فقال: لا أسأل، قد اكتفيت، رواه عطاء عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما وهذا قول سعيد بن جبيرؒ والزهريؒ وابن زيدؒ قالو: جمع له الرسل ليلة أسري به، فلقيهم وأمر أن يسألهم، فما شک ولا سأل. (زاد المسير في علم التفسير: ٣١٩/٧، بيروت. ومثله في: التفسير القرطبي: ٨٣/١٦، وتفسير الطبري: ٦١٢/٢١).

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قوله تعالیٰ: واسئل من أرسلنا... يستدل به على حياة الأنبياء. (مشكلات القرآن، ص٣٧٧، سورة الزخرف).

(۲) ﴿ولقد آتينا موسى الكتاب فلا تكن في مرية من لقائه﴾. (سورة الٓمٓ سجدة: الآية: ٢٣).

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عن أبي العالية ... (واسئل من أرسلنا)... وأراد بذلک لقاءه صلى الله عليه وسلم إياه ليلة الإسراء كما ذكر في الصحيحين وغيرهما، وروي نحو ذلک عن قتادة وجماعة من السلف،... وكان المراد من قوله ﴿ فلا تكن في مرية من لقاءه﴾ على هذا وعده تعالىٰ نبيه صلى الله عليه وسلم بلقاء موسىٰ وتكون الآية نازلة قبل الإسراء. (روح المعاني: ١٣٨/٢١. وكذا

في زاد المسير: ٦/٣٤).

(۳)﴿**بل أحياء عند ربهم يرزقون، فرحين بما آتاهم الله من فضله**﴾.(سورة آل عمران:١٦٩).

(۴)﴿**ولا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله أموات، بل أحياء ولكن لا تشعرون**﴾. (سورة البقرة: الآية: ١٥٤).

ان دونوں آیات سے متعلق علامہ ابن الحجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قلت: وإذا ثبت أنهم أحياء من حيث النقل فإنه يقويه من حيث النظر كون الشهداء أحياء بنص القرآن، والأنبياء أفضل من الشهداء.(فتح الباری:٦/٤٨٨،کتاب احادیث الانبیاء).

یعنی جب نقل سے یہ ثابت ہوگیا کہ شہداء زندہ ہیں، اور انبیاء کرام شہداء سے افضل ہیں، لہذا اس آیت سے ان کی حیات بطریق اولیٰ ثابت ہوتی ہے۔

حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم احادیث کی روشنی میں:

(۱) عن أنس رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الأنبياء أحياء في قبورهم يصلون، رواه أبو يعلى والبزار وجال أبي يعلى ثقات. (مجمع الزوائد: ٨/٢١١، باب ذكر الأنبيا،و مسند أبي يعلى الموصلي: ٧/٤٤٥، رقم: ٣٣٣١،وحياة الأنبياء للبيهقي:ص٣).

اس حدیث کو محدثین اور فقہاء کرام نے صحیح قرار دیا ہے۔

قال الهيثميؒ: ورجال أبي يعلى ثقات.(مجمع ٨/٢١١،دارالفكر).

قال الملا علي القاريؒ: وصح خبر الأنبياء أحياء في قبورهم يصلون. (مرقاة:٣/٢٤١، باب الجمعة).

قال ابن حجرؒ: وصححه البيهقي.(فتح الباری ٦/٤٨٨).

(۲) عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" من صلى علي عند قبري سمعته، ومن صلى علي غائباً أبلغته".(رواه البيهقي في شعب الإيمان:٢/٢١٥ رقم:١٥٨٣).

تنزیہ الشریعہ میں مذکور ہے:

من صلى علي عند قبري سمعته ومن صلى علي غائباً وكل الله بها ملكاً يبلغني، وكفا أمر دنياه وآخرته، وكنت له شهيداً وشفيعاً.(خط) من حديث أبي هريرة ﷺ ولا يصح، فيه محمد بن مروان وهوالسدى الصغير، وقال العقيلي: لا أصل لهذا الحديث.(تعقب) بأن

البيهقي أخرجه في الشعب من هذا الطريق، وتابع السدي عن الأعمش فيه أبومعاوية، أخرجه أبو الشيخ في الثواب (قلت) وسنده جيد كما نقله السخاوي عن الحافظ ابن حجرؒ والله أعلم. وله شواهد من حديث ابن مسعود وابن عباس وأبي هريرة، أخرجها البيهقي، ومن حديث أبي بكر الصديق أخرجه الديلمي ومن حديث عمار أخرجه العقيلي من طريق علي بن قاسم الكندي وقال: علي بن قاسم شيعي فيه نظر، لا يتابع علي حديثه. انتهى. وفي لسان الميزان (٢٤٩/٤): أن ابن حبان ذكرعلي بن قاسم في الثقات، وقد تابعه عبد الرحمن بن صالح وقبيصة بن عقبة، أخرجهما الطبراني. (تنزيه الشريعة المرفوعة: ٣٣٥/١، دار الكتب العلمية. ومثله في اللآلي المصنوعة: ٢٥٩/١، دار الكتب العلمية).

خلاصہ یہ ہے کہ ابوالشیخ کی سند سے یہ حدیث قوی اور جید ہے، محدثین اس کو صحیح قرار دیتے ہیں اور اس کے کئی شواہد بھی بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث میں تصریح ہے کہ جب آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے روضہ اطہر کے پاس درود شریف پڑھا جاتا ہے تو آپ خود سنتے ہیں۔

(۳) عن أوس بن أوس رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن من أفضل أيامكم يوم الجمعة، فيه خلق آدم عليه السلام، وفيه قبض، وفيه النفخة، وفيه الصعقة، فأكثروا علي من الصلاة، فإن صلاتكم معروضة علي. قالوا يا رسول الله! كيف تعرض صلاتنا عليك وقد أرمت؟ قال: إن الله عز وجل حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء. (سنن النسائي: ٢٠٣/١-٢٠٤ـ وكذا في المستدرك للحاكم: ٥٦٠/٤، رقم: ٨٦٨١ـ و سنن ابن ماجه: ٧٦/١ و أبوداود: ٢١٤/١).

امام حاکم، علامہ ذہبی، ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی، نووی، ابن کثیر، ابن حجر، ابن القیم، علامہ منذری، شیخ عبد الحق وغیرہ ان سب حضرات نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

یہ حدیث بھی اپنے مستدل پر واضح ہے کہ انبیاء قبور میں زندہ ہیں۔

(۴) عن ابن مسعود رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن لله ملائكة سياحين في الأرض يبلغوني عن أمتي السلام. (نسائي: ١٨٩/١، مسند احمد: ٤٥٢/١، رقم ٦٤٣٢١، مصنف ابن أبي شيبة: ٤٤/٦، المجلس العلمي رقم: ٨٧٩٦، مصنف عبد الرزاق: ٢١٥/٢).

علامہ ہیثمی، نسائی، سخاوی، دارمی، ابونعیم، بیہقی اور ابن حبان، وغیرہ رحمہم اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

(۵) عن أبي الدرداء رضي اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: أكثروا الصلاة علي يوم الجمعة، فإنه يوم مشهود تشهده الملا ئكة، و إن أحداً لن يصلي علي إلا عرضت علي صلا ته حتى يفرغ منها، قال: قلت: وبعد الموت؟ قال: وبعد الموت، إن اللّٰه حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء، فنبي اللّٰه حي يرزق. (رواه ابن ماجه :ص۱۱۸).

فیض القدیر میں ہے:

قال الدميري: رجاله ثقات. (فيض القدير:۲/۸۷، المكتبة التجارية الكبرى).

حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم علماء کرام ومشائخ عظام کے اقوال کی روشنی میں:

(۱) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إن حياته صلى اللّٰه عليه وسلم في القبر لايعقبها موت، بل يستمر حياً، والأنبياء أحياء في قبورهم. (فتح الباري:۷/۲۹).

(۲) امام بیہقی فرماتے ہیں:

إن اللّٰه جل ثناء ه رد إلى الأنبياء عليهم السلام أرواحهم، فهم أحياء عند ربهم كالشهداء. (حياة الأنبياء،ص۲۲، حديث ۲۱).

(۳) ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

المعتقد المعتمد أنه صلى اللّٰه عليه وسلم حي في قبره كسائر الأنبياء في قبورهم وهم أحياء عند ربهم، وإن لأروحهم تعلقاً بالعالم العلوي والسفلي كماكانوا في الحال الدنيوي فهم بحسب القلب عرشيون وباعتبار القالب فرشيون. (تسكين الصدور، ص۲۳۱، بحواله :شرح الشفاء: ۲/۱٤۲، طبع مصر).

(۴) علامہ سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لا شك في حياته صلى اللّٰه عليه وسلم بعد وفاته وكذا سائر الأنبياء عليهم الصلاة والسلام أحياء في قبورهم حياة أكمل من حياة الشهداء التي أخبر اللّٰه تعالى بها في كتابه العزيز. (تسكين الصدور، ۲۳۰۔ بحواله وفاء الوفاء: ۲/٤۰۵).

(۵) علامہ سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فأقول: حياة النبي صلى الله عليه وسلم في قبره هو وسائر الأنبياء معلومة عندنا علماً قطعياً لما قام عندنا من الأدلة في ذلك وتواترت به الأخبار. (الحاوی للفتاوی:۲/۱۷۸).

نیز فرماتے ہیں:

قال المتكلمون المحققون من أصحابنا: إن نبينا صلى الله عليه وسلم حي بعد وفاته.

(الحاوی للفتاوی:۲/۱۸۰).

مزید لکھتے ہیں:

وقال الشيخ تقي الدين السبكي: حياة الأنبياء والشهداء في قبورهم كحياتهم في الدنيا ويشهد له صلاة موسى عليه السلام في قبره، فإن الصلاة تستدعي جسداً حياً. (الحاوی للفتاوی: ۲/۱۸٤. رسالة إنباء الأذكياء بحياة الأنبياء).

(۶) مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إن النبي صلى الله عليه وسلم حي كما هي تقرر وإنه يصلي في قبره بأذان وإقامة. (فتح الملهم: ۳/٤۱۹، قدیم نسخه).

(۷) علامہ عینی رحمہ اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول" **ولا يذيقك الله الموتتين** "کی شرح میں لکھتے ہیں:

وهما الموتتان الواقعتان لكل أحد غير الأنبياء عليهم الصلاة والسلام، فإنهم لا يموتون في قبورهم بل هم أحياء. (عمدة القاری:۱۱/٤۰۲-٤۰۳، باب قبل باب مناقب عمر رضی الله عنه).

(۸) علامہ شرنبلالی الحنفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ومما هو مقرر عند المحققين أنه صلى الله عليه وسلم حي يرزق متمتع بجميع الملاذ والعبادات غير أنه حجب عن أبصار القاصرين عن شريف المقامات. (نور الإيضاح، ص۱۸۹، فصل فی زيارة النبی صلى الله عليه وسلم).

(۹) ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

إن الأنبياء أحياء في قبورهم فيمكن لهم سماع صلاة من صلى عليهم. (مرقاة:۳/۲۳۸، مكتبة امدادية، ملتان)۔

(۱۰) شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حیات انبیاء متفق علیہ است، ہیچ کس رادروے خلافے نیست''۔(اشعۃ اللمعات:۱/۶۱۳،مطبع لکھنؤ)۔

(۱۱) علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وبهذا التقرير اندفع ما أورده المقدسي على قولهم "ولا رسول بعده" من أنهم إن أرادوا أن رسالته مقصورة على حياته، فممنوع، إذ قد صرح في منية المفتي أن رسالة الرسول لا تبطل بموته، ثم قال: ويمكن أن يقال أنها باقية حكماً بعد موته وكان استحقاقه بحقيقة الرسالة، لا بالقيام بأمور الأمة.اه. ولا يخفى ما في كلامه من إيهام انقطاع حقيقتها بعده صلى الله عليه وسلم، فقد أفاد الدر المنتقى أنه (أي القول بأن رسالته صلى الله عليه وسلم باقية بعد موته حكما فقط) خلاف الإجماع. قلت: وأما مانسب إلى الإمام الأشعري إمام أهل السنة والجماعة من إنكار ثبوتها بعد الموت، فهو افتراء وبهتان والمصرح به في كتبه وكتب أصحابه خلاف ما نسب إليه بعض أعدائه لأن الأنبياء عليهم السلام أحياء في قبورهم .اه. (شامي: ٤/١٥١،مطلب في ان رسالته صلى الله عليه وسلم باقية بعد موته،سعيد).

(۱۲) حنابلہ میں سے ابن عقیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

هو صلى الله عليه وسلم حي في قبره يصلي. (آپ کے مسائل: ١٠/٤٩٩،بحواله الروضة البهية :ص١٤).

(۱۳) علامہ عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والذي نعتقد أن رتبة نبينا صلى الله عليه وسلم على مراتب المخلوقين على الإطلاق، وأنه حي في قبره حياة مستقرة أبلغ من حياة الشهداء المنصوص عليها في التنزيل، إذ هو أفضل منهم بلا ريب، وأنه يسمع من يسلم عليه.(تسكين الصدور:٢٦٣،بحوالة اتحاف النبلاء،٤١٥).

(۱۴) غیر مقلدین میں سے قاضی شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقد ذهب جماعة من المحققين إلى أن رسول الله صلى الله عليه وسلم حي بعد وفاته، وإنه يسر بطاعات أمته وأن الأنبياء لا يبلون، مع أن مطلق الإدراك كالعلم والسماع ثابت لسائر الموتى. (نيل الأوطار:٣/٣٠٤، باب فضل يوم الجمعة).

حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم علماء دیوبند کی نظر میں:

مولانا شبیر احمد عثمانی کا حوالہ فتح الملہم سے گزر گیا۔

(۱۵) حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

بیہقی وغیرہ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں کذا فی المواہب، اور یہ نماز تکلیفی نہیں بلکہ تلذذ کے لیے ہے، اور اس حیات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ کو ہر جگہ پکارنا جائز ہے۔ (نشر الطیب: ص ۲۱۱، طبع جدید، دہلی)۔

(۱۶) المہند علی المفند (جو علماء دیوبند کے اتفاقی اور اجماعی عقائد پر مشتمل ہے) میں ہے:

مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عندنا وعند مشايخنا حضرة الرسالة صلى الله عليه وسلم حيّ في قبره الشريف، وحياته صلى الله عليه وسلم دنيوية من غير تكليف، وهي مختصة به صلى الله عليه وسلم وبجميع الأنبياء والشهداء، لا برزخية كما هي حاصلة لسائر المؤمنين بل لجميع الناس، كما نص عليه العلامة السيوطي رحمه الله في رسالته " إنباء الأذكياء بحياة الأنبياء " حيث قال: قال الشيخ تقي الدين السبكي: حياة الأنبياء والشهداء في القبر كحياتهم في الدنيا، ويشهد له صلاة موسى عليه السلام في قبره فإن الصلاة تستدعي جسداً حياً إلى آخر ماقال فثبت بهذا أن حياته دنيوية برزخية لكونها في عالم البرزخ، ولشيخنا شمس الإسلام والدين محمد قاسم العلوم على المستفيدين قدس الله سره العزيز في هذا المبحث رسالة مستقلة دقيقة المأخذ، بديعة المسلك، لم يرمثلها، قد طبعت وشاعت في الناس واسمها " آبِ حيات " أي ماء الحياة. انتهىٰ. (المهند على المفند: ص ۴۳-۴۴، السوال الخامس)۔

(۱۷) نیز حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیدہ اجماعی ہے، جیسا کہ مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے گزرا، نیز علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

نحن نؤمن ونصدق بأنه صلى الله عليه وسلم حي يرزق في قبره، إن جسده الشريف لا تأكله الأرض، والإجماع على هذا. (القول البديع: ص ۱۷۲، دار الكتب العربى)۔

(۱۸) حیاۃ النبی علیہ السلام کے منکرین کو معتزلہ یا ان جیسے یعنی اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج قرار دیا گیا ہے۔

قال العلامة العيني في شرح البخاري: من أنكر الحياة في القبروهم المعتزلة ومن نحا

نحوهم...(عمدة القاری: ۱۱/۴۰۳، ملتان)۔

حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر (بقول علامہ بنوری رحمہ اللہ) جامع ترین تالیف حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب رحمہ اللہ کی بنام ''تسکین الصدور'' ہے جس میں آپ نے اس مسئلہ کے ہر گوشے پر تفصیل سے محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ: تمام اہل السنّت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ حضرات انبیاء کرام قبر اور برزخ میں زندہ ہیں، اور ان کی زندگی حضرات شہداء کی زندگی سے بھی اعلی وارفع ہے اور منکرین حیات کے تمام دلائل کے بالتفصیل جوابات دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب پر اکابر علماء دیوبند کی تصدیقات بھی شامل ہیں، اور سب کی متفقہ رائے ہے کہ یہ کتاب محقق، جامع، معتدل، مدلل ومبرہن، ہر مسئلہ میں مذہب جمہور اختیار کرنے والی ہے۔

چند حضرات کے اسماء گرامی، جن کی تصدیقات وتقریظات کتاب کے شروع میں ہیں:

(۱) مسند العلماء صدر المدرسین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند۔

(۲) صدر المفتیین حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب رحمہ اللہ مفتی اعظم دار العلوم دیوبند۔

(۳) جامع الفضائل حضرت مولانا القاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ مہتمم دار العلوم دیوبند۔

(۴) المحدث الجلیل فقیہ زمان حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمہ اللہ۔

(۵) استاذ العلماء، عالم بے بدل حضرت مولانا خیر محمد جالندھری صاحب رحمہ اللہ۔

(۶) سابق شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب رحمہ اللہ۔

(۷) المحدث الجلیل المحقق النبیل حضرت العلامہ السید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ۔

(۸) حافظ الحدیث، امیر علماء جمعیۃ پاکستان حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی صاحب۔

(۹) زبدۃ المحدثین، عمدۃ الفقہاء حضرت مولانا مفتی ظفر احمد عثمانی صاحب۔

(۱۰) امام الفضلاء جامع المنقول والمعقول مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ۔

ان کے علاوہ دیگر بہت سے اکابر امت کی تصدیقات وتائیدات کتاب کے شروع میں موجود ہیں۔

واللہ ﷻ اعلم۔

حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اشکال اور جواب:

اشکال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ قرآن کریم کے خلاف ہے؟ قرآن کریم میں ہے: ﴿إن تدعوهم لا يسمعوا دعاء كم﴾.

الجواب: اس کا جواب تفسیر مظہری میں ہے:

(إن تدعوهم) لقضاء حاجتكم (لا يسمعوا دعاء كم) لأنها جمادات، (ولو سمعوا) على سبيل الفرض أوعلى تقدير كونهم ذا شعور كإبليس (ما استجابوا لكم) لعدم قدرتهم على الإنفاع أو لتبرئهم منكم ومما تدعون لهم من الألوهية كعيسىٰ وعزير والملائكة. (تفسير مظهرى: ۸/ ۵۰).

اور اگر اس کو عام کرلیا جائے اور انبیاء (جن سے بعض لوگ مدد مانگتے ہیں) کو شامل کرلیا جائے تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرمان: ﴿فإنهم عدو لي إلا رب العالمين﴾ میں ''ھم'' کی ضمیر ذوالعقول کے لیے ہے تو سارے اولیاء وانبیاء جو ان سے پہلے گزرے ہیں وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے۔

الغرض اس آیت کا تعلق ہی سماع انبیاء سے نہیں ہے۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأما قوله ﴿وما أنت بمسمع من فى القبور﴾ فسياق الآية يدل على أن المراد منها أن الكافر الميت القلب لا تقدر على إسماعه إسماعاً ينتفعون به كما أن من في القبور لا تقدر على إسماعهم إسماعاً ينتفعون به، ولم يرد سبحانه أن أصحاب القبور لايسمعون شيئاً البتة كيف وقد أخبر النبي صلى اللّٰه عليه وسلم أنهم يسمعون خفق نعال ... وشرع السلام عليهم بصيغة الخطاب الذى يسمع ... (كتاب الروح، ص۵۵).

الغرض آیاتِ قرآنیہ میں مردوں سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں کی گئی، بلکہ زندہ کفار سے اس سماع کی نفی کی گئی ہے جو سماع مفید اور نافع ہوسکتا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دوسرا اشکال اور جواب:

سوال: حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے جسد کھانے کو حرام کردیا ہے، پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک بڑھیا کے بتلانے پر یوسف علیہ السلام کی ہڈیوں کو

لے گئے، اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟

الجواب: مذکورہ بالا روایت صحیح ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے پورے جسد مبارک کو لے گئے، اس میں مجازِ مرسل ہے، یعنی جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے، اور یہ بکثرت مستعمل ہے۔

حدیث ملاحظہ فرمائیں:

أخرجه أبويعلى في" مسنده " (١/٣٤٤) والحاكم (٢/٤٠٤-٤٠٥و٥٧١-٥٧٢)من ثلاث طرق عن يونس بن أبي إسحاق عن أبي بردة عن أبي موسى قال: أتى النبي صلى الله عليه وسلم أعرابياً فأكرمه ، فقال له: ايتنا، فأتاه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" سل حاجتک" فقال: ناقة برحلها أعنزاً يحلبها أهلي فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أعجزتم أن تكونوا مثل عجوز بني إسرائيل؟ فقال أصحابه يارسول الله ! وما عجوز بني إسرائيل ؟ قال: إن موسى لما سار ببني إسرائيل من مصر ضلوا الطريق فقال: ماهذا؟ فقال علماؤهم (نحن نحدثک) إن يوسف لماحضره الموت أخذ عليناموثقاً من الله أن لايخرج من مصرحتى ننقل عظامه معنا، قال: فمن يعلم موضع قبره؟ قالوا ماندري أين قبريوسف إلا عجوز من بني إسرائيل فبعث إليها فاتته، فقال: دلوني على قبر يوسف قالت: لا والله لا أفعل)حتى تعطيني حكمي، قال: وما حكمک ؟ قالت: أكون معک في الجنة، فكره أن يعطيها ذلک ، فأوحى الله إليه أن أعطها حكمها فانطلقت بهم إلى بحيرة، موضع مستنقع ماء ، فقالت: أنصبوا هذا الماء فأنصبوا قالت: احفروا واستخرجوا عظام يوسف فلما أقلوها إلى الأرض إذا الطريق مثل ضوء النهار.

والسياق لأبي يعلى والزيادات مع الرواية الأخرى للحاكم وقال: صحيح على شرط الشيخين وقدحكم أحمد وابن معين أن يونس سمع من أبي بردة حديث" لا نكاح إلا بولي" ووافقه الذهبي .

أقول (الشيخ الألباني): إنما هو على شرط مسلم وحده فإن يونس لم يخرج له البخاري في "صحيحه"وإنما في " جزء القراء ة ".

(فائدة) كنت استشكلت قديماً قوله في هذا الحديث "عظام يوسف" لأنه يتعارض بظاهره

مع الحديث الصحيح: " إن الله حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء " حتى وقفت على حديث ابن عمر رضي الله عنه" أن النبي صلى الله عليه وسلم لما بدن قال له تميم الداري: ألا أتخذ لک منبراً یارسول الله يجمع أو يحمل عظامک؟ قال: بلى فاتخذ له منبراً مرقاتين" أخرجه أبو داؤد(۱۰۸۱) بإسناد جيد على شرط مسلم. فعلمت منه أنهم كانوا يطلقون "العظام"ويريدون البدن كله من باب إطلاق الجزء وإرادة الكل، كقوله تعالیٰ:وقرآن الفجر أي صلاة الفجر فزال الإشكال والحمد لله فكتبت هذا لبيانه.(سلسلة الأحاديث الصحيحة:۵۵۹/۱).

علوم البلاغة میں ہے:

المجاز المرسل: ــ هو ما كانت العلاقة بين ما استعمل فيه وما وضع له ملابسة ومناسبة غير المشابهة ... وعلاقات هذا المجاز كثيرة (منها) الجزئية بمعنى أن الشيء يتضمنه وغيره شيء آخر... ومن هذا قوله تعالیٰ:﴿قم الليل إلا قليلاً﴾أي صل وقوله تعالیٰ:﴿لاتقم فيه أبداً﴾ أي لاتصل... قال معن بن أوس: ـ

أعلمه الرماية كل يوم ☆ فلما اشتد ساعده رماني

وكم علمته نظم القوافي☆ فلما قال قافية هجاني

(علوم البلاغة المبحث الرابع في المجاز المرسل: ۲۵۰ـ۲۵۱، بيروت). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

مردہ کے لیے لفظ وصال استعمال کرنے کا حکم:

سوال: بعض حضرات مردہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کا وصال ہوگیا، بعض سلفی حضرات اس کو بے ادبی سمجھتے ہیں کہ وصال کا لفظ تو عشقِ مجازی میں استعمال ہوتا ہے؟

الجواب: محبوب سے ملاقات کو وصال کہتے ہیں، اس میں عشقِ مجازی کی تخصیص نہیں، اللہ تعالیٰ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوسکتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں بخاری شریف میں ہے:

عبد الرحمن بن أبي بكرة رضي الله عنه قال: خطبنا النبي صلى الله عليه وسلم يوم النحر...إلى قوله فإن دماء كم وأموالكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا إلى يوم يلقون ربكم، ألا هل بلغت ؟ قالوا: نعم، قال : اللهم اشهد،إلى آخر الحديث...

(رواه البخاري: ۱/۲۳۵).

شمائل ترمذی میں ہے:

عن سهل بن سعد رضي الله عنه أنه قيل له: ... فقال سهل مارأى رسول الله صلى الله عليه وسلم النقي حتى لقي الله تعالىٰ... (شمائل ترمذی: ۹، باب ماجاء فی صفة خبز رسول الله صلی الله علیه وسلم).

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدہ کی روٹی نہیں دیکھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوئی۔

الغرض: محبوب کی ملاقات کے لیے وصال کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:
﴿وأقيموا الصلاة وآتوا الزكاة وأطيعوا الرسول
لعلكم ترحمون﴾
(سورة النور)

قال رسول اللہ صلى اللہ علیہ وسلم:
﴿اتقوا اللہ ربكم وصلوا خمسكم
وصوموا شهركم وأدوا زكاة أموالكم
وأطيعوا ذا أمركم تدخلوا جنة ربكم﴾
(رواه الترمذي)

کتاب الزکاۃ

باب......﴿۱﴾

وجوب زکوٰۃ کا بیان

فصل اول

سونا، چاندی اورزیورات پروجوبِ زکوٰۃ کا حکم

خانۂ کعبہ کے غلاف کے سونے پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم:

سوال: خانۂ کعبہ کے غلاف پر جوکشیدہ کاری ہوتی ہے وہ سونے کے تاروں سے ہوتی ہے اگرکسی کے پاس خانۂ کعبہ کے غلاف کا اوپر والا حصہ ہوتو اس میں کافی مقدار میں سونا ہوتا ہے، اگرکسی کی ملکیت میں دوتین میٹر کا غلاف ہوتو اس سونے کی زکوٰۃ اس پر ہے یانہیں؟

الجواب: اگرکسی کی ملکیت میں خانۂ کعبہ کا غلاف اتنی مقدار میں ہوکہ جس میں سونا بقدرِ نصاب ہے تو اس پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

وسببه أی سبب افتراضها ملک نصاب حولی نسبة للحول لحولانه عليه تام. (الدر المختارمع الشامی:۲/ ۲۵۹، کتاب الزکاة ،سعید).

ہدایہ میں ہے:

وإذاكان الغالب على الورق الفضة فهوفي حكم الفضة وإذاكان الغالب عليها الغش فهو في حكم العروض....لأن الدراهم لاتخلوعن قليل غش لأنها لاتنطبع إلا به وتخلوعن الكثيرفجعلنا الغلبة فاصلة وهوأن يزيد على النصف اعتباراً للحقيقة...إلا أن في غالب الغش لابد من نية التجارة كما في سائرالعروض إلا إذا كانت تخلص منها فضه تبلغ نصاباً

لأنه لايعتبر في عين الفضة القيمة ولا نية التجارة .(الهداية: ۱ /۱۹۵،باب زكاة المال،شركة علمية).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

کپڑوں میں بعض اوقات سونے چاندی وغیرہ کے تار لگے رہتے ہیں پہلے زمانہ میں اس کا رواج اور استعمال کچھ زیادہ ہی تھا... جہاں تک سونے یا چاندی کے چڑھائے ہوئے ایسے پانی کی بات ہے جو الگ نہیں کیا جاسکتا تو اس پر تو بہرحال زکوٰہ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہ تو محض ایک رنگ (colour) ہے سونا اور چاندی ہے ہی نہیں، رہ گئے سونے اور چاندی کے وہ اجزاء جو باقی رہتے ہوئے کسی چیز کے ساتھ لگائے جاتے ہیں ان کو الگ کرنا بھی بہ آسانی ممکن نہیں ہوتا تو احناف کے اصول اور فقہی جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سونے اور چاندی پر مطلقاً زکوٰۃ واجب قرار دیتے ہیں چاہے اس کو خواتین آرائش ہی کے لئے کیوں نہ استعمال کریں، چنانچہ علامہ مسعود کاسانیؒ فرماتے ہیں:

لا يعتبر في هذا النصاب صفة زائدة على كونه فضة فتجب الزكاة فيها سواء كانت دراهم مضروبة أو نقرة أو تبراً أوحلياً مصوغاً أو حلية سيف أو منطقة أو لجام أو سرج أو الكواكب في المصاحف والأواني وغيرها إذا كانت تخلص عند الإذابة إذا بلغت مأتي درهم وسواء كان يمسكها للتجارة أو للنفقة أو للتجمل أو لم ينو شيئاً .(بدائع الصنائع:۲ /۱۶).

علامہ کاسانیؒ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ احناف کے یہاں کپڑوں میں لگے ہوئے سونے چاندی کے اجزاء پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اکثر علماء کی یہی رائے ہے، مولانا تھانویؒ نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔امدادالفتاوی ۲۰۲۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۰۲، گوٹے لچکے کی زکوٰۃ، رحمانیہ دیوبند)۔واللہ ﷻ اعلم۔

سونے چاندی اور زیورات پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم:

سوال: (الف) کیا سونے چاندی کی زکوٰۃ الگ دی جاتی ہے یا اس کے مجموعہ پر زکوٰۃ ہوتی ہے؟

(باء) زیورات کی قیمتیں الگ ہوتی ہیں، لہٰذا مجموعہ پر زکوٰۃ نکالے یا ہر ایک کی الگ زکوٰۃ نکالے؟

الجواب: (الف) اگر سونا بقدرِ نصاب ہے اور چاندی بھی بقدرِ نصاب ہے تو دونوں کی علیحدہ زکوٰۃ ادا کردے یا دونوں کو ملا کر قیمت کے اعتبار سے ادا کردے جس میں فقراء کا فائدہ ہو اس کی قیمت لگادے، اور اگر دونوں بقدرِ نصاب نہ ہو لیکن دونوں کو ملانے سے قیمت دونوں میں سے کسی ایک کے نصاب تک پہنچاتی ہے تو بھی قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہے اور اگر دونوں مل کر بھی نصاب تک نہیں پہنچتے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(باء) صرف سونے چاندی کے زیورات میں زکوۃ واجب ہے اوراس کی تفصیل (الف) کے تحت گزری اس کے مطابق ادا کرے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وهذ االذي ذكرنا كله من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصاباً بأن كان أقل من النصاب فأما إذا كان كل واحد منهما نصاباً تاماً ولم يكن زائداً عليه لا يجب الضم بل ينبغي أن يؤدى من كل واحد منهما زكاته ولو ضم أحدهما إلى الآخر حتى يؤدي كله من الفضة أو من الذهب فلا بأس به عندنا و لكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجاً وإلا فيؤدي من كل واحد منهما ربع عشره. (بدائع الصنائع:۲/ ۲۰،فصل فی مقدارالواجب،سعید وكذا في الشامي:۲/ ۳۰۳،باب زكاة المال،سعيد).

ہدایہ میں ہے:

ويضم الذهب إلى الفضة للمجانسة من حيث الثمنية و من هذا الوجه صار سبباً ثم يضم بالقيمة عند أبي حنيفة و عندهما بالأجزاء. (الهداية:۱/ ۱۹۶).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولو ضم أحد النصابين إلى الآخرحتى يؤدي كله من الذهب أو من الفضة لا بأس به لكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء قدراً و رواجاً و إلا فيؤدي من كل واحد ربع عشره كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۷۹).

ترمذی شریف میں ہے:

عن عمروبن شعيب عن أبيه عن جده، أن امرأتين أتتا رسول الله ﷺ وفي أيديهما سواران من ذهب، فقال لهما: أتؤديان زكاته، فقالتا: لا، فقال لهما رسول الله ﷺ: أتحبان أن يسوركما الله بسوارين من نار، قالتا: لا، قال: فأديا زكاته. (ترمذی شریف:۱/ ۱۳۸، باب ما جاء في زكاة الحلي، فيصل)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

رینڈ کے ساتھ سونا ملا کر وجوبِ زکوۃ کا حکم:

سوال: اگر کسی کے پاس دو رینڈ ہیں اور آدھا اونس سونا ہے اور سونے کی قیمت کو رینڈ کے ساتھ

ملا دینے سے نصاب پورا ہو جاتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں سونے کی قیمت رینڈ کے ساتھ ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر نصاب پورا نہیں ہوتا تو زکوٰۃ واجب نہیں۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

وتضم قيمة العروض إلى الثمنين و الذهب إلى الفضه قيمةً كذا في الكنز حتى لو ملك مائة درهم و خمسة دنانير قيمتها مائة درهم تجب الزكاة عنده......يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء قدراً و رواجاً. (الفتاوى الهندية: ١/١٧٩، في زكاة الذهب و الفضة).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

نقد پانچ روپے زائد از ضرورت اور تین تولہ سونا ہو تو زکوٰۃ اس لئے فرض ہو جاتی ہے کہ نقد رقم چاندی، سونے کے حکم میں ہے اور تین تولہ سونا اور نقد پانچ روپے ملکر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جاتے ہیں اس لئے زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۵/۱۶۶، کتاب الزکوٰۃ).

نوٹ: یہ مسئلہ اس وقت ہے جب کہ چاندی کو معیارِ نصاب بنایا جائے، لیکن اگر سونا معیارِ نصاب ہو تو پھر زکوٰۃ واجب نہیں، جس کی تفصیل عنقریب آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سونے چاندی کی ناک کان وغیرہ پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: کسی نے ضرورت کی وجہ سے سونے چاندی کی ناک کان بنوائے ہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء اس طرح جڑے ہیں کہ بآسانی الگ ہو سکتے ہیں اور نکل سکتے ہیں تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر نکالے نہیں جاسکتے ہیں تو انسان کے عضو کی طرح ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں ہے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن امرأتين أتتا رسول الله ﷺ وفي أيديهما سواران من ذهب، فقال لهما: أتؤديان زكاته، فقالتا: لا، فقال لهما رسول الله ﷺ: أتحبان أن يسوركما الله بسوارين من نار، قالتا: لا، قال: فأديا زكاته. (ترمذی شریف: ١/١٣٨، باب ما جاء في زكاة الحلي)

امدادالفتاوی میں ہے:

سونے کی ناک بنوا کر چہرے پر لگاتے ہیں اور یہ ناک بلا حرج جدا بھی ہوسکتی ہے تو اس ناک میں زکوٰۃ واجب ہے، لیکن دانت میں جو سونا لگایا یا بھرا ہوا ہے وہ اس طرح جدا نہیں ہوسکتا لہذا اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔
(امدادالفتاوی: ۲/ ۴۹، سونے کی بنائی ہوئی ناک یا دانتوں پر زکوٰۃ).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

بعض حالات میں بعض خاص مصلحت کے پیش نظر سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے ناک، دانت، کھوکھلے دانتوں کا سونے چاندی سے بھرنا، سونے کے تاروں سے دانت کو باندھنا وغیرہ ان کا حکم یہ ہے کہ اگر ان کو بآسانی نکالا جاسکتا ہے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیورات میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے، لیکن اگر ان کو آسانی سے نکالا نہیں جاسکتا بلکہ وہ مستقل طور پر لگادئے گئے ہیں اور انسان کے جسم کا ایک ایسا عضو بن جائے جس کو الگ کیا جانا ممکن نہ ہو تو اب وہ انسان کی بنیادی ضروریات میں داخل ہوگیا اور ایسی چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ (ملخص از جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۰۸، سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء پر زکوٰۃ، نعیمیہ).

نیز ملاحظہ فرمائیں: ایضاح المسائل: ۱۰۸، نعیمیہ۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سونے کے ساتھ کچھ چاندی ہو تو زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر سونے کے ساتھ تھوڑی چاندی ملادی جائے تو سونے کا حساب ہوگا یا چاندی کا؟

الجواب: اگر کچھ مقدار سونے کی اور کچھ مقدار چاندی کی ہو تو دونوں کو ملا کر اگر ان کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وتضم قيمة العروض إلى الثمنين والذهب إلى الفضة قيمة كذا في الكنزحتى لو ملك مائة درهم وخمسة دنانير قيمتها مائة درهم تجب الزكاة عنده. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، فصل فی زکاۃ الذھب والفضۃ، وکذافی الھدایۃ: ۱/ ۱۹۶، فصل فی العروض).

ہدایہ میں ہے:

ثم قال: يقومها بما هو أنفع للمساكين احتياطا لحق الفقراء قال وهذا رواية عن

أبي حنيفة . (الهداية : ١/١٩٥ ،فصل في العروض،شركة علمية).

بہشتی زیور میں ہے:

کسی کے پاس نہ تو پوری مقدار سونے کی ہے نہ پوری مقدار چاندی کی بلکہ تھوڑا سونا ہے اور تھوڑی چاندی ہے تو اگر دونوں کی قیمت ملا کر ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو جاوے یا ساڑھے سات تولہ سونے کے برابر ہو جاوے تو زکوٰۃ واجب ہے، اور اگر دونوں چیزیں اتنی تھوڑی ہیں کہ دونوں کی قیمت نہ اتنی چاندی کے برابر ہے نہ اتنے سونے کے برابر تو زکوٰۃ واجب نہیں۔ (بہشتی زیور تیسرا حصہ: ۲۴۰، دارالاشاعت)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

سونے چاندی کے نصاب کی مقدار:

سوال: سونے چاندی کا نصاب کیا ہے؟

الجواب: سونے کا نصاب ۸۷ گرام ۴۸۰ ملی گرام ہے۔

اور چاندی کا نصاب ۶۱۲ گرام ۳۵ ملی گرام ہے۔

کتاب الفتاوی میں ہے:

سونے کا نصاب ۲۰ مثقال سونا ہے، جو ساڑھے سات تولہ اور جدید اوزان میں ۸۷.۴۷۹ گرام ہوتا ہے، چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے جو ساڑھے باون تولہ ہے اور جدید اوزان میں ۶۲۱.۳۵ گرام ہوتا ہے۔ (کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ: ۲۶۱، زکوٰۃ کا نصاب، نعیمیہ۔ واحسن الفتاوی: ۴/۲۵۴).

جواہر الفقہ میں ہے:

سونے کا نصاب شرعی بیس مثقال ہیں مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشہ ہے تو نصاب سونے کا تولہ کے حساب سے ساڑھے سات تولہ ہو گیا۔

چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے اور ایک درہم کا وزن تین ماشہ ایک رتی اور ایک پانچواں حصہ رتی کا ہے، تو حساب نکالنے سے واضح ہو گیا کہ چاندی کا نصاب باون تولہ چھ ماشہ ہے۔ (جواہر الفقہ ''اوزانِ شرعیہ'' ۱/۴۲۳، دارالعلوم کراچی).

ہدایہ میں ہے:

ليس فيما دون مائتي درهم صدقة لقوله عليه السلام : ليس فيما دون خمس أواق صدقة " والأوقية أربعون درهماً،... ليس فيما دون عشرين مثقالاً من ذهب صدقة.

(الهداية: ١/١٩٤ ،فصل في الفضة و الذهب ،شركة علميةو بدائع الصنائع ٢/١٦)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

جدید پیمانہ میں اوزانِ شرعیہ کی مقدار کے احکام:

سوال: صاع، مد، میل، فرسخ، قفیز، وسق، نصابِ ذہب وفضہ، دیت وغیرہ کی مقدار جدید ناپ تول میں کیا ہے؟

الجواب: اوزانِ شرعیہ کی مقدار جدید ناپ تول کے اعتبار سے مندرجۂ ذیل نقشہ میں ملاحظہ فرمائیں:

صاع	۳ء۱۸۴۲۷۲کلوگرام	۸رطل	۴مد	۲۷۳تولہ	۱۰۴۰درہم
مد	۷۹۶ء۰۶۸گرام	۲رطل	ــــــ	۶۸ء۲۵تولہ	۲۶۰درہم
رطل	۳۹۸ء۰۳۴گرام	ــــــ	۱/۲ مد	۳۴ء۱۲۵تولہ	۱۳۰درہم
وسق، ۶۰ صاع	۱۹۱ء۵۶۳۲کلوگرام	۴۸۰رطل	۲۴۰مد	۱۶۳۸۰تولہ	۶۲۴۰۰درہم
تولہ	۱۱ء۶۶۴گرام	ــــــ	ــــــ	ــــــ	۳ء۸۰۹۵درہم
☆قفیز، ۱۲صاع	۳۸ء۲۱۱۲۶۴کلوگرام	۹۶رطل	۴۸مد	۳۲۷۶تولہ	۱۲۴۸۰درہم

☆ حاشية الهداية: ۳/۲٤: وفي بعض كتب اللغة ان القفيز مكيال قدر اثنا عشر صاعاً.

درهم	۳ء۰۶۱۸گرام چاندی	ــــــ	ــــــ	ــــــ
مثقال، دینار	۴ء۳۷۴گرام	ــــــ	ــــــ	ــــــ
نصاب ذهب	۸۷ء۴۸گرام سونا	۲۰دنانیر	۷ء۱/۲تولہ سونا	ــــــ
نصاب فضة	۶۱۲ء۳۵گرام چاندی	۲۰۰دراہم	۵۲۱/۲تولہ چاندی	ــــــ
قیراط	۲۱۸ء۷ملی گرام	ــــــ	ــــــ	ــــــ
اقل مهر	۳۰ء۶۱۸گرام چاندی	۱۰دراہم	۲ء۶۲۵تولہ چاندی	۳۱.۵ماشہ
مهر فاطمی(۱)	۱۵۳۰گرام ۹۰۰ملی گرام	۵۰۰دراہم	۱۳۱ء۲۵تولہ چاندی	ــــــ
دیة	۳۰ء۶۱۸کلوگرام چاندی	۱۰۰۰۰دراہم	۲۶۲۵تولہ چاندی	ــــــ
اوقية	۱۲۲ء۴۷۲گرام	۴۰دراہم	۱۰ء۵تولہ	ــــــ

مذکورہ بالا نقشہ اوزانِ شرعیہ کے حساب سے بنایا گیا ہے، احسن الفتاوی: ۴/۹۳ میں بھی اسی حساب کو ذکر کیا البتہ درہم کے مشہور حساب سے اختلاف کیا ہے لہٰذا احسن الفتاوی کے مطابق نقشہ یہ ہوگا:

درهم	۳۰۴۲ء۳گرام	——	——
دينار	۴۸۶ء۴گرام	——	——
نصاب ذهب	۸۷ء۴۸۰ گرام	۲۰دنانیر	۱/۲ ۷تولہ سونا(۲)
نصاب فضة	۶۱۲ء۳۵ گرام	۲۰۰دراہم	۵۲ء۱/۲تولہ(۳)
قيراط	۲۳۹۴ء۰گرام	——	——
اقل مهر	۳۴ء۰۲ گرام	۱۰دراہم	۲ء۹۱۶تولہ
مهر بنات النبي صلی اللہ علیہ وسلم جومہر فاطمی کے نام سے مشہور ہے(۴)	۱۶۳۲ء۹۶ گرام	۴۸۰دراہم	۱۴۰تولہ
مهر ازواج النبي صلی اللہ علیہ وسلم(۵)	۱۰۷اگرام	۵۰۰دراہم	۱۴۵ء۸۳تولہ
دية	۳۴ء۰۲کلوگرام	۱۰۰۰۰دراہم	۲۹۱۶ء۶۶تولہ
اوقية	۱۳۶ء۰۸گرام	۴۰دراہم	۱۱ء۶۷تولہ

(۱) ہمارے فتویٰ کے مطابق مہر فاطمی ۴۸۰ درہم ہے، جس کی تفصیل کتاب النکاح، باب المہر کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ (۲) اور نمبر (۳) میں مشہور قول کو اختیار کیا ہے احتیاط کی وجہ سے۔

(۴) عن ابن عباس أن النبي ﷺ حين زوج علياً فاطمة، قال: يا علي لا تدخل على أهلك حتى تقدم لهم شيئاً، فقال: مالي شيء يا رسول الله! قال: أعطهادرعک الحطمية، قال ابن أبي رواد: فقومت الدرع أربعمائة وثمانين درهماً. رواه الطبراني في الأوسط و الكبير باختصاره،وفيه سعيد بن زنبور و لم أجد من ترجمه و بقية رجاله ثقات.(مجمع الزوائد:٤/٢٨٣).

(۵) عن أبي سلمة قال: سألت عائشة رضي الله تعالىٰ عنها،كم كان صداق نساء النبي ﷺ؟ قالت: كان صداقه في أزواجه اثنتي عشرة أوقية ونشاً. هل تدري ما النّش؟ هو نصف أوقية، وذلک خمسمائة درهم.(رواه ابن ماجه:١/١٣٥).

گز	۹۱۴۴ء۰سنٹی میٹر	——	——	——
ذراع	۴۸ء۲۷سینٹی میٹر	——	——	——
میل شرعی	۱ء۸۲۸۸۰۰۰کلومیٹر	۲۰۰۰گز	۱ء۱۳۶۳۶۳۶میل انگریزی	——

میل انگریزی	۱٫۶۰۹۳۴۴۰ کلومیٹر	۱۷۶۰ گز	——	۰٫۸۸۰۰ میل شرعی
فرسخ	۵٫۴۸۶۴ کلومیٹر	۶۰۰۰ گز	۳٫۴۰۹۰۹۰۸ میل انگریزی	۳ میل شرعی
مسافت قصر	۷۷٫۲۴۸۵۱۲ کلومیٹر	۸۴۴۸۰ گز	۴۸ میل انگریزی	۴۲٫۲۴ میل شرعی

تقریباً ۷۸ کیلومیٹر۔ اس قول کو اکثر اکابرؒ نے اختیار فرمایا ہے۔

اور ۴۵/میل شرعی: ۸۲.۲۹۶ کلومیٹر۔ ائمہ خوارزم کا مفتیٰ بہ قول ہے، جس کو دیگر حضرات نے اختیار فرمایا ہے، لیکن اس کی تحدید ۷۸ کیلومیٹر کی گئی ہے، جبکہ ۴۵ شرعی میل کو براہِ راست کیلومیٹر بنانے سے اس کی مقدار ۸۲ کیلومیٹر سے کچھ اوپر بنتی ہے۔

اور ۴۸/میل شرعی: ۸۷.۷۸۲۴ کلومیٹر۔ بعض علماء نے اس قول کو اختیار فرمایا ہے۔

استار	۱۹٫۹۱۷ گرام	۱/۱۶۰ صاع	——	——	۱/۴۰ مد	——	۱٫۷۰۶۴۵ تولہ	۱/۲۰ رطل	۶٫۵ دراہم
إردبّ	۷۶٫۴۲۲۵۲۸ کلوگرام	۲۴ صاع	۱۲ فَرَق	۲ قفیز	۹۶ مد	——	۶۵۵۲ تولہ	۱۹۲ رطل	۲۴۹۶۰ دراہم
جَدیب	۱۵۲٫۸۴۵۰۵۶ کلوگرام	۴۸ صاع	۲۴ فَرَق	۴ قفیز	۱۹۲ مد	——	۱۳۱۰۴ تولہ	۳۸۴ رطل	۴۹۹۲۰ دراہم
حِمل	۱۹۱٫۰۵۶۳۲ کلوگرام	۶۰ صاع	۳۰ فَرَق	۵ قفیز	۲۴۰ مد	اوسق	۱۶۳۸۰ تولہ	۴۸۰ رطل	۶۲۴۰۰ دراہم
فَرَق	۶٫۳۶۸۵۴۴ کلوگرام	۲ صاع	——	——	۸ مد	——	۵۴۶ تولہ	۱۶ رطل	۲۰۸۰ دراہم
فَرْق	۲۰۶٫۹۷۷۶۸ کلوگرام	۶۵ صاع	——	——	۲۶۰ مد	——	۱۵۵۴۵ تولہ	۵۲۰ رطل	۶۷۶۰۰ دراہم
قلة	۶٫۳۶۸۵۴۴ کلوگرام	۲ صاع	——	——	۸ مد	——	۵۴۶ تولہ	۱۶ رطل	۲۰۸۰ دراہم
عَرَق	۴۷٫۷۶۴۰۸ کلوگرام	۱۵ صاع	——	——	۶۰ مد	——	۴۰۹۵ تولہ	۱۲۰ رطل	۱۵۲۰۰ دراہم
مکتل	۴۷٫۷۶۴۰۸ کلوگرام	۱۵ صاع	——	——	۶۰ مد	——	۴۰۹۵ تولہ	۱۲۰ رطل	۱۵۲۰۰ دراہم
کُرّ	۲۲۹۲٫۶۷۵۸۴ کلوگرام	۷۲۰ صاع	۳۶۰ فَرَق	۶۰ قفیز	۲۸۸۰ مد	۱۲ اوسق	۱۹۶۵۶۰ تولہ	۵۷۶۰ رطل	۷۴۸۸۰۰ دراہم
کیلجة	۱٫۴۹۲۶۱۲۵ کلوگرام	——	——	——	۱،۷/۸ مد	——	۱۲۷٫۹۶۹ تولہ	۳٫۷۵ رطل	۴۸۷٫۵ دراہم
کوز	۴٫۷۷۶۴۰۸ کلوگرام	۱،۱/۲ صاع	——	——	۶ مد	——	۴۰۹٫۵ تولہ	۱۲ رطل	۱۵۶۰ دراہم
مکوک	۴٫۷۷۶۴۰۸ کلوگرام	۱،۱/۲ صاع	——	——	۶ مد	——	۴۰۹٫۵ تولہ	۱۲ رطل	۱۵۶۰ دراہم

جوزة	۱۷ء۴۹۶ گرام	۴ مثقال	—	—	—
حزمة	۱۷ء۴۹۶ گرام	۴ مثقال	—	—	—
دانق	۰ء۵۱۰۳ گرام	—	۶/۱ درہم	—	—
طسوج	۰ء۱۲۷۵۷۵ گرام	—	—	۴/۱ دانق	—
نش	۶۱ء۲۳۶ گرام	—	۲۰ درہم	—	نصف اوقیہ

برید	۲۱ء۹۴۵۶ کلومیٹر	۲۴۰۰۰ گز	۴ فرسخ	۱۳ء۶۳۶۳۶۳۲ میل انگریزی	۱۲ میل شرعی
حبل	۴۸۷ء۲ سینٹی میٹر	۵۳۲ء۸ گز	۱۰ ذراع	—	—

اس حساب میں "المقاییس والمقادیر عند العرب" للشہیدۃ النسیبہ محمد فتحی الحریری، **کو بنیاد** بنا کر حساب کیا گیا ہے۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

زیور نصاب سے کم ہو مگر قیمت چاندی کے نصاب کے بقدر ہو تو زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک عورت کے پاس صرف سونے کے زیورات ہیں جو نصاب سے کم ہیں مگر چاندی کے نصاب کے برابر ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر عورت کے پاس صرف سونے کے زیورات ہیں اور نصاب سے کم ہیں اور دوسری کوئی نقد رقم یا چاندی وغیرہ کچھ بھی نہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

و أجمعوا على أنه لا تعتبر القيمة في الذهب و الفضه عند الانفراد في حق تكميل النصاب، حتى أنه إذا كان له إبريق فضة وزنه مائة درهم و قيمته لصناعته مائتان، لا تجب فيه الزكاة باعتبار القيمة، وكذلك إذا كانت له آنية ذهب وزنها عشرة وقيمتها لصناعتها مائتا درهم لا تجب فيها الزكاة باعتبار القيمة . (بدائع الصنائع: ۲/۱۹، فصل فی مقدار الواجب، سعید و کذا فی الفتاوی الهندیة: ۱/۱۷۹، فصل فی زکاة الذهب و الفضة)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

سونے اور چاندی کوملانے میں صاحبین کا مذہب:

سوال: سونے اور چاندی کوملانے کے سلسلہ میں صاحبین کا کیا مذہب ہے؟ اور کیا موجودہ حالات میں اس پرفتویٰ دیا جاسکتا ہے یانہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صاحبین کے نزدیک سونے اور چاندی کو باعتبار اجزاء ملایا جائے گا مثلاً کسی شخص کے پاس چاندی کے نصاب کا دوتہائی موجود ہے اور سونے کے نصاب کا ایک تہائی تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر سونا نصاب کے ایک تہائی سے کم ہوتو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وقالا: بالأجزاء فإن كان من هذا ثلا ثة أربا ع نصاب ومن الآخر ربع ضم، أو النصف من كل أو الثلث من أحدهما و الثلثان من الآخر، فيخرج من كل جزء بحسابه. (فتاوی الشامی: ۲/ ۳۰۳، باب زکاۃ المال،سعید۔و بدائع الصنائع: ۲/ ۲۰۔و الهداية: ۱/ ۱۹۵)۔**واللہ ﷻ اعلم**۔(مفیداضافہ ضمیمہ میں دیکھئے)

۱۰/ رینڈ اور ایک چوتھائی اونس پرزکوٰۃ کا حکم:

سوال: آج کل چاندی کا نصاب بہت کم ہے، اگر کسی بالغ لڑکی کے پاس ۱۰ رینڈ اور اونس کا چوتھائی سونے کا زیور ہے تو اس پرزکوٰۃ فرض ہے یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں سونے کی قیمت رینڈ کے ساتھ ملانے سے چاندی کا نصاب پورا ہوجاتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر نصاب پورا نہیں ہوتا تو زکوٰۃ واجب نہیں۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وتضم ...الذهب إلى الفضة قيمة كذا في الكنز حتى لو ملك مائة درهم وخمسة دنانير قيمتها مائة درهم تجب الزكاة عنده. (فتاوی هندية: ۱/ ۱۷۹،فصل فی زکاۃ الذهب والفضة۔و کذافی الهداية:(۱/ ۱۹۶،فصل فی العروض).

ہدایہ میں ہے:

ثم قال: يقومها بما هو أنفع للمساكين احتياطا لحق الفقراء، قال: وهذا رواية عن أبي حنيفة. (الهداية: ۱/ ۱۹۵ ،فصل فی العروض،شرکة علمية،و الشامی: ۲/ ۲۹۹،سعيد).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

نقد پانچ روپے زائد از ضرورت اور تین تولہ سونا ہو تو زکوٰۃ اس لئے فرض ہوجاتی ہے کہ نقد رقم چاندی، سونے کے حکم میں ہے اور تین تولہ سونا اور نقد پانچ روپے ملکر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہوجاتے ہیں اس لئے زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔ (فتاویٰ رحیمیہ:۵/۱۶۶، کتاب الزکوٰۃ).

مزید ملاحظہ ہو: آپ کے مسائل اور ان کا حل:۳/۳۵۴، ۳۵۵، وجدید فقہی مسائل:۶/۱۴۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سونے چاندی کی قیمت کی تبدیلی کے وقت نصاب شمار کرنے کا حکم:

سوال: اس زمانہ میں سونے چاندی کی قیمت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے تو زکوٰۃ کس طرح ادا کرے؟

الجواب: جس دن پیسے کا مالک بن جائے اگر وہ نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے تو اسی دن سے حولانِ حول کا حساب شروع ہوگا، پھر سال ختم ہونے پر اس کی زکوٰۃ ادا کریگا، اور اگر سونے چاندی کا نصاب نہیں بنتا لیکن مالِ تجارت وغیرہ کو ملانے سے چاندی کا نصاب بن جاتا ہے تو چاندی کے نصاب کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کریگا۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ليس فيما دون مائتي درهم صدقة، لقوله عليه السلام:" ليس فيما دون خمس أواق صدقة " والأوقية أربعون درهماً، فإذا كانت مائتين وحال عليها الحول ففيها خمسة دراهم، لأنه عليه السلام كتب إلى معاذ ﷺ أن خذ من كل مائتي درهم خمسة دراهم ومن كل عشرين مثقالاً من ذهب نصف مثقال. (الهداية:١/١٩٤،باب زكاة المال).

درمختار میں ہے:

و سببه ملک نصاب حولي تام، وفي الشامي:(قوله نصاب) هو ما نصبه الشارع علامة على وجوب الزكاة من المقادير المبينة في الأبواب الآتية، و هذا شرط في غير زكاة الزرع و الثمار....قوله نسبة للحول لحولانه عليه أي دون حولان الحول على النصاب شرط لكونه سبباً وهذا علة للنسبة. (الدر المختار مع الشامي: ٢/٢٥٩،سعيد).

کتاب الفتاوی میں ہے:

زکوٰۃ میں حساب اس تاریخ کے لحاظ سے کیا جاتا ہے جس تاریخ کو وہ پہلی بار نصابِ زکوٰۃ کا مالک بنا ہے، اس وقت جو رقم کسی کے پاس محفوظ ہو یا سونا چاندی، شیئرز، سامانِ تجارت یا قرض جس کی وصولی متوقع ہو، موجود ہو، ان کا حساب کیا جائے اور ہر ہزار پر ۲۵ روپے کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کی جائے، اس میں نہ آمدنی ملحوظ ہے اور

نہ بجٹ، بلکہ اس تاریخ کو اموالِ زکوٰۃ میں سے جو کچھ اس کے پاس موجود ہو اس سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔
(کتاب الفتاوی تیسرا حصہ ص ۲۶۵، نعیمیہ)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

شوہر کے پاس کچھ نہ ہو لیکن بیوی کے پاس زیورات ہوں تو زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر شوہر کی کوئی تنخواہ نہ ہو لیکن بیوی کے پاس زیورات ہوں تو کیا زکوٰۃ لازم ہوگی؟ اور نکالنے کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر چہ شوہر کی کوئی تنخواہ یا آمدنی نہ ہو پھر بھی بیوی پر زکوٰۃ لازم ہوگی اس لئے کہ وہ زیورات کی مالکہ ہے بشرطیکہ زیورات نصاب تک پہنچتے ہوں۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں ہے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن امرأتين أتتا رسول الله ﷺ وفي أيديهما سواران من ذهب، فقال لهما: أتؤديان زكاته، فقالتا: لا، فقال لهما رسول الله ﷺ: أتحبان أن يسور كما الله بسوارين من نار، قالتا: لا، قال: فأديا زكاته. (ترمذی شریف: ۱/۱۳۸، باب ما جاء في زكاة الحلي، فيصل).

ہدایہ میں ہے:

الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا بلغ نصاباً ملكاً تامّاً و حال عليه الحول. (الهداية: ۱/۱۸۵).

کفایت المفتی میں ہے:

عورت اپنے زیور اور جہیز کی مالک ہوتی ہے اور اسی کے ذمہ اس کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور چونکہ اس کے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے روپیہ نہیں ہوتا اس لئے خاوند سے لے کر ادا کرتی ہے یا اس کے امر و اجازت سے خاوند ادا کر دیتا ہے، اگر خاوند ادا نہ کرے نہ روپیہ دے تو عورت پر واجب ہوگا کہ وہ اپنا سامان بیچ کر ادا کرے کیونکہ واجب اس کے ذمہ ہے۔ (کفایت المفتی: ۴/۲۶۶، کتاب الزکاۃ پہلا باب، دارالاشاعت).

کتاب الفتاوی میں ہے:

قرآن و حدیث میں سونے اور چاندی پر مطلقاً زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے (سورۂ توبہ) بلکہ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صراحۃً ان زیورات کے بارے میں بھی زکوٰۃ کی تلقین کرنا ثابت ہے جن کو صحابیات

(رضی اللہ تعالی عنہن) پہنی ہوتی تھیں (ترمذی)،اس لئے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سونے اور چاندی پر ہر صورت میں زکوۃ واجب ہے،خواہ وہ زیورات کی شکل میں ہوں یا نہ ہوں اور خواہ زیورات زیر استعمال ہوں یا نہ ہوں۔(کتاب الفتاوی:تیسرا حصہ ص:۲۸۰)۔واللہ ﷻ اعلم۔

مرہونہ زیورات پر زکوۃ کا حکم:

سوال: رہن پر رکھے ہوئے زیورات کی زکوۃ کس پر واجب ہے؟ راہن پر یا مرتہن پر؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زیورات کا مالک راہن ہے مرتہن کے پاس فقط بطورِ امانت ہے لہذا راہن پر زکوۃ لازم ہوگی۔

اور وجوبِ زکوۃ کی تفصیل حسبِ ذیل درج ہے:

(۱) اگر قرضہ ۵۰ ہزار ہے اور زیورات کی قیمت ۷۰ ہزار ہے تو ۵۰ ہزار قرضہ منہا کرنے کے بعد صرف ۲۰ ہزار پر زکوۃ واجب ہوگی۔

(۲) ۵۰ ہزار قرضہ ہے اور قیمت ۵۲ ہزار ہے تو دو ہزار نصاب سے کم ہے اس لیے زکوۃ واجب نہیں، ہاں دوسری نقد رقم وغیرہ ملانے سے بقدرِ نصاب ہو جائے تو زکوۃ واجب ہوگی۔

(۳) زیورات کی قیمت قرضہ سے کم ہے تو زکوۃ واجب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

قلت: لكن أرجع شيخ مشايخنا السائحاني في قول الشارح "بعد قبضه" إلى المرتهن كما رأيته بخطه في هامش نسخته، ويؤيده أن عبارة البحر هكذا: ومن موانع وجوب الرهن إذا كان في يد المرتهن بعدم ملك اليد، وليس فيها ما يدل على أنه لايزكيه بعد الاسترداد. (الشامي: ۲/۲۶۳، سعيد).

علامہ شامیؒ نے علامہ سائحانیؒ کی عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ واپسی کے بعد راہن پر زکوۃ واجب نہیں۔(یعنی راہن کے پاس واپسی کے بعد زکوۃ لازم ہونی چاہئے)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولا على الراهن إذا كان الرهن في يد المرتهن، هكذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۲).

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک شئی مرہون مرتہن کے قبضہ میں ہے زکوٰۃ واجب نہیں لیکن راہن کے پاس آنے کے بعد لازم ہونی چاہئے۔

فتاوی فریدیہ میں ہے:

رہن رکھے ہوئے زیور میں زکوٰۃ:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بیوی کا زیور تقریباً بیس تولہ سونے کا ہے میں نے قرضہ چکانے کے لیے وہ زیور بیوی سے لیکر نیشنل بینک میں رہن رکھا ہوا ہے تقریباً دوسال کا عرصہ گزر چکا ہے کہ میں نے تین ہزار روپیہ قرضہ اس زیور کی کفالت پر لیا ہوا ہے کیا ایسا زیور جو کہ اپنے قبضہ میں بھی نہ ہو اور زیر بار بھی ہو اس زیور پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: آپ ہر سال اس زیور کی قیمت سے مقدارِ قرضہ خواہ بینک سے لیا ہو یا اور کسی سے لیا ہو تفریق کر کے باقی زیور سے زکوٰۃ فی الحال ادا کریں گے بشرطیکہ مقدار نصاب سے کم نہ ہوا ہو۔ (فتاوی فریدیہ: ۳/۴۱۹).

خلاصہ یہ ہے کہ اگر زید نے عمر کے پاس ۱۰ تولہ سونا بطورِ رہن رکھا اور زید پر عمر کا دین ۲ تولہ سونے کی قیمت کی مقدار میں ہے تو زید پر لازم ہے کہ ۸ تولے سونے کی زکوٰۃ ادا کرے کیونکہ یہ زائد ۸ تولے سونا عمر کے پاس زید کی امانت کے مانند ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

۹/ کیریٹ سونے پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت کے پاس ۹/ کیرٹ سونے کے زیورات ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ کیونکہ سونا مغلوب ہے اور دوسری دھات غالب ہے۔

الجواب: متون اور عام کتبِ فقہ کی روشنی میں جب دوسری دھات غالب ہو تو زکوٰۃ لازم نہیں ہے، البتہ احتیاطاً زکوٰۃ ادا کردینا بہتر ہے۔ لیکن اگر گلانے سے دوسری دھاتیں بآسانی الگ ہوسکتی ہیں تو پھر سونے میں زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اور آسان صورت یہ ہے کہ سنوار کے پاس لیجاوے جو قیمت وہ بتلادے اس کا چالیسواں حصہ دیدے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

فإن غلب الغش فليس كالفضة كالستوقة فينظر إن كانت رائجة أو نوى التجارة اعتبرت قيمتها فإن بلغت نصاباً من أدنى الدراهم التي تجب فيها الزكاة و هي التي غلبت

فضتها وجبت فيها الزكاة و إلا فلا، و إن لم تكن أثماناً رائجة و لا منوية للتجارة فلا زكاة فيها، إلا أن يكون ما فيها من الفضة يبلغ مائتي درهم بأن كانت كثيرة ويتخلص من الغش، لأن الصفر لا تجب الزكاة فيها إلا بنية التجارة، و الفضة لا يشترط فيها نية التجارة، فإن كان ما فيها لا يتخلص فلا شيء عليه، لأن الفضة فيه قد هلكت، كذا في كثير من الكتب، وفي غاية البيان: الظاهر أن خلوص الفضّة من الدراهم ليس بشرط بل المعتبر أن تكون في الدراهم فضة بقدر النصاب. (البحر الرائق:۲/۲۲۸،باب زكاة المال،كوئته).

بہشتی زیور میں لکھا ہے:

سونا چاندی اگر کھرا نہ ہو بلکہ اس میں کچھ میل ہو مثلاً چاندی میں رانگا ملا ہوا ہے تو دیکھو چاندی زیادہ ہے یا رانگا زیادہ ہے اگر چاندی زیادہ ہے تو اس کا وہی حکم ہے جو چاندی کا حکم ہے یعنی اگر اتنی مقدار ہو جو اوپر بیان ہوئی تو زکوۃ واجب ہے اور اگر رانگا زیادہ ہے تو اس کو چاندی نہ سمجھیں گے پس جو حکم پیتل، تانبے، لوہے، رانگے وغیرہ اسباب کا آگے آویگا وہی اس کا حکم ہے۔ (بہشتی زیور، زکوۃ کا بیان، تیسرا حصہ:۲۳۹، مسئلہ نمبر ۷)۔

عطر ہدایہ میں مرقوم ہے کہ سونا چاندی بآسانی الگ ہو سکتے ہیں۔ عبارت ملاحظہ کیجئے:

سناروں، سادہ کاروں، نیاریوں بلکہ غیر کاریگروں تک کے مشاہدات وتجارب سے یہ امر ثابت ومشہور ومعروف ہے کہ نئے روپیوں کو پگھلانے اور دوسری تدبیر عرفیہ وحیل اکسریہ کے عمل میں لانے سے ان کی چاندی میں جو میل گلٹ کا ہے اس سے یہ بالکل علیحدہ وجدا ہو جاتی ہے....بہت سی کتبِ فقہیہ میں ان روپیوں کے مثل (دراہم غالبۃ الغش) سے ان کی چاندی کا علیحدہ ہو سکنا اور اس چاندی میں احکامِ زکوۃ وربوا وصرف کا اعتبار کیا جانا بضمن مسائل متعددہ مصرح ہے، ہاں حسبِ تصریح شیخ ابن ہمام واقتضاء قواعد جن دراہم غالبۃ الغش میں ملمع کی طرح چاندی نہایت ہی قلیل ہونے سے جدا نہ ہوتی ہو، مل جاتی ہو اس کا بیشک اعتبار نہیں کیا جائیگا اور کتبِ شافعیہ میں تو بھاری ملمع میں بھی جو چاندی ہوتی ہے اس کا بھی علیحدہ ہو سکنے کی وجہ سے اعتبار کیا جانا مذکور ہے اور اس پر قواعد حنفیہ کے شاہد ہونے سے بعض مشائخ حنفیہ نے بھی ہلکے اور بھاری ملمع میں فرق کر کے فرمایا ہے کہ چاندی یا سونے کا ملمع اتنا زیادہ ہو کہ علیحدہ ہو سکے تو اس کا بھی اعتبار کرنا واجب ہے، چنانچہ ردالمحتار (ص۳۲۹) میں ہے:

ونقل الخير الرملي نحوه من المحيط ثم قال: وأقول: يجب تقليد المسئلة بما إذا لم تكثر الفضة أو الذهب المموه أما إذا كثر بحيث يحصل منه شيء يدخل في الميزان

بالعرض على النار يجب حينئذٍ اعتباره ولم أره لأصحابنا لكن رأيته للشافعية وقواعدنا شاهدة به فتأمل .

بہرحال ہلکے اور بھاری ملمع اوران کے مانند دراہم مغشوشہ میں فرق کیا جائے یا نہ اکثر دراہم غالبۃ الغش کہ جن میں مثل نئے روپیوں کے بھاری ملمع سے بھی زیادہ چاندی ہے ان سے خالص چاندی کا علیحدہ ہوسکنا اوران میں جو چاندی ہے اس کا اعتبار کیا جانا منصوص ہے کوئی روایت بھی اس کے خلاف نہیں ہے اور منصوص ہوتا تب بھی جبکہ مدار اعتبار علیحدہ ہوسکنے پر ہے (علیحدہ ہوسکنے سے گوحالاً اس چاندی سے منتفع نہ ہوسکیں لیکن آئندہ تو جب چاہیں پگھلا کے منتفع ہوسکتے ہیں جوکہ حسب تصریح فتح القدیر (۵۲۳/۱)" **وإن لم يخلص فلا شيء عليه لأن الفضة هلكت فيه إذا لم ينتفع بها لا حالاً ولا مآلاً فبقي العبرة للغش أصل مناط"** عبرۃ نقدین ہے اورعلیحدہ ہوسکنا مشاہدات اورتجارب سے ثابت اورمشہور ومعروف ہے۔ (عطر ہدایہ، جدید ص:۳۵۴۔۳۵۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

پلاٹینم (platinum) اور ٹائیٹانیم (titanium) میں زکوٰۃ کا حکم:

سوال: کیا پلاٹینم (platinum) اور ٹائیٹانیم (titanium) میں زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں جبکہ تجارت کے لئے نہ ہوں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں تجارت کی نیت نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو الدرالمختار میں ہے:

(وشرطه) أي شرط افتراض أدائها...(وثمنية المال كالدراهم والدنانير) لتعينها للتجارة بأصل الخلقة، فتلزم الزكاة كيفما أمسكهما ولو للنفقة،(أو السوم)بقيدها الآتي(أو نية التجارة) في العروض إما صريحاً و لا بد من مقارنتها لعقد التجارة كما سيجيء أو دلالة بأن يشتري عيناً بعرض التجارة. (الدر المختار:۲/۲٦۷،سعید).

ہدایہ میں ہے:

فصل في العروض: الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت... و لأنها معدة للاستنماء بإعداد العرب، فأشبه المعدّ بإعداد الشرع، و تشترط نية التجارة ليثبت الإعداد. (الهداية:۱/۱۹۵).

فتح القدیر میں ہے:

فصل في العروض : العروض جمع عرض بفتحتين حطام الدنيا، كذا في المغرب والصحاح، و العرض بسكون الراء المتاع و كل شيء فهو عرض سوى الدراهم و الدنانير ... قوله و تشترط نية التجارة لأنه لما لم تكن للتجارة خلقة فلا يصير لها إلا بقصدها فيه وذلک هو نية التجارة. (شرح فتح القدیر: ۲/۲۱۷، دار الفکر).

نورالایضاح میں ہے:

و لازكاة في الجواهرواللآلي إلا أن يتملكها بنية التجارة كسائر العروض. (نورالایضاح: ۱۶۰)

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

(و لا زكاة في الجواهر واللآلي)قال في الدرر: الأصل أن ماعدا الحجرين و السوائم إنما يزكي بنية التجارة عند العقد، فلو نوى التجارة بعد العقد أو اشترى شيئاً للقنية ناوياً أنه إن وجد ربحاً باعه، لا زكاة فيه. (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ۳۹۱)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

ہیرے جواہرات میں وجوبِ زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر میں کوئی ہیرایا جوہراس نیت سے خریدتا ہوں کہ جب مجھے حاجت ہوگی تو میں اس کو بیچ کر حاجت پوری کرلوں گا، کیونکہ پیسہ اور کرنسی کا اعتبار نہیں اور ہیرے جواہر کی قیمت کافی ہوتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ہیرے، جواہرات چونکہ بغرضِ تجارت نہیں خریدے گئے، بلکہ حاجت اورضرورت پوری کرنے کے لئے خریدے گئے ہیں، لہذا زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہودرمختار میں ہے:

لا زكاة في اللآلي و الجواهر كاللؤلؤ و الياقوت و الزمرد وأمثالها، درر عن الكافي، و إن ساوت ألفاً اتفاقاً، فى نسخة ألوفاً، إلا أن تكون للتجارة، والأصل أن ما عدا الحجرين (أي الذهب والفضة) إنما يزكي بنيه التجارة ... و شرط مقارنتها لعقد التجارة و هو كسب المال بالمال بعقد شراء أو إجارة أو استقراض و لو نوى التجارة بعد العقد أو اشترى شيئاً

للقنية ناوياً أنه إن وجد ربحاً باعه، لا زكاة عليه. (الدر المختار مع الشامي:۲/۲۷۳،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

و كذا لا (زكاة في) الجوهر اللؤلؤ و الياقوت و البلخش و الزمرد و نحوها إذا لم يكن للتجارة. (الفتاوى الهندية:۱/۱۷۲ ،كتاب الزكاة).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

شریعت نے اصولی طور پر معدنیات میں سوائے سونے اور چاندی کے کسی اور چیز میں زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے۔اس اصول کے مطابق ہیرے جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے،سوائے اس کے کہ اسے تجارتی مقصد کے لئے خریدا گیا ہو۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۰۷،نعیمیہ).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

فقہاء نے اس کی صراحت فرمائی ہے کہ نقدین اور سوائم کے علاوہ عروض وغیرہ میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جبکہ مالِ تجارت ہو۔بلکہ فقہاء احناف نے تو یہ تصریح فرمائی ہے کہ ہیرے جواہرات اگر تجارت کے لئے نہ ہوں تو خواہ وہ ہزاروں روپے کے کیوں نہ ہوں اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی ،اس لئے مذکورہ صورت میں بھی احناف کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی ،خواہ وہ ہیرے جواہرات تمول کے لئے محفوظ کئے گئے ہوں یا زینت وآرائش کے لئے ،اور اگر اپنے سرمایہ کو ہیرے جواہرات کی شکل میں زکوٰۃ سے بچنے کے علاوہ کسی اور مقصد سے محفوظ کیا جائے تو عنداللہ بھی ایسے شخص سے محاسبہ نہیں ہوگا۔(جدید فقہی مباحث:۷/۵۰۴،و۶/۸۹)۔واللہ ﷻ اعلم۔

(مفید اضافہ ضمیمہ میں دیکھئے)۔

دورِ جدید میں ثمنِ عرفی کے لئے معیارِ نصاب کا حکم:

ثمنِ عرفی کی زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے عام طور پر فقہاء نصابِ چاندی کو معیار قرار دیتے ہیں لیکن دورِ جدید میں سونے چاندی کے مابین بڑا تفاوت پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے سونا اعلیٰ پیمانہ پر رہ گیا اور چاندی بے حیثیت سمجھی جانے لگی ،اور شریعت کا منشا یہ ہے کہ زکوٰۃ غنی یعنی مالدار پر فرض ہو اور اگر چاندی کو معیارِ نصاب رکھے تو ہر شخص پر جو کچھ سونا اور کچھ روپے کا مالک ہو زکوٰۃ فرض ہو جائے گی ،حالانکہ خود اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے نقد پیسے نہیں ،خود ضرورت مند ہے،معاملہ برعکس ہو جاتا ہے اس وجہ سے وجوبِ زکوٰۃ کے لئے معیارِ نصاب سونا ہونا چاہئے۔

ملاحظہ ہو ’’الفقہ الحنفی وادلتہ‘‘ میں ہے:

والذي يظهر لي أن تقدير النصاب بالذهب أولىٰ من تقديره بالفضة مع ارتفاع تكاليف المعيشة ونزول قيمة الفضة نزولاً ملحوظاً، فقل أن تجد من لا يملک نصاباً من الفضة، وإذا كان الأمر كذاک، فلن تجد فقيراً تؤدي إليه الزكاة ، فالأنفع للفقراء والأغنياء اعتبار نصاب الذهب، والله أعلم. (الفقه الحنفي وادلته: ۱/۳۵۲زكاة الأوراق المالية،بيروت).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

موجودہ دور میں جبکہ سونے اور چاندی کے نرخ میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے تو حرمتِ زکوٰۃ وایجابِ زکوٰۃ کا نصاب چاندی کے نصاب سے مقرر کیا جانا چاہیئے یا سونے کے نصاب سے؟

علامہ یوسف القرضاوی نے لکھا ہے کہ اکثر معاصرین علماء کی رائے یہ ہے کہ چاندی کے نصاب کو اصل قرار دے کر اسی سے نصاب کا تعین کیا جائے۔

اس کے برخلاف بعض دیگر علماء جیسے شیخ ابو زہرہ، شیخ خلاف اور شیخ حسن نے سونے کے نصاب کو اصل قرار دینے کی تجویز کی ہے، علامہ یوسف القرضاوی نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے، اس لئے کہ اموالِ زکوٰۃ کو اگر موازنہ کر کے دیکھا جائے کہ پانچ اونٹوں پر زکوٰۃ ہے، چالیس بکریوں پر زکوٰۃ ہے، پانچ وسق کھجور یا کشمش پر زکوٰۃ ہے، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس عہد میں زکوٰۃ کے تمام نصابوں سے قریب سونا ہے چاندی نہیں۔

اس لئے مناسب یہی ہے کہ نصابِ زکوٰۃ کے لئے سونے کو اصل قرار دیا جائے، اس میں اگر چہ پہلے قول کے برعکس فقراء اور مستحقین کے حق میں نسبتاً فائدہ کم ہے، مگر عام افراد جن کے ذمہ زکوٰۃ ہے ان کے حق میں سہولت ہے، اس کے علاوہ موجودہ دور میں چاندی کے نصاب کے اعتبار سے بہت ہی کم مقدار مال پر زکوٰۃ عائد ہوگی جو اسلامی عدل وانصاف کے تقاضے کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ (جدید فقہی مباحث: ۷/۶۵۵، ادارۃ القرآن).

نیز اس مسئلہ سے متعلق ماہنامہ ''الحق'' دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں مفتی مختار اللہ حقانی صاحب کا تفصیلی مضمون چھپا ہے جو پانچ قسطوں پر مشتمل ہے، اس مضمون کا خلاصہ مندرجۂ ذیل ہے:

دورِ نبوی میں دراہم اور دنانیر کا حساب قیمت کے اعتبار سے مساوی تھا اس لئے فقہاءِ کرام نے اموالِ تجارت میں صاحبِ مال کو اختیار دیا کہ وہ اموالِ تجارت میں زکوۃ کی ادائے گی کے لئے سونا چاندی میں سے جس کے ساتھ چاہئے قیمت لگائے جب اس کی قیمت دونوں نصابوں میں سے کسی ایک کے مطابق ہو جائے تو ان اموال میں زکوٰۃ واجب ہے مگر موجودہ دور میں چاندی اور سونے کی قیمت کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ موجودہ دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اموالِ تجارت کے اس نصاب کی

قیمت کا اعتبار کیا جائے جس میں مالکان کو ضرر یا مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

چنانچہ سونا دورِ اول سے لے کر آج تک اپنے مقام پر برقرار رہا ہے اس کی قیمت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا تو اصولی طور پر کسی چیز کے لئے بنیاد بھی وہی نقد ہونی چاہئے جو اپنی جگہ پر برقرار رہی ہو اس لئے اموالِ تجارت میں وجوبِ زکوٰۃ کے لئے سونے کے نصاب کو معیار قرار دیا جائے اور مناسب بھی یہی ہے، اس لئے کہ بین الاقوامی سطح پر سونا ہی ایک ایسی دھات ہے جو اشیاء کے تعین کے کام آتی ہے اور اسی سے مبادلہ ہوتا ہے چاندی کی طرف کوئی دیکھتا ہی نہیں اور نہ اس میں آج کل صلاحیت ہے۔

اس لئے موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض محققین علماء نے سونے کو اموالِ تجارت اور موجودہ کرنسی کے لئے معیارِ نصاب قرار دیا ہے، جن میں امام ابوزہرہؒ، شیخ وھبہ زحیلی، شیخ یوسف قرضاوی، شیخ الازھر شیخ جاد الحق علی جاد الحق، ڈاکٹر حمید اللہ، پروفیسر محفوظ احمد صاحب، مولانا محمد شعیب مفتاحی، ڈاکٹر علی جمعہ الاستاذ بجامعۃ الازھر، شیخ خلاف اور شیخ حسن وغیرہ حضرات شامل ہیں۔

سونے کو معیارِ نصاب قرار دینے والوں کے چند دلائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) علامہ یوسف قرضاوی ''فقہ الزکوٰۃ'' میں فرماتے ہیں:

إن الفضه تغيرت قيمتها بعد عصر النبي ﷺ و من بعده و ذلك لاختلاف قيمتها باختلاف العصور كسائر الأشياء، و أما الذهب فاستمرت قيمته ثابتة إلى حد بعيد ولم تختلف قيمة النقود الذهبية باختلاف الأزمنة، لأنها وحدة التقدير في كل العصور، و هذا ما اختاره الأساتذة : أبو زهرة و خلاف و حسن في بحثهم عن الزكاة، و يبدو لي أن هذا القول سليم الوجهة قوي الحجة. (فقه الزكاة: ١/٢٦٤).

(۲) علامہ قرضاوی نے دوسری دلیل یہ بیان کی ہے:

فبالمقارنة بين الأنصبة المذكورة في أموال الزكاة كخمس من الإبل، أو أربعين من الغنم، أو خمسة أوسق من الزبيب أو التمر، نجد أن الذي يقاربها في عصرنا هو نصاب الذهب لا نصاب الفضة. إن خمس إبل أو أربعين شاة تساوي قيمتها نحو أربع مائة دينار أو جنيه، أو أكثر، فكيف يعد الشارع من يملك أربعاً من الإبل أو تسعاً وثلاثين من الغنم فقيراً، ثم يوجب الزكاة على من يملك نقداً لا يشترى به شاة واحدة ؟ و كيف يعتبر من يملك هذا القدر الضئيل من المال غنياً ؟ (فقه الزكاة: ١/٢٦٤).

(۳) علامہ قرضاوی تیسری دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال العلامة ولي الله الدهلوي في كتابه القيم (حجة الله البالغة:۲/۵۰۶): **" إنما قدر (النصاب) بخمس أواق (من الفضة) لأنها مقدار يكفي أقل أهل بيت سنة كاملة، إذ كانت الأسعار موافقة في أكثر الأقطار واستقرئ عادات البلاد المعتدلة في الرخص والغلاء تجد ذلك". فهل نجد الآن في أي بلد من بلاد الإسلام أن خمسين أو نحوها من الريالات المصرية أو السعودية أو القطرية أو الروبيات الباكستانية أو الهندية و نحوها ـ تكفي لمعيشة أسرة ـ سنة كاملة ، أو شهراً واحداً، أو حتى أسبوعاً واحداً ؟ إنها في بعض البلا د التي ارتفع فيها مستوى المعيشة كبلاد النفط (البترول)لا تكفي بعض الأسر المتوسطة لنفقات يوم واحد فكيف يعد من ملكها غنياً في نظر الشرع الحكيم؟ هذا بعيد غاية البعد. ولهذا كان الأولى أن نقتصر على تقدير النصاب في عصرنا بالذهب وإذا كان التقدير بالفضة أنفع للفقراء والمستحقين، فهو إجحاف بأرباب الأموال وأرباب الأموال في الزكاة ليسوا هم الرأسماليين وكبار الموسرين ، بل هم جمهور الأمة.** (فقه الزكاة: ۲/۲۶۵).

(۴) دورِ حاضر کے محقق علامہ وھبہ الزحیلی فرماتے ہیں:

ويقدر نصابها كما بينا بسعرصرف نصاب الذهب المقررشرعاً وهوعشرون ديناراً أومثقالاً.... والأصح تقدير النصاب الورقي بالذهب لأنه المعادل لنصاب الأنعام (الإبل والبقر والغنم) ولارتفاع مستوى المعيشة وغلاء الحاجيات. (الفقه الاسلامی وادلته:۲/۷۷۳، زكاة الاوراق النقدية،دارالفكر).

(۵) ڈاکٹر علی جمعہ الاستاذ بالجامعۃ الازہر فرماتے ہیں:

والرأي في ذلك عندي أن الله قد خلق في الذهب خصائص ثمن لا توجد في غيره، وأنه ثابت النسبة بينه وبين باقي السلع والعروض غالباً إلى يومنا هذا، وأن الله قد بدأ به في كتابه فهو يصلح دائماً معياراً للتقويم . (جدید فقہی مباحث:۷/۶۷۵).

(۶) شیخ الازہر شیخ جاد الحق علی جاد الحق کا رجحان:

النصاب الشرعي للمال النقدي الذي تجب فيه الزكاة بعد استفاء باقي الشروط هو ما تقابل قيمته بالنقود الحالية قيمة "۸۵" جراماً من الذهب. (الأزهرمن فتاوى فضيلة الإمام:ص۶۷).

(۷) مولانا محمد شعیب مفتاحی فرماتے ہیں:

مناسب یہی ہے کہ نصابِ زکوٰۃ کے لئے سونے کو اصل قرار دیا جائے، اس میں اگر چہ پہلے قول کے برعکس فقراء اور مستحقین کے حق میں نسبتاً فائدہ کم ہے، مگر عام افراد جن کے ذمہ زکوٰۃ ہے ان کے حق میں سہولت ہے، اس کے علاوہ موجودہ دور میں چاندی کے نصاب کے اعتبار سے بہت ہی کم مقدار مال پر زکوٰۃ عائد ہوگی جو اسلامی عدل وانصاف کے تقاضے کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ (جدید فقہی مباحث: ۷/۶۵۵، ادارۃ القرآن).

(۸) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں:

دوسری رائے پر سونا معیار ہوگا، پھر سکوں کے لئے آج سونا ہی معیار ہے اور چاندی کا قوتِ زر سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ (اسلام کا نظام عشر وزکوٰۃ، مال تجارت کا نصاب، ص ۷۳، حیدر آباد).

(۹) علماء عرب کی ایک بڑی جماعت کا بھی یہی فیصلہ ہے:

ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث میں ہے:

دورِ جدید کے بعض اہل علم خصوصاً عرب علماء کا رجحان یہ ہے کہ اموالِ تجارت اور کاغذی نقود کی تقویم میں سونے کے نصاب کو معیار بنایا جائے اور اسی کے ذریعہ مالیت کی تعیین کی جائے۔

قد قرر مؤتمر علماء المسلمين الثاني ومؤتمر البحوث الإسلامية الثاني عام ۱۳۸۵ھـ/۱۹۶۵م في شأن الزكاة ... وأن يكون تقويم نصاب الزكاة في نقود التعامل المعدنية والأوراق النقدية وعروض التجارة على أساس قيمتها ذهباً. تعليق الدكتور مصطفى كمال وصفي على الشرح الصغير: ۱/۵۸٦۔ (جدید فقہی مباحث: ۷/۸۱۰، تقویم عروض، ادارۃ القرآن).

(۱۰) شریعت نے زکوٰۃ مالدار لوگوں پر فرض کی ہے (بخاری ۱/۱۹۳) اگر چاندی کو معیار قرار دیا جائے تو زکوۃ بجائے مالدار کے فقراء کے کندھوں پر آ جائے گی، کیونکہ آج کل تقریباً ہر گھر میں ایک آدھ تولہ سونے کے زیورات ضرور ہوتے ہیں اور کچھ نہ کچھ نقدی روپے بھی ہر آدمی کے پاس ہوتے ہیں دونوں کو ملا کر چاندی کے نصاب کو پہنچ جائیں گے تو قربانی وصدقۂ فطر واجب ہوگا، نیز حولان حول کے بعد زکوۃ بھی واجب ہوگی، جب کہ اس آدمی کی حالت یہ ہے کہ وہ صاحب اہل وعیال ہے اور خود زکوۃ کا مستحق ہے تو اس پر زکوۃ لازم کرنا یسر نہیں بلکہ عسر ہے۔

نیز اگر سونا نہ بھی ہو لیکن ایسی بعض اشیاء موجود ہوں جو حوائج اصلیہ سے زائد ہوں اور حساب سے چاندی کی قیمت کے نصاب کو پہنچ جائے تو یہ شخص اغنیاء میں داخل ہو جائے گا جس کی وجہ سے زکوۃ لینا جائز نہ ہوگا جبکہ حالات زکوۃ لینے کے متقاضی ہیں۔

(۱۱)ان دلائل کے پیشِ نظر اور ضرورت کے تحت اسلامی ملک کویت نے بھی مروجہ کرنسی کے لئے معیارِ نصاب سونا قرار دیا ہے اور اس کو قانونی شکل دی ہے، چنانچہ وزارت الاوقاف والشئون الاسلامیہ سے جاری شدہ رسالے میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

إذا بلغ ما يملكه المسلم منها ما قيمته عشرون مثقالاً من الذهب فنحسب البنكنوت على أساس نصاب الذهب لأن لها مقابلاً ذهبياً في بنك الدولة هو ما يسميه الاقتصاديون بالغطاء الذهبي....وعلى هذا يجب أن يراعي كل إنسان القيمة السائدة للذهب في بلده وقت إخراج الزكاة . (بحوالہ منہاج:ص۱۰، ۱۹۹۶ء اپریل تا جون)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ماہنامہ ''الحق'' (اگست ۲۰۰۲ء ۔جنوری فروری ۲۰۰۳ء)۔واللہ ﷻ اعلم۔

فصل دوم

نقد رقم، قرضے اور اثاثے وغیرہ پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم

طلباء کے پیسوں میں زکوٰۃ کا حکم:

سوال: والدین بچوں کو خرچے کی جو رقم دیتے ہیں، کیا اس رقم پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی طالبِ علم اپنے اخراجات کی ادائے گی کے لئے تجارت کرے تو اس مال پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر رقم نصاب کے بقدر ہے اور پورا سال بالغ طالبِ علم کے قبضہ میں ہے تو زکوٰۃ لازم ہے ورنہ نہیں، نیز اخراجات کے بعد جو مال بچ جائے اور بقدرِ نصاب ہو تو حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ لازم ہے، ہاں نابالغ کے مال میں زکوٰۃ نہیں۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وسببه أي افتراضها ملک نصاب حولي نسبة للحول لحولانه عليه تام، قوله ملک نصاب فلا زكاة في سوائم الوقف و الخيل المسبّلة لعدم الملک. (الشامی:۲/۲۵۹،سعید).

البحر الرائق میں ہے:

في معراج الدراية فی فصل زكاة العروض: أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة. (البحر الرائق:۲/۲۰۶، کوئٹه،و کذافی الشامی:۲/۲۶۲،سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وأما شرط وجوبها: ومنها الملک التام و هو ما اجتمع فيه الملک و اليد ... كذا في السراج الوهاج. (الفتاوی الهندية:۱/۱۷۲).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

مالِ تجارت کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ: سال پورا ہونے پر جس قدر مال موجود ہو اس وقت اس کی جتنی قیمت ہو اس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے۔ (فتاوی محمودیہ: ۹/۴۱۳، مبوب ومرتب جامعہ فاروقیہ).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

ایک شرط یہ ہے کہ بقدرِ نصاب مال کا پورے طور پر مالک ہو اور پوری ملکیت یہ ہے کہ اس مال پر ملکیت اور قبضہ دونوں پائے جائیں۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/۲۲، مجددیہ).

احسن الفتاوی میں ہے:

سوال: ایک شخص کے پاس کئی ہزار روپیہ جمع ہے اس پر سال بھی گذر چکا ہے، مگر اس کے پاس نہ مکان ہے اور نہ ہی گھریلو سامان، ابھی شادی بھی نہیں کی انہی ضروریات کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہے، اس پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟

الجواب: اس پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ اگر سال پورا ہونے سے قبل تعمیر مکان کا سامان یا گھریلو استعمال کی اشیاء وغیرہ خرید لے تو زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ قال ابن عابدين رحمه الله تعالى تحت قوله (و فسره ابن ملك) فإذا كان معه دراهم أمسكها بنية صرفها إلى حاجته الأصلية لا تجب الزكاة فيها إذا حال الحول و هي عنده، لكن اعترضه في البحر بقوله و يخالفه ما في المعراج في فصل زكاة العروض: أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة و كذا في البدائع في بحث النماء التقديري اهـ، قلت: و أقره في النهر و الشرنبلالية و شرح المقدسي و سيصرح به الشارح أيضاً و نحوه قوله في السراج سواء أمسكه للتجارة أو غيرها و كذا قوله في التتارخانية نوى التجارة أو لا (إلى قوله) و كذا ما سيأتي في الحج من أنه لو كان له مال و يخاف العزوبة يلزمه الحج به إذا خرج أهل بلده قبل أن يتزوج و كذا لو كان يحتاجه لشراء دار أو عبد، فليتأمل. و الله أعلم. رد المحتار: ۲/۷. (احسن الفتاوی: ۴/۲۹۱، سعید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حاجتِ اصلیہ کے لئے جمع کردہ رقم پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر کسی نے اپنے گھر کی ضرورت کے لئے ایک لاکھ رینڈ رکھے لیکن ابھی تک گھر نہیں بنایا تو اس رقم پر حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ایک لاکھ رینڈ پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وسببه أي افتراضها ملك نصاب حولي نسبة للحول لحولانه عليه تام، قوله ملك نصاب فلا زكاة في سوائم الوقف و الخيل المسبّلة لعدم الملك. (شامی:۲/۲۵۹،سعید).

البحر الرائق میں ہے:

في معراج الدراية في فصل زكاة العروض: أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة. (البحر الرائق:۲/۲۰٦، کوئٹه).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ایک شخص کے پاس کئی ہزار روپیہ جمع ہے اس پر سال بھی گذر چکا ہے، مگر اس کے پاس نہ مکان ہے اور نہ ہی گھریلو سامان، ابھی شادی بھی نہیں کی انہی ضروریات کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہے، اس پر زکوۃ فرض ہے یا نہیں؟

الجواب: اس پر زکوۃ فرض ہے، البتہ اگر سال پورا ہونے سے قبل تعمیر مکان کا سامان یا گھریلو استعمال کی اشیاء وغیرہ خرید لے تو زکوۃ فرض نہ ہوگی۔ **قال ابن عابدين رحمه الله تعالى تحت قوله (وفسره ابن ملك) فإذا كان معه دراهم أمسكها بنية صرفها إلى حاجته الأصلية لا تجب الزكاة فيها إذا حال الحول و هي عنده لكن اعترضه في البحر بقوله و يخالفه ما في المعراج في فصل زكاة العروض أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري** اھ، **قلت: و أقره في النهر و الشرنبلالية و شرح المقدسي و سيصرح به الشارح أيضاً و نحوه قوله في السراج سواء أمسكه للتجارة أو غيرها وكذا قوله في التتارخانية نوى التجارة أو لا (إلى قوله) وكذا ما سيأتي في الحج من أنه لو كان له مال و يخاف العروبة يلزمه الحج به إذا خرج أهل بلده قبل أن يتزوج وكذا لو كان يحتاجه لشراء دار أو عبد، فليتأمل، و الله أعلم.** رد المحتار: ۲/۷. (احسن الفتاوی:٤/۲۹۱،سیعد کمپنی).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

اگر اپنی بہت سی ضروریات کو بند کر کے کسی خاص ضرورت کے لئے روپیہ جمع کیا جائے تو سال بھر کے بعد اس پر زکوۃ فرض ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند:٦/٦٤)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حاجتِ اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ:

سوال: فقہاء فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ اس مال میں واجب ہے جو حوائجِ اصلیہ سے زائد ہو، تو حوائجِ اصلیہ کا دائرہ کیا ہے؟ کونسی چیزیں اس میں شامل ہیں؟

الجواب: حوائجِ اصلیہ میں وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی بسر کرنا دشوار ہو جائے، خواہ وہ حقیقۃً ہو یا تقدیراً۔

یعنی حوائجِ اصلیہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) حاجتِ اصلیہ حقیقیہ: وہ تمام اشیاء شامل ہیں جس کے بغیر انسان کو ہلاکت کا خطرہ ہو، مثلاً ضروری نفقہ، اخراجات، رہائشی مکانات، آلاتِ جنگ اور سردی گرمی کے وہ کپڑے جن کی اپنے موسم کے اعتبار سے ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) حاجتِ اصلیہ تقدیریہ: وہ تمام اشیاء داخل ہیں کہ انسان جن کے بارے میں ہر وقت صحیح معنی میں متفکر رہتا ہے، مثلاً واجب الاداء قرضہ، پیشہ اور کاریگری کے اوزار وآلات اور گھر کے ضروری اثاث وسامان اور سواری کے جانور اور علماء کے لیے دینی کتابیں یہ سب حوائجِ اصلیہ میں شامل ہیں، لہذا اگر کسی کے پاس نقد رقم موجود ہے، لیکن اس پر قرض بھی ہے، تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

حضراتِ فقہاء کرام کی بیان کردہ جزئیات سے اتنی بات تو ظاہر ہے کہ حاجتِ اصلیہ کی کوئی ایسی تحدید نہیں جس میں کمی زیادتی کی گنجائش نہ ہو، بلکہ وسعت ہے البتہ لفظ حاجت اور اصلی کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے اس کے دائرے میں جائز حد تک نمائش سے بچتے ہوئے توسع کی گنجائش ہے، مثلاً کچے مکان کی جگہ پختہ مکان، نل کی جگہ پرٹنکی، سواری کے جانور کی جگہ پر موٹر سائیکل، جیپ کار، تیر کمان کی جگہ پر رائفل، بندوق وغیرہ، آلاتِ صنعت وحرفت میں دست کاری کی جگہ مشینیں، اسی طرح ضروریاتِ زندگی میں بڑے مکانات میں لفٹ، ٹیلیفون فریج، کولر، موسم کے اعتبار سے ہیٹر، اے سی، پنکھا، اسی طرح نوکر، چاکر یا لونڈی، ڈرائیور وغیرہ جو موٹر چلا سکے، اگر گھرانہ خوش حال ہو، اسی طرح بچوں کی پڑھائی یا تربیت کا سامان، الغرض اس طرح کی جدید چیزیں جو روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی میں داخل ہیں، اور جن کی اصل تصریحاتِ فقہاء میں بنیادی حیثیت سے موجود ہیں، وہ سب حاجتِ اصلیہ میں داخل ہیں۔ البتہ ٹی وی، وی سی آر جیسی فحش اور ناجائز چیزیں حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں۔

(ملخص از جدید فقہی مباحث: ۶/ ۲۹۲، ۳۹۶، ادارۃ القرآن۔ وایضاح النوادر: حصۂ دوم: ۳۳۔ ۳۴۔ وامداد الفتاوی: ۲/ ۴۲)۔

اولاد کا نکاح حوائجِ اصلیہ میں داخل نہیں، کیونکہ اگر وہ بالغ ہیں تو نکاح کی ذمہ داری اولاد پر ہے، اور نابالغ ہیں تو نکاح ضروری نہیں، باپ پر صرف نابالغ اولاد کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔ (فتاوی محمودیہ:۹/۳۴۳، مبوب ومرتب)۔

نیز ذاتی مکان کا ہونا بھی حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں، زندگی بسر کرنے کے لیے کرایہ کا مکان بھی کافی ہے، اور مکان کے لیے جمع کردہ رقم پر سال گزرجائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

درمختار میں ہے:

فارغ عن الحاجة الأصلية، لأن المشغول بها كالمعدوم، وفسره ابن ملك بما يدفع عنه الهلاك تحقيقاً كثيابه، أو تقديراً كدينه. وفي الشامي: وفسره ابن ملك، وذلك حيث قال: وهي ما يدفع الهلاك عن الإنسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنىٰ وآلات الحرب والثياب المحتاج إليها لدفع الحر أو البرد، أو تقديراً كالدين، فإن المديون محتاج إلى قضاءه بما في يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك، وكآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها، فإن الجهل عندهم كالهلاك، فإذا كان له دراهم مستحقة بصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة، كما أن الماء المستحق بصرفه إلى العطش كان كالمعدوم. (الدر المختار مع الشامی:۲/۲۶۲، سعید۔ وکذا فی البدائع:۲/۱۱، سعید)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

چیک پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب ہے اور حولان الحول سے پہلے اس کو مال کا ایک چیک مل گیا اب تک اس نے بینک سے رقم نہیں نکلوائی یہاں تک کہ سال گذر گیا، تو اب اس پر زکوٰۃ کب لازم ہوگی چیک ملتے ہی یا رقم بینک سے نکلوانے کے بعد؟

الجواب: جب چیک اس کو مل گیا تو یہ قبضہ حکمی ہے لیکن وہ چیک جس کی پشت پر رقم ہو خالی نہ ہو خصوصاً جب بینک اس کو جاری کردے، اس رقم پر قبضہ حکمی ہے، لہٰذا چیک وصول ہوتے ہی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے کہ جس وقت بھی وہ بینک سے رقم نکلوانا چاہتا ہے نکلوا سکتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی کو صندوق میں رقم ہبہ کردے تو اگر صندوق مفتوح ہو، مقفل نہ ہو تو یہ قبضہ کے مترادف ہے، کیونکہ جس وقت چاہتا ہے وہ لے سکتا ہے اور اگر مقفل ہو تو یہ قبضہ نہیں ہوگا، اسی طرح یہاں بھی اس کے ذریعہ سے جب چاہے رقم نکلوا

سکتا ہے بلکہ بعض معاملات میں خود چیک بھی چل سکتا ہے، جو بڑے معاملات ہوتے ہیں ان میں چیک استعمال ہوتا ہے، رہی یہ بات کہ اس کو بینک کینسل کر سکتا ہے تو اس کا تعلق قبضہ سے نہیں بلکہ اس کی مالیت کی منسوخی ہے وہ ڈرافٹ اور ڈالر میں بھی ہو سکتا ہے، اگر کسی کے ڈالر چوری ہوئے تو ممکن ہے کہ بینک ان کی مالیت منسوخ کر دے بہر حال صورتِ مسئولہ میں چیک وصول ہوتے ہی وجوبِ زکوۃ کا حکم عائد ہوگا چاہے سالہا سال رقم بینک میں پڑی رہے۔

ملاحظہ ہو الدر المختار میں ہے:

والتمكن من القبض كالقبض فلو وهب لرجل ثياباً في صندوق مقفل و دفع إليه الصندوق لم يكن قبضاً لعدم تمكنه من القبض، و إن مفتوحاً كان قبضاً لتمكنه منه، فإنه كالتخلية في البيع. اختيار. (الدر المختار: ٥/ ٦٩٠، كتاب الهبة، سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

ولو وهب لرجل ثياباً في صندوق مقفل و دفع إليه الصندوق لم يكن قبضاً، و إن كان الصندوق مفتوحاً كان قبضاً لأنه يمكنه القبض، كذا في المحيط. (البحر الرائق: ٧/ ٢٨٦).

واللہ ﷻ اعلم۔

عورت کے جہیز پر وجوبِ زکوۃ کا حکم:

سوال: لڑکی کو جو سامان (برتن وغیرہ) شادی میں دیا جاتا ہے کیا اس پر زکوۃ ہے یا نہیں؟ یاد رہے کہ یہ سامان کبھی سالوں تک استعمال میں نہیں آتا اور قیمت ہزاروں روپے سے زائد ہوتی ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں سامان وغیرہ پر زکوۃ لازم نہیں ہاں قربانی اور صدقۃ الفطر لازم ہوگا۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

و ليس في دور السكنى و ثياب البدن و أثاث المنازل و دواب الركوب و عبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة، لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضاً.

(الهداية: ١/ ١٨٦، كتاب الزكاة).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وأما شروط وجوبها فمنها ...فراغ المال عن حاجته الأصلية، فليس في دور السكنى

و ثیاب البدن و أثاث المنازل و دواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکاة، و کذا طعام أهله وما یتجمل به من الأواني إذا لم یکن من الذهب و الفضه. (الفتاوی الهندیة: ۱/۱۷۲، کتاب الزکاة).

کفایت المفتی میں ہے:

گھر کے اندر استعمال کا سامان نصابِ زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوتا۔ (کفایت المفتی: ۴/۲۶۳، دارالاشاعت، وفتاوی حقانیہ: ۳/۴۹۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مسجد و مدرسہ کی جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: کیا مدرسہ یا مسجد کی جمع شدہ رقم بقدرِ نصاب ہو تو اس میں زکوٰۃ لازم ہے؟

الجواب: مدرسہ یا مسجد کی جمع شدہ رقم اگر چہ بقدرِ نصاب ہو، اس میں زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ردالمحتار میں ہے:

و سببه ملک نصاب حولي تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد: سواء کان لله کزکاة وخراج، وقال بن عابدین رحمه الله قوله کزکاة: فلو کان له نصاب حال علیه حولان فلم یزکه فیهما لا زکاة علیه في الحول الثاني. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۲/۲۵۹، کتاب الزکاة، سعید).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

جس مال کا کوئی متعین مالک نہ ہو بلکہ مسجد یا مدرسہ یا اور کوئی ادارے اس کے مالک ہوں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ملک العلماء علامہ کاسانیؒ کا بیان ہے:

ولا تجب الزکاة في سوائم الوقف و الخیل المسبلة لعدم الملک وهذا لأن في الزکاة تملیکاً و التملیک في غیر الملک لا یتصور. (جدید فقہی مسائل: ۲/۵۰).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

مدارسِ اسلامیہ اور مساجد اور دیگر قومی اور رفاہی فنڈ بیت المال وغیرہ شخص حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ سب اشیاء اشخاص حکمی میں شامل ہیں اور اسلامی شریعت نے زکوٰۃ کا فریضہ شخص حقیقی کی ملکیت تامہ پر واجب کیا ہے اور شخص حکمی کی ملکیت پر واجب نہیں کیا ہے اس لئے مساجد، مدارس، قومی فنڈ اور بیت المال وغیرہ کی ملکیت پر زکوٰۃ

واجب نہیں ہے۔

فلا زكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا لأن في الزكاة تمليكاً والتمليك في غير الملك لا يتصور. بدائع: ۹/۲، شامی: ۲۵۹/۲. (جدید فقہی مباحث: ۲۸۵/۶، ادارۃ القران والعلوم الاسلامیۃ).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

مسجد مدرسہ کے چندہ کا روپیہ جو بقدرِ نصاب جمع ہوجاتا ہے اور سال اس پر گذر جاتا ہے اس میں زکوٰۃ نہیں مہتمم مسجد و مدرسہ کے پاس جو رقم مسجد یا مدرسہ کی جمع رہتی ہے اس میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۴۹/۶).

کفایت المفتی میں ہے:

محلّہ کا وہ روپیہ جو جماعت یا کمیٹی کا مشترک روپیہ ہو اور لوگوں کے کام آنے کے لئے جمع کیا یا مسجد کا روپیہ ہو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ (کفایت المفتی: ۲۵۰/۴).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

مسجد یا مدرسہ کے پاس جب رقم بقدرِ نصاب ہو تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۳۲۷/۹، جامعہ فاروقیہ)

مزید ملاحظہ ہو: جدید فقہی مباحث: ۳۵/۷، ادارۃ القران والعلوم الاسلامیۃ، کتاب الفتاوی تیسرا حصہ: ص ۲۶۷، اہم فقہی فیصلے: ۵۵، ادارۃ القرآن کراچی۔ وایضاح النوادر حصۂ دوم: ۲۳۔ واللہ ﷻ اعلم۔

برائے حج جمع کردہ رقم پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے پاکستان یا ہندوستان میں حج کے لئے جمادی الثانیہ میں رقم جمع کرائی، اور حج کی منظوری آگئی لیکن رمضان تک حج کے لئے نہیں گیا جبکہ رمضان زکوٰۃ کا مہینہ ہے پھر ذی قعدہ میں گیا اس پر رمضان میں اس رقم کی زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟ اور فرض اور نفل حج کا فرق ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں جو رقم بعد رمضان اس کو مل گئی اس پر زکوٰۃ لازم ہے اور جتنی رقم حکومت نے ضروریاتِ حج کے لئے لے لی وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے یعنی اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

إذا أمسكه لينفق منه كل ما يحتاج به فحال الحول وقد بقي معه منه نصاب فإنه يزكي

ذلک الباقي و إن كان قصده الإنفاق منه أيضاً في المستقبل لعدم استحقاق صرفه إلى حوائجه الأصلية وقت حولان الحول،بخلاف ماإذا حال الحول وهومستحق الصرف إليها.

(شامی:۲/ ۲٦۲،سعید).

احسن الفتاوی میں ہے:

آمدورفت کے کرایہ اور معلم وغیرہ کی فیس کے لئے جورقم دی گئی ہے اس پرزکوۃ نہیں ہے،اس سے زائد رقم جوکرنسی کی صورت میں اس کوواپس ملے گی اس میں سے یکم رمضان تک جتنی رقم بچے گی اس پرزکوۃ فرض ہے، جو خرچ ہوگئی اس پرنہیں،**قال في الشامية :إذا أمسكه لينفق منه كل ......الخ.**(احسن الفتاوی۴/۲٦۴).

بعض مفتی حضرات فرماتے ہیں کہ کل رقم پرزکوۃ فرض ہے۔ملاحظہ ہو: خیرالفتاوی:۳/ ۴۷۴،وغیرہ۔

لیکن جب آدمی حج کے لئے رقم جمع کراتا ہے اوراس کے بدلے میں اس کوحج کے انتظام کا حق مل جاتا ہے تو یہ رقم حاجی صاحب کی ملکیت سے نکل گئی ہاں جورقم واپس ملے گی اس پرزکوۃ ہوگی، جب رقم ملکیت سے نکلی تو اس پرزکوٰۃ نہیں،اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کوکھیت کی سیرابی کے لئے نہر کے انتظام کا حق مل جائے اوراس کے عوض رقم ادا کرے تو یہ رقم ملکیت سے نکلی،ہدایہ میں حق الشرب کی بیع کوجائز کہایاحق المرور کے عوض آدمی کسی کورقم دیدے تو وہ ملکیت سے نکل گئی یا اجارہ میں ایک سال کا کرایہ پہلے سے ادا کردیا تو وہ رقم بھی ملکیت سے نکل گئی یا استصناع میں جوتا بنانے کا آرڈر دیدیا اگر چہ ابھی تک تیار نہیں ہوالیکن جب ثمن دیدے تورقم ملکیت سے نکل گئی اور یہ مسئلہ اجارہ کی طرح یوں ہے کہ حکومت بمنزلہ اجیر ہے اور یہ شخص بمنزلہ مستاجر ہے اوراگر اجارہ میں پہلے سے اجرت دی جائے تو وہ اجرت ملکیت سے خارج ہوجاتی ہے۔

ملاحظہ ہوعالمگیری میں ہے:

ثم الأجرة تستحق بإحدى معانٍ ثلاثة : إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل، أو باستيفاء المعقود عليه، فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة، فإنه يملكها كذا في شرح الطحاوي.

(الفتاوی الهندية:٤/ ٤١٣، كتاب الاجارة،في بيان متى تجب الاجرة).

بدائع الصنائع میں ہے:

لأنهما لما شرطا تعجيل البدل لزم اعتبار شرطهما لقوله عليه السلام "المسلمون على شروطهم" وملک الآجر البدل حتى تجوز له هبته والتصدق به و الإبراء عنه. (بدائع الصنائع: ٤/ ٢٠٣، فصل فی حکم الإجارة،سعید).

لہذا حکومت اس رقم کی مالک بن گئی اور حاجی صاحب پر اس کی زکوۃ نہیں اور ہم اس مسئلہ میں حضرت مفتی رشید صاحب صاحبِ احسن الفتاوی کے تابع ہیں۔

کتاب الفتاوی میں ہے:

سفرِ حج کے کرایہ اور مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران ہونے والے لازمی اخراجات، اس کی حاجتِ اصلیہ یعنی بنیادی ضروریات میں داخل ہیں، ان میں زکوۃ واجب نہیں، اس سے زائد جو رقم حاجی اپنے طور پر سفرِ حج میں خرچ کرتا ہے وہ حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔ (کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ ص ۲۷۴)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

حج کی منظوری کے بعد حج کو نہ جائے تو رقم واپس ملنے پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: حج کی منظوری ہوئی اور وہ شخص نہ جائے تو حج کی اکثر رقم واپس ہوسکتی ہے تو اب اس رقم کی زکوٰۃ اس پر ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں رقم واپس ہونے پر زکوٰۃ فرض ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

إذا أمسكه لينفق منه كل ما يحتاجه فحال الحول وقد بقي معه منه نصاب فإنه يزكي ذلک الباقي و إن كان قصده الإنفاق منه أيضاً في المستقبل بعد استحقاق صرفه إلى حوائجه الأصلية وقت حولان الحول. (شامی:۲/۲۶۲، سعید)۔

طحطاوی میں ہے:

في معراج الدراية والبدائع : إن الزكاة تجب في النقد كيف أمسكه للنماء أو للنفقة.

(طحطاوی علی مراقی الفلاح:۷۱۵، قدیمی)۔

فتاوی دار العلوم دیوبند میں ہے:

حج کے لئے جمع کردہ رقم کی زکوۃ ادا کرنا فرض ہے۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند:۶/۱۱۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مالِ حرام پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص کے پاس مالِ حرام آجائے یا اس کو سود کی رقم مل جائے تو اس رقم پر زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر کسی کے پاس خالص حرام یا سود کا مال ہے تو اس میں زکوٰۃ لازم نہیں ہے، اس لیے کہ اگر مالک معلوم ہے تو مالک تک پہنچانا ضروری ہے، اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو واجب التصدق ہے، جیسا کہ شامی میں ہے: **لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على أربابها**.(شامی).

اور اگر کسی شخص کے پاس حلال مال کے ساتھ حرام کی آمیزش ہے جیسے رشوت یا سود کی حاصل ہونے والی اضافی رقم اور دونوں مالوں میں امتیاز ممکن ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اصل مالک معلوم ہو تو اس تک پہنچانا ضروری ہے، ورنہ بلانیتِ ثواب فقراء پر خرچ کردے۔

اور اگر دونوں میں امتیاز مشکل ہو جائے، تو امام صاحبؒ کے مذہب کے مطابق حلال مال کے ساتھ حرام مال ملانے سے یہ حرام مال بھی اس کی ملک میں داخل ہو جائے گا، لہٰذا اس مخلوط مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ چونکہ اس قول میں آسانی ہے اور فقراء کا زیادہ فائدہ بھی ہے اس وجہ سے فقہاء نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله، ملكه فتجب الزكاة فيه ويورث عنه، لأن الخلط استهلاک إذا لم يمكن تميزه عند أبي حنيفةؒ .... وإلا فلا زكاة كما لوكان الكل خبيثاً، كما في النهر عن الحواشي السعدية.(الدرالمختار:۲/ ۲۹۰،سعید).

وفي الشامي: (كما لوكان الكل خبيثاً) في القنية: لوكان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة، لأن الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد إيجاب التصدق ببعضه .(شامی:۲/ ۲۹۱،سعید).

فتاوی بزازیہ میں ہے:

لو بلغ المال الخبيث نصاباً لايجب فيه الزكاة، لأن الكل واجب التصدق.(الفتاوی البزازيةعلى هامش الهندية:۲/ ۸۶).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: امدادالفتاوی:۲/ ۱۴۔ وامدادالاحکام:۲/ ۳۔ وکفایت المفتی:۴/ ۲۵۶۔ واحسن الفتاوی: ۴/ ۲۸۳۔ وفتاوی حقانیہ:۳/ ۵۲۳۔ وجدید فقہی مباحث:۷/ ۶۳۷۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قرض پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: (۱) میں نے زید کو دس ہزار رینڈ قرضہ کے طور پر دئے تھے اس نے تین سال بعد مکمل رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا جو کہ جنوری ۲۰۰۴ء میں مکمل ہوئے۔ (۲) اور عمر نے بیس ہزار رینڈ قرضہ لیا تھا اور ہر ماہ دو

ہزار رینڈ ادا کرنے کا وعدہ کیا قسط وار۔
(۱) کیا مجھ پر ان ۳ سالوں کی زکوۃ واجب ہے؟ (۲) قسطوار رقم پر کس طرح زکوۃ ادا کی جائے؟
الجواب: (۱) جس وقت قرض وصول ہو جائے اس وقت گذشتہ تین سالوں کی زکوۃ دینا بھی واجب ہے۔
(۲) جس وقت جس قدر قرض وصول ہو جائے اس رقم پر زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے۔
ملاحظہ ہو مراقی الفلاح میں ہے:

و زكاة الدين على أقسام: فإنه قوي ووسط وضعيف؛ فالقوي هو بدل القرض ومال التجارة إذا قبضه وكا ن على مقر ولومفلساً أوعلى جاحد عليه بينة زكاه لما مضى ويتراخى وجوب الأداء إلى أن يقبض أربعين درهماً، ففيها درهم، لأن ما دون الخمس من النصاب عفو لا زكاة فيه وكذا فيما زاد بحسابه. (مراقي الفلاح:٢٦٢، كتاب الزكاة،بيروت ،كذا في الشامي: ٢/٣٠٥،سعيد).

محیطِ برھانی میں ہے:

إذا قبض منها أربعين درهماً يجب عليه الأداء بقدر ما قبض، هذا كله قول أبي حنيفةؒ.

(المحيط البرهاني:٣/٢٤٦).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

بعد وصول قرضہ کے زکوۃ دینا واجب ہوتا ہے لیکن اگر قبل از وصول دیدی جائے تو یہ بھی جائز ہے جو قرضہ اب قابلِ وصول ہے اور بعد میں شاید قابلِ وصول نہ رہے اس میں بھی یہی حکم ہے جو گذرا کہ زکوۃ کا ادا کرنا واجب اسی وقت ہوتا ہے جب وصول ہو جاوے لیکن اگر فی الحال دیدے گا تب بھی درست ہے، اور قرض اگر باقساط وصول ہو تو جس قدر وصول ہوتا جاوے اس کی زکوۃ ادا کرتا جائے اور اگر ایک دفعہ کل کی زکوۃ دیدے خواہ پہلے یا پیچھے یہ بھی درست ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۶/۹۶ مدلل ومکمل، دارالاشاعت).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

وہ قرض جو کسی شخص کو دیا گیا ہو تاجر نے وہ سامان جو تجارت ہی کے لئے تھا بیچا ہو اور اس کی قیمت باقی ہو اگر یہ رقم کل کی کل ایک ساتھ مل جائے تو سبھوں کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی اور اگر کئی سالوں کے بعد ملی تو تمام سالوں کی بہ یک وقت ادا کی جائے گی، اگر یہ رقم تھوڑی تھوڑی وصول ہو تو جتنا روپیہ وصول ہوا اتنے کی زکوۃ ادا کرتا جائے،

لیکن اگر یہ رقم نصابِ زکوٰۃ کے ۱/۵ سے بھی کم ہوتو پھر زکوۃ واجب نہیں ہوگی، اس کو فقہ کی اصطلاح میں دینِ قوی کہتے ہیں۔ (جدید فقہی مسائل:۱/۲۱۲،نعیمیہ)۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

قرض کی زکوٰۃ قرض خواہ کے ذمہ ہونے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے دوسرے شخص کو قرض دیا تو یہ قرض والی رقم اس کی ملکیت سے نکلی اور مدیون کی ملکیت میں آ گئی تو زکوٰۃ کون ادا کرے گا؟

الجواب: یہ دین کی رقم دائن کی ملک ہے یا اس پر حق ملکیت ہے، لہذا اس پر زکوٰۃ لازم ہے، مدیون پر زکوٰۃ لازم نہیں۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

فلا زكاة على مكاتب لعدم الملک التام ولا في كسب مأذون ولا في مرهون بعد قبضه و لا فيما اشتراه لتجارة قبل قبضه ومديون للعبد بقدر دينه فيزكي الزائد إن بلغ نصاباً و عروض الدين كالهلاک عند محمد و رجّحه في البحر ولو له نصب صرف الدين لأيسرها قضاء و لو أجناساً صرف لأقلها زكاة. (الدر المختار: ۲/۲۶۳،سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ومنها الملک التام و هو ما اجتمع عليه الملک واليد وأما إذا وجد الملک دون اليد كالصداق قبل القبض أو وجد اليد دون الملک كملک المكاتب و المديون لا تجب فيه الزكاة كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۳،وطحطاوی علی الدر: ۱/۳۹۱).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

وہ دین جو تجارتی مال یا قرض کے طور پر لازم ہے اور مدیون اس دین کا اقرار بھی کرتا ہے اور مدیون ادائے گی پر قدرت بھی رکھتا ہے اور دائن بہ آسانی اس کو وصول بھی کر سکتا ہے تو ایسے دین کو دینِ قوی کہا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوتی ہے۔ (جدید فقہی مباحث: ۶/۲۸۸،ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ۔ وایضاح النوادر حصۂ دوم: ۳۰). کفایت المفتی میں ہے:

روپے کے مالک کو زکوٰۃ دینی ہوگی قرض لینے والے کے ذمہ نہیں۔ (کفایت المفتی: ۴/۲۶۶،دارالاشاعت).

آپ کے مسائل میں ہے:

اصول یہ ہے کہ قرض کی رقم کی زکوٰۃ قرض دینے والے کے ذمے ہوتی ہے، قرض لینے والے کے ذمے نہیں ہوتی، اس لئے اس رقم کی زکوٰۃ آپ لوگوں کے ذمہ نہیں، قرض دینے والے کو چاہئے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل:۳/۳۵۱، مکتبہ لدھیانوی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نابالغ لڑکے کا مال باپ کے پاس بطورِقرض ہوتو بالغ ہونے کے بعدزکوٰۃ کاحکم:

سوال: ایک شخص اپنے نابالغ لڑکے سے ایک مدت تک قرضہ کے طور پر پیسے لیتارہا اس نیت سے کہ واپس کرونگا، قرضہ لینے کے بعد ایک مدت گذرگئی یہاں تک کہ بچہ بالغ ہوگیا اوراس مدت میں باپ نے اس رقم کی زکوٰۃ ادانہیں کی تھی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس رقم پرزکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اس رقم کا حکم بعینہ قرض کی طرح ہے یعنی جب وصول ہوجائے تب زکوٰۃ ادا کرے اور بلوغ کے بعد سے جتنے سال گزرے تمام کی ادا کرنا لازم ہے، ہاں بالغ ہونے سے پہلے کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے اور سال کی ابتداء بلوغ سے شمار ہوگی۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

و كذا الصبي إذا بلغ يعتبر ابتداء الوقت من وقت بلوغه. (الفتاوی الهنديه:۱/۱۷۲).

مراقی الفلاح میں ہے:

و زكاة الدين على أقسام : فإنه قوي ووسط وضعيف؛ فالقوي هو بدل القرض و مال التجارة إذا قبضه و كا ن على مقرولومفلساً أوعلى جاحد عليه بينة زكاه لما مضى ويتراخى وجوب الأداء إلى أن يقبض أربعين درهماً، ففيها درهم، لأن ما دون الخمس من النصاب عفو لا زكاة فيه و كذا فيما زاد بحسابه. (مراقی الفلاح:۲۶۲، کتاب الزکاة،بیروت، کذا فی الشامی: ۲/۳۰۵، سعید).

محیطِ برھانی میں ہے:

إذا قبض منها أربعين درهماً يجب عليه الأداء بقدرما قبض،هذا كله قول أبي حنيفةؒ.

(المحیط البرهانی:۳/۲۴۶).

مزید ملاحظہ: شامی:۲/۳۰۵، البحر الرائق:۲/۳۰۷، فتح القدیر:۲/۱۶۷، الھندیہ:۱/۱۷۲، احسن الفتاوی:۴/۲۶۱، فتاوی دارالعلوم دیوبند:۶/۱۵۲، جدید فقہی مسائل:۱/۲۱۲، فتاوی مفتی محمود:۳/۲۳۳۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ترقیاتی قرضے مانعِ زکوۃ نہیں ہے:

سوال: طویل المیعاد قرض کو مالک کی اصل رقم سے وضع کیا جائے گا یا نہیں یا پوری رقم پر زکوۃ لازم ہے؟ یعنی طویل المیعاد دین مانعِ زکوۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: طویل المیعاد ترقیاتی قرضوں میں ہر سال ادا طلب قسط کو اس سال کی زکوۃ سے علیحدہ کر کے باقی مالیت پر زکوۃ واجب ہوگی یعنی پورا قرض زکوۃ سے منہا نہیں کیا جائے گا اور مانعِ زکوۃ نہ ہوگا۔

ملاحظہ ہو حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

(قوله المؤجل)وقيل المهر المؤجل لا يمنع لأنه غير مطالب به عادة بخلاف المعجل و قيل إن كان الزوج عزم على الأداء منع وإلا فلا، لأنه لا يعد ديناً بحر عن غاية البيان، و في القهستاني و الصحيح أن المؤجل غير مانع كما في الجواهر. (حاشية الطحطاوي على الدر:١/٣٩١).

شامی میں ہے:

(قوله أو مؤجلا) عزاه في المعراج إلى شرح الطحاوي وقال: وعن أبي حنيفةؒ لايمنع وقال الصدر الشهيد: لا رواية فيه و لكل من المنع وعدمه وجه،زاد القهستاني عن الجواهر و الصحيح أنه غيرمانع. (شامي:٢/٢٦١،سعيد).

بدائع الصنائع میں ہے:

وعلى هذا يخرج مهر المرأة فإنه يمنع وجوب الزكاة عندنا معجلاً كان أو مؤجلاً لأنها إذا طالبته يؤاخذ به، وقال بعض مشايخنا: إن المؤجل لا يمنع لأنه غير مطالب به عادة. (بدائع الصنائع:٢/٦).

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

السراجية: الدين المؤجل قال بعضهم: يمنع الزكاة، وذكرمجد الأئمة السرخسيؒ عن مشايخه أنه لايمنع .(الفتاوى التاتارخانية:٢/٢٩٢).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

زکوۃ کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ضروری ہے کہ فقہی جزئیات سے پرے اٹھ کر شریعت کے مقصد و منشاء اور احکامِ زکوۃ کی روح کو بھی ملحوظ رکھا جائے، ظاہر ہے کہ زکوۃ کے سلسلہ میں شریعت کی روح یہ ہے کہ انسان اپنے

مال میں خدا کے واسطہ سے اس غریب بندوں کا حق بھی محسوس کرے اور غرباء پر خرچ کرے، اسی لئے فقہاء کے یہاں یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جہاں وجوب اور عدم وجوب دونوں پہلو موجود ہو وہاں اس پہلو کو ترجیح دی جائے جس میں فقراء کو فائدہ ہوتا ہے...اب صورت حال یہ ہے کہ اس زمانہ میں تجارت اور کاروبار کے لئے ترقیاتی قرضوں کا رواج عام ہے جو طویل مدت میں اور آسان اقساط پر ادا طلب ہوتا ہے، مقروض اس پیسہ سے بڑے بڑے معاشی فائدے حاصل کرتا ہے اور یہ رقم اس کے پاس جامد نہیں ہوتی بلکہ گردش میں رہتی ہے اور فقہاء کی زبان میں بالفعل مالِ نامی کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اگر اس دین کو زکوٰۃ سے مانع قرار دیا جائے تو فقراء ہمیشہ اپنے حق سے محروم رہیں گے، اس لئے جیسے متأخرین علماء نے بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر عورتوں کے دین مہر کو زکوٰۃ میں مانع نہیں مانا ہے، یہ بات عین مناسب ہے کہ طویل مدتی استثماری دیون میں ہر سال کی ادا طلب قسط کو اس سال کی زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور باقی مالیت پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے، اس پر فقہاء کے اس جزئیہ سے بھی روشنی ملتی ہے جس میں بیوی کے نفقے کے دین کو زکوٰۃ سے مانع نہیں مانا گیا ہے اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ نفقہ ایک ساتھ واجب نہیں ہوتا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے واجب ہوتا ہے۔ ”**لأنها تجب شيئاً فشيئاً فتسقط إذا لم يوجد قضاء القاضي أو التراضي**“ بدائع، امداد الفتاوی، فتاوی دارالعلوم۔ (جدید فقہی مباحث: ۷/ ۲۴۹).

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۱۴ نعیمیہ۔ وایضاح النوادر: حصۂ دوم: ۳۷، مناسب ومعتدل حکم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مہر وصول ہونے سے قبل زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت کا مہر شوہر کے ذمہ واجب ہو اور ابھی تک ادا نہیں کیا تو عورت پر اس کی زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مہر وصول ہونے سے پہلے زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔

البحر الرائق میں ہے:

قسم أبوحنيفةؒ الدين على ثلاثه أقسام قوي ... وضعيف ... وهو بدل ما ليس بمال كالمهر والوصية وبدل الخلع ... و في الضعيف لا تجب ما لم يقبض نصاباً ويحول الحول بعد القبض عليه. (البحر الرائق: ۲/ ۲۰۷، کوئٹه، والشامی: ۲/ ۳۰۶، باب زكاة المال، سعيد، والفقه على مذاهب الأربعة: ۱/ ۹۶۱).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

زکوٰۃ اس پر قبل الوصول واجب نہیں ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۶/ ۵۷۔ وایضاح النوادر: حصۂ دوم: ۱۱)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

مرد جب دینِ مہر عورت کو دیدے اور وہ مقدارِ نصاب ہو اور اس پر سال بھی گزر جائے تب عورت کے ذمہ اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر وہ مقدارِ نصاب نہیں بلکہ اس سے کم ہے اور عورت کے پاس اتنی مقدار موجود ہے جس کو مہر کے ساتھ ملا کر پورا نصاب ہوسکتا ہے تو اس کو ملا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی، اگر نصاب پورا نہیں ہوسکتا تو اس پر زکوٰۃ نہیں اسی طرح وصول ہونے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں۔ (فتاوی محمودیہ: ۹/ ۳۷۷، جامعہ فاروقیہ)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

رقم گم ہوجانے سے زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص کے پاس رقم تھی جس پر زکوٰۃ واجب ہو چکی تھی وہ پوری رقم گم ہوگئی کیا زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: رقم گم ہوجانے کے بعد زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔

طحطاوی میں ہے:

ولا يضمن الزكاة مفرط غير متلف فهلاک المال بعد الحول يسقط الواجب و هلاک البعض حصته، ويصرف الهالک إلى العفو، قوله يسقط الواجب لتعلقه بالعين لا بالذمة.

(حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ۷۱۸، قدیمی).

درمختار میں ہے:

فلا يسقط الفطرة وكذا الحج بهلاک المال بعد الوجوب كما لا يبطل النكاح بموت الشهود بخلاف الزكاة والعشر والخراج لاشتراط بقاء الميسرة عن نفسه، وفي الشامي: قوله بخلاف الزكاة فإنها تسقط بهلاک المال بعد الحول يعني سواء تمكن من الأداء أم لا لأن الشرع علق الوجوب بقدرة ميسرة والمعلق لقدرة ميسرة لا يبقى بدونها. (الدرالمختار مع الشامی: ۲/ ۳٦١، سعید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بینک میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: بینک میں جمع شدہ رقم پرزکوٰۃ لازم ہے یانہیں؟

الجواب: بینک میں جمع شدہ رقم پرزکوٰۃ لازم ہے اس لئے کہ مالک نے اپنے اختیار سے جمع کرائی ہے اور یہ رقم اس کی ملک میں ہے، لہذا سال گزرنے پرزکوٰۃ لازم ہے۔

ملاحظہ ہوجدید فقہی مسائل میں ہے:

بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھی جائے یا فکس ڈپازٹ کی جائے ہردوصورت میں جمع شدہ رقم پرزکوٰۃ واجب ہوگی، زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ملکیت اور قبضہ ضروری ہوتا ہے، بنک میں جمع رقم پرملکیت تو جمع کرنے والے کی ظاہر ہی ہے، قبضہ بظاہراس کا نہیں ہے مگر چونکہ اس نے اپنے ارادہ واختیار سے بینک میں رقم جمع کی ہے، لہذا بینک قبضہ میں اصل مالک کا نائب ہے، اس طرح بالواسطہ جمع کنندہ کا قبضہ بھی ثابت ومحقق ہے، اس لئے فقہاء نے ازراہ امانت رکھے گئے مال میں زکوٰۃ واجب قراردی ہے کیوں کہ امین کا قبضہ اصل مالک کا قبضہ ہے، لہذا ایسی جمع شدہ رقم پرزکوٰۃ واجب ہوگی جس کو مالک نے اپنے اختیار ومرضی سے جمع کیا ہو۔ (جدید فقہی مسائل:۱/۲۱۶، نعیمیہ)۔

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی دارالعلوم:۶/۱۳۴، وامدادالاحکام:۲/۲۵، وفتاوی رحیمیہ:۲/۱۴۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ڈپوزٹ کی رقم پرزکوٰۃ کا حکم:

سوال: ڈپوزٹ کی رقم پرزکوٰۃ لازم ہے یانہیں؟ اوراگر لازم ہے تو کس پر؟

الجواب: ڈپوزٹ کی رقم قرض کی طرح ہے اورجس طرح قرض کی زکوٰۃ قرض خواہ کے ذمہ لازم ہے اسی طرح ڈپوزٹ کی رقم پربھی زکوٰۃ لازم ہے اورکرایہ دار کے ذمہ ہے۔

ملاحظہ ہومراقی الفلاح میں ہے:

و زكاة الدين على أقسام: فإنه قوي ووسط وضعيف؛ فالقوي هو بدل القرض ومال التجارة إذا قبضه وكان على مقر ولومفلساً أوعلى جاحد عليه بينة زكاه لما مضى ويتراخى وجوب الأداء إلى أن يقبض أربعين درهماً، ففيها درهم، لأن ما دون الخمس من النصاب عفو لا زكاة فيه وكذا فيما زاد بحسابه . (مراقی الفلاح:٢٦٢، کتاب الزکاة، بیروت، کذا فی الشامی:٢/٣٠٥، سعید)۔

درمختار میں ہے:

فلا زكاة على مكاتب لعدم الملك التام ولا في كسب مأذون ولا في مرهون بعد

قبضه ولا فيما اشتراه لتجارة قبل قبضه ومديون للعبد بقدر دينه فيزكي الزائد إن بلغ نصاباً وعروض الدين كالهلاك عند محمد و رجّحه في البحر ولو له نصب صرف الدين لأيسرها قضاء ولو أجناساً صرف لأقلها زكاة. (الدر المختار: ۲/۲۶۳، سعید).

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ایضاح النوادر: حصہ دوم ص۲۰، وجدید فقہی مسائل: ۱/۲۱۷، نعیمیہ۔ واللہ ﷻ اعلم۔

(مفید اضافہ ضمیمہ میں دیکھئے)۔

پگڑی کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: کرایہ دار مالکِ مکان کو یک مشت پیشگی رقم ادا کرتا ہے سال گزرنے پر اس رقم کی زکوٰۃ کس کے ذمہ ہوگی؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مالکِ مکان کے ذمہ زکوٰۃ لازم ہوگی۔

ملاحظہ ہو ایضاح النوادر میں ہے:

کرایہ دار پیشگی یکمشت جو رقم مالکِ مکان اور مالکِ دوکان کو ادا کرتا ہے مالکِ مکان اس کا مالک ہوجاتا ہے اس کی زکوٰۃ بھی مالکِ مکان ہی پر لازم ہوا کرتی ہے، کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، اس لئے کہ اس رقم پر کرایہ دار کی ملکیتِ تامہ حاصل نہیں ہے۔ **إذا عجل الاجرة لايملك الاسترداد.** شامی: ۶/۱۰۔ (ایضاح النوادر: حصۂ دوم ص۱۰).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

پیشگی رقم مالکِ مکان کی ملکیت میں آجاتی ہے اس لئے مالکِ مکان ہی کو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ چنانچہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں: **و أما زكاة الأجرة المعجلة عن سنين في الإجارة الطويلة التي يفعلها بعض الناس عقوداً ويشترطون الخيار ثلاثة أيام في رأس كل شهر فتجب على الآجر لأنه ملكها بالقبض.** (فتح القدير: ۲/۱۲۱).

پس پیشگی دیئے گئے کرایہ کی زکوٰۃ مالکِ مکان پر واجب ہوگی۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/۲۱۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

فصل سوم

اموالِ تجارت اور کرایہ داری پر زکوٰۃ کے احکام

تجارتی سامان میں قیمتِ فروخت کا اعتبار ہوگا:

سوال: ایک شخص اپنی دکان کے مالِ تجارت کی زکوٰۃ نکالنا چاہتا ہے تو کس قیمت کے اعتبار سے نکالے قیمتِ خرید یا قیمتِ فروخت؟ اور کس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں سامانِ تجارت کی زکوٰۃ نکالتے وقت قیمتِ فروخت کا اعتبار ہوگا۔

ملاحظہ ہو الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

يقوم التاجر العروض أو البضائع التجارية في آخر كل عام بحسب سعرها في وقت إخراج الزكاة لا بحسب سعر شرائها و يخرج الزكاة المطلوبة. (الفقه الاسلامي وأدلته:۲/۷۹۲، ۷۶۰، دار الفكر).

الفقہ علی المذاہب الاربعۃ میں ہے:

و تعتبر قيمتها في البلد الذي فيه المال حتى لو أرسل تجارة إلى بلد آخر فحال عليه الحول اعتبرت قيمتها في تلك البلد فلو أرسلها إلى مفازة اعتبرت قيمتها في أقرب الأمصار إلى تلك المفازة . (الفقه على المذاهب الأربعة:۱/۶۰۷).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

سوال: سوداگر کے پاس مال موجود ہے اب زکوٰۃ دینا چاہتا ہے سال بھر کے بعد تو اس مال کی قیمتِ خرید کا اعتبار ہوگا یا بازار کے بھاؤ کا لحاظ ہوگا؟

الجواب: مالِ تجارت کی جو قیمت بازار میں بوقتِ زکوٰۃ دینے کے ہے اسی قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کی

جاوے، خواہ قیمتِ خرید سے زیادہ ہو یا کم ہو بحوالہ شامی۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۶/۱۴۱)۔

جواہرالفتاوی میں ہے:

مال میں خواہ سونا چاندی ہو یا مالِ تجارت سب کے اندر وجوبِ زکوٰۃ کے لئے قیمتِ فروخت کا اعتبار ہوگا قیمتِ خرید کا اعتبار نہ ہوگا۔ (جواہرالفتاوی: ۱/۶۳، امدادالفتاوی: ۲/۴۲)۔

کفایت المفتی میں ہے:

موجودہ نرخ چاندی وسونے کا زکوٰۃ نکالنے کے لئے معتبر ہوگا۔ (کفایت المفتی: ۴/۳۰۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

گزشتہ کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت قیمت لگانے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے گزشتہ چند سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، اب ادا کرنا چاہتا ہے تو کس قیمت کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے، یا کسی کے سامانِ تجارت پر رمضان میں زکوٰۃ واجب ہوئی تھی اور چار مہینے تک زکوٰۃ ادا نہیں کی، چار ماہ گزرنے کے بعد سامانِ تجارت کی قیمت بڑھ گئی تو اس صورت میں ماہِ رمضان کا اعتبار ہے یا جس وقت ادا کرتا ہے اس کا اعتبار ہے؟ جدید فقہی مباحث اور جدید فقہی مسائل کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم الاداء کا اعتبار ہے، ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث میں ہے:

قیمت سے ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلہ میں کس دن کی قیمت معتبر ہے، دو قول ہے، ایک قول یہ ہے کہ مال پر جس دن سال گزرا اور اس مال کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوئی، اس دن کی قیمت کا اعتبار ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ جس دن زکوٰۃ ادا کر رہا ہے اس دن کی قیمت کا اعتبار ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاحبِ مال ان دونوں قولوں میں سے کس قول پر عمل کر کے اس کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے، تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادائیگی زکوٰۃ کے دن کی قیمت کو معمول بہا قرار دیا جائے...... (جدید فقہی مباحث: ۷/۵۶۷، ادارۃ القرآن والعلوم)۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر چند سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہے تو یوم الوجوب یعنی جس دن سال پورا ہوا اور زکوٰۃ واجب ہوئی اس دن کا اعتبار ہے، نیز جب رمضان میں سال ختم ہوا تھا اور زکوٰۃ واجب ہوئی تھی اور چار ماہ کے بعد زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہے تب بھی یوم الوجوب کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرے۔ اکثر فقہی عبارات اسی کے موافق ہیں، امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے، اگرچہ بعض حضرات نے یوم الاداء والے قول کو اختیار کیا ہے، لیکن اس میں مشکلات پیش آتی ہیں، اس لیے کہ آئے دن قیمتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے بار بار قیمت لگانے میں بھی دشواری ہے، لہذا آسانی کی وجہ سے یوم الوجوب والا قول اختیار کیا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں فقہی عبارات حسبِ ذیل درج ہیں:

درمختار میں ہے:

و تعتبر القيمة يوم الوجوب، و قالا: يوم الأداء. وفي السوائم يوم الأداء إجماعاً، وهو الأصح، و يقوم في البلد الذي المال فيه. وفي الشامي: قوله وهوالأصح: أي كون المعتبر في السوائم يوم الأداء إجماعاً هو الأصح فإنه ذكر في البدائع: أنه قيل: إن المعتبر عنده فيها (السوائم) يوم الوجوب و قيل يوم الأداء، و في المحيط: يعتبر يوم الأداء بالإجماع و هو الأصح. (شامی:۲/۲۸٦،باب زكاة الغنم، سعيد).

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

وفي الولوالجية: يقوم يوم حال عليها الحول بالغة مابلغت بعد أن كانت قيمتها في أول الحول مائتين ويزكي من مائتي درهم خمسة دراهم. (الفتاوى التاتارخانية:۲/۲۳۸، زكاة عروض التجارة،ادارة القرآن).

دوسری جگہ مذکور ہے:

رجل له مائتا قفيز حنطة للتجارة حال عليها الحول وقيمتها مائتا درهم حتى وجبت عليها الزكاة، فإن أدى من عينها أدى ربع عشرعينها خمسة أقفزة حنطة وإن أدى من قيمتها ربع عشر القيمة أدى خمسة دراهم، فإن لم يؤد حتى تغير سعر الحنطة إلى زيادة وصارت تساوي أربعمائة فإن أدى من عين الحنطة أدى ربع العشر خمسة أقفزة بالاتفاق، وإن أدى من القيمة أدى خمسة دراهم قيمتها يوم حولان الحول الذي يوم الوجوب عند أبي حنيفةؒ وعندهما يؤدي عشرة دراهم قيمتها يوم الأداء. (الفتاوى التاتارخانية:۲/۲٤۱، زكاة عروض التجارة،ادارة القرآن).

نیز مذکور ہے:

ولو كانت له جارية للتجارة قيمتها مائتادرهم فزادت فى عينها بعد الحول حتى صارت أربعمائة لايجب في الزيادة شيء .....ولو زاد سعرها بعد الحول فصار أربعمائة فعند أبي حنيفةؒ تعتبر قيمتها يوم تمام الحول لايجب إلا خمسة دراهم. (الفتاوى التاتارخانية:۲/۲٤٤،زكاة عروض التجارة).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وإن أدى القيمة تعتبر قيمتها يوم الوجوب لأن الواجب أحدهما ولهذا يجبر المصدق على قبوله. (الفتاوی الهندية: ۱/ ۱۸۰، الفصل الثانی فی العروض).

احسن الفتاوی میں ہے:

سوال: سونے کی زکوٰۃ میں کس وقت کی قیمت معتبر ہوگی؟ آیا وقتِ وجوب کی قیمت معتبر ہے یا وقتِ ادا کی؟

الجواب: سونے چاندی کی زکوٰۃ اور عشر میں وقتِ وجوب کی قیمت معتبر ہے، البتہ زکوٰۃ سوائم میں وقتِ ادا کی قیمت کا اعتبار ہے۔ (احسن الفتاوی: ۴/ ۲۶۸).

فتاوی فریدیہ میں ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ سونا جو سو روپے فی تولہ خریدا گیا ہو اور اب آٹھ سو روپے فی تولہ ہے تو زکوٰۃ کس شرح پر ادا کی جائے گی؟

الجواب: حولانِ حول کے وقت جو نرخ ہو وہ معتبر ہوگا۔ (فتاوی فریدیہ: ۳/ ۴۱۴، باب الزکوٰۃ فی الاموال).

واللہ تعالیٰ اعلم۔

تھوک و پھٹکر کاروبار میں زکوٰۃ کی قیمت لگانے کا حکم:

سوال: ایک دکان میں بعض چیزیں تھوک (WHOLESALE) بھاؤ میں فروخت کی جاتی ہیں، اور بعض چیزیں پھٹکر (RETAIL) بھاؤ میں فروخت کی جاتی ہے دونوں میں زکوٰۃ کس قیمت سے ادا کرے؟

الجواب: اموالِ تجارت میں زکوٰۃ کا مدار قیمت فروخت پر ہے، لہذا پھٹکر (RETAIL) میں فروخت ہونے والی اشیاء میں پھٹکر (RETAIL) بھاؤ کا اعتبار ہوگا، اور تھوک (WHOLESALE) بھاؤ میں فروخت ہونے والی اشیاء میں زکوٰۃ کی ادائے گی میں تھوک (WHOLESALE) بھاؤ کا اعتبار ہوگا۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ایضاح النوادر: حصۂ دوم: ۴۴۔ وجدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۲۰۔ وجدید فقہی مباحث: ۷/ ۵۶۸۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

تجارتی پلاٹ پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: تجارتی پلاٹ پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: تجارتی پلاٹ چونکہ مالِ تجارت میں شامل ہے اس وجہ سے اس کی پوری مالیت پر زکوٰۃ

فرض ہے۔

ملاحظہ ہو الفقہ الحنفی وادلتہ میں ہے:

روى البيهقي عن مجاهد في قوله تعالىٰ: ﴿أنفقوا من طيبات ما كسبتم﴾. (البقرة:٢٦٧). قال: التجارة، ومما أخرجنالكم من الأرض، قال: النخل، وروى أيضاً عن سمرة بن جندب ﷺ: أما بعد فإن رسول الله ﷺ كان يأمرنا أن نخرج الصدقة من الذي نعد للبيع (سنن ابی داود: ١/٢٢٥) ...فالزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصاباً من الذهب، أو الفضة. (الفقه الحنفى وادلته: ١/٣٥٣، زكاة عروض التجارة، بيروت).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

تجارتی پلاٹ مالِ تجارت ہے، لہذا اس پر زکوۃ فرض ہے، جو چیز بھی بیچنے کی نیت سے خریدی جائے وہ مالِ تجارت میں داخل ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۴/۲۹۵)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

تجارتی پلاٹ چونکہ مالِ تجارت ہے اس لئے اس کی پوری مالیت پر زکوۃ فرض ہے۔ (ایضاح المسائل: ص۱۰۶)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

کتبِ تجارت میں زکوۃ کا حکم:

سوال: تجارتی کتابوں میں زکوۃ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: جو کتابیں تجارت کی غرض سے رکھی ہوں اور اس پر سال گزر جائے تو زکوۃ ادا کرنا لازم ہے۔

ملاحظہ ہو الفقہ الحنفی وادلتہ میں ہے:

روى البيهقي عن مجاهد في قوله تعالىٰ: ﴿أنفقوا من طيبات ما كسبتم﴾. (البقرة:٢٦٧). قال: التجارة، ومماأخرجنالكم من الأرض، قال: النخل وروى أيضاً عن سمرة بن جندب ﷺ: أما بعد فإن رسول الله ﷺ كان يأمرناأن نخرج الصدقة من الذي نعد للبيع (سنن ابی داود: ١/٢٢٥) ...فالزكاة واجبة فى عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصاباً من الذهب، أو الفضة. (الفقه الحنفى وادلته: ١/٣٥٣، زكاة عروض التجارة، بيروت).

امداد الاحکام میں ہے:

کتبِ تجارت میں زکوٰۃ کا حکم:

جو کتابیں آپ کے پاس موجود ہیں، اور ان پر سال گزر گیا تو انہی ایک ہزار میں سے ۲۵ عدد کتابیں زکوٰۃ میں نکال دی جائیں، یا ۲۵ کتابوں کی قیمت دیدی جائے، جو آسان ہو اور انفع للفقراء ہو۔ (امداد الاحکام: ۲/ ۳۱).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مرغی خانہ اور مچھلی کے تالاب پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: مرغی خانہ اور مچھلی کے تالاب پر زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: مرغی خانہ اور مچھلی کے تالاب کی زمین اور متعلقہ سامان وغیرہ پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے، البتہ مرغیاں، مچھلیاں خریدتے وقت فروختگی کی نیت کی تھی تو سال گزرنے کے بعد ان کی مالیت پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

ملاحظہ ہو ایضاح المسائل میں ہے:

خود مرغی خانہ اور تالاب کی مالیت پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، تالاب میں مچھلیاں اور ان کے بچے خرید کر ڈالتے وقت فروختگی کی نیت کی تھی تو ان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن سیلاب وغیرہ میں مچھلیاں تالاب سے نکل جائیں اتنی پر زکوٰۃ واجب نہیں اور جو رہ جائیں ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ (ایضاح المسائل: ۱۰۷).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

مرغی خانہ اور مچھلی کے تالاب کی زمین، مکان اور متعلقہ سامان پر زکوٰۃ نہیں، مرغیاں اور چوزے خریدتے وقت اگر خود انہی کو بیچنے کی نیت ہے تو ان کی مالیت پر زکوٰۃ فرض ہے، اور اگر ان کی بجائے ان کے انڈے اور بچے بیچنے کی نیت ہے تو زکوٰۃ نہیں، تالاب میں مچھلیاں یا ان کے بچے خرید کر ڈالے ہوں تو ان کی مالیت پر زکوٰۃ فرض ہے، ورنہ نہیں، مرغی خانہ اور تالاب کی آمدنی پر بہر صورت زکوٰۃ ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۴/ ۳۰۰)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فیکٹری، مل، مشین، گاڑی، وغیرہ پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر کسی کی ملکیت میں فیکٹری، مل، مشین، گاڑی، وغیرہ اشیاء موجود ہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں فیکٹری، مل، مشین، گاڑی، وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، ہاں اگر ان اشیاء کی تجارت کرتا ہے تو ان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لأنهامشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية وعلى هذاكتب العلم لأهلها وآلات المحترفين لما قلنا. (الهداية: ١/١٨٦، كتاب الزكاة).

جواہر الفقہ میں ہے:

کارخانے اور مل وغیرہ کی مشینوں پر زکوۃ فرض نہیں، لیکن ان میں جو مال تیار ہوتا ہے اس پر زکوۃ فرض ہے۔

(جواہر الفقہ: ۱/۳۸۵، مسائلِ زکوۃ، دارالعلوم کراچی)۔

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

آلاتِ محترفین پر زکوۃ نہیں ہے، جیسا کہ درمختار میں ہے، **وكذلك آلات المحترفين**۔ (فتاوی دارالعلوم: ۶/۹۳، وامداد الفتاوی: ۲/۴۲، وایضاح المسائل: ۱۰۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تجارتی عمارتوں میں زکوۃ کا حکم:

سوال: اگر کسی کے پاس بہت سی عمارتیں ہیں جن کی وہ تجارت کرتا ہے تو حولان الحول کے بعد وہ عمارتیں جن کو اس نے نہیں بیچا اس پر زکوۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں تجارتی عمارتوں پر سال گزرنے کے بعد زکوۃ واجب ہوگی۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وأما أموال التجارة فتقدير النصاب فيها بقيمتها من الدنانير و الدراهم فلا شيء فيها ما لم تبلغ قيمتها مائتي درهم أو عشرين مثقالاً من ذهب فتجب فيها الزكاة وهذا قول عامة العلماء...لنا ما روي عن سمرة بن جندب ﷺ أنه قال كان رسول الله ﷺ يأمرنا بإخراج الزكاة من الرقيق الذي نعده للبيع...وقال ﷺ "هاتوا ربع عشر أموالكم". (بدائع الصنائع: ٢/٢٠، فصل في أموال التجارة، سعيد).

ہدایہ میں ہے:

الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصاباً من الورق أو الذهب لقوله عليه السلام فيما يقومها فيؤدى من كل مائتي درهم خمسة دراهم ولأنها معدة

للاستنماء بإعداد العبد فأشبه المعد بإعداد الشرع ويشترط نية التجارة ليثبت الإعداد .

(الهداية:١/١٩٥،فصل فى العروض،شركة علمية).

کفایت المفتی میں ہے:

اگر مکانات کی تجارت کی جاتی ہے تو بحیثیت مال تجارت ہونے کے ان کی قیمت پر زکوۃ ہوگی۔(کفایت المفتی:۴/۲۶۴).

احسن الفتاوی میں ہے:

تجارت کی نیت سے خرید کردہ زمین اور مکان اور برائے فروخت تعمیر کردہ مکانات کی موجودہ مالیت پر زکوۃ فرض ہے۔(احسن الفتاوی:۴/۲۹۹)۔واللہ ﷻ اعلم۔

کرایہ کے مکان پر زکوۃ کا حکم:

سوال: میں نے ایک مکان کرایہ پر دیا ہے تو کیا اس کی قیمت پر ہر سال زکوۃ واجب ہے یا اس کے کرایہ کی رقم پر واجب ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مکان کی قیمت پر زکوۃ لازم نہیں، البتہ کرایہ کی رقم بقدرِ نصاب ہو یا دوسری رقم کے ساتھ ملا کر بقدرِ نصاب ہو تو سال گزرنے پر زکوۃ لازم ہوگی۔

البحر الرائق میں ہے:

ولو آجر عبده أو داره بنصاب إن لم يكونا للتجارة لا تجب ما لم يحل الحول بعد القبض في قول أبي حنيفة. (البحر الرائق:٢/٢٠٨،كوئته).

درمختار میں ہے:

ولا زكاة على مكاتب...ولا ثياب البدن وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها وكذا الكتب. قال الشامي: ونحوها أي كثياب البدن الغير المحتاج إليها وكالحوانيت والعقارات. (الدر مع الشامي:٢/٢٦٤،٢٦٥،سعيد).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

جائداد کی قیمت پر زکوۃ لازم نہ ہوگی بلکہ کرایہ کی آمدنی پر جو نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے، اور اس پر تنہا یا دیگر رقومِ موجودہ کے ساتھ سال پورا ہو جاوے زکوۃ لازم ہوگی۔(فتاوی دارالعلوم دیوبند:۶/۱۳۳).

آپ کے مسائل میں ہے:

میرے پاس دو مکان ہیں، ایک میں میں خود رہائش پذیر ہوں اور دوسرا کرایہ پر، تو آیا زکوۃ مکان کی مالیت پر ہے یا اس کے کرایہ پر؟

جواب: اس صورت میں زکوۃ مکان کی قیمت پر واجب نہیں، البتہ اس کے کرایہ پر جبکہ نصاب کو پہنچے تو زکوۃ ہوگی۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل: ۳/۳۷۱).

کفایت المفتی میں ہے:

مکان پر یا اس کی قیمت پر تو کسی حال میں زکوۃ نہیں خواہ رہائش ہو یا نہ ہو (کیونکہ غیر نامی ہے) ہاں اگر مکانات کی تجارت کی جاتی ہو تو بہ حیثیت مالِ تجارت ہونے کے ان کی قیمت پر زکوۃ ہوگی۔

(۲) زکوۃ مکان کی قیمت پر نہیں آمدنی پر ہے۔ (کفایت المفتی: ۴/۲۶۳).

ایضاح المسائل میں ہے:

کسی کی ملکیت میں زائد مکان یا دوکان ہے جو کرایہ پر دے رکھا ہے، یا گاڑی، مشین وغیرہ کرایہ پر دے رکھی ہے تو ان کی قیمت پر زکوۃ واجب نہیں بلکہ ان کی آمدنی میں سال گزرنے پر زکوۃ واجب ہے یا پہلے سے نصاب کے بقدر روپیہ یا چاندی وغیرہ موجود ہے تو مذکورہ اشیاء کی آمدنی پر سال گزرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ آمدنی کو سابق رقم کے ساتھ ملا کر زکوۃ ادا کرنا لازم ہے۔ مجمع الانہر: ۱/۲۲، امداد الفتاوی: ۲/۴۱۔ (ایضاح المسائل: ص ۱۰۵، نعیمیہ)

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی محمودیہ: ۹/۴۲۵، جامعہ فاروقیہ۔ واللہ ﷻ اعلم۔

۱۰/ لاکھ کے مکان پر زکوۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنا ۱۰ لاکھ کا مکان کرایہ پر دیا ہے اور اس کی آمدنی کا صرف یہی ذریعہ ہے کرایہ کی آمدنی سالانہ ۲۴ ہزار رینٹ ہے اور وہ اس گھر کی زکوۃ ہر سال ۲۵ ہزار (۱۰ لاکھ میں سے ڈھائی فیصد) ادا کرتا ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں زکوۃ کے اسقاط کا کوئی حیلہ ہے؟

الجواب: جو گھر تجارت کے لئے ہو اس کی قیمت پر زکوۃ ہے اور جو مکان کرایہ کے لئے ہو اس کی قیمت پر زکوۃ نہیں ہے، ہاں کرایہ دوسری رقم کے ساتھ مل کر بقدرِ نصاب ہو کر سال گزر جائے تو اس پر زکوۃ لازم ہوگی ورنہ نہیں۔

البحر الرائق میں ہے:

ولو آجر عبده أو داره بنصاب إن لم يكونا للتجارة لا تجب ما لم يحل الحول بعد القبض في قول أبي حنيفة . (البحر الرائق:۲/ ۲۰۸، کوئٹہ).

درمختار میں ہے:

ولا زكاة على مكاتب... و لا ثياب البدن و أثاث المنزل و دور السكنى و نحوها وكذا الكتب. قال الشامي: و نحوها أي كثياب البدن الغير المحتاج إليها وكالحوانيت و العقارات . (الدر مع الشامي:۲/ ۲٦٤، ۲٦٥، سعید).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

جائداد کی قیمت پر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی بلکہ کرایہ کی آمدنی پر جو نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے، اوراس پر تنہا یا دیگر رقومِ موجودہ کے ساتھ سال پورا ہو جائے زکوٰۃ لازم ہوگی ۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند:۶/۱۴۳).

آپ کے مسائل میں ہے:

میرے پاس دو مکان ہیں، ایک میں میں خود رہائش پذیر ہوں اور دوسرا کرایہ پر، تو آیا زکوٰۃ مکان کی مالیت پر ہے یا اس کے کرایہ پر؟

جواب: اس صورت میں زکوٰۃ مکان کی قیمت پر واجب نہیں، البتہ اس کے کرایہ پر جبکہ نصاب کو پہنچے تو زکوٰۃ ہوگی ۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل:۳/۳۷۱).

کفایت المفتی میں ہے:

مکان پر یا اس کی قیمت پر تو کسی حال میں زکوٰۃ نہیں خواہ رہائش ہو یا نہ ہو (کیونکہ غیر نامی ہے) ہاں اگر مکانات کی تجارت کی جاتی ہو تو بہ حیثیت مالِ تجارت ہونے کے ان کی قیمت پر زکوٰۃ ہوگی۔

(۲) زکوٰۃ مکان کی قیمت پر نہیں آمدنی پر ہے۔ (کفایت المفتی:۴/۲۶۳، ۲۶۴).

ایضاح المسائل میں ہے:

کسی کی ملکیت میں زائد مکان یا دوکان ہے جو کرایہ پر دے رکھا ہے، یا گاڑی، مشین وغیرہ کرایہ پر دے رکھی ہے تو ان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ ان کی آمدنی میں سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہے یا پہلے سے نصاب کے بقدر روپیہ یا چاندی وغیرہ موجود ہے تو مذکورہ اشیاء کی آمدنی پر سال گزرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ آمدنی کو سابق رقم کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے۔ مجمع الانہر:۱/۲۲، امداد الفتاوی:۲/۴۱۔ (ایضاح المسائل:ص۱۰۵، نعیمیہ).

کتاب الفتاوی میں ہے:

مکان پر اس وقت زکوۃ واجب ہوتی ہے جب مکان تجارتی مقصد سے حاصل کیا گیا ہو، مکان ضرورت سے زیادہ ہو، لیکن مقصود تجارت نہ ہو، بلکہ کرایہ پر لگانا، یا کسی اور کام میں استعمال کرنا ہو تو اب اس میں زکوۃ واجب نہیں۔ (کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ ص ۲۷۱)۔

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی محمودیہ: ۹/۴۲۵، جامعہ فاروقیہ، جدید فقہی مسائل: ۱/۲۰۵ تجارت اور کرایہ داری میں فرق۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کرایہ پر دی ہوئی زمین پر زکوۃ کا حکم:

سوال: اگر کسی نے زمین کرایہ پر دی ہے تو زکوۃ کس پر واجب ہوگی؟

الجواب: زمین کے کرایہ کی آمدنی بقدرِ نصاب ہو کر اس پر سال گزر جائے تب زمین کے مالک پر زکوۃ لازم ہوگی اس آمدنی پر ورنہ نہیں۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ولا زكاة على مكاتب...ولا ثياب البدن وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها وكذا الكتب .قال الشامي: ونحوها أي كثياب البدن الغير المحتاج إليها وكالحوانيت والعقارات. (الدر مع الشامي:٢ /٢٦٤،٢٦٥،سعيد).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

جائداد کی قیمت پر زکوۃ لازم نہ ہوگی بلکہ کرایہ کی آمدنی پر جو نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے، اور اس پر تنہا یا دیگر رقومِ موجودہ کے ساتھ سال پورا ہو جائے زکوۃ لازم ہوگی۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۶/۱۳۳)۔

آپ کے مسائل میں ہے:

میرے پاس دو مکان ہیں، ایک میں میں خود رہائش پذیر ہوں اور دوسرا کرایہ پر، تو آیا زکوۃ مکان کی مالیت پر ہے یا اس کے کرایہ پر؟

جواب: اس صورت میں زکوۃ مکان کی قیمت پر واجب نہیں، البتہ اس کے کرایہ پر جبکہ نصاب کو پہنچے تو زکوۃ ہوگی۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/۳۷۱)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

دھوبی کے صابون وغیرہ میں زکوٰۃ کا حکم:

سوال: اگر دھوبی نے کپڑوں کو دھونے کے لئے صابون یا رنگ مثلاً زرد رنگ رکھا ہے تو حولانِ حول کے بعد اس میں زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دھوبی کے صابون وغیرہ میں زکوٰۃ لازم نہیں ہے، کیونکہ ایسی چیز جس کا اثر مصنوعات میں باقی نہیں رہتا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ہاں رنگ خریدا اور اس کی مالیت نصاب کے بقدر ہے اور اس پر سال گزر گیا تب اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

أما إذا كان يبقى أثرها في المعمول كما لو اشترى الصباغ عصفراً أو زعفراناً ليصبغ ثياب الناس بأجر وحال عليه الحول كان عليه الزكاة إذا بلغ نصاباً و إن لم يبق لذلك العين أثر في المعمول كالصابون والحرض لا زكاة فيه. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۲، جديد فقهي مسائل: ۱/۲۰۹)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مکان کا کرایہ کئی سالوں سے ادا نہیں کیا تو اس پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: کرایہ پر دئے ہوئے مکان کا کرایہ کئی سالوں سے وصول نہیں ہوا قرض چلا آرہا ہے تو مکان کے مالک پر اس کی زکوٰۃ ہے یا نہیں نیز وصول ہونے کے بعد گذشتہ کی زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں کرایہ کی رقم پر قبضہ کرنے سے پہلے زکوٰۃ نہیں ہے اور وصول کرنے کے بعد سال گزرنے پر صرف اسی سال کی واجب ہوگی گذشتہ سالوں کی بھی لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

ولو آجر عبده أو داره بنصاب إن لم يكونا للتجارة لا تجب ما لم يحل الحول بعد القبض. (البحر الرائق: ۲/۲۰۸، کوئٹہ).

شامی میں ہے:

لكن قال في البدائع أن رواية ابن سماعة أنه لازكاة فيه حتى يقبض المائتين و يحول الحول من وقت القبض هي الأصح من الروايتين عن أبي حنيفةؒ ، ومثله في غاية البيان.

(شامی: ۲/۳۰۶، باب زكاة المال، سعید).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

تاہم دینِ قوی واوسط کی تعریف پر نظر کی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کی ان عبارتوں میں اجرت سے غلام ہی کی اجرت مراد ہے۔اس لئے کہ دین کی ان دونوں قسموں میں دین کے لئے مال کا عوض ہونا بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ غلام ہی کی خدمت حنفیہ کے یہاں مال کے درجہ میں ہے،اس طرح آزاد کی اجرت دینِ ضعیف قرار پاتی ہے،جس پر ملازمین کو ملکیت تو حاصل ہے''ید'' و قبضہ حاصل نہیں ہے،لہذا اس رقم پر گزرے ہوئے دنوں کی زکوۃ واجب نہیں ہونی چاہئے،علماء ہند میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مفتی جمیل احمد صاحبؒ نے بھی اسی کو ترجیح دیا ہے کہ اس رقم میں گزشتہ ایام کی زکوۃ واجب نہ ہوگی۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۱۶،نعیمیہ)

جدید فقہی مباحث میں ہے:

فقہاء کرام کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ ملک تام کے لئے ملکیت اور قبضہ وتصرف دونوں کا ہونا ضروری ہے،ملک تام کو دوسرے لفظوں میں ملک مطلق اور ملک کامل بھی کہتے ہیں،چنانچہ بدائع الصنائع میں ملک مطلق کی شرح وہی کی گئی ہے جو ابھی اوپر ملک تام کی گزری کہ مالک کو شئ پر ملکیت اور قبضہ وتصرف دونوں حاصل ہو،بدائع الصنائع کی عبارت یہ ہے:

''منها الملک المطلق و هو أن یکون مملوکاً له رقبة و یداً''.بدائع:۲/۹،شامی:۲/۴.(جدید فقہی مباحث:۷/۵۳۵،ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ).

دوسری جگہ ہے:

فرضیت زکوۃ کے لئے مال پر مالک کی ملکیت تام ہونا ضروری ہے اگر مالک کو مال پر ملکیت تام حاصل ہے تو اس صورت میں مالک پر اس مال میں زکوۃ فرض ہے ورنہ نہیں۔فتاوی عالمگیری:۱/۱۷۲،شامی:۱/۵.(جدید فقہی مباحث:۷/۵۳۶،ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ).

مزید ملاحظہ ہو:احسن الفتاوی:۴/۲۶۱۔واللہ ﷻ اعلم۔

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ کا حکم:

سوال: پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: تنخواہ سے جو رقم حکومت کاٹتی ہے وہ استحقاق کے زمرے میں آتی ہے ملکیت نہیں،لہذا وصولی سے پہلے اس پر زکوۃ نہیں،اور حکومت جو سود اس رقم پر دیتی ہے وہ سود نہیں،کیوں کہ سود اپنی مملوکہ رقم پر

مشروط اضافے کا نام ہے، جبکہ یہ رقم مملوکہ نہیں، ہاں اگر اپنی رقم بینک میں جمع کرا کے اس کا مشروط نفع لے تو وہ سود اور حرام کہلائیگا۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

فنقول قسم أبوحنيفة الدين على ثلا ثه أقسام: إلى قوله ... وضعيف وهو بدل ما ليس بمال كالمهر والوصية وغيره إلى قوله ......وفي الضعيف لا تجب ما لم يقبض نصاباً و يحول عليه الحول بعد القبض عليه. (فتح القدير:۲/ ۱٦۷، كتاب الزكاة، دار الفكر).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما دين الوسط فما وجب له بدلاً عن مال ليس للتجارة (إلى قوله) وفيه روايتان عنه وروى ابن سماعة عن أبي يوسف عن أبي حنيفة أنه لا زكاة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض و هو أصح الروايتين عنه الخ. (بدائع الصنائع:۲/ ۱۰، سعيد).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

سرکاری محکموں اور دیگر پرائیویٹ اداروں کے ملازمین کی تنخواہ میں سے جو حصہ فنڈ کے نام کاٹ کر جمع کرلیا جاتا ہے اور اس پر مزید اضافہ کے ساتھ محفوظ کرلیا جاتا ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت اصل رقم اور اضافہ دونوں ملازم کو مل جاتے ہیں تو ایسی صورت میں تفصیل یہ ہے کہ فنڈ کی رقم بالاتفاق دین قوی کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی اور دین ضعیف کے دائرہ میں داخل ہونا زیادہ راجح ہے اس لئے کہ ملازم کا اس رقم پر ابھی قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملازم کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی ہے اسی وجہ سے اضافہ شدہ رقم کو سود کے دائرہ میں داخل نہیں کیا جاتا ہے اور دین ضعیف میں قبضہ کے بعد بالاتفاق سنین ماضیہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی ہے، اس لئے پراویڈنٹ فنڈ پر ماضی کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (امداد الفتاویٰ:۲/۴۹، فتاویٰ محمودیہ:۳/۵۱، کفایت المفتی:۴/۲۸۸و۲۴۶، جواہر الفتاویٰ: ۱/۳۸۵، فتاویٰ رحیمیہ:۵/۱۴۷، عزیز الفتاویٰ:۳۶۸).

أما دين الوسط فما وجب له بدلاً عن مال ليس للتجارة (الى قوله) وفيه روايتان عنه ... الخ. بدائع:۲/ ۱۰، منحة الخالق:۲/ ۲۰۷، و مثله في الشامي:۲/ ۳۰٦ و مثله في مجمع الأنهر:۱/ ۱۹۵. (جدید فقہی مباحث:٦/۲۹۰، ادارۃ القرآن العلوم الاسلامیۃ).

کفایت المفتی میں ہے:

پراویڈنٹ فنڈ پر جو رقم محکمہ کی طرف سے دی جاتی ہے اور اسی طرح دونوں رقموں کے مجموعے پر جو رقم سود کے

نام سے بڑھائی جاتی ہے یہ سب رقم جائز ہے، یہ شرعاً سود نہیں ہے اگر چہ محکمہ اس کو سود کے نام سے موسوم کرتا ہے اوران تمام رقوم کی زکوٰۃ ادا کرنے کا یہ حکم ہے کہ وصولی رقم کے بعد ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے وصول ہونے سے پہلے ادائیگی زکوٰۃ لازم نہیں۔ (کفایت المفتی: ۸/ ۹۷، دارالاشاعت).

فتاوی دارالعلوم دیو بند میں ہے:

ملازمان کی تنخواہ میں سے کچھ روپیہ وضع ہوتا ہے اور پھر اس میں کچھ رقم ملا کر بوقتِ ختم ملازمت ملازموں کو ملتا ہے وہ ایک انعام سرکاری سمجھا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ گزشتہ برسوں کی واجب نہیں ہوتی، آئندہ کو بعد وصول کے جب سال بھر نصاب پر گزر جاوے گا اس وقت زکوٰۃ دینا لازم ہوگا۔ **وعند قبض مائتين مع حولان الحول بعده أي بعد القبض من دين ضعيف و هو بدل غير مال كمهر و دية و بدل كتابة** . الدر المختار: ۲/ ٤۹، باب زكاة المال، سعيد۔ (فتاوی دارالعلوم دیو بند: ۶/ ۳۳۱، مدلل ومکمل).

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ایضاح النوادر: حصۂ دوم ص ۳۱، مکتبہ علمیہ سہارنپور، وجدید فقہی مسائل: از مولانا برہان الدین سنبھلی ص ۱۲۴، ادارہ اسلامیات، لاہور۔ فتاوی قاضی خان: ۱/ ۲۵۲، فتاوی عالمگیری: ۱/ ۱۷۴۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

پینشن فنڈ پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: پینشن فنڈ پر زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟ اگر لازم ہے تو کب ادا کرے پوری رقم وصول ہونے پر یا ہر سال ادا کرے؟

الجواب: پینشن فنڈ حکومت کی طرف سے ہبہ ہے اور ہبہ میں قبضہ سے پہلے ملکیت نہیں آتی لہذا وصول ہونے کے بعد جب سال گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی یا اگر اس کے پاس دوسری رقم موجود ہے تو پینشن کی رقم اس کے ساتھ ملا کر جب سال پورا ہوگا تو پینشن کی رقم کی زکوٰۃ بھی اس کے ساتھ ادا کی جائے۔

کفایت المفتی میں ہے:

پینشن جو ملازم کو ملازمت سے سبکدوشی پر ملتی ہے جائز ہے، اس لئے کہ حکومت کی طرف سے ایک قسم کا عطیہ اور تعاون ہے۔ (کفایت المفتی: ۸/ ۹۷، دارالاشاعت).

پینشن فنڈ کا حکم بعینہٖ پراویڈنٹ فنڈ کی طرح ہے اور اس کے حوالہ جات ذکر کئے جا چکے۔ **واللہ ﷻ اعلم.**

تجارتی شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: شیئرز جو تجارتی سرمایہ ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: شیئرز جو تجارتی سرمایہ ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث میں ہے:

فقہی تصریحات اور اصول کے اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اصل رقم اور منافع کی جو مالیت ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے کہ تجارتی اموال میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس میں بازار کی قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا البتہ اگر کوئی شخص شیرز کی خرید وفروخت کا کاروبار ہی کرتا ہے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیرز کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(جدید فقہی مباحث: ۶/۲۵۱، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

اگر کسی نے کسی کمپنی میں حصص وشیرز خرید کر شرکت کر لی ہے تو اس کے راس المال اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ امداد الفتاوی ۲/۲۱۔ (ایضاح المسائل: ۱۰۶، نعیمیہ)۔

کتاب الفتاوی میں ہے:

چونکہ شیئرز مالِ تجارت کی نمائندگی کرتے ہیں اور مالِ تجارت میں زکوٰۃ واجب ہے، اس لئے حصص میں اس کی مارکیٹ کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ ص: ۲۶۸، نعیمیہ)۔

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی محمودیہ: ۹/۴۲۰، جامعہ فاروقیہ، فتاوی رحیمیہ: ۲/۱۴، فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۶/۱۴۰۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

عمارتی کمپنی کے شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص کے پاس عمارتی کمپنی کا ایک شیئرز ہے تو اس کی آمدنی پر زکوٰۃ ادا کرے یا شیئرز کی قیمت پر یا دونوں پر؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر کمپنی تجارت کرتی ہے تو شیئرز کی اصل رقم اور منافع دونوں پر زکوٰۃ لازم ہے اور اگر کمپنی تجارت نہیں کرتی صرف کرایہ وصول کیا جاتا ہے تو اس کے شیئرز پر زکوٰۃ ہے یعنی منافع پر زکوٰۃ لازم ہے اصل رقم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو کفایت المفتی میں ہے:

کمپنی تجارت کرتی ہے تو زکوٰۃ جمع شدہ رقم پر ہوگی اور اگر کرایہ وصول کرنے کی کمپنی ہے تو جمع شدہ مال پر زکوٰۃ

نہیں، بلکہ حاصل شدہ منافع پر ہوگی۔ (کفایت المفتی: ۴/ ۲۵۷، شیئرز پر زکوٰۃ، دارالاشاعت)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

شیئرز پر زکوٰۃ ہے اگر کمپنی تجارت کرتی ہے، مثلاً کپڑا، لوہا، سامان مشتری وغیرہ فروخت کرتی ہے، سمینٹ بیچتی ہے، بجلی سپلائی کرتی ہے (جیسے الیکٹرک کمپنی) تو شیئرز کی اصل رقم (شیئرز کی قیمت) اور شیئرز کے منافع دونوں پر زکوٰۃ ہے، اور اگر کمپنی تجارت نہیں کرتی صرف کرایہ وصول کیا جاتا ہے جیسے ٹرام کمپنی ریلوے کمپنی تو اس کے شیئرز کے منافع پر زکوٰۃ ہے اصل رقم پر زکوٰۃ نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۱۴)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

کارخانہ کی زمین وتعمیرات ومشین خود فروخت کرنے کے لئے نہیں، بلکہ آمدنی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں تو ان پر زکوٰۃ لازم نہیں ان سے حاصل شدہ آمدنی حسبِ ضابطۂ شرعیہ نقود کی طرح زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹/ ۴۲۷، جامعہ فاروقیہ)۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لأنهامشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية وعلى هذاكتب العلم لأهلها وآلات المحترفين لما قلنا. (الهداية: ۱/ ۱۸٦، كتاب الزكاة)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

کمپنی میں احتیاطی رقم پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: کمپنی سال بھر کاروبار کرنے کے بعد سالانہ نفع کا حساب لگا کر منافع کا کچھ حصہ بطورِ احتیاط کمپنی محفوظ کر لیتی ہے، تاکہ آئندہ کوئی نقصان ہو تو تدارک کیا جائے، اور بقیہ نفع شیئرز ہولڈروں کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ احتیاطی رقم جس کو کمپنی نے محفوظ کرلیا اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں یعنی شیئرز ہولڈر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا یا نہیں؟ جب کہ اس کے قبضہ میں نہیں ہے اور نہ تصرف کا حق حاصل ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں منافع کا وہ حصہ جو کمپنی نے بطور احتیاط محفوظ کرلیا ہے اس کی زکوٰۃ بھی شیئرز ہولڈر کے ذمہ لازم ہے اس لئے کہ یہ دینِ قوی کے حکم میں ہے، نیز کمپنی نے احتیاطی رقم دوبارہ سرمایہ میں داخل کرلی اور دیگر منافع تقسیم کئے تو چونکہ تجارتی شیئرز کمپنی میں اصل اور منافع دونوں پر زکوٰۃ لازم ہے اس وجہ سے شیئرز ہولڈر سرمایہ کی زکوٰۃ بھی منافع کے ساتھ ادا کرینگے۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث میں ہے:

فقہی تصریحات اور اصول کے اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اصل رقم اور منافع کی جو مالیت ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے کہ تجارتی اموال میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس میں بازار کی قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا البتہ اگر کوئی شخص شیرز کی خرید وفروخت کا کاروبار ہی کرتا ہے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیرز کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(جدید فقہی مباحث:۶/۲۵۱، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ)۔

بدائع الصنائع میں ہے:

أما القوي فهو الذى وجب بدلاً عن مال التجارة كثمن عرض التجارة من ثياب التجارة وعبيد التجارة أو غلة مال التجارة ولا خلاف في وجوب الزكاة فيه.(بدائع الصنائع:۲/۱۰، سعید)۔

امدادالفتاویٰ میں ہے:

ابتدائی شرکت میں اصل شریک کا جو مثلاً سو روپے کا تھا، اس میں سے کچھ حصہ تو عمارات وآلات میں لگ گیا اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور کچھ حصہ تجارت میں لگا اس پر مع نفع کے زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ وہ نفع پورا اس شریک کو مل گیا ہو خواہ کچھ تقسیم ہو کر بقیہ سرمایہ میں شامل ہو گیا، مثلاً: سو روپے میں بیس تو عمارات وآلات میں لگ جاویں اور اسی تجارت میں لگ جاویں اور اس اسی پر پندرہ روپیہ نفع میں سے دس تو شریک کو ملے اور پانچ سرمایہ میں داخل کر دئے گئے اب زکوٰۃ ۹۵ روپے واجب ہوگی۔(امدادالفتاویٰ:۲/۲۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مشتری نے پیشگی ثمن ادا کیا تو زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ایک لاکھ رینڈ میں ایک فلیٹ بک کرایا یہ فلیٹ ابھی تک تیار نہیں، مشتری نے ایک لاکھ رینڈ ادا کر دئے تو سال گزرنے کے بعد اس ثمن کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں پیشگی ادا کیا ہوا ثمن مشتری کی ملکیت سے خارج ہو گیا اور بائع کی ملکیت میں داخل ہو گیا لہذا اس ادا کردہ رقم کی زکوٰۃ مشتری پر لازم نہیں ہے بلکہ بائع پر لازم ہوگی۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث میں ہے:

پیشگی ادا کی ہوئی قیمت چونکہ مشتری کی ملکیت سے نکل چکی ہے اور اس پر مشتری کو نہ تو ملکیت حاصل ہے اور نہ قبضہ، اس لئے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہیں ہوگی، البتہ بائع کو اس قیمت پر ملک تام حاصل ہے اس کی

زکوۃ اس پرواجب ہوگی۔

البحرالرائق میں ہے:

رجل اشترى عبداً للتجارة يساوي مائتي درهم ونقد الثمن ولم يقبض العبد حتى حال الحول فمات العبد عند البائع كان على بائع العبد زكاة المائتين...أما على البائع فلأنه ملک الثمن وحال الحول عليه عند البائع...إلى قوله: ولازكاة على المشتري لأن الثمن زال عن ملكه إلى البائع فلم يملک المائتين حولاً كاملاً....فلا تجب عليه الزكاة. البحر الرائق ۲ /۲۰۳، کوئٹہ.(جديد فقهى مباحث:۶/۱۷۳،ادارة القرآن).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

جہاں تک پیشگی رقم کی بات ہے تو یہ واضح ہے کہ یہ رقم مالکِ مکان کی ملکیت میں آجاتی ہے اس لئے مالکِ مکان ہی کو اس کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی...چنانچہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں: و أما زكاة الأجرة المعجلة عن سنين في الإجارة الطويلة التي يفعلها بعض الناس عقوداً ويشترطون الخيار ثلاثة أيام في رأس كل شهر فتجب على الآجر لأنه ملكها بالقبض. (فتح القدير:۲/۱۲۱) پس پیشگی دیئے گئے کرایہ کی زکوۃ مالکِ مکان پرواجب ہوگی۔یعنی کرایہ دار پر اس رقم کی زکوۃ لازم نہیں۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۱۷،نعیمیہ وفتاوی حقانیہ ۳/۵۰۷).

نیز اس صورت کو استصناع بھی بنا سکتے ہیں کہ مشتری نے گویا مالکِ زمین کو دس منزلہ میں پانچویں منزل مشتری کے لیے بنانے کا آڈر دیا اور فلیٹ کا مالک اس کو بنا کر حوالہ کرے گا، تو یہ ایسا ہے جیسے کسی کو میز یا پیالہ یا الماری کے لئے آڈر دیا جائے اور قیمت دے دی جائے تو ثمن مشتری کی ملکیت سے نکل گیا لہذا اس کی زکوۃ زمین کے مالک پر ہوگی ہاں اس استصناع کا عرف متقدمین فقہاء کے زمانے میں نہیں تھا اور اب ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

أما صورة الاستصناع فهو أن يقول إنسان لصانع من خفاف أو صفار أوغيرهما اعمل لي خفاً أو آنية من أديم أونحاس من عندک بثمن كذا ويبين نوع ما يعمل وقدره وصفته فيقول الصانع نعم.

وأما جوازه فالقياس أن لايجوز لأنه بيع ما ليس عند الإنسان لا على وجه السلم، ويجوز استحساناً لإجماع الناس على ذلک لأنهم يعملون ذلک في سائر الأعصار من غيرنكير ....وأما شرائط جوازه....منها أن يكون مما يجري فيه التعامل بين الناس من أواني الحديد

والرصاص والنحاس و الزجاج و الخفاف والنعل. (بدائع الصنائع:۵/۲ کتاب الاستصناع).

واللہ تعالیٰ اعلم۔

مشترک کاروبار میں وجوبِ زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک مشترک کمپنی یا فیکٹری ہے جس میں کئی حصہ دار ہیں، تو کیا کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور اس کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب: کسی کمپنی کی حیثیت بذاتِ خود نہیں ہوتی بلکہ تاجروں کی تجارت سے ہوتی ہے، لہذا مشترکہ کاروبار کے حصہ داروں کی زکوٰۃ مجموعی رقم پر یا مجموعہ مال پر واجب نہیں، بلکہ ہر شریک کی زکوٰۃ اس کے حصہ کے حساب سے واجب ہوگی، تو جس شریک کا حصہ نصاب تک نہیں پہنچتا اور اس کے علاوہ دیگر مال بھی نہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اور ہر شریک اپنے حصہ کی زکوٰۃ خود ادا کریگا۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

ولا تجب الزكاة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وإن صحت الخلطة ... و إن تعدد النصاب تجب إجماعاً، ويتراجعان بالحصص، وبيانه، في الحاوي، فإن بلغ نصيب أحدهما نصاباً زكاه دون الآخر، قوله في نصاب مشترك، المراد أن يكون بلوغه النصاب بسبب الاشتراك وضم أحد المالين إلى الآخر بحيث لا يبلغ مال كل منهما بانفراده نصاباً. قوله وإن تعدد النصاب، أى بحيث يبلغ قبل الضم مال كل واحد بانفراده نصاباً فإنه يجب حينئذٍ على كل منهما زكاة نصابه. (فتاوى الشامي:۲/۳۰٤، سعيد).

بدائع الصنائع میں ہے:

فأما إذا كانت (السوائم) مشتركة بين اثنين فقد اختلف فيه قال أصحابنا أنه يعتبر في حال الشركة ما يعتبر في حال الانفراد وهو كمال النصاب في حق كل واحد منهما، فإن كان نصيب كل واحد منهما يبلغ نصاباً تجب الزكاة وإلا، فلا. (بدائع الصنائع:۲/۲۸،سعيد).

مزید ملاحظہ فرمائیں: فتاوی دارالعلوم:۶/۶۷، مدلل ومکمل۔ وایضاح النوادر:۲/۳۹۔ وامداد الفتاوی:۳/۱۳۰، وفتاوی حقانیہ:۳/۵۰۴۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ثمنِ بیع الوفا پر وجوبِ زکوۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دوسرے سے کوئی چیز ۵۰ ہزار میں خریدی، بائع نے مشتری سے کہا کہ جب میں آپ کی دی ہوئی قیمت واپس کردوں گا تو آپ مجھے مبیع واپس کردینا، اب اداشدہ قیمت کی زکوۃ کس پر واجب ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عقد مذکور کو اصطلاحِ فقہاء میں بیع الوفاء سے نامزد کرتے ہیں اور بہت سے حضرات کے نزدیک یہ بیع جائز ہے، اور بائع ثمن کا مالک ہے، جس طرح مشتری مبیع کا مالک بن گیا لہذا اس رقم کی زکوۃ بائع کے ذمہ واجب ہوگی۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

و بيع الوفاء ذكرته هنا تبعاً للدرر، صورته أن يبيع العين بألف على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين، وسماه الشافعية بالرهن المعاد ويسمى بمصر بيع الأمانة وبالشام بيع الإطاعة، وقيل هو رهن فتضمن زوائده، وقيل بيع يفيد الانتفاع به، وفي إقالة شرح المجمع عن النهاية: وعليه الفتوى. (الدر المختار:۵/۲۷۶،سعيد).

وقال ابن عابدين الشاميؒ: في بيان ما تغير بالعرف: وإفتاء هم عن طين الشارع للضرورة وبيع الوفاء به . (شرح عقود رسم المفتي:۳۹).

مزید ملاحظہ فرمائیں: البحر الرائق :۷/۶،کوئٹہ۔والفتاوی البزازية على هامش الهندية:۴/۴۰۵۔والخانية على هامش الهندية:۲/۱۶۵۔وامداد الفتاوی:۳/۱۰۶۔۱۰۹۔ وامداد المفتين:۲/۸۳۸۔والمقالات الفقهية:۳۲۹۔۳۵۶).

ان تمام کتب میں بیع الوفاء کے بارے میں جواز مرقوم ہے۔

زکوۃ کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں:

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

وفي بيع الوفاء المعهود بسمرقند تجب زكاة الثمن على البائع. (فتاوی قاضيخان على هامش الهندية:۱/۲۵۴، فصل في اموال التجارة).

شامی میں ہے: قالوا: ثمن المبيع وفاء إن بقي حولاً فزكاته على البائع لأنه ملكه. (فتاوی الشامی:۲/۲۶۱،مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاءً،سعيد)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

فصل چہارم

جانوروں کی زکوٰۃ کا بیان

گایوں پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: لوگ گایوں کو پالتے ہیں اور ان کے لئے مخصوص فارم ہوتے ہیں تو ایسی گایوں پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کسی نے گایوں کا فارم قائم کیا ہے اور اس کی افزائش کرتا ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، فقہاء نے جانوروں کی زکوٰۃ کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہے اس کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے اور اگر خود گایوں کی افزائش نہیں کرتا بلکہ خرید وفروخت کرتا ہے تو قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ملاحظہ ہو الدر المختار میں ہے:

(نصاب البقر والجاموس) ولو متولداً من وحش وأهلية.... إلى(ثلا ثون سائمة) غير مشتركة (و فيها تبيع)الخ.

شامی میں ہے:

(سائمة) فلو علوفة فلا زكاة فيها إلا إذا كانت للتجارة، فلا يعتبر فيها العدد بل القيمة.

(شامی:۲/ ۳۰٤).

احسن الفتاوی میں ہے:

جن مواشی کا غالب چارہ گھر میں ہو یا ہر چرنا کم ہو ان پر زکوٰۃ نہیں، البتہ تجارت کی نیت سے خریدے ہو تو ان کی قیمت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ (احسن الفتاوی:۴/۲۷۲).

فتاوی قاضی خان میں ہے:

الزكاة فرض على المخاطب إذا ملك نصاباً نامياً حولاً كاملاً والمال النامي نوعان السائمة ومال التجارة، أما السائمة فهي الراعية التي تكتفي بالرعي، يطلب منها العين وهو النسل واللبن، فإذا علفها في مصر أو غير مصر فهي علوفة وليست بسائمة. (فتاوی قاضی خان: ۱/۲٤٥).

مزید ملاحظہ ہو: کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ ص۳۴۶، جانوروں کی زکوۃ، مکتبہ نعیمیہ۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

فارم میں بھیڑ بکریوں پر زکوۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے فارم کرایہ پر لیا ہے ۱۰۰ سال کے لئے اور اس میں بھیڑ بکریاں اور گائیں رکھی ہیں، کیا ان پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ کیونکہ کرایہ کی مشقت ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر جانوروں کو نسل بڑھانے کے لئے رکھا ہے اور بقدرِ نصاب ہیں تو سال گزرنے کے بعد بضابطہ شرعیہ زکوۃ لازم ہوگی، اور اگر خرید وفروخت کرتا ہے تو قیمت پر زکوۃ لازم ہوگی اور فارم کا کرایہ اس کے منافی نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

السائمة شرعاً المكتفية بالرعي....قلت: لكن في القاموس: الكلأ كجبل العشب رطبه و يابسه فلم يقيده بالمرعى ... (شامی: ۲/۲۷٥، سعید).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

فإن كانت تسام في بعض السنة وتعلف في البعض فإن اسيمت في أكثرها فهي سائمة وإلا فلا. (الفتاوی الهندية: ۱/۱۷٦).

فتاوی قاضی خان:

أما السائمة فهي الراعية التي تكتفي بالرعي. (فتاوی قاضی خان: ۱/۲٤٥)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

گھوڑوں پر زکوۃ کا حکم:

سوال: کیا وہ گھوڑے جو نسل بڑھانے کے لئے رکھے جاتے ہیں ان میں زکوۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: نسل بڑھانے کے لئے جو گھوڑے رکھے جاتے ہیں ان میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ولا شيء في خيل سائمة عندهما وعليه الفتوى، خانية وغيرها...وفي الشامي: وقيد بالسائمة لأنها محل الخلاف، أما التي نوى بها التجارة فتجب فيها زكاة التجارة اتفاقاً، قوله عندهما: لما في الكتب الستة من قوله عليه الصلاة والسلام:"ليس على المسلم في عبده وفرسه صدقة". زاد مسلم: "إلاصدقة الفطر" قوله وعليه الفتوى، قال الطحاوي: هذا أحب القولين إلينا، ورجحه القاضي أبوزيد في الأسرار، وفي الينابيع وعليه الفتوى وفي الجواهر: والفتوى على قولهما، وفي الكافي: هو المختار للفتوى، وتبعه الزيلعي والبزازي تبعاً للخلاصة، وفي الخانية قالوا: الفتوى على قولهما تصحيح العلامة قاسم.قلت: وبه جزم في الكنز. (الدرالمختارمع الشامی:۲/۲۸۲،سعید).

مزید ملاحظہ ہو: الفتاوی الهندية:۱/۱۷۸،وفتاوی قاضی خان:۱/۲۴۹،والبحرالرائق:۲/۲۱۶،وتبیین الحقائق:۱/۲۶۵،ودررالحکام فی شرح غررالاحکام:۱/۱۷۷۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿و اٰتوا حقہ یوم حصادہ﴾

(سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱٤۱)

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

﴿فیما سقت السماء والعیون أو کان عثریاً العشر وما سقي بالنضح نصف العشر﴾

(بخاری شریف)

باب......﴿۲﴾

عشر اور خراج کا بیان

باب ...... ﴿۲﴾

عشر اور خراج کا بیان

پاکستان ہندوستان کی زمینوں کا حکم:

سوال: پاکستان اور ہندوستان میں بعض نہریں انگریزوں نے بنوائی ہیں ان نہروں سے سیراب شدہ زمین عشری ہیں یا خراجی؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ انگریزوں نے جاتے وقت یہ نہریں مسلمانوں کو ھبہ کردی تھیں مسلمانوں نے ان سے خریدی نہیں اور نہ قہراً لی تھیں، لہذا اس میں خراج نہیں بلکہ نصف عشر ہے۔

جواہر الفقہ میں ہے:

وہ زمینیں جو پاکستان قائم ہونے سے پہلے غیر آباد تھیں کسی شخص کی ملکیت میں داخل نہیں تھیں پھر انگریزی حکومت نے ان میں آب رسانی کے ذرائع مہیا کر کے لوگوں میں مالکانہ طور پر تقسیم کیں ان میں جو اراضی مسلمانوں کو بلا قیمت یا بالقیمت حاصل ہوئیں وہ عشری ہیں۔ (جواہر الفقہ: جلد دوم: ۲۵۸).

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ آپ رسانی کے ذرائع اگرچہ انگریزوں کے مہیا کردہ ہیں لیکن انہوں نے مالکانہ طور پر تقسیم کردیا تو اب عشری ہوگئی۔

امداد الفتاوی میں ہے:

و يجب أي العشر في مسقى سماء أوسيح كنهر إلى قوله ويجب نصفه في مسقى غرب أي دلو كبير ودالية أي دولاب لكثرة المؤنة .... اس سے معلوم ہوا کہ بارانی زمین میں عشر ہے اور آبپاشی چاہ تالاب میں نصف عشر اور جس زمین کی آبپاشی دونوں طرح ہو تو اس میں غالب کا اعتبار ہے

اور دونوں برابر ہوں تو نصف پیداوار میں عشر اور نصف میں نصف عشر۔ (امداد الفتاویٰ:۲/۶۰، فصل فی العشر والخراج)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بارش سے سیراب ہونے والی نہری زمین پر عشر کا حکم:

سوال: اگر نہری زمین میں کئی سال بارش سے سیرابی ہو پانی دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تو عشر ہوگا یا نصفِ عشر؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عشر واجب ہوگا۔

شامی میں ہے:

ويجب أي العشر في مسقى سماء أو سيح كنهر... قوله ﷺ: "ماسقت السماء ففيه العشر. (الدر المختار مع الشامي:۲/۳۲۵،۶، باب العشر، سعيد).

جواہر الفقہ میں ہے:

مسئلہ: اگر کسی زمین کی آب پاشی کچھ بارش سے کچھ کنویں وغیرہ سے ہوتو اس میں اکثر کا اعتبار کیا جائے گا کہ زیادہ آب پاشی بارانی ہے تو عشر واجب ہوگا۔ (جواہر الفقہ:۲/۲۸۰، دار العلوم کراچی۔ وفتاویٰ محمودیہ:۹/۴۳۵، مبوب ومرتب۔ وامداد الفتاویٰ:۲/۶۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ساؤتھ افریقہ اور استرالیا وغیرہ ممالک میں عشر کا حکم:

سوال: ساؤتھ افریقہ اور استرالیا جیسے ممالک میں کیا عشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: جن ممالک میں مسلمان دار الاسلام کی طرح آرام سے رہتے ہوں اور ان کی ملکیت میں زمین ہو اس میں عشر واجب ہے۔

مبسوط کی عبارت کا یہی مطلب معلوم ہوتا ہے۔ أرأيت قوماً من أهل الحرب أسلموا على دارهم أتكون أرضهم من أرض العشر؟ قال: نعم.

اسی طرح ساؤتھ افریقہ کی جو زمین مسلمان کی ملکیت میں آجائے اس میں عشر یا نصفِ عشر ہوگا۔

اگر وہ زمین غیر مسلم سے خرید لے تو پھر بھی عشر ہے، جیسے کہ ابتداء ہی سے اس کی ملکیت میں آچکی ہو، کیوں کہ پہلے سے یہ زمین نہ عشری تھی نہ خراجی، کیوں کہ وہاں خراج کا نظام اور ترتیب نہیں ہے، جیسے حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے۔

(۲) مبسوط میں جہاں یہ لکھا ہے کہ کوئی شخص دارالحرب میں داخل ہوا اور وہاں کے پہاڑوں میں اس کو کچھ مل گیا اس میں عشر نہیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے اس صورت میں اس نے پہاڑوں میں کاشت نہیں کیا، بلکہ وہاں امان لیکر گیا اور اس کو ایک چیز مل گئی۔

ہدایہ میں ہے:

ومن دخل دارالحرب بأمان فوجد في دار بعضهم ركازاً رده عليهم....وإن وجده في الصحراء فهو له لأنه ليس في يد أحد على الخصوص فلا يعد غدراً ولا شيء فيه.

(الهداية: ۱/ ۲۰۰، باب فی المعادن و الرکاز۔ و کذافی المبسوط: ۲/ ۲۱۵، باب المعادن، ادارة القرآن).

اس میں خمس وغیرہ بھی نہیں، کیوں کہ مالِ غنیمت کے حکم میں نہیں ہے۔

کتاب الخراج میں ہے:

قال أبويوسفؒ: فأما ما سألت عنه يا أمير المؤمنين من حد أرض العشر من حد أرض الخراج فكل أرض أسلم أهلها عليها وهي من أرض العرب أو أرض العجم فهي لهم وهي أرض العشر، بمنزلة المدينة حين أسلم عليها أهلها وبمنزلة اليمن، وكذلك كل من لاتقبل منه الجزية ولايقبل منه إلا الإسلام أو القتل ومن عبدة الأوثان من العرب فأرضهم أرض عشر، وإن ظهر عليها الإمام لأن رسول الله ﷺ قد ظهر على أرضين من أرض العرب وتركها فهي أرض عشر حتى الساعة، وأيما دار من دور الأعاجم قد ظهر عليها الإمام وتركها في أيدي أهلها فهي أرض خراج، وإن قسمها بين الذين غنموها فهي أرض عشر... (كتاب الخراج: ٦٩، فصل حد أرض العشر من أرض الخراج، ادارة القرآن).

نیز ملاحظہ ہو: شامی: ۴/ ۱۷۸، سعید۔ وفتاوی قاضی خان: ۱/ ۲۷۰۔ وجواہر الفقہ: ۲/ ۲۸۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

خودرو گھاس پر عشر کا حکم:

سوال: اگر کسی کی زمین میں گھاس خود بخود اگتی ہے تو کیا اس میں عشر ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں خودرو گھاس پر عشر نہیں، البتہ اگر کسی نے گھاس مقصود بنالیا ہو اور زمین کو اسی کے لئے خاص کر دیا ہو تو عشر واجب ہوگا۔

ملاحظہ ہو فتاوی قاضی خان میں ہے:

ولايجب العشرفي التبن و لا في الحطب و الحشيش. (فتاوی قاضی خان: ۱/۲۷۶، فصل فی العشر).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

فلا عشر في الحطب والحشيش والقصب. (الفتاوی الهندية: ۱/۱۸۶).

ہدایہ میں ہے:

قال أبوحنيفةؒ في قليل ما أخرجته الأراضي وكثيره العشر سواء سقي سيحاً أو سقته السماء إلا القصب والحطب والحشيش. (الهداية: ۱/۲۰۱).

اہم فقہی فیصلے میں ہے:

بشمول گھاس ودرخت وغیرہ پرایسی زمینی پیداوار پرعشر واجب ہے جس کی پیداوار سے مقصود نماء ہوتی ہے اور جیسے آمدنی کی غرض سے پیدا کیا جاتا ہے، لہذا اتمام غذائی اجناس، میوہ جات، پھلوں اور پھولوں پر عشر واجب ہے، البتہ خودرو درخت اور گھاس جن سے حصولِ آمدنی مقصود نہ ہو اس پر عشر واجب نہیں۔ (اہم فقہی فیصلے، ترتیب: حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحبؒ، ص۶۲، ادارۃ القرآن)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

وقف شدہ زمین پر عشر کا حکم:

سوال: کیا وقف شدہ زمینوں پر عشر لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں موقوفہ زمینوں کی پیداوار میں عشر لازم ہے۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث میں ہے:

اوقاف کی زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہے، کیونکہ ادائے عشر کے سلسلے کی آیات واحادیث کا عموم اسے بھی شامل ہے، وجوبِ عشر کے لئے ملکیت شرط نہیں ہے بلکہ پیداوار کا مالک ہونا شرط ہے وجوبِ عشر کا سبب زمین نامی ہونا اور پیداوار کا حاصل ہونا ہے، اور ظاہر ہے کہ اوقاف کی زمین میں بھی یہ دونوں سبب پائے جارہے ہیں لہذا عشر واجب ہوگا، علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

وكذا ملك الأرض ليس بشرط لوجوب العشر وإنما الشرط ملك الخارج فيجب في الأراضي التي لا ملك لها وهي الأراضي الموقوفة لعموم قوله تعالى: ﴿ومما أخرجنا

لکم من الأرض و آتوا حقه یوم حصاده﴾ . "بدائع الصنائع:٢/٥٦". (**جدیدی فقہی مباحث:٩/٨١،ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ**).

امدادالاحکام میں ہے:

زمین وقف متعلق مسجد پر بھی عشر ہے۔قال في العالمکیریة: وکذا ملک الأرض لیس بشرط للوجوب لوجوبه في الأراضي الموقوفة. "الفتاوی الهندیة:١/١٩١". (**امدادالاحکام:٢/٣٥،باب العشر والخراج،دارالعلوم کراچی**).

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

و یجب العشر في الأراضي الموقوفة وأرض الصبیان والمجانین إن کانت عشریة وإن کانت خراجة ففیها الخراج. (الفتاوی القاضی خان: ١/١٧٦ علی هامش الهندیة).

درمختار میں ہے:

ویجب مع الدین وفي أرض صغیر ومجنون ومکاتب ومأذون ووقف...وفي الشامي: إن ملک الأرض لیس بشرط لوجوب العشر وإنما الشرط ملک الخارج، لأنه یجب في الخارج لا في الأرض، فکان ملکه لها وعدمه سواء، بدائع. (الدرالمختارمع الشامی:٢/٣٢٦،باب العشر، سعید).

بدائع الصنائع میں ہے:

فیجب في الأراضي التي لا ملک لها وهي أراضي الموقوفة لعموم قوله تعالیٰ:یاأیها الذین امنوا أنفقوا من طیبات ما کسبتم ومما أخرجنالکم من الأرض وقوله عزوجل: واتوا حقه یوم حصاده ، وقول النبي ﷺ: ما سقته السماء ففیه العشروماسقي بغرب أودالیة ففیه نصف العشرولأن العشر یجب في الخارج لا في الأرض فکان ملک الأرض وعدمه بمنزلة واحد . (بدائع الصنائع:٢/٥٦،سعید۔والفتاوی الهندیة:١/١٨٥) ۔**واللہ تعالیٰ اعلم۔**

گھر میں پھل دار درخت ہوتو اس میں عشر کا حکم:

سوال: اگرکسی کے گھر میں پھل دار درخت لگا ہوتو اس میں عشر واجب ہے یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عشر واجب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی خانیہ میں ہے:

رجل في داره شجرة مثمرة لا عشر فيه وإن كانت البلدة عشرية بخلاف ما إذا كانت في الأراضي. (الفتاوى الخانية على هامش الهندية: ۱/۲۷۷).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو كان في دار رجل شجرة مثمرة لا عشر فيها كذا شرح المجمع لابن الملك. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۶)

جدید فقہی مباحث میں ہے:

رہائشی مکان کی چھتوں پر یا مکان سے متصل افتادہ زمین پر جو سبزیاں اگائی جائیں ان پر عشر نہیں ہے چونکہ وہ عام طور پر تجارت کی غرض سے نہیں لگائیں جاتے اور رہائشی مکان کی زمین عشری نہیں ہے، اس لئے اس سے حاصل ہونے والی سبزیوں اور پھلوں پر عشر واجب نہیں ہے۔ (جدید فقہی مباحث: ۹/۸۰، ادارۃ القرآن، وجدید فقہی مسائل: ۲/۱۰۸، نعیمیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تجارتی زمین میں عشر کا حکم:

سوال: اگر کسی نے زمین تجارت کے لئے خریدی اور اس میں کاشت کی کیونکہ ابھی بکی نہیں تو اس میں عشر ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عشر واجب ہے اس لئے کہ وجوبِ عشر کے لئے پیداوار شرط ہے زمین چاہے تجارتی ہو یا عاریت کی ہو یا وقف کی ہو۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وكذا ملك الأرض ليس بشرط لوجوب العشر وإنما الشرط ملك الخارج فيجب في الأراضي التي لا ملك لها وهي أراضي الموقوفة لعموم قوله تعالىٰ: ﴿يأيها الذين امنوا أنفقوا من طيبات ما كسبتم ومما أخرجنا لكم من الأرض﴾، وقوله عزوجل: ﴿واتوا حقه يوم حصاده﴾، وقول النبي ﷺ: "ما سقته السماء ففيه العشر وما سقي بغرب أو دالية ففيه نصف العشر" ولأن العشر يجب في الخارج لا في الأرض فكان ملك الأرض وعدمه بمنزلة واحد. (بدائع الصنائع: ۲/۵٦، سعید۔ والفتاوى الهندية: ۱/۱۸۵).

مزید ملاحظہ ہو: الفتاوی الهندية: ١/١٨٥ ـ وحاشية الطحطاوي على الدر: ١/٤١٩ ـ وجواهر الفقه: ٢/٢٧٧ ـ وفتاوی محمودیه: ٩/٤٣٨، مبوب ومرتب ـ **واللہ ﷻ اعلم۔**

شہد کی مکھیوں میں عشر کا حکم:

سوال: بعض لوگ شہد کی مکھیوں کو پالتے ہیں اور ان کے لئے خاص جگہ بناتے ہیں اور مشقت اٹھاتے ہیں کیا ایسی مکھیوں کے شہد میں عشر ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں شہد کی مکھیوں میں عشر لازم ہے، کیوں کہ جب عشر کے وجوب کی علت یہ لکھی ہے کہ مکھیاں پھول اور پھل کھاتی ہیں اور پھل اور پھول اکثر لگائے جاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ جو پھول اور پھل لگائے جائیں اور ان کی حفاظت ہو ان میں بھی عشر ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

قوله يجب في عسل أرض العشر ومسقى سماء وسيح بلاشرط نصاب وبقاء إلا الحطب والقصب والحشيش أي يجب العشر فيما ذكر أما في العسل فللحديث" في العسل العشر" ولأن النحل يتناول من الأنوار والثمار وفيهما العشرفكذا فيما يتولد منهما.

(البحر الرائق: ٢/٢٣٧، باب العشر، كوئته، وكذافي الشامي: ٢/٣٢٥، سعيد، والمبسوط: ٢/٢١٦، ادارة القرآن)

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ويجب العشرفي العسل إذاكان في أرض العشر. (الفتاوى الهندية: ١/١٨٦، وكذا في فتاوى قاضيخان: ١/٢٧٦)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

گندم کے بھوسے میں عشر کا حکم:

سوال: گندم کے بھوسے میں عشر لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر گندم دانہ پکڑنے اور پکنے کے بعد کاٹا جاوے تو بھوسے میں عشر واجب نہیں ہے جیسے عام طور پر ہوتا ہے لیکن اگر دانہ پکڑنے اور پکنے سے پہلے کاٹ لیں تو عشر واجب ہے کیونکہ بھوسہ مقصود ہوتا ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولا عشر فيما هو تابع للأرض كالنخل والأشجار وكل ما يخرج من الشجرة

كالصمغ والقطران لأنه لا يقصد به الاستغلال كذا في البحر الرائق، و لايجب في البزور التي لاتصلح إلا للمزارعة والتداوي كبزر البطيخ...(الفتاوى الهندية: ١/١٨٦،فى زكاة الزرع).

درمختار میں ہے:

وتسميته زكاة مجازاً إلا فيما لايقصد به استغلال الأرض نحوحطب وقصب فارسي و حشيش وتبن وسعف وصمغ وقطران وغيره.(الدرالمختار: ٢/٣٢٧)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللہ ﷺ : ”إذا أديت زكاة مالك، فقد قضيت ما عليك“

(ترمذی شریف)

باب......﴿۳﴾

زکوٰۃ ادا کرنے کا بیان

باب......﴿۲﴾

زکوٰۃ ادا کرنے کا بیان

فقیر کو چیک دینے سے زکوٰۃ ادا ہونے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے کسی فقیر کو زکوٰۃ کا چیک دیا اس کے ذریعہ سے وہ بینک سے رقم نکالے گا لیکن رقم چار پانچ دن کے بعد ملتی ہے، کیا زکوٰۃ فی الحال ادا ہوئی یا بینک سے وصول ہو جانے کے بعد ادا ہوگی؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چیک وصول ہونا رقم پر حکمی قبضہ کے مترادف ہے لہذا چیک وصول ہونے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

ملاحظہ ہو الدر المختار میں ہے:

والتمكن من القبض كالقبض فلووهب لرجل ثياباً في صندوق مقفل ودفع إليه الصندوق لم يكن قبضاً لعدم تمكنه من القبض وإن مفتوحاً كان قبضاً لتمكنه منه فإنه كالتخلية في البيع. اختيار. (الدر المختار: ۵/ ٦۹۰، کتاب الهبة، سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

ولو وهب لرجل ثياباً في صندوق مقفل ودفع إليه الصندوق لم يكن قبضاً وإن كان الصندوق مفتوحاً كان قبضاً لأنه يمكنه القبض كذا في المحيط. (البحر الرائق: ۷/ ۲۸٦، کتاب الهبة، كوئته۔ والمحيط البرهاني: ۷/ ۱٦۹، الفصل الثاني فيما يجوز في الهبة ومالايجوز، مكتبه رشيديه)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

نوٹ سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم:

سوال: نوٹ سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب تک نوٹ کو سونا، چاندی سے نہ تبدیل کریں اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب: سابقہ زمانہ میں علماء کے درمیان کچھ اختلاف تھا مثلاً حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مفتی محمد شفیعؒ اور بہت سے علماء کی رائے یہ تھی کہ یہ محض وثیقہ ہے اور اس کی حیثیت قرض کی سند کی ہے۔

لیکن موجودہ زمانہ میں تقریباً اتفاق ہو چکا ہے کہ اب اس نے بذاتِ خود مالیت کی حیثیت اختیار کر لی ہے یعنی نوٹ خود مال اور ثمن ہے نہ کہ محض سند اور وثیقہ، لہذا اس پر زکوٰۃ بھی لازم ہے اگر بقدرِ نصاب ہو تو اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی بھی درست ہے فقیر کو مالک بناتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

دورِ جدید کے محقق وھبہ زحیلی فرماتے ہیں:

والحق وجوب الزكاة فيها(الأوراق النقدية) لأنها أصبحت هي أثمان الأشياء ، وامتنع التعامل بالذهب. (الفقه الاسلامي وادلته:۲/۷۷۲، زكاة الاوراق النقدية، دار الفكر).

پشاور سے شائع ہونے والا ماہ نامہ ''العصر'' میں بھی اس قسم کا مضمون چھپا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

نوٹ بذاتِ خود ثمنِ عرفی بن گئے ہیں، لہذا نوٹوں کے ذریعے زکوٰۃ ادا کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، بلکہ فی الفور ادا متصور ہوگی اور یہی قول قوی ہے۔

نیز مرقوم ہے:

عصرِ حاضر میں کاغذی نوٹوں کا ثمنِ عرفی بن جانا بدیہی حقیقت بن گیا ہے کہ انسانی معاشرے میں انہیں کے ذریعہ تبادلہ اور قوتِ خرید کا حاصل تسلیم کر لیا ہے، ورنہ تو ذاتی حیثیت کاغذی پرزوں سے زیادہ نہیں رکھتا۔ (ماہنامہ ''العصر'' جامعہ عثمانیہ پشاور، ص: ۳۰۔۳۱، ستمبر ۲۰۰۷ء شعبان ۱۴۲۸ھ).

مزید ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل: ۱/۲۲۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بینک کے ذریعہ سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم:

سوال: پاکستان میں لوگ بینکوں میں روپے رکھتے ہیں، حکومت کا قانون یہ ہے کہ حکومت اس رقم سے زکوٰۃ کاٹتی ہے، رقم جمع کرنے والوں کو یہ قانون معلوم ہے، بلکہ غالباً بینک کے کاغذات میں یہ قانون موجود ہے، اس کٹوتی سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ زکوٰۃ ادانہیں ہوتی ،اور مندرجۂ ذیل اشکالات کرتے ہیں:
(۱) بینک مقروض ہے، اس نے زکوٰۃ اپنی رقم سے نکالی، یعنی رقم بینک کی ملکیت میں ہے مالک کی ملک میں نہیں؟
(۲) درحقیقت بینک نے سود کی رقم سے ایک حصہ کاٹا، مثلاً سود کی شرح ساڑھے سات فیصد ہے تو اس کی جگہ ۵ فیصد رقم مالک کو دی تو کٹوتی سود سے ہوئی ، نہ کہ زکوٰۃ سے؟
لہٰذا اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

الجواب: (۱) اس مسئلہ میں ہدایہ کی ایک عبارت سے روشنی ملتی ہے کہ: اگر کسی شخص کا دوسرے پر ہزار رینڈ کا قرضہ ہے اور قرض خواہ نے مقروض سے کہا کہ اس ایک ہزار سے ایک غلام غیر معین خریدلو، پس مقروض نے غلام خریدلیا پھر قرض خواہ کے قبضہ کرنے سے پہلے ہی مقروض کے پاس مرگیا تو یہ مقروض کے مال میں سے ہلاک ہوا، اور اگر قرض خواہ نے قبضہ کرلیا پھر مرا تو یہ قرض خواہ کی ملک میں ہلاک ہوا، اور یہ مسئلہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے، اور صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں قرض خواہ کی ملک میں ہلاک ہوگا، (یعنی مقروض قرض خواہ کی طرف سے وکیل بالقبض ہوگا اور وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہے)۔۔۔۔ پھر اس کے چند سطور بعد صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں: برخلاف اس کے کہ اگر قرض خواہ مقروض کو صدقہ کرنے کا حکم کرے (یعنی صدقہ قرض خواہ کے مال میں سے ادا ہوگا) اس لیے کہ یہاں اس نے مال اللہ تعالیٰ کے لیے صدقہ کیا اور اللہ تعالیٰ معلوم ہے۔

اسی مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے صورتِ مسئولہ میں بینک میں رقم جمع کراتے وقت گویا مالک نے برضا ورغبت یہ کہہ دیا کہ تم میری زکوٰۃ ادا کردیا کرو پھر جب بینک اس طرح زکوٰۃ ادا کردے تو صحیح ہے زکوٰۃ ادا ہوجائیگی، فقیر وکیل بالقبض ہوگا، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب بن کر قبضہ کرے گا پھر اپنے لیے قبضہ کرے گا، گویا کہ فقیر اصل مالک سے وصول کررہا ہے، تو بینک کا زکوٰۃ ادا کرنا اصل مالک کے زکوٰۃ ادا کرنے کی طرح ہے۔
ہدایہ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

ومن له على آخر ألف درهم فأمره أن يشتري بها عبداً بغيرعينه فاشتراه، فمات في يده قبل أن يقبضه الآمر مات من مال المشتري، وإن قبضه الآمرفهوله، وهذا عند أبي حنيفة، وقالا: هو لازم للآمر إذا قبضه المأمور..... بخلاف ما إذا أمره بالتصدق، لأنه جعل المال لله تعالىٰ وهو معلوم. (الهداية:۳/۱۸۶،۱۸۷).

نیز یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے کہ جس پر مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کراچی نے بحث کی تھی اور یہ فیصلہ صادر

فرمایا کہ بینک کا زکوٰۃ کاٹنا صحیح ہے۔

نیز اس اشکال کا جواب احسن الفتاویٰ میں بھی بالتفصیل مذکور ہے، ملاحظہ ہو احسن الفتاویٰ: ۴/۳۱۴۔۳۲۴۔
لیکن اس مسئلہ کو مذکورہ بالا مسئلہ کی روشنی میں دیکھنے سے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

(۲) دوسرا اشکال یہ تھا کہ بینک نے درحقیقت سود کی رقم سے ایک حصہ کاٹا، لہٰذا سود کی رقم سے ادائیگی ہوئی نہ کہ زکوٰۃ سے؟

اس کا جواب یہ کہ بینک میں رقم رکھی جاتی ہے وہ اکثر سودی رقم نہیں ہوتی، ہاں بینک کی طرف سے سود کی جو اضافی رقم حلال رقم کے ساتھ مل جائے اور کل رقم سے زکوٰۃ ادا کردی جائے تو زکوٰۃ حلال مال کی طرف منسوب ہوگی، اور سود کی رقم واجب التصدق سمجھی جائیگی۔ نیز آدمی پر لازم ہے کہ کل سودی رقم بلا نیتِ ثواب صدقہ کردے۔

مثلاً ایک آدمی نے ۱۰۰۰۰۰، ایک لاکھ بینک میں جمع کرائے، اس پر ۱۰۰۰۰، دس ہزار سود آیا بینک نے اس پوری رقم میں سے چالیسواں حصہ یعنی ۲۷۵۰ دو ہزار سات سو پچاس زکوٰۃ نکالی، تو ڈھائی ہزار ایک لاکھ کی زکوٰۃ ہے اور ۲۵۰ ڈھائی سو زکوٰۃ نہیں، بلکہ سودی رقم صدقہ کی، ہاں آدمی پر لازم ہے کہ بقیہ ۹۷۵۰ کو بھی صدقہ کردے، اور سود کا مصرف بھی فقراء ہیں، اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں۔ (مستفاد از فتاوی حقانیہ: ۴/۹۸)۔

یاد رہے مذکورہ بالا تفصیل اس وقت ہے جب کہ بینک نے اس شخص کی زکوٰۃ اس پر سود آنے کے بعد نکالی۔

اور اگر زکوٰۃ نکالنے کے بعد سود آیا مثلاً ایک لاکھ کی زکوٰۃ ۲۵۰۰ نکال کر زکوٰۃ فنڈ میں بینک نے رکھ دی، پھر ۲۵۰۰ پر سود آیا، تو یہ زیادتی فقراء کے حق میں ہی ہوگی، نہ کہ مالک کے حق میں۔ ونظیرہ إبل الزكاة والأضحية إذ ولدت. (مستفاد از فتاوی فریدیہ: ۳/۳۸۰)۔

درمختار میں ہے:

ولدت الأضحية قبل الذبح يذبح الولد معها، وعند بعضهم يتصدق به بلا ذبح.
(الدر المختار: ۵/۳۲۳، سعید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تمام زیورات صدقہ کرنے سے پچھلے سالوں کی ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک آدمی کے پاس بہت سارے زیورات تھے اور سالوں سے ان زیورات کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی پھر تمام زیورات زکوٰۃ کی نیت سے ایک چندے والے کو دیدیے تو کیا تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: تمام زیورات زکوٰۃ کی نیت سے چندے والے کو دیدینے سے گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا

ہوگئی۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

من تصدق بجميع ماله لا ينوي الزكاة سقط فرضها عنه استحساناً لأن الواجب جزء منه فكان متعيناً فيه فلا حاجة إلى التعيين. (الهداية:۱/۱۸۸،كتاب الزكاة).

شرح عنایہ میں ہے:

فلو تصدق بالجميع سقط الجميع. (شرح العناية على هامش فتح القدير:۲/۱۷۰،كتاب الزكاة،دار الفكر).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو دفع جميع النصاب إلى الفقير ينوي به... يقع عما نوى. (الفتاوى الهندية:۱/۱۷۱،كتاب الزكاة)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

زیورات کی زکوۃ میں زیور یا سونا دینے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص زیورات کی زکوۃ ادا کرنا چاہتا ہے تو وزن کے اعتبار سے ادا کرے یا قیمت کے اعتبار سے؟

الجواب: اگر کوئی شخص سونے کی زکوۃ سونے سے ادا کرنا چاہتا ہے تو قیمت کا اعتبار نہیں ہوگا، وزن کے حساب سے زکوۃ ادا کرنا چاہئے، مثلاً چالیس تولے میں ایک تولہ ادا کرے، اور اس میں بناوٹ کا اعتبار نہیں ہے، اور اگر خلافِ جنس سے ادا کرنا چاہتا ہے تو پورے زیور کی قیمت نکلوا کر اس کا چالیسواں حصہ ادا کرے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

أنه لو أدى من خلاف جنسه اعتبرت القيمة .(الشامي:۲/۲۹۷،سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

فلو أدى من خلاف جنسه تعتبر القيمة بالإجماع. (البحر الرائق:۲/۲۲۷،باب زكاة المال،كوئته۔و كذا في تبيين الحقائق:۱/۲۷۸۔و الفتاوى الهندية:۱/۱۷۹).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سونے چاندی کے زیور میں قیمت کا اعتبار نہیں وزن کا اعتبار ہے اگر ۲۰۰ تولہ چاندی کا زیور ہے تو زکوۃ ۵،

تولہ لازم ہے۔(فتاوی محمودیہ:۹/۳۷۸،مبوب ومرتب)۔

نیز مذکور ہے:

اگرزکوٰۃ میں چاندی نہیں دیتے بلکہ اس کی قیمت دیتے ہیں تو جس قیمت میں وہ بازار میں فروخت ہوگی اس قیمت کا اعتبار ہوگا۔(فتاوی محمودیہ:۹/۳۷۹،مبوب ومرتب)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: کتاب الفتاوی:۳/۳۷۹،ازمولانا خالدسیف اللہ صاحب۔وآپ کے مسائل اوران کاحل:۳/۳۶۴۔ وامدادالفتاوی:۲/۴۹۔واللہ ﷻ اعلم۔

پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم:

سوال: پیشگی زکوٰۃ ادا کرنا درست ہے یانہیں؟

الجواب: صاحبِ نصاب اگر پیشگی یعنی سال پورا ہونے سے قبل زکوٰۃ ادا کردے تو زکوٰۃ ادا ہوجائیگی۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ولو عجل ذونصاب زكاته لسنين أولنصب صح لوجود السبب. (الدرالمختار:۲/۲۹۳، كتاب الزكاة،سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ويجوز تعجيل الزكاة بعد ملك النصاب، ولايجوزقبله كذا في الخلاصة. وإنما يجوز التعجيل بثلاثة شروط: أحدهما أن يكون الحول منعقداً عليه وقت التعجيل، والثاني أن يكون النصاب الذي أدى عنه كاملاً في آخر الحول. والثالث أن لايفوت أصله فيما بين ذلك فإذاكان له النصاب من الذهب أو الفضة أو أموال التجارة أقل من المأتين فعجل الزكاة ثم كمل النصاب أوكانت له مائتا درهم أوعروض للتجارة قيمتها مائتادرهم فتصدق بالخمسة عن الزكاة وانتقص النصاب حتى حال عليه الحول والنصاب ناقص أوكان النصاب كاملاً وقت التعجيل ثم هلك جميع المال صار ما عجل به تطوعاً هكذا في شرح الطحاوي، وكما يجوز التعجيل بعد ملك نصاب واحد عن نصاب واحد يجوز عن نصب كثيرة كذا في فتاوى قاضي خان. فلوكان عنده مائتا درهم فعجل زكاة ألف فإن استفاد مالاً أو ربح صار ألفاً ثم تم الحول وعنده ألف فإنه يجوز التعجيل وسقط عنه زكاة الألف، و إن

تم الحول ولم يستفد شيئاً ثم استفاد فالمعجل لايجزئ عن زكاتها فإذا تم الحول من حين الاستفادة كان له أن يزكي كذا في البحر الرائق، ويجوز التعجيل لأكثر من سنة لوجود السبب كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۶۷، الباب الأول في صفة الزكاة)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

عورت کے لئے زیورات کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم:

سوال: ایک عورت مطلقہ ہے اس کے پاس صرف زیورات ہیں جو زکوٰۃ کے نصاب سے زیادہ ہیں اس کے پاس اور کوئی روپیہ نہیں ہے، تو وہ زکوٰۃ کیسے ادا کرے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عورت کے پاس نصاب سے زائد زیورات ہیں لہذا زکوٰۃ دینا لازم ہے، اگر اس کے پاس نقد پیسہ نہیں تو ہر ماہ تھوڑی تھوڑی رقم ادا کردے پھر زیورات بیچنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں ہے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن امرأتين أتتا رسول الله ﷺ وفي أيديهما سواران من ذهب، فقال لهما: أتؤديان زكاته فقالتا: لا، فقال لهما رسول الله ﷺ: أتحبان أن يسور كما الله بسوارين من نار، قالتا: لا، قال: فأديا زكاته. (ترمذی شریف: ۱/۱۳۸، باب ما جاء في زكاة الحلي، فيصل)۔

کفایت المفتی میں ہے:

عورت اپنے زیور اور جہیز کی مالک ہوتی ہے اور اسی کے ذمہ اس کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور چونکہ اس کے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے روپیہ نہیں ہوتا اس لئے خاوند سے لے کر ادا کرتی ہے یا اس کے امر واجازت سے خاوند ادا کردیتا ہے، اگر خاوند ادا نہ کرے نہ روپیہ دے تو عورت پر واجب ہوگا کہ وہ اپنا سامان بیچ کر ادا کرے کیونکہ واجب اس کے ذمہ ہے۔ (کفایت المفتی: ۴/۲۶۶، کتاب الزکاۃ، پہلا باب، دارالاشاعت)۔

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

جو زیور زوجہ کا مملوکہ ومقبوضہ ہے اور بقدر نصاب ہے اس کی زکوٰۃ اس عورت کے ذمہ ہی واجب ہے اگر اس کا شوہر تبرعاً اس کی طرف سے دیدے یا عورت اس سے لے کر دیدے یا جو خرچ اس کا شوہر اس کو دیتا ہے اس میں سے ادا کردے تو یہ جائز ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہوسکے تو پھر اس عورت کو اسی زیور میں سے زکوٰۃ دینی پڑے گی۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۶/۲۸۵، مدلل ومکمل، دارالاشاعت)۔

دوسری جگہ ہے: اگر اور کوئی صورت ادائے گی زکوۃ کی میسر نہ ہو تو بالضرور ایسا کیا جاوے گا کہ زیور کا کچھ حصہ بقدر زکوٰۃ، زکوٰۃ میں دیا جائے گا یہ فرض اللہ کا ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۶/ ۱۰۹، مدلل و مکمل، دارالاشاعت).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

تھوڑا تھوڑا دینے سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۹/ ۴۶۶، مبوب ومرتب جامعہ فاروقیہ).

آپ کے مسائل اور ان کا حل:

بیوی یا تو اپنا جیب خرچ بچا کر زکوٰۃ ادا کرے یا زیورات کا ایک حصہ زکوٰۃ میں دے دیا کرے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/ ۳۴۵، مکتبہ لدھیانوی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قسط وار زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص زکوٰۃ کی رقم یک مشت ادا کرنے کے بجائے ماہ بماہ قسط وار ادا کرنا چاہتا ہے تو اس طرح ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ کی رقم قسط وار ادا کرنا بھی درست اور صحیح ہے، اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وشرط صحة أدائها نية مقارنة له أي للأداء ولوحكماً أومقارنة بعزل ما وجب كله أوبعضه. (الدر المختار: ۲/ ۲۷۰، سعید).

کتاب الفتاوی میں ہے:

زکوٰۃ کی ادائیگی میں شریعت نے بڑی آسانی رکھی ہے، نصاب پر سال گزرنے پہلے بھی زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے، سال گزرنے کے بعد بھی مہلت ہے کہ حسبِ مواقع و حالات تاخیر سے ادا کرسکتا ہے، البتہ کوشش کرنی چاہئے کہ حتی المقدور جلد سے جلد زکوٰۃ ادا کردے، اسی طرح زکوٰۃ یک مشت بھی دی جاسکتی ہے، اور قسطوں میں بھی، لہذا ماہانہ ایک سو روپے کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کردینا بھی کافی ہے۔ (کتاب الفتاوی: ۳/ ۳۲۳، زمزم).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

کل رقم کا فوراً رمضان میں صرف کرنا ضروری نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی کر کے ادا کرنے سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۹/ ۴۶۷، مبوب و مرتب)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوۃ کی رقم منی آرڈر کرنے سے ادائیگی کا حکم:

سوال: اگر کسی نے زکوۃ کی رقم منی آرڈر کی تو زکوۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں فقیر کے پاس زکوۃ کی رقم منی آرڈر کرنے سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے، یعنی ڈاک کے حوالہ کرنے سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے، اگر چہ درمیان میں ضائع ہوجائے دوبارہ ادا کرنا لازم و ضروری نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی رحیمیہ میں ہے:

زکوۃ کی رقم بذریعہ منی آرڈر اور ڈرافٹ بھیجی جاسکتی ہے، کیونکہ مجبوری ہے۔ (فتاوی رحیمیہ: ۱۶۴/۵).

امداد الفتاوی میں ہے:

في الدر المختار مسائل متفرقة من كتاب الهبة : تمليك الدين ممن ليس عليه الدين باطل إلا في ثلاث: حوالة أو وصية وإذا سلطه أي سلط المملك غير المديون على قبضه أي الدين فيصح حينئذٍ ومنه ما لووهبت من ابنها ما على أبيه فالمعتمد الصحة للتسليط. اس جزئیہ "ومنه ما لو وهبت..." سے معلوم ہوا کہ صورتِ تسلیط میں بالفعل تملیک ہوتی ہے، ورنہ صحت کو تسلیط سے معلل نہ کیا جاتا کیونکہ قبض حسی کے وقت تو صحت ہبہ میں کوئی تردد ہی نہیں پھر اس میں ترجیح صحت کے کوئی معنی نہیں، اس سے ثابت ہوا کہ خود تسلیط تملیک ہے، گو قبل القبض اس تسلیط سے عزل جائز ہو لعدم تمام العقد ...پس جب تسلیط تملیک ہے، اور تملیک کے وقت نیت اداء زکوۃ کافی ہے، اور منی آرڈر بھیجنے میں یقیناً تسلیط ہے، لہذا روانگی منی آرڈر کے وقت نیت کافی ہے۔ (امداد الفتاوی: ۴۵/۲، ادائے زکوۃ بذریعہ منی آرڈر).

ایضاح المسائل میں ہے:

اگر زکوۃ کی رقم فقیر کے پاس منی آرڈر کردی جائے تو زکوۃ کی نیت سے ڈاک کے حوالہ کردینے سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے، لہذا اگر اس کے بعد درمیان میں ضائع ہوجائے تو دوبارہ زکوۃ لازم نہ ہوگی۔ (ایضاح المسائل: ۱۲۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوۃ کی رقم نفع بخش کاروبار میں لگانے سے ادائیگی زکوۃ کا حکم:

سوال: زکوۃ کی رقم کو کسی نفع بخش کاروبار میں لگا کر اس کے منافع فقراء پر تقسیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ فقیر کی تملیک نہیں پائی گئی اور زکوۃ میں فقراء کی تملیک ضروری

ہے لہٰذا یہ صورت جائز نہیں ہے، اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، نیز اس میں درجِ ذیل خرابیاں بھی ہیں:
(۱) زکوٰۃ کو جلد از جلد سال کے اختتام سے پہلے تقسیم کرنا چاہئے جبکہ اس میں زکوٰۃ کا مال محبوس اور بند ہوگیا نیز ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد کارخانہ کے منتظمین کے ورثہ اس کو وراثت سمجھ کر آپس میں تقسیم کرلیں۔ (۲) زکوٰۃ میں تملیک کا ضروری ہونا ایک بدیہی حقیقت ہے اور ﴿آتوا الزکاۃ﴾، أدوا زکاۃ أموالکم. (ترمذی:۱/۱۳۳) کے علاوہ فقہاء نے زکوٰۃ کے مال سے مسجد کی تعمیر، میت کی تکفین وغیرہ سے اس لیے منع فرمایا کہ اس میں تملیک نہیں پائی جاتی۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وقد أمر اللّٰہ الملاک بإیتاء الزکاۃ لقولہ عزوجل: ﴿وآتوا الزکاۃ﴾ والإیتاء ھو التملیک، ولذا سمی اللّٰہ تعالیٰ الزکاۃ صدقۃ بقولہ تعالیٰ: ﴿إنما الصدقات للفقراء...﴾ والتصدق تملیک. (بدائع الصنائع:۲/۳۹،سعید).

فتح القدیر میں ہے:

ولا یبنی بھا مسجد ولا یکفن بھا میت، لانعدام التملیک وھو الرکن فإن اللّٰہ تعالیٰ سماھا صدقۃ، وحقیقۃ الصدقۃ تملیک المال من الفقیر. (فتح القدیر:۲/۲۶۷،دار الفکر۔وکذا فی العنایۃ شرح الھدایۃ:۲/۲۶۷،دار الفکر).

درمختار میں ہے:

وافتراضھا عمري أي علی التراخي، وصححہ الباقاني وغیرہ، وقیل فوري أي واجب علی الفور وعلیہ الفتوی، کما في شرح الوھبانیۃ. (الدر المختار:۲/۲۷۱،سعید).

بہشتی زیور میں ہے:

جب مال پر سال گزر جائے تو فوراً زکوٰۃ ادا کردے، نیک کام میں دیر لگانا اچھا نہیں۔ (بہشتی زیور: تیسرا حصہ:۲۷).

مزید ملاحظہ ہو: شامی:۲/۳۴٤،سعید۔والفتاوی الھندیۃ:۱/۱۸۸۔وتبیین الحقائق:۱/۳۰۰۔وکتاب الفتاوی:۳/۳۰۰۔وفتاوی رحیمیہ:۲/۸)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

فقیر کو بطور قرض زکوٰۃ کی رقم دینے سے ادائیگی کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص زکوٰۃ کی رقم فقیر کو بطور قرض دے، جس میں قرض کی واپسی مطلوب ہو، تو زکوٰۃ

ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں تملیک نہ پائے جانے کی وجہ سے زکوۃ ادا نہ ہوگی۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وقد أمر اللّٰه الملاک بإيتاء الزكاة لقوله عزوجل: ﴿وآتوا الزكاة﴾ والإيتاء هو التمليك، ولذا سمى اللّٰه تعالىٰ الزكاة صدقة بقوله تعالىٰ: ﴿إنما الصدقات للفقراء...﴾ والتصدق تمليك. (بدائع الصنائع:۲/۳۹،سعید).

فتح القدیر میں ہے:

ولا يبنى بها مسجد ولا يكفن بها ميت، لانعدام التمليك وهو الركن فإن اللّٰه تعالىٰ سماها صدقة، وحقيقة الصدقة تمليك المال من الفقير. (فتح القدير:۲/۲٦۷،دارالفكر۔وكذا في العنايةشرح الهداية:۲/۲٦۷،دارالفكر).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

زکوۃ کی رقم فقیر کو بطور قرض دینے کی اجازت نہیں، جب تک ضرورت مند غریب کو اس رقم کا مالک نہ بنایا جائے زکوۃ ادا نہ ہوگی۔ (فتاوی رحیمیہ:۳/۲۰۳۔وفتاوی دارالعلوم دیوبند:۶/۱۹۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

زکوۃ ادا کرنے کا وکیل بنانے کے بعد رقم واپس لینے کا حکم:

سوال: زید نے عمر کو زکوۃ کے ۵۰ ہزار رینڈ فقراء تک پہنچانے کے لیے دیئے، عمر نے ابھی تک زکوۃ تقسیم نہیں کی یا کچھ تقسیم کرلی کہ زید نے عمر سے کہا وہ رقم واپس کردو، میں خود تقسیم کردوں گا، عمر دینے سے انکار کرتا ہے، کیا زید اس رقم کو واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر زید نے عمر کو زکوۃ کے لیے وکیل بنایا اور زکوۃ کی ادائیگی سے قبل ہی اس کو معزول کردیا تو عمر معزول ہوگیا اب زید رقم واپس لے کر خود ادا کردے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے کہ اگر کسی نے دوسو درہم کی زکوۃ ۵ درہم وکیل کو دیئے، وکیل نے اب تک ادا نہیں کیے، پھر پتہ چلا کہ معطی کے پاس دوسو درہم سے ایک درہم کم ہے یعنی اس کو زکوۃ ادا نہیں کرنی ہے، تو معطی وکیل سے ۵ درہم واپس لے سکتا ہے، ہاں اگر وکیل نے فقیر کو پہنچا دیئے تو اب معطی کو مانگنے کا حق نہیں ہے۔

رجل أدى خمسة من المأتين بعد الحول إلى الفقير أو إلى الوكيل لاجل الزكاة، ثم

ظهر فيها درهم ستوقة لم تكن تلك الخمسة زكاة لنقصان النصاب، وإذا أراد أن يسترد الخمسة من الفقير ليس له ذلك وله أن يسترد من الوكيل إن لم يتصدق بها، هكذا في فتاوى قاضيخان. (الفتاوى الهندية:۱/۱۷۲).

معلوم ہوا کہ جو مال بنیتِ صدقہ فقیر تک پہنچ جائے وہ واپس نہیں ہوسکتا، اور جو وکیل کو دیا وہ واپس ہوسکتا ہے، ہاں اگر عامل یا مدرسہ کے سفیر کو زکوۃ کی رقم دی تو اس سے واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ وہ فقراء کا بھی وکیل ہے، اسی لیے اگر عامل کے پاس ہلاک ہوجائے تو زکوۃ ادا ہوجائے گی۔ **ولو هلك المال في يد العامل أوضاع سقط حقه وأجزأ عن الزكاة.** (هندية:۱/۱۸۸).

وفي الدر المختار: لا يخرج عن العهدة بخلاف ما إذا ضاعت في يد الساعي، لأن يده كيد الفقراء.

(الدر المختار مع الشامی:۲/۲۷۰، سعید).

(وکذا فی امدادالمفتین: جلددوم ص ۱۰۸۵۔ وامدادالفتاوی:۳/۳۱۶۔ وجدیدفقہی مسائل:۱/۲۲۷).

ہاں فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے کہا کہ فلاں کی طرف سے دین وصول کرنے کا وکیل ہوں، مدیون نے وکالت سے انکار کر کے دین دے دیا تب بھی مدیون اس رقم کو وکیل سے واپس نہیں لے سکتا۔

درمختار میں ہے:

أدعى أنه وكيل الغائب بقبض دينه فصدقه الغريم أمر بدفعه إليه... وكذا إذا لم يصدقه على الوكالة ودفع له ذلك على زعمه... وفي الوجوه كلها الغريم ليس له الاسترداد حتى يحضر الغائب. (الدر المختار:۵/۵۳۲، سعید).

تکملہ فتح القدیر میں ہے:

" في الوجوه كلها "يعني الوجوه الأربعة المذكورة وهي :(۱) دفعه مع التصديق من غير تضمين (۲) ودفعه بالتصديق مع التضمين (۳) ودفعه ساكتاً من غير تصديق ولا تكذيب (۴) ودفعه مع التكذيب. ليس للغريم أن يسترد المدفوع حتى يحضر الغائب لأن المؤدى صار حقاً للغائب، إما ظاهراً وهو في حالة التصديق أو محتملاً وهو في حالة التكذيب كذا في عامة الشروح . (تكملة فتح القدير:۸/۱۲۸، دارالفکر).

مذکورہ بالا فقہی عبارات کی روشنی میں مسئلہ دین اور مسئلہ زکوۃ میں فرق واضح ہوجاتا ہے اس طور پر کہ دین میں مدیون وکیل سے واپس نہیں لے سکتا کیونکہ دائن کا حق قوی اور مضبوط ہے، اور زکوۃ میں معطی وکیل سے واپس

لے سکتا ہے، اس لیے کہ فقیر کا حق مضبوط نہیں فقیر تک پہنچنے سے ثابت ہوتا ہے، ہاں جو جانبین کے وکیل ہوتے ہیں ان سے بھی واپس نہیں لے سکتا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد انتقال کرجانے پر ادائیگی کا حکم:

سوال: اگر کسی پر زکوٰۃ واجب ہوئی، ادائیگی سے پہلے اس کا انتقال ہوگیا تو کیا مرنے کے بعد اس کے مال میں سے زکوٰۃ نکالی جائیگی یا نہیں؟

الجواب: اس مسئلہ کی چند صورتیں ہیں: (۱) زکوٰۃ واجب ہوئی اور ادا کرنے سے پہلے مرگیا تو اس کی موت کے بعد اس کے مال میں سے زکوٰۃ نہیں نکالی جائے گی، اس لیے کہ زکوٰۃ کے لیے نیت شرط ہے اور یہاں مفقود ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

إذا مات من عليه الزكاة سقطت الزكاة بموته، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ١/١٧٦).

درمختار میں ہے:

وشرط صحة أدائها نية مقارنة له أي للأداء ولوحكماً. (الدرالمختار: ٢/٢٦٨، سعيد).

(۲) اگر میت نے وصیت کی تھی کہ میرے مال کی زکوٰۃ نکال دینا اور زکوٰۃ کی مقدار ثلث سے کم یا برابر ہے تو ورثاء پر زکوٰۃ ادا کرنا لازم اور ضروری ہے۔

(۳) انتقال سے پہلے زکوٰۃ کی رقم علیحدہ کرکے رکھ لی یا وکیل کو دیدی پھر ادائیگی سے پہلے انتقال ہوگیا، اگر میت نے وصیت کی تھی تو کل مال کے ثلث سے ادا کردی جائے گی۔ اور اگر وصیت نہیں کی تھی تو علیحدہ رقم ترکہ میں شمار ہوکر ورثہ کے درمیان تقسیم ہوگی، کیونکہ مزکی مؤکل کی موت سے وکیل معزول ہوگیا، لہذا اب اس کا تصرف صحیح نہیں ہوگا۔ (مستفاد از احسن الفتاوی: ۴/۲۶۵).

درمختار میں ہے:

ولو مات فأداها وارثه جاز، وفي الشامي: "جاز" في الجوهرة: إذا مات من عليه زكاة، أو فطرة أو كفارة أو نذر لم تؤخذ من تركته عندنا، إلا أن يتبرع ورثته بذلك وهو من أهل التبرع ولم يجبروا عليه، وإن أوصى تنفذ من الثلث. (الشامي: ٢/٣٥٩، سعيد).

نیز مذکور ہے:

ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء أو تصدق بكله، وفي الشامي: فلو ضاعت لا تسقط عنه الزكاة ولو مات كانت ميراثاً عنه. (شامی:۲/ ۲۷۰،سعید).

(۴)اوراگرمیت نے زکوٰۃ کی وصیت نہیں کی تھی لیکن بالغ وارث اپنے حصہ سے اپنے مرحوم مورث کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرما کر میت کا ذمہ فارغ کردیں گے۔

شامی میں ہے:

إلا أن يتبرع ورثته بذلك وهم من أهل التبرع، ولم يجبروا عليه. (شامی:۲/۳۵۹،سعید).

کتاب الفتاوی میں ہے:

اگرکسی کے ذمہ زکوٰۃ واجب تھی نہ خوداس نے ادا کی اور نہ اس کے لیے وصیت کی تو اس کے ورثاء پر زکوٰۃ کی ادائے گی واجب نہیں ...لیکن اخلاقی اوراحسانی حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ورثہ اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے کی کوشش کریں، کہ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں" **وما ذلک علی اللّٰه بعزيز**". (کتاب الفتاوی:۳/۳۳۶)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بیٹے کی طرف سے ادا کرنے کے لئے صریح اجازت کا حکم:

سوال: ایک شخص اپنے بیٹے کی طرف سے کئی سالوں سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے، بیٹے کو معلوم ہے لیکن صراحۃً اجازت نہیں دی تو کیا زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں بیٹے کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہوگی اس لئے کہ نفسِ اجازت ضروری ہے صراحۃً ہو یا عرفاً یا سابقاً کسی بھی طرح اجازت سمجھی جائے گی جیسا کہ قربانی کے باب میں فقہاء نے فرمایا ہے البتہ صریح اجازت لے لیں تو اس میں احتیاط ہے جیسا کہ دیگر بعض فقہاء کا قول ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

(ولا يؤدي عن زوجته... ولا عن أولاده الكبار وإن كانوا في عياله) لانعدام الولاية، ولو أدى عنهم أو عن زوجته بغير أمرهم أجزأه استحساناً لثبوت الإذن عادة. (الهداية:۱/ ۲۰۹، باب صدقة الفطر).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولايؤدي عن زوجته ولا عن أولاده الكبار وإن كانوا في عياله، ولو أدى عنهم أوعن زوجته بغير أمرهم أجزأه استحساناً كذا في الهداية، وعليه الفتوى كذا في فتاوى قاضيخان. (الفتاوى الهندية:١/١٩٣).

فتاوی قاضی خان میں ہے:

وليس على الرجل أن يضحي عن أولاده الكبار وامرأته إلا بإذنهم، وعن أبي يوسفؒ أنه يجوز بغير أمرهم استحساناً. (فتاوی قاضی خان :٣/٣٤٥).

شامی میں ہے:

ولوضحّى عن أولاده الكبار وزوجته لا يجوز إلا بإذنهم وعن الثاني يجوز استحساناً بلا إذنهم ....ولعله ذهب إلى أن العادة إذا جرت من الأب في كل سنة صاركالإذن منهم... فإن كان على هذا الوجه فما استحسنه أبويوسف مستحسن. (شامی:٦/٣١٥،کتاب الاضحية، سعيد۔ وكذا فی الفتاوی البزازية علی هامش الهندية:٦/٢٩٥ فصل السابع فی التضحية عن الغير)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

قربانی کا گوشت زکوۃ میں دینے کا حکم:

سوال: قربانی کا گوشت بنیتِ زکوۃ کسی کو دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قربانی کا گوشت بنیتِ زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے ایک ذمہ داری ادا ہو چکی ہے اب دوسرا ذمہ ادا نہیں کرسکتا، ماء مستعمل کی طرح ہے، نیز زکوۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین ہے اور دین یا کسی معاوضہ میں قربانی کا گوشت دینا درست نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وإذا رفع اللحم إلى فقير بنية الزكاة لايحسب عنها في ظاهر الرواية. (شامی:٢/٣٢٨،سعيد).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولايعطى أجر الجزار والذابح لماروي عن رسول اللهﷺ أنه قال: من باع جلد أضحية فلا أضحية له، وروي أن النبي ﷺ قال لعليؓ: تصدق بجلالها وخطامها ولايعطى أجر الجزار منها، وروي عن سيدناعلي كرم الله وجهه أنه قال: إذا أضحيتم فلا تبيعوا لحوم

ضحایاکم .... (بدائع الصنائع:۸۱/۵،سعید)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

مدیون کی طرف سے دائن کا زکوٰۃ کی رقم وصول کرنے کا حکم:

سوال: اگرکسی شخص پرقرض ہواور مستحق زکوٰۃ بھی ہواس کوکسی نے بتادیا کہ میں آپ کا قرضہ ادا کروں گااوردائن کومدیون کی طرف سے زکوٰۃ کی رقم دیدی گئی تو زکوٰۃ اداہوئی یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مدیون دائن کواطلاع کردے کہ فلاں شخص میری طرف سے قرضہ ادا کردے گا آپ میری طرف سے وصول کرلینااس صورت میں دائن اولاً مدیون کی طرف سے قبضہ کرے گا تو زکوٰۃ اداہوجائے گی اور جب تصرف کرے گا تو یہ قبضۂ ضمان ہوگالہذا قرض بھی اداہوجائے گا۔

ملاحظہ ہوشامی میں ہے:

والأصل أن القبضين إذا تجانسا ناب أحدهما عن الآخر، وإذا تغايرا ناب الأعلىٰ عن الأدنىٰ لاعكسه، فقبض الوديعة مع قبض الهبة يتجانسان لأنهما قبض أمانة ومع قبض الشراء يتغايران، لأنه قبض ضمان فلا ينوب الأول عنه. (شامی:۶۹۴/۵،کتاب الھبہ، سعید).

لیکن قبضۂ امان تصرف کرنے سے قبضہ ضمان بن جا تاہے۔ملاحظہ ہوہدایہ میں ہے:

وإن خلطها المودع بماله حتى لايتميز ضمنها. (الھدایۃ:۲۷۳/۳).

شرح مجلّہ میں ہے:

ولو أنفق الوديع يعني الوديعة ثم رد مثله وخلطه بالباقي خلطاً لايتميز معه ضمن الكل (تنوير) أي فيضمن البعض بالإنفاق والبعض بالخلط(طحطاوى). (شرح المجلۃ:۴۳۸/۱،بیروت).

نیز مذکورہے:

لوكان المبيع في يد المشترى عارية أووديعة أورهناً ثم اشتراه من مالكه لايصير قابضاً بمجرد العقد لأن قبض العارية والوديعة والرهن قبض أمانة ولاينوب عن قبض الشراء لأن قبض الشراء مضمون بنفسه ولكن لوفعل المشتري في فصل الوديعة والعارية ما يكون قابضاً منه ثم أراد البائع أخذ المبيع ليحبسه بالثمن لم يكن له ذلك. (شرح المجلۃ:۴۳۸/۱).

شامی میں ہے:

ومنه لوغصب شيئاً ثم اشتراه صار قابضاً بخلاف الوديعة والعارية إلا إذا وصل إليه بعد

التخلية. (شامي:٤/٥٦١،مطلب في حبس المبيع لقبض الثمن، سعيد).

شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مودع کے ہاتھ ودیعت فروخت کی گئی اور تخلیہ کیا گیا پھر اس کے ہاتھ پہنچ کر اس نے تصرف کیا تو مودع کا قبضہ درست ہوگا یہاں بھی جب دائن قبضہ کرنے کے بعد تصرف کرے تو اس کا قبضہ درست ہو جائیگا۔

جدید فقہی مباحث میں ہے:

یہ صحیح ہے کہ بعض صورتوں پر ایک ہی قبضہ دو قبضوں کی کفایت کرتا ہے ایک اصالۃً ہوتا ہے اور ایک نیابۃً لیکن یہ ضابطہ عام نہیں ہے۔ یہاں معاملہ کو ظاہر پر رکھیں تو یہی بات بنتی ہے کہ بازار سے سامان کو حاصل کرنے والا ادارہ کے لیے خریدار اور پھر ادارہ کی طرف سے فروخت کنندہ بھی ہے اور اپنے ہی ہاتھ اس لئے کہ ادارہ سے خریدا بھی ہے، ہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ادارہ کے ساتھ ان کا خریداری کا معاملہ جو کہ مال کے بازار سے حاصل کرنے سے پہلے ہوا ہے وہ تو محض ایک وعدہ ہے اس لیے بازار سے لیتے وقت یہ شخص صرف ادارہ کا وکیل ہے خریداری کے لیے اس کے بعد جب وہ سامان کو حاصل کر کے اپنے قبضہ میں باقی رکھتا ہے اور اس پر مالکانہ تصرف کرتا ہے تو سابق وعدہ کے مطابق وہ ادارہ سے سامان مذکور کو خریدنے والا بن جاتا ہے یوں اس سابق وکالتی ونیابتی قبضہ اب اصالتی یعنی اپنے لیے قبضہ بن جاتا ہے۔ (جدید فقہی مباحث:۳/۴۲۶،ادارۃ القرآن).

لہذا صورتِ مسئولہ میں بھی دائن کا قبضہ اولاً فقیر کی طرف سے قبضہ وکالتی ونیابتی تھا جب اپنے قبضہ میں باقی رکھتا ہے اور اس پر مالکانہ تصرف کرتا ہے تو سابق وعدہ کے مطابق قرض وصول کرنے والا بن جاتا ہے اور وہی سابق وکالتی ونیابتی قبضہ اب اصالتی یعنی اپنے لیے قبضہ بن جاتا ہے اور مالدار کی زکوٰۃ بھی ادا ہو جاتی ہے اور فقیر مقروض کا قرضہ بھی ادا ہو جاتا ہے۔

لیکن بہتر یہ ہے کہ دائن کی بیوی مدیون کی طرف سے وکیل بالقبض بن جائے اور قبضہ کرنے کے بعد اپنے شوہر کو دیدے۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

أويوكل المديون خادم الدائن بقبض الزكاة ثم بقضاء دينه فيقبض الوكيل صار ملكاً للمؤكل. (الاشباه و النظائر: كتاب الحيل ص٤٢٨)۔

قرضہ ادا کرنے کی دوسری صورت:

مدیون کی طرف سے مالدار وکیل بالقبض بن جائے ، پھر دائن کو اس کی طرف سے قرضہ ادا کردے تو

مالدار کی زکوٰۃ اور فقیر کا قرضہ دونوں کی ادائیگی درست ہوجائیگی۔ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

ولو قضى دين حي فقير بغير أمره لم يجز، لأنه لم يوجد التمليك من الفقير لعدم قبضه وإن كان بأمره يجوز عن الزكاة لوجود التمليك من الفقير ؛ لأنه لما أمره به صار وكيلاً عنه في القبض فصار كأن الفقير قبض الصدقة بنفسه وملكه من الغريم . (بدائع الصنائع: ۲/ ۳۹،سعید)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو قضى دين الفقير بزكاة ماله إن كان بأمره يجوز ؛ وإن كان بغير أمره لا يجوز وسقط الدين. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۹۰)۔

لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ قبضہ تو غیر کا ہونا چاہئے اور یہاں (معطی) دینے والا اور (آخذ) لینے والا ایک ہو گئے یہ کیسے صحیح ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہاں غیر ہی کا قبضہ ہے کہ جب مالدار نے مقروض سے اجازت حاصل کر لی تو مالدار مقروض کی طرف سے وکیل بالقبض بن گیا اور وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ ہے جو غیر کا قبضہ ہے۔ اور یہ بات بدائع کی عبارت میں واضح ہے۔

مزید ایک نظیر ملاحظہ کیجئے: فقہاء نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک ہی آدمی بائع اور مشتری نہیں بن سکتا،لیکن موکل کی طرف سے اجازت ہو تو ایسا معاملہ صحیح اور درست ہے۔چنانچہ فتاویٰ بزازیہ میں مرقوم ہے: **الوكيل بالبيع لا يملك شراء ه لنفسه لأن الواحد لا يكون مشترياً و بائعاً فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه...وإن أمره الموكل أن يبيعه من نفسه أو أولاده الصغار أو ممن لا يقبل له شهادته فباع منهم جاز .** (الفتاوى البزازية بهامش الفتاوى الهندية: ۵/ ۷٤٥، الرابع في البيع)۔

مزید دیکھئے: (فتاویٰ دار العلوم زکریا،جلد پنجم،ص۷۴۱)۔

نیز موجودہ دور میں اس کی ایک نظیر یہ بھی ہے کہ مدارس میں جو زکوٰۃ کا مال آتا ہے،راجح قول کے مطابق مہتمم حضرات معطین کی طرف سے بھی وکیل ہوتے ہیں اور مدرسہ کے نادار طلبہ کی طرف سے بھی وکیل ہوتے ہیں،یعنی ایک ہی آدمی معطی بھی ہے اور آخذ بھی ہے۔

مزید دیکھئے: مسئلہ بعنوان: رفاہی تنظیم میں زکوٰۃ دینے سے ادائیگی کا حکم۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بنامِ قرض زکوٰۃ دی اب فقیر قرض واپس کرتا ہے تو اس رقم کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی فقیر کو زکوٰۃ دی اور اس کو قرض کا نام دیا کہ میں قرض دے رہا ہوں پھر فقیر نے اس کو واپس کرنا چاہا مالک نہیں لے رہا تھا، لیکن فقیر نے زبردستی واپس کر دی اب یہ رقم دوبارہ واجب التصدق ہے یا نہیں؟ کیونکہ بظاہر زکوٰۃ ادا ہو چکی ہے؟

الجواب: جو مال واجب التصدق ہو معطی کے لئے اس کا لینا جائز نہیں ہے پس اگر فقیر واپس کرنے پر اصرار کر رہا ہے تو اس کو لیکر کسی اور کو دینا ہے لیکن خود اس رقم کو استعمال نہیں کر سکتا، بہر صورت زکوٰۃ ادا ہو چکی۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ومن أعطى مسكيناً درهماً و سماها هبة أو قرضاً و نوى الزكاة فإنها تجزئه في الأصح.

(الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۱).

ردالمحتار میں ہے:

إنه لا اعتبار للتسمية فلوسماها هبة أو قرضاً تجزئه فى الأصح. (رد المحتار: ۲/۲۶۸، سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

فهي تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي ولامولاه بشرط قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله تعالىٰ، هذا في الشرع كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۰).

امداد الاحکام میں ہے:

اگر زید نے عمرو سے اس کے سوالِ قرض کے بعد یہ نہیں کہا کہ یہ روپیہ قرض نہیں بلکہ ہبہ ہے تو زکوٰۃ بوجہ نیتِ زکوٰۃ کے اس صورت میں بھی ادا ہوگی لیکن اس رقم کو عمرو سے واپس لینا جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ بالکل عود فی الصدقہ ہے....اگر زید نے اس رقم کو واپس لے لیا تو لازم ہے کہ اس کو پھر کسی حیلہ سے عمرو ہی کو واپس کر دے ورنہ اداءِ زکوٰۃ میں شبہ رہے گا، **قال في الشامية تحت قول الدرر: وشرط صحة أدائها نية مقارنة له أي للأداء ما نصه أشار إلى أنه لا اعتبار لتسمية فلو سمّاها هبة أو قرضاً تجزيه على الأصح.**

شامی: ۲/۲۶۸۔(امداد الأحكام: ۲/۱۰، وفتاوى رحيميه: ۳/۱۱۲، واحسن الفتاوى: ۴/۲۶۳)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

فقیر کے پاس زکوٰۃ کی کوئی چیز ہو تو مالداری کے بعد استعمال کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص فقیر ہے اس کو زکوٰۃ میں کوئی چیز دی گئی جس کو وہ استعمال کرتا رہتا ہے، بعد میں وہ

مالدار بن گیا تو مالداری کے بعد اس چیز کو وہ استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ بظاہر استعمال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اب وہ صاحبِ نصاب ہے۔

الجواب: صاحبِ نصاب بن جانے کے بعد بھی اس چیز کو وہ استعمال کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

إنه لاخبث في نفس الصدقة وإنما الخبث في فعل الأخذ لكونه إذلالاً به فلا يجوز ذلك للغني من غير حاجة وللهاشمي لزيادة حرمته والأخذ "أي أخذ الصدقات" لم يوجد من المولىٰ فصار كابن السبيل إذا وصل إلى وطنه والفقير إذا استغنىٰ وقد بقي في أيديهما ما أخذا من الصدقة حيث يطيب لهما. (الهداية:۳/۳۳۹،كتاب المكاتب،باب موت المكاتب وعجزه)۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

فقیر کی ملک میں زکوٰۃ کی اشیاء ہوتو مالدار کے استعمال کا حکم:

سوال: بہت سی مرتبہ فقیر کو زکوٰۃ کی چیزیں ملتی ہیں: مثلاً کتابیں، برتن، بستر، چارپائی، بڈشیٹ وغیرہ وغیرہ اور اس کے پاس صاحبِ نصاب اغنیاء آتے ہیں تو وہ انہی چیزوں کو استعمال کرتا ہے، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ہدایہ ج ۳، کتاب المکاتب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ غنی کے لئے ان چیزوں کا استعمال بطورِ تملیک جائز ہے اور بطورِ اباحت جیسے کہ سوال میں مذکور ہے ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وهذا بخلاف ما إذا أباح للغني والهاشمي لأن المباح له يتناوله على ملك المبيح فلم يتبدل الملك فلا تطيبه. (الهداية:۳/۳۳۹)۔

لیکن اس میں بہت حرج اور دقت ہے مثلاً کسی کے ہاں زکوٰۃ کی قالین بچھی ہے اور وہ اغنیاء سے کہتا ہے کہ یہاں تشریف نہ رکھیں یہ زکوٰۃ کا مال ہے، اس کے علاوہ زکوٰۃ کا مال ظاہر کرنا بھی ذلت سمجھی جاتی ہے، لہٰذا اس مسئلہ میں شارحِ ہدایہ سعدی چلپیؒ کا میلان استعمال کے جواز کی طرف ہے، بندہ فقیر کا میلان بھی اس طرف ہے۔ صاحبِ ہدایہ نے فرمایا ہے کہ صدقہ میں خبث وخرابی نہیں اس کے لینے میں خرابی ہے اس لئے ہاشمی اور غنی کے لئے زکوٰۃ کا لینا ذلت ہے تو حضرت مولانا سعدی چلپی نے فرمایا کہ اگر غنی فقیر کے گھر پر زکوٰۃ کی چیز استعمال کرے تو یہ جائز ہونا چاہئے کیوں کہ بطورِ ملک نہیں لیا صرف استعمال کیا۔قال المصنفؒ: ولا يجوز ذلك للغني من غير

حاجة وللهاشمي لزيادة حرمته. أقول: فعلى هذا لو أباح الفقير للغني أو الهاشمي ينبغي أن يطيب لهما عنده، إذ لا أخذ منهما كما لا يخفى. (تكملة فتح القدير مع حاشية سعدى چلپی:۹/ ۲۱٤، دار الفكر).

نیز زکوٰۃ کے مال میں زکوٰۃ کا بتلانا بھی ضروری نہیں ہے، اسی وجہ سے مالدار حضرات بھی استعمال کر سکتے ہیں ورنہ اگر مالداروں کے استعمال کی اجازت نہ ہوتی تو بتلانا ضروری ہوتا کہ یہ زکوٰۃ کا مال ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بعض حضرات نے مالدار کے لیے استعمال کی اجازت نہیں دی ان کا جواب:

سوال: بعض مفتی حضرات فرماتے ہیں کہ غنی کے لیے حلال نہیں ہے مثلاً حضرت مفتی رشید احمد لدھیانویؒ نے احسن الفتاوی میں عدمِ جواز تحریر فرمایا ہے، نیز یہ بھی فرمایا کہ جن حضرات نے اجازت دی انہوں نے تحقیق نہیں فرمائی چنانچہ ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

مجوزین نے فتوی لکھتے وقت کتب کی طرف رجوع نہیں فرمایا۔ (احسن الفتاوی:۴/ ۲۵۹) اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: عدمِ جواز کی عبارتوں کا جائزہ لینے کے بعد جب اس میں حرج اور دقت محسوس ہوئی تو اس کے مقابل ہی حضرت مولانا سعدی چلپی نے جواز کی تصریح فرمائی ہے اس عبارت کے پیشِ نظر ہم نے جواز کی طرف میلان ظاہر کیا، نیز فتاوی تاتارخانیہ کی عبارت بھی پیشِ خدمت ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

الفقير إذا أباح للغني عين ما أخذ من الزكاة من الطعام هل يحل له التناول؟ قال بعض المشايخ: يحل، وإليه مال شيخ الإسلام. (الفتاوى التاتارخانية:۲/ ۲٦۸، ادارة القرآن)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

اپنا قرضہ دوسرے کو دلواتے وقت زکوٰۃ کی نیت سے ادائیگی کا حکم:

سوال: اگر مقرض نے مستقرض سے کہا کہ میرا قرض زید کو دیدو اور اس میں مقرض نے زکوٰۃ کی نیت کی تو زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر قرض خواہ نے قرض دار کے ادا کرنے سے پہلے زکوٰۃ کی نیت کر لی تو زکوٰۃ ادا ہوگئی۔

فتح القدیر میں ہے:

قال: أعطى رجلاً دراهم ليتصدق بها تطوعاً فلم يتصدق حتى نوى الآمر من زكاة ماله

من غير أن يتلفظ به ثم تصدق المأمور جازت عن الزكاة. (فتح القدير:۲/ ۱۷۰،دارالفكر).

نتائج الافکار میں ہے:

بخلاف ما نحن فيه لأن التوكيل بالقبض يثبت فيه بأمر الآمر، وأنه يسبق الشراء، و بخلاف ما إذا وهب الدين من غير من عليه الدين حيث تصح الهبة ويثبت الأمر من الواهب للموهوب له بالقبض في ضمن الهبة لأن الملك يتوقف إلى زمان القبض فيكون التوكيل بالقبض سابقاً على التمليك معنى. (وبخلاف ما إذا أمره بالتصدق)جواب عن قياسهما على الآمر بالتصدق و لم يذكر في الكتاب و قد ذكرناه في سياق دليلهما(لأنه)أي الآمر بالتصدق (جعل المال لله تعالى) ونصب الفقير وكيلاً عن الله عزوجل في قبض حقه كذا في الكافي وغيره (وهو معلوم) أي الله تبارك وتعالى معلوم فكان كتعيين البائع في المسئلة الأولى، وأما مسئلة التصادق في الشراء، بأن لا دين له عليه فلأن الدراهم والدنانير لا يتعينان في الشراء عيناً أو ديناً ولكن يتعينان في الوكالات، فلما لم يتعينا في الشراء لم يبطل الشراء ببطلان الدين،كذا ذكره الإمام المرغيناني وقاضيخان. (نتائج الأفكار: ۸/ ۶۲باب الوكالة في البيع و الشراء،دارالفكر).

الدرالمختار میں ہے:

(ولو أمره) أي أمر رجل مديونه (بالتصدق بما عليه صح)أمره بجعله المال لله تعالىٰ و هومعلوم كما صح أمره (لو أمر) الآخر المستأجرة بمرمة ما استأجره كما عليه من الأجرة و كذا لو أمره بشراء عبد يسوق الدابة وينفق عليها صح اتفاق للضرورة، لأنه لا يجد الآجر كل وقت فجعل المؤجر كالمؤجرفي القبض. (الدر المختار :۵/ ۵۱۹،باب الوكالة بالبيع والشراء،سعيد).

طحطاوی علی الدر میں ہے:

ولو أمره أي أمر رجل مديونه بالتصدق بما عليه صح أمره بجعله المال لله تعالىٰ وهو معلوم (قوله بجعله المال لله) أي والفقيرغائب عنه والباء للسببية. (طحطاوی علی الدر ۳/ ۲۷۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

واجب مقدار سے زائد ادا کرنے پر آئندہ زکوٰۃ میں محسوب کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے تخمینے سے ایک سال کی زکوٰۃ ادا کی، پھر جب حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے واجب مقدار سے زائد ادا کی تو زائد رقم آئندہ سال کی زکوٰۃ میں شمار کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زائد رقم آئندہ سال کی زکوٰۃ میں شمار کر سکتا ہے۔

فتاوی ولوالجیہ میں ہے:

رجل له أربع مائة درهم فظن أن عنده خمس مائة درهم فأدى زكاة خمس مائة، ثم ظهر أن عنده أربع مائة، فله أن يحتسب الزكاه للسنة الثانية، لأنه أمكن أن يجعل الزيادة تعجيلاً.

(الفتاوى الولوالجية: ۱/ ۱۹۳، الفصل الثالث في تعجيل الزكاة، بيروت، وكذا في الشامي: ۲/ ۲۹۳، سعيد والبحر الرائق: ۲/ ۲۲۵، كوئٹه).

کتاب الفتاوی میں ہے:

سوال: ایک شخص نے دس ہزار روپے بطور زکوٰۃ کے دیدئے، لیکن جب اس نے حساب کیا تو اس پر آٹھ ہزار روپے ہی زکوٰۃ کے واجب ہوئے تھے، تو کیا وہ آئندہ اپنی زکوٰۃ میں اس زائد رقم حساب کر سکتا ہے؟

جواب: جی ہاں! مالکِ نصاب ہونے کے بعد ایک سے زیادہ سالوں کی زکوٰۃ بھی قبل از وقت ادا کی جا سکتی ہے، پس گویا اس نے موجودہ سال کے ساتھ سالِ آئندہ کی زکوٰۃ کا بھی حصہ ادا کر دیا ہے اور یہ درست ہے۔

(کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ ص ۳۲۱، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی).

امداد الاحکام میں ہے:

مقدارِ واجب سے زائد جو رقم زکوٰۃ میں دیدی گئی ہے وہ آئندہ سال کی زکوٰۃ میں محسوب ہو سکتی ہے۔

(امداد الاحکام: ۲/ ۲۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سفیر سے مدرسہ کی زکوٰۃ کی رقم چوری ہو گئی تو زکوٰۃ کا حکم:

سوال: کسی نے مدرسہ کے سفیر کو زکوٰۃ کی رقم دیدی وہ رقم اس سفیر سے گم ہو گئی یا چوری ہو گئی اب دو باتیں دریافت طلب ہیں (۱) زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟ (۲) سفیر ضامن ہو گا یا نہیں؟

الجواب: (۱) اکابرؒ کا اتفاق ہے کہ سفیر مدرسہ کے نادار طلباء کا وکیل ہے اور وکیل کا قبضہ مؤکل کے قبضہ کے برابر ہے اس اعتبار سے زکوٰۃ ادا ہو گئی۔

(۲) سفیر وکیل اور امین ہے لہذا حفاظت کا اچھی طرح انتظام کیا تھا پھر بھی گم ہوگئی یا چوری ہوگئی تو تاوان نہیں آئے گا، لیکن اگر کوتاہی کی ہے تو تاوان آئے گا۔

ملاحظہ ہو ایضاح المسائل میں ہے:

اگر مدارس کے سفراء کے ہاتھ سے زکوٰۃ کی رقم چوری ہوجائے یا مہتمم کے ہاتھ سے چوری یا ضائع ہوجائے اوران کی حفاظت میں کوئی کمی نہیں رہی ہے تو ان لوگوں پر تاوان لازم نہ ہوگا، اور مالک کی زکوٰۃ بھی ادا ہوجائے گی، اس لئے کہ یہ لوگ عملاً وعرفاً فقیر طلبہ کے وکیل ہیں اور وکیل کا قبضہ گویا فقیر کا قبضہ ہے۔

اوراگر ان لوگوں نے حفاظت میں کوتاہی کی ہے یا زکوٰۃ کی رقم میں تبدیلی کی ہے یا اپنی رقم کے ساتھ مخلوط کردیا ہے تو ان لوگوں پر تاوان واجب ہوگا، اور اپنی جیب سے اتنی رقم فقراء کو دینا لازم ہوگا۔ (ایضاح المسائل: ص ۱۲۰، نعیمیہ)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

مہتمم مدرسہ اگر طلبا کا وکیل ہے تو اس کا قبضہ طلبا ہی کا قبضہ ہے، لہذا زکوٰۃ ادا ہوگئی، کسی پر ضمان لازم نہیں۔

(فتاوی محمودیہ: ۹/۵۱۳، مبوب ومرتب)۔

امداد المفتین میں ہے:

مہتممینِ مدرسہ اوران کے مقرر کردہ چندہ وصول کرنے والے عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہوکر فقراء کے وکیل ہیں، معطینِ چندہ کی وکالت صرف اس درجہ میں ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو وکیل تسلیم کرکے اپنا چندہ ان کے حوالہ کردیا تو جب بحیثیتِ وکیل فقراء رقم ان کے قبضہ میں چلی گئی تو وہ فقراء کی ملک ہوگئی، اور زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بھی ایک سوال کے جواب میں فرمایا: یہ طلباء وفقراء مجہول الکمیت والذات ہیں اس کے باوجود ان کی وکالت مہتممانِ مدرسہ کے لئے عرفی طور پر ثابت ہوگئی اوران کا قبضہ فقراء کا قبضہ ہوگیا۔ (امداد المفتین: جلد دوم: ۱۰۸۵، اختیار الصواب، دار الاشاعت)۔

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی خلیلیہ: جلد اول: ۱۵۴، باب المصرف، مکتبۃ الشیخ۔ وجدید فقہی مسائل: ۱/۲۲۶، نعیمیہ)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

شفاخانہ کے لئے زکوٰۃ کی رقم لی تو چوری ہونے پر ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک شفاخانہ ہے اس میں زکوٰۃ کا ایک فنڈ ہے، اس میں دوائیاں خرید کر غریب بیماروں میں

تقسیم کی جاتی ہیں، اگراس مقصد کے لئے زکوٰۃ لی گئی اوروکیل سے ہلاک ہوگئی تو کیا زکوٰۃ ادا ہوئی یانہیں؟

الجواب: عام طور پر ہسپتال سے استفادہ کرنے والے ہسپتال کے اطراف کے لوگ ہوتے ہیں جیسے مدرسہ میں اس مدرسہ کے طلبہ مراد ہیں تو ہسپتال کے مریض فقراء مراد ہیں لہذا زکوٰۃ ادا ہوگئی دوبارہ ادا کرنا لازم نہیں ہے۔ یہ مسئلہ بعینہٖ سفیر مدرسہ والے مسئلہ کی طرح ہے اوراس کے دلائل ذکر کئے جاچکے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوٰۃ ادا کرتے وقت مہر منہا کرنے کا حکم:

سوال: اگرکسی کے ذمہ بیوی کا مہر لازم ہے اوراس کی مقدار ایک لاکھ رینڈ ہے تو کیا زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اس لاکھ کو کم کیا جائے گا یانہیں؟ یا مجموعہ پر زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا؟

الجواب: اگر شوہر مہر ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے یا بیوی عرفاً مطالبہ نہیں کرتی تو مجموعہ پر زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے، اوراگر ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر مہر کی مقدار منہا کرنے کے بعد بقیہ رقم پر زکوٰۃ ادا کرے گا، ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

وذكر البزدوي في شرح الجامع الكبير: قال مشايخنا: في رجل عليه مهرمؤجل لامرأته وهو لا يريد أدائه لايجعل مانعاً من الزكاة لعدم المطالبة في العادة وأنه حسن أيضاً هكذا في جواهر الفتاوى. (الفتاوى الهندية: ١/١٧٣).

اگر باوجود مہر مؤجل ہونے کے یہ شخص فی الحال ادا کرنے کی فکر میں ہے تب تو زکوٰۃ واجب نہیں ورنہ واجب ہے۔ (امداد المفتیین: جلد دوم ص ۴۵۱۔ وفتاوی محمودیہ ۹:۳۱۹، مبوب ومرتب۔ وجدید فقہی مسائل: ۱/۲۲۱۔ وفتاوی دارالعلوم: ۶/۴۶۔ وامداد الاحکام: ۲/۲۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوٰۃ ادا کرتے وقت اخراجات منہا کرنے کا حکم:

سوال: اگرکسی شخص نے کسی کا مکان بنانے کے لئے رقم بھیجی یا اس کی ضرورت کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے کتابیں بھیجی، یا زکوٰۃ کی رقم غریبوں تک پہنچانے کے لئے کسی شخص کو بھیجا تو کرایہ کی رقم زکوٰۃ سے منہا کرسکتے ہیں یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اولاً تو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اخراجات وغیرہ زکوٰۃ کے علاوہ سے ادا کریں، لیکن اگر کوئی صورت نہ بن سکے تو زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرنے کی گنجائش ہونی چاہیئے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها...﴾ (التوبة: ٦٠).

کفایت المفتی میں ہے:

زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے لانے والوں کو اس رقم میں سے اجرتِ عمل دینے کی گنجائش ہے خواہ وہ غنی ہوں۔ (کفایت المفتی:۴/۲۸۶).

مولانا خالد سیف اللہ فرماتے ہیں:

جیسے عاملین زکوٰۃ وعشر فقراء کے حقوق کے تحفظ کے لئے اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں، اسی طرح زکوٰۃ وعشر کے حساب وکتاب اور اس کی تقسیم وغیرہ کے لئے اور بھی عملہ مطلوب ہوسکتا ہے، عام طور سے فقہاء نے اس مسئلہ سے بحث نہیں کی ہے، لیکن علامہ قرطبیؒ نے اس مسئلہ کو بھی تحریر فرمایا ہے:

الحادي عشرة : ودل قوله تعالیٰ: ﴿والعاملين عليها﴾ علی أن كل ما كان من فروض الكفايات كالساعي والكاتب والقسام والعاشر وغيرهم فالقائم به يجوز له أخذ الأجرة عليه. (الجامع لاحكام القرآن:۸/۱۱۳، دار الكتب العلمية).

....غور کیا جائے تو عاملین میں اپنے وسیع معنی کے اعتبار سے صرف محصلین ہی داخل نہیں ہے، بلکہ زکوٰۃ کی جمع وتقسیم کے تمام کارکنان اس میں داخل ہیں۔ (اسلام کا نظام عشر وزکوٰۃ:۱۱۵).

اسلامی فقہ میں ہے:

بہت سی جگہوں میں ریل، بس یا ہوائی جہاز سے جو سامان بھیجا جاتا ہے اس سواری کا کرایہ زکوٰۃ کی مد سے دیا جائے یا نہ دیا جائے؟ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اس مد سے کرایہ نہ دیا جائے..(جیسا کہ مذکور ہے: فتاوی دارالعلوم: ۶/۳۳۵۔ وفتاوی محمودیہ:۹/۴۸۳۔ وفتاوی رحیمیہ:۲/۱۰۔ وفتاوی فریدیہ:۳/۳۹۷۔) مگر راقم الحروف کے نزدیک کرایہ کا پیسہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز ہے۔ اگر ہم کسی مزدور کو غریب کا مکان بنوانے کی غرض سے طلب کریں، یا ہم اس کو زکوٰۃ کا سامان پہنچانے کے لئے دیں اگر ہم اس کی مزدوری زکوٰۃ سے نہ دیں تو مکانات کی تعمیر نہ ہوسکے گی، اور نہ ان تک سامان پہنچ سکے گا،....اور یہ تملیک کے خلاف اس لئے نہیں کہ سارے اخراجات کر کے وہ چیز ہم کسی مستحق کو دیں گے، اس لئے اس کی حیثیت کرایہ کی نہیں بلکہ قیمت کی ادائیگی کی ہے، اگر منی آرڈر اور بیمہ کے ذریعہ ہم اپنی زکوٰۃ دوسری جگہ بھیجیں تو منی آرڈر اور بیمہ کی فیس بھی اگر زکوٰۃ کے روپیہ سے ادا کی جائے تو یہ تملیک کے خلاف نہیں ہے کیونکہ یہ سب اس غریب تک پیسہ پہنچانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ (اسلامی فقہ:۱/۴۷۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوۃ ادا کرتے وقت حکومت کا ٹیکس وضع کرنے کا حکم:

سوال: ٹیکس جو حکومت کی طرف سے لازم ہوتا ہے اگر ادا نہیں کیا یہاں تک کہ زکوہ ادا کرنے کا وقت آ گیا تو وضع کیا جائے گا یا کل رقم پر زکوۃ ہوگی، یعنی ٹیکس مانع عن وجوب الزکاۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر حکوت کی طرف سے ٹیکس لازم ہو جائے اور اس کی مقدار متعین ہو جائے، مثلاً یہ بتلایا گیا آپ کی دکان پر ہم نے اس سال ۵۰ ہزار کا ٹیکس لگایا جو آپ کو ادا کرنا پڑے گا، تو یہ دین ہے جس کو وضع کرنے کے بعد بقیہ رقم کی زکوۃ ادا کی جائے گی، ہاں اگر دکاندار یا کمپنی کے مالک نے کوشش کر کے اس ٹیکس کو ۳۰ ہزار کر لیا اور ۲۰ ہزار بچ گئے تو ان ۲۰ ہزار کی زکوۃ بعد میں ادا کر دے، کیونکہ یہ دین سے مستثنیٰ ہو گئے۔

ملاحظہ ہو حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

وسببها أي سبب افتراضها أي الزكاة ملک نصاب حولي تام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد سواء كان لله كزكاة وخراج أوللعبد ولوكفالة أومؤجلاً ولوصداق زوجته المؤجل للفراق أونفقة لزمته بقضاء أورضي بخلاف دين نذر وكفارة وحج لعدم المطالب.

قوله له مطالب أي بالجبر والحبس وقوله من جهة العباد أي طلباً واقعاً من جهة عبد وهو إما الإمام في الأموال الظاهرة...أو الدائن في دين العباد. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۱/۳۹۰).

شرح العنایہ میں ہے:

وأما النوائب فهي مايلحقه من جهة السلطان من حق أوباطل أوغيرذلک مما ينوبه أنها ديون في حكم توجه المطالبة بها. (شرح العناية على الهداية: ۷/۲۲۲).

فتح القدیر میں ہے:

أما في زماننا فأكثر النوائب توخذ ظلماً ومن دفع الظلم عن نفسه فهوخيرله وإن أراد الإعطاء فليعط من هوعاجز عن دفع الظلم عن نفسه. (فتح القدير: ۷/۲۲۳، دار الفكر).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

دین خواہ مؤجل ہو یا معجّل مانع وجوبِ زکوۃ ہے قول راجح کے مطابق۔ (احسن الفتاوی: ۴/۲۵۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

وکیلِ زکوٰۃ سے رقم چوری ہو جانے پر ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دوسرے کو زکوٰۃ کی رقم دی اس وکیل سے رقم چوری ہوگئی تو زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟ نیز اس وکیل پر تاوان آئے گا یا نہیں؟

الجواب: مستحقین اگر متعین نہیں تھے بلکہ اپنی صواب دید پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا تھا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی دوبارہ ادا کرنا لازم ہے، اور وکیل امین ہوتا ہے اگر اس نے حفاظت میں کوتاہی نہیں کی تھی تو تاوان نہیں آئے گا ورنہ وکیل ذمہ دار ہوگا۔ اور اگر مستحقین متعین تھے مثلاً وہ کسی ادارے کا سفیر یا مہتمم تھا تو اس کا حکم ذکر کیا جا چکا۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

الإيداع شرعاً تسليط الغير على حفظ ماله صريحاً أو دلالة ....وهي أمانة، هذا حكمها مع وجوب الحفظ والأداء عند الطلب واستحباب قبولها، فلا تضمن بالهلاك.

(الدر المختار:٥/٦٦٤،سعيد،و الفتاوى الهندية:٤/٣٣٨).

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

رجل عزل زكاة ماله ووضعها في ناحية بيته، فسرقها سارق لايقطع يده للشبهة وعليه أن يزكيها. (خلاصة الفتاوى: ١/٢٣٨).

در مختار میں ہے:

ولايخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء...وفي الشامي: فلوضاعت لاتسقط عنه الزكاة. (الدر المختار مع الشامي:٢/٢٧٠،سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: فتاویٰ محمودیہ:۹/۴۸۰، مبوب ومرتب۔ وکفایت المفتی:۴/۲۹۷۔ وفتاویٰ فریدیہ:۳/۲۷۵)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

وکیل زکوٰۃ کی رقم اپنے اوپر خرچ کرلے تو ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی کو زکوٰۃ کی رقم فقراء پر خرچ کرنے کے لئے دی چونکہ وہ خود مستحق تھا اس لئے اس نے اپنے اوپر خرچ کرلی تو زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: اگر اعطاء کا لفظ کہا ہو تو دوسرے کو دینا ضروری ہے، اور اگر جیسے چاہو استعمال کرو کہا ہو تو خود استعمال کرسکتا ہے بشرطیکہ مستحق ہو۔

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق کے حاشیہ میں ہے:

لو قال لرجل ادفع زكاتي إلى من شئت أو أعطها من شئت فدفعها لنفسه لم يجز وفي جوامع الفقه جعله قول أبي حنيفةؒ، وقال وعند أبي يوسفؒ يجوز ولوقال ضعهاحيث شئت جاز وضعها في نفسه، وقال في المرغيناني: وكل بدفع زكاته فدفعها لولده الكبير أو الصغيرأوزوجته يجوز ولايمسك لنفسه. (حاشية تبيين الحقائق للشلبي:۱/۳۰۵).

درمختار میں ہے:

والوكيل أن يدفع لولده الفقير و زوجته لا لنفسه إلا إذا قال ربها ضعها حيث شئت...وفي الشامي: الوكيل إنما يستفيد التصرف من المؤكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره، كما لو أوصىٰ لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل.

(الدرالمختارمع الشامي:۲/۲٦۹،سعيد).

فتاوی قاضی خان میں ہے:

رجل دفع زكاة ماله إلى رجل وأمره بالأداء فأعطى الوكيل ولد نفسه الكبير أوالصغير أو امرأته وهم محاويج جاز ولايمسك لنفسه شيئاً. (فتاوی قاضيخان على هامش الهندية: فصل في اداء الزكاة،۱/۲٦۱ فصل في أداء الزكاة۔والفتاوى الهندية:۱/۱۸۹).

بہشتی زیور میں ہے:

تم نے ایک شخص کو اپنی زکوۃ دینے کے لئے دوروپے دئے تو اس کو اختیار ہے چاہے خود کسی غریب کو دیدے یا کسی اور کے سپرد کردے کہ تم یہ روپیہ زکوۃ میں دیدینا....اور وہ شخص وہ روپیہ اگر اپنے کسی رشتہ داریا ماں باپ کو غریب دیکھ کر دیدے تو بھی درست ہے، لیکن اگر وہ خود غریب ہو تو آپ ہی لے لینا درست نہیں، البتہ اگر تم نے یہ کہہ دیا ہو کہ جو چاہے کرو اور جسے چاہے دیدو تو آپ بھی لے لینا درست ہے۔(بہشتی زیور:۲۴۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

وکیل کا زکوۃ کی رقم میں تبدیلی کرنے سے ادائیگی کا حکم:

سوال: مجھے ایک صاحب نے ایک ہزار رینڈ دیکر وکیل بنایا کہ میں ہندوستان میں فلاں کو اس کی زکوۃ پہنچادوں، میں نے بذریعہ حوالہ دوسری رقوم کے ساتھ یہ رقم بھی پہنچادی وہاں میرے نمائندے نے دوسری رقم میں سے زکوۃ ادا کردی تو زکوۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: وکیل کے پاس جب تک زکوٰۃ کی رقم موجود ہے اور دوسری رقم سے زکوٰۃ ادا کردی تو ادا ہو جائے گی، لیکن اگر زکوٰۃ کی اصل رقم خرچ کردی پھر دوسری رقم سے ادا کرتا ہے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں اصل رقم موجود تھی لہذا زکوٰۃ ادا ہوگئی، نیز رینڈ ہندوستان میں نہیں چلتے اس وجہ سے یہاں زکوٰۃ پہنچانے کا مطلب اس کو تبدیل کر کے پہنچانا ہے اس لیے زکوٰۃ ادا ہوگئی، کیونکہ تبدیل کرنے کی اجازت ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

ولو تصدق بدراهم نفسه أجزأ إن كان على نية الرجوع وكانت دراهم المؤكل قائمة ... وفي الشامي: أي الوكيل بدفع الزكاة إذا أمسک دراهم المؤكل ودفع من ماله ليرجع ببدلها في دراهم المؤكل صح، بخلاف ما إذا أنفقها أولاً على نفسه ثم دفع من ماله فهو متبرع. (الدر المختار مع الشامي: ۲/۲۶۹، سعيد).

احسن الفتاوی میں ہے:

زکوٰۃ بہرحال ادا ہو جائے گی، البتہ تبدیل کا جواز اس پر موقوف ہے کہ مؤکل کی طرف سے تبدیل کا اذن صراحۃً یا دلالۃً موجود ہو، موجود عرف میں اس کی اجازت ہے اس لئے صراحۃً اذن کی ضرورت نہیں، معہذا صراحۃً اجازت لے لینا بہتر ہے۔ (احسن الفتاوی: ۴/۲۹۰).

بہشتی زیور میں ہے:

کسی غریب کو دینے کے لئے تم نے دو روپے کسی کو دئے لیکن اس نے بعینہ وہی دو روپے فقیر کو نہیں دئے بلکہ اپنے پاس سے دیدئے تو زکوٰۃ ادا ہوگئی، بشرطیکہ تمہارے روپے اس کے پاس موجود ہوں، البتہ اگر تمہارے روپے اس نے خرچ کرڈالے اس کے بعد اپنے روپے غریب کو دئے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔ (بہشتی زیور: زکوٰۃ کے ادا کرنے کا بیان: ۲۴۵، دار الاشاعت)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بعض مدارس میں تملیک کی بعض صورتیں رائج ہیں ان سے ادائیگی کا حکم:

سوال: بعض محتاط مدارس میں زکوٰۃ کی تملیک کا مندرجۂ ذیل نظام ہے:

نادار طلبہ کو زکوٰۃ کی رقم ۴۰۰ رینڈ دیتے ہیں پھر دوسرا ناظم اس کی رہائش، بجلی، تعلیم اور کھانے پینے کے لئے ۳۰۰ رینڈ لیتا ہے اور ۱۰۰ رینڈ طالبِ علم کے پاس رہتے ہیں یہ نظام بظاہر بہت دلکش اور پیارا ہے، لیکن بعض علماء اس پر مندرجۂ ذیل اشکالات کرتے ہیں:

(۱) اگر کوئی طالبِ علم غیر حاضر رہا، تو غیر حاضری کے ایام کا خرچہ نہیں لینا چاہیئے، حالانکہ کٹی ہوئی رقم میں واپسی کا کوئی طریقہ مروج نہیں؟

(۲) طلبہ کو وظائف کے ملنے سے پہلے اگر وہ شخص مرجائے تو وہ رقم امانت ہونے کی وجہ سے ورثہ کو واپس کرنا چاہیئے؟

(۳) وظائف کی تقسیم سے پہلے اگر حولانِ حول ہوجائے تو پھر زکوٰۃ واجب ہونا چاہیئے، کیونکہ مالک کی ملکیت باقی ہے؟

(۴) نیز کھانے کا معاوضہ بیع ہے اور رہائش، بجلی وغیرہ کی سہولت اجارہ ہے ایک عقد میں بیع اور اجارہ کو جمع کرنا ”صفقة في صفقتين“ ہے جو ممنوع ہے؟

الجواب: نادار طلبہ کو زکوٰۃ کی رقم دینا حقیقۃً تملیک ہے پھر جب طالبِ علم ۳۰۰ رینڈ کی فیس ادا کرتا ہے تو وہ تبرعِ مشروط کے ذیل میں آتا ہے یعنی اس تبرع کے بدلہ میں طالبِ علم کو کھانے پینے، رہائش وغیرہ کی سہولت کی شرط لگائی گئی، تبرعِ مشروط ھبہ بالعوض ہے اگر چند دن طالبِ علم غیر حاضر رہا تو اس کی رقم واپس کرنا ضروری نہیں، نیز اگر طالبِ علم نے پورے سال کی فیس جمع کرادی اور درمیان سال میں چلا گیا تو اس میں بھی بقیہ سال کی فیس کی واپسی شرعاً لازم نہیں، کیونکہ ھبہ بالعوض میں واہب موھوب کو واپس نہیں مانگ سکتا، جبکہ یہاں تو موھوب خرچ ہوچکا ہے یا مخلوط ہوچکا ہے جو استہلاک کہلاتا ہے۔

تبرع مشروط جائز ہے۔ ملاحظہ ہو مولانا ظفر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

سوال: مدارس میں فیس داخلہ اور فیس ماہواری طلبہ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جائز ہے، کیونکہ یہ اجرت نہیں بلکہ چندہ ہے اور چندہ میں شرط جائز ہے کیونکہ اس سے جبر لازم نہیں آتا جس کو شرط منظور نہیں ہوگی اس کو عدم داخلہ کا اختیار ہوگا، ودليله: أنه ﷺ **قال لمن أضافه وعائشة** رضی الله تعالیٰ عنها **قال: لا، قال: فلا إذن حتى قال في الثالثة: وعائشة** رضی الله تعالیٰ عنها **قال: نعم.** مسلم شريف: ۲/۱۷٦۔ (امدادالاحکام: ۳/۲۰٦، کتاب الاجارۃ)۔

(۲) چونکہ مہتمم مدرسہ یا ناظم عامل کے بعض احکام میں عامل کے حکم میں ہے، لہذا اگر اس شخص کا انتقال ہوجائے اور اس کا مال الگ رکھا ہو تو پھر نادار طلبہ کی طرف سے مہتمم یا ناظم کے قبول کرنے کے بعد وہ رقم واپس نہیں ہوگی، جبکہ اکثر تو رقم مخلوط ہونے کی صورت میں معلوم ہی نہیں کہ کس کی رقم خرچ ہوئی۔

(۳) وظائف کی تقسیم سے پہلے اگر حولانِ حول ہوجائے تو زکوٰۃ واجب نہیں کیونکہ عامل کے پاس زکوٰۃ کی رقم

پڑی رہنے سے زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی، کیونکہ مہتمم یا ناظم طلبہ کے وکیل ہیں۔
نظام الفتاویٰ میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی تحریر نقل فرمائی ہے کہ عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں، مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال کے معطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے وکلاء ہیں لہذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں۔ (نظام الفتاویٰ: ۱/۱۱۶)۔
(۴) اس معاملہ میں بیع اور اجارہ بھی جمع نہیں بلکہ مدرسہ کی سہولیات کے عوض میں فیس ایک تبرع اور ھبہ ہے۔
واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:
﴿إنما الصدقات للفقراء والمساكين
والعاملين عليها ....﴾

(سورۃ التوبۃ)

عن أبي جحيفة رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال:
﴿إن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم أخذ الصدقة
من أغنيائنا وجعلها في فقرائنا﴾

(ترمذی شریف)

مصارفِ زکوٰۃ کا بیان

باب ......﴿۴﴾

مصارفِ زکوٰۃ کابیان

مکان کی توسیع میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کاحکم:

سوال: میرے ایک غریب رشتہ دار کے پاس مکان ہے مگر بہت چھوٹا ہے،اس کی حاجت سے بھی چھوٹا ہے نیز وہ مستحق زکوٰۃ بھی ہے کیا گھر بڑا کرنے کے لئے اس کوزکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مستحقِ زکوٰۃ یعنی جس کے پاس حاجتِ اصلیہ سے زائد بقدرِنصاب مال نہ ہواس کوگھر کی مرمت یاتوسیع کے لئے زکوٰۃ کی رقم دینادرست ہے۔

ملاحظہ ہودرمختار میں ہے:

مصرف الزكاة والعشرهو فقيرالمقابل للمسكين لا للغني وهو من له أدنى شيء أي دون نصاب أوقدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة...وفي الشامي: والحاصل أن المراد هنا الفقير المقابل للمسكين لا للغني، دون نصاب أي نام فاضل عن الدين فلو مديوناً فهو مصرف كما يأتي، مستغرق في الحاجة،كدار السكنى وعبيد الخدمة وثياب البذلة وآلات الحرفة وكتب العلم للمحتاج إليها تدريساً أوحفظاً أوتصحيحاً....والحاصل أن النصاب قسمان(١)موجب للزكاة وهو النامي الخالي عن الدين. (٢) وغيرموجب لها وهوغيره،فإن كان مستغرقاً بالحاجة لمالكه أباح أخذها وإلاحرمه.... (الدرالمختارمع الشامی:۲/۳۳۹،باب المصرف،سعید).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

فقیر کو نصاب سے کم کر کے قسط وار رقم دیتا رہے اور وہ فقیر رقم کو تعمیر میں خرچ کرتا جائے، اگر فقیر کے پاس زمین نہیں ہے تو پہلے زمین خرید کر مالک بنایا جائے اور اس کے بعد قسط وار زکوٰۃ کی رقم دیتا رہے اور فقیر تعمیر کرتا رہے، اور اسی طرح مکان مکمل ہو جائے تو یہ صورت جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ:۴/۲۹۰، وایضاح المسائل:ص ۱۱۵، نعیمیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تنخواہ دار حاجتمند کے لئے زکوٰۃ لینے کا حکم:

سوال: ایک شخص ملازمت کرتا ہے اس کی بیوی کا ایکسیڈنٹ ہوا جس کی وجہ سے دوا، ہسپتال کی فیس وغیرہ اخراجات زیادہ ہو گئے، ماہانہ تنخواہ سے ان تمام اخراجات کو پورا نہیں کرسکتا ہے لہذا اس شخص کے لئے زکوٰۃ لینے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں شخصِ مذکور کے لئے زکوٰۃ لینے کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

مصرف الزكاة والعشر....هو فقير، وهو من له أدنى شيء أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع الشامي:۲/۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، سعيد).

فتح القدیر میں ہے:

والفقير من له أدنى شيء وهو مادون النصاب أو قدر النصاب غير نام وهو مستغرق في الحاجة...ويجوز صرف الزكاة لمن لاتحل له المسئلة بعد كونه فقيراً ولا يخرجه عن الفقر ملك نصب كثيرة غير نامية إذا كانت مستغرقة بالحاجة. (فتح القدير:۲/۲۶۱، باب من يجوز دفع الصدقة اليه ومن لايجوز، دار الفكر).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب وإن كان صحيحاً مكتسباً كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية:۱/۱۸۹، في المصارف).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جس کی ضروریات تنخواہ سے پوری نہ ہوں وہ بھی مستحقِ زکوٰۃ ہے اور اس کو زکوٰۃ کی رقم دینا جائز ہے۔ (فتاوی

محمودیہ:۹/۵۲۵،مبوب ومرتب)۔

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

جس کی آمدنی قلیل ہواور وہ مالکِ نصاب نہ ہو یعنی ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا مالک نہ ہوتو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔(فتاوی رحیمیہ:۵/۱۵۲)۔

کفایت المفتی میں ہے:

کسی غیر مستطیع مریض کو اس کے علاج کے واسطے زکوٰۃ کا روپیہ دیا جاسکتا ہے۔(کفایت المفتی:۴/۲۷۴،دار الاشاعت)۔واللہ ﷻ اعلم۔

غریب بھائی ،بہن کو زکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: اگر کسی کے بھائی ، بہن غریب اور مستحقِ زکوٰۃ ہیں تو مالدار بھائی ان کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مستحقِ زکوٰۃ بھائی ،بہن کو زکوٰۃ دینا جائز بلکہ اولیٰ ہے اسلئے کہ اس میں صلہ رحمی بھی ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

والأفضل في الزكاة والفطرو النذرالصرف أولاً إلى الإخوة والأخوات ثم إلى أولادهم ثم إلى الأعمام والعمات ثم إلى أولادهم ثم إلى الأخوال والخالات ثم إلى أولادهم ثم إلى ذوي الأرحام ثم إلى الجيران ثم إلى أهل حرفته ثم إلى أهل مصره أوقريته كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية:۱/۱۹۰،في المصارف)۔

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

وفي المضمرات: الأفضل صرف الزكاتين، يعني صدقة الفطر وزكاة المال إلى أحد هؤلاء السبعة، الأول: إخوته الفقراء وأخواته، ثم إلى أولادهم، ثم إلى أعمامه الفقراء.....

(الفتاوى التاتارخانية:۲/۲۷۱،بمن توضع فيه الزكاة،ادارة القرآن)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

عزیز واقارب یعنی بھائی بہن ، چچی ، پھوپھی ، خالہ، ماموں، وغیرہ اوران کی اولاد کو زکوٰۃ دینے میں دوثواب ملتے ہیں،(۱)ادائے زکوٰۃ کا ثواب (۲) صلہ رحمی کا ثواب ،لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ یہ لوگ صحیح معنی میں زکوٰۃ

کے مستحق ہوں۔ (ایضاح المسائل:ص ۱۱۰، نعیمیہ۔ واحسن الفتاوی: ۴/۲۶۹۔ وفتاوی محمودیہ: ۹/۵۴۱، مبوب ومرتب)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مساجد کے ائمہ کوزکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: ہمارے علاقہ میں لوگ اپنی مسجدوں میں امام رکھتے ہیں، اور امام کی تنخواہ مقرر نہیں کرتے بلکہ فصل پکنے کے بعد ان کو اناج وغیرہ زکوٰۃ میں سے دیتے ہیں، اگر امام مستحق زکوٰۃ ہو تو کیا زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ کیا یہ اجرت نہیں ہے؟ زکوٰۃ بطورِ اجرت دی جاسکتی ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ دینے کی دوصورتیں ہیں: (۱) مسجد کا امام زکوٰۃ کا مستحق ہو تو اس کو غریب ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ دینا یہ درست بلکہ افضل ہے۔

(۲) امام کو امامت کی اجرت میں زکوٰۃ دی جائے، اس صورت میں زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اگرچہ امام کے لئے تنخواہ کے طور پر لینا جائز ہوگا۔

مذکورہ بالا صورتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے افضل اور بہتر یہ ہے کہ امام کے لئے اجرت مقرر کی جائے پھر بظاہر گزارہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کو صدقات وزکوٰۃ بھی دیا کریں۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

التصدق على الإمام الفقير أفضل، وفي الشامي: أي من الجاهل الفقير. (الدرالمختار مع الشامي: ۲/۳٥٤، سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

لو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضاً أجزأه، وإلا فلا. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۰، باب المصارف).

فتاوی فریدیہ میں ہے:

امام مسجد جب غریب ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے ہاں اجرت ومعاوضہ کی صورت میں جائز نہیں۔ اور جو ائمہ مساجد اغنیاء نہ ہوں تو ان کو یہ صدقات واجبہ اگر امامت کے عوض میں دئے جائیں تو دینے والوں کا ذمہ فارغ نہیں ہوا۔ اور اگر امامت کی وجہ سے اور امامت کے صلہ میں دیے جائیں تو بلا شک وشبہ جائز ہے۔ **والمتعارف هو الإعطاء له على وجه الترحم، والصلة ولذا ينوي المعطون الثواب والتقرب إلى الله، والأجير لايكون**

كذلك، وبالجملة أن منع الإعطاء مطلقاً خراب نظام أكثر المساجد. (فتاوی فریدیہ:۳/۵۳۷،وآپ کے مسائل اوران کا حل:۳/۴۰۱)۔

فتاوی مفتی محمود میں ہے:

اگر یہ معروف ومشہور ہے کہ لوگ امام کوز کوۃ وعشر دیا کرتے ہیں، اورامام مذکور بھی اس غرض سے ان کی امامت کرتا ہے کہ یہ لوگ اسے زکوۃ دیا کریں گے اوراگر وہ نہ دیں تو وہ امامت چھوڑ کر ہی چلا جائے گا گویا عقد اجارہ نہ تو صحیح ہوا ہے اور نہ فاسد، لیکن بہر حال کالعقد ضرور ہے، کیونکہ یہ لوگ اسے زکوۃ نہ دیں تو یہ امامت چھوڑ جائے گا، اس صورت میں گواحتیاط اس میں ہے کہ پہلے کچھ مال بطور ہدیہ کہ امام کی خدمت میں پیش کردے اور بعد میں مالِ زکوۃ وعشر وغیرہ دے، کیونکہ اس صورت میں کسی قسم کا عقد نہیں ہوا ہے، اس لئے لوگوں کے ذمہ اسے کچھ دینا واجب نہیں، تو زکوۃ اجرت میں شمار نہ ہوگی اس لئے ادائیگی صحیح ہوگی۔اوراگر کسی قسم کا عقد نہیں ہوا ہے، لوگ اگر زکوۃ نہ دیں یا کم دیں تب بھی امامت کرتا ہے، صرف اس نے اس امامت کوزکوۃ وعشر دیے جانے کے لئے وسیلہ بنایا ہے، بس اتنی سی بات ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر امامت نہ کروں گا تو لوگ زکوۃ وعشر نہ دیں گے، ایسے امام کو بلاشبہ دینا جائز ہے اور زکوۃ ادا بھی ہوگی، جس کے نظائر کتبِ فقہ میں بکثرت موجود ہیں۔اوراگر امامت محض للہ کرتا ہے، زکوۃ وعشر ملنے کی طمع نہیں ہے تو بطریق اولی لینا دینا جائز ہوگا۔(فتاوی مفتی محمود پاکستان:۳/۳۳۴۔۳۳۶، وفتاوی دارالعلوم:۶/۲۱۳، مدلل ومکمل)۔واللہ ﷻ اعلم۔

تنخواہ دار مقروض کو زکوۃ دینے کا حکم:

سوال: ایک آدمی ۷۰ ہزار رینڈ کا مقروض ہے اور یہ قرض فی الحال لازم ہے لیکن قرضہ ادا کرنے کے لئے اس کے پاس رقم موجود نہیں نیز اس کے پاس حوائجِ اصلیہ سے زائد کوئی سامان بھی نہیں ہے البتہ ماہواری تنخواہ ملتی ہے تو کیا اس کو زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مقروض کو قرضہ ادا کرنے کے لئے زکوۃ کی رقم دینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو ابوداود شریف میں ہے:

عن عطاء بن يسار أن رسول الله ﷺ قال: لا تحل الصدقة لغني إلا لخمسة، لغاز في سبيل الله، أو لعامل عليها، أو لغارم، أو لرجل اشتراها بماله، أو لرجل كان له جار مسكين

فتصدق على المسكين فأهداها المسكين للغني. (رواه ابوداود: ۱/۲۳۱).

بذل المجهود میں ہے:

أولغارم قيل: الغارم الذي عليه الدين أكثر من المال الذي في يده أومثله أوأقل منه لكن ماوررائه ليس بنصاب. (بذل المجهود: ۸/۱۷٤).

البحر الرائق میں ہے:

يجوز دفع الزكاة إلى من يملك مادون النصاب أوقدرنصاب غيرنام وهومستغرق في الحاجة. (البحر الرائق: ۲/۲٤۰، کوئٹہ).

شامی میں ہے:

والحاصل أن النصاب قسمان: موجب للزكاة و هو النامي الخالي عن الدين، وغير موجب لها وهوغيره، فإن كان مستغرقاً بالحاجة لمالكه أباح أخذها وإلا حرمه.
(الشامی: ۲/۳۳۹، سعید) ۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

زکوٰۃ کی رقم سے مکان بنا کر فقیر کو اس کا مالک بنانے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے زکوٰۃ کی رقم سے گھر خرید کر فقیر کو اس گھر کا مالک بنا دیا تو زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مکان فقیر کے نامزد کر دیا اور اس مکان کے کاغذات فقیر کو دیکر مالک بنا دیا تو زکوٰۃ ادا ہو گئی۔

لیکن ضروری ہے کہ مکان بنانے کے بعد اس کی مارکیٹ ویلیو کے مطابق قیمت متعین کرے ایسا نہ ہو کہ مکان پر دو لاکھ کا خرچہ آیا اور مارکیٹ میں اس کی قیمت ڈھائی لاکھ ہے، اور زکوٰۃ دینے والے نے اس کی قیمت ۳ لاکھ لگائی بلکہ اس کی قیمت عام بازار کے مطابق لگائے، ہاں اس میں یہ خرابی پائی جاتی ہے کہ ایک فقیر کو مقدارِ نصاب سے زیادہ دیا گیا، لیکن فقیر کی ضرورت کی وجہ سے اور ان کے بال بچوں کی رہائش فراہم کرنے اور ایک اہم ضرورت پورا کرنے کے پیشِ نظر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کو قبول فرما کر اجر عطا فرمائیں گے۔

درمختار میں ہے:

هي تمليك خرج الإباحة، فلوأطعم يتيماً ناوياً الزكاة لايجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم لأنه بالدفع إليه بنية الزكاة يملكه. (الدر المختار مع الشامی: ۲/۲۵۷، کتاب الزکاۃ، سعید).

مزید ملاحظہ ہو: حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ۷۱٤، قدیمی۔ والبحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، کوئٹه).

احسن الفتاوی میں ہے:

اگر رقم مسکین کو نہیں دی بلکہ اس رقم سے مکان بنوا کر دیا تو اس میں کراہت نہیں اس لئے کہ اس سے مسکین صاحب نصاب نہیں ہوا۔ (احسن الفتاوی: ۴/ ۲۹۰).

ایضاح المسائل میں ہے:

کسی نے زکوٰۃ کی رقم اصل مال سے الگ نہیں کیا اور مجموعہ رقم سے ذاتی طور پر ایک مکان تعمیر کر کے جو رقم خرچ ہوئی اس کا حساب لگا کر زکوٰۃ کی نیت سے کسی نادار بے گھر فقیر کو مالک بنا کر فقیر کے نام رجسٹری کرا کے قبضہ دلا دیا اور اس میں اپنا کوئی تعلق باقی نہیں رکھا تو اس طرح مکان بنا دینا بلا کراہت جائز اور درست ہے اس لئے کہ فقیر کو اس سے مالدار صاحبِ نصاب نہیں بنایا گیا، بلکہ صرف ضرورت کا مکان فراہم ہوا ہے۔ (ایضاح المسائل: ص ۱۱۵، نعیمیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوٰۃ کی رقم سے فقیر کا قرض بذریعہ وکیل ادا کرانے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص کثرتِ قرض کی وجہ سے زکوٰۃ کا مستحق ہے، اور اگر اس کو زکوٰۃ دی جائے تو ضائع کر دے گا، لہذا یہ شخص کسی کو وکیل بنا سکتا ہے تا کہ اس کی طرف سے قرض ادا کر دے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں فقیر اگر اپنا وکیل مقرر کرے اور وکیل زکوٰۃ کی رقم لیکر فقیر کی طرف سے قرضہ ادا کر دے تو یہ جائز ہے اور زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اور اگر کسی کو وکیل نہیں بنایا صرف اجازت دی تو پھر بھی زکوٰۃ ادا ہو جائیگی، گویا دائن نے فقیر کے لیے قبضہ کر کے اپنی جیب میں رقم ڈال دی۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

ولو قضى دين حي فقير إن قضى بغير أمره لم يجز لأنه لم يوجد التمليك من الفقير لعدم قبضه وإن كان بأمره يجوز عن الزكاة لوجود التمليك من الفقير لأنه لما أمره به صار وكيلاً عنه في القبض فصار كان الفقير قبض الصدقة بنفسه وملكه من الغريم. (بدائع الصنائع: ۲/ ۳۹، ركن الزكاة، سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولو قضى دين الفقير بزكاة ماله إن كان بأمره يجوز وإن كان بغير أمره لا يجوز. (الفتاوى

الهندية: ۱/ ۱۹۰، الباب السابع فی المصارف، و کذا فی الشامی: ۲/ ۳۴۵، سعید).

احسن الفتاوی میں ہے:

مسکین کی اجازت سے اس کا قرض مدز کوٰۃ سے ادا کیا جائے تو جائز ہے، مسکین کو مدز کوٰۃ کا بتانا ضروری نہیں۔ (احسن الفتاوی: ۴/۲۵۰).

ایضاح المسائل میں ہے:

اگر کوئی شخص بہت زیادہ مقروض ہے اور قرض ادا کرنے کے لئے اگر اس کو زکوٰۃ کی رقم دینے میں یہ خطرہ کہ خود کھا جائے گا اور قرض ادا نہیں کرے گا تو مقروض فقیر سے اس کا قرض ادا کرنے کی اجازت لیکر مالدار آدمی اپنی زکوٰۃ کی رقم سے قرضدار فقیر کا قرض ادا کرے گا تو فقیر کا قرض اور مالدار کی زکوٰۃ دونوں ادا ہو جائیں گے۔

(ایضاح المسائل: ص۱۱۳، نعیمیہ)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

غنی طالبِ علم کو زکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: میں نے بعض کتابوں میں پڑھا کہ عالم یا طالبِ علم اگر چہ غنی ہو، اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، کیونکہ وہ علم دین کی خدمت میں مشغول ہے، اگر مسلسل زکوٰۃ نہیں لے گا تو اس کی زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے گی، کیا یہ مسئلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: علامہ طحطاویؒ اور علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ مختار قول کے مطابق غنی عالم و طالبِ علم کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اس لیے کہ زکوٰۃ کے لیے فقر شرط ہے، اور بعض کتابوں میں جو مذکور ہے وہ غیر معتبر ہے۔

درمختار میں ہے:

وعامل...فيعطي ولوغنياً لا هاشمياً، لأنه فرغ نفسه لهذا العمل فيحتاج إلى الكفاية... وبهذا التعليل يقوي مانسب للواقعات من أن طالب العلم يجوز له أخذ الزكاة ولو غنياً إذا فرغ نفسه لإفادة العلم واستفادته لعجزه عن الكسب والحاجة داعية إلى مالابد منه. وفي الشامي: قوله"مانسب للواقعات" ذكر المصنفؒ أنه راٰه بخط ثقة معزياً إليها، قلت: ورأيته في جامع الفتاوى ونصه: وفي المبسوط: لايجوزدفع الزكاة إلى من يملك نصاباً إلا إلى طالب العلم والغازي ومنقطع الحاج لقوله ﷺ "يجوزدفع الزكاة لطالب العلم وإن كان له نفقة أربعين سنة" وفيه أيضاً...وهذا الفرع مخالف لإطلاقهم الحرمة في الغني، ولم يعتمده

أحد. ط. قلت: وهو كذلك والأوجه تقييده بالفقير، ويكون طلب العلم مرخصاً لجواز سؤاله من الزكاة وغيرها وإن كان قادراً على الكسب، إذ بدونه لايحل له السوال. (الدر المختار مع الشامي:۲/ ۳٤٠،باب المصرف ،سعيد۔وكذافي حاشية الطحطاوي على الدرالمختار:١/ ٤٢٤).

درمختار میں ہے:

التصدق على العالم الفقير أفضل. (الدرالمختار:۲/ ۳٥٤،سعيد).

فتاویٰ فریدیہ میں ہے:

غنی معلم ومتعلم کوزکوٰۃ دینادرست نہیں۔(فتاویٰ فریدیہ:۳/ ۵۵۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

مالدار شخص کی چھوٹی بچی کوزکوٰۃ دینے کاحکم:

سوال: ایک مالدارصاحبِ نصاب شخص کی چھوٹی (دوماہ کی) بچی کے قلب میں سراخ ہونے کی وجہ سے داخلِ ہسپتال ہے،اوراس شخص کی اتنی حیثیت نہیں کہ اس کاخرچ برداشت کرسکے،توکیااس بچی کے ہسپتال کے بل وغیرہ کے لئے اس کوزکوٰۃ دے سکتے ہیں یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مالدارصاحبِ نصاب شخص کی بچی کوزکوٰۃ کی رقم دینادرست نہیں ہے، البتہ اس کی والدہ کودیدیاجائے غالباًوالدہ صاحبِ نصاب نہیں ہوگی،اوراگراس کی ملکیت میں کچھ زیورات ہوں توشوہرکوہبہ کردے اورزکوٰۃ لےکراپنی بچی پرخرچ کرلے،یااس کے پاس موجودرقم کوبچی پرخرچ کرکے پھرزکوٰۃ لے۔

ملاحظہ ہوبدائع الصنائع میں ہے:

وأما ولد الغني فإن كان صغيراً لم يجز الدفع إليه وإن كان فقيراً لا مال له، لأن الولد الصغير يعد غنياً بغنى أبيه وإن كان كبيراً فقيراً يجوز، لأنه لا يعد غنياً بمال أبيه فكان كالأجنبي ولودفع إلى امرأة فقيرة وزوجهاغني جاز. (بدائع الصنائع:۲/ ٤٧،سعيد۔وكذا في الفتاوى الهندية:١/ ١٨٩،المصارف).

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

غنی کی محتاج اولادصغارکوزکوٰۃ وغیرہ صدقاتِ واجبہ دینادرست نہیں ہے اس سے زکوٰۃ ادانہ ہوگی۔(فتاویٰ دارالعلوم:۶/ ۲۱۲،مصارف زکوٰۃ،مدلل ومکمل)۔واللہ ﷻ اعلم۔

یتیم بچہ جس کی والدہ مالدار ہو اس کو زکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: ایک یتیم بچہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتا ہے اور اس کی والدہ مالدار ہے تو کیا اس یتیم بچہ کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یتیم بچہ اگر سمجھدار ہے اور قبضہ کرسکتا ہے نیز مستحقِ زکوٰۃ بھی ہے تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز اور درست ہے اگر چہ اس کی والدہ مالدار ہو اور اگر بچہ بہت چھوٹا ہے جو قبضہ کو نہیں سمجھتا ہے اور لین دین کے بھی قابل نہیں ہے تو اس کی طرف سے اس کا ولی قبضہ کرے تو جائز ہے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

درمختار میں ہے:

فلوأطعم يتيماً ناوياً الزكاة لايجزيه إلاإذا دفع إليه المطعوم كمالوكساه بشرط أن يعقل القبض. وفي الشامي: ولايخفى أنه يشترط كونه فقيراً ولاحاجة إلى اشتراط فقر أبيه أيضاً لأن الكلام في اليتيم ولا أباً له فافهم .(الدرالمختارمع الشامی:۲/۲۵۷، سعید).

طحطاوی میں ہے:

وطفل الغنية ولو أبوه ميتاً لأنه لايعد غنياً بغناها ولو انحاز إليها، قوله لانتفاء المانع علة للجميع، والمانع أن الطفل يعد غنياً بغنى أبيه... ولولم يكن له أب فانتفى المانع فيها. (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:۱/۴۲۸،باب المصرف،کوئٹہ).

نیز مذکور ہے:

ولايشترط في المدفوع إليه البلوغ بل ولا العقل لأن تمليك الصبي صحيح لكن إن لم يكن عاقلاً فإنه يقبض عنه وصيه أوأبوه أومن يعوله قريباً أوأجنبياً أو الملتقط وإن كان عاقلاً فقبض من ذكر وكذا قبضه بنفسه، بحر. (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:۱/۳۸۸،کوئٹہ۔ والشامی:۲/۳۲۲،سعید)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

مدرسہ کے قرضہ میں سفیر کو زکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: ایک شخص مدرسہ کا سفیر ہے اس نے مدرسہ کے لئے کسی سے قرض لیا ہے طلبہ پر خرچ کرنے کے لئے اس کو زکوٰۃ مل گئی اب وہ اس کو قرض میں ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں طلبہ کے وکیل کے قبضہ کے بعد اس کے مصارف فقراء ومساکین ہی

ہیں، لہذا اس رقم کو مستحق طلبہ پر تملیکاً خرچ کرنا ضروری ہے چونکہ قرض سفیر نے لیا ہے لہذا طلبہ کی زکوٰۃ کی رقم اس میں خرچ نہیں کرسکتا، ہاں طلبہ کو زکوٰۃ کی رقم وظائف میں دیدے پھر ان سے مدرسہ کی تعلیم کھانے پینے وغیرہ کی فیس وصول کرلے پھر اس کو مدرسہ جیسے چاہے خرچ کرلے۔ ہاں اگر کسی نے سفیر ہی کو زکوٰۃ سفیر کے لیے دی تو وہ اس کو اپنے قرض میں خرچ کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو ایضاح النوادر میں ہے:

ہمارے اکثر اہل فتاوی نے مہتمم کو طلبہ اور معطین دونوں کا وکیل تسلیم کیا ہے اور طلبہ کے وکیل ہونے کی وجہ سے مہتمم اور اس کے ماتحتی لوگوں کے قبضہ کرنے پر زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اسی وقت ادا ہو جاتی ہے، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ معطین کے حق میں اہلِ مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں، اور طلبہ اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، فتاوی خلیلیہ :۱/ ۳۱۹، اور یہی مضمون حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے فتاوی محمودیہ میں نقل فرمایا ہے کہ جب طلبہ مہتمم کے اہتمام وانتظام اور قوانین کو تسلیم کرکے داخلہ لیا ہے تو گویا یوں کہدیا کہ آپ میرے وکیل ہیں۔ فتاوی محمودیہ:۲/ ۲۱۸، اور حضرت قطبِ عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے صاف اور واضح الفاظ میں مہتمم کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے۔ تذکرۃ الرشید:۱/ ۱۶۴، حاشیۃ فتاوی خلیلیہ :۱/ ۳۲۰، اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کا کچھ اختلاف تھا لیکن اپنی آخری عمر میں اس فتوی سے رجوع فرمالیا۔ امداد المفتین: جلد دوم: ۱۰۸۵، لیکن اہل مدرسہ کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ضروری ہوگا۔ (ملخص از ایضاح النوادر: حصہ دوم ۵۰۔ ۵۳، نعیمیہ).

جواہر الفتاوی میں ہے:

دینی مدارس کے مہتممین و منتظمین کے قبضہ میں اموالِ زکوٰۃ آجانے کے بعد یہ حضرات اسے مستحق طلبہ کے کھانا، دوا وغیرہ دینے کے علاوہ دوسری ضروریات مثلاً اساتذۂ کرام اور ملازمین کی تنخواہوں، تعمیرات، کتب خانہ کی کتابیں خریدنے میں بدونِ حیلۂ تملیک کے خرچ نہیں کرسکتے، انہیں اس بات کا قطعاً اختیار نہیں ہوتا کہ مصارفِ منصوصہ کے علاوہ کسی اور مصرف میں اموالِ زکوٰۃ صرف کریں، ﴿إنما الصدقات للفقراء والمساكين﴾ الآیۃ. (جواہر الفتاوی:۱/ ۸۱).

اسی بنیاد پر تمام فقہاء کرام متفقہ طور پر لکھتے ہیں:

ما يوضع في بيت المال أربعة أنواع الأول زكاة السوائم والعشور وما أخذه العاشر من تجار المسلمين الذين يمرون عليه ومحله ماذكرنا من المصارف (أي الفقراء والمساكين)، الهندية:۱/ ۱۹۰،

کذا فی ردالمحتار: ۲/ ۶۳، بدائع الصنائع: ۲/ ۶۸،

جس سے واضح ہوا کہ جس طرح کہ بیت المال کے اموال زکوٰۃ کو غیر مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں اسی طرح دینی مدارس کے زکوٰۃ فنڈ کو بھی غیر مصارف زکوٰۃ میں خرچ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، البتہ حیلۂ تملیک کے بعد مدرسہ کی دوسری ضروریات پر خرچ کرنے کی اجازت ہوجائے گی۔ (جواہر الفتاوی: ۱/ ۸۱۔۸۳، اسلامی کتب خانہ کراچی)۔

جدید فقہی مباحث میں ہے:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی رائے یہ ہے کہ مہتمم کو طلبہ کا وکیل فرض اور تسلیم کیے جانے کی صورت میں بھی اس زکوٰۃ کی رقم مدرسین تنخواہ اور مدرسہ کی دیگر ضروریات میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں، بلکہ طلبہ کے خورد ونوش، لباس اور ان کی خاص ضروریات پر ہی خرچ کرسکتا ہے۔ (جدید فقہی مباحث: ۵/ ۱۶۰، مصرف زکوٰۃ، ادارۃ القرآن)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوٰۃ کی رقم سے غریب طلبہ کی فیس ادا کرنے کا حکم:

سوال: ہمارے مدرسہ کے طلبہ غریب ہیں جو فیس وغیرہ ادا نہیں کرسکتے ہیں، تو کیا ان کی فیس زکوٰۃ کی رقم سے ادا کی جاسکتی ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں طلبہ غریب اور مستحق زکوٰۃ ہونے کی وجہ سے ان کی فیس زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرنا جائز ہے۔

اور اس کی صورت یہ ہے کہ غریب نادار طالبِ علم کو کچھ رقم بطورِ وظیفہ دیدی جائے پھر اس میں سے بطورِ فیس وصول کرلیا جائے، تمام رقم وصول نہ کریں بلکہ کچھ جیب خرچ کے لئے چھوڑ دے، پھر جو فیس وصول ہوئی وہ مدرسہ اپنے کاموں میں استعمال کرلیا کرے۔

ملاحظہ ہو قرآن کریم میں ہے: ﴿**إنما الصدقات للفقراء والمساكين ...**﴾. الآية.

حدیث شریف میں ہے:

تؤخذ من أغنيائهم وترد على فقرائهم. (رواه الترمذي: ۱/ ۱۳۶، باب ماجاء في كراهية أخذ خيار المال في الصدقة).

البحرالرائق میں ہے:

هي تمليک المال من فقير...وقيد بالتمليک احترازاً عن الإباحة ولهذا ذكر الولوالجي وغيره أنه لوعال يتيماً فجعل يكسوه ويطعمه وجعله من زكاة ماله فالكسوة تجوز لوجود ركنه وهوالتمليک وأما الإطعام إن دفع الطعام إليه بيده يجوز أيضاً لهذه العلة وإن كان لم يدفع إليه ويأكل اليتيم لم يجز لانعدام الركن وهوالتمليک ولم يشترط قبض الفقير لأن التمليک في التبرعات لايحصل إلا به...ولم يشترط البلوغ والعقل لأنهما ليسا بشرط لأن تمليک الصبي صحيح لكن إن لم عاقلاً فإنه يقبض عنه وصيه....وإن كان عاقلاً فقبض من ذكر وكذا قبضه بنفسه والمراد أن يعقل القبض بأن لايرمى به ولايخدع عنه. (البحرالرائق:۲/۲۰۱، کتاب الزکاۃ، کوئٹه).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

نادار طالبِ علم کو زکوٰۃ کا پیسہ یا مدز کوٰۃ سے قاعدہ پارہ تملیکاً دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، جب کہ وہ طالبِ علم سمجھدار ہو، اور مالکانہ قبضہ کی اہلیت رکھتا ہو، بالکل چھوٹا ناسمجھ نہ ہو۔ (فتاویٰ محمودیہ:۹/۵۴۸، مبوب ومرتب).

مزید ملاحظہ ہو: ایضاح النوادر: حصہ دوم ص۴۸، مدز کوٰۃ سے طلبہ کی فیس ادا کرنا، نعیمیہ، وجدید فقہی مسائل:۱/۲۲۵۔

واللہ ﷻ اعلم۔

اسلامی اسکول کے بچوں کی فیس زکوٰۃ کی رقم سے وصول کرنے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام: کچھ دینی درد رکھنے والے حضرات اسلامی اسکول کھولنا چاہتے ہیں، اسکول میں نادار اور مالدار دونوں قسم کے لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کریں گے، اسکول کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے بچوں سے فیس وصول کی جائے گی، کیا غریب بچوں کی فیس کی رقم میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ اور کیا زکوٰۃ کے متعلق یہ بتلانا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ ہے؟ کیا زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے؟ کیا بالغ نابالغ بچوں میں زکوٰۃ کی وصولی میں شرعاً فرق ہوگا؟ اگر کسی کے گھر میں ٹی وی یا وی سی آر ہو اور اس کی قیمت نصاب کو پہنچتی ہو تو وہ غنی شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: زکوٰۃ کی رقم شرعاً ان فقراء اور مساکین کو مالکانہ طور پر دینا ضروری ہے جو مالکِ نصاب نہ ہوں، نصاب کی مقدار ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کی مقدار رقم یا ضرورت سے زائد

سامان ہے، اسکول میں آنے والے بچے اگر بالغ ہوں اور وہ خود مالکِ نصاب نہ ہوں تو ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، اگر ان کے والد مالدار ہوں تو کوئی حرج نہیں، نیز زکوٰۃ میں یہ بتلانا بھی ضروری نہیں کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، بلکہ زکوٰۃ عیدی، تحفے، وظیفے وغیرہ کے نام سے بھی دی جاسکتی ہے، ہاں زکوٰۃ میں فقیر کی تملیک ضروری ہے۔

اسکول میں آنے والے بچے اگر نابالغ ہوں اور ان کے والد حضرات نادار ہوں صاحبِ نصاب نہ ہوں، تو ایسے بچوں کو بھی زکوٰۃ کی رقم جس عنوان سے بھی ہو دی جاسکتی ہے۔ ہاں جن بچوں کے والد صاحبِ نصاب ہوں اور وہ بچے نابالغ ہوں ان بچوں کو زکوٰۃ شرعاً نہیں دی جاسکتی، جو بچے زکوٰۃ کے مستحق ہوں ان کو مالکانہ طور پر زکوٰۃ دیکر پھر یہی رقم ان سے بطور فیس وصول کی جاسکتی ہے، اگر کسی کے گھر پر ٹی وی یا وی سی آر ہو اور اس کی قیمت نصاب کو پہنچتی ہو تو وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں ضرورت سے زائد ہیں، اور ان کی قیمت بقدر نصاب ہے، ہاں اگر ٹی وی اور وی سی آر بچوں کے والد کے نہ ہوں بلکہ والدہ کے ہوں تو والد کو نادار سمجھا جائے گا، اور اس کے وہ نابالغ بچے جو زکوٰۃ پر قبضہ کرنا جانتے ہوں مستحق زکوٰۃ ہوں گے۔

اس مسئلہ کے دلائل اوپر والے مسئلہ میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

زکوٰۃ کی رقم حیلۂ تملیک کے بعد مدرسہ کی دیگر ضروریات میں خرچ کرنے کا حکم:

سوال: ہمارے مدرسہ کی آمدنی زیادہ تر زکوٰۃ ہوتی ہے، اور مدرسہ میں مالدار اور نادار دونوں قسم کے طلبہ پڑھتے ہیں، نیز مدرسہ کو (Braille, Books) نابینا لوگوں کا رسم الخط اور ٹیپ کی ضرورت ہے، مزید براں بیرونی ملکوں کے نابینا لوگ ہماری خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم کس طرح زیادہ سے زیادہ نابینا لوگوں کی خدمت کر سکے، لہذا کوئی جائز حیلہ بتائیں کہ ہم زکوٰۃ کی رقم کو للہ میں تبدیل کر کے اس کو مدرسہ کی ضروریات میں خرچ کریں؟

الجواب: زکوٰۃ کو للہ میں تبدیل کرنے کا حیلہ بغیر ضرورتِ شدیدہ کے جائز نہیں ہے، اگر زکوٰۃ میں ہم حیلے کرتے رہیں گے تو زکوٰۃ کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا، ہاں بغیر تدبیر اور حیلہ کے مدرسہ چلانے کے لئے ایک کام کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ طلبہ پر فیس مقرر کریں اور غریب طلبہ کو زکوٰۃ کی رقم مثلاً ۵۰۰، دیدیں پھر مدرسہ چلانے اور کھانے اور تعلیم وغیرہ کے لئے ان سے مثلاً ۴۰۰، رینڈ وصول کرلیں ایک صاحب دیدیں اور دوسرا یا وہی دوسری جگہ وصول کرلیں۔ پھر وصول شدہ رقم ٹیپ وغیرہ کسی بھی کام میں خرچ کر سکتے ہیں، ہاں باہر کے لوگوں کو نہیں دے سکتے کیونکہ مدرسہ کا مال مدرسہ ہی میں خرچ ہونا چاہئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مدارس کے سفراء عاملین کے حکم میں ہے:

سوال: مدارس کے سفراء عاملین کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں راجح قول کے مطابق مدارس کے سفراء اور محصلین چندہ عاملین زکوٰۃ کے حکم کے ماتحت داخل ہیں۔

ملاحظہ ہو جواہر الفتاوی میں ہے:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہ کی تحقیق اولاً یہ تھی کہ مہتممین مدارس عاملین صدقہ کے حکم میں نہیں بلکہ معطیان زکوٰۃ کے وکیل ہوتے ہیں پھر بعد میں حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانویؒ اور حضرت سہارنپوریؒ کی تحقیق کی بناپر حضرت مفتی صاحب اپنی اول تحقیق سے رجوع فرما کر اس کے قائل ہوئے کہ آج کل کے مہتممین مدرسہ اور ان کے مقرر کردہ چندہ وصول کرنے والے عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہو کر فقراء کے وکیل ہیں۔ (جواہر الفتاوی: جلد اول ص ۴۷، اسلامی کتب خانہ، کراچی)۔

جدید فقہی مباحث میں ہے:

مدارس کے سفراء اور محصلین چندہ راجح قول کے مطابق عاملین زکوٰۃ کے حکم کے ماتحت داخل ہیں اور حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کی تو شروع ہی سے یہی رائے ہے کہ سفراء و محصلین عاملین زکوٰۃ کے حکم میں داخل ہیں اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے امداد المفتین اور معارف القرآن میں اور حضرت مولانا تھانویؒ نے امداد الفتاوی میں ابتداءً اگرچہ سفراء و محصلین کو عاملین کے حکم میں داخل نہیں مانا تھا لیکن ان حضرات کی رائے آخر میں بدل گئی، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، جواہر الفقہ، جلد چہارم، فتاوی خلیلیہ، جلد اول، امداد الفتاوی جلد ششم۔ (جدید فقہی مباحث: ۵۸۴/۷، ادارۃ القرآن)۔

مولانا خالد سیف اللہ فرماتے ہیں:

جہاں نظامِ شرعی موجود نہ ہو، وہاں دینی ادارے اور درس گاہیں زکوٰۃ کے اجتماعی طور پر اکٹھا کرنے اور مستحقین تک پہنچانے کا نظم کر سکتے ہیں اس لیے کہ دینی مدارس کے طلبہ بھی زکوٰۃ کا بہترین مصرف ہیں، وہاں ان اداروں کی طرف سے وصول زکوٰۃ کا کام کرنے والے جزوی طور پر عاملین ہی کے حکم میں ہیں کہ گو وہ امیر المسلمین کی طرف سے اس کام پر مامور نہیں ہیں، لیکن وصولی زکوٰۃ کا حق امیر کو تفویض کرنے سے شریعت کا جو اصل مقصود ہے یعنی اجتماعی طور پر زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کا نظم کرنا وہ اس طرح پورا ہو جاتا ہے اور اصل اعتبار مقاصد ہی کا ہے، "الأمور بمقاصدها"۔ (اسلام کا نظامِ عشر و زکوٰۃ: ص ۱۱۷، عاملین اور موجودہ محصلین)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے لانے والوں کو اس رقم میں سے اجرت دینے کی گنجائش ہے خواہ وہ غنی ہوں، مگر کسی حال میں ان کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے زیادہ نہیں دی جائے گی، کسی مستحق زکوٰۃ کو زکوٰۃ کی رقم کسی عمل کے معاوضہ میں (سوائے تحصیل وجمع زکوٰۃ کے) نہیں دی جاسکتی کیونکہ زکوٰۃ کی ادائے گی میں تملیک بلاعوض شرط ہے ملازمین مد تعلیم وتبلیغ کو تنخواہ بطور عقد اجارہ دی جاتی ہے جو تملیک بلاعوض نہیں ہے، البتہ اگر ان کو بطور وظیفہ ماہواری رقم دی جائے اور مستاجر کی حیثیت سے ان کے عمل کی جانچ نہ کی جائے اور اجیر کی طرح ان سے مواخذت نہ ہوں تو پھر ان کو زکوٰۃ میں سے ماہواری وظیفہ دینا جائز ہوگا۔ (کفایت المفتی:۴/۲۸۶، مصارف زکوٰۃ، دارالاشاعت)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: جدید فقہی مباحث:۶/۳۳۵، ادارۃ القرآن۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شعبۂ زکوٰۃ کے ملازمین عاملین کے حکم میں ہے:

سوال: اگر کسی ادارے نے زکوٰۃ کا شعبہ قائم کیا ہے اور اس میں کچھ ملازمین زکوٰۃ کی تقسیم وحساب کے لئے رکھے ہیں، تو یہ عاملین کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: شعبۂ زکوٰۃ کے ملازمین عاملین کے حکم میں ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وعامل يعم الساعي والعاشر فيعطى ولوغنياً لاهاشمياً لأنه فرغ نفسه لهذا العمل فيحتاج إلى الكفاية والغني لايمنع من تناولها. وفي الشامي: قوله يعم الساعي: هومن يسعى في القبائل لجمع صدقة السوائم، قوله: فيحتاج إلى الكفاية: لكن لايزادعلى نصف ماقبضه.

(الدرالمختار مع الشامي:۲/۳۳۹، باب المصرف، سعيد، وكذافي البحرالرائق:۲/۲۴۱، باب المصرف، كوئٹه)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ومنها العامل وهومن نصبه الإمام لاستيفاء الصدقات والعشور كذا في الكافي، ويعطيه مايكفيه وأعوانه بالوسط مدة ذهابهم وإيابهم مادام المال باقياً إلا إذا استغرقت كفايته الزكاة فلا يزاد على النصف، كذا في البحرالرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۸، باب المصرف)۔

مزید حوالہ جات اوپر والے مسئلہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مرد مسلمان ہو اور بیوی بچے غیر مسلم ہوں تو مرد کو زکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: شوہر نے اسلام قبول کیا لیکن اس کے بیوی بچے غیر مسلم ہیں تو مرد کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں جب مرد نے اسلام قبول کرلیا اور وہ مستحقِ زکوٰۃ بھی ہے تو اس کو صرف اسی کی نیت سے زکوٰۃ دینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث میں ہے:

عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ بعث معاذاً إلى اليمن فقال: إنک تأتي قوماً أهل الكتاب فادعهم إلى شهادة أن لا إله إلاالله و أني رسول الله، فإن هم أطاعوا لذلک فأعلمهم أن الله افترض عليهم خمس صلوات في اليوم و الليلة فإن هم أطاعوا لذلک فأعلمهم أن الله افترض عليهم صدقة أموالهم توخذ من أغنيائهم وترد على فقرائهم ... (رواه الترمذي: ۱/۱۳٦، باب ما جاء في كراهية اخذ خيار المال في الصدقة).

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو زکوٰۃ دینا ضروری ہے غیر مسلم کو دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

البحر الرائق میں ہے:

قوله لا إلى ذمي أي لا تدفع إلى ذمي لحديث معاذ ﷺ "خذها من أغنيائهم وردها في فقرائهم" لا لأن التنصيص على الشيء ينفي الحكم عما عداه بل للأمر بردها إلى فقراء المسلمين فالصرف إلى غيرهم ترک للأمر، وحديث معاذ ﷺ مشهور تجوز الزيادة به على الكتاب... (البحر الرائق: ۲/۲٤۲، باب المصرف، كوئته).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

مصرف الزكاة ما ذكر الله تعالىٰ في قوله: ﴿إنما الصدقات للفقراء﴾. الآية. (فتاوى قاضيخان: ۱/۳٦٥).

وفيه أيضاً: ولا يجوز صرف الزكاة إلى الكافر حربياً كان أو ذمياً. (الفتاوى الخانية على هامش الهندية: ۱/۲٦۷، وكذا في الشامي: ۲/۲۸۰، سعيد، وبدائع الصنائع: ۲/٤۹، سعيد)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

دنیوی علوم حاصل کرنے والی لڑکی کوزکوٰۃ کی رقم دینے کا حکم:

سوال: ایک لڑکی جودنیوی علوم سیکھ رہی ہے اور مستحق زکوٰۃ ہے توزکوٰۃ کی رقم اس کودینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دنیوی علوم حاصل کرنے والی بالغ لڑکی اگر مستحق زکوٰۃ ہے تواس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

ملاحظہ ہوفتاوی ہندیہ میں ہے:

ویدفع إلی امرأة غني إذا كانت فقيرة، وكذا إلى البنت الكبيرة إذاكان أبوها غنياً لأن قدر النفقة لا يغنيها. (الفتاوى الهندية: ١/١٨٩، باب المصرف).

نیز مذکور ہے:

ويجوز صرفها إلى من لايحل له السوال إذا لم يملك نصاباً، وإن كانت له كتب تساوي مأتي درهم إلا أنه يحتاج إليها للتدريس أو التحفيظ أو التصحيح يجوزصرف الزكاة إليه كذا في فتاوى قاضي خان، سواء كانت فقهاً أوحديثاً أو أدباً هكذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ١/١٨٩، باب المصرف).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

اگر مستحق کوتملیک کردی جائے توزکوٰۃ اداہوجائے گی اگر چہ وہ انگریزی پڑھتا ہولیکن دیندار کودینا افضل ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۹/۵۵۹، مبوب ومرتب)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مدرسین کی تنخواہوں میں زکوٰۃ کی رقم دینے کا حکم:

سوال: مدارسِ اسلامیہ کے مدرسین کی تنخواہوں میں زکوٰۃ کی رقم دینا جائز ہے یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں تنخواہ میں زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے، ہاں اگر مستحق طلباء کوزکوٰۃ کی رقم دیدی گئی پھران سے تعلیمی فیس وصول کی گئی تواب اس کوتنخواہوں میں خرچ کرسکتے ہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کی رقم میں بلامعاوضہ فقیر کومالک بنانا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہوکنز الدقائق میں ہے:

هي تمليك المال بغيرعوض من فقيرمسلم غير هاشمي ولامولاه بشرط قطع المنفعة

عن المملک من کل وجه لله تعالیٰ .(کنز الدقائق:۵۵،کتاب الزکاۃ،مکتبہ امدادیہ).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

صدقات واجبہ کی ادائے گی کے لئے ضروری ہے کہ ان کو مصارف (فقراء وغیرہ) پر بطور تملیک بلاعوض صرف کیا جائے لہذا تنخواہ میں دینا جائز نہیں، اگر کارکنان مدرسہ بغیر شرعی حیلے کہ تنخواہ میں دیں گے تو زکوۃ وغیرہ ادا نہیں ہوگی۔ (فتاوی محمودیہ:۹/۶۰۵،مبوب ومرتب).

ایضاح المسائل میں ہے:

مدرس، ملازم، باورچی وغیرہ کی تنخواہوں میں زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا جائز نہیں ہے۔(ایضاح المسائل: ۱۱۸،نعیمیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

مدارسِ عربیہ میں آمدہ رقوم کا شرعی حکم:

سوال: مدارسِ عربیہ میں صدقاتِ واجبہ اور غیر واجبہ یعنی عطیات وغیرہ کی رقم جمع ہوتی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ آیا وہ مالک کی ملکیت سے خارج ہوتی ہے یا نہیں؟ نیز سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ نیز مالکان کی زکوٰۃ کب ادا ہوگی خرچ کرنے کے بعد یا منتظمین کے قبضہ کرنے کے بعد؟

الجواب: مدارس میں عموماً تین قسم کی رقوم داخل ہوتی ہیں:

(۱) رقومِ عطیات، ہدایا وصدقاتِ نافلہ وغیرہ یعنی وہ رقوم جو واجب التملیک نہیں ہوتیں۔

(۲) رقومِ زکوٰۃ ونذر وکفارات وغیرہ یعنی وہ رقوم جو واجب التملیک ہوتی ہیں۔

(۳) وہ رقم جس کو دینے والا کسی خاص کام کے لیے متعین کر کے دیتا ہے، مثلاً فلاں کمرہ، یا فلاں فرش وغیرہ۔

ہر ایک کا حکم ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عطیات یعنی غیر واجب التملیک رقوم کے بارے میں بھی مہتممینِ مدارس اور ان کے نواب وکیل ونائب ہوتے ہیں۔لیکن اربابِ حل وعقد کے مشورہ سے خرچ کا جو ضابطہ حدودِ شرع میں رہتے ہوئے مقرر ومتعین ہوتا ہے صرف اس ضابطہ کے ماتحت خرچ کرنا ضروری رہتا ہے، اور اگر اربابِ حل وعقد نہ ہوں یا ہوں مگر کسی خرچ کے بارے میں کوئی واضح ضابطہ ملے تو ادارہ کے سابق اہلِ علم ودیانت وذمہ داروں کا معمول دیکھا جائے گا، اور اس کی اتباع کی جائے گی، مہتمم یا عملہ مدارس خود رائے نہیں کر سکتے ہیں۔

(۲) رقومِ زکوٰۃ وغیرہ جو واجب التملیک ہوتی ہیں، ان رقوم میں مہتممینِ مدارس معطی کے من وجہ وکیل ہوتے ہیں

اس لیے قبضہ مہتمم من کل الوجوہ قبضہ مستحق نہیں ہوگا۔ اور اسی وجہ سے طلباء یا مستحق زکوٰۃ کو تملیکاً دینا ضروری ہوگا، بغیر تملیک کے دوسرے مصرف میں خرچ کرنا درست وجائز نہیں ہے، نیز ان رقوم کو غیر واجبۃ التملیک رقوم سے مستقل طور پر الگ رکھنا چاہئے، نیز ان رقوم میں یہ لوگ طلباء کے بھی وکیل ونائب ہوتے ہیں، لہذا ان رقوم کو دینے کے بعد معطین واپس نہیں لے سکتے اور نہ ان رقوم پر حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی، اور نہ ہی مقدارِ کثیر حاصل ہونے کے بعد مزید حاصل کرنے کو ناجائز کہہ سکتے ہیں، اور نہ کوئی مستحق غنی قرار پائے گا، پھر معطین بھی مختلف ہوتے ہیں، بعض تو طلباء پر خرچ کرنے کی صراحت کرتے ہیں اور دیگر بعض بغیر صراحت کے صرف مدرسہ کے لیے دیتے ہیں، تو پہلی صورت میں تملیکِ طلباء ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا، اور دوسری صورت میں مدرسہ کے کسی بھی مستحقِ زکوٰۃ سے بلا تکلف تملیک کرالینا کافی ہوگا۔

(۳) یعنی وہ رقوم کہ دینے والا کسی خاص کام کے لیے نامزد کردے اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں مہتمم مدارس محض معطی کے وکیل ونائب ہوتے ہیں، لہذا اس قسم کی رقوم کو خلط واستہلاک سے بچانے کے لیے مدارس میں بالکل الگ الگ رکھنا اور ہدایت ومنشا معطی کے موافق خرچ کرنا لازم رہتا ہے۔ (ملخص از نظام الفتاوی: ۶/۴۴۶-۴۵۰، اصلاحی کتب خانہ)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مالکانِ زکوٰۃ کی تصریح کے خلاف زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے زلزلہ میں مبتلی لوگوں کے لیے زکوٰۃ کی رقم دی اور وہ رقم کچھ وجوہات کی بنا پر وہاں خرچ نہ ہوسکی اب اس زکوٰۃ کی رقم کو کہیں اور استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ کی رقم دوسری جگہ خرچ کرنا جائز نہیں ہے مالکان کی اجازت ضروری ہے، ہاں اگر مختلف لوگوں کی زکوٰۃ کی رقم ہے اور سب کو اطلاع دینا مشکل ہو اور متعین کردہ مصرف میں خرچ کرنا بھی ممکن نہ ہو تو پھر دوسری جگہ مصرفِ زکوٰۃ میں خرچ کرنا جائز ہوگا۔

ملاحظہ ہو الفقہ الحنفی وادلتہ میں ہے:

أما إذا عين الغني الفقير للوكيل لم يجزله أن يدفع الزكاة إلى غيره. (الفقه الحنفي وادلته: ۱/ ۳٤٠، بيروت).

شامی میں ہے:

وهنا الوكيل إنما يستفيد التصرف من المؤكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك

الدفع إلى غيره. (شامی:۲/۲٦۹،سعید).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

وکیل امین ہوتا ہے، ہدایتِ مؤکل کے خلاف تصرف کرنے کا اس کو حق نہیں۔ (فتاوی محمودیہ:۹/۴۹۵،مبوب ومرتب)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ٹی وی (T.V) کے مالک کو زکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: ایک شخص اصطلاحی طور پر غریب ہے لیکن اس کے پاس ٹی وی (T.V) ہے اور عمومی سطح پر زندگی گزارتا ہے نیز اس کے پاس ضرورت سے زائد بہت سی اشیاء پڑی ہیں، کیا ایسا شخص مستحق زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ اگر اس کے پاس پرانی ٹی وی (T.V) ہے جو کہ بہت کم قیمت کی ہوتی ہے تو اس کے ہوتے ہوئے آدمی مالدار اور صاحبِ نصاب نہیں کہلاتا، ہاں اگر ٹی وی (T.V) کے ساتھ اور بھی ضرورت سے زائد چیزیں ہوں اور بقدرِ نصاب ہوں تو پھر وہ صاحبِ نصاب ہے، لیکن اس کے گھر کے دوسرے افراد تو مستحق زکوٰۃ ہوں گے ان کو دیدے۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولايجوز دفع الزكاة إلى من يملک نصاباً أي مال كان دنانير أو دراهم أوسوائم أو عروضاً للتجارة أولغير التجارة فاضلاً عن حاجته الأصلية وهي مسكنه وأثاث مسكنه وثيابه وخادمه ومركبه وسلاحه...ويجوزدفعها إلى من يملک أقل من النصاب وإن كان صحيحاً مكسباً كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية:١/١٨٩)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مجنون یا بے ہوش کو زکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: اگر کوئی مجنون یا بے ہوش ہے اور فقیر بھی ہے تو اس کو زکوٰۃ کس طرح دی جائے جب کہ وہ قبضہ کو نہیں جانتا۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ان کے ولی یا وصی کو زکوٰۃ دی جائے اور اگر ولی یا وصی نہ ہوں تو اس کے نگران کو دے دی جائے۔

شامی میں ہے:

قوله تمليكاً وفي التمليک إشارة إلى أنه لايصرف إلى مجنون وصبي غيرمراهق إلا إذا

قبض لهما من يجوز له قبضه كالأب والوصي وغيرهما. (شامی:۲/۳٤٤،سعید).

بدائع الصنائع میں ہے:

وكذا لو دفع زكاة ماله إلى صبي فقير أو مجنون فقير وقبض له وليه أبوه أو جده أو وصيهما جاز لأن الولي يملك قبض الصدقة عنه. (بدائع الصنائع:۲/۳۹،سعید، وكذا فى الفتاوى الهندية:۱/۱۹۰)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

علاج معالجہ کے لیے زکوٰۃ کی رقم دینے کا حکم:

سوال: ہمارے یہاں بیرونی ممالک کے مسلمان رہتے ہیں، اور مزدوری کرتے ہیں، بہت سی مرتبہ علاج وغیرہ کے لیے بڑی رقم کی ضرورت پڑتی ہے اوران کے پاس اتنی رقم موجود نہیں ہوتی، کیا انھیں علاج وغیرہ کے لیے زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں تنخواہ دار مریض جو تنگ دست ہو اس کو علاج معالجہ وغیرہ کے لیے زکوٰۃ کی رقم دینا جائز ہے۔

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

وإن كانت غلتها لا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة، قال محمدؒ: يحل له أخذ الزكاة، وإن كانت قيمتها يبلغ ألوفاً، وفي الفتاوى العتابية: وعليه الفتوى. (الفتاوى التاتارخانية:۲/۲۷۷،من توضع الذكاة فيه،ادارة القرآن).

البحر الرائق میں ہے:

يجوز دفع الزكاة إلى من يملك مادون النصاب أو قدرنصاب غير نام وهومستغرق في الحاجة. (البحرالرائق:۲/۲٤۰،کوئٹہ).

درمختار میں ہے:

مصرف الزكاة...هو فقير، وهو من له أدنى شيء أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة، وفي الشامي: دون نصاب أي نام فاضل عن الدين، فلو مديوناً فهو مصرف، قوله مستغرق في الحاجة كدارالسكنى وعبيد الخدمة وثياب البذلة وآلات الحرفة وكتب العلم للمحتاج إليها تدريساً أو حفظاً أوتصحيحاً... والحاصل أن النصاب

قسمان: موجب للزكاة وهو النامي الخالي عن الدين، وغير موجب لها وهو غيره، فإن كان مستغرقاً بالحاجة لمالكه أباح أخذها وإلا حرمه. (الشامی:۲/۳۳۹،سعید).

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی قاضیخان علی هامش الهندية:۱/۲٦٦، فصل فيمن توضع فيه الزكاة۔والفتاوی الهندية:۱/۱۸۹۔وفتاوی محمودیه:۹/۵۱۷،مبوب ومرتب۔وبهشتی زیور:۳/۲٤۷)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

وکیل کا موکل کے خلاف زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی کو زکوٰۃ کی رقم جنوبی افریقہ میں دی کہ اس کو ہندوستان لے جا کر وہاں مستحقین کو دینا کیا یہ شخص اس رقم میں سے کچھ حصہ یا کل رقم یہاں کے فقیروں کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر دوسری جہت کی نفی نہیں کی تھی بلکہ صرف ہندوستان خرچ کرنے کو کہا تھا تو جنوبی افریقہ کے فقراء پر خرچ کر سکتا ہے، لیکن اگر دوسری جہت کی نفی کی تھی مثلاً یہ کہا تھا کہ صرف ہندوستان میں خرچ کرنا یہاں خرچ مت کرنا تو اب جنوبی افریقہ کے فقراء پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر میں ہے:

الأصل أن المؤكل إذا قيد على وكيله فإن كان مفيداً اعتبر مطلقاً وإلا لا وإن كان نافعاً من وجه، ضاراً من وجه، فإن أكده بالنفي اعتبر وإلا لا. وفي حاشية الحموي: قوله :وإن كان نافعاً من وجه ضاراً من وجه، كما لوقال: بعه في سوق كذا فباع في غير ذلک السوق جاز، لأن هذا شرط قد ينفعه وقد لاينفعه. (الأشباه والنظائر مع حاشية الحموی:۲/۲۷۸، کتاب الوکالة، ادارة القرآن).

اگر کسی معین شخص کو زکوٰۃ دینے کا وکیل بنایا اور وکیل نے دوسرے شخص کو دیدی تو ضامن ہوگا۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

التوكيل إنما يستفيد التصرف من المؤكل وقد أمر بالدفع إلى فلان فلا يملک الدفع إلى غيره، كما لو أوصىٰ لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره. (شامی:۲/۲٦۹،سعید).

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

سئل عمر الحافظ عن رجل دفع إلى الآخر مالاً فقال له هذا زكاة ما لي فادفعها إلى فلان فدفعها الوكيل إلى الآخر هل يضمن؟ فقال: نعم، له التعيين. (فتاوی التاتارخانية:۲/۲۸٤،ادارة القرآن). **واللہ ﷻ اعلم۔**

عورت کومیراث نہ ملنے پر زکوۃ کی رقم لینے کا حکم:

سوال: ایک عورت کے والد کی کافی جائداد ہیں، والد کے انتقال کے بعد وہ عورت باپ کی وارث اور حقدار بنی، مگر بھائیوں نے حصہ نہیں دیا اور عورت بقدر نصاب کی مالکہ بھی نہیں ہے تو کیا زکوۃ کی رقم لے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عورت مستحق زکوۃ ہے لہذا زکوۃ کی رقم لے سکتی ہے۔

الدرالمختار میں ہے:

ولو دفعها لأخته ولها على زوجها مهر يبلغ نصاباً وهو مليئ مقر ولو طلبت لايمتنع عن الأداء لاتجوز وإلا جاز . (الدرالمختار:۲/۳۵۶، سعید).

وفي الشامي: وفي الفتح: دفع إلى فقيرة لها مهر دين على زوجها يبلغ نصاباً وهو موسر بحيث لو طلب أعطاها لايجوز وإن كان لايعطى لو طلبت جاز. (الشامی:۲/۳۴۴،باب المصرف، سعید).

فتاوی ولوالجیہ میں ہے:

رجل دفع زكاة ماله إلى أخته، وهي تحت زوج، إن كان مهرها دون مأتي در هم، أو كان أكثر لكن المعجل أقل من مأتي درهم، أو أكثر لكن الزوج معسر جاز الدفع إليها، وهو أعظم الأجر، لأنها فقيرة قريبة. (فتاوی الولوالجیة:۱/۱۷۷،الفصل الاول فیمن تحل له الزکاة،بیروت).

واللہ ﷻ اعلم۔

مصارفِ زکوۃ اور مصارفِ ربوا میں فرق:

سوال: مصارفِ زکوۃ اور مصارفِ ربوا میں فرق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو برائے مہربانی مطلع فرمائیں؟

الجواب: مصارفِ زکوۃ اور مصارفِ ربوا محتاج اور مساکین لوگ ہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ زکوۃ کی رقم غیر مسلم فقیر کو نہیں دی جاسکتی، اور ربوا کی رقم غیر مسلم فقیر کو دے سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہو قرآن کریم میں ہے:

﴿إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها...﴾. الآية.

درمختار میں ہے:

ولا تدفع إلى ذمي لحديث معاذ ﷺ، وجاز دفع غيرها وغير العشر والخراج إليه أي الذمي ولو واجباً كنذر وكفارة وفطرة،خلافاً للثاني، وبقوله يفتى، حاوي القدسي، وفي الشامي: قوله "وبقوله يفتى" الذي في حاشية الخير الرملي عن الحاوي: وبقوله نأخذ، قلت: لكن كلام صاحب الهداية يفيد ترجيح قولهما. وعليه المتون. (الدرالمختارمع الشامي:۲/ ۲۵۱،سعيد).

شامی میں ہے:

ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه .(شامی:٦/ ٣٨٥،سعيد).

معارف السنن میں ہے:

قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك، فسبيله التصدق. (معارف السنن:١/ ٣٤،سعيد).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

سود کی رقم حاجت مند کو دے دی جائے خود استعمال نہ کرے۔(فتاوی رحیمیہ:۲/۱۹۲).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سود کی رقم محتاج غرباء کو دے دے ثواب کی نیت نہ کرے۔(فتاوی محمودیہ:۱۶/۳۸۳،مبوب ومرتب).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

یہ رقم مسکین محتاج کو دی جاسکتی ہے اور وہ اپنے کام میں لے سکتا ہے غریب مسلمان کو فائدہ پہنچانا چاہئے وہ بہ نسبت غیر مسلم کے زیادہ حقدار ہے۔(فتاوی رحیمیہ:۶/۲۱)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بنی ہاشم اور سادات کو زکوٰۃ کی رقم دینے کا حکم:

سوال: بنی ہاشم اور سادات کو زکوٰۃ دینے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مذہبِ احناف میں سادات اور بنی ہاشم کو زکوٰۃ کی رقم دینے کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) مشہور قول یہ ہے کہ زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ دینا جائز نہیں ہے۔ (یہ قول عام کتبِ فقہ میں مذکور ہے)۔
(۲) آپس میں ایک دوسرے کو دینا جائز ہے کسی دوسرے سے لینا جائز نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو: (فتح القدیر:۲/۲۷۲، دارالفکر۔ و البنایة:۴/۲۰۳)۔
(۳) کسی قسم کا صدقہ چاہے واجبہ ہو یا نافلہ ہو یا وقف ہو دینا جائز نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو: (فتح القدیر:۲/۲۷۳، دارالفکر۔ و معارف السنن:۵/۲۶۶)۔
(۴) خمس الخمس اور مالِ غنیمت کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے اب زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ بھی دینا جائز ہے۔
ملاحظہ ہو علامہ طحاویؒ فرماتے ہیں:

وقد اختلف عن أبي حنيفةؒ في ذلک: فروى عنه أنه قال: لابأس بالصدقات كلها على بني هاشم، وذهب في ذلک عندنا إلى أن الصدقات إنما كانت حرمت عليهم من أجل ماجعل لهم في الخمس من سهم ذوي القربىٰ، فلما انقطع ذلک عنهم ورجع إلى غيرهم بموت رسول الله ﷺ حل لهم بذلک ماقدكان محرماً عليهم من أجل ماقدكان أحل لهم، وقد حدثني سليمان بن شعيب عن أبيه عن محمد بن أبي يوسف عن أبي حنيفةؒ في ذلک مثل قول أبي يوسف، فبهذا نأخذ. (شرح معانی الآثار:۱/۳۳۳، کتاب الزکاة، باب الصدقة علی بنی هاشم)۔
فیض الباری میں ہے:

ونقل الطحاوي عن أمالي أبي يوسفؒ أنه جاز دفع الزكاة إلى آل النبيﷺ عند فقدان الخمس، فإن في الخمس حقهم فإذا لم يوجد صح صرفها إليهم، وفي "البحر" عن محمد ابن شجاع الثلجي عن أبي حنيفةؒ أيضاً جوازه، وفي عقد الجيد: أن الرازي أيضاً أفتىٰ بجوازه، قلت: وأخذ الزكاة عندي أسهل من السوال فأفتي به أيضاً. (فیض الباری:۳/۵۲، باب مایذکر فی الصدقة للنبیﷺ و اله)۔

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

وروى أبوعصمة عن أبي حنيفةؒ أنه يجوزدفع الزكاة إلى الهاشمي وإنما كان لايجوز في ذلک الوقت، لسقوط خمس الخمس. (البناية شرح الهداية:۴/۲۰۳)۔
مجمع الانہر میں ہے:

"لا تدفع إلى هاشمي" قيل بخلاف التطوع...وعن الإمام: "لا بأس بصرف الكل

إليهم، وعنه: جواز دفع الزكاة إليهم، وفي الآثار: وعن الإمام روايتان، وبالجواز نأخذ، لأن الحرمة مخصوصة بزمانه عليه الصلاة والسلام. (مجمع الانهرشرح ملتقى الابحر: ۱/ ۲۳۱،بيان احكام المصرف).

تبیین الحقائق میں ہے:

وروى أبوعصمة عن أبي حنيفةؒ جواز دفع الزكاة إلى الهاشمي في زمانه، وروي عن أبي حنيفةؒ: أن الهاشمي يجوز له أن يدفع زكاته إلى الهاشمي. وفي حاشية الشيخ الشلبيؒ على تبيين الحقائق: (قوله، وروى أبوعصمة عن أبي حنفةؒ جواز دفع الزكاة) قال الطحاويؒ: هذه الرواية عن أبي حنيفةؒ ليس بالمشهورة اه غاية وفي شرح الآثارعن أبي حنيفةؒ: لابأس بالصدقات كلها على بني هاشم، والحرمة للعوض، وهوخمس الخمس، فلما سقط ذلک بموته عليه الصلاة والسلام حلت لهم الصدقة، قال الطحاويؒ: وبه نأخذ، وفي النتف: يجوز صرف الزكاة إلى بني هاشم في قوله خلافاً لهما اه كاكي. (تبيين الحقائق مع الحاشية: ۱/ ۳۰۳، باب المصرف،مكتبه امداديه ،ملتان).

قال في "النتف في الفتاوى": من لا تعطى لهم الزكاة ...والخامس: إلى بني هاشم في قول أبي يوسفؒ ومحمدؒ وأبي عبد اللهؒ ويجوز في قول أبي حنيفةؒ. (النتف في الفتاوى،ص۱۲۹،دارالكتب العلمية).

وقال الشيخ الشرنبلاليؒ في حاشيته على الدرر: وقال في شرح الآثارعن أبي حنيفةؒ: أن الصدقات كلها جائزة على بني هاشم، والحرمة كانت في عهد النبي صلى الله عليه وسلم لوصول خمس الخمس إليهم، فلما منعهم ظلماً عن ذلک بموته صلى الله عليه وسلم حلت لهم الصدقة، وقال الطحاويؒ: وبالجواز نأخذ، كذا في شرح المجمع لابن الملک. (حاشية العلامة الشرنبلاليؒ على درر الحكام في شرح غرر الاحكام: ۱/ ۱۹۱ ـ وكذا في فتح باب العناية: ۲/ ۱۳۹ ـ وحاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۱/ ۴۳۸ ـ ومراقي الفلاح: ص ۲۶۳ ـ معارف السنن: ۵/ ۲۶۶).

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں:

سادات کا اکرام واحترام لازم ہے، اس لیے ان کو زکوۃ وصدقاتِ واجبہ دینے سے احتراز کا حکم ہے، کیونکہ

ایسا مال اوساخ الناس کہلاتا ہے،لیکن جوسادات اس قدر حاجت مند ہوں کہ گزارے کے لیے بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائیں،ان کے حق میں حنفیہ میں سے امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور شافعیہ میں سے امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کو درست قرار دیا ہے کہ زکوۃ لینے میں جس قدر ان کے احترام پر زد پڑتی ہے اس سے زیادہ تر بھیک مانگنے میں ہے، یہ سب کی نگاہوں میں بڑی ذلت ہے،اس بڑی ذلت سے بچانے کے لیے اگر ان کو زکوۃ دیدی جائے ،تو یہ اہون ہے۔(فتاوی محمودیہ:۹/۵۶۰،باب مصارف الزکاۃ،و۱۶/۳۸۴،باب الربوا،مبوب ومرتب)۔

نیز دیگر مذاہب میں سے بھی بعض حضرات جواز کے قائل ہیں:

ملاحظہ ہو مذہبِ مالکیہ:

قال الأبهري المالكي يحل لهم فرضها ونفلها.(عمدة القاری:٦/٥٣٦،دارالحدیث ،ملتان)۔

مذہبِ شافعیہ:

وأفتیٰ فخر الدين الرازي من الشافعية بالجواز في هذه الأزمنة حين منعوا أسهمهم من بيت المال وضربهم الفقر.(عقدالجید:ص ٥٠)۔

عمدۃ القاری میں ہے:

وقال الإصطخري :إن منعوا الخمس جازصرف الزكاة إليهم.(عمدة القاری:٦/٥٣٦)۔

مذہبِ حنابلہ:

قال ابن القيم : قلت: وقد ذهب بعض الفقهاء إلى أنهم يجوّزون لهم الأخذ من الزكاة مطلقاً إذا منعوا حقهم من الخمس.(بدائع الفوائد:٣/٦٥٤)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

وبنو هاشم إذا منعوا من خمس الخمس جاز لهم الأخذ من الزكاة وهو قول القاضي يعقوب وغيره من أصحابنا وقاله أبويوسف والإصطخري من الشافعية لأنه محل حاجة و ضرورة و يجوز لبني هاشم الأخذ من زكاة الهاشميين وهومحكي عن طائفة من أهل البيت.

(الاختیارات العلمیة :١/٩٣)۔

نیز متأخرین علماء میں سے بھی بعض حضرات نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

جن میں سے چند علماء کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں:

(۱) شیخ یوسف قرضاوی فقہ الزکاۃ میں فرماتے ہیں:

ورجح شيخ الإسلام ابن تيمية : أنه يجوز لبني هاشم الأخذ من زكاة الهاشميين... والذي أراه أن القول بإعطاء الزكاة لأقارب المصطفى ـ صلى الله عليه وسلم ـ في زماننا أرجح وأقوى ؛ لحرمانهم من خمس الغنائم والفيء ، الذي كان يعطى منه لذوي القربى في عهد النبي ـ صلى الله عليه وسلم ـ تعويضاً من الله لهم عما حرم عليهم من الصدقة. (فقه الزكاة: ۱/۱۸۱).

(۲) علامہ دکتور وہبہ زحیلی: "وإعطاء هم حينئذٍ أفضل من إعطاء غيرهم۔ (الفقه الاسلامی وادلته: ۲/۸۸٤، دار الفكر).

(۳) مولانا انور شاہ کشمیری۔ (فیض الباری: ۳/۵۲).

(۴) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں:

لیکن فی زمانہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی ذلت (جو سادات کے لیے حرمتِ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد ہے) سے بچانے کے لیے سادات کے لیے زکوٰۃ کی اجازت اب ایک ضرورت بن گئی ہے اور اس کی بنا پر قول ضعیف پر بھی فتویٰ دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ فقہاء کی صراحتیں اس سلسلے میں موجود ہیں، ہذا ما عندی، واللہ اعلم بالصواب۔ (اسلام کا نظام عشر وزکوٰۃ: ۱۲۹۔۱۳۰).

(۵) حضرت مفتی محمد فرید صاحب منہاج السنن میں فرماتے ہیں:

قال في منهاج السنن: قلت: لو اضطروا إلى السوال لكان ذل أخذ الزكاة أهون من ذل السوال، على أن الأوساخ ليست بأنجاس، فلو أفتىٰ المفتي بنادر الرواية عند الضرورة لم يكن بعيداً عن الأصول. (منهاج السنن: ۳/۱٦۹).

(٦) حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب فرماتے ہیں:

بہر حال قولِ امام مختلف ہے، امام طحاویؒ اور بعض دیگر علماء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، اختلاف دلیل و براہین کا نہیں، بلکہ بدلتے ہوئے حالات و زمانہ کا ہے، اس لیے اپنے دور کے حالات کے اعتبار سے اس روایتِ غیر مشہورہ پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے، موجودہ حالات یہی ہیں کہ خمس الخمس سادات کو ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، عطایا و ہدایا کے ذریعہ سادات کی خدمت کا جذبہ مفقود ہوتا جارہا ہے، لہذا میں پوری طمانیتِ قلب کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ ضرورت مند سادات کو زکوٰۃ شرعاً دی جاسکتی ہے۔ (مجلّہ "بحث و نظر" بعنوان "سادات کو زکوٰۃ دینا" ص ۱۰۰۔۱۰۲).

(۷) علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ معارف السنن میں فرماتے ہیں:

وفي كتبنا: أن الهاشمي لوكان عاملاً على الصدقة لايأخذ عمالته من مال الصدقة، ويجوز له الأخذ من مال الوقف بلا خلاف، قال ابن الهمام في الفتح: وصرح في الكافي، بدفع صدقة الوقف إليهم، على أنه بيان المذهب من غير نقل خلاف، وذكرابن الهمامؒ قبله وبعده الخلاف فيه، ثم قال: والحق الذي يقتضيه النظر إجراء صدقة الوقف مجرى النافلة، فإن ثبت في النافلة جواز الدفع يجب دفع الوقف وإلا فلا، الخ؛ ثم ذكر قول شارح الكنز في عدم الفرق بين الواجبة والتطوع، ومال إليه ابن الهمام، انظر: الفتح (٢/٢٤) والبناية شرح الهداية للعيني (١/١٢٧٠) والعمدة (٤/٤٣٣) وذهب الطحاوي إلى أخذ العمالة للهاشمي، ونقل أبوعصمة رواية شاذة في جواز أخذ الزكاة للهاشمي عند انقطاع الخمس من بيت المال، كما في الفتح والبحروغيرهما، من رواية أبي عصمة عن أبي حنيفة، ورواهاالطحاوي عن محمد عن أبي يوسف عنه في شرح الآثار، وهو وجه لبعض الشافعية، وقول لبعض المالكية، انظر: فتح الباري (٣/٢٨٠)، وحكاه الطحاوي من أمالي أبي يوسف، واختاره (١/٣٠١) من شرح الآثار في باب الصدقة على بني هاشم، واختاره فخرالدين الرازي من الشافعية. (معارف السنن: ٥/٢٦٥).

امام ابوحنیفہؒ کی یہ روایتِ جواز اگرچہ غیر ظاہر الروایت ہے، لیکن اس کے ثبوت کی نفی کسی نے نہیں کی، نیز ضرورت کے وقت غیر ظاہر الروایت پر فتویٰ دینا بھی ائمہ حضرات کے یہاں رائج ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله: وقيل يفتىٰ بقول محمدؒ إن أخره شهراً بلا عذر بطلت، وفي الجامع الخاني: الفتوىٰ اليوم على قول محمدؒ لتغير أحوال الناس في قصد الإضرار، وبه ظهر أن إفتاء هم بخلاف ظاهر الرواية لتغير الزمان، فلا يرجح ظاهر الرواية عليه وإن كان مصححاً أيضاً كما مر في الغصب في صبغ الثوب بالسواد، وله نظائر كثيرة، بل قد أفتوا بماخالف رواية أئمتنا الثلاثة كالمسائل المفتىٰ فيها بقول زفرؒ، ومسئلة الاستيجار على التعليم ونحوه، فافهم.

(الدر مع الشامی :٦/٢٢٦،باب طلب الشفعة، سعيد).

مفتی مختاراللہ صاحب مفتی دارالعلوم حقانیہ جو بندہ سے تلمذ کی نسبت بھی رکھتے ہیں،انہوں نے اس مسئلہ پر ایک مفصل مقالہ تحریر فرمایا ہے،ہم قارئین سے استدعا کرتے ہیں کہ اس رسالہ سے بھی استفادہ کریں۔

اشکال اور جواب:

اشکال: جو حضرات جواز کے قائل ہیں ان پر یہ اشکال عائد ہوتا ہے کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے: **إن هذه الصدقات إنما هي أوساخ الناس، وأنها لا تحل لمحمدﷺ ولا لآل محمد**. (رواه مسلم:١/٣٤٥).

یعنی صدقات لوگوں کا میل کچیل ہیں،محمدﷺ اور آپ کے آل کے لیے حلال نہیں ہے،اس کی مخالفت لازم آتی ہے اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: اس حدیث کی تاویل ان کے نزدیک یہ ہوسکتی ہے کہ حل کامل نہیں،یعنی مناسب نہیں۔بہت سے مواقع میں "لا تحل" کا مطلب علماء نے نامناسب لکھا ہے،مثلاً سنن ابی داود،ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث مذکور ہے:" لا تحل الصدقة لغني ولا لذي مرة سوي" علماء نے اس حدیث میں لفظ "لا تحل" کی تاویل فرمائی ہے۔یعنی یہ مطلب نہیں کہ حلال نہیں بلکہ اس کے معنی ہے مناسب نہیں یا کامل حلال نہیں۔

ملاحظہ ہو ابوداود شریف کے حاشیہ میں ہے:

" **لا تحل حلاً كاملاً** ".(حاشیۃ ابواداود شریف لے: ١/٢٣١).

مرقات میں ہے:

"**فيه نفي كمال الحل لانفس الحل**". (مرقات:٤/١٦٩).

شرح معانی الآثار میں ہے:

وذهبوا في تأويل الآثار المتقدمة إلى أن قول النبيﷺ "لا تحل الصدقة لذي مرة أي أنها لا تحل له كما تحل للفقير الزمن الذي لايقدر على غيرها، فيأخذها على الضرورة.....من ذلك ماروي عن رسول اللهﷺ أنه قال: ليس المسكين بالطوّاف ولا بالذي ترده التمرة والتمرتان. (شرح معانی الآثار:١/٣٣٥).

اسی طرح حدیث میں ہے:" الضيافة ثلاثة أيام فما بعد ذلك فهو صدقة لايحل له أن يثوي عنده حتى يحرجه " یعنی مہمان کے لیے میزبان کے ہاں ۳ دن سے زائد ٹھہرنا حلال نہیں،اس کا مطلب بھی حرام ہونا نہیں

بلکہ نامناسب اور مکروہ ہے۔

نیز جولوگ اپنے آپ کو بنوہاشم کہتے ہیں وہ کروڑوں کی تعداد میں ہیں، اور ان میں بے شمار حاجتمند فقراء ہیں، اور لوگوں کی عادت یہ ہے کہ نفلی صدقات بہت کم دیتے ہیں، لہذا اس ضرورت کی بناپر علماء نے زکوٰۃ کی رقم بنوہاشم کو دینا جائز قرار دیا ہے۔ ورنہ سوال کی ذلتی اس سے زیادہ سخت اور اہانت کا باعث ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ماں ہاشمی ہو اور والد ہاشمی نہ ہو تو زکوٰۃ لینے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص کی ماں ہاشمی ہو اور والد ہاشمی نہ ہو تو ایسا شخص زکوٰۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟ شوافع اور احناف کے نزدیک فرق ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں شخصِ مذکور کے لئے زکوٰۃ لینا جائز ہے، نسب میں باپ کا اعتبار ہوتا ہے، ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

ويؤخذ من هذا أن من كانت أمها علوية مثلاً وأبوها عجمي يكون العجمي كفؤاً لها، وإن كان لها شرف ما، لأن النسب في الآباء ولهذا جاز دفع الزكاة إليها فلا يعتبر التفاوت بينهما من جهة شرف الأم، ولم أر من صرح بهذا. (شامی:۳/۸۷،سعید۔واحسن الفتاوی:۴/۲۷۹)۔

اعانۃ الطالبین میں ہے:

والعبرة في الانتساب إلى الآباء، فلا يعطى أولاد البنات شيئاً، لأنهم ليسوا من الآل، ولذلك لم يعط ﷺ الزبير رضي الله عنه وعثمان رضي الله عنه مع أن أميهما هاشميان. (اعانة الطالبين:۲/۲۳۳۔والبجیرمی علی الخطیب:۵/۱۶۲۔وفتح الوهاب:۲/۴۰)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللہ ﷺ:

"أدوا عن كل حر و عبد صغير و كبير نصف صاع من بر أو صاعاً من شعير"

(ابوداود شریف)

صدقۃ الفطر کا بیان

باب......﴿۵﴾

صدقۃ الفطر کا بیان

اکابرؒ کی اختیار کردہ صدقۃ الفطر کی صحیح مقدار:

سوال: یہ تو متفق علیہ ہے کہ صدقۃ الفطر گندم سے نصف صاع اور جو سے ایک صاع ہے لیکن کیلو کے اعتبار سے نصف صاع کتنا ہوتا ہے؟

الجواب: اکثر اکابرؒ نے لکھا ہے کہ نصف صاع انگریزی تول سے پونے دوسیر ہوتا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ کے رسالہ ''الطرائف والظرائف'' میں مرقوم ہے:

ایک مد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے پاس تھا جس کی مسلسل سند حضرت زید بن ثابتؓ کے مد تک (جوانہوں نے حضرت رسول اللہ ﷺ کے مد سے ناپ کر بنایا تھا) پہنچتی ہے اس کو حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے دومرتبہ بھر کر وزن کیا (کیونکہ دومد کا ہوتا ہے) تو ۸۸ تولہ کے سیر سے ۱½ سیر ۱½ چھٹانک ہوا تھا۔ (الطرائف والظرائف: حصۂ دوم: ص ۱۲).

اس حساب سے نصف صاع کا وزن ایک سو چالیس تولہ تین ماشہ ہوتا ہے جو کہ ۸۰ تولہ کے سیر سے پونے دوسیر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

احتیاط اسی میں ہے کہ اسی تولہ کے سیر سے پونے دوسیر گندم ایک صدقۃ الفطر میں نکالے جاویں۔ (اوزانِ شرعیہ: ص: ۳۸).

مولانا خالد سیف اللہ فرماتے ہیں:

ہندوستان کے اکثر اربابِ افتاء کی رائے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی رائے کے قریب ہے۔ (کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ: ۳۶۲، زمزم)۔

یعنی جدید حساب سے جب ایک تولہ ۶۶۴، ۱۱ گرام کے برابر ہے تو ۱۴۰ تولہ ۹۶، ۶۳۲، ۱ کیلوگرام ہوگا۔

مولانا مجیب اللہ ندوی رحمہ اللہ اسلامی فقہ میں تحریر فرماتے ہیں:

صدقہ فطر میں اگر کوئی گیہوں یا اس کا آٹا دے تو اس کو ۸۰ تولے کے سیر سے پونے دوسیر گیہوں یا آٹا دینا چاہئے... اس زمانہ میں سب سے بہتر یہ ہے کہ صدقۂ فطر میں غلہ کے بجائے پونے دوسیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جو کی قیمت جتنی ہو دے دے۔ (اسلامی فقہ: ۱/۴۲۲)۔

مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب جو ایک محقق عالم گزرے ہیں عمدۃ الفقہ میں فرماتے ہیں:

انگریزی سیر کے وزن سے یعنی جو سیر کے اسی تولہ کا ہوتا ہے اور ہندوستان و پاکستان میں رائج ہے اس کے حساب سے ایک صاع تقریباً ساڑھے تین سیر اور نصف صاع پونے دوسیر کا ہوتا ہے یہی مفتی بہ ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/۱۰۷، مجددیہ)۔

حضرت تھانویؒ کے خطبات الجمعہ کے آخر میں جو صدقۃ الفطر کے احکام چھپے ہیں اس میں بھی پونے دوسیر گندم یا اس کی قیمت مرقوم ہے۔ ملاحظہ ہو:

اگر گیہوں دیوے تو نصف صاع واجب ہے جو انگریزی تول سے پونے دوسیر ہوتا ہے۔ (خطبات الاحکام لجمعات العام: ۱۵۸، احکام صدقۂ فطر)۔

فتاوی دارالعلوم میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب تحریر فرماتے ہیں:

صدقۂ فطر موافق وزنِ سبعہ کے مثقال کہ ۴½ ماشہ کا قرار دے کر جیسا کہ معروف ہے انگریزی وزن سے تقریباً پونے دوسیر گندم ہوتا ہے اور حساب اس کا کر لیا گیا ہے یہی احوط بھی ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند مدلل و مکمل: ۶/۳۰۴، مسائل صدقۃ الفطر، دارالاشاعت)۔

فتاویٰ مفتی محمود میں حضرت مفتی محمود صاحب پاکستانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

احتیاط اس میں ہے کہ اسی تولہ کے سیر سے پونے دوسیر گندم ایک صدقۃ الفطر میں نکالے جائیں۔ (فتاوی مفتی محمود وغیرہ من المفتین: ۳/۳۱۵)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کفایت المفتی میں تحریر فرماتے ہیں:
غرضیکہ درہم کی مقدار دہلی کے تولے سے ۳ ماشہ کی صحیح ہے اور اسی حساب سے نصف صاع کا وزن احوط اسی روپے کے سیر سے تقریباً پونے دوسیر ہوتا ہے پس صدقۂ فطر میں گیہوں اسی روپے بھر کے سیر سے پونے دوسیر دینے چاہئیں۔ (کفایت المفتی: ۴/۳۱۱، دار الاشاعت)۔

فتاوی رحیمیہ میں ہے:
صدقۃ الفطر میں اسی تولہ کے سیر سے پونے دوسیر گیہوں دینے چاہئیں، نصف صاع کے ایک کلو پانچ سو پچھتر گرام ہوتے ہیں۔ (فتاوی رحیمیہ: ۵/۱۷۲، صاع کا وزن اور صدقۂ فطر کی صحیح مقدار)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:
خالص گیہوں ہو تو پونے دو کلو دیا جائے تو صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا۔ (فتاوی رحیمیہ: ۵/۱۷۷)۔

ایضاح المسائل میں ہے:
نصف صاع کا وزن ۱۳۵ تولہ ہوتا ہے۔ (فتاوی دار العلوم: ۶/۳۰۵، ۳۲۷۔ وجواہر الفقہ: ۱/۴۲۴۔ وفتاوی رحیمیہ: ۵/۱۷۴)۔
اور ایک تولہ: گیارہ گرام ۶۶۴ ملی گرام کا ہوتا ہے۔

مکمل نقشہ ملاحظہ فرمائیں:

☆ ایک رتی = ۲/۱، ۱۲۱ ملی گرام،
☆ دس رتی = ۱۲۱۵ ملی گرام،
☆ ۹۶، رتی = ۱۱۶۶۴ ملی گرام = ۱۱، گرام ۶۶۴ ملی گرام قدیم تولہ۔ ۹۶، رتی کا ایک تولہ:
موجودہ زمانہ کے دس گرام کے تولہ سے ایک تولہ ایک گرام ۶۶۴ ملی گرام ہوگا۔
☆ ایک ماشہ = ۹۷۲ ملی گرام،
☆ ۱۲، ماشہ = ۱۱۶۶۴ ملی گرام = گیارہ گرام ۶۶۴ ملی گرام = ایک تولہ۔
☆ ۱۳۵، تولہ = ۱۶۲۰، ماشہ = ۱۵۷۴ گرام ۶۴۰ ملی گرام۔
☆ ڈیڑھ کلو ۷۴ گرام ۶۴۰ ملی گرام = نصف صاع مقدار صدقۂ فطر۔

(ایضاح المسائل: ۱۰۱، صدقۂ فطر اور نصف صاع کے حساب کے لیے بہترین نقشہ، کتب خانہ نعیمیہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اکابرؒ کی تحقیق کے موافق صدقۃ الفطر کی مقدار تقریباً پونے دو سیر بنتی ہے یعنی اسی تولہ کے سیر سے ۱۴۰ تولہ، اور جدید حساب کے مطابق ۹۶، ۶۳۲، ۱ کیلو گرام ہوتا ہے، اور آخر الذکر کتاب ایضاح المسائل

میں مفتی شبیر احمد صاحب نے ۱۳۵ تولہ والی تحقیق جواہر الفقہ سے نقل فرمائی ہے، اس کے حساب سے تقریباً ڈیڑھ کلو ۷ گرام ۶۴۰ ملی گرام بنتا ہے۔

الغرض ازراہِ احتیاط پونے دو کیلو یعنی ۷۵۰، اکیلو گرام صدقۃ الفطر میں نکالا جائے اس میں اکثر اکابرؒ کی تحقیق شامل ہو جائے گی۔

اور پونے دو سیر کی جگہ پونے دو کیلو یاد رکھنا بھی آسان ہے اور آج کل اکثر ممالک میں سیر نہ ہونے کی وجہ سے پونے دو سیر کی مقدار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اس لیے لوگوں کو پونے دو کیلو بتلانا چاہئے، بعض اکابرؒ جیسے مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کی تحقیق مذکورہ بالا تحقیق کے خلاف ہے لیکن ہم نے اکثر اکابرؒ اور مفتیانِ کرامؒ کے قول اور تحقیق کو ترجیح دی، اور اکثریت کے راستہ پر چلنا زیادہ موزون اور بہتر ہے۔

شیخ اسعد محمد سعید الصاغرجی " الفقه الحنفي وأدلته "(۱/۳۷۸، مقدار الواجب) میں فرماتے ہیں:

وزنه نصف الصاع كيلوغرام ونصف، وثمان أجزاء من الألف من الغرام. والله أعلم.

یعنی صدقہ فطر جدید پیمانہ میں: ۱/کیلو ۶۲۵ گرام ہوتا ہے، تقریباً پونے دو کیلو، جو اکابرؒ کی متعین کردہ مقدار کے موافق ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

صدقۃ الفطر عید سے پہلے ادا کرنے کا حکم:

سوال: صدقۃ الفطر عید الفطر سے پہلے رمضان میں ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ مستحب کے خلاف ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ رمضان مبارک میں صدقۃ الفطر ادا کرنے سے ادا ہو جائے گا، لیکن مستحب یہ ہے کہ عید الفطر کے دن عیدگاہ جانے سے پہلے ادا کردے، نیز رمضان میں ادا کرنا بھی درست ہے، ہاں ایک روایت کے پیش نظر رمضان سے پہلے بھی ادا کر سکتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

والمستحب أن يخرج الناس الفطرة يوم الفطر قبل الخروج إلى المصلى فإن قدموها إلى المصلى جاز لأنه أدى بعد تقرر السبب فأشبه التعجيل في الزكاة ولاتفصيل بين مدة ومدة هو الصحيح. (الهداية: ۱/۲۱۱، ومثله في الجوهرة: ۱۶۵، الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۲).

شامی میں ہے:

ویستحب إخراجها قبل الخروج إلى المصلى بعد طلوع فجر الفطر عملاً بأمره وفعله صلى الله عليه وسلم وصح أداء ها إذا قدمه على يوم الفطر أو أخره اعتباراً بالزكاة والسبب موجود إذ هو الرأس بشرط دخول رمضان في الأول أي مسئلة التقديم هو الصحيح وبه يفتي جوهرة و بحر عن الظهيرية لكن عامة المتون والشروح على صحة التقديم مطلقاً و صححه غير واحد و رجحه في النهر و نقل عن الولوالجية أنه ظاهر الرواية، قلت: فكان هو المذهب . (شامی:۲/۳٦٧،سعید،و البحر الرائق:۲/۲۵۵،کوئٹہ،و تبیین الحقائق:۱/۳۱۱،امدادیہ ملتان).

فتاویٰ دار العلوم میں ہے:

صدقہ فطر رمضان شریف میں دینا درست ہے خواہ کسی عشرہ میں دیوے۔(فتاویٰ دار العلوم دیوبند:۶/۳۰۵،مسائل صدقہ فطر،مدلل و مکمل)۔واللہ ﷻ اعلم۔

صدقۂ فطر میں غیر منصوص اشیاء دینے کا حکم:

سوال: صدقۂ فطر میں کپڑے سلا کر غریب بچوں کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز اس کے علاوہ غیر منصوص اشیاء دینے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اشیاءِ منصوصہ کی قیمت لگا کر اس رقم سے غیر منصوص اشیاء خرید کر دینا جائز اور درست ہے، نیز غریب بچوں کو کپڑے سلا کر دینا بھی درست ہے صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

وما لم ينص عليه كذرة وخبز يعتبر فيه القيمة.(الدر المختار:۲/۳٦٤،باب صدقة الفطر،سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

أن الصحيح في الخبز أنه لايجوز إلا باعتبار القيمة لعدم ورود النص به فكان كالزكاة وكالذرة وغيرها من الحبوب التي لم ترد بها النص .(البحر الرائق:۲/۲٥٤،باب صدقة الفطر،کوئٹہ).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما الأقط فتعتبر فيه القيمة لايجزئ إلا باعتبار القيمة...لأنه غير منصوص عليه من وجه يوثق به وجواز ما ليس بمنصوص عليه لا يكون إلا باعتبار القيمة كسائر الأعيان التي

لم يقع التنصيص عليها من النبي ﷺ. (بدائع الصنائع:۲/۷۲،بیان جنس الواجب،سعید).

کفایت المفتی میں ہے:

غیر منصوص اشیاء میں حکم یہ ہے کہ صاع یا نصف صاع جائز نہیں بلکہ نصف صاع گیہوں کی قیمت میں جس قدر چاول آتے ہوں اس قدر دینے ہوں گے۔ (کفایت المفتی:۴/۳۱۲،دارالاشاعت).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اگر غیر منصوص سے کوئی شخص ادا کرنا چاہے تو منصوص کی قیمت لگا کر دراہم یا دنانیر دیدے، یا اتنی قیمت کی کوئی اور شئے ثوب وغیرہ دیدے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۹/۶۳۱،مبوب ومرتب۔وکذا فی کتاب الفتاوی:۳/۳۶۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

غیر ملکی کے لیے صدقۂ فطر کی قیمت لگانے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص پاکستان یا ہندوستان کا رہنے والا ساؤتھ افریقہ میں رہتا ہے تو وہ اپنے ملک کے حساب سے قیمت لگا کر صدقۂ فطر ادا کرے تو صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: غیر ملکی جو کہ ساؤتھ افریقہ میں قیام پذیر ہے اس کے لیے اپنے ملک کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ ساؤتھ افریقہ ہی کے حساب سے قیمت لگا کر صدقۂ فطر ادا کرے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وفي الفطرة مكان المؤدى عند محمدؒ :أي لا مكان الرأس الذي يؤدى عنه قوله وهو الأصح بل صرح في النهاية والعناية بأنه ظاهر الرواية كما في الشرنبلالية وهو المذهب كما في البحر فكان أولىٰ مما في الفتح من تصحيح قولهما باعتبار مكان المؤدى عنه.

(الشامی:۲/۳۵۵،سعید).

البحر الرائق میں ہے:

والمعتبر في الزكاة مكان المال في الروايات كلها وفي صدقة الفطر مكان الرأس المخرج عنه في الصحيح. (البحر الرائق:۲/۲۵۰،باب المصرف،کوئٹہ۔وکذا فی فتح القدیر:۲/۲۸۰، دارالفکر۔والعناية علی هامش فتح القدیر:۲/۲۸۰،دارالفکر)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

يعتبر قيمة البر في صدقة الفطر بقدر ما يكون في بلد المعطي لا ما يكون في المصر

البعيد . (فتاوی دارالعلوم دیوبند:۶/۳۰۶، مدلل ومکمل).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

آپ کے یہاں میدہ کی خرید وفروخت بکثرت ہے تو خود میدہ یا اس کی قیمت دینا چاہئے، اگر چہ گیہوں سے زیادہ بیٹھے، ہندوستان سے گیہوں کا نرخ معلوم کر کے قیمت دینا کافی نہیں ۔ (فتاویٰ محمودیہ:۹/۶۲۴، مبوب ومرتب)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

غیر ملکی کی اولاد کے لیے صدقۂ فطر کی قیمت لگانے کا حکم:

سوال: ساؤتھ افریقہ میں رہنے والا شخص جس کے بیوی بچے پاکستان میں ہیں وہ پاکستان کے حساب سے ادا کرے یا ساؤتھ افریقہ کی قیمت کے اعتبار سے؟

الجواب: شخصِ مذکور کے لیے اپنے بچوں کا صدقۂ فطر ساؤتھ افریقہ کی قیمت کے اعتبار سے ادا کرنا لازم ہے، پاکستان کی قیمت کے اعتبار سے ادا کرنا درست نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

وصحح في المحيط أنه في صدقة الفطر يؤدى حيث هو ولايعتبرمكان الرأس من العبد والولد لأن الواجب في ذمة المولىٰ ...وحكى الخلاف في البدائع فعن محمدؒ يؤدى عن عبيده حيث هو وهو الأصح. (البحرالرائق:۲/۳۵۵، باب المصرف، کوئٹہ).

عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

أن وجوب الصدقة على المولىٰ في ذمته عن رأسه فحيث كان رأسه وجبت عليه ورأس مماليكه في حقه كرأسه في وجوب المؤنة التي هي سبب الصدقة فيجب حيثما كانت رؤسهم . (العناية على هامش فتح القدير:۲/۲۸۰، دارالفكر).

شامی میں ہے:

و في الفطرة مكان المؤدى عند محمدؒ :أي لا مكان الرأس الذي يؤدى عنه قوله وهو الأصح بل صرح في النهاية والعناية بأنه ظاهرالرواية كما في الشرنبلالية وهوالمذهب كما في البحر فكان أولىٰ مما فى الفتح من تصحيح قولهما باعتبار مكان المؤدى عنه...قلت: في التتارخانية: يؤدى عنهم حيث هو وعليه الفتوىٰ وهو قول محمدؒ ومثله قول أبي حنيفةؒ

وهو الأصح. (الشامي:۲/۳۵۵،سعيد)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

صدقۂ فطر کی رقم سے کھانا پکوا کر کھلانے کا حکم:

سوال: اگر صدقۂ فطر کی رقم جمع کر کے اس کا کھانا پکوا کر جیل میں قیدیوں کو عید کے دن ایک جگہ بٹھا کر کھلا دے تو صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب: صدقۂ فطر میں زکوٰۃ کی طرح تملیک ضروری ہے اور ایک جگہ بٹھا کر کھلانے میں تملیک نہیں پائی جاتی بلکہ یہ اباحت ہے، اس لیے کہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کا حق حاصل نہیں، لہذا صدقۂ فطر ادا نہیں ہوگا، ہاں ہر ایک کے برتن میں تملیکاً دے دیا جائے، تو صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا، نیز جیل میں بعض قیدی صاحبِ نصاب بھی ہوتے ہیں، ان کو دینے سے بھی ادا نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

وأما ركنها فهو نفس الأداء إلى المصرف فهي التمليك كالزكاة فلا تتأدى بطعام الإباحة. (البحر الرائق:۲/۲۵۲،باب صدقة الفطر،كوئته).

شامی میں ہے:

و اشتراط التمليك فلا تكفي الإباحة كما في البدائع هذا ما ظهر لي، تأمل.

(شامی:۲/۳۶۹،باب صدقة الفطر،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

زکوٰۃ کا کھانا مستحق کو بطورِ تملیک دینا لازم ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہو کہ اتنی مقدار میری ملک ہے خواہ میں کھاؤں یا فروخت کروں یا کسی کو کھلاؤں اور ایک ساتھ سب کو بٹھا کر کھلانے میں یہ بات نہیں ہوتی۔ (فتاویٰ محمودیہ:۹/۶۰۲، مبوب ومرتب).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

صدقۃ الفطر کا رکن اس کے مصرف کو دے دینا ہے پس یہ دینا بھی تملیک کے طور پر ہونا چاہئے جیسا کہ زکوٰۃ میں ہے پس طعامِ اباحت (یعنی مباح کر دینے) سے ادا نہیں ہوگا۔ (عمدۃ الفقہ:۳/۱۶۸،مجددیہ)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ :

﴿یاأیھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کماکتب
علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون﴾

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

”من صام رمضان إیماناً واحتساباً
غفر لہ ما تقدم من ذنبہ“

(متفق علیہ)

کتاب الصوم

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

﴿اتقوا اللّٰہ ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شھرکم
وأدوا زکاۃ أموالکم وأطیعوا ذا أمرکم تدخلوا جنۃ ربکم﴾

(رواہ الترمذی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿فمن شهد منكم الشهر فليصمه﴾
وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:
”صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته فإن غم عليكم
فعدوا ثلاثين ثم أفطروا“

(رواہ الترمذی)

وقال علیہ الصلاۃ والسلام:
”الشهر يكون تسعاً وعشرين“

باب (۱)

رؤیتِ ہلال اور اختلافِ مطالع کا بیان

باب ﴿۱﴾

رؤیت ہلال اور اختلافِ مطالع کا بیان

ہوائی جہاز سے رؤیت ہلال کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص ہوائی جہاز سے پرواز کر کے چاند دیکھے اور زمین پر کسی کو نظر نہ آئے تو محض ہوائی جہاز کی رؤیت کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اگر کسی شخص نے ہوائی جہاز سے پرواز کر کے چاند دیکھا اور زمین پر کسی کو نظر نہیں آیا تو محض ہوائی جہاز کی رؤیت شرعاً معتبر نہیں، لیکن اگر ہوائی جہاز زیادہ بلندی پر نہ ہو اور کوئی شخص جہاز میں بیٹھے ہوئے چاند دیکھ لے تو اس کی رؤیت مقبول ہوگی، کیونکہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ جو شخص خارج مصر، یا کسی اونچی جگہ سے چاند دیکھے تو اس کی رؤیت مقبول ہوگی۔

ملاحظہ فرمائیں فتاوی ہندیہ میں ہے:

وذكر الطحاوي أنه تقبل شهادة الواحد إذا جاء من خارج المصر وكذا إذا كان على مكان مرتفع كذا في الهداية، وعلى قول الطحاوي اعتمد الإمام المرغيناني وصاحب الأقضية والفتاوى الصغرى. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۸، الباب الثانی فی رؤیة الهلال).

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

وإن جاء الواحد من خارج المصر وشهد برؤية الهلال ثمة روي أنه تقبل شهادته وإليه أشار في الأصل، وكذا لو شهد برؤية الهلال في المصر على مكان مرتفع. (فتاوی قاضیخان

علی هامش الهندیة: ١٩٦/١، الفصل الاول رؤیة الهلال).

درمختار میں ہے:

أو كان على مكان مرتفع واختاره ظهير الدين.... وفي الشامي: قلت:.... وفي المبسوط وإنما يرد الإمام شهادته إذا كانت السماء مصحية، وهو من أهل المصر فأما إذا كانت متغيمة أو جاء من خارج المصر أو كان في موضع مرتفع فإنه يقبل عندنا اه. فقوله عندنا يدل على أنه قول أئمتنا الثلاثة وقد جزم به في المحيط وعبر عن مقابله بقيل، ثم قال وجه ظاهر الرواية أن الرؤية تختلف باختلاف صفو الهواء وكدورته وباختلاف انهباط المكان وارتفاعه، فإن هواء الصحراء أصفى من هواء المصر، وقد يرى الهلال من أعلى الأماكن مالا يرى من الأسفل فلا يكون تفرده بالرؤية خلاف الظاهر بل على موافقة الظاهر ففيه التصريح بأنه ظاهر الرواية، وهوكذلك لأن المبسوط من كتب ظاهر الرواية أيضاً.

(الدر المختار مع الشامی: ٣٨٨/٢، کتاب الصوم، سعید۔وکذا فی امداد الفتاح :ص ٦٧٠،بیروت)

اسلامی فقہ میں ہے:

جب مطلع صاف ہوتو چاند دیکھنے میں کسی تکلیف کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر مطلع غبار آلود یا بدلی ہو یا ایسا شہر ہو جہاں دس منزلہ اور بیس منزلہ مکان ہی مکان ہوں تو وہاں اگر دوربین سے یا ہوائی جہاز سے چاند دیکھنے کی کوشش کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ اس کا انتظام اسلامی حکومت کرے یا کوئی باقاعدہ قابل اعتماد افراد کریں، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جس ڈگری پر عام طور پر وہاں چاند کی رؤیت ہوتی ہو اس سے زیادہ اونچائی سے نہ دیکھا گیا ہو یعنی جیسے ہوائی جہاز کو بہت اونچا نہ اڑایا گیا ہو اس لیے کہ چاند کبھی غروب نہیں ہوتا وہ کہیں نہ کہیں تو دکھائی دیتا ہی ہے، اس لیے اس کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ (اسلامی فقہ ۳۸۲/۱، نئے آلات کے ذریعہ)۔

آلاتِ جدیدہ میں مرقوم ہے:

شرط یہ ہے کہ ہوائی پرواز اتنی اونچی نہ ہو جہاں تک زمین والوں کی نظریں پہنچ ہی نہ سکیں کیونکہ شرعاً رؤیت وہی معتبر ہے کہ زمین پر رہنے والے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ سکیں، اس لیے اگر بیس تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر کے کوئی شخص چاند دیکھ آئے تو اس بستی کے لیے وہ رؤیت معتبر نہیں جس کے عام انسان باوجود مطلع صاف ہونے کے اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام،ص ۱۸۶، کتب خانہ قاسمی دیوبند)۔

نظام الفتاوی میں ہے:

اگر خبر دینے والے شاہدین ہوائی جہاز سے دیکھ کر طریقہ موجب کے ساتھ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے خبر یا شہادت دیں تو حسب ضابطہ شرعی اعتبار کرلیا جائے گا اور اس طرح وہ خبر یا شہادت بھی معتبر ومقبول ہوسکتی ہے۔

(منتخبات نظام الفتاوی: ص ۲۲۹، اصلاحی کتب خانہ)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

مطلع ابر آلود ہو تو گمان غالب کافی ہے، لہذا ایسی صورت میں ہوائی جہاز یا دوربین کے ذریعہ رؤیت معتبر ہونی چاہئے، بشرطیکہ ہوائی جہاز کے ذریعہ پرواز اتنی اونچی نہ کی گئی ہو کہ مطلع بدل جائے۔

چنانچہ مجلس تحقیقاتِ شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تجویز (۷) اس طرح ہے:

''ہوائی جہاز سے اتنی بلندی پر اڑ کر چاند دیکھنا جس سے مطلع متاثر ہوتا ہو معتبر نہیں ہے اور شریعت نے اس کا مکلّف بھی نہیں کیا ہے، فقہی کتابوں میں جہاں اونچی جگہوں پر چڑھ کر چاند دیکھنے کا تذکرہ ہے، اس سے مراد وہ اونچائی ہے جو عموماً شہروں میں ہوا کرتی ہے تاکہ مکانوں اور درختوں کی بلندی افق کو دیکھنے میں حائل نہ ہو خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہو، لہذا ہوائی جہاز سے اس قدر اونچائی پر پہنچ کر اگر چاند دیکھا جائے جس سے مطلع بدل جاتا ہے تو وہاں کی زمین والوں کے لیے معتبر رؤیت نہیں قرار پائے گی''۔ (جدید فقہی مسائل: ۲/۲۴، نعیمیہ)۔

مزید ملاحظہ ہو: امداد المفتین جلد دوم ص ۴۸۱-۴۸۳ بذریعہ ہوائی جہاز رویت ہلال کا حکم، دار الاشاعت، وایضاح المسائل، ص ۸۰، کتب خانہ نعیمیہ)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ثبوت ہلال کے لیے جدید فلکیاتی حساب کا حکم:

سوال: بعض ممالک میں رمضان ختم ہونے سے چند دن پہلے ہی سے عید کی تاریخ متعین کردیتے ہیں اور اس کا اعلان کرتے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ جدید فلکیات کے ذریعہ حساب لگا سکتے ہیں، شریعت میں اس حساب کا کیا حکم ہے؟

الجواب: رؤیت ہلال کے بارے میں نجومی، ستارہ شناس کی بات قابل اعتبار نہیں، لہذا ان کے حساب کے بناء پر ہلال کا ثبوت نہیں ہوگا، کیونکہ شریعت نے روزہ اور عید کو رؤیتِ ہلال پر وابستہ کیا ہے لہذا نجومیوں کا قول خواہ کتنا ہی دقیق نظریات پر مبنی ہو اس میں قطعیت نہیں پائی جاتی، بلکہ اکثر اوقات ان کی رائیں باہم مختلف ہوجاتی ہیں، ہاں جدید فلکیاتی حساب نفی میں استعمال کرسکتے ہیں لیکن اثبات میں گنجائش نہیں ہے، البتہ

جو یقینی ہے اس سے مدد لینے کی گنجائش ہے۔

الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے:

لا عبرة بقول المنجمين ، فلا يجب عليهم الصوم بحسابهم ولا على من وثق بقولهم، لأن الشارع علق الصوم على إمارة ثابتة لا تتغير أبداً، وهي رؤية الهلال أو إكمال العدة ثلاثين يوماً، أما قول المنجمين فهو إن كان مبنياً على قواعد دقيقة فإنا نراه غير منضبط، بدليل اختلاف آرائهم في أغلب الأحيان وهذا هو رأى ثلاثة من الأئمة وخالف الشافعية، ... قالوا : يعتبر قول المنجم في حق نفسه وحق من صدقه ولا يجب الصوم على عموم الناس بقوله على الراجح. (الفقه على المذاهب الأربعة :١/٣٤٤، هل يعتبر قول المنجم، القاهرة).

الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید میں ہے:

ولا يعتد شرعاً بقول الفلكيين الذين يعتمدون على الحساب ولو كانوا عدولاً. (الفقه الحنفى فى ثوبه الجديد :١/٤٠١، ثبوت رمضان وأحكام رؤية الهلال ، دمشق).

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

ولا يعتمد على ما يخبر به أهل الميقات والحساب والتنجيم، لمخالفته شريعة نبينا عليه أفضل الصلاة والتسليم. (الفقه الإسلامى وأدلته:٢/٩٩٥، كيفية اثبات هلال رمضان وهلال شوال، دارالفكر).

شامی میں ہے:

(قوله ولا عبرة بقول المؤقتين) أي في وجوب الصوم على الناس بل في المعراج لا يعتبر قولهم بالإجماع، ولا يجوز للمنجم أن يعمل بحساب نفسه، وفي النهر فلا يلزم بقول المؤقتين إنه أي الهلال يكون في السماء ليلة كذا وإن كانوا عدولاً في الصحيح كما في الإيضاح . (شامى ٢/٣٨٧، مطلب لا عبرة بقول المؤقتين فى الصوم ، سعيد).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور عام فقہاء کا اتفاق ہے کہ فلکیاتی علوم اور حساب پر عید ورمضان کا فیصلہ درست نہیں۔ (جدید فقہی مسائل ۲/۲۵، کتب خانہ نعیمیہ)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ فریدیہ: ۴/۴۰، وفتاوي دار العلوم ديوبند:٦/٣٦٧، مسائل رویت ہلال مدلل ومکمل)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

جدید آلات کے ذریعہ رؤیت ہلال کا حکم:

سوال: دوربین وخوردبین وغیرہ آلات یا اس کے علاوہ جدید آلات سے چاند دیکھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: دوربین محض ایک نگاہ کو بڑھانے والا آلہ ہے جیسا کہ عینک (چشمہ) اس سے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں، نیز جدید آلات کے ذریعہ رؤیت کی حیثیت محض کشف کی ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز وجود میں نہ ہو اور اس کی وجہ سے خواہ مخواہ نظر آنے لگے، لہذا ان جدید آلات سے مدد حاصل کرنے کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ فرمائیں شامی میں ہے:

قلت:... وفي المبسوط وإنما يرد الإمام شهادته إذا كانت السماء مصحية، وهو من أهل المصر فأما إذا كانت متغيمة أو جاء من خارج المصر أو كان في موضع مرتفع فإنه يقبل عندنا اهـ. فقوله عندنا يدل على أنه قول أئمتنا الثلا ثة وقد جزم به في المحيط وعبر عن مقابله بقيل، ثم قال وجه ظاهر الرواية أن الرؤية تختلف باختلاف صفو الهواء وكدورته وباختلاف انهباط المكان وارتفاعه، فإن هواء الصحراء أصفى من هواء المصر، وقد يرى الهلال من أعلى الأماكن مالا يرى من الأسفل فلا يكون تفرده بالرؤية خلاف الظاهر بل على موافقة الظاهر، ففيه التصريح بأنه ظاهر الرواية، وهو كذلك لأن المبسوط من كتب ظاهر الرواية أيضاً. (الدر المختار مع الشامي: ۳۸۸/۲، كتاب الصوم، سعيد۔وكذا في امداد الفتاح :ص ٦٧٠،بيروت).

اسلامی فقہ میں ہے:

جب مطلع صاف ہو تو چاند دیکھنے میں کسی تکلیف کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر مطلع غبار آلود یا بدلی ہو یا ایسا شہر ہو جہاں دس منزلہ اور بیس منزلہ مکان ہی مکان ہوں تو وہاں اگر دوربین سے چاند دیکھنے کی کوشش کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (اسلامی فقہ: ۳۸۲/۱، نئے آلات کے ذریعہ)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

دوربین سے چاند دیکھنے سے رؤیت معتبر ہوتی ہے اسی طرح خوردبین سے دیکھنا بھی صحیح اور معتبر ہے۔
(ایضاح المسائل: ص ۸۰، کتب خانہ نعیمیہ)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

مطلع ابرآلود ہو تو گمان غالب کافی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں دوربین کے ذریعہ رؤیت معتبر ہونی چاہئے۔
(جدید فقہی مسائل:۲/۲۴ نعیمیہ)۔

امدادالفتاوی میں ہے:

دوربین یا خوردبین سے دیکھنے کا کوئی جدا حکم نہیں بلا آلہ دیکھنے کے جو احکام ہیں وہی اس کے بھی ہیں، پس اگر افق پر ابر وغبار ہے تب تو ان کی رؤیت بشرط عدم مانع اوروں کے لیے کافی ہے، سب عمل کریں، اور اگر ابر وغیرہ نہیں تو اوروں کو بھی عمل جائز نہیں اور خود ان کو بھی عمل جائز نہیں۔ (امدادالفتاوی:۲/۱۱۰، دارالعلوم کراچی)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

ریڈیو کی خبر سے ثبوت ہلال کا حکم:

سوال: عام طور پر جمعیۃ العلماء کا فیصلہ ریڈیو پر شائع کیا جاتا ہے تو اس سے رؤیت ہلال ثابت ہوگی یا نہیں؟

الجواب: ریڈیو کی خبر ایک اعلان کی حیثیت رکھتی ہے یہ اعلان اگر رؤیت ہلال کی باضابطہ کمیٹی کی جانب سے ہو، جو شرعی شہادت وقواعد کے مطابق فیصلہ کرتی ہے، اور اعلان کرنے والا کمیٹی کا معتمد مسلم نمائندہ ہو تو اس پر اعتماد کرنا صحیح اور درست ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اگر وہ محکمہ رؤیت ہلال کی شرعی طور پر تحقیق کر کے والی ملک کے امر سے تار یا ریڈیو کی ذریعہ رؤیت کا اعلان کردے تو خاص اس شہر میں نیز ان مقامات میں جو اس شہر کے تابع ہوں جیسے قرب وجوار کے قصبات اس اعلان کا اعتبار کر کے عمل کرنا شرعاً درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۰/۵۵، باب رؤیۃ الہلال)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

محض ریڈیو کی خبر سے شرعاً رویت کا ثبوت نہیں ہوتا بلکہ ریڈیو کی خبر معتبر ہونے کے لیے حسب ذیل شرطیں لازم ہیں:

۱- حاکم مسلم یا کسی ہلال کمیٹی کے باشرع اور متبع شریعت ذمہ دار ثبوت شرعی کے بعد از خود ریڈیو پر اعلان کرے یا اعلان کرائے۔

۲- اس طرح اعلان کریں کہ ہم نے شہادت لی ہے، اور شرعی شہادت سے رؤیت کا ثبوت ہو چکا ہے۔

۳- ذمہ دار اپنا خود تعارف بھی کرائے کہ فلاں بن فلاں ہوں، فلاں حاکم یا فلاں ہلال کمیٹی کا ذمہ دار ہوں۔

۴- ریڈیو کے اعلان کی تفصیل ذمہ دار علماء کے سامنے رکھ دیں، اور وہ تحقیق و تفتیش سے اطمینان کر لیں، ان کی ہدایات پر عمل کریں۔

۵- ریڈیو کا اعلان اتنی دور تک معتبر ہو سکتا ہے کہ اس کے تسلیم کرنے سے آپ کے یہاں کبھی مہینہ ۲۸ یا ۳۱ کا نہ ہوتا ہو۔

۶- اس رؤیت کے موقع پر آپ کے یہاں مطلع صاف نہ ہو، ورنہ اس اعلان کا اعتبار نہ ہوگا، مذکورہ شرطوں کے ساتھ ریڈیو کا اعلان معتبر ہے ورنہ معتبر نہیں۔ (ایضاح المسائل: ص ۸۰، نعیمیہ)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

ریڈیو: شرعی قاضی، یا مستند علماء کرام کی مجلس یا وہ چاند کمیٹی جن کا فیصلہ مسلمان تسلیم کرتے ہوں، یہ لوگ با قاعدہ شہادت لیکر چاند کا فیصلہ کریں اور اس فیصلہ کو شرعی قاضی یا علماء کرام کی مجلس یا چاند کمیٹی کا صدر یا ان کا معتمد نمائندہ بذریعہ ریڈیو نشر کرے اور دوسری جگہ کے علماء کرام اسے منظور رکھیں تو اس پر عمل کرنا درست ہے۔ (فتاوی رحیمیہ: ۱۸۵/۵)۔

فتاویٰ فریدیہ میں ہے:

ہلال کمیٹی کا اعلان اور اخبار بذریعہ ریڈیو وغیرہ واجب الاعتماد ہوگا جبکہ خبر تفصیلی ہو، اس میں حکم دہندہ اور سببِ حکم مذکور ہوتا کہ ظن غالب حاصل ہو۔ (فتاوی فریدیہ: ۵۷/۴)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: جدید فقہی مسائل: ۲۲/۲، ریڈیو اور ٹی وی کی اطلاع۔ وامداد المفتین: ۴۸۰-۴۷۷/۲)۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

ٹیلیفون کی خبر سے ثبوتِ ہلال کا حکم:

سوال: ٹیلیفون کی خبر سے رؤیت ہلال کا ثبوت ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ٹیلیفون میں بولنے والا جانا پہچانا آدمی ہے اور اس میں کوئی اشتباہ بھی نہیں ہے اور اس کی سچائی کا ظن غالب ہے اور اپنے یہاں رؤیت کا شرعی فیصلہ ہونے کی خبر دے رہا ہے تو اس کو معتبر مان کر شخصی طور پر عمل کرنا جائز ہے، واجب نہیں، اور اگر ہر طرف سے ٹیلیفون کے ذریعہ متواتر خبریں آئیں اور کثیر تعداد میں لوگ

خبریں دیں اور استفاضہ کی حد تک پہنچ جائے تو اس کو شرعی شہادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، اور اس پر عمل کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

کتاب الفتاوی میں ہے:

اگر مطلع صاف ہو خواہ مسئلہ عید کے چاند کا ہو یا رمضان کا، رؤیت ثابت ہونے کے لیے خبر مستفیض یعنی اتنے لوگوں کی خبر مطلوب ہے کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہو جانا نا قابل تصور ہو، اگر مطلع ابر آلود ہو، اور مسئلہ رمضان کے چاند کا ہو تو ایک معتبر آدمی کی خبر چاند کے ثبوت کے لیے کافی ہے، گویا ان دونوں صورتوں میں چاند ثابت ہونے کا مدار خبر پر ہے، لہذا ٹیلیفون پر خبر دی جائے اور اطمینان ہو جائے کہ خبر دہندہ اپنا جو تعارف کر رہا ہے، وہ صحیح ہے، اور یہ شخص معتبر ہے تو ٹیلیفون کی ایسی خبروں کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ (کتاب الفتاوی:۳/۳۷۶).

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: احسن الفتاوی:۴/۴۰۷۔۴۱۲۔ فتاوی رحیمیہ:۵/۱۸۷۔ جدید فقہی مسائل:۲/۲۱۔ کفایت المفتی:۴/۲۱۶۔ نظام الفتاوی:۲/۱۶۳۔ واللہ ﷻ اعلم۔

فاسق کی شہادت پر قاضی فیصلہ کر دے تو ثبوتِ ہلال کا حکم:

سوال: کیا قاضی رویت ہلال میں فاسق کی شہادت قبول کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر قبول کر لی تو اس کی بنیاد پر صادر شدہ فیصلہ درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب: فاسق کی شہادت قبول کرنے والا قاضی گنہگار ہے، لیکن اس کی اچھی شہرت وامانت داری کی وجہ سے اگر قاضی نے اس کی شہادت قبول کر لی تو فیصلہ نافذ ہوگا بلکہ امام ابو یوسف کے قول کے مطابق جو فاسق شرافت ومروت میں مشہور ہو اس کی شہادت قبول کرنا لازم ہے اور ایسے شخص کو قاضی بنانا بھی گناہ نہیں، لیکن اصح قول یہ ہے کہ اس کی شہادت قبول کرنا گناہ ہے، لیکن فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

(والفاسق أهلها فيكون أهله لكنه لا يقلد) وجوباً ويأثم مقلده كقابل شهادته به يفتىٰ وقيده في القاعدية بما إذا غلب على ظنه صدقه فليحفظ، درر، واستثنى الثاني الفاسق ذا الجاهة والمروءة فإنه يجب قبول شهادته بزازية، قال في النهر: وعليه فلا يأثم أيضاً بتوليته القضاء حيث كان كذلك إلا أن يفرق بينهما . انتهى.

وفي الشامية: (قوله لكنه لا يقلد وجوباً) قال في البحر وفي غير موضوع ذكره الأولوية

یعني الأولی أن لا تقبل شهادته وإن قبل جاز وفي الفتح ومقتضی الدلیل أن لا یحل أن یقضی بها فإن قضی جاز ونفذ ومقتضاه الإثم ... وصرح ابن الکمال بأن من قلد فاسقا یأثم وإذا قبل القاضي شهادته یأثم. (قوله واستثنی الثاني) أي أبویوسفؒ من الفاسق الذي یأثم القاضي بقبول شهادته، والظاهر أن هذا مما یغلب علی ظن القاضي صدقه، فیکون داخلاً تحت کلام القاعدیة فلا حاجة إلی استثنائه علی ما استظهرنا آنفاً تأمل. (الدر المختار مع الشامی ۵/ ۳۵۶، کتاب القضاء، مطلب فی حکم القاضی الدرزی والنصرانی سعید).

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

باتفاقِ فقہاء فاسق کی شہادت کوقبول کرنا اوراس کے مطابق فیصلہ کرنا قاضی کے ذمہ واجب نہیں ہے، لیکن اگرقاضی کوقرائن کے ذریعہ معلوم ہوجائے کہ یہ جھوٹ نہیں بولتا اس بناپر وہ فاسق کی شہادت پرکوئی فیصلہ کردے تو یہ فیصلہ صحیح اورنافذ ہے۔ مستفاد از ہدایہ، شرح وقایہ، درمختار، شامی، عالمگیری وغیرہ۔ (رؤیتِ ہلال وفوٹو کے احکام: ص۵۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

فاسق قاضی کے فیصلہ پررؤیت ہلال کاحکم:

سوال: اگرکوئی قاضی عقیدہ کے اعتبار سے فاسق ہوتو کیا اس کی قضا اور فیصلہ معتبر ہوگا یانہیں؟

الجواب: کسی بھی فاسق شخص کوخواہ فسق عقیدہ کے اعتبار سے ہو یا عمل کے اعتبار سے ہوقاضی نہیں بنانا چاہئے، لیکن اگرامیر المؤمنین اورحاکم اعلی نے اس کوقاضی بنادیا تو قضا درست ہوگی، لہذا مسلمانوں کوان کاحکم مان لینا چاہئے۔

ملاحظہ ہوشامی میں ہے:

(قوله والفاسق أهلها) وأفصح بهذه الجملة دفعاً لتوهم من قال إن الفاسق لیس بأهل للقضاء فلا یصح قضاءه؛ لأنه لا یؤمن علیه لفسقه، وهو قول الثلاثة واختاره الطحاوي، قال العینيؒ: وینبغي أن یفتی به خصوصاً في هذا الزمان. أقول: لو اعتبر هذا لانسد باب القضاء خصوصاً في زماننا فلذا کان ما جری علیه المصنف هو الأصح کما في الخلاصة، وهو أصح الأقاویل کما في العمادیة، نهر، وفي الفتح: والوجه تنفیذ قضاء کل من ولاه سلطان ذو شوکة وإن کان جاهلاً فاسقاً وهو ظاهر المذهب عندنا وحینئذٍ فیحکم بفتوی

غيره . (فتاوى الشامي :۵/۳۵۵ ، كتاب القضاء ، سعيد) ـ**واللہ ﷻ اعلم ـ**

مطلع صاف ہوتو جمعِ عظیم کی شہادت ضروری ہے:

سوال: اگر مطلع صاف ہوتو قاضی ۲،۳ گواہوں کی گواہی سے عیدو رمضان کا حکم کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مذہبِ احناف میں متون وشروح اس بات پر متفق ہیں کہ ظاہر الروایت کے مطابق مطلع صاف ہونے کی صورت میں جمعِ عظیم ضروری ہے، چند آدمیوں کی گواہی سے ثبوتِ ہلال متحقق نہ ہوگا، اور یہ بات کہ لوگ چاند دیکھنے میں سستی کرتے ہیں اس زمانہ میں متحقق نہیں، بلکہ اس کام کے لیے حکومتوں، عوام اور جمعیتوں کی طرف سے کمیٹیاں بنائی گئی ہیں، نیز موجودہ دور میں جھوٹ غلط فہمی وغیرہ عام ہے لہذا ظاہر الروایت پر عمل لازم اور ضروری ہے۔

ملاحظہ فرمائیں مبسوط میں ہے:

فأما إذا لم يكن بالسماء علة فلا تقبل شهادة الواحد والمثنى حتى يكون أمراً مشهوداً ظاهراً في هلال رمضان وهكذا في هلال الفطر في رواية هذا الكتاب، وفي رواية الحسن عن أبي حنيفةؒ قال: تقبل فيه شهادة رجلين أورجل وامرأتين بمنزلة حقوق العباد، والأصح ما ذكرنا هنا فإن في حقوق العباد إنما تقبل شهادة رجلين إذا لم يكن هناك ظاهر يكذبهما وهنا الظاهر يكذبهما في هلال رمضان وفي هلال شوال جميعاً لأنها أسوة سائر الناس في الموقف والمنظر وحدة البصر وموضع القمر فلا تقبل فيه شهادة إلا أن يكون أمراً مشهوداً ظاهراً. (المبسوط للإمام السرخسيؒ: ۳/ ۱۴۰، دار الفكر).

امداد الفتاح میں ہے:

وإذا لم يكن بالسماء علة فلا بد للثبوت من شهادة جمع عظيم لرمضان والفطر وغيرهما لأن المطلع متحد في ذلك المحل، والموانع منتفية، والأبصار سليمة ، والهمم في طلب روية الهلال مسقيمة ، فالتفرد في مثل هذه الحالة لوهم الغلط فوجب التوقف في رؤية البعض القليل حتى يراه الجمع الكثير. (امداد الفتاح :ص ۶۷۰ ،بيروت).

کنز الدقائق میں ہے:

وقبل بعلة خبر عدل ولو قناً أو أنثى لرمضان وحرين أو حر وحرتين للفطر وإلا فجمع

عظیم لهما. (كنز الدقائق :ص٦٧، كتاب الصوم ،مكتبة امدايه ملتان).

المختار میں ہے:

وإن لم يكن بالسماء علة لم تقبل إلا شهادة جمع يقع العلم بخبرهم. (المختار: ۱۲۹، کتاب الصوم۔ و كذا في الهداية: ۱/ ۲۱۵).

نیز عصر حاضر میں جھوٹ اور غلط فہمی عام ہے لہذا ظاہر الروایت پر عمل کرنا ضروری ہوگا، جیسا کہ علامہ خیر الدین رملی نے فرمایا۔ ملاحظہ ہو:

قال العلامة الشامي: ظاهر الرواية اشتراط العدد لا الجمع العظيم والعدد يصدق باثنين ... ونازعه محشيه الرملي بأن ظاهر المذهب اشتراط الجمع العظيم، فيتعين العمل به لغلبة الفسق والافتراء على الشهر. (فتاوى الشامي: ۲/ ۳۸۸، سعيد)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

دوسرے دن چاند نہ نظر آنے پر شہادت کا حکم:

سوال: اگر آج چاند کی گواہی دی گئی اور کل بھی جانب مغرب میں چاند نظر نہیں آیا، حالانکہ آسمان صاف تھا تو کیا کل کی گواہی خلافِ ظاہر ہو کر مردود ہوئی یا نہیں؟ یا دوسرے دن مطلع صاف ہونے کے باوجود رؤیتِ عام نہیں ہوئی۔

الجواب: یہ مسئلہ عربی کتب وفتاویٰ میں نہیں ملا، البتہ فتاوی واحدی میں لکھا ہے کہ اگر دوسرے دن چاند نظر نہیں آیا تو پھر بھی سابقہ فیصلہ درست ہے، لیکن فتاوی واحدی نے پرانی کتابوں میں سے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، لہذا ان کا یہ فتویٰ خلافِ ظاہر ہے، اور آج کل لوگوں کی خلافِ ظاہر گواہی کو دیکھتے ہوئے یہ فتویٰ دینا چاہئے کہ سابقہ عید یا روزہ درست نہیں تھا، اور گواہوں کو تعزیری سزا دینا چاہئے۔

فتاویٰ واحدی کی عبارت درج ذیل ہے:

سوال: ما قولهم: اندرآنچہ ہلال فطر را گواہاں در دیہی دیدند قاضی قسم دادہ حکم بدان نمود وشب دویم در دیہ ودیگر بعضے مردم بسیار نظر بستند ندیدند دراں صورت حکم ماضی نافذ است یا نہ وکذب شہود رؤیت ظاہر شد ونہ وگواہی ندیدن مقبول است یا نہ؟

جواب: الظاهر أن حكم القاضي نافذ وإن لم يروا الهلال في الليلة الثانية، كما يستفاد من جواهر الفتاوى حيث قال: قاضٍ شهد عنده شاهدان برؤية هلال رمضان وقضى به ثم

أتموا ثلاثين يوماً ولم يروا هلال العيد والسماء مصحية فإنهم يفطرون لأنهم عقدوا ثلاثين يوماً كما أمروا به ولا يظهر بذلك كذب الشهود لأن قولهما وإن كان متحملاً فقد صار حجة لاتصال القضاء به، انتهىٰ، وكما لا يظهر كذب الشهود في الصورة المذكورة لاتصال القضاء بالشهادة فكذلك فيما نحن فيه كما لا يخفى على أن الأصل قبول شهادة الإثبات دون النفي. (فتاوی واحدی: للعلامة عبد الواحد سیوستانی سندھی رحمہ اللہ ،جلداول ص ۳۳۱)۔

نیز جب آسمان صاف ہواور دوتین آدمی گواہی دیں تو اس کو خلاف ظاہر ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا جاتا تو جب پہلے دن رؤیت کے بعد دوسرے دن صاف آسمان میں رؤیت نہیں ہوئی یہ تو بہت ہی خلاف ظاہر ہے لہٰذا دوسرے دن رؤیت نہ ہو تو سابقہ شہادت کو کالعدم قرار دینا چاہئے ،اس لیے کہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ مرقوم ہے کہ کسی چیز پر گواہی دی جائے اور ظاہر میں یقینی طور پر اس کی مخالفت ثابت ہوجائے تو وہ گواہی کالعدم سمجھی جائے گی۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وإذا تنازعا في دابة وأقام كل واحد منهما بينة أنها نتجت عنده وذكراً تاريخاً وسن الدابة يوافق أحد التاريخين فهو أولى، لأن الحال تشهد له فيترجح...وإن خالفت سن الدابة الوقتين بطلت البينتان، كذا ذكره الحافظ الشهيد، لأنه ظهر كذب الفريقين فتترك في يد من كانت في يده. (الهداية: ۳/۲۲٤)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ظاہر میں بینہ کی مخالفت ثابت ہوجائے تو بینہ خود باطل ہے یعنی ان کی گواہی مردود ہے۔

فتح القدیر میں ہے:

بطلت البينتان، كذا ذكره الحاكم لأنه ظهر كذب الفريقين وذلك مانع عن قبول الشهادة حالة الانفراد فيمنع حالة الاجتماع أيضاً. (فتح القدير: ۲۷۹/۸، دار الفكر)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

صبح کومشرق میں اور شام کومغرب میں چاند نظر آنا ممکن نہیں:

سوال: علامہ شامی رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی علاقہ میں صبح کو بجانب مشرق طلوع آفتاب سے پہلے،اور شام کو بجانب مغرب چاند نظر آئے ،آج کل بعض علاقوں میں بھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم نے صبح کو بھی چاند دیکھا اور شام کو غروب کے بعد بھی دیکھا،کیا ایسا ممکن ہے؟ علامہ شامیؒ کی عبارت ملاحظہ

فرمائیں:

وأما إذا رؤي يوم التاسع والعشرين قبل الشمس ثم رؤي ليلة الثلاثين بعد الغروب، وشهدت بينة شرعية بذلک، فإن الحاكم يحكم برؤيته ليلاً كما هو نص الحديث، ولايلتفت إلى قول المنجمين إنه لا تمكن رؤيته صباحاً ثم مساءً في يوم واحد كما قدمناه عن فتاوى الشمس الرملي الشافعي. (فتاوی الشامی: ۳۹۲/۲، مطلب فی رؤية الهلال نهاراً، سعید)؟

الجواب: قدیم اور جدید ماہرین فلکیات اور مفسرین کے اقوال اور تجربہ کی روشنی میں یہ ممکن نہیں کہ صبح کو شرقاً اور شام کو غرباً چاند نظر آئے، کیونکہ چاند کم سے کم دو دن ضرور چھپتا ہے، چنانچہ علم حدیث وفقہ کے ساتھ ساتھ فلکیات کے ماہر مفتی بغداد علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

فبقي ثمانية وعشرون وهو زمان ما بين أول ظهوره بالعشيات مستهلا أول الشهر، وآخر رؤيته بالغدوات مستتراً آخره. (روح المعانی: ۱۶/۲۳، سورة یٰس).

یعنی ۲۸ دن کے علاوہ دو دن چاند کے چھپنے سے لیکر ظاہر ہونے تک ہیں۔

نیز جلالین کے حاشیہ میں بحوالہ کمالین مذکور ہے کہ چاند دو دن چھپتا ہے اور کبھی کبھی تین دن۔

ملاحظہ ہو جلالین میں ہے:

هو الذي جعل الشمس ضياء وقدره منازل منازل ثمانية وعشروين منزلاً في ثمان وعشرين ليلة من كل شهر، ويستتر ليلتين إن كان الشهر ثلاثين يوماً وليلة إن كان تسعة وعشرين يوماً. اس عبارت کے تحت حاشیہ میں مذکور ہے:

تبع في ذلک الشيخ البغوي لكن ذلک خلاف المشاهدة... یعنی علامہ سیوطیؒ نے امام بغویؒ کی اتباع میں یہ لکھا ورنہ درحقیقت چاند دو دن چھپتا ہے جب مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور تین دن جب کہ ۳۰ دن کا مہینہ ہو، چنانچہ آخر میں لکھتے ہیں: **وأقل ما يخفى ولا يرى صباحاً ولا مساءً ليلتان، وأكثره ثلاث ليال.** (جلالین مع الحاشیة: ۱۷۰/۲، رقم الحاشیة: ۲۳).

نیز حدیث شریف میں ہے:

عن عمران بن حصينؓ أن النبي صلى الله عليه وسلم قال لرجل: هل صمت من سرر هذا الشهر (أي شعبان) شيئاً فقال: لا، قال: فقال له: إذا أفطرت رمضان فصم يوماً أو يومين.

(رواه مسلم: ۳۶۸/۱).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے دریافت فرمایا کہ: آپ نے شعبان کے آخر میں جن میں چاند چھپتا ہے روزے رکھے؟ اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا: جب رمضان ختم ہو تو ایک یا دو دن روزے رکھ لینا۔

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اوزاعیؒ، ابوعبیدؒ اور دیگر بہت سارے علماء کے حوالے سے نقل فرمایا ہے کہ اس سے مراد مہینہ کا آخری حصہ ہے۔

قال النوويؒ: سرر ويقال أيضاً سَرار وسِرار بفتح السين وكسرها، وكله من الاستسرار. قال الأوزاعيؒ وأبو عبيدؒ وجمهور العلماء من أهل اللغة والحديث: المراد بالسرر آخر الشهر، سميت بذلک لاستسرار القمر فيها، قال البيهقي في السنن الكبرى بعد أن روى الروايتين عن الأوزاعي: الصحيح آخره، ... قال القاضي: والأشهر أن المراد آخر الشهر كما قاله أبو عبد اللهؒ والأكثرون. (شرح مسلم شريف: ۱/۳۶۸).

ان عبارات اور حوالہ جات کی روشنی میں علامہ شامیؒ کی بات سمجھ میں نہیں آتی، ممکن ہے کہ ہمارے صوابی مردان اور چارسدہ یا سعودی عرب کی طرح شام میں بھی یہ بات مشہور ہو، یا ہوسکتا ہے کہ شمس رملی کی اتباع میں یہ بات فرمائی ہو، لیکن حقیقت وہی ہے جو ذکر کی گئی۔

نیز اس مسئلہ کی کچھ تفصیل محترم عبدالمنعم صاحب نے اپنی رسالہ ''اعدل الاقوال'' میں ذکر فرمائی ہے۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

جس روز مشرق کی طرف بوقت صبح چاند نظر آئے، اس روز بلکہ اس سے ایک روز بعد رؤیت ہلال محال ہے کیونکہ ان ایام میں غروب شمس قبل ہی قمر غروب ہو جاتا ہے، اور حکومتِ سعودیہ میں بسا اوقات خود اسی روز ہی رؤیت کا اعلان ہو جاتا ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۴/۴۱۷).

خلاصہ یہ ہے کہ صاحبِ جلالین کے قول کے مطابق چاند کا ایک دن کم از کم چھپنا ضروری ہے اور صاحب کمالین اور علامہ آلوسی کے قول کے مطابق دو دن چھپنا ضروری ہے، لہذا صبح کو مشرق میں اور شام کو مغرب میں چاند کی رؤیت ناممکن ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

۳۰ روزے ختم ہونے کے بعد چاند نظر نہ آنے پر عید کا حکم:

سوال: اگر رمضان المبارک کے ۳۰ دن پورے ہونے کے بعد مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہ آئے تو عید ہوگی یا نہیں؟

الجواب: اگر ایک آدمی کی گواہی سے چاند کا ثبوت ہوا تھا اور ۳۰ روزے گزرنے کے بعد بھی چاند نظر نہیں آیا تو صحیح قول کے مطابق آئندہ کل عید نہیں ہوگی، بلکہ روزہ رکھنا ضروری ہوگا، اس وجہ سے کہ گواہی خلاف ظاہر ہوکر مردود ہوئی۔

اور اگر دو آدمیوں کی گواہی سے ثابت ہوا تھا تو فتاوی ہندیہ میں صحیح یہ لکھا ہے آئندہ کل عید ہوگی۔ اور علامہ شامیؒ نے بھی اسی کو شامی میں ذکر فرمایا ہے، لیکن البحر الرائق اور تنقیح الفتاوی الحامدیہ (جو کہ شامی کے بعد کی تصنیف ہے) کی عبارات کی روشنی میں ہندیہ کا قول مرجوح ہے، کیونکہ علامہ ابن نجیمؒ اور علامہ شامیؒ نے فرمایا کہ ایک سے زائد آدمیوں نے گواہی دی پھر ۳۰ دن کے بعد آسمان صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہیں آیا تو یہ گواہی شہادتِ زور قرار دی جائے گی اور آئندہ کل روزہ رکھنا ضروری ہوگا، نیز ہندیہ کا قول اس حدیث کے بھی خلاف ہے کہ مہینہ یا ۲۹ کا ہوگا یا ۳۰ کا ہوگا، جب ۳۰ دن گزر گئے اور آسمان صاف ہے اور چاند نظر نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہینہ ۳۱ کا ہوگیا حالانکہ ایسا نہیں ہوسکتا، اس لیے مختار قول یہ ہے کہ سابقہ شہادت صحیح نہیں تھی۔

مذکورہ بالا مسئلہ اس وقت ہے جبکہ ۳۰ روزے ختم ہونے کے بعد مطلع صاف ہو اور چاند نظر نہ آئے لیکن اگر مطلع ابر آلود ہے صاف نہیں ہے اور چاند دکھائی نہیں دیا تو بالاتفاق عید کرنا جائز ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

وإذا صاموا بشهادة الواحد وأكملوا ثلاثين يوماً ولم يروا هلال شوال لا يفطرون فيما روى الحسن عن أبي حنيفةؒ للاحتياط، وعن محمدؒ أنهم يفطرون كما في التبيين، وفي غاية البيان قول محمدؒ أصح، قال شمس الأئمة: هذا الاختلاف فيما إذا لم يروا هلال شوال والسماء مصحية، فأما إذا كانت متغيمة فإنهم يفطرون بلا خلاف كذا في الذخيرة وهو الأشبه، هكذا في التبيين، وإذا شهد على هلال رمضان شاهدان والسماء متغيمة وقبل القاضي شهادتهما صاموا ثلاثين يوماً فلم يروا هلال شوال إن كانت السماء متغيمة يفطرون من الغد بالاتفاق وإن كانت مصحية يفطرون أيضاً على الصحيح. (الفتاوى الهندية: ١٩٨/١).

اسی طرح درمختار میں مذکور ہے:

وبعد صوم ثلاثين بقول عدلين حل الفطر لوجود نصاب الشهادة، ولو صاموا بقول عدل حيث يجوز وغم هلال الفطر لا يحل على المذهب خلافاً لمحمدؒ كذا ذكره

المصنف لكن نقل ابن الكمال عن الذخيرة أنه إن غم هلال الفطر حل اتفاقاً وفي الزيلعي الأشبه إن غم حل وإلالا. وفي الشامي: قوله وفي الزيلعي نقله لبيان فائدة لم تعلم من كلام الذخيرة وهي ترجيح عدم الفطر إن لم يغم شوال بظهور غلط الشاهد لأن الأشبه من ألفاظ الترجيح، لكنه مخالف مما علمته من تصحيح غاية البيان لقول محمد بالحل نعم حمل في الإمداد ما في غاية البيان على قول محمدؒ بالحل إذا غم شوال بناء على تحقيق خلاف الذي نقله المصنفؒ، وقد علمت عدمه وحينئذٍ فما في غاية البيان في غير محله لأنه ترجيح لما هو متفق عليه. (الدر المختار مع الشامی: ۲/۳۹۱، سعید).

لیکن علامہ شامی نے تنقیح الفتاوی الحامدیہ میں اس کے خلاف تحریر فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

شهادة الزور لا تعلم إلا بالإقرار ولا تعلم بالبينة (أقول) قد تعلم بدون الإقرار كما إذا شهد بموت زيد أو بأن فلاناً قتله ثم ظهر زيد حياً، وكذا إذا شهد برؤية الهلال ومضى ثلاثون يوماً وليس في السماء علة ولم ير الهلال ومثله هذا كثير. (تنقیح الفتاوی: ۱/۳٤۱).

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۰ دن گزرنے کے بعد آسمان صاف ہونے کے باوجود چاند دکھائی نہ دے تو سابقہ شہادت زور کہلائے گی اور اکتیسواں روزہ رکھنا ضروری ہوگا۔

نیز یہ بھی جاننا چاہئے کہ تنقیح الفتاوی ردالمحتار کے بعد لکھی ہے چنانچہ مقدمہ میں فرماتے ہیں:

وزدت مالا بد منه من نحو استدراكه أو تقييده أو فيه تقوية وتاييد ضاماً إلى ذلك أيضاً بعض تحريرات نقحتها في حاشيتي على البحر المسمات "منحة الخالق على البحر الرائق" وحاشيتي التي علقتها على شرح التنوير المسماة "رد المحتارعلى الدرالمختار".

(مقدمة تنقيح الفتاوى: ۱/۲).

لہٰذا عدم افطار والا قول راجح ہوگا، نیز اسی کے موافق علامہ ابن نجیم مصریؒ نے بھی البحر الرائق میں تحریر فرمایا ہے:

ملاحظہ فرمائیں البحر الرائق میں ہے:

قوله ومن أقر أنه شهد زوراً يشهد ولا يعزر وقيد باقراره لأنه لا يحكم به (أي بالزور) إلا بإقراره وزاد شيخ الإسلام أن يشهد بموت واحد فيجيء حياً كذا في فتح القدير وجعل في إيضاح الإصلاح نظير مسئلة ظهوره حياً بعد الشهادة بموته أو قتله ما إذا شهدوا برؤية الهلال فمضى ثلا ثون يوماً وليس في السماء علة ولم يروا الهلال. (البحر الرائق: ۷/۱۲٦، کوئٹہ).

بحر کی عبارت میں ” شهدوا “جمع کا صیغہ ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ تنقیح میں ” شهد “کا لفظ مجہول ہے یعنی ایک کی گواہی سے یا چند کی گواہی سے رمضان ثابت ہوا ہو پھر بھی شہادت زور قرار دی جائے گی اور اکتیسواں روزہ رکھنا ضروری ہوگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اختلافِ مطالع کا حکم:

سوال: اختلافِ مطالع کا شرعاً اعتبار ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی کیا حد ہے؟

الجواب: اختلافِ مطالع کا اعتبار شرعاً ہونا چاہئے، اس لیے کہ فقہائے حنفیہ میں سے علامہ زیلعی اور علامہ کاسانی جیسے جلیل القدر فقہاء نے اسی کو ترجیح دی ہے، نیز اکابر دیوبند میں سے بھی بعض حضرات نے اس کو راجح قرار دیا ہے۔ رہا مسئلہ کہ اس کی کیا حد ہوگی؟ تو اس کے بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا قول واضح معلوم ہوتا ہے کہ جن بلاد میں اتنا فاصلہ ہو کہ ایک جگہ کی رؤیت کا دوسری جگہ اعتبار کرنے سے مہینہ اٹھائیس دن یا اکتیس دن کا ہو جائے تو وہاں اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور جہاں ایسا نہ ہو وہاں نہ کرے، نیز اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کرنے میں یہ بھی ایک نقص ہے کہ اگر جنوبی افریقہ میں چاند دیکھا جائے تو آسٹریلیا میں فجر کا وقت قریب ہوگا یا بعض ممالک میں فجر ہو چکی ہوگی تو کیا وہ فجر تک چاند کا انتظار کریں گے یا روزہ رکھنے کے بعد اس کو توڑ دیں گے، ہاں پاکستان، انڈیا اور عربی ممالک کا اتحاد رؤیت میں ممکن اور آسان ہے، بلکہ جنوبی افریقہ کو معیار مانا جائے جہاں جنوب مغرب ہونے کی وجہ سے رؤیت کا امکان زیادہ ہے اور رؤیت کا نظام بھی مضبوط ہے تو چاند کا مسئلہ افریقہ اور یورپ اور ہندوستان پاکستان سے لیکر مغرب تک حل ہو سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

هذا إذا كانت المسافة بين البلدين قريبة لا تختلف فيها المطالع ، فأما إذا كانت بعيدة فـلا يلزم أحد البلدين حكم الآخر لأن مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فيعتبر في أهل كل بلد مطالع بلدهم دون البلد الآخر. (بدائع الصنائع: ۸۳/۲، سعيد).

الفقہ الحنفی وادلتہ میں ہے:

إذا كـان بيـن الـقـطرين قريب بحيث تتحد المطالع فلا يعتبر ، وإن كانت بعيدة بحيث تختلف المطالع فيعتبر فلو صام أهل قطر ثلا ثين يوماً برؤية، وأهل قطر آخر تسعة وعشرين يـومـاً برؤية ، فعليهم قضاء يوم إن كان بين القطرين قرب بحيث تتحد المطالع ، وإن كانت

بعيدة بحيث تختلف، لا يلزم أحد القطرين حكم الآخر، فالقرب مثل سورية، والعراق، والبعد مثل الكويت والمغرب، وجاء عن ابن عباس وعائشة رضي اللّٰه عنهما صوم كل جماعة يوم يصومون، وفطرهم يوم يفطرون. (الفقه الحنفی وأدلته: ۳۸۹/۱، قبول خبر الواحد فی روية هلال رمضان، دمشق).

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

والأشبه أن يعتبر لأن كل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس تختلف باختلاف الأقطار، كما أن دخول الوقت وخروجه تختلف باختلاف الأقطار حتى إذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم منه أن تزول في المغرب، وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلك طلوع فجر لقوم وطلوع شمس للآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم. (تبیین الحقائق: ۳۲۱/۱، امدایه، ملتان)

فتاویٰ بینات میں ہے:

اختلافِ مطالع کا مسئلہ متقدمین اور متاخرین میں مختلف فیہ رہا ہے اس میں فقہاء کرام کے تین مسلک ہیں۔

پہلا مسلک: امام اعظم سے منقول ہے اور ظاہر الروایت کہا جاتا ہے کہ اختلاف مطالع کا کوئی اعتبار نہیں (لیکن پوری دنیا پر اس کو لاگو کرنے میں بہت مشکلات ہیں)

دوسرا مسلک: یہ ہے کہ ہر جگہ ہر حال میں اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا جائے گا۔

تیسرا مسلک: یہ ہے کہ بلادِ قریبہ میں تو اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں، البتہ بلادِ بعیدہ میں اس کا اعتبار ہے۔ (جس کا مدار عرف ہونا چاہئے اور اکثر بلاد شمالیہ اور جنوبیہ میں اختلافِ مطالع ہوتا ہے، جنوب میں چاند نظر آتا ہے اور شمال میں نظر نہیں آتا) اس قول کو علامہ زیلعی اور صاحب بدائع نے ترجیح دی ہے۔ (فتاویٰ بینات: ۵۸/۳، اختلاف مطالع کا حکم، مکتبہ بینات کراچی)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ”رؤیتِ ہلال“ میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے استاذ محترم حضرت سید محمد انور شاہ کشمیریؒ بھی اسی کی ترجیح کے قائل تھے، اور استاذ محترم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم شرح مسلم میں اسی قول کی ترجیح کے لیے ایک ایسی چیز کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس پر نظر کرنے کے بعد اس قول کی ترجیح واضح ہو جاتی ہے، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ مشرق ومغرب کے فاصلے چند گھنٹوں میں طے ہو رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ قرآن وسنت میں یہ بات منصوص وقطعی ہے کہ کوئی مہینہ انتیس

دن سے کم اور تیس دن سے زائد نہیں ہوتا، بلادِ بعیدہ اور مشرق ومغرب کے فاصلوں میں اگر اختلافِ مطالع نظر انداز کر دیا جائے تو اس نص قطعی کے خلاف یہ لازم آئے گا کہ کسی شہر میں اٹھائیس کو بعید ملک میں اس کی شہادت پہنچ جائے کہ آج وہاں چاند دیکھ لیا گیا ہے تو اگر اس شہر کو دوسرے کے تابع کیا جائے تو اس کا مہینہ اٹھائیس کا رہ جائے گا، جو شریعت کے مقرر کردہ حساب سے کم یا زیادہ بن جاتا ہے جو صحیح نہیں، حضرت علامہ عثمانیؒ کی اس تحقیق سے اس کا بھی فیصلہ ہو گیا کہ بلادِ قریبہ اور بلادِ بعیدہ میں قرب وبعد کا معیار کیا اور کتنی مسافت ہوگی؟ وہ یہ ہے کہ جن بلاد میں اتنا فاصلہ ہو کہ ایک جگہ کی رؤیت کا دوسری جگہ اعتبار کرنے کے نتیجے میں مہینہ کے دن اٹھائیس رہ جائیں یا اکتیس ہو جائیں، وہاں اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا جائے گا، اور جہاں اتنا فاصلہ نہ ہو وہاں نظر انداز کر دیا جائے۔ (ملخص از رویتِ ہلال: ص ۵۸۔۵۹، دار المعارف، کراچی).

مفتی عبد المنعم صاحب فرماتے ہیں:

اکابر علماء دیوبند میں سے مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا یوسف بنوریؒ، وغیرہ اختلافِ مطالع کو معتبر مانتے ہیں، اور مفتی محمد فرید صاحب بھی اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ (اعدل الاقوال فی مسئلۃ الھلال: ص ۲۷).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: جدید فقہی مسائل: ۲/ ۲۷۔۳۴، نعیمیہ۔ ومنہاج السنن: ۴/ ۱۳۔۱۵۔ ورویت ہلال: ۵۸۔۵۹۔ وفتاوی بینات: ۳/ ۵۸۔۶۳۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ثبوتِ ہلال میں مختلف جماعتیں بن جانے پر عید کا حکم:

سوال: البانیا میں شوال کے چاند کے بارے میں مسلمانوں کی مختلف جماعتیں بن گئی جو حسب ذیل ہیں:

(۱) ایک جماعت نے سعودیہ کی اتباع کی اور روزہ نہیں رکھا نہ تراویح پڑھی بلکہ دوسرے دن عید منائی۔

(۲) ایک جماعت نے برطانیہ والوں کی اتباع کی اور سعودیہ کے ایک دن بعد عید منائی لیکن نہ برطانیہ میں کسی نے چاند دیکھا اور نہ البانیا میں اور دونوں ملکوں میں صرف ایک گھنٹہ کا فرق ہے۔

(۳) تیسری جماعت نے ۳۰ روزے مکمل کیے اس وجہ سے کہ البانیا میں چاند نظر نہیں آیا لہٰذا ان لوگوں نے پہلی جماعت کے دو دن بعد عید منائی اور دوسری جماعت کے ایک دن بعد۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان جماعتوں میں سے کس کی عید صحیح ہے قواعدِ شرعیہ کے مطابق؟

الجواب: پہلی جماعت کی عید شرعی، عرفی، اور حسابی سب اعتبار سے غلط ہوئی۔

دوسری جماعت نے چاند نہیں دیکھا نہ اپنے شہر میں اور نہ یورپ میں پس اگر ان کو ایسیا یا قریبی شہروں سے چاند کی صحیح خبر پہنچی اور عید منائی تو صحیح ہے ورنہ رؤیت کی خبر صحیح کے بغیر برطانیہ کی اقتداء کی تو عید صحیح نہیں ہوئی۔

تیسری جماعت کی عید بھی صحیح ہے، اس وجہ سے کہ صحیح خبر ان کو نہیں پہنچی یا پہنچی تو انھوں نے اعتماد نہیں کیا صحیح طریقہ پر نہ پہنچنے کی وجہ سے یا انھوں نے بلادِ بعیدہ کی گواہی قبول نہیں کی، یا کسی اور وجہ سے قبول نہیں کی بہر حال ان کا عمل صحیح ہے۔

ملاحظہ حدیث شریف میں ہے:

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن غم عليكم فعدوا ثلاثين ثم أفطروا''. (رواه الترمذي: ١٤٧/١، باب ماجاء لاتتقدموا الشهر بصوم).

الفقہ الحنفی وادلتہ میں ہے:

إذا كان بين القطرين قريب بحيث تتحد المطالع فلا يعتبر ، وإن كانت بعيدة بحيث تختلف المطالع فيعتبر فلو صام أهل قطر ثلاثين يوماً برؤية، وأهل قطر آخر تسعة وعشرين يوماً برؤية ، فعليهم قضاء يوم إن كان بين القطرين قرب بحيث تتحد المطالع ، وإن كانت بعيدة بحيث تختلف، لا يلزم أحد القطرين حكم الآخر، فالقرب مثل سورية، والعراق، والبعد مثل الكويت والمغرب، وجاء عن ابن عباس وعائشة رضي الله عنهما صوم كل جماعة يوم يصومون ، وفطرهم يوم يفطرون. (الفقه الحنفي وأدلته: ٣٨٩/١، قبول خبر الواحد في روية هلال رمضان، دمشق).

مزید دلائل مسئلہ ''اختلافِ مطالع کا حکم'' کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اختلافِ مطالع کے بارے میں چند سوالات:

سوال: کیا فرماتے ہیں بزرگانِ دین ومفتیانِ شرحِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

آج کل رؤیتِ ہلال کے بارے میں بہت چرچہ ہو رہا ہے اور لوگ طرح طرح کی چہ می گوئیاں کر رہے ہیں، اس کی اصل کیا ہے، برائے مہربانی جواب عنایت فرمائیں اور اجر عظیم کے مستحق ہوں۔

(۱) اگر ایک شہر والوں نے چاند دیکھا تو کتنے شہر والوں پر ان کی اطاعت کرنا ضروری ہوگا؟ اور رقبۂ رویتِ ہلال

کیا ہے؟ اور مطلع کا اعتبار کتنے کیلو میٹر تک کیا جائے گا؟
(۲) اس ملک میں پڑوسی ممالک میں سے کن کن ممالک کی رؤیت کا اعتبار ہوگا؟ اور جوہانسبرگ، کیپ ٹاؤن کا مطلع ایک ہے یا الگ الگ؟
(۳) ہم مدینہ منورہ کی رؤیت کا اعتبار کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

الجواب: مذہبِ احناف میں ظاہر الروایت کے مطابق مشرق کی گواہی مغرب کے لیے کافی ہے جب صحیح طریقہ سے پہونچے یا شہرت واستفادہ کی تعریف میں داخل ہو، جو حضرات اختلافِ مطالع میں کیلو میٹر کا حساب کرتے ہیں ان کے اقوال میں تضاد ہونے کے علاوہ وہ قاعدہ کلیہ کے ذیل میں نہیں آتا، بلکہ اکثر تخمینہ پر مبنی ہے، لیکن محققین علماء بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کا اعتبار کرتے ہیں، جس کی تفصیل گزر چکی۔
(۲) اس ملک میں اگر واقعی چاند دیکھا گیا، اور احناف کے مذہب کے مطابق اس میں سقم اور خرابی نہیں تو اس کو قبول کر لینا چاہئے، نیز پڑوسی ممالک کی شہادت بھی قبول کی جائے گی۔
(۳) سعودی عرب کی شہادت قبول نہ کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی شہادت اکثر خلافِ ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ چاند مشرق ومغرب دونوں طرف ایک دن میں دیکھا جاتا ہے، جب کہ قدیم وجدید اہل ہیئت کے نزدیک یہ نہیں ہوسکتا، نیز اور کسی جگہ رؤیت نہیں ہوتی، بلکہ بہت سی مرتبہ رؤیت کے دوسرے دن آسمان صاف ہونے کے باوجود چاند کی عام بلکہ کبھی کبھی خاص رؤیت نہیں ہوتی، نیز کبھی چاند ۵/۶ گھنٹے کا ہوتا ہے اور رؤیت کا دعویٰ ہوتا ہے، بلکہ کبھی پیدائش سے بھی پہلے رؤیت کا دعویٰ ہوتا ہے، لہذا خلافِ ظاہر شہادت کو کیسے قبول کیا جائے؟
دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں فقہ حنبلی کی روشنی میں رمضان کے لیے ایک آدمی کی شہادت اور عید وغیرہ کے لیے دو ثقہ آدمیوں کی شہادت کافی ہے، جب کہ احناف کے نزدیک آسمان صاف ہونے کی صورت میں جمع عظیم درکار ہے، لیکن اس کے باوجود اس اختلاف سے بچنا تو آسان ہے کیونکہ جب حنبلی قاضی اس کو قبول کر کے فیصلہ کر لے تو احناف اس کو تسلیم کر سکتے ہیں، لیکن خلافِ ظاہر شہادت کو قبول کرنا بہت مشکل ہے، نیز ان کی شہادت کی تفصیلات کا علم بھی اکثر لوگوں کو نہیں ہوتا بلکہ وہاں شخصی حکومت کی وجہ سے ان چیزوں کی تفصیلات تک پہونچنا بھی دشوار بلکہ ناممکن سا ہے، یہ نہ سمجھا جائے کہ سعودی کی رؤیت ہمیشہ غلط ہوتی ہے، بہر حال علماء کے ہاں زیادہ قابل اعتماد نہیں، نیز محققین علماء حضرات بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کے قائل ہیں ان کے نزدیک دیگر وجوہات کی بنا پر ان کی اتباع نہیں کی جاتی۔

ان سوالات کے جوابات مرحمت فرمانے کے بعد چونکہ اس ملک میں انتشار اور افتراق کا اندیشہ تھا اور جدت

پسند لوگوں کی طرف سے کچھ ایسی ہوائیں چل رہی تھیں کہ رمضان وعید وغیرہ میں سعودی کی اتباع کرنا چاہیے، جب کہ یہاں کی تینوں جمعیتیں (کیپ ٹاؤن، نٹال، اور ٹرانزوال) برابر خدمت میں مصروف تھیں، اور رؤیت ہلال کا متفقہ فیصلہ صادر کر رہی تھیں، لہذا اس خلجان اور انتشار کے دفعیہ کے لیے حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے فقہاء کے اقوال وعبارات کا جامع اور مستحکم ایک مقالہ تحریر فرمایا جس کو سپرد قرطاس کیا جاتا ہے۔

《لمعات الأدلة في اختلاف الأهلة》

بسم الله الرحمٰن الرحيم

الحمد لله الذي جعل الأهلة مواقيت للناس والحج ، وإيفاء المواعيد، وقدر في عقبها الابتهاج بالفرح والعيد، نحمده على ما أولانا الدين الأبيض النقي الصافي الحميد، ونقى أرواحنا وأجسادنا بحلية العبادة والتوحيد ، ثم نشكره على ما أنشأ فينا العلماء الكبار الذين نشروا ألوية العلم ، وحاربوا الشيطان اللعين المريد.

والصلاة والسلام على أفضل الرسل وخاتم الأنبياء السيد الرؤف الرحيم، الفرد الفريد، الذي أخرجنا من ورطة المهالک ، وظلمات الوهم إلى أنوار الشرع السديد، وعلى آله وأصحابه الذين هم نجوم الهداية، وكواكب الكرامة، كل منهم كالدر النضيد، عن المعائب والنقائص بعيد ، وعلى الأئمة المجتهدين، والفقهاء الذين بذلوا جهدهم في استنباط المسائل في العهد القديم والجديد، لاسيما على أبي حنيفة ومالک والشافعي وأحمد رحمهم الله تعالىٰ ، فهؤلاء أئمتنا وهم أولىٰ بالإمامة، ونحن أحق بالتقليد. أما بعد :

فقد سرني أن توجهت علماء الكبار والمشايخ العظام من إفريقيا الجنوبية إلى حل المعضلة التي تكاد أن تفرق عصا المسلمين في هذه المنطقة، المنبتة للذهب والدر، وتشتت شملهم، وتفرق جمعهم، وقد بذلوا جهدهم في هذا الصدد ، وكيف لا ، وقد رزقهم الله علماً وفهماً وصلاحاً وتقوى لا عصبية فيهم ولاعناد، فأشكر الجمعيات الثلاث، جمعية كيب تاؤن ، ونتال ، وترانسوال ، باحتفالهم في هذه الحفلة المباركة لتحقيق مسئلة رؤية الهلال وتوجيه عنان أفكارهم إلى تسديد أمور المسلمين وإصلاح أحوالهم، ولقد فرحت فرح الصبيان بالعيد، بأن رأيت بعينيّ وأبصرت بكريمتيّ ، خضوع العوام للعلماء ههنا والإجابة لقولهم ودعوتهم، والرضاء بحكمهم وقضاء هم، فمن كرم الله تعالىٰ ومنّه أن

وضع زمام أمور العوام ههنا في أيدي العلماء، فيجب الشكرعلى هذه النعمة الكبرىٰ، فنسأل الله تعالىٰ أن يوفق علماء هذه المنطقة للأ قضية الصحيحة. اللّٰهمّ اجعلهم نجوماً لامعةً، وأقماراً بازغةً، وشموساً ساطعةً، وبارک في مساعيهم الجميلة.

وقبل أن أبدأ بالمقصود، أريد أن أنبه على أن الا تحاد والا تفاق بين مسلمي مملكة ودولة واحدة ، ورفع النزاع والخصومة فيما بينهم ، من أهم الأمور، فينبغي للعلماء النحارير، وأرباب القلوب الصافية، أن لا ينشئوا الاختلاف الجديد، ويعملوا على الطريقة القديمة، والسنة الجارية إلى الآن، وهي اعتبار رؤية بلاد هذه المنطقة ، دون التعويل على البلاد النائية البعيدة ، والآن أبدأ فيما أقصد ، وعلى اللّٰه التوفيق ، ومنه الاستعانة.

وأقسم المطلوب في ثلاث لمعات:ــ

اللمعة الأولىٰ : ـــ في أقوال السادات الشافعية في اختلاف المطالع ، فقد صرح أساطين المذهب الشافعي وكباره بأن الصحيح عندهم أن اختلاف المطالع معتبر في أحكام الصوم والفطر وسائر الأحكام، قال الإمام النووي الشافعيؒ ذلک الحبر الكبير والعالم النحريرالذي له منة على رقاب الشوافع في شرح المسلم ، ما نصه :

" الصحيح عند أصحابنا أن الرؤية لا تعم الناس بل تختص بمن قرب على مسافة لا تقصر فيها الصلاة وقيل إن اتفق المطلع لزمهم وقيل إن اتفق الإقليم وإلا ، فلا ".(شرح النووی للصحیح المسلم : ۱/۳٤۸، باب بیان ان لکل بلد رؤیتهم).

هذه العبارة تنادي بأعلىٰ صوت بأن الصحيح عند الشافعية أن الرؤية لاتعم الناس بل تلزم رؤية أهل بلدة على بلدة بعيدة وما يقابل الصحيح يكون خطأً فعلم أن رواية أبي الطيب من الشوافع من عدم اعتبار اختلاف المطالع لايعبأ بها ولا يعتد.

وقال حافظ الدنيا محمد علي ابن حجر الشافعي العسقلانيؒ إمام دراية الحديث وروايته في كتابه الشهير بـ " فتح الباري في شرح الصحيح البخاري" ما لفظه :

" وقد اختلف العلماء في ذلک على مذاهب، أحدها لأهل كل بلد رؤيتهم وفي صحيح مسلم من حديث ابن عباس رضي اللّٰه تعالىٰ عنه ما يشهد له وحكاه ابن المنذر عن عكرمة والقاسم وسالم وإسحق وحكاه الترمذيؒ عن أهل العلم ولم يحک سواه وحكاه الماوردي

وجهاً للشافعية ، ثانيها : مقابله إذا رؤي ببلدة لزم أهل البلاد كلها وهو المشهور عند المالكية لكن حكى ابن عبد البر الإجماع على خلافه وقال: أجمع على أنه لا تراعىٰ الرؤية فيما بعد من البلاد كخراسان والأندلس ... و بعد هذه السطور ... وقال بعض الشافعية: إن تقاربت البلاد كان الحكم واحداً وإن تباعدت فوجهان لايجب عند الأكثر. (فتح الباري:١٢٣/٤، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم "إذا رأيتم الهلال فصوموا")

يفيد هذا الكلام المذهب أمرين : الأوّل : أن اعتبار اختلاف المطالع مذهب أكثر الشافعية . والثاني : أن اختلاف العلماء فيما لم تبعد البلدتان بعداً كبيراً فإن بعدتا بعداً كثيراً كخراسان و الأندلس فقد حكىٰ فيه ابن عبد البرّ الإجماع على اعتبار اختلاف المطالع ، ورؤية كل بلدة لأهلها ولاريب أن البعد والمسافة فيما بين إفريقيا الجنوبية والسعودية أكثر مما بين خراسان (وهي من بلاد إيران) والأندلس (وهي الآن تسمىٰ إسپين) فكيف ينبغي في ضوء ماحكينا عن ابن حجرؒ اتفاق الأعياد فيما بيننا وبين العربية السعودية.

وقال ابن عابدين الشامي الحنفيؒ في رسالة مفردة له في هذا الموضوع: وما اختاره من اعتبار اختلاف المطالع هو المعتمد عند الشافعية على ماصححه الإمام النوويؒ في المنهاج عملاً بالحديث المذكور. (رسائل ابن عابدين:٢٥١/١،الرسالة التاسعة، سهيل).

واعتبار اختلاف المطالع مذكور في أكثر كتب الشافعية كالمبسوط:(ص٣٠٥، حيدرآباد).

اللمعة الثانية :ــ في غرر النقول عن السادات الحنفية حفظهم اللّٰه ورعاهم أكثر علماء الأحناف لا يعتبرون اختلاف المطالع، ولكن كثير منهم يعتبرونه ويعدونه أشبه بحسب الدليل ويحسبونه أبين برهاناً وحجةً . وقد مضىٰ أن ابن عبد البر ينادي بأعلىٰ صوت أن البلدتين البعيدتين اللتين بينهما بعدكبيريعتبرفيهما اختلاف المطالع بالإجماع.

وقال الإمام علاء الدين أبوبكر بن مسعود الكاسانيؒ الحنفي في" بدائع الصنائع": هذا إذا كانت المسافة بين البلدتين قريبة لا تختلف فيها المطالع فأما إذا كانت بعيدة فلا يلزم أحد البلدتين حكم الآخر لأن مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فيعتبر أهل كل بلد مطالع بلدهم دون الآخر.(بدائع الصنائع:٨٣/٢،سعيد).

وفي فتاوى دار العلوم ديوبندحكاية عن التاتارخانية: أهل بلدة إذا رأوا الهلال هل يلزم في حق كل بلدة اختلفوا فيه فبعضهم قالوا: لا يلزم فإنما المعتبر في حق أهل بلدة رؤيتهم وفي الخانية لاعبرة باختلاف المطالع قال القدوريؒ: إذا كان بين البلدتين (بعد) لا يختلف به المطالع يلزم وذكر الحلوانيؒ: أنه الصحيح من مذهب أصحابنا. (فتاوی دارالعلوم دیوبند:٦/٣٦٣،مدلل ومکمل).

وحكى فيه أيضاً عن مختار النوازل : أهل بلدة صاموا تسعة وعشرين يوماً بالرؤية وأهل بلدة أخرىٰ صاموا ثلا ثين بالرؤية ، فعلى الأوّل قضاء يوم إذا لم يختلف المطالع بينهما أما إذا اختلف لا يجب القضاء.(فتاوی دارالعلوم:٦/٣٦٣،مدلل ومکمل).

وقال الملا علي القاري الحنفيؒ في شرح النقاية : والأشبه من حيث الدليل هو الاعتبار باختلافها كما في دخول وقت الصلاة لأن السبب شهود الشهر فإذا انعقدت الرؤية في حق قوم لا يلزم أن ينعقد في حق غيرهم مع اختلاف المطالع كما لو زالت الشمس أو غربت على قوم دون آخرين يجب الظهر أو المغرب على الأولين دون أولٰئک لعدم انعقاد السبب في حقهم واختار صاحب التجريد وغيره من المشايخ اعتبار اختلاف المطالع كما روى الجماعة إلا البخاريؒ من حديث كريب رضي الله عنه أن أم الفضل بعثته إلى معاوية بالشام قال: قدمت الشام وقضيت حاجتها واستهل عليها رمضان وأناْ بالشام فرأيت الهلال ليلة الجمعة ثم قدمت المدينة في آخر الشهر فسألني ابن عباس رضي الله عنهما قال: متىٰ رأيتم الهلال قلت: ليلة الجمعة فقال: أنت رأيته قلت: نعم ، ورآه الناس فصاموا وصام معاوية رضي الله عنه فقال: لكن رأينا ليلة السبت فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلا ثين أو نراه أي الهلال فقلت : أوَ لا تكتفي برؤية معاوية وصيامه فقال: لا هكذا أمرنا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم.

(شرح النقاية:١/٤١٢،کتاب الصوم، سعید).

وفي تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق للمحدث الزيلعيؒ: والأشبه أن يعتبر(اختلاف المطالع) لأن كل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار كما أن دخول الوقت وخروجه يختلف باختلاف الأقطار حتى إذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم منه أن تزول في المغرب وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس

بل كلما تحركت الشمس درجة فتلك طلوع فجر قوم وطلوع شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم. روي أن أباموسى الضرير الفقيه صاحب المختصر قدم الأسكندرية فسئل عمن صعد على منارة الأسكندرية فيرى الشمس بزمان طويل بعد ما غربت عندهم في البلد أيحل له أن يفطر فقال: لا يحل لأهل البلد لأن كلاً مخاطب بما عنده والدليل على اعتبار اختلاف المطالع ماروي عن كريب ﷺ الخ. (تبيين الحقائق: ۳۲۱/۱)

وقد حقق هيئة كبار علماء المملكة العربية السعودية حفظهم الله ورعاهم فقالوا: وقد مضىٰ علىٰ ظهور هذا الدين مدة أربعة عشر قرناً لانعلم منها فترة جرى فيها توحيد الأمة الإسلامية على رؤية واحدة فإن أعضاء الهيئة يرون بقاء الأمر على ما كان عليه وعدم إثارة هذا الموضوع وأن يكون لكل دولة إسلامية حق اختيار ما تراه بواسطة علماء ها من الرائين المشار إليها في المسألة إذ لكل منها أدلة ومستنداته نقلاً عن تحرير هيئة العلماء الكبار للسعودية .

ونوافق أصحاب الفتوىٰ هذه بأن لا تثار هذه القضية ههنا ويبقى الأمر على ماكان في السنوات الماضية من اعتماد هذه الدولة برؤيتها دون الاستشراف إلى دول بعيدة أخرى.

اللمعة الثالثة :ـــ قد تحقق مما مضى أن الشافعية بأسرهم، وجمعاً كبيراً من الحنفية يعتبرون اختلاف المطالع، لكن قد يخطر ببال بعض العلماء أن بعض الشوافع وكثيراً من الحنفية لا يعتبرون اختلاف المطالع فلم لا يفتىٰ بقولهم ولم لا يعتبر العيد واحداً موافقاً بالسعودية ؟ ولم لا يقبل الا تحاد بالمركز الإسلامي؟

فالتحقيق في هذا الصدد عند الفقير تراب أقدام العلماء أن الأحناف الذين لا يعتمدون على اختلاف المطالع يشترطون لتوحيد العيد وتوفيقه وإجراء ه في جميع البلاد أحد شروط ثلا ثة لا توجد فيما نحن فيه عند الأحناف وهي هذه : إما أن يتحمل إثنان الشهادة أويشهدا على حكم القاضي أو يستفيض الخبر والظاهر أن هذه الشرائط لا توجد في أكثر المواضع إما عدم وجود الشرطين الأولين أعني تحمل الشهادة أو الشهادة على حكم القاضي فانتفاء ه ظاهر إذ لا يشهد على شهادة الشاهدين شاهدان ههنا و لا يشهد الشهود ههنا على حكم القاضي السعودي واستفاضة الخبر أيضاً مشكوكة إذ لا يستفيض الخبر

من السعودية في مواقع كثيرة ولو سلمنا استفاضة الخبر و شهرته في بعض المواقع فلا نظن أن قضاة السعودية يراعون المذهب الأخر، فإن مذهب الأحناف أن الشهود يجب أن يكونوا عدولاً وأن المطلع إن كان صافياً والسماء مصحية والأفق مضيئاً فيشترط الجمع العظيم الذي يحصل اليقين بخبرهم .

قال القاريؒ في شرح النقاية بعد ما أوضح: أن العدل الواحد قناً كان أو حراً يكفي في الصوم إذا كانت السماء متغيمة وشرط مع غيم للفطر نصاب الشهادة وهو رجلان أو رجل وامرأتان ثم قال : وبلا غيم ونحوه شرط جمع عظيم أي في الصوم والفطر لأن انفراد الجمع القليل بالرؤية يوجب ظن غلطهم فيوجب التوقف فيه حتى يكون جمعاً كثيراً .

(شرح النقاية:۱/۱ ۱ ٤، كتاب الصوم، سعيد).

ثم قال والجمع العظيم قيل أهل محله ، وعن أبي يوسفؒ خمسون رجلاً كالقسامة ، وعن محمدؒ أنه قدر ما يحصل للإمام العلم بخبرهم. (شرح النقاية:۱/۱ ۱ ٤، كتاب الصوم، سعيد).

لكن شاهد كثير من الناس هناك أن المطلع كان صافياً والسماء مصحية وأذيع الخبر بالراديو ولم يرى الهلال الجمع العظيم.

وأما أمر الحج وسائر العبادات للمقيمين هناك فيفعلونها تبعاً لمطلعهم وبلدهم ولذلك عباداتهم صحيحة .

وأخيراً لا آخراً أقول من غير لومة لائم: أن علماء إفريقيا الجنوبية ومشائخها أشجعاء مجترعون يصدعون بالحق، ولا يخافون بالله لومة لائم، لا يمنعهم، ولا يردعهم من إظهار الحق أية حكومة، و لا أية قوة ، عندهم قوة فصل الخصومات والأقضية، لا يخدعون ولا يخدعون، يميزون القطمير من النقير، والغث من السمين، قد صرفوا أعمارهم في خدمة الدين، لهم علم غزير، وفهم دقيق، وإلمام تام باللغات المختلفة، التقوىٰ دثارهم، والتدين شعارهم، يحيطون بجوانب المسائل وأطرافها، يعرفون شروط المسائل وآدابها، نداء الحق في سوداء قلوبهم، وصياح الباطل قذاء أعينهم، فكيف يريد بعضهم أن يعتمدوا على الدول البعيدة في مثل هذه المسألة المهمة، فهل يستخفون بآلاء الله تعالىٰ التي منحها إياهم ؟ وهل توجد هذه الصفات في غيرهم ؟ كلا ثم كلا.

فالمرجو من المشايخ العظام، وأرباب الفتوىٰ والقضاء، أن يمشوا على سنتهم القديمة ولا يلتفتوا إلى أي نداء مثل هذا النداء . وعلى اللّٰه التوفيق والاعتماد. واللّٰه تعالىٰ أعلم. وصلى اللّٰه تعالىٰ على خير خلقه محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.

كتبه (الشيخ المفتى) رضاء الحق عفا اللّٰه عنه

دار الإفتاء، دار العلوم زكريا، لينيشيا

إفريقيا الجنوبية.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
"إنما الأعمال بالنیات"
(رواہ البخاری)

باب ...... ﴿۲﴾

احکامِ نیت کا بیان

پہلے ہی دن پورے مہینے کے روزوں کی نیت کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے پورے مہینہ کے روزوں کی نیت پہلے دن کر لی تو ائمہ میں سے کسی کے نزدیک کافی ہوگی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک پہلے دن نیت کر لینا پورے مہینہ کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ روزانہ علیحدہ علیحدہ نیت کرنا ضروری ہے، ہاں امام مالکؒ کے نزدیک پہلے دن کی نیت پورے مہینہ کے لیے کافی ہے لہذا ہر دن علیحدہ نیت کرنا ضروری نہیں ہے اگر قاطعِ نیت کوئی چیز پیش آجائے تو تجدیدِ نیت ضروری ہے، ورنہ سحری قائم مقام نیت ہے اس میں خود بخود نیت ہو جاتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں بدائع الصنائع میں ہے:

ویشترط لکل یوم من رمضان نیة علی حدة عند عامة العلماء ، وقال مالکؒ: یجوز صوم جمیع الشهر بنیة واحدة وجه قوله إن الواجب صوم الشهر لقوله تعالیٰ: ﴿ فمن شهد منکم الشهر فلیصمه ﴾، والشهر اسم لزمان واحد، فکان الصوم من أوله إلی آخره عبادة واحدة، کالصلاة والحج فیتأدی بنیة واحدة، ولنا أن صوم کل یوم عبادة علی حدة غیر متعلقة بالیوم الآخر، بدلیل أن ما یفسد أحدهما لا یفسد الآخر، فیشترط لکل یوم منه نیة علی حدة. (بدائع الصنائع:۲/۸۵،سعید).

شرحِ مہذب میں ہے:

فرع في مذاهبهم في النية لكل يوم من كل صوم:۔ ومذهبنا أن كل يوم يفتقر إلى نية سواء نية صوم رمضان والقضاء والكفارة والنذر والتطوع، وبه قال أبوحنيفةؒ،وإسحق بن راهويهؒ، وداودؒ، وابن المنذرؒ،والجمهور، وقال مالكؒ: إذا نوى في أول ليله من رمضان صوم جميعه، كفاه لجميعه، ولا يحتاج إلى النية لكل يوم، وعن أحمدؒ وإسحقؒ روايتان، أصحهما كمذهبنا، والثانية كمالكؒ، واحتج لمالكؒ بأنه عبادة واحدة، فكفته نية واحدة، كالحج وركعات الصلاة، واحتج أصحابنا بأن كل يوم عبادة مستقلة لا يرتبط بعضه ببعض ولا يفسد بفساد بعض، بخلاف الحج وركعات الصلاة. (شرح المهذب للامام النوويؒ: ۳۰۲/۶، دار الفكر۔والفقه الاسلامی وادلته: ۶۲۴/۲،دار الفکر)۔

الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے:

الشافعية قالوا: أركان الصيام ثلاثة: ۔منها النية إلى قوله...ويجب تجديدها بكل يوم صامه. الحنفية، قالوا :...وأما شروط صحة الأداء فاثنان...ثانيها النية ...ولا بد من النية لكل يوم من رمضان. (الفقه على مذاهب الاربعة: ۵۴۷/۱)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

رات میں بے ہوش ہوجانے سے روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص رمضان المبارک میں مغرب کے بعد بیہوش ہوگیا اور دوسرے دن شام کو ہوش میں آیا تو روزہ ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اس کا روزہ ہوگیا کیونکہ نیت کا وقت مغرب سے شروع ہوجاتا ہے، اور اس شخص کا ظاہری حال یہ ہی بتلا رہا ہے کہ اس نے آئندہ کل کے روزہ کی نیت کی ہوگی۔

ملاحظہ فرمائیں حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

ويشترط لصحة أدائه ثلاثة شرائط: النية في وقتها لكل يوم ...الوقت بالنسبة لأداء رمضان بعد الغروب إلى قبيل الضحوة، ففي أي جزء منه وجدت صح...فإن الجنون إذا طرأ بعد النية وبقي إلى الغروب صح صومه. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح:ص۶۳۶،کتاب الصوم، قدیمی)۔

درمختار میں ہے:

ومن جن أو أغمي عليه بعد النية (أي صح صومهما) وإنما لم يصح صومهما في اليوم الثاني لعدم النية. وفي الطحطاوي: قوله بعد النية أي بعد ما نواه في محل النية. (الدرالمختار مع حاشية الطحطاوی:۱/۴۴۰،کوئته).

مزید ملاحظہ فرمائیں: الفتاوی الهندية:۱/۱۹۵۔وبدائع الصنائع:۲/۸۳،سعید)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

دن میں بے ہوش ہوجانے سے روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے روزہ رکھا بعد میں بے ہوش ہوگیا کچھ کھایا پیا نہیں، کیا اس کا روزہ باقی رہا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور کا روزہ ادا ہوگیا، اس لیے کہ بے ہوشی نواقض صوم میں سے نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

من أغمي عليه في رمضان لم يقض اليوم الذي حدث فيه الإغماء لوجود الصوم فيه وهو الإمساك المقرون بالنية. (الهداية:۱/۲۲۳۔وكذا فی البحر الرائق:۲/۲۹۰،کوئته۔وحاشية الطحطاوی على الدر:۱/۴۶۸،کوئته۔والجوهرة النيرة:۱/۱۷۷).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

ويشترط لصحة أدائه ثلاثة شرائط: النية في وقتها لكل يوم ...الوقت بالنسبة لأداء رمضان بعد الغروب إلى قبيل الضحوة، ففي أي جزء منه وجدت صح...فإن الجنون إذا طرأ بعد النية وبقي إلى الغروب صح صومه. (حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح:ص۶۳۶،کتاب الصوم، قدیمی)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

روپے کی نیت سے روزہ رکھنے سے سقوطِ فرض کا حکم:

سوال: ایک شخص تارکِ صوم ہے ایک متقی آدمی نے اس کے ساتھ وعدہ کیا کہ آپ روزہ رکھیں میں آپ کو فی روزہ ۵۰ رینڈ ادا کروں گا اس نے روزہ رکھا، اب روزہ دار رینڈ کا مطالبہ کررہا ہے اور متقی آدمی کہتا ہے کہ میں نے تو صرف ترغیب کے لیے کہا تھا کون حق پر ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں روزہ دار کو روزوں کا ثواب مل جائے گا اور ذمہ فارغ ہو جائے گا لیکن ریئڈ کا مستحق نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

قيل لشخص صل الظهر ولك دينار، فصلىٰ بهذه النية ، ينبغي أن تجزئه ولا يستحق الدينار . وفي الشامية : قال في الأشباه : وهذه المسئلة ليست منصوصة في مذهبنا وصرح به النووي، وقواعدنا لا تأباه . (الدر المختار مع الشامی:۱/۴۳۸، سعید۔ومثله فی الفتاوی اللكنوی:ص۲۳۹، فی باب النية)۔**واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال:
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:
﴿من أفطر يوماً من رمضان من غير رخصة ولا مرض
لم يقض عنه صوم الدهر كله وإن صامه﴾

(رواه الترمذی)

باب......﴿۳﴾

ما يفسد الصوم وما لا يفسد

باب ......﴿۳﴾

روزہ کے مفسدات ومکروہات کا بیان

روزہ میں ویکس (vicks) کے استعمال کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے روزہ کی حالت میں ویکس (vicks) استعمال کی تو روزہ ٹوٹا یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں چونکہ ویکس کا اثر دماغ پر پہنچتا ہے اصل چیز نہیں پہنچتی لہذا روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ مثلاً روزہ کی حالت میں سرمہ لگانے سے حلق میں اثر ظاہر ہوتا ہے اسی طرح سر میں تیل ڈالنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے پھر بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، فسادِ روزہ کے لیے اصل شیٔ کا دخول ضروری ہے، مثلاً دھواں وغیرہ زبردستی حلق میں داخل کردے تو روزہ فاسد ہو جائے گا کیونکہ عینِ دھواں داخل ہوا۔

ملاحظہ فرمائیں طحطاوی میں ہے:

ومفاده أنه لو دخل حلقه الدخان أفطر أي دخان كان ولو عوداً أو عنبراً لو ذاكراً لإمكان التحرز عنه، فليتنبه له ،كما بسطه الشرنبلالي، قوله إنه لو دخل حلقه الدخان، كان تبخر بخور فأشم دخانه وأدخله في حلقه ذاكراً لصومه فسد صومه، لإمكان التحرز، ولا يتوهم أنه كشم الورد ومائه والمسك، لوضوح الفرق بين هواء تطيب بريح المسك وشمه وبين جوهردخان وصل إلى جوفه بفعله، شرنبلالية. (حاشية الطحطاوي علي الدر المختار ١/ ٤٥٠،باب مايفسد الصوم ومالايفسده، كوئته).

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جوہرِ دخان سے روزہ فاسد ہوتا ہے نہ کہ صرف خوشبو سونگھنے سے اور ویکس بھی ایک خوشبو کی طرح ہے اس میں جوہر کا دخول نہیں پایا جاتا۔

مراقی الفلاح میں ہے:

اکتحل ولو وجد طعمه أي طعم الكحل في حلقه أو لونه في بزاقه أو نخامته في الأصح وهو قول الأكثر وسواء كان مطيباً أو غيره وتفيد مسئلة الاكتحال ودهن الشارب الآتية أنه لا يكره للصائم شم رائحة المسک والورد ونحوه، مما لا يكون جوهراً متصلاً كالدخان، فإنهم قالوا: لا يكره الاكتحال بحال، وهو شامل للمطيب وغيره، ولم يخصه بنوع منه، وكذا دهن الشارب، ولو وضع في عينيه لبناً أو دواء مع الدهن، فوجد طعمه في حلقه لا يفسد صومه إذ لا عبرة بما يكون من المسام.(مراقی الفلاح،ص:۲۳۸، باب مالا یفسد الصوم، بیروت).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولو اكتحل الصائم لم يفسده وإن وجد طعمه في حلقه...لأنه لا منفذ من العين إلى الجوف، ولا إلى الدماغ، وما وجد من طعمه فذلک أثره لاعينه.(بدائع الصنائع:۲/۹۳،سعید).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

سوال: روزہ کی حالت میں زنڈوبام یا اس طرح کی دوسری دوائیں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ جب کہ ایسی دواؤں کا اثر بظاہر دماغ تک پہنچتا ہے؟

جواب: روزہ اسی وقت ٹوٹتا ہے، جب کوئی چیز بعینہٖ فطری منفذ کے ذریعہ پیٹ یا دماغ تک پہنچے، اگر کوئی چیز مساماتِ بدن کے ذریعہ جسم میں داخل ہو تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا: وما يدخل فی مسامات البدن من الدهن لا يفطر. (الفتاوی الہندیۃ:۱/۲۰۳).

نیز اگر اصل شئ کے بجائے صرف اس کا اثر جسم کے اندر پہنچے تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، بام وغیرہ لگانے سے جسم کے اندر صرف اس کا اثر پہنچتا ہے، نہ کہ اصلی شئ، نیز وہ بھی جسم کے مسامات کے ذریعہ اندر جاتا ہے، اس لیے اس کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔(کتاب الفتاوی:۳/۳۹۴،زمزم)۔واللہ ﷻ اعلم۔

کان میں تیل ڈالنے سے روزہ کا حکم:

سوال: بحالتِ روزہ کان میں تیل ڈالنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: روزہ کی حالت میں کان میں تیل یا دوا ڈالنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، لیکن پانی پہنچنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

(أقطر في أذنه...أفطر)...وأطلق في الإقطار في الأذن، فشمل الماء، وهو في الدهن بلاخلاف، وأما الماء فاختار في الهداية عدم الإفطار به، سواء دخل بنفسه أو أدخله، وصرح الولوالجي: بأنه لا يفسد صومه مطلقاً على المختار معللاً بأنه لم يوجد الفطر صورة ولا معنى، لأنه مما لا يتعلق به صلاح البدن بوصوله إلى الدماغ، وجعل السعوط كالإقطار في الأذن، وصححه في المحيط، وفي فتاوى قاضيخان: أنه إن خاض الماء فدخل أذنه لا يفسد، وإن صب الماء في أذنه، فالصحيح أنه يفسد، لأنه وصل إلى الجوف بفعله، ورجحه المحقق في فتح القدير. (البحر الرائق:۲/۲۷۸،باب مایفسد الصوم ومالایفسده،کوئٹہ وکذا فی الشامی:۲/۳۹۶،سعید).

ہدایہ میں ہے:

ومن احتقن أو استعط أو أقطر في أذنه أفطر، لقوله ﷺ: الفطر مما دخل، ولوجود معنى الفطر، وهو وصول ما فيه صلاح البدن إلى الجوف، ولا كفارة عليه، لانعدامه صورة، ولو أقطر في أذنيه الماء، أو دخلهما لايفسد صومه، لانعدام المعنى والصورة، بخلاف ما إذا أدخله الدهن. (الهداية:۱/۲۲۰، باب مایوجب القضاء الکفارة).

مزید ملاحظہ ہو: الفتاوی الهندية :۱/۲۰۴، وحاشية الطحطاوي على مراقی الفلاح:۶۷۲، قدیمی، و امداد الفتاوی: ۲/۱۲۸، وفتاوی رحیمیه: ۲/۷۱، وایضاح المسائل :۸۴۔واللہ ﷻ اعلم۔

مسئلہ مذکورہ بالا پر مزید تحقیق:

سوال: بعض علماء کان میں تیل یا دواڈالنے کو مفسد صوم قرار نہیں دیتے، ان کی تحقیق کا خلاصہ کیا ہے؟

الجواب: جو حضرات کان میں تیل یا دواڈالنے کو مفسد صوم قرار نہیں دیتے وہ یہ کہتے ہیں کہ اطباء کی تحقیق سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ کان اور دماغ یا معدہ کے درمیان کوئی منفذ نہیں ہے اس لیے کان میں تیل یا دواڈالی جائے تو دماغ یا معدہ میں پہنچنے کا امکان نہیں ہے۔

چنانچہ امداد الفتاویٰ میں ایک سائل کی گفتگو درج ہے، جو براہِ راست ڈاکٹر سے ہوئی تھی۔

ملاحظہ فرمائیں:

وہ (اخی المکرّم جناب ڈاکٹر صاحب) یہ بھی فرماتے ہیں کہ کان میں تیل یا دوا ڈالی جائے تو اس کے معدہ میں کسی طرح پہنچنے کا امکان نہیں اس لیے کہ یہ ظاہری سوراخ ایک جلد پر جسے پردہ کہا جاتا ہے ختم ہو جاتا ہے، اور وہ جلد اس طرح کان میں لگی ہوئی ہے کہ جس سے وہ مثل ایک صندوق کے ہے جس کا راستہ صرف بیرونی سوراخ ہے، سوائے اس کے کہ کسی شخص کے کسی خاص مرض کی وجہ سے پردہ میں سوراخ ہوں۔ (امداد الفتاوی:۲/۱۴۷، دارالعلوم کراچی)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب فرماتے ہیں:

دراصل اس مسئلہ کا تعلق طب اور میڈیکل سائنس سے ہے مختلف ڈاکٹروں سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ کان اور دماغ یا معدہ کے درمیان کوئی منفذ نہیں ہے بلکہ کان کے سرے پر ایک پردہ موجود ہے جو اس راستہ کو بند کرتا ہے، اس کے برخلاف آنکھ کا حلق کی طرف منفذ موجود ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ کان میں جو دوائیں ڈالی جاتی ہیں آدمی اس کا مزہ محسوس نہیں کرتا اور آنکھ کی دواؤں کا ذائقہ فوراً حلق میں محسوس ہوتا ہے، اس لیے آنکھ میں سیال دواؤں کا ڈالنا مفسد صوم ہونا چاہئے اور کان میں ڈالی جانے والی دواؤں کو بھی ازراہِ احتیاط ناقض صوم مانا جائیگا۔ (جدید فقہی مسائل:۱/۱۸۵، نعیمیہ)۔(یاد رہے کہ آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا یہ مسئلہ آگے آنے والا ہے)۔

کتب فقہیہ کی عبارات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو چیزوں کی وجہ سے روزہ ٹوٹتا ہے (۱) صب یعنی ڈالنا (۲) وصول یعنی پہنچنا۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ من المخارق الأصلية كالأنف أو الأذن و الدبر، بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومه أما إذا وصل إلى الجوف فلا شك فيه لوجود الأكل من حيث الصورة، وكذا إذا وصل إلى الدماغ، لأن له منفذاً إلى الجوف فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف. (بدائع الصنائع:۲/۹۳، سعید)۔

مبسوط میں ہے:

وأكثر مشايخنا رحمهم الله تعالىٰ على أن العبرة للوصول حتى إذا علم أن الدواء اليابس وصل إلى جوفه فسد صومه، وإن علم أن الرطب لم يصل إلى جوفه، لايفسد صومه عنده، إلا ذكر اليابس والرطب بناءً على العادة. (المبسوط للامام السرخسیؒ: ۳/۶۸)۔

نیز ملاحظہ ہو: البحر الرائق: ۲/۲۷۸، کوئٹہ۔ والدر المختار مع الشامی: ۲/۴۰۲، سعید).
مفتی رفیع صاحب "المقالات الفقهيه" میں فرماتے ہیں:

ههنا ثلاثه أصول اتفقت عليها المذاهب الأربعة ونحتاج إليها في مناقشة عدة من المنافذ التي لها تعلق بالطب وتشريح الأبدان وهي كما تلي :

الأصل الأول : اتفقت المذاهب الأربعة على أن المفطر إنما يحصل إذا وصل الشيء المفطر إلى الجوف المعتبر من المنفذ المعتبر، ولا فطر إذا لم يصل إليه ولا إذا وصل إليه من منفذ غير معتبر.

الأصل الثاني: أن كل ثقبة أوفتحة في ظاهر الجسم ليس لها مسلك إلى الجوف المعتبرفي الصيام، لامباشرة، و لا بواسطة قناة أوجوف آخر، فهي منفذ غير معتبر في المذاهب الأربعة، سواء كانت الفتحة خلقية أو غيرخلقية، فلا يفسد الصوم عند أحد بما يدخل إلى باطن الجسم، بمثل هذا المنفذ، ولا أعلم فيه خلافاً ، وهو الموافق للقياس....

الأصل الثالث: أن الثقبات والفتحات التي توجد في ظاهر الجسم إلى باطنه، فمنها ما هي ظاهرة النفوذ إلى الجوف المعتبر كالفم والأنف والدبر، فلا يحتاج فيها إلى رأي الطب، ومنها ما هي نفوذها وعدم نفوذها إلى الجوف المعتبر خفاء، فالجزم فيها بأنها نافذة إليه أولا؟ ليس في الأصل من باب الفقه، لأنه من باب الطب وتشريح الأبدان كما صرح به غير واحد من الفقهاء كالسرخسيؒ في المبسوط، والمرغينانيؒ في الهداية، وابن الهمامؒ في فتح القدير، وابن نجيمؒ في البحر الرائق...فلا بد فيها من الاعتماد على أهل الطب وخبرائه....

فالمعتبر من المنافذ عند الإمام أبي حنيفةؒ وعامة المشايخؒ هي: الفم، والأنف، والأذن، والدبر، وفرج المرأة ، والآمة ، والجائفة ، والثقبة ، والثلاثة الأخيرة غيرمعتبرة عندهما ، و الإحليل معتبر عند أبي يوسفؒ خلافاً لهم .

النظر الطبي في مذهبهم :

لا إشكال في اعتبارهم الفم، والأنف، والدبر، والجائفة، والثقبة، لأن نفوذ كل منها إلى الجوف المعتبر ظاهر، وأما اعتبار الآمة عند أبي حنيفةؒ، وعامة المشايخؒ، وقبل المرأة عند المشايخؒ ، والأذن عند جميع الحنفية والإحليل عند أبي يوسفؒ، ففيه إشكال من حيث

الطب الحديث، فإنه ينكر نفوذها إلى الحلق أو المعدة أو الأمعاء....وأما الأذن: فلأن الدواء أو الماء أو الدهن ونحوها لاتصل بالإقطار فيها إلى الحلق إذاكانت طبلة الأذن سليمة غير مخروقة، لأن فتحة الأذن ليست بنافذة إلى الحلق لامباشرة ولا بواسطة قناة أوجوف آخر إلا إذا كانت الطبلة مخروقة. وإيضاحه: أن الأذن ثلاثة أقسام: (١) الأذن الخارجية (٢) الأذن الوسطى (٣) الأذن الداخلية. والطبلة حاجزة بين أذن الخارجية والوسطى، وهي (أي: الطبلة) غشاء مثل الجلد تماماً في تركيبها، وما يقطر في الأذن الخارجية لايصل إلى الأذن الوسطى إلابتشرب المسام إذا كانت الطبلة سليمة غير مخروقة فلا يصل إلى الحلق...

والأصول الثلاثة التي قدمناها في أول هذا الفصل عن المذاهب الأربعة تقتضي أن لاتعتبر هذه المنافذ الأربعة أيضاً عند الحنفية بالاتفاق. (المقالات الفقيهة:ضابط مفطرات الصوم فی المذاهب الاربعة:ص ۱۱۰_۱۱٤، ۱٤۳،الباب الثانی،مکتبہ دارالعلوم کراچی).

مذکورہ بالاتحقیقات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کان میں تیل یادواڈالنے سے روزہ فاسدنہیں ہوناچاہئے اس لیے کہ وہاں کوئی منفذنہیں ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

آنکھ میں دواڈالنے سے روزہ کاحکم:

سوال: اگرکسی شخص نے بحالتِ روزہ آنکھ میں دواڈالی توکیاحکم ہے؟

الجواب: آنکھ میں دواڈالنےاورسرمہ لگانے سے روزہ میں کوئی خرابی نہیں آتی روزہ بدستور باقی رہتا ہے،اگرچہ اس کااثرحلق میں محسوس ہو۔

ملاحظہ ہومراقی الفلاح میں ہے:

ولو وضع في عينه لبناً أو دواء مع الدهن فوجد طعمه في حلقه لا يفسد صومه إذ لا عبرة بما يكون من المسام. (مراقی الفلاح: ص۲۳۹، باب مالا یفسد الصوم، بیروت).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو أقطر شيئاً من الدواء في عينه لا يفطر صومه عندنا وإن وجد طعمه في حلقه. (الفتاوی الھندیة: ۱/۲۰۳، الباب الرابع فیما یفسد ومالا یفسد).

احسن الفتاوی میں ہے:

سوال: آنکھ میں بہتی ہوئی دوا ڈالنے سے حلق میں دوا کا صاف اثر معلوم ہوا ہے اس سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، **قال ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله وإن وجد طعمه في حلقه) أي طعم الكحل أو الدهن كما في السراج...** (احسن الفتاوی:۴/۴۲۹، کتاب الصوم).

مزید ملاحظہ ہو: ایضاح المسائل: ص۸۵، وجدید فقہی مسائل: ۱/۱۸۳، نعیمیہ، وعمدۃ الفقہ: کتاب الصوم حصہ سوم ص۲۶۰، مجددیہ۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ناک میں دوا ڈالنے سے روزہ کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے روزہ کی حالت میں ناک میں دوا ڈالی تو روزہ فاسد ہوا یا نہیں؟

الجواب: روزہ کی حالت میں ناک میں دوا ڈالنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، اور قضا واجب ہوتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں فتاوي ولوالجیہ میں ہے:

أما السعوط في الأنف والإقطار في الأذن: إن كان دهناً أو ما يشبهه يفسد صومه لأنه وصل إلى جوف الرأس ما هو مصلح للبدن فكان في معنى الأكل. (الفتاوى الولوالجية:١/٢٢٠، بيروت).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ومن احتقن أو استعط أو أقطر في أذنه دهناً أفطر ولا كفارة عليه هكذا في الهداية.

(الفتاوى الهندية:١/٢٠٤، الباب الرابع فيما يفسد الصوم ومالا يفسد، ومراقى الفلاح :ص٢٤٥، باب ما يفسد الصوم من غير كفارة، بيروت).

ایضاح المسائل میں ہے:

ناک میں دوا ڈالنے سے اور پانی پہنچانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اسی طرح حلق میں پہنچنے سے بھی روزہ فاسد ہوجاتا ہے، لہذا غسل جنابت میں غرغرہ اور استنشاق میں مبالغہ نہیں کرنا چاہئے۔ فتاوی رحیمیہ: ۵/۱۹۸، فتاوی دار العلوم: ۶/۴۱۶، درمختار کراچی: ۲/۴۰۲، جواہر الفقہ: ۱/۳۷۸۔ (ایضاح المسائل: ص۸۵، مسائل روزہ، نعیمیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زیرناف بال صاف کرتے وقت شہوت سے منی خارج ہونے سے روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص روزہ کی حالت میں زیرناف بال کی صفائی کررہا تھا کہ شہوت ابھری اور منی خارج ہوگئی تو کیا روزہ فاسد ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں روزہ فاسد ہوگیا اور قضا واجب ہے، کیونکہ منی خارج کرتے وقت ہاتھ لگایا ہوگا، اور ہاتھ لگانے سے شہوت کے ساتھ منی خارج ہوجائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی ولوالجیہ میں ہے:

الصائم إذا عالج ذكره حتى أمنى يجب عليه القضاء هو المختار، لأنه وجد الجماع معنى. (الفتاوى الولوالجية: ۱/ ۲۱۸، فيما يفسد صومه وفيما لا يفسد، بيروت)

البحر الرائق میں ہے:

قالوا: الصائم إذا عالج ذكره حتى أمنى يجب عليه القضاء وهو المختار، كذا في التجنيس والولوالجية، وبه قال عامة المشايخ، كذا في النهاية. (البحر الرائق: ۲/ ۲۷۲، باب ما يفسد الصوم ومالا يفسده، كوئته).

احسن الفتاوی میں ہے:

ہاتھ سے منی خارج کرنا بہت سخت گناہ ہے، حدیث میں اس پر لعنت وارد ہوئی ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، قضا واجب ہے کفارہ نہیں۔ (احسن الفتاوی: ۴/ ۴۴۵، بحوالہ شامی، استمناء بالید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دمہ کے مریض کے لیے انہیلر استعمال کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص دمہ کا مریض ہے، انہیلر کے بغیر گزارہ مشکل ہوتا ہے، نہ لینے سے مرض کافی شدید ہوجاتا ہے، لہذا روزہ کی حالت اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر دمہ کا دائمی مریض ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں ہے تو انہیلر استعمال کرلیا کرے اور ساتھ میں فدیہ بھی دیدیا کرے، کہ اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق حکم خداوندی کی اطاعت ہوجائے۔ اور اگر دائمی مریض نہ ہو تو بعد میں قضا کرلے اور کفارہ لازم نہیں ہے، دائمی مریض گویا شیخ فانی کے حکم میں ہے، البتہ وسعت کے مطابق روزہ رکھے اور انہیلر بھی استعمال کرلے اور فدیہ بھی دیدے۔

الجوہرۃ النیرۃ میں ہے:

والشيخ الفاني الذي لا يقدر على الصوم يفطر ويطعم لكل يوم مسكيناً نصف صاع من بر أو صاعاً من تمر أو صاعاً من شعير كما يطعم في الكفارات، الفاني الذي قرب إلى الفناء أو فنيت قوته ،كذا العجوز مثله. (الجوهرة النيرة :١/١٧٦، كتاب الصوم ، امدايه، ملتان).

نورالایضاح میں ہے:

ويجوز الفطر لشيخ فانٍ وعجوز فانية... وتلزمها الفدية... وفي حاشية الطحطاوي: وإنما لزمته باعتبار شهودية الشهر، وأبيح له للحرج، وأفاد القهستاني عن الكرماني: أن المريض إذا تحقق اليأس من الصحة أي صحة يقدر معها على الصوم فعليه الفدية لكل يوم.

(حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ص٦٨٨، کتاب الصوم ، قدیمی).

اور دمہ کے مریض کا روزہ انہیلر کے استعمال کے ساتھ امساک کی طرح ہوگا اور اس پر ثواب بھی ملے گا۔

ملاحظہ ہو الجوہرۃ النیرۃ میں ہے:

وإذا قدم المسافر أوطهرت الحائض في بعض النهار أمسكا بقية يومهما... قوله أمسكا أي على الإيجاب هو الصحيح قضاء لحق الوقت لأنه وقت معظم. (الجوهرة النيرة:١/١٧٧، كتاب الصوم ، امدايه، ملتان).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

انہیلر کے ذریعہ دوا کے اجزاء حلق کے نیچے پہنچتے ہیں یا یہ گیس میں تبدیل ہو کر حلق سے نیچے جاتی ہے اس لیے راقم الحروف یہ رائے دیا کرتا ہے کہ انہیلر لیتے ہوئے روزہ رکھ لیا جائے ، کہ اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق حکم خداوندی کی اطاعت ہو جائے اور جو لوگ صاحبِ استطاعت ہوں وہ فدیہ بھی ادا کردیں، کہ اگر روزہ کافی نہ ہو تو فدیہ سے اس کمی کی تلافی ہو جائے ،منہ کے راستہ سے کسی چیز کا حلق سے نیچے پہنچانا روزہ کو توڑ دیتا ہے۔اسی طرح ناک کے ذریعہ بھی کسی چیز کا پہنچانا روزہ کے لیے مفسد ہے، اس لیے انہیلر کی دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے۔

(کتاب الفتاویٰ: تیسرا حصہ،۳۹۴، نعیمیہ).

نوٹ: انہیلر ایک قسم کا پمپ ہوتا ہے جس میں دوا ہوتی ہے منہ میں رکھ کر دبانے سے دوا گیس کے طور پر براہِ راست پھیپھڑوں میں چلی جاتی ہے اور چند لمحوں میں آرام اور سکون ہو جاتا ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

شیخ فانی کی تعریف:

امداد الفتاویٰ میں ہے:

سوال: شیخِ فانی کی جس کو روزہ معاف ہے کیا تعریف ہے یعنی کس عمر اور حالت میں شیخ فانی سمجھا جاوے گا؟

الجواب: في الدر المختار: وللشيخ الفاني العاجز من الصوم الفطر ويفدي الخ، وفي رد المحتار: أي الذي فنيت قوته أو أشرف على الفناء ولذا عرفوه بأنه الذي كل يوم نقص إلى أن يموت نهر ومثله ما في قهستاني عن الكرماني: المريض إذا تحقق اليأس من الصحة فعليه الفدية لكل يوم من المرض، وكذا ما في البحر: لو نذر صوم الأبد فضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعيشة له أن يطعم ويفطر لأنه استيقن أنه لا يقدر على القضاء. (الدر المختار مع الشامي: ۲/۱۹۱)، ان روایات سے ملخص شیخ فانی کا مفہوم یہ نکلا کہ اس کی موجودہ حالت سے یہ معلوم ہو کہ اس کو نہ فی الحال روزہ پر قدرت ہے نہ آئندہ امید ہے اور اس عدم قدرت کی وجہ خواہ پیرانی سالی ہو خواہ مرض۔ (امداد الفتاوی: ۲/۱۵۱، کراچی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دوا کھائے بغیر گزارہ نہ ہو ایسے مریض کے لیے روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص مریض ہے ڈاکٹر نے اسے کہا دن میں دو تین مرتبہ دوا لینا ضروری ہے، تو اس شخص کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کوئی مسلمان دیندار ماہر ڈاکٹر یہ فیصلہ کرے کہ اس شخص کے لیے روزہ رکھنا مضر ہے دن میں دوا نہ لیگا تو مرض شدید ہو جائے گا، تو ایسے شخص کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور صحت یاب ہونے کے بعد قضا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

أما المريض فالمرخص منه هو الذي يخاف أن يزداد بالصوم و اليه وقعت الإشارة في الجامع الصغير، فإنه قال: في رجل خاف إن لم يفطر تزداد عيناه وجعاً أوحماه شدة أفطر، وذكر الكرخيّ في مختصره: أن المريض الذي يبيح الإفطار هو ما يخاف منه الموت أو زيادة العلة كائناً ماكانت العلة. (بدائع الصنائع: ۲/۹۴، سعید، فصل فی حکم فساد الصوم).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

و منها المرض: ۔ المريض إذا خاف على نفسه التلف أو ذهاب عضو يفطر بالإجماع

وإن خاف زيادة العلة وامتداده فكذلك عندنا وعليه القضاء إذا أفطر، كذا في المحيط، ثم معرفة ذلك باجتهاد المريض، والاجتهاد غير مجرد الوهم بل هو غلبة ظن عن إمارة أو تجربة أو بإخبار طبيب مسلم غير ظاهر الفسق، كذا في فتح القدير والصحيح الذي يخشى أن يمرض بالصوم فهو كالمريض هكذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، الباب الخامس فی الاعذار التی تبیح الافطار).

طحطاوی میں ہے:

ولمن خاف وهو مريض زيادة المرض بكم أو كيف لو صام، أفاد أن الصحيح الذي غلب على ظنه المرض بصومه ليس له أن يفطر وأفاد السيد أن في ذلك خلافاً، فالزيلعي على إباحة الفطر له والعلامة المسكين على عدمه، وقد تبع فيه صاحب الذخيرة، وجرى على إباحة الفطر في الدر، وذكر في القهستاني أن الممرض ملحق بالمريض. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ص ۶۸۴، فصل فی العوارض، قدیمی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حقنہ لگانے سے روزہ کا حکم:

سوال: روزہ میں حقنہ ”پیچھے کے راستے سے دوا داخل کرنا“ (Suppository) کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حقنہ لگانے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے اور قضا لازم ہے، کفارہ لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ومن احتقن أو استعط أو أقطر في أذنه أفطر لقوله ﷺ: الفطر مما دخل، ولوجود معنى الفطر وهو وصول ما فيه صلاح البدن إلى الجوف ولا كفارة عليه لانعدامه صورة.

(الهداية: ۱/ ۲۲۰، باب مايوجب القضاء والكفارة).

بدائع الصنائع میں ہے:

وما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ من المخارق الأصلية، كالأنف أو الأذن والدبر بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومه. (بدائع الصنائع: ۲/ ۹۳، سعيد).

نیز ملاحظہ ہو: البحر الرائق: ۲/ ۲۷۸، کوئٹہ۔ والدر المختار مع الشامی: ۲/ ۴۰۲، سعید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کی حالت میں سگریٹ پینے اور پینے والے کے پاس بیٹھنے کا حکم:

سوال: روزہ کی حالت میں سگریٹ پینے (Smoking) کا کیا حکم ہے؟ نیز سگریٹ پینے والے کے پاس بیٹھنے (Passive Smoking) کا کیا حکم ہے؟

الجواب: عام طور پر سگریٹ پینے والے سگریٹ کو نفع بخش سمجھتے ہیں، لہذا قضا اور کفارہ دونوں لازم ہیں، اور پاس بیٹھنے والا حلق میں دھواں کھینچ کر داخل کردے تو روزہ فاسد ہوجائے گا اور قضا واجب ہوگی۔

درمختار میں ہے:

دخل حلقه غبار أو ذباب أو دخان ولو ذاكراً استحساناً لعدم إمكان التحرز عنه، ومفاده أنه لو أدخل حلقه الدخان أفطر أي دخان كان ولو عوداً أو عنبراً له ذاكراً لإمكان التحرز عنه فليتنبه له، كما بسطه الشرنبلالي. وفي الشامي: قوله: أنه لو أدخل حلقه الدخان، أي بأي صورة كان الإدخال، حتى لو تبخر ببخور وآواه إلى نفسه واشتمه ذاكراً لصومه أفطر لإمكان التحرز عنه وهذا مما يغفل عنه كثيراً من الناس، ولايتوهم أنه كشم الورد ومائه والمسک لوضوح الفرق بين هواء تطيب بريح المسک وشبهه وبين جوهر دخان وصل إلى جوفه بفعله، إمداد، وبه علم حكم شرب الدخان ونظمه الشرنبلالي في شرحه على الوهبانية بقوله:

ويمنع من بيع الدخان وشربه ☆ وشاربه في الصوم لاشک يفطر
و يلزمه التكفير لو ظن نافعاً ☆ كذا دافعاً شهوات بطن فقرروا.

(الدرالمختار مع ردالمحتار: ۲/ ۳۹۵، باب مایفسد الصوم ومالا یفسده، سعید).

حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

واختلفوا في معنى التغذي قال بعضهم: إن يميل الطبع إلى أكله وتنقضي شهوة البطن به، وقال بعضهم: هو ما يعود نفعه إلى إصلاح البدن. قوله (هوما يعود نفعه الخ) هذا تفسير للغذاء لا للتغذي فيحتاج إلى تقدير مضاف أي تناول ما يعود نفعه قوله إلى إصلاح البدن، أي وإن لم يمل إليه الطبع، وعلى هذا البدعة التي ظهرت الآن وهو الدخان إذا شربه في لزوم الكفارة ... فمن قال: إن التغذي ما يميل الطبع إليه وتنقضي به شهوة البطن ألزم به الكفارة. (مراقی الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوی: ٦٦٥، باب ما يفسد به الصوم وتجب به الكفارة مع القضاء،

قديمي۔ و درر الحكام شرح غرر الاحكام : ١/٢٠٢ ـ و كذا في الطحطاوي على الدر: ١/٤٥٠، كوئته).

امداد الاحکام میں ہے:

ہاں، اگر اگر بتی کو پاس رکھ کر اس کے دھویں کو سونگھا جائے اور حلق میں داخل کیا جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔ (امداد الاحکام: ۲/۱۳۵).

فتاوی دار العلوم میں ہے:

حقہ سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضاء لازم ہوتی ہے، بعض صورتوں میں کفارہ بھی لازم ہوتا ہے، یعنی اسے نفع بخش سمجھا تب تو کفارہ وقضا دونوں لازم ہوں گے، ورنہ صرف قضا۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند: ۶/۴۱۹، مدلل ومکمل).

واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کی حالت میں تیرنے کا حکم:

سوال: روزہ کی حالت میں پانی میں تیرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب: روزہ کی حالت میں تیرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، البتہ اس بات کا خیال رہے کہ حلق میں پانی نہ اترنے پائے ورنہ روزہ ٹوٹ جائے گا۔

ملاحظہ فرمائیں فتاوی ہندیہ میں ہے:

وإن تمضمض أو استنشق فدخل الماء جوفه إن كان ذاكراً لصومه فسد صومه وعليه القضاء، وإن لم يكن ذاكراً لا يفسد صومه ،كذا في الخلاصة وعليه الاعتماد. (الفتاوى الهندية: ١/٢٠٢).

فتاوی دار العلوم میں ہے:

تالاب میں غسل کرنے سے اور غوطہ لگانے سے روزہ نہیں جاتا۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند: ۶/۱۱۴، مدلل ومکمل).

احسن الفتاوی میں ہے:

کان میں پانی جانے سے روزہ نہیں جاتا عمداً ڈالنے کے مفسد ہونے میں اختلاف ہے عدم فساد ارجح اور فساد احوط ہے۔ **لما في العلائية : أو دخل الماء في أذنه وإن كان بفعله على المختار إلى قوله لم يفطر . وفي الشامية : قوله وإن كان بفعله اختاره في الهداية والتبيين وصححه في المحيط وفي الولوالجية أنه المختار ، وفصل في الخانية بأنه إن دخل لا يفسد وإن أدخله يفسد في الصحيح لأنه وصل إلى الجوف**

بفعله فلا يعتبر فيه صلاح البدن ، ومثله في البزازية واستظهره في الفتح والبرهان شرنبلالية ملخصاً .
والحاصل الاتفاق على الفطر بصب الدهن وعلى عدمه بدخول الماء. واختلف التصحيح في إدخاله. رد المحتار:۲/۳۹٦،سعيد۔ وفي الهندية : ولو أقطر في أذنه الماء لا يفسد صومه كذا في الهداية ، وهو الصحيح هكذا في محيط السرخسيّ. عالمگیری:۱/۲۰٤ ۔(احسن الفتاویٰ:۴/۴۲۱)۔واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ میں خون نکلوانے کا حکم:

سوال: روزہ میں خون نکلوانے(BLOOD EXTRACTION TEST OR DONOR) کا کیا حکم ہے؟

الجواب: روزہ کی حالت میں خون نکلوانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا ہے۔البتہ اگر کمزور ہو جانے کا خوف ہوتو خون نکلوانا مکروہ ہے۔

ملاحظہ ہوحدیث شریف میں ہے:

عن ابن عباس رضي اللّٰه تعالى عنه، أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم احتجم وهو محرم واحتجم وهو صائم. وعن شعبة قال: سمعت ثابتاً البناني قال : سئل أنس بن مالک رضي اللّٰه تعالى عنه : أكنتم تكرهون الحجامة للصائم؟ قال: لا إلا من أجل الضعف. (بخاری شریف: ۱/۲٦۰/۱۸۹۷،۱۸۹۸، باب الحجامة والقيء للصائم).

ہدایہ میں ہے:

ولو ادهن لم يفطر لعدم المنافي وكذا إذا احتجم لهذا، ولماروينا. (الهداية:۱/۲۱۷،باب مايوجب القضاء والكفارة).

تبیین الحقائق میں ہے:

قال رحمه اللّٰه تعالىٰ: فإن أكل الصائم أو شرب أو جامع ناسياً أو احتلم أو أنزل بنظر أو ادهن أو احتجم ...لم يفطر... وأما الاحتجام فلما روينا، ولعدم المنافي وهوقول جمهور العلماء... ولأن الحجامة ليس فيها إلا إخراج الدم فصارت كالافتصاد والجرح. (تبيين الحقائق:۱/۲۲۳،باب مايفسد الصوم ومالايفسد).

احسن الفتاوی میں ہے:

سوال: روزہ کی حالت میں بذریعہ انجکشن خون نکلوانا مفسدِ صوم یا مکروہ تو نہیں؟

جواب: مفسد نہیں البتہ اگر ایسے ضعف کا خطرہ ہو کہ روزہ کی طاقت نہیں رہے گی تو مکروہ ہے۔(احسن الفتاوی :۴/۴۲۵).

ایضاح المسائل میں ہے:

روزہ کی حالت میں خون نکلوانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اور اگر ایسے ضعف کا خطرہ ہے کہ روزہ کی طاقت باقی نہ رہے تو مکروہ ہے۔احسن الفتاوی:۴/ ۴۲۵، (ایضاح المسائل :ص ۸۷، نعیمیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کی حالت میں خون دینے کا حکم:

سوال: کسی مریض کو خون کی ضرورت ہے تو روزہ کی حالت میں خون دینے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

الجواب: روزہ کی حالت میں خون دینے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، ہاں ایسی کمزوری کا خطرہ ہے کہ روزہ کی طاقت باقی نہ رہے گی تو مکروہ ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن ابن عباس رضي اللّٰه تعالى عنهما أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم احتجم وهو محرم، واحتجم وهو صائم. وعن شعبة قال: سمعت ثابتاً البناني قال : سئل أنس بن مالك رضي اللّٰه تعالى عنه : أكنتم تكرهون الحجامة للصائم؟ قال: لا إلا من أجل الضعف. (بخاری شریف: ۱/ ۲۶۰/ ۱۸۹۷، ۱۸۹۸، باب الحجامة والقئ للصائم).

ہدایہ میں ہے:

ولو ادهن لم يفطر لعدم المنافي وكذا اذا احتجم لهذا، ولمارويناه. (الهداية: ۱/ ۲۱۷، باب مايوجب القضاء والكفارة).

تبیین الحقائق میں ہے:

قال رحمه اللّٰه تعالىٰ: فإن أكل الصائم أو شرب أو جامع ناسياً أو احتلم أو أنزل بنظر أو ادهن أو احتجم ...لم يفطر... وأما الاحتجام فلما روينا، ولعدم المنافي وهوقول جمهور

العلماء ... ولأن الحجامة ليس فيها إلا إخراج الدم فصارت كالافتصاد والجرح. (تبيين الحقائق: ۱/۲۲۳، باب مايفسد الصوم ومالايفسد).

کتاب الفتاوی میں ہے:

روزہ ایسی چیزوں سے ٹوٹتا ہے جو جسم میں داخل ہو، نہ کہ ایسی چیزوں سے جو جسم سے خارج ہو اس سے صرف قے کی صورت مستثنیٰ ہے جس کی بعض صورتیں ناقض صوم ہیں، اس لیے خون دینے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود روزہ کی حالت میں فصد لگوانا ثابت ہے، فصد ایک طبی عمل تھا جس کے ذریعہ جسم کا فاسد خون باہر نکالا جاتا تھا، اس لیے خون دینے میں کچھ حرج نہیں، خواہ ٹسٹ کے لیے، یا کسی مریض کے لیے البتہ اگر یہ اندیشہ ہو کہ خون دینے کی وجہ سے روزہ کو قائم نہیں رکھ سکے گا، اور اضطرار اور مجبوری کی حالت میں نہ ہو تو خون دینا مکروہ ہے، اسی احتیاط کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی حالت میں فصد لگوانے کو پسند نہیں فرمایا، اس لیے کہ تمام لوگوں میں اس کی قوتِ برداشت نہیں ہوتی، اور خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے روزہ کو قائم نہیں رکھ سکیں۔ (کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ، ص۴۰۰، کتب خانہ نعیمیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قے ہونے سے روزہ کا حکم:

سوال: روزہ کی حالت میں قے ہونے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قے سے روزہ صرف دو صورتوں میں ٹوٹ جاتا ہے: (۱) خود بخود منہ بھر کر قے آجائے اور قصداً روزہ یاد ہونے کی حالت میں قے نگل جائے۔ (۲) جان بوجھ کر منہ بھر کر قے کرے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ میں روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

قوله وإن ذرعه القيء أي غلبه وسبقه قاموس، والمسئلة تتفرع إلى أربع وعشرين صورة؛ لأنه إما أن يقيء أو يستقيء وفي كل إما أن يملأ الفم أودونه، وكل من الأربعة إما أن خرج أو عاد أو أعاده وكل إما ذاكر لصومه أو لا، ولافطر في الكل على الأصح إلا في الإعادة واستقاء بشرط الملء مع التذكر شرح الملتقى. (الشامي: ۲/۴۱۴، مطلب في الكفارة، سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

فالحاصل أن صور المسائل اثناعشر؛.... وأن صومه لا يفسد على الأصح في الجميع

إلا في مسألتين في الإعادة بشرط ملء الفم، وفي الاستقاء بشرط ملء الفم. (البحر الرائق: ۲/۲۷۴، باب ما يفسد الصوم و ما لا يفسد، کوئٹہ).

نیز ملاحظہ ہو: تبيين الحقائق:باب ما يفسد الصوم وما لا يفسد ـو العناية شرح الهداية:باب ما يوجب القضاء والكفارة، والجوهرة النيرة :كتاب الصوم ـوفتح القدير:باب ما يوجب القضاء والكفارة ـو درر الحكام فی شرح غرر الاحكام: باب مايوجب الافساد فی الصوم ـو الفتاوی الهندية:الباب الرابع فی ما يفسد وفی مالا يفسد).

کتاب الفتاوی میں ہے:

اگر بلاارادہ ازخود منہ بھر کر قے آجائے، یا پانی آجائے جو قے ہی کی ایک صورت ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر انسان قصداً قے کو نگل جائے یا جان بوجھ کر قے کرے اور وہ منھ بھر کر ہو تو اس صورت میں روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ، ص۳۹۱)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بحالتِ روزہ انجکشن اور گلوکوز کا حکم:

سوال: ایک شخص روزہ کی حالت میں (Drip) انجکشن اور گلوکوز کے ذریعہ دوا لیتا ہے اور علاج کراتا ہے تو اس سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ دوا سے معدہ کی اصلاح مقصود ہو تو مسئلہ میں کوئی فرق پڑے گا یا نہیں؟

الجواب: روزہ کی حالت میں انجکشن یا (Drip) وغیرہ سے دوا جسم میں پہنچانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اسی طرح گلوکوز چڑھانے سے بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا، لیکن جو انجکشن بدن کی قوت کا ذریعہ بنتا ہو اور آدمی اس کی وجہ سے کھانے پینے سے مستغنی رہتا ہو اس کا استعمال کراہت سے خالی نہیں ہے، البتہ وہ انجکشن جو براہِ راست پیٹ میں رکھا جاتا ہے، مثلاً کتے کاٹے کا، تو یہ مفسد ہونا چاہئے، اس لئے کہ دوائی براہِ راست پیٹ میں پہنچائی گئی لہذا روزہ کی حالت میں اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

ادهن أو اكتحل أو احتجم وإن وجد طعمه في حلقه. وفي الشامي: أي طعم الكحل أو الدهن كما في السراج، وكذا لو بزق فوجد لونه في الأصح، بحر، قال في النهر: لأن الموجود في حلقه أثر داخل من المسام الذي هو خلل البدن والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ للاتفاق على أن من اغتسل في ماء فوجد برده في باطنه أنه لا يفطر وإنما كره الإمام الدخول في الماء والتلفف بالثوب المبلول لما فيه من إظهار الضجر في إقامة العبادة لا لأنه

مفطر. (الدر المختار مع الشامي:۲/۳۹۵،باب مالا يفسد الصوم ومالا يفسده،سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولو دخل حلقه غبار الطاحونة أو طعم الأدوية أو غبار الهرس وأشباهه... لم يفطره كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية:۱/۲۰۳،فيما يفسد ومالا يفسد).

کتاب الفتاوی میں ہے:

انجکشن اور گلوکوز کے ذریعہ معدے تک کوئی چیز براہِ راست نہیں پہنچتی، بلکہ دوائیں رگوں میں پہونچتی ہیں اور رگوں کے ذریعہ پورے جسم میں پھیل جاتی ہیں، اسی لیے انجکشن اور گلوکوز کو دوا کھانا یا پینا نہیں کہا جاتا، اس لیے انجکشن اور گلوکوز کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، روزہ اصل شی کے پہنچنے سے ٹوٹتا ہے نہ کہ کسی شی کا اثر پہنچنے کی وجہ سے، البتہ جس شخص کو بیماری کی وجہ سے گلوکوز چڑھانا ضروری نہ ہوں محض تقویت کے لیے روزہ کی حالت میں گلوکوز چڑھانا ایک درجہ کی کراہت سے خالی نہیں، لہذا اس سے بچنا چاہئے۔ (کتاب الفتاوی: تیسرا حصہ، ص۳۹۲، کتب خانہ نعیمیہ)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

انجکشن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اِلا یہ کہ جوفِ معدہ میں دوا پہونچائی جائے۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۰/۱۵۴، مبوب ومرتب)۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: امداد الفتاوی: ۲/۱۴۵، کراچی، وامداد الاحکام: ۲/۱۳۰، کراچی، وکفایت المفتی: ۴/۲۵۳، واحسن الفتاوی: ۴/۴۲۲، وایضاح المسائل: ص۸۴، وفتاوی رحیمیہ: ۲/۳۸، وآلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام: ص۱۶۲-۱۶۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

انجکشن کے بارے میں مزید تحقیق:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کہ انجکشن رگ میں ہو یا گوشت میں طاقت کے لیے ہو یا بیماری کے لیے مفسدِ صوم ہے یا نہیں؟

الجواب: مفسد صوم وہ چیز ہے جو منافذ اصلیہ منہ، ناک، دبر، قبل، وغیرہ کے ذریعہ جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں پہونچ جائے یا عارضی منفذ جیسے پیٹ کے گہرے زخم کے اندر سیال دوا ڈالدے، ہاں جو چیز مسامات یا رگوں کے ذریعہ پہونچ جائے وہ مفسد نہیں۔

ملاحظہ فرمائیں فتح المعین میں ہے:

لأن المفطر إنما هو الداخل من المنافذ ولهذا اتفقوا على أن من اغتسل فوجد برد الماء في باطنه لا يفطر. (فتح المعين:١/٤٣١).

مبسوطِ سرخسی میں ہے:

وإن وصل عين الكحل إلى باطنه فذلك من قبل المسام، لا من قبل المسالك، إذ ليس بين العين إلى الحلق مسلك فهو نظير الصائم يشرع في الماء فيجد برودة الماء في كبده. (المبسوط للامام السرخسيؒ: ٣/٦٧).

ہدایہ میں ہے:

والداخل من المسام لا ينافي كما لو اغتسل بالماء البارد. (الهداية:١/٢١٧،باب مايوجب القضاء والكفارة).

وفي البدائع: تحت مسئلة الاكتحال: وما يوجد من طعمه فذاك أثره لاعينه. (بدائع الصنائع:٢/٩٣،سعيد).

نیز جب دوا رگ میں پہونچی تو خون کے ساتھ ملنے کی وجہ سے خون غالب ہوا اور دوا کی حقیقت خون میں بدل گئی، اور جب بطن میں پہونچی تو وہ خون ہی تھا، بیرونی چیز بدل گئی، جیسے لعاب خون پر غالب ہو اور اس کو صائم نگل لے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

شامی میں ہے:

فإن غلب الدم أو تساويا فسد وإلا لا، إلا إذا وجد طعمه بزازيه واستحسنه المصنف وهو ماعليه الأكثر. (شامی:٢/٣٩٦،باب مايفسد الصوم ومالايفسده،سعيد) ۔**واللہ تعالیٰ اعلم۔**

ملازمت میں روزہ استطاعت سے باہر ہو تو افطار کا حکم:

سوال: کوئی ملازم ملازمت کر رہا ہے اور رمضان میں سخت گرمی کی وجہ سے روزہ رکھنا انتہائی مشکل ہے بلکہ شدتِ پیاس کی وجہ سے طاقت سے باہر ہو اور چھٹی بھی نہ ملتی ہو تو ایسے ملازم کے لیے افطار کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟

الجواب: ایسے ملازم کو رمضان میں چھٹی لینے کی کوشش کرنا چاہئے اگر چھٹی مل جائے تو روزے رکھ

لے اور اگر چھٹی نہیں ملتی اور ملازمت کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا، تو حسبِ استطاعت روزہ رکھ لے پھر جب طاقت سے باہر ہوجائے تو استغفار کے ساتھ پانی پی لے اور بعد میں اس روزہ کی قضا کرے۔ ہاں ابتداء سے روزہ رکھنا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

والخادم الحر الذي ذهب لكري النهر فاشتد وخاف على نفسه الهلاك ينبغي أن لا تجب الكفارة لو أفطر. (الفتاوى التاتارخانية ۲/۳۸۵، ادارة القرآن).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

المحترف المحتاج إلى نفقته علم أنه لو اشتغل بحرفته يلحقه ضرر مبيح للفطر يحرم عليه الفطر قبل أن يمرض كذا في القنية. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۰۸).

قال ابن عابدين الشامي رحمه الله:

قال الرملي: قال في جامع الفتاوى: لو ضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعيشة فله أن يفطر ويطعم لكل يوم نصف صاع، أقول: هذا إذا لم يدرك عدة من أيام آخر يمكنه الصوم فيها، أما إذا أمكنه يجب القضاء. (منحة الخالق على هامش البحر الرائق: ۲/۲۸۱، كوئته).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

والصحيح الذي يخشى أن يمرض بالصوم فهو كالمريض فكذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۰۷).

آپ کے مسائل میں ہے:

کام کی وجہ سے روزہ چھوڑنے کی تو اجازت نہیں اس لیے روزہ تو رکھ لیا جائے لیکن جب روزے میں حالت مخدوش ہوجائے تو روزہ توڑ دے اس صورت میں قضاء واجب ہوگی، کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/۲۷۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مطبخ میں مختلف کھانوں اور مسالوں کی خوشبو سے روزہ کا حکم:

سوال: عورتیں مطبخ (kitchen) میں کھانا پکاتی ہیں تو مسالوں اور مختلف کھانوں کی خوشبو اور دھواں ان کے دماغ تک پہونچتا ہے، اس سے روزہ پر کوئی اثر مرتب ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نہ غذائیت کا فائدہ دیتی ہیں اور نہ دوا کا اور ان سے اجتناب کرنا بہت مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن ہوتا ہے مثلاً دھواں، غبار، اور عورتوں کے لیے کھانا پکانے کے دوران مختلف کھانوں اور مسالوں کا خوشبودار دھواں وغیرہ، اس کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں غیر اختیاری طور پر ہو تو نہ اس سے روزہ فاسد ہوتا ہے اور نہ مکروہ ہوتا ہے، اور نہ اس کی وجہ سے روزہ پر کوئی اثر مرتب ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

دخل حلقه غبار أو ذباب أو دخان ولو ذاكراً استحساناً لعدم إمكان التحرز عنه ومفاده أنه لو أدخل حلقه الدخان أفطر أي دخان كان ولو عوداً أو عنبراً لو ذاكراً لإمكان التحرز عنه. (الدر المختار: ۲/۳۹۵، سعید۔ وکذا في مراقي الفلاح: ۳۳۹، بیروت۔ وفتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة: ۱/۲۰۸).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اور اگر کسی کے حلق میں پیسنے یا چھاننے کا غبار یا دوا کا مزہ (یعنی کسی نے دوائی کوٹی اور اس کا مزہ اپنے حلق میں محسوس کیا) یا کوٹنے وغیرہ کا غبار یا دھواں یا خاک کا غبار جو ہوا یا جانوروں کے سموں (کھروں) سے اڑتا ہے داخل ہوا یا اس قسم کی کوئی اور چیز داخل ہوئی تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، خواہ اس کو اپنا روزہ یاد ہو یا نہ ہو کیونکہ ان چیزوں سے بچنا ممکن نہیں ہے، اور یہ حکم اس وقت ہے جب کہ روزہ دار کے فعل کے بغیر خود بخود داخل ہو جائے اور اگر روزہ یاد ہوتے ہوئے اس نے اپنے فعل سے ان میں سے کسی چیز کو داخل کیا تو اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا کیونکہ وہ منہ بند کر کے اس سے بچ سکتا تھا اور لوگ اس بات سے غافل ہیں۔ (عمدۃ الفقہ: کتاب الصوم حصہ سوم: ۲۶۴، مجددیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عورت کا اندام نہانی میں انگلی ڈالنے سے روزہ کا حکم:

سوال: اگر عورت نے اپنے اندامِ نہانی میں انگلی ڈالی یا ڈاکٹرنی نے انگلی ڈالی تو روزہ ٹوٹا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر انگلی خشک تھی تو روزہ فاسد نہیں ہوا، ہاں تر ہونے کی صورت میں روزہ فاسد ہو جائے گا اور قضا لازم ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولو أدخل أصبعه في استه أو المرأة في فرجها لايفسد، وهو المختار إلا إذا كانت مبتلة بالماء أو الدهن فحينئذٍ يفسد لوصول الماء أو الدهن هكذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية:١/٢٠٤).

درمختار میں ہے:

أدخل أصبعه اليابسة فيه أي دبره أو فرجها ولو مبتلة فسد. وفي الشامي: لبقاء شيء من البلة في الداخل. (الدرالمختارمع الشامی:٢/٣٩٧، سعيد).

نیز ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل:۱/۱۸۳۔ وفتاوی محمودیہ:۱۰/۱۴۳، مبوب ومرتب)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عورت کی اندام نہانی میں دواڈالنے سے روزہ کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت نے روزہ کی حالت میں اپنی شرمگاہ میں دواڈالی تو روزہ ٹوٹ گیا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں روزہ ٹوٹ گیا اور قضا لازم ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

أقطر في إحليله ماء أو دهناً وإن وصل إلى المثانة على المذهب وأما في قبلها فمفسد إجماعاً لأنه كالحقنة. وفي الشامي: قوله: فمفسد إجماعاً، وقيل على الخلاف، والأول أصح فتح عن المبسوط. (الدرالمختارمع الشامی:٢/٣٩٩۔٤٠٠،سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

الإقطار في قبل المرأة يفسد الصوم بلا خلاف على الصحيح، كذا في غاية البيان وفي الولوالجية: أنه يفسد بالإجماع. (البحر الرائق:٢/٢٧٩، كتاب الصوم، كوئته).

مراقی الفلاح میں ہے:

أو أقطرت في فرجها على الأصح لشبهه بالحقنة. (مراقي الفلاح: ٢٤٧،باب ما يفسد الصوم، بيروت).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

عورتوں کی شرمگاہ میں کسی بھی قسم کی دواڈالنا مفسدِ صوم ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے: **وفي الإقطار في**

إقبال النساء يفسد بلا خلاف وهو الصحيح. الفتاوى الهندية: ٢٠٤/١ ـ (جدید فقہی مسائل:۱/۱۸۳،اندرونِ جسم دوا کا استعمال،نعیمیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

اندامِ نہانی میں ڈاکٹرنی کے انگلی ڈالنے سے روزہ کا حکم:

سوال: قریب الولادۃ عورت کی شرمگاہ میں اگر ڈاکٹرنی انگلی داخل کرے تو روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ جب کہ انگلی اکثر دوا آلود ہوتی ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دوا آلود انگلی داخل کرنے سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور قضا واجب ہوگی۔اور اگر انگلی خشک ہے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

دلائل مسئلۂ مذکورہ بالا کے تحت گزر چکے،وہاں ملاحظہ فرمالیں۔واللہ ﷻ اعلم۔

مسوڑھوں کا خون پیٹ میں جانے سے روزہ کا حکم:

سوال: اگر کسی کے مسوڑھوں سے خون نکلتا رہتا ہے اور غفلت یا نیند کی حالت میں تھوک کے ساتھ پیٹ میں اتر جاتا ہے تو روزہ ٹوٹے گا یا نہیں؟

الجواب: مسوڑھوں سے خون نکل کر حلق میں داخل ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) خون کی مقدار کم ہے اور تھوک غالب ہے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔(۲) خون کی مقدار زیادہ ہے یعنی تھوک پر غالب ہے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔لیکن علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: کہ اگر خون نکلنے کی کیفیت ایسی ہو کہ اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں روزہ فاسد نہ ہوگا،جیسا کہ قئی خود بخود لوٹ جائے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

خرج الدم من بين أسنانه ودخل حلقه يعني ولم يصل إلى جوفه أما إذا وصل فإن غلب الدم أو تساويا فسد وإلا لا... وفي الشامي: قلت: ومن هذا يعلم حكم من قلع ضرسه في رمضان ودخل الدم إلى جوفه في النهار ولو نائماً فيجب عليه القضاء إلا أن يفرق بعدم إمكان التحرز عنه فيكون كالقيء الذي عاد بنفسه فليراجع. (الدر المختار مع الشامي:٢/٣٩٦،باب مايفسد الصوم ومالا يفسده،سعيد).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

وفي السراج عن الوجيز لو كان الدم غالباً لايفطر وهو الصحيح إلحاقاً له بمابين

الأسنان بجامع عدم الاحتراز عنه، نهر. (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار: ۱/۴۵۱، کوئٹه).

النہرالفائق میں ہے:

ولو خرج دم من أسنانه فدخل حلقه فإن غلب الريق أفطره وكذا إن ساواه استحساناً وإلا لا، هذا ما عليه أكثر المشايخ، وفي السراج عن الوجيز: لوكان الدم غالباً لايفطر وهو الصحيح إلحاقاً له بما بين الأسنان بجامع عدم الاحتراز عنه. (النهرالفائق: ۲/۱۸، باب مايفسد الصوم، قديمی).

خلاصہ: نہر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ خون غالب ہو پھر بھی صحیح قول کے مطابق روزہ نہیں ٹوٹے گا اس لیے کہ اس سے بچنا مشکل ہے، ہاں اگر اس کو چوستا رہتا ہے تو روزہ فاسد ہو جائیگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کی حالت میں دانت نکلوانے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص کو دانت میں تکلیف ہو تو روزہ کی حالت میں نکلوانا درست ہے یا نہیں؟ اس سے روزہ ٹوٹے گا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر دانت میں شدید تکلیف ہے تو نکلوانا درست ہے، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ خون حلق سے نیچے نہ اترنے پائے۔ البتہ بغیر ضرورت کے روزہ کی حالت میں نکلوانا مکروہ ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

قلت: ومن هذا يعلم حكم من قلع ضرسه في رمضان ودخل الدم إلى جوفه في النهار ولو نائماً فيجب عليه القضاء إلا أن يفرق بعدم إمكان التحرز عنه فيكون كالقيء الذي عاد بنفسه فليراجع. (الدرالمختارمع الشامی: ۲/۳۹۶، باب مايفسد الصوم ومالا يفسده، سعيد).

النہرالفائق میں ہے:

ولو خرج دم من أسنانه فدخل حلقه فإن غلب الريق أفطره وكذا إن ساواه استحساناً وإلا لا، هذا ما عليه أكثر المشايخ، وفي السراج عن الوجيز: لوكان الدم غالباً لايفطر وهو الصحيح إلحاقاً له بما بين الأسنان بجامع عدم الاحتراز عنه. (النهرالفائق: ۲/۱۸، باب ما يفسد الصوم، قديمی).

احسن الفتاوی میں ہے:

روزہ میں دانت نکلوانا یا اس پر دوا لگانا بوقتِ ضرورتِ شدیدہ جائز ہے، اور بلاضرورت مکروہ ہے، اگر دوا یا خون پیٹ کے اندر چلا جائے اور تھوک پر غالب ہو یا اس کے برابر ہو یا اسکا مزہ محسوس ہو تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۲۶)۔

کتاب الفتاوی میں ہے:

بذاتِ خود دانت نکالنے میں کچھ حرج نہیں، لیکن عام طور پر دانت نکالتے ہوئے، مسوڑھوں سے کافی خون آتا ہے، اور یہ بھی امکان رہتا ہے کہ خون حلق سے نیچے چلا جائے، اور ایسی صورت میں روزہ ٹوٹ جائے گا، اس لیے اگر شدید مجبوری نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ رمضان میں دانت نہ نکلوائے، شدید عذر کے بغیر رمضان میں دانت نکلوانا مکروہ ہے۔ (کتاب الفتاوی:۳/۴۰۰، نعیمیہ۔ وکذا فی ایضاح المسائل:۸۷، نعیمیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ہاتھ سے شہوت پوری کرنے سے روزہ کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں ہاتھ سے شہوت پوری کرے (استمناء بالید) تو روزہ فاسد ہوتا ہے یا نہیں؟ ہدایہ میں اس کے خلاف مرقوم ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں راجح اور مفتیٰ بہ قول کے مطابق روزہ فاسد ہوجائے گا اور قضاء لازم ہوگی۔

ہدایہ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

فإن نام فاحتلم لم يفطر...وكذا إذا نظر إلى امرأة فأمنى ... وصار كالمتفكر إذا أمنى وكالمستمني بالكف على ما قالوا. (الهداية: ۱/۲۱۷).

محقق ابن ہمامؒ صاحبِ ہدایہ کے اس قول کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ مصنفؒ نے "**على ما قالوا**" سے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ استمناء بالید سے عدمِ فساد کا قول ضعیف ہے۔ اور مختار قول کی طرف ابن ہمامؒ نے اشارہ فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

قوله على ما قالوا: عادته في مثله إفادة الضعف مع الخلاف، وعامة المشايخ على الإفطار، وقال المصنفؒ في التجنيس: أنه المختار كانه اعتبرت المباشرة المأخوذة في معنى الجماع أعم من كونها مباشرة الغير أو لا، بأن يراد مباشرة هي سبب الإنزال. (فتح القدير: ۲/۳۲۰، دارالفکر).

فتاویٰ ولوالجیہ میں ہے:

الصائم إذا عالج ذكره حتى أمنى يجب عليه القضاء هو المختار، لأنه وجد الجماع معنى... لقوله صلى الله عليه وسلم: "ناكح اليد ملعون". (الفتاوى الولوالجية:۱/۲۱۸، كتاب الصوم،الفصل الاول، بيروت).

البحر الرائق میں ہے:

قالوا: الصائم إذا عالج ذكره حتى أمنى، يجب عليه القضاء وهو المختار، كذا في التجنيس و الولوالجية، وبه قال عامة المشايخ، كذا في النهاية. (البحرالرائق:۲/۲۷۲، کوئٹه).

مزید ملاحظہ ہو: الفتاوى الهندية:۱/۲۰۵۔ وردالمحتار:۲/۳۹۹، سعید۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بیوی سے دل لگی کے وقت انزال ہونے پر فسادِ روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ روزہ کی حالت میں چھیڑ چھاڑ (دل لگی) کر رہا تھا کہ انزال ہوگیا تو روزہ فاسد ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں روزہ فاسد ہوگیا اور قضا واجب ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولو أنزل بقبلة أو لمس فعليه القضاء، دون الكفارة لوجود معنى الجماع، ووجود المنافي صورة أو معنى يكفي لإيجاب القضاء احتياطاً. (الهداية:۱/۲۱۷).

درمختار میں ہے:

أو وطيء ...فخذ أو بطناً أو قبل ولو قبلة فاحشة بأن يدغدغ أو يمص شفتيها، أو لمس ولو بحائل لا يمنع الحرارة...فأنزل قيد للكل حتى لو لم ينزل لم يفطر كما مر....قضىٰ في الصور كلها. (الدرالمختار:۲/۴۰۴۔۴۰۶، سعید).

مزید ملاحظہ ہو: البحرالرائق:۲/۲۷۸، کوئٹہ۔ ومراقی الفلاح:۲۴۶۔ وفتاوی محمودیہ:۱۰/۱۴۵).

واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کی حالت میں پان منہ میں رکھنے سے فسادِ صوم کا حکم:

سوال: اگر کسی نے تمباکو والا پان منہ میں رکھا اور اس کا پانی نہیں نگل رہا ہے تو اس سے روزہ ٹوٹ گیا

یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر پان کا ذائقہ حلق میں محسوس ہوا اور حلق سے نیچے اتار لیا تو روزہ فاسد ہوگیا، لیکن اگر حلق تک پہونچ کر حلق سے نیچے نہیں اترا تو مفسد نہیں ہے، البتہ مکروہِ تحریمی ضرور ہے، لیکن عادۃً حلق سے نیچے جاتا ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وكره مضغ علك أبيض ممضوغ ملتئم، وإلا فيفطر...قوله أبيض قيده بذلك لأن الأسود وغير الممضوغ وغير الملتئم، يصل منه شيء إلى الجوف، وأطلق محمدؒ المسألة وحملها الكمال تبعاً للمتأخرين على ذلك قال للقطع بأنه معلل بعدم الوصول، فإن كان مما يصل عادة حكم بالفساد لأنه كالمتيقن. (الشامي:٢/٤١٦،مطلب فيما يكره للصائم،سعيد).

منہاج السنن میں ہے:

فائدة: استعمال سفوف التتن موجب للقضاء، فإنه يدخل الباطن بدليل وجود طعمه في الحلق كما يشير إليه كلام درالمختار حيث قال: وأكل مثل سمسمة من خارج يفطر، يكفر في الأصح إذا مضغ بحيث تلاشت في فمه إلا أن يجد الطعم في حلقه، والعوام لو أفتوا بعدم الفساد عند عدم الوصول إلى الحلق والبطن لبلغوا إلى الآفاق أن النشوق غير مفسد كما هو عادة العوام في كل زمان. (منهاج السنن:٤/٦٣).

شامی میں ہے:

وفي البزازية: قيد عدم الفساد في صورة غلبة البصاق بما إذا لم يجد طعمه وهوحسن.

(الشامي:٢/٣٩٦،باب مايفسد الصوم ومالايفسده، سعيد).

جواہر الفتاویٰ میں ہے:

حقہ، پان، نسوار، ایسی چیز جو کسی مقصد سے منہ میں رکھی جاتی ہے اس کے اثرات حلق میں چلے جاتے ہیں، تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا، اور اگر اثر نہ جانے کا اہتمام کرے تو پھر بھی شک کی وجہ سے مکروہ (تحریمی) ہے۔

(جواہر الفتاویٰ:۱/۲۸).

امداد الاحکام میں ہے:

روزہ کی حالت میں سفوفِ تمبا کو منہ میں رکھنا:

قال في العالمكيرية : ولو مص الهليلج فدخل البزاق حلقه لم يفسد ما لم يدخل عينه كذا في الظهيرية. الفتاوى الهندية: ١/١٣١۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفوفِ تمبا کو مرکب کا اس طرح دانتوں میں استعمال کرنا کہ حلق سے نیچے یقیناً نہ اترے مفسد صوم نہیں، اور اگر ذرا سا بھی حلق سے نیچے اتر جائے گا تو روزہ فاسد ہے اور اس سفوف کا استعمال بحالتِ صوم بلاضرورت مکروہ ہے، اور ضرورت بعد مغرب کے استعمال کرنے سے بھی رفع ہوسکتی ہے۔ (امدادالاحکام:۲/۱۲۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

صبح صادق کے بعد بیوی سے الگ ہونے پر روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے سحری کے وقت ہمبستری کی اور اسی حالت میں شوہر بیوی سو گئے، صبح صادق کے بعد دونوں کی آنکھ کھلی تو فی الفورا لگ ہو گئے، اب ان دونوں کا روزہ فاسد ہوا یا نہیں؟ ان پر قضا اور کفارہ ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دونوں کا روزہ فاسد نہیں ہوا، کیونکہ صبح صادق کے بعد جماع نہیں پایا گیا، لہذا ان پر قضا اور کفارہ لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

الجماع إدخال الفرج بالفرج ولا دوام للإدخال بخلاف ما إذا أخرج ثم أولج.

(الهداية: ٢/٣٨٩، كتاب الطلاق).

البحرالرائق میں ہے:

الجماع هو إدخال الفرج بالفرج وليس له دوام حتى يكون لدوامه حكم ابتدائه، كمن حلف لايدخل هذه الدار وهو فيها لا يحنث باللبث. (البحرالرائق: ٤/٣٥، باب التعليق، كوئته).

ولوجامع عامداً قبل الفجر وطلع وجب النزع في الحال فإن حرك نفسه فعليه الكفارة. (البحرالرائق: ٢/٢٧١، كوئته).

بحر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر فی الحال عضو مخصوص نکالا تو قضا نہیں۔

ولو بدأ بالجماع ناسياً فتذكر إن نزع من ساعته لم يفطر وإن دام على ذلك حتى أنزل فعليه القضاء. (البحرالرائق: ٢/٢٧١، كوئته).

چونکہ نسیان جماع قبل الفجر کے مشابہ ہے اور دونوں مفسد نہیں، تو نسیان کی صورت میں جب فی الفور عضو مخصوص

الگ کرے تو قضا نہیں لہذا ادخال قبل الفجر میں بھی قضا نہیں ہونا چاہئے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وإن بدأ بالجماع ناسياً وأولج قبل الفجر ثم طلع الفجر أو تذكر الناسي إن نزع في فوره لا يفسد صومه في الصحيح. (الفتاوى الهندية:١/٢٠٤).

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ایلاج قبل الفجر اور اخراج بعد الفجر میں نسیان کی صورت میں روزہ فاسد نہیں ہوا یعنی قضا نہیں۔

لیکن مراقی الفلاح کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نائم ناسی کے حکم میں نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

قال: أوصب أحد في جوفه وهو أي صائم نائم لوصول المفطر إلى جوفه كما لو شرب وهو نائم وليس كالناسي لأنه تؤكل ذبيحته وذاهب العقل والنائم لا تؤكل ذبيحتهما. (مراقي الفلاح:ص ٢٤٥ ،باب مايفسد الصوم من غير كفارة،بيروت).

لیکن اس کے سیاق وسباق سے پتہ چلتا ہے کہ کھانے پینے کے بارے میں نائم ناسی کی طرح نہیں ہے کیونکہ کھانے کا دوام ابتداء کے حکم میں ہے، بخلاف جماع کہ اس کے دوام کو ابتداء یعنی ادخال کا حکم نہیں۔

نیز فتاوی واحدی میں بھی یہ مسئلہ تحریر شدہ ہے کہ اس صورت میں قضا اور کفارہ دونوں واجب نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

الظاهر أنه لا كفارة عليه لعدم تحقق الجماع وهو إدخال الفرج بالفرج بعد طلوع الفجر، قال في الهداية: الجماع إدخال الفرج بالفجر وليس له دوام حتى يكون لدوامه حكم ابتدائه ... فذلک لا يجب القضاء بالنزع بعد الانتباه من النوم لأن المفسد هو الجماع ولم يوجد في النزع بعد الانتباه. (فتاوى الواحدى:جلداول:٣٢٤،كتاب الصوم).

واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ (tooth paste) استعمال کرنے کا حکم:

سوال: روزہ کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ (tooth paste) استعمال کرنے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

الجواب: روزہ کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ (tooth paste) کا استعمال بلاضرورتِ شدیدہ کراہت

سے خالی نہیں ،البتہ جب تک حلق سے نیچے نہ اترے روزہ فاسد نہیں ہوگا،بوقتِ ضرورت استعمال کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہوشامی میں ہے:

وكره له ذوق كل شيء وكذا مضغه بلا عذر... والظاهر أن الكراهة في هذه الأشياء تنزيهية. (الشامي:٢/٤١٦،سعيد).

آپ کے مسائل میں ہے:

ٹوتھ پیسٹ کا استعمال روزہ کی حالت میں مکروہ ہے تاہم اگر حلق میں نہ جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔(آپ کے مسائل اوران کاحل:۳/۱۹۱).

کتاب الفتاوی میں ہے:

پیسٹ میں ذائقہ ہوتا ہے اورروزہ کی حالت میں کسی بھی چیز کے ذائقہ کو چکھنا مکروہ ہے اس لیے روزہ کی حالت میں پیسٹ کرنے سے بچنا چاہئے،یہ کراہت سے خالی نہیں ہے۔کره ذوق شيء ومضغه بلاعذر۔بحر:٢/٢٧٩،(کتاب الفتاوی:۳/۳۹۹).

مزید ملاحظہ فرمائیں:اسلامی فقہ:۱/۳۸۸،روزہ کے مکروہات۔وفتاوی دارالعلوم:۶/۴۰۴،مدلل ومکمل).

لیکن چونکہ اس کا ذائقہ تر مسواک کی طرح دل اور پیٹ کے لیے مرغوب نہیں بلکہ دانتوں کی صفائی کا ذریعہ اور معاون ہے،لہذا اس کے استعمال پر زیادہ نکیر نہیں کرنی چاہئے،میرے خیال میں یہ مسواک کے ذائقے کی طرح ہے اوراس کو مکروہ کہنا قابل غور ہے۔

ملاحظہ ہو" فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء"میں مرقوم ہے:

حكم استعمال معجون الأسنان للصائم :

س: هل يجوز للصائم أن يستعمل معجون الأسنان وهو صائم في نهار رمضان ؟

ج: لا حرج في ذلك مع التحفظ عن ابتلاع شيء منه ،كما يشرع استعمال السواك للصائم في أول النهار وآخره. (مأخوذ من " مجلة المجمع الفقهي الاسلامي" : ٢٧٢،١٤٢٤هـ).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:
﴿فمن کان منکم مریضاً أو علی سفر فعدۃ من أیام أخر﴾
وعن عائشۃ رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہا قالت:
”کنا نحیض عند النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم
فیأمرنا بقضاء الصوم“
(رواہ ابن ماجہ)

باب ﴿٤﴾

قضا اور کفارہ کا بیان

باب......﴿۴﴾

قضا اور کفارہ کا بیان

سحری کے وقت منہ میں پان رکھ کر سو جانے سے قضا اور کفارہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے سحری کے وقت منہ میں پان رکھا اور سو گیا پھر طلوعِ فجر کے بعد اٹھا تو اس پر قضا اور کفارہ ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں روزہ فاسد ہو جائے گا اور صرف قضا واجب ہوگی اس لیے کہ کچھ نہ کچھ ذائقہ حلق میں گیا ہوگا، اور حالتِ نوم میں کھانے پینے سے صرف قضا ہے کفارہ لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وإن أفطر خطأً كان تمضمض فسبقه الماء أوشرب نائماً. (الدرالمختار:۲/۴۰۱،باب مایفسد الصوم ومالایفسده، سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

النائم إذا شرب فسد صومه. (الفتاوى الهندية:۱/۲۰۳).

مراقی الفلاح میں ہے:

باب ما يفسد الصوم ويوجب القضاء من غير كفارة... أوصب أحد في جوفه ماء وهو أي صائم نائم لوصول المفطر إلى جوفه كما لوشرب وهو نائم وليس كالناسي لأنه تؤكل ذبيحته وذاهب العقل والنائم لا تؤكل ذبيحتهما. (مراقي الفلاح:ص ۲۴۵، باب مايفسد الصوم من غير كفارة).

امدادالفتاویٰ میں ہے:

اگر سوتے وقت پان منہ میں لے کر سوئے اور صبح تک منہ میں رہا، روزہ جاتا رہے گا۔(امدادالفتاویٰ:۲/۲۰۳)

بہشتی زیور میں ہے:

منہ میں پان دبا کر سوگیا اور صبح ہوجانے کے بعد آنکھ کھلی تو روزہ نہیں ہوا قضا رکھے اور کفارہ واجب نہیں۔(بہشتی زیور: تیسرا حصہ:۱۲)۔واللہ ﷻ اعلم۔

کھانے یا جماع سے افطار کرنے پر تداخل کفارہ کا حکم:

سوال: بہشتی زیور کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر دو رمضان میں کسی نے کھانا کھایا تو ایک کفارہ کافی ہے اور اگر دو رمضان میں دو مرتبہ جماع کیا تو دو کفارے لازم ہیں، اور علامہ شامیؒ نے اس کی وجہ جنایت کا بھاری ہونا تحریر فرمایا ہے، کیا جماع اور کھانے میں فرق ہے یا دونوں کا حکم ایک ہے؟

الجواب: بعض محققین نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ دونوں صورتوں میں ایک ہی کفارہ لازم ہوگا، چاہے جماع ہو یا کھانا ہو دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

ملاحظہ فرمائیں، شیخ عبدالواحد سیوستانی فتاوی واحدی میں تحریر فرماتے ہیں:

الظاهر أن الأصح ما في مختصر الأجناس ويؤيده ما في السراجية إذا أفطر في رمضان مراراً يكفيه كفارة واحدة وكذا لو أفطر في رمضانين وهو الأصح. والإفطار كما تكون بسائر المفطرات فكذا بالجماع، فيدخل في قوله إذا أفطر كما لا يخفى... وصحح في متن مواهب الرحمن التداخل في صورة وجود الجماع في رمضانين أيضاً حيث قال: وكفت عندنا كفارة واحدة عن وطيات في أيام لم يتخلل بينهما تكفير ولو في رمضانين دون غيره على ما اختاره البعض للفتوىٰ.

آگے مصنف رحمہ اللہ فرق کرنے والوں کا قول بیان فرماتے ہیں:

وأما ما في الأشباه والعيني من الفرق بوجوب الكفارتين في صورة وجود الجماع في رمضانين فمتفرع على ما اختاره بعض من التداخل في غير الجماع فقط كما يستفاد من الدر المختار، بزازية، مجتبىٰ وغيرهما، واختار بعضهم للفتوىٰ أن الفطر بغير الجماع تداخل وإلا، لا، انتهىٰ. (فتاوی واحدی: ۳۲۳، باب ما یوجب الکفارۃ).

حاصل یہ ہے کہ دو رمضان میں قصداً کھانا کھائے یا دو رمضان میں دو جماع کرے ایک کفارہ ہوگا، ہاں اگر پہلی جنایت کا کفارہ ادا کر کے دوسرے رمضان میں بھی وہی جنایت کر لی تو دوبارہ کفارہ لازم ہوگا۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

بوسہ (French kiss) سے قضا اور کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کسی نے رمضان میں روزہ کی حالت میں ایک عورت کو بوسہ دیا تو کیا قضا لازم ہے یا کفارہ بھی؟ اور بوسہ سے (French kiss) مراد ہے یعنی "ادخال اللسان فی فم الغیر مع ابتلاع بزاق الغیر" عامۃً اس طریقہ پر ہوتا ہے کہ زبان کو چوسا جاتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے کا لعاب حلق سے نیچے اتر جاتا ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں بوسہ سے لعاب حلق سے نیچے نہ اترا ہو اور نہ انزال ہوا ہو تو یہ مکروہ ہے، اور اگر انزال ہو گیا تو قضا واجب ہے، اور اگر بیوی کا تھوک بھی حلق سے نیچے اتر گیا تو قضا اور کفارہ دونوں واجب ہے، چاہے انزال ہو یا نہ ہو۔

شامی میں ہے:

(قوله وكره قبلة الخ) جزم في السراج بأن القبلة الفاحشة بأن يمضغ شفتيها تكره على الإطلاق أي سواء أمن أو لا. (رد المحتار: ۲/٤۱۷، سعید، وهکذا فی الفتاوی الهندية: ۱/۲۰۰).

البحرالرائق میں ہے:

لو ابتلع الصائم ريق غيره فإن كان بزاق صديقه يجب عليه الكفارة وإن لم يكن صديقه يجب عليه القضاء دون الكفارة لأن الريق تعافه النفس وتستقذره إذا كان من غير صديقه فصار كالعجين ونحوه مما تعافه النفس وإن كان من صديقه لا تعافه فصار كالخبز ونحو ذلك مما تشتهيه النفس. (البحر الرائق: ۸/٤۸۰، مسائل شتیٰ، کوئته، وكذا فی االفتاوی الهندية: ۱/۲۰۳، والشامی ۲/٤۱٤).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اگر کوئی روزہ دار آدمی اپنے دوست یا اپنی بیوی کا لعاب یا تھوک نگل گیا تو اس کی وجہ سے قضاء بھی لازم ہوگی اور کفارہ بھی لازم ہوگا۔ **ومنه ابتلاع بزاق زوجته أو صديقه لأنه يتلذذ به ولا تلزم الكفارة ببزاق غيرهما لأنه يعافه.** مراقی الفلاح۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/۱۷۱، باب قضاء الصوم، مبوب ومرتب)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مزدور مجبوری میں افطار کرلے تو قضا اور کفارہ کا حکم:

سوال: ایک شخص ماہِ رمضان میں سخت کام کی مزدوری کررہا تھا، مالک چھٹی نہیں دیتا تھا، اتنی شدید پیاس لگی کہ برداشت سے باہر جس میں ہلاکت یا پاگل پن کا خطرہ تھا اس نے افطار کرلیا تو اس پر قضا اور کفارہ ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں شخصِ مذکور پر صرف قضا واجب ہے کفارہ واجب نہیں، اس لیے کہ سخت مجبور تھا، اور حالتِ مجبوری میں افطار کرنے سے کفارہ لازم نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

الأعذار التي تبيح الإفطار ... ومنها العطش والجوع كذلک، إذا خيف منهما الهلاک أو نقصان العقل كالأمة إذا ضعفت عن العمل وخشيت الهلاک بالصوم وكذا الذي ذهب به موكل السلطان إلى العمارة في الأيام الحارة إذا خشي الهلاک أو نقصان العقل. (الفتاوی الهندية: ۱/ ۲۰۷ ـ وكذا فی فتح القدير: ۲/ ۲۷۲، دارالفكر).

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو ہلاکت کا خوف یا پاگل ہونے کا خطرہ ہے یا باندی کام کرتی ہے اور ہلاکت کا خوف ہے تو اس کے لیے افطار کی گنجائش ہے اور بعد میں قضا کرلے۔

نیز عالمگیری میں ہے:

ومنها المرض:۔ المريض إذا خاف على نفسه التلف أو ذهاب عضو يفطر بالإجماع وإن خاف زيادة العلة وامتداده فكذلک عندنا وعليه القضاء إذا أفطر كذا في المحيط. (الفتاوی الهندية: ۱/ ۲۰۷).

بہشتی زیور میں ہے:

اگر ایسی پیاس لگی یا ایسی بھوک لگی کہ ہلاکت کا ڈر ہے تو بھی روزہ توڑ ڈالنا درست ہے۔ (بہشتی زیور: تیسرا حصہ: ۱۷، باب دہم)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نفل روزہ کے درمیان حیض آجانے سے قضا کا حکم:

سوال: ایک عورت نے نفل روزہ رکھا، درمیان میں حیض لاحق ہوا تو اس روزہ کی قضا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں قضاواجب ہے۔

ملاحظہ ہوفتاوی ہندیہ میں ہے:

ومن دخل في صوم التطوع ثم أفسده قضاه ... سواء حصل الفساد بصنعه أو بغير صنعه حتى إذا حاضت الصائمة المتطوعة يجب القضاء في أصح الروايتين. (الفتاوى الهندية: ۲۱۵/۱).

درمختار میں ہے:

ولو شرعت تطوعاً فيهما أي في الصلاة والصوم ... فحاضت أي في اثنائهما قوله قضتهما للزومهما بالشروع. (الدرالمختار مع الشامي: ۲۹۱/۱، باب الحيض، سعيد).

احسن الفتاوی میں ہے:

اس روزہ کی قضاواجب ہے۔(احسن الفتاوی: ۴۳۸/۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

صیامِ کفارہ کے درمیان حیض آنے سے کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت کو کفارہ کے روزوں کے درمیان حیض شروع ہو گیا تو اب ازسرِنو شروع کرے؟

الجواب: صیامِ کفارہ کے درمیان ماہواری شروع ہونے سے روزوں میں فصل مضرنہیں ،جیسے ہی ماہواری ختم ہوفوراً روزے شروع کردے،لیکن اگر ماہواری ختم ہونے کے بعدایک دن کا بھی فصل کیا تو پھر ازسرِنو شروع کرنا لازم ہوگا۔

ملاحظہ ہوفتاوی ولوالجیہ میں ہے:

وإذا كان على الرجل صيام شهرين متتابعين بقتل، أوظهار، أوكفارة فطر، فصامها وأفطر يوماً للمرض فعليه الاستقبال، فرق بين هذا وبينما إذا كانت امرأة فأفطرت فيما بين ذلك للحيض لم يكن عليها الاستقبال، والفرق وهو أن المرأة لا تجد شهرين في العادة لاحيض فيها، فلو انقطع التتابع بالحيض لم تقدر على الأداء فلم ينقطع التتابع بخلاف المريض والمريضة لأنهما يجدان شهرين لايمرض فيهما عادة، لكن إذا طهرت تصل بما مضى لأنها قدرت على الأصل، فإن لم يصل استقبلت لأن الأصل هو الوصل وإنما تركت البعض بحكم الحيض ولاعذر فيما وراء الحيض. (الفتاوى الولوالجية: ۲۲۶/۱،في كيفية الكفارة وترتيبها،بيروت).

مزید ملاحظہ ہو: شامی:۲/۴۱۲،سعید۔وحاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح:ص۶۷۰،فصل فی الکفارة، قدیمی۔واحسن الفتاوی:۴/۴۴۱)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

نفل روزہ توڑ دینے سے قضا کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے نفل روزہ زوال سے پہلے توڑ دیا تو قضا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں قضا لازم ہے۔

ملاحظہ ہو النہر الفائق میں ہے:

وللمتطوع الفطر أيضاً... ويقضي يوماً مكان قال في الفتح لاخلاف بين أصحابنا في وجوب القضاء إذا أفسد عن قصد أو غير قصد . (النهرالفائق:۲/۳۳).

البحر الرائق میں ہے:

قوله وللمتطوع بغيرعذر في رواية ويقضي أي له الفطر بعذر وبغيره وإذا أفطر قضى.

(البحرالرائق:۲/۲۸۷،فصل فی العوارض،کوئٹه)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
”من صام من کل شہر ثلاثة أیام فذلک صیام الدھر
فأنزل اللہ تبارک وتعالیٰ تصدیق ذلک في کتابه:
﴿من جاء بالحسنة فله عشر أمثالھا الیوم بعشرۃ أیام﴾“

(رواہ الترمذي)

باب……﴿۵﴾

نفل روزوں کا بیان

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
”تعرض الأعمال یوم الإثنین ویوم الخمیس
فأحب أن یعرض عملي وأنا صائم“

(رواہ الترمذي)

باب ......﴿۵﴾
نفل روزوں کا بیان

شوال کے شش روزوں کا حکم:

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شوال کے چھ روزے رکھنے کا ثبوت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو جس کام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا، وہ ہمارے لیے کیسے مستحب ہوگا؟

الجواب: شوال کے شش روزے مذہبِ احناف میں مستحب ہیں، اور استحباب کے ثبوت کے لیے فعلی روایات ضروری نہیں ہے، قولی روایت بھی کافی ہے، اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً: اذان سنت مؤکدہ ہے، لیکن فعلاً ثابت نہیں ہے صرف قولاً ثابت ہے، صومِ داودی کی فضیلت بھی صرف قولاً ثابت ہے، رمضان المبارک میں عمرہ کی فضیلت قولاً ثابت ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رمضان المبارک میں عمرہ نہیں فرمایا، بلکہ بعض مرتبہ فعلی امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہوتے ہیں، جیسے بغیر مہر کے نکاح، چار سے زائد نکاح وغیرہ، یہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے، امت کے دیگر افراد کے لیے روا نہیں ہے، اس کے برخلاف قولی امور امت کے لیے ہوتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

فاعلم أن الفضائل والرغائب لا تنحصر فيما ثبت فيه فعله صلى الله عليه وسلم فقط، فإن النبي صلى الله عليه وسلم كان يخص لنفسه أموراً تكون أليق بشأنه وأحرى لمنصبه وإذ لم يستوعب الفضائل كلها عملاً وجب أن يرغب فيها قولاً لتعجل بها الأمة فمنها:

صلاة الضحیٰ فإنه إذا لم يعمل بها بمعنى أنه لم يجعلها وظيفة له دل على فضلها قولاً لتعمل بها أمته وتحرز الأجر، ألا ترىٰ أنهم تكلموا في ثبوت الأذان من النبي صلى الله عليه وسلم فعلاً مع كونه من أفضل الأعمال فالفضل لاينحصر فيما ثبت فعله منه فإن كلاً يختار لنفسه ما ناسب شأنه ومن هذا الباب رفع اليدين بعد الصلوات للدعاء قل ثبوته فعلاً وكثر فضله قولاً فلا يكون بدعة أصلاً، فمن ظن أن الفضل فيما ثبت عمله صلى الله عليه وسلم به فقط فقد حاد عن طريق الصواب وبنىٰ أصلاً فاسداً. (فيض الباری:۲/۴۳۱،باب صلاة الضحی فی السفر، مطبعه حجازی بالقاهرة).

شیخ عبد الفتاح ابوغدہ صاحبؒ نے بھی حضرت شاہ صاحب کی اس عبارت سے استدلال فرمایا ہے، چنانچہ عبارت ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

قال: في حديث المطلب بن أبي وداعة المذكور برقم ۱۵ ص ۳۲، وإن لم يثبت بعد المكتوبة، من فعله، نظراً إلى عامة الأحاديث الواردة بعد الصلوات المكتوبة، فقد سكتت عن ذكر الرفع، ولكن حديث عبد الله بن الزبير رضي الله عنه الآتي في ص۱۳۸، يكفي لإثبات أن الرفع في الدعاء بعد الصلوات المكتوبة كان من هدي النبي صلى الله عليه وسلم أيضاً فإذا ثبت جنسه لم يكن بدعة أصلاً، مع ورود القولية في فضله عامة. (حاشية الشيخ عبد الفتاح على رسالة "سنية رفع اليدين فی الدعاء بعد الصلوات المكتوبة "ص ۱۳۰، حلب).

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا خصوصی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً ثابت نہیں ہے، لیکن عمومی قولی روایات سے دعا میں ہاتھ اٹھانے کا ثبوت ملتا ہے، لہذا قولی روایات کافی ہیں۔ (لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے عملاً بھی دعا بعد الصلاۃ میں رفع الیدین ثابت ہے)۔

رمضان میں عمرہ کی فضیلت قولاً ثابت ہے۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث میں ہے:

عن أم معقل عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: عمرة في رمضان تعدل حجة. (رواه الترمذی:۱/۱۸۶)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

احادیث، کتبِ فقہ اور فتاویٰ کی روشنی میں شوال کے شش روزوں کی تحقیق:

سوال: شوال کے چھ روزوں سے متعلق احادیث اور کتبِ فقہ سے تحقیق درکار ہے؟

الجواب: شوال کے چھ روزوں کی فضیلت احادیث سے ثابت ہے۔

ملاحظہ فرمائیں چند احادیث درجِ ذیل ہیں:

(۱) عن أبي أيوب الأنصاري ﷺ أنه حدثه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "من صام رمضان ثم أتبعه ستاً من شوال كان كصيام الدهر. (رواه مسلم:۱/۳۶۹،باب استحباب صوم من ستة شوال۔والترمذی:۱/۱۵۸،باب ماجاء فی صیام ستة ایام من شوال۔وابوداود:۱/۳۳۰،باب فی صوم ستة ایام من شوال۔وابن ماجة:۱/۱۲۳).

(۲) عن ثوبان مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: " من صام ستة أيام بعد الفطر كان تمام السنة من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها. (رواه ابن ماجة:۱/۱۲۳،باب ستة ایام من شوال).

(۳) عن ابن عمر ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " من صام رمضان و أتبعه ستاً من شوال، خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه. (اخرجه الطبرانی فی الاوسط:۸/۲۷۵/۸۶۲۲) واخرجه البیهقی فی سننه الکبری:۴/۲۹۲۔والنسائی فی الکبری:۲/۱۶۳۔والطبرانی فی الکبیر:۲/۱۲۵۔والبیهقی فی شعب الایمان:۸/۲۴۵۔وابوعوانة:۶/۳۶،باب بیان ثواب من صام رمضان۔وابن خزیمة:۷/۴۸۰،جماع ابواب صوم التطوع۔وابوداود الطیالسی:۲/۱۲۵۔واحمد:۵/۲۹۷،حدیث ابی ایوب الانصاریؓ۔والدارمی:۵/۲۹۷،باب فی صیام الستة من شوال).

نیز فقہاء نے بھی ان روزوں کو مستحب قرار دیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں مراقی الفلاح میں ہے:

وأما القسم الرابع وهو المندوب....ومنه صوم ست من شهرشوال.... (مراقی الفلاح:۲۳۰،کتاب الصوم،بیروت).

شامی میں ہے:

قال صاحب الهداية في كتابه التجنيس: أن صوم الستة بعد الفطر متتابعة منهم من كرهه، والمختار أنه لا بأس به لأن الكراهة إنما كانت لأنه لا يؤمن من أن يعد ذلك من

رمضان فيكون تشبهاً بالنصارى والآن زال ذلك المعنى ، ومثله في كتاب النوازل لأبي الليث، والواقعات للحسام الشهيد، والمحيط البرهاني ، والذخيرة ، وفي الغاية عن الحسن بن زياد: أنه كان لا يرى بصومها بأساً ويقول كفىٰ بيوم الفطر مفرقاً بينهن وبين رمضان ، وفيها أيضاً عامة المتأخرين لم يروا به بأساً، ...وتمام ذلك في رسالة " تحرير الأقوال في صوم الست من شوال " للعلامة قاسم وقد رد فيها على ما في منظومة التباني وشرحها من عزوه الكراهة مطلقاً إلى أبي حنيفةؒ وأنه الأصح بأنه على غير رواية الأصول وأنه صحح ما لم يسبقه أحد إلى تصحيحه وأنه صحح الضعيف وعمد إلى تعطيل ما فيه الثواب الجزيل بدعوى كاذبة بلا دليل ثم ساق كثيراً من نصوص كتب المذهب فراجعها فافهم. (الدرالمختار مع الشامي:۲/ ٤٣٥ ،مطلب في صوم الست من شوال،سعيد).

بدائع الصنائع میں ہے:

والإتباع المكروه هو أن يصوم يوم الفطر ويصوم بعده خمسة أيام، فأما إذا أفطر يوم العيد ثم صام بعده ستة أيام فيلس بمكروه ، بل هو مستحب وسنة. (بدائع الصنائع:۲/ ۷۸،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

عامة المتأخرين لم يروا به بأساً هكذا في البحر الرائق، والأصح أنه لابأس به كذا في محيط السرخسي، وتستحب الستة متفرقة كل أسبوع يومان كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية:١/ ٢٠١ ـوكذا في فتاوى قاضيخان على هامش الهندية:١/ ٢٠٦ ـ و البحرالرائق: ٢/ ٢٥٨).

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

شوال کے چھ روزے شش عید کے نام سے مشہور ہیں، درمختار میں لکھا ہے کہ متفرق رکھنا ان کا بہتر اور مستحب ہے اور پے در پے رکھنا بھی مکروہ نہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم:۶/ ۴۹۱،مدلل ومکمل،دارالاشاعت).

اسلامی فقہ میں ہے:

شوال کے مہینہ میں چھ روزے رکھنا بھی سنت ہے۔ (اسلامی فقہ:۱/ ۴۱۷،نفل روزے).

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''اعلاء السنن'' (۹/ ۱۷۷) میں ان چھ روزوں کو مستحب قرار دیتے ہوئے ایک باب ''باب استحباب صيام ستة من شوال'' قائم کر کے حدیث ذکر فرمائی ہے۔

موجودہ دور کے مشہور محقق وفقیہ ''الدکتور وھبۃ الزحیلی'' نے اپنی کتاب ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ان

روزوں کو جو بالاتفاق بین الائمۃ مستحب ہیں، گنتے ہوئے نمبر چار میں شوال شوال کے چھ روزوں کو ذکر کیا ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان روزوں کے استحباب پر چاروں مذاہب کے علماء متفق ہیں۔

مذکورہ کتاب کی عبارت ملاحظہ فرمائیں: **وأيام صوم التطوع بالاتفاق ما يلي : ١ ... ٢ ... ٣ ... ٤ ـ صوم ستة أيام من شوال ، ولو متفرقة .** (الفقه الاسلامي وادلته :٢/ ٥٨٨ـ٥٨٩،النوع الرابع، صوم التطوع،دارالفکر)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ رحیمیہ:۱۶/۲،شوال کے چھ روزے۔ وبہشتی زیور:۱۰/۳،نفل روزے کا بیان۔ وعمدۃ الفقہ: ۱۸۶/۳،مستحب روزے۔ کتاب الفتاویٰ:۴۴۲/۳،شوال کے چھ روزوں کا حکم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

امام صاحب کی طرف کراہت کی نسبت کا مطلب:

سوال: امام صاحب کی طرف کراہت کی نسبت ہے، اور یہ بات بھی طے ہے کہ عبادات میں امام صاحبؒ کا قول لینا چاہئے، اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: محققین فقہاء نے کراہت کی تردید فرمائی ہے، اور امام صاحب سے کراہت والا قول غیر ثابت قرار دیا ہے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ اس مسئلہ پر مفصل بحث کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

... وتمام ذلک في رسالة "تحرير الأقوال في صوم الست من شوال" للعلامة قاسم وقد رد فيها على ما في منظومة التباني وشرحها من عزوه الكراهة مطلقاً إلى أبي حنيفةؒ وأنه الأصح بأنه على غير رواية الأصول، وأنه صحح ما لم يسبقه أحد إلى تصحيحه وأنه صحح الضعيف وعمد إلى تعطيل ما فيه الثواب الجزيل، بدعوى كاذبة بلا دليل، ثم ساق كثيراً من نصوص كتب المذهب، فراجعها فافهم.

(فتاوى الشامی:٢/ ٤٣٥،مطلب فی صوم الست من شوال،سعید)

نیز علامہ یوسف بنوریؒ نے بھی کراہت والے قول کو صیغۂ تمریض سے بیان فرمایا ہے۔

ملاحظہ ہو معارف السنن میں ہے:

نسب إلى أبي حنيفةؒ ومالکؒ كراهتها ، وإلى الشافعيؒ وأحمدؒ استحبابها، والنقول التي حكاها المتأخرون من ابن نجيمؒ والكمالؒ وابن الكمالؒ، وغيرهم من علمائنا مضطربة، ولكن أفرد هذا الموضوع المحقق العلامة قاسم بن قطلوبغا برسالة خاصة سماها" تحرير

الأقوال في صوم الست من شوال" وحقق من نصوص المذهب استحبابها عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ. (معارف السنن:٥/٤٤٣،سعيد۔وکذا فی اعلاء السنن:٧/١٧٧۔١٧٨،ادارة القرآن)۔

رہی یہ بات کہ عبادات میں امام صاحب کا قول لینا چاہئے، یہ ہر جگہ متعین نہیں ہے، بلکہ جو حدیث کے موافق ہو اس کو لینا چاہئے، چنانچہ فقہاء کی تحریرات میں بھی یہ بات موجود ہے کہ کوئی فقہی مسئلہ حدیث کے موافق ہو تو اس سے عدول نہیں کرنا چاہئے، یعنی فتویٰ کے لیے اسی روایت کو اختیار کرنا چاہئے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

قال في شرح المنية: ولا ينبغي أن يعدل عن الدراية إذا وافقتهارواية على ما تقدم عن فتاوى قاضيخان، ومثله ماذكرفي القنية من قوله: وقد شدد القاضي الصدر في شرحه في تعديل الأركان جميعها تشديداً بليغاً فقال: وإكمال كل ركن واجب عند أبي حنيفةؒ ومحمدؒ. وعند أبي يوسفؒ والشافعيؒ فريضة، فيمكث في الركوع والسجود وفي القومة بينهماحتى يطمئن كل عضومنه، هذا هوالواجب عند أبي حنيفةؒ ومحمدؒ حتى لوتركها أو شيئاً منها ساهياً يلزمه السهوولوعمداً يكره أشد الكراهة ... والحاصل أن الأصح رواية ودراية وجوب تعديل الأركان وأما القومة والجلسة وتعديلهما فالمشهورفي المذهب السنية، وروي وجوبهما وهوالموافق للأدلة وعليه الكمال ومن بعده من المتأخرين وقد علمت قول تلميذه أنه الصواب. (شامی:١/٤٦٤،مطلب لاينبغی ان يعدل عن الدراية اذاوافقتهارواية،سعيد)۔

نیز اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: فتاوی دار العلوم زکریا جلد دوم ص۵۴۹، نمازِ جمعہ کا بیان۔واللہ ﷻ اعلم۔

عالمگیری وغیرہ میں "لابأس" کا مطلب:

سوال: عالمگیری وغیرہ میں "لا بـــأس" کہا گیا ہے جو خلافِ اولیٰ کے لیے بولا جاتا ہے، پس معلوم ہوا کہ خلافِ اولیٰ یعنی مکروہ ہے اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: عالمگیری وغیرہ کی عبارت میں " لا بـــأس "کا مطلب کراہت اور خلافِ اولیٰ نہیں ہے، بہت سی جگہوں میں " لا بأس " مندوبات میں بھی استعمال ہوتا ہے، علامہ ابن نجیمؒ اور علامہ شامیؒ نے متعدد جگہوں پر اس کی صراحت کی ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

کلمة "لا بأس" قد تستعمل في المندوب ، كما في البحر من الجنائز والجهاد.

(شامی:۲/۱۸۰،سعید۔و ۱/۱۱۹،سعید۔والبحرالرائق:۵/۱۹۲،کوئٹہ)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

امام مالکؒ نے بھی مکروہ فرمایا ہے اس کا مطلب:

سوال: امام مالکؒ نے بھی شوال کے شش روزوں کومکروہ فرمایا ہے اس کی کیا توجیہ ہے؟

الجواب: علامہ ابن عبدالبرؒ نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ امام مالکؒ نے مکروہ اس لیے کہا کہ جاہل لوگ اس کو لازم اور ضروری نہ سمجھ لیں۔ ورنہ مالکیہ کے فروع میں شوال کے چھ روزوں کومستحبات میں سے لکھا ہے ہاں اگر عید کے بعد متصلاً رکھے جائیں تو مکروہ ہے۔

ملاحظہ ہو الاستذکار میں ہے:

وأما صيام الستة من شوال على طلب الفضل وعلى التأويل الذي جاء به ثوبان ﷺ، فإن مالكاً لا يكره ذلك إنشاء الله ، لأن الصوم جنة وفضله معلوم...ومالك لايجهل شيئاً من هذا ، ولم يكره من ذلك إلا ما خافه على أهل الجهالة والجفاء إذا استمر ذلك ، وخشي أن يعدوه من فرائض الصيام مضافاً إلى رمضان ، وما أظن مالكاً جهل الحديث،والله أعلم.

(الاستذکار:۳/۳۸۰،باب جامع الصيام،دارالكتب العلمية، بيروت).

الدرالثمین میں ہے:

والمستحب: الأشهر الحرم، وصيام شعبان، وعشر ذي الحجة...وستة من شوال لفضلها. (الدرالثمين لابن عاشر:۳۲٤،دارالفكر۔وبداية المجتهد:۲۲۵،كتاب الصيام الثانی،وهو المندوب اليه)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

محرم کے دسویں کے ساتھ گیارہویں روزہ کا حکم:

سوال: اگر کسی نے نویں کو روزہ نہیں رکھا بلکہ دسویں اور گیارہویں کو رکھا تو کیا حکم ہے؟

الجواب: محرم کی دسویں کو صرف ایک روزہ رکھنا مکروہ ہے، لیکن اس کے ساتھ نویں یا گیارہویں کو رکھ لے تو کراہت نہیں رہتی، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بلا کراہت سنت ادا ہوگئی۔

ملاحظہ ہو مراقی الفلاح میں ہے:

وأما القسم الثالث: وهو المسنون فهو صوم عاشوراء فإنه يكفر السنة الماضية مع صوم التاسع لصومه صلى الله عليه وسلم، وقال: لئن بقيت إلى قابل لأصومن التاسع، وفي الطحطاوي: قوله مع صوم التاسع، أي أو الحادي عشر لما يأتي للمصنف فتنتفي الكراهة بضم يوم قبله أوبعده. (مراقی الفلاح مع حاشية الطحطاوی:ص۶۳۹، قدیمی).

مرقات میں ہے:

قال التوربيشتي: قيل: أريد بذلك أن يضم إليه يوماً آخر ليكون هديه مخالفاً لأهل الكتاب وهذا هو الوجه، لأنه وقع موقع الجواب لقولهم إنه يوم يعظمه اليهود...وقال ابن الهمامؒ: يستحب صوم يوم عاشوراء ويستحب أن يصوم قبله يوماً أو بعده يوماً فإن أفرده فهو مكروه للتشبه باليهود، وروى أحمد خبراً "صوموا يوم عاشوراء وخالفوا اليهود وصوموا قبله يوماً وبعده يوماً" وظاهره أن الواو بمعنى أو لأن المخالفة تحصل بأحدهما.

(مرقات:۴/۲۸۸،باب صيام التطوع،ملتان).

درمختار میں ہے:

والمكروه تنزيهاً كعاشوراء وحده...وفي الشامي:أي مفرداً عن التاسع أو عن الحادي عشر، إمداد، لأنه تشبه باليهود، محيط. (الدر المختار مع الشامی:۲/۳۷۵،سعید)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

صرف دس محرم کے روزے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے صرف عاشوراء کا روزہ رکھا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: صرف عاشورہ یعنی دس محرم کا روزہ رکھنا مکروہ تنزیہی ہے، لیکن اس کے باوجود ثواب مل جائے گا، ہاں علامہ ابوبکر کاسانیؒ نے فرمایا کہ عام حضرات نے بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وكره بعضهم صوم يوم عاشوراء وحده، لمكان التشبه باليهود، ولم يكرهه عامتهم، لأنه من الأيام الفاضلة فيستحب استدراك فضيلتها بالصوم. (بدائع الصنائع:۲/۷۹، سعید).

فتح القدیر میں ہے:

والمكروه تنزيهاً عاشوراء مفرداً عن التاسع. (فتح القدير:۲/ ۳۰۳،دارالفكر۔وكذا في امدادالفتاح:ص ٦٥٦،بيروت۔والدرالمختارمع الشامي:۲/ ۳۷۵،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

عاشورہ کے فقط ایک روزہ پر کفایت کرنا مکروہ ہے،لیکن ثواب اس کا بھی مل جائے گا۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۰/۱۹۳، مبوب ومرتب)۔واللہ ﷻ اعلم۔

دوشنبہ اور پنجشنبہ کے روزے کی فضیلت وحکم:

سوال: پیر اور جمعرات کے روزے کی کیا فضیلت ہے،اور اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: پیر اور جمعرات کے روزے کی فضیلت حدیث سے ثابت ہے،لہذا مستحب ہے،حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پیر اور جمعرات کے دن انسانوں کے اعمال خداوند قدوس کے حضور پیش کیے جاتے ہیں،تو میں پسند کرتا ہوں کہ روزہ کی حالت میں میرے اعمال پیش کیے جائیں۔

ملاحظہ فرمائیں ترمذی شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: تعرض الأعمال يوم الإثنين والخميس فأحب أن يعرض عملي وأنا صائم. قال أبوعيسىٰ: حديث أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه في هذا الباب حديث حسن غريب. (ترمذی شريف:۱/ ۱۵۷،باب ماجاء في صوم يوم الاثنين والخميس).

وأيضاً روى ابن ماجة عن ابي هريرة ص:۱۲٤، وابوداود عن اسامة بن زيد:۱/ ۳۳۱، والطبراني عن جابرؓ۔ (الترغيب والترهيب:۲/ ۱۲۵).

دوسری روایت میں ہے کہ پیر کے دن آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی ولادت باسعادت ہوئی۔

ملاحظہ ہو ابوداود شریف میں ہے:

عن أبي قتادة رضي الله تعالىٰ عنه قال: يارسول الله أرأيت صوم الإثنين ويوم الخميس قال: فيه ولدت وفيه أنزل على القرآن. (رواه ابوداود:۱/ ۳۲۹۔وكذا في مسنداحمد:٥/ ۲۹٦/ ۲۲٥۹۰).

صحیح مسلم شریف میں ہے:

قال: سئل عن صوم الإثنين قال: " ذاک يوم ولدت فيه ويوم بعثت أو أنزل علي فيه".

(رواہ مسلم:۳/۱٦۷/۲۸۰٤۔وکذا فی مسنداحمد:۵/۲۹٤/۲۲۵۹٤).

خلاصہ یہ ہے کہ پیر اور جمعرات کا روزہ مستحب ہے، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا اور بعض صحابہ سے بھی یہ عمل ثابت ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایام بیض کے روزوں کی فضیلت وحکم:

سوال: ایام بیض کے روزوں کی کیا فضیلت ہے اور ان کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ایام بیض یعنی ہر قمری ماہ کے تین دن، تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخ کے روزے ہیں، ان تاریخوں کی راتوں میں چاند کے کامل ہونے اور بہت روشن ہونے کی وجہ سے ان دنوں کو ایام بیض یعنی ایام لیالی بیض کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر ماہ کے تین روزے صیام الدہر کی مانند ہیں، نیز ان میں دو سنتیں جمع ہو جاتی ہیں، ایک تو ہر ماہ کے تین روزے جن کا تذکرہ روایات میں آتا ہے، اور ان روزوں کو ایام بیض میں رکھنا۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن موسى بن طلحة قال: سمعت أباذر رضي الله تعالىٰ عنه يقول : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : "يا أباذر إذا صمت من الشهر ثلا ثة أيام فصم ثلٰث عشرة وأربع عشرة وخمس عشرة، قال أبوعيسى : حديث أبي ذر رضي الله تعالىٰ عنه حديث حسن وقد روي في بعض الحديث أن من صام ثلا ثة أيام من كل شهر كان كمن صام الدهر حدثنا هناد...عن أبي ذر رضي الله تعالىٰ عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" من صام من كل شهر ثلا ثة أيام فذلک صيام الدهر، فأنزل الله تبارک وتعالىٰ تصديق ذلک في كتابه :﴿ من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها﴾ اليوم بعشرة أيام " قال أبوعيسى: هذا حديث حسن. (ترمذی شریف:۱/۱۵۹،باب ماجاء فی صوم ثلاثة من کل شهر۔ورواہ النسائی:برقم ۲٤۲۱۔وابن ماجة:برقم۱۷۷۹).

نیز فقہاء نے بھی مستحب قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو امداد الفتاح میں ہے:

وأما القسم الرابع وهو المندوب فهو صوم ثلا ثة أيام من كل شهر ليكون كصيام جميعه من جاء بالحسنة فله عشرة أمثالها، كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم "يصوم ثلا ثة أيام من الشهر الإثنين والخميس والإثنين من الجمعة الأخرىٰ "رواه أبوداود، و يندب كونها أي: الثلا ثة، الأيام البيض وهي الثالث عشر والرابع عشر والخامس عشر سميت بذلک لتكامل ضوء الهلال ، وشدة البياض فيها لما في أبي داود كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم " يأمرنا أن نصوم البيض ثلاث عشرة وأربع عشرة وخمس عشرة قال: وقال: هو كهيئة الدهر، كصيام الدهر. (اخرجه ابوداود فی الصيام باب : فی صوم الثلاث من كل شهر (٢٤٤٩) **وفي "النسائي" كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لا يفطر الأيام البيض لا في حضر ولا في سفر.** (اخرجه النسائی فی الصيام ،باب : (٧٠) (٢٣٤٤)۔ (امدادالفتاح مع الحاشية:ص٦٥٥ ،اقسام الصوم، بيروت۔ و كذا فی حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح:ص٦٣٩ ،فصل فی صفة الصوم، قديمی)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

صرف جمعہ کو نفل روزہ رکھنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص جمعہ ہی کا روزہ رکھے آگے پیچھے نہ رکھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا جمعہ کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا، اس لیے فقہاء نے تنہا جمعہ کو روزہ رکھنا مکروہِ تنزیہی قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم :" لا يصوم أحدكم يوم الجمعة إلا أن يصوم قبله أوبعده " قال أبوعيسى: حديث أبي هريرة رضي الله عنه حديث حسن صحيح. (ترمذی شريف:١/١٥٧، باب ماجاء فی كراهية صوم يوم الجمعة وحده).

وعلى هامش الترمذي : قال الشيخ في اللمعات: نهى عن صومه لئلا يحصل له ضعف يمنعه عن إقامته وظائف الجمعة وأورادها وهذا الوجه اختاره النوويؒ انتهىٰ، وقيل: علة النهي ترک موافقة اليهود في يوم واحد من أيام الأسبوع يعني عظمت اليهود السبت فلا تعظموا الجمعة خاصة بصيام وقيام وقيل: غير ذلک . (رقم الحاشية: ۳)۔

مسند احمد میں ہے:

عن زياد الحارثي قال: سمعت أبا هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال له رجل: أنت الذي تنهى الناس عن صوم يوم الجمعة قال: فقال: ها ورب الكعبة ها ورب الكعبة ثلا ثاً لقد سمعت محمداً صلى الله عليه وسلم يقول:" لا يصوم أحدكم يوم الجمعة وحده إلا في أيام معه ". (مسندالامام احمد:مسندابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ رقم ۱۱۰۹۲).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قوله وكره إفراد يوم الجمعة إلا أن يضم إليه يوماً قبله، أو يوماً بعده كما في الحديث، واعلم أنه ثبت بالسنة طلب صومه، والنهي عنه، والأخيرمنهما النهي كما وضحه في شرح الجامع الصغير للسيوطي، وذلک لأن فيه وظائف فلعله إذا صامه ضعف عن فعلها، وعد في الدر صومه من المندوب، والمعتمد ما هنا، قوله لا تخصوا ليلة الجمعة ...النهي للتنزيه. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح:ص ٦٤٠،فصل فی صفة الصوم وتقسيمه،قديمی۔وكذا فی امدادالفتاح:ص٦٥٧،اقسام الصوم،بيروت۔وحاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:۱/٤٤١،كوئٹه۔ والشامی:۲/۳۷٥،سعيد)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

۱۵ شعبان کے روزہ کا حکم:

سوال: ۱۵ شعبان کا روزہ مستحب ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کہاں سے ثابت ہے؟

الجواب: ۱۵ شعبان کا روزہ رکھنا مستحب ہے، اور حدیث سے ثابت ہے اگرچہ حدیث ضعیف ہے لیکن فضائل میں بلا اعتقادِ سنیت عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی شرائط کی تفصیلات رسالہ" الجزء اللطيف في الاستدلال بالحديث الضعيف" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں:

عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا نهارها، فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا، فيقول: ألا من مستغفر لي فأغفرله، ألا مسترزق فأرزقه، ألا مبتلى فأعافيه ألا كذا، ألا كذا حتى يطلع الفجر. (رواه ابن ماجة:ص۹۹، باب ماجاء فی ليلة النصف من شعبان۔والبيهقی فی

شعب الایمان:۳/۳۷۸/۳۸۲۲،ماجاء فی لیلة النصف من شعبان)۔

پورے ذخیرۂ احادیث میں صرف ایک حدیث موجود ہے جس سے ۱۵ شعبان کے روزہ کا پتہ چلتا ہے،لیکن اس حدیث پر محدثین نے بہت کچھ کلام فرمایا ہے،مستقل رسائل بھی تحریر فرمائے ہیں اس کے باوجود اس کو موضوع نہیں کہا جا سکتا۔

ملاحظہ فرمائیں محدثِ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی فرماتے ہیں:

پندرھویں شعبان کے روزے کے بارے میں جو حدیث ابن ماجہ میں آئی ہے وہ موضوع نہیں ہے کسی ماہر حدیث نے اس کو موضوع نہیں کہا ہے،''تحفۃ الاحوذی'' کی عبارت سے اس حدیث کے موضوع ہونے پر استدلال کرنا کرنا جہالت ہے،اس حدیث کے راویوں میں ابو بکر بن ابی سبرہ ضرور ہے اور اس کی نسبت بیشک یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حدیثیں بناتا تھا،لیکن اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زیر بحث حدیث اس کی بنائی ہوئی ہے اور موضوع ہے،محض اس بنا پر کہ سند میں ایسا کوئی راوی موجود ہے جو حدیثیں بناتا تھا کسی حدیث کو موضوع کہدینا جائز نہیں ہے،اس سے تو بس اتنا لازم آئے گا کہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔(مجلّہ المآثر ص ۶۹۔۷۰، ۱۹۹۵ء)۔

نیز موضوع کہنے والوں کی سخت تردید فرمائی ہے۔مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:(مجلّہ المآثر ص ۶۸۔۷۴، ۱۹۹۵ء)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

المرغوبات من الصيام أنواع أولها صوم المحرم، والثاني صوم رجب، والثالث صوم شعبان...(الفتاوی الهندية:۱/۲۰۲)۔

اسلامی فقہ میں ہے:

شعبان کی ۱۵/ تاریخ کو اور شوال کے مہینہ میں چھ روزے رکھنا بھی سنت ہے،شعبان کی پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھنے اور پندرھویں رات کو عبادت کرنے اور قبرستان جا کر مردوں کے لیے دعائے مغفرت کرنے کا بھی ذکر حدیث میں ہے۔(اسلامی فقہ:۱/۴۱۷)۔

مفتی تقی صاحب تحریر فرماتے ہیں: پندرھویں شعبان کے روزے کے استحباب پر علمائے کرام کی تصریحات؛

علماء حنفیہ: ☆ حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

پندرھویں تاریخ شعبان کو روزہ رکھنا مستحب ہے۔(زوال السنۃ:ص ۱۰)۔

☆ حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بھی اس کو پندرھویں شعبان کے مسنون اعمال میں شمار فرمایا،یعنی اس کی صبح کو روزہ رکھنا مستحب ہے۔

☆ علامہ قطب الدین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مشکوٰۃ شریف کی شرح مظاہر حق: ۳۶۴/۲، پر باب صیام التطوع میں پندرھویں شعبان کا روزہ بھی شمار فرمایا ہے۔

علمائے مالکیہ:

وندب صوم يوم النصف من شعبان (كذا في شرح الصغير على أقرب المسالك للشيخ الدردير المالكي. (۶۹۲/۱، باب الصوم). یعنی شیخ دردیر مالکیؒ نے پندرھویں شعبان کا روزہ مستحب قرار دیا ہے۔

علمائے حنابلہ:

☆ شیخ مرداوی حنبلی نے اپنی کتاب "الانصاف" میں تحریر فرمایا ہے کہ شیخ ابن جوزی نے "المستوعب" میں لکھا ہے کہ شعبان کے روزوں میں پندرھویں شعبان کا روزہ زیادہ مؤکد ہے۔

☆ نیز ابن رجب حنبلیؒ نے بھی فرمایا پندرھویں شعبان کے روزہ کا حکم خصوصیت سے آیا ہے۔ (ملخص از رسالہ: شب براءت کی حقیقت: ص ۷۴۔ ۷۷، از مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ)۔

☆ نیز ہر مہینہ کے تین دن یعنی ایام بیض کے بارے میں صحیح روایات موجود ہیں ان کی وجہ سے بھی پندرھویں شعبان کا روزہ مستحب قرار دیا جائے گا۔

☆ علامہ شرنبلالیؒ نے مراقی الفلاح میں تحریر فرمایا ہے کہ ہر وہ روزہ جو شریعت میں مطلوب ہو اور اس پر ثواب کا وعدہ ہو وہ بھی مستحب ہوتا ہے، اور چونکہ پندرھویں شعبان کے روزہ کے بارے میں روایت موجود ہے لہذا مستحب ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیں مراقی الفلاح میں ہے:

ومنه (المندوبات) كل صوم ثبت طلبه والوعد عليه بالسنة الشريفة. (مراقی الفلاح: ص ۲۳۰)۔

ماہنامہ دار العلوم دیوبند میں حدیثِ بالا پر تفصیلی کلام کرنے کے بعد اس کے موضوع نہ ہونے کی تین وجوہات بیان فرما کر بطورِ خلاصہ درجِ ذیل عبارت ذکر کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

خلاصہ یہ ہے کہ پندرہویں شعبان کے روزے کو نہ تو واجب وسنت کہا جا سکتا ہے نہ ہی بدعت کہہ کر بالکل رد کیا جا سکتا ہے؛ بلکہ اس کو مستحب کہا جائے گا۔ (ماہنامہ دار العلوم دیوبند، ص ۱۲، شعبان ۱۴۳۴ھ مطابق جون ۲۰۱۳ء)۔

مزید ملاحظہ ہو: (ماہنامہ دار العلوم دیوبند، وما ثبت بالسنۃ ص ۳۵۸۔ ۳۶۳، از شیخ عبد الحق محدثِ دہلوی)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بسم الله الرحمن الرحيم

قال الله تعالیٰ :
﴿ولا تباشروهن وأنتم عكفون
فى المساجد﴾
عن عائشةؓ أن النبى صلى الله عليه وسلم
"كان يعتكف العشر الأواخر من رمضان حتى توفاه الله"

(متفق عليه)

باب ......﴿۶﴾

اعتکاف کا بیان

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:
"فى المعتكف هو يعتكف الذنوب
ويجرى له من الحسنات كعامل الحسنات كلها"

(رواه ابن ماجه)

باب……﴿۶﴾

اعتکاف کا بیان

اعتکافِ مسنون میں درس وغیرہ کے استثناء کا حکم:

سوال: زید ایک طالبِ علم ہے اس نے اپنے شیخ کے ساتھ ایک مسجد میں اعتکاف کیا وہ ایک دوسری مسجد میں ایک استاذ کے پاس سبق پڑھتا ہے کیا وہ اپنے سبق کا استثناء کرسکتا ہے یا نہیں؟ سنا ہے کہ اعتکاف میں کچھ چیزوں کو مستثنیٰ کرنا درست ہے، باحوالہ بیان کیجئے؟

الجواب: اعتکافِ مسنون میں حاجتِ شرعیہ اور حاجتِ طبعیہ کے علاوہ مسجد سے نکلنے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ اعتکاف فاسد ہوجائے گا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بھی درس کے لیے مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے، اور استثناء کرنا بھی درست نہیں، مسنون اعتکاف استثناء کرنے سے نفلی بن جاتا ہے، ہاں نذر کا اعتکاف ہو تو استثناء جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ترمذی شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها أنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اعتكف أدنى إلي رأسه فأرجله، وكان لا يدخل البيت إلا لحاجة الإنسان". (رواه الترمذي: ۱/۱۶۵، باب المعتكف يخرج لحاجة ام لا).

معارف السنن میں ہے:

لا يخرج المعتكف من معتكفه إلا لحاجة شرعية أو طبعية. (معارف السنن: ۵/۵۳۹، سعيد).

درمختار میں ہے:

قال: طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ...(أو) شرعية كعيد وأذان.

(الدر المختار:٢/٤٤٥،باب الاعتكاف،سعيد).

احسن الفتاوی میں ہے:

مسنون اعتکاف میں نمازِ جنازہ، عیادتِ مریض، اور مجلسِ علم میں حاضری کی نیت کی تو وہ نفل ہو جائے گا، سنت ادا نہ ہوگی، مسنون اعتکاف صرف وہی ہے جس میں کوئی استثناء نہ کیا ہو، اس میں نکلنا مفسد ہے۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۹۹).

درسِ ترمذی میں ہے:

اعتکافِ مسنون میں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی استثناء ثابت نہیں ہے، اس لیے اعتکافِ مسنون میں صحتِ استثناء کے لیے دلیل مستقل چاہئے جو مفقود ہے، لہذا اعتکافِ مسنون کو علی الوجہ المسنون ادا کرنے کے لیے استثناء کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، ظاہر یہی ہے کہ اگر کوئی شخص اعتکاف مسنون شروع کرتے وقت یہ نیت کرلے تو پھر اس کا اعتکاف مسنون نہ رہے گا بلکہ نفلی بن جائے گا، اور جتنی دیر مسجد سے باہر رہے گا اتنی دیر اعتکاف شمار نہیں ہوگا۔ (درسِ ترمذی:۲/۶۵۰).

ہاں نذر اعتکاف میں استثناء درست ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولو شرط وقت النذر والالتزام أن يخرج إلى عيادة المريض وصلاة الجنازة وحضور مجلس العلم يجوز له ذلك. (الفتاوى الهندية:١/٢١٢ـ ومثله في الدر المختار:٢/٤٤٨،سعيد ـ وفي الفتاوى التاتارخانية:٢/٤١٢،الفصل الثاني عشر في الاعتكاف،ادارة القرآن)ـ **واللہ ﷻ اعلم۔**

ہر محلّہ کی مسجد میں اعتکاف کا حکم:

سوال: اعتکاف بستی کی ایک مسجد میں کافی ہے یا ہر محلّہ کی مسجد میں مسنون ہے؟

الجواب: اعتکاف سنت علی الکفایہ ہے لہذا ہر محلّہ کی مسجد میں ہونا چاہئے، اگرچہ کوئی صریح عبارت نہیں ملی، لیکن تراویح پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح تراویح ہر محلّہ کی مسجد میں مسنون ہے اس طرح اعتکاف بھی ہر محلّہ کی مسجد میں مسنون ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

الاعتكاف سنة مؤكدة في العشر الأخيرمن رمضان أي سنة كفاية كما في البرهان. وفي الشامي: قوله سنة كفاية، نظيرها إقامة التراويح بالجماعة فإذا قام بها البعض سقط الطلب عن الباقين، فلم يأثموا بالمواظبة على الترك بلاعذر. (الدر المختار مع الشامی:۲/۴۴۲، سعید).

اور تراویح بالجماعت کے متعلق مرقوم ہے:

الجماعة فيها سنة على الكفاية، أفاد أن أصل التراويح سنة عين، فلو تركها واحد كره، بخلاف صلاتها بالجماعة، فإنها سنة كفاية، فلو تركها الكل أساءوا، أما لو تخلف عنها رجل من أفراد الناس، وصلى في بيته، فقد ترك الفضيلة. (فتاوى الشامی:۲/۴۵، سعید).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

اس سے متعلق کوئی صرح جزئیہ نہیں ملا، البتہ شامی میں اعتکاف کی سنیت کو نظیر اقامتِ تراویح کہا ہے، اور تراویح کے باب میں تین قول نقل فرما کر اس کو ترجیح دی ہے کہ ہر محلّہ کی ایک مسجد میں اقامتِ تراویح سے سنتِ کفایہ ادا ہو جائے گی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اعتکاف کا بھی یہی حکم ہے۔ (احسن الفتاویٰ:۴/۴۹۸).

مزید ملاحظہ ہو: کتاب الفتاویٰ:۳/۴۵۱۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عورت کے لیے اپنے مخصوص کمرہ سے باہر جانے کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت نے اعتکاف کے لیے ایک کمرہ مخصوص کرلیا، اب اس سے باہر نکلنے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عورت کا متعین کردہ کمرہ جائے اعتکاف بن گیا اب اس کمرہ سے بلاضرورت باہر جانے کی اجازت نہیں ورنہ اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

ملاحظہ فرمائیں عالمگیری میں ہے:

والمرأة تعتكف في مسجد بيتها إذا اعتكفت في مسجد بيتها فتلك البقعة في حقها كمسجد الجماعة في حق الرجل لا تخرج منه إلا لحاجة الإنسان كذا في شرح المبسوط للإمام السرخسي. (الفتاوى الهندية:۱/۲۱۱).

حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

وللمرأة الاعتكاف في مسجد بيتها وهو محل عينته المرأة للصلاة فيه ولاتخرج منه إذا اعتكفت فلو خرجت لغير عذر يفسد واجبه وينتهي نفله. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح:ص٦٩٩،باب الاعتكاف،قديمي)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

معتکف کے لیے غسل تبرید کا حکم:

سوال: کیا حالتِ اعتکاف میں گرمی کی وجہ سے ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں غسلِ تبرید کے لیے مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، ورنہ اعتکاف فاسد ہوجائے گا۔

ملاحظہ فرمائیں ترمذی شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها أنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اعتكف أدنى إلي رأسه فأرجله، وكان لا يدخل البيت إلا لحاجة الإنسان". (رواه الترمذي:١/١٦٥،باب المعتكف يخرج لحاجة ام لا).

شامی میں ہے:

وحرم عليه الخروج إلا لحاجة الإنسان طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ولا يمكنه الاغتسال في المسجد فلو أمكنه من غير أن يلوث المسجد فلا بأس به، بدائع، أي بأن كان فيه بركة ماء أو موضع معد للطهارة أو اغتسل في إناء بحيث لايصيب المسجد الماء المستعمل، قال في البدائع: فإن كان بحيث يتلوث بالماء المستعمل يمنع منه لأن تنظيف المسجد واجب، والتقييد بعدم الإمكان يفيد أنه لو أمكن كما قلنا فخرج أنه يفسد...لكن قول البدائع لا بأس به ربما يفيد الجواز، فتأمل. (الدر المختار مع الشامي:٢/٤٤٥،سعيد).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

"لو احتلم" کی قید سے معلوم ہوا کہ تبرید کے لیے خروج جائز نہیں۔(احسن الفتاوی:۴/۴۹۷۔وفتاوی رحیمیہ:۳/۲۲۰).

ہاں اگر کسی حاجت کے لیے نکلا اور ساتھ میں غسل تبرید بھی کرلیا تو جائز ہے۔

شامی میں ہے:

ولیس کالمکث بعدها ما لو خرج لها ثم ذهب لعیادة مریض أو صلاة جنازة من غیر أن یکون خرج لذلک قصداً فإنه جائز کما في البحر الرائق عن البدائع. (شامی:۲/٤٤٥،سعید)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

اکیسویں رات کو چند گھنٹے گزر جانے کے بعد اعتکاف شروع کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص سنت اعتکاف کا ارادہ رکھتا ہے، لیکن اکیس رمضان کو چند گھنٹے گزرنے کے بعد مسجد میں پہنچا تو مسنون اعتکاف صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مسنون اعتکاف پورے عشرہ کا ہوتا ہے، یعنی بیس رمضان کے غروب سے تھوڑی دیر پہلے مسجد میں حاضر ہونا اور عید کا چاند نظر آنے تک مسجد میں اعتکاف کی نیت سے رہنا ضروری ہے، اور صورتِ مسئولہ میں چند گھنٹے بعد پہنچا لہذا مسنون اعتکاف ادا نہ ہوگا، ہاں نفلی اعتکاف کا ثواب مل جائے گا۔

ملاحظہ فرمائیں مرقات میں ہے:

وعند الأئمة الأربعة أنه یدخل قبل غروب الشمس إن أراد اعتکاف شهر أو عشر.

(مرقات المفاتیح:٤/٣٢٩،ملتان)۔

البحر الرائق میں ہے:

وفي الکافي ومتی دخل في اعتکافه اللیل والنهار فابتداؤه من اللیل لأن الأصل أن کل لیلة تتبع الیوم الذي بعدها ألا تری أنه یصلی التراویح في أول لیلة من رمضان ولایفعل ذلک في أول لیلة من شوال .... فعلی هذا یدخل المسجد قبل الغروب ویخرج بعد الغروب من آخر یوم... کما صرح قاضیخان في فتاواه. (البحر الرائق:۲/۳۰۵،کوئٹہ)۔

بہشتی زیور میں ہے:

رمضان شریف کی بیسویں تاریخ کے دن چھپنے سے پہلے سے رمضان کی انتیس یا تیس تاریخ یعنی جس دن عید کا چاند نظر آجاوے اس تاریخ کے دن چھپنے تک (مسجد میں) پابندی سے جم کر بیٹھنے کو اعتکاف کہتے ہیں۔

(بہشتی زیور:۳/۲۲)۔

وفي حاشیة بهشتي زیور : والمشهور عند مشائخنا أن یدخل المعتکف بعد العصر قبل غروب

الشمس من اليوم العشرين من شهر رمضان ليدخل الليلة الحادية وعشرين في الاعتكاف. (رسائل الارکان:ص ۲۳۱، حاشیۂ بہشتی زیور)۔

فتاوی دارالعلوم میں ہے:

بیسویں کی رات کا ایک حصہ گزرنے کے بعد اعتکاف شروع کیا تو عشرۂ اخیرہ کا پورا اعتکاف نہ ہوا اور وہ سنت پوری ادا نہ ہوئی۔ (فتاوی دارالعلوم: ۶/ ۵۰۶، مدلل ومکمل، دارالاشاعت)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اعتکافِ مسنون میں روزہ فاسد ہوجانے سے اعتکاف کا حکم:

سوال: ایک شخص نے مسنون اعتکاف کیا ایک دن غلطی سے غروب آفتاب سے پہلے افطار کرلیا، یہ بات تو واضح ہے کہ روزہ کی قضا لازم ہے، لیکن اس دن کے اعتکاف کی قضا ہے یا نہیں؟

الجواب: اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے، جب روزہ توڑدے یا کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو اعتکاف بھی فاسد ہوجاتا ہے، لہذا صورتِ مسئولہ میں بھی اعتکاف فاسد ہوگیا اور اس دن کی قضا لازم ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی شامی میں ہے:

ومقتضى ذلک أن الصوم شرط أيضاً في الاعتكاف المسنون لأنه مقدر بالعشر الأخير حتى لو اعتكفه بلا صوم لمرض أو سفر ينبغي أن لايصح عنه، بل يكون نفلاً فلا تحصل به إقامة سنة الكفاية. (الشامي: ۲/ ٤٤٢، باب الاعتكاف، سعيد)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وإذا فسد الاعتكاف الواجب وجب قضاؤه فإن كان اعتكاف شهر بعينه إذا أفطر يوماً يقضي ذلک اليوم... (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۳)۔

بدائع الصنائع میں ہے:

ولو أكل أو شرب في النهار عامداً فسد صومه وفسد اعتكافه لفساد الصوم. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۱٦، سعيد)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے، اگر بغیر روزہ کے یہ اعتکاف کیا تو یہ اعتکاف مسنون نہیں ہوگا، بلکہ نفل بن جائے گا، البتہ اگر ایک دن روزہ نہ رکھا تو صرف ایک دن کے اعتکاف کی قضاء لازم ہوگی۔

(فتاویٰ محمودیہ:۱۰/۲۲۰،مبوب ومرتب)۔

مزید ملاحظہ ہو:(احسن الفتاویٰ:۴/۵۰۱۔وفتاویٰ حقانیہ:۴/۱۹۶)۔واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کے بغیر مسنون اعتکاف کا حکم:

سوال: ایک بوڑھا شخص جو شیخ فانی ہونے کی وجہ سے یا سخت بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا ہے تو اس کا مسنون اعتکاف صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مسنون اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بوڑھے میاں کا اعتکاف نفلی ہو جائے گا سنت ادا نہ ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

ومقتضى ذلک أن الصوم شرط أيضاً في الاعتكاف المسنون لأنه مقدر بالعشر الأخير حتى لو اعتكفه بلا صوم لمرض أو سفر ينبغي أن لايصح عنه، بل يكون نفلاً فلا تحصل به إقامة سنة الكفاية. (الشامي:۲/٤٤٢،باب الاعتكاف ، سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے،اگر بغیر روزہ کے یہ اعتکاف کیا تو یہ اعتکاف مسنون نہیں ہوگا، بلکہ نفل بن جائے گا،البتہ اگر ایک دن روزہ نہ رکھا تو صرف ایک دن کے اعتکاف کی قضاء لازم ہوگی۔

(فتاویٰ محمودیہ:۱۰/۲۲۰،مبوب ومرتب)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

سوال:عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف کا قصد ہے،لیکن روزہ رکھنے کی سکت نہیں ہے،تو بدون روزہ رکھے اعتکاف صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:مسنون اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے،لہٰذا روزہ کے بغیر اعتکاف نفلی ہے،مسنون اعتکاف نہیں ہے۔(فتاویٰ رحیمیہ:۳/۱۱۰کتاب الاعتکاف)۔واللہ ﷻ اعلم۔

معتکف کا نفل وضو کی غرض سے مسجد سے نکلنے کا حکم:

سوال: زید معتکف ہے ماہِ رمضان میں سنت اعتکاف میں مشغول ہے چاشت کی نماز ابھی تک نہیں پڑھی اس کا وضو ٹوٹ گیا اب نفل وضو یا وضو کو دائم رکھنے کے لیے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے یا نہیں؟ بظاہر یہ وضو

ضروری نہیں اس لیے نکلنا محل نظر ہے فقہ کی کتابیں اس مسئلہ کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زید کے لیے نفل وضو یا وضو کو دائم رکھنے کے لیے مسجد سے نکلنا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو منحۃ الخالق میں ہے:

وفي حاشية الرملي عن خط المقدسي: لا شك أن صلاة تحية المسجد و السنة بالاستقلال أفضل من الإتيان بها في ضمن الفرض يؤدى ولا يخفى أن من يعتكف ويلازم باب الكريم إنما يروم ما يوجب له مزيد التفضيل و التكريم. (منحة الخالق على البحر الرائق:۲/۲ ۳۰، کوئٹہ).

یعنی حاشیہ رملی میں ہے کہ تحیۃ المسجد اور سنت مستقل پڑھنا فرض کے ضمن میں پڑھنے سے افضل ہے اور معتکف کریم کے دروازہ پر فضائل اور ثواب کے حصول کے لیے ہی بیٹھا ہے۔

البحر الرائق میں ہے:

والصحيح أن هذا قول الكل في حق الكل لأنه خرج لإقامة سنة الصلاة وسنتها تقام في موضعها فلا تعتبر خارجاً. (البحرالرائق :۲/۳ ۳۰، کوئٹہ).

شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اشعۃ اللمعات میں مستحب غسل کے لیے نکلنے کو جائز فرمایا ہے۔(اشعۃ اللمعات:۲/۱۲۰).

اور متانہ میں بحوالہ فتاوی حجہ :"والوضوء والاغتسال فرضاً كان أو نفلاً" کی صراحت موجود ہے اس لیے معتکف نفل وضو اور نفل نماز کے لیے وضو دونوں کے لیے نکل سکتا ہے۔(المتانة فی مرمة الخزانة:۳۷۸).

واللہ تعالیٰ اعلم۔

معتکف کا غسلِ جمعہ کے لیے نکلنے کا حکم:

سوال: ایک شخص معتکف ہے، کیا وہ جمعہ کے دن سنت غسل کے لیے نکل سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اس مسئلہ میں اکابرؒ کے دو گروہ ہیں بعض کے نزدیک نکلنا درست نہیں ہے مثلاً مولانا ظفر احمد تھانویؒ، مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، مفتی فرید صاحب وغیرہ ان حضرات کے مستدلات شامی، بدائع وغیرہ کتب ہیں۔

ملاحظہ ہو بدائع میں ہے:

وماروي عن النبي صلى الله عليه وسلم من الرخصة في عيادة المريض وصلاة الجنازة .... ويجوز أن تحمل الرخصة على ما إذا كان المعتكف خرج لوجه مباح كحاجة الإنسان أو للجمعة، ثم عاد مريضاً أوصلى جنازة من غير أن كان خروجه لذلك قصداً وذلك جائز. (بدائع الصنائع:۲/۱۱٤،سعید۔وکذا فی شامی:۲/٤٤٥،سعید۔وامدادالاحکام:۲/۱٤۲۔وفتاوی محمودیہ:۱۰/۲٤۳،مبوب ومرتب۔وفتاوی فریدیہ:٤/۱۹۷).

دیگر بعض حضرات کے نزدیک سنت غسل کے لیے نکلنا جائز ہے۔مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، مفتی رشید احمد لدھیانویؒ اور مولانا خالد سیف اللہ وغیرہ۔

ملاحظہ ہو اشعۃ اللمعات میں ہے:

وکان لایدخل البیت إلا لحاجة الإنسان ... اما غسلِ جمعہ، روایتے صریح دراں از اصول نمی یابم، جز آنکہ در شرح امداد گفتہ است کہ: بیروں می آید برائے غسل، فرض باشد یا نفل۔(اشعۃ اللمعات:۲/۱۲۰،مجددیہ).

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ غسل جمعہ کے بارے میں کوئی صریح روایت کتب فقہ میں نہیں ملی، سوائے اس کے کہ شرح امداد میں لکھا ہے کہ معتکف باہر نکل سکتا ہے غسل کے لیے چاہے فرض ہو یا نفل۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

وضو اور غسل خواہ فرض ہو یا نفل اس کے لیے مسجد سے نکلنے کا جواز دلائل ذیل سے ثابت ہے:

(۱) نقل في المتانة عن فتاوى الحجة :ويجوزلمعتكف أن يخرج من المسجد في سبعة أشياء : البول ، والغائط ، والوضوء ، والاغتسال، فرضاً كان أو نفلاً ، والجمعة، يخرج أيضاً لحاجة السلطان ، ويخرج أيضاً لأمر لا بد ، ثم يرجع بعد ما فرغ من ذلك الأمر سريعاً .(المتانة فی مرمة الخزانة:۳۷۸).

(۲) نقل الرواية المذكورة عن فتاوى الحجة: المخدوم محمدقاسم التتوي رحمه الله تعالىٰ في بياضه المعروف بالبياض الهاشمي.

(۳)ونقلها العلامة العثماني رحمه الله عن الإكليل عن الخزانة عن فتاوى الحجة.(احکام القرآن:۱/۱۹۰).

(۴) قال المخدوم التتوی رحمہ اللہ فی حیاۃ الصائمین : دہم: از حاجتِ شرعیہ وضوء واغتسال است، پس جائز است معتکف را خروج از مسجد برائے آں، اگر چہ فرض باشد یا نفل، کذا فی المضمرات، والفتاوی الحجۃ، والتاتارخانیۃ وکنز العباد ومتانۃ الروایات۔(الفتاوی المحمدیہ:۲/۸۰،للمفتی محمد الھالائی السندی).

(۵) وفي مضمرات الأنوار: يجوز للمعتكف الخروج للبول والغائط والوضوء والاغتسال فرضاً كان أو نفلاً. (حوالہ مذکورۂ بالا).

(۶) اشعۃ اللمعات کی عبارت جو پہلے ذکر کی جا چکی۔

فتاوی الحجہ، متانہ، خزانہ، بیاض ہاشمی، الاکلیل، احکام القرآن، حیاۃ الصائمین، مضمرات، فتاوی تاتارخانیہ، کنز العباد، فتاوی محمودیہ، مظہر الانوار اور اشعۃ اللمعات ۱۳ کتابوں میں یہ مسئلہ بلا تردد منقول ہے، اگر چہ ان میں بعض کتابیں غیر معروف ہیں، اور خزانۃ الروایات و کنز العباد کی مولانا عبدالحیؒ نے النافع الکبیر میں تضعیف فرمائی ہے، مگر دوسری کتب معروف و معتبر ہیں، پھر اتنے علماء و اہل فتوی جن میں مخدوم ٹھٹویؒ جیسے جلیل القدر فقیہ بھی ہیں، ان سب کا بلا انکار و بلا ذکر اختلاف، نقل کرنا مستقل دلیل ہے، علاوہ ازیں قول ''الدر المختار'' "وحرم عليه الخروج إلا لحاجة الإنسان" کے تحت علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: "ولا يمكث بعد فراغه من الطهور". (شامی ۲/۴۴۵، سعید) یہاں طہور سے نفل وضو متبادر ہے، اور غالباً اس کے لیے جواز خروج سے مخالف کو بھی انکار نہیں، بعض نے وضو للصلاۃ النافلۃ اور وضو نفل میں فرق کیا ہے، اول کے لیے جواز خروج اور ثانی کے لیے عدم جواز کو اختیار کیا ہے، یہ فرق غیر معقول ہونے کے علاوہ شامیہ کے جزئیہ مذکورہ کے بھی خلاف ہے، پس نفل وضو کو حوائج اصلیہ میں شمار کرنے اور نفل غسل کو شمار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ (ملخص از احسن الفتاوی: ۴/۵۰۳).

خلاصہ یہ ہے کہ معتکف جمعہ کے دن سنت غسل کے لیے نکل سکتا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

باب ﴿۷﴾

متفرقات الصوم

سزا کے طور پر روزہ رکھوانے کا حکم:

سوال: اگر استاذ بطور سزا کسی طالب علم سے روزہ رکھوالے تو یہ درست ہے یا نہیں؟ اور اس روزہ کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب: مدارس میں طلبہ سے سزا کے طور پر روزہ رکھوانا درست ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے نیز اس روزہ کا ثواب بھی ملے گا۔ جیسا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے بارے میں فرمایا جب سات سال کے ہوجائے تو انہیں نماز کا حکم کرواور دس سال کے بعد نماز چھوڑنے پر ان کی پٹائی کرو، تا کہ نماز کے عادی بن جائے، اگر چہ احکام شرعیہ کے مخاطب نہیں ہیں، پھر بھی نماز کا ثواب ان کو ملے گا۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث شریف میں ہے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع واضربوا عليها وهم أبناء عشر وفرقوا بينهم في المضاجع.

قال الألباني: حسن صحيح. (سنن ابی داود: ۷۰، باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ).

نیز لوگوں کے سامنے غیر وقت میں نماز پڑھنا بھی مصلحت کی وجہ سے روایت میں مذکور ہے، اور ریا میں داخل نہیں ہے بلکہ اس پر ثواب بھی ملے گا۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أيوب عن أبي قلابة أن مالك بن الحويرث قال: "ألا أنبئكم صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: وذلك في غير حين صلاة، فقام، ثم ركع فكبر، ثم رفع رأسه فقام هنية، ثم سجد، ثم رفع رأسه هنية، ثم سجد، ثم رفع رأسه هنية، فصلى صلاة عمرو بن سلمة شيخنا هذا، قال أيوب: كان يفعل شيئاً لم أرهم يفعلونه كان يقعد في الثالثة أو الرابعة فأتينا النبي صلى الله عليه وسلم فأقمنا عنده. (رواه البخاری:۱/۱۱۳).

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسر شہوت کے لیے روزہ رکھنے کو فرمایا اس میں کسر شہوت بھی ہے اور ثواب بھی ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج، فإنه أغض للبصر، وأحصن للفرج، ومن لم يستطع فعليه بالصوم، فإنه له وجاء". (رواه البخاری:۲/۷۵۸).

ظاہر ہے کہ یہ روزہ براہِ راست رضاء الٰہی کے لیے نہیں ہے بلکہ زنا سے بچنے کے لیے کسر شہوت ہے، یہاں بھی روزہ رکھوانا نفس کو سزا دینے اور مدرسے کے احکام بجالانے کے لیے ہے۔

علاوہ ازیں شریعتِ مطہرہ میں اس قسم کی بہت ساری مثالیں پائی جاتی ہیں جن میں عبادات کو سزا کے طور پر مقرر کیا ہے، مثلاً کفارۂ یمین، کفارۂ ظہار، وغیرہ اور ظاہر ہے کہ اس سے عبادات کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

غیر معتدل ایام علاقوں میں روزہ کا حکم:

سوال: بعض علاقوں میں ایام غیر معمولی طول اختیار کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے روزہ رکھنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے مثلاً دن ۲۲، ۲۳ گھنٹے کا ہو جاتا ہے یا اس سے زائد تو ایسی صورت میں روزہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ایسے علاقوں میں جو حضرات بالکل روزہ کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے کہ دن بے حد طویل ہے، وہ یا تو قضاء کر لیں، یعنی ابھی نہ رکھیں پھر جب ایام معتدل ہو جائے اس وقت قضاء کر لیں، یا اقرب البلاد کے روزوں کے مطابق روزہ رکھ لیں، لیکن اگر روزہ پر قدرت ہو جیسے انگلینڈ وغیرہ میں تو روزہ رکھنا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامی فرماتے ہیں:

تتمة: لم أر من تعرض عندنا لحكم صومهم، فيما إذا كان يطلع الفجر عندهم كما تغيب الشمس، أو بعده بزمان لا يقدر فيه الصائم على أكل ما يقيم بنيته، ولا يمكن أن يقال: لوجوب موالاة الصوم عليهم، لأنه يؤدي إلى الهلاك، فإن قلنا: بوجوب الصوم يلزم القول بالتقدير، وهل يقدر ليلهم بأقرب البلاد إليهم، كما قاله الشافعية هنا أيضاً أم يقدر لهم بما يسع الأكل والشرب، أم يجب عليهم القضاء فقط دون الأداء؟ كل محتمل، فليتأمل، ولا يمكن القول هنا بعدم الوجوب أصلاً، كالعشاء عند القائل به فيها لأن علة عدم الوجوب فيها عند القائل به عدم السبب وفي الصوم قد وجد السبب وهو شهود جزء من الشهر وطلوع فجر كل يوم، هذا ما ظهر لي، والله تعالىٰ أعلم. (فتاوى الشامي:١/٣٦٦،مطلب في طلوع الشمس من مغربها،سعيد۔و كذا في حاشية الطحطاوي على الدر المختار:١/١٧٥،كوئته).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

اگر اوقات میں غیر معمولی فرق ہو جائے مثلاً ۲۰،۲۲ گھنٹوں کا دن ہو جائے اور دو چار گھنٹوں کی رات رہ جائے تو بھی قرآن وحدیث کے عمومی احکام کا تقاضا ہے کہ روزہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ہو اور اسی پر فتویٰ ہے، البتہ چونکہ بسا اوقات اس کی وجہ سے غیر معمولی مشقت پیدا ہو جائیگی اور عمر رسیدہ یا کمزور آدمیوں کے لیے روزہ رکھنا دشوار ہو جائیگا، ان کو یہ خصوصی سہولت دی جا سکتی ہے کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ نہ رکھیں اور آئندہ جب موسم ہلکا اور قابل تحمل ہو جائے ان کے اوقات نسبۃً کم ہو جائیں تو قضاء کر لیں۔(جدید فقہی مسائل:۱/۱۷۸، کتب خانہ).

مزید ملاحظہ فرمائیں: بوادر النوادر:۲۳۹، ادارہ اسلامیات لاہور۔واحسن الفتاوی :۲/۱۱۳، کتاب الصلاۃ۔ وجدید مسائل کا شرعی حل:۴۷۔۵۰، ادارہ اسلامیات)۔واللہ ﷻ اعلم۔

چند گھنٹے کے روزہ کا حکم:

سوال: کیا دین محمدی میں ۴/۵ گھنٹے کا روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ پوچھنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ ہمارے علاقہ میں بعض لوگ بقرعید کے دن صبح سے کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں اور روزہ داروں کی طرح رہتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا روزہ ہے، پھر عید کی نماز کے بعد افطار کرتے ہیں اور بعض اپنی قربانی سے کھاتے ہیں، ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا صبح میں چائے وغیرہ پی سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: دین محمدی میں روزہ صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہوتا ہے، چند گھنٹے کا روزہ نہیں ہوتا۔

ہاں عید الاضحیٰ میں جو لوگ قربانی کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ صبح کچھ نہ کھائے نمازِ عید کے بعد اپنی قربانی سے ابتدا کرے، یہ حدیث شریف سے ثابت ہے، اس کو امساک کہنا چاہئے، نیز یہ واجب بھی نہیں بلکہ صرف مستحب ہے، لہٰذا کوئی صبح چائے وغیرہ پینا چاہے تو ممنوع بھی نہیں، بلا کراہت جائز ہے۔

اور جن لوگوں کے پاس قربانی کی وسعت نہیں ہے، یا وہ دوسری جگہ قربانی کراتے ہیں تو ان کے لیے بھی امساک بہتر ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ترمذی شریف میں ہے:

عن عبد الله بن بريدة عن أبيه قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم لا يخرج يوم الفطر حتى يطعم ولا يطعم يوم الأضحى حتى يصلى. قال أبوعيسىٰ: وقد استحب قوم من أهل العلم أن لا يطعم يوم الأضحى حتى يرجع. (رواه الترمذي:١/١٢٠،فيصل).

مراقی الفلاح میں ہے:

(الصوم) هو الإمساك نهاراً ضد الليل من الفجر الصادق إلى الغروب. (مراقي الفلاح:ص ٢٢٨،بيروت۔وكذا في الهندية:١/١٩٤).

فتاوی شامی میں ہے:

قوله ويندب تاخير أكله عنهما أي يندب الإمساك عما يفطر الصائم من صبحه إلى أن يصلى وإن لم يضح في الأصح...قوله في الأصح، وقيل لا يستحب التاخير في حق من لم يضح، بحر. (فتاوى الشامي:٢/١٧٦،سعيد).

وفي حاشية اللامع للشيخ زكريا: والتعليل ببداية الأكل من أضحيته يؤيد تقيد الندب بمن له أضحية والتعليل بموافقة المساكين أو اتباع فعله صلى الله عليه وسلم أو إطلاق لفظ الصوم على هذا اليوم في بعض الروايات يؤيد العموم. (حاشية اللامع:٢/٣٩)۔واللہ ﷻ اعلم۔

عید الاضحیٰ میں امساک کو روزہ کہنے کا حکم:

سوال: جو لوگ عید الاضحیٰ میں چاشت تک امساک کرتے ہیں اور اس کو روزہ کہتے ہیں، تو کیا اس

امساک کوروزہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اس امساک کوروزہ کہنا صحیح ہے۔

ملاحظہ فرمائیں معارف السنن میں ہے:

قال الشيخ: وهذا القدر من الإمساك أسميه أيضاً بالصوم لما يدل به حديث صيام عشرة، فإنه على اعتبار الإمساك في اليوم العاشر سماه صوماً، وهو الإمساك إلى الصلاة أقول: فيه حديث حفصة رضي الله تعالىٰ عنها عند النسائى قالت:" أربع لم يكن يدعهن النبي صلى الله عليه وسلم صيام عاشوراء، والعشر، وثلاثة أيام من كل شهر، وركعتان قبل الفجر". (معارف السنن:٤/٤٥١،سعيد).

اوجز المسالک میں ہے:

تعليل موافقة الفقراء مؤيد لمن قال: لا يأكل في الأضحى وإن لم يضح، ويؤيد أيضاً إطلاق الصوم عليه في بعض الأحاديث، فقد روي عن حفصة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: "أربع لم يكن يدعهن النبي صلى الله عليه وسلم صيام عاشوراء، والعشر، وثلاثة أيام من كل شهر، وركعتان قبل الفجر". فإطلاق الصوم على العشر مؤول بوجوه: منها: أن صوم العشر باعتبار بعض الأوقات، وعلى هذا فينبغي أن لا يذوق شيئاً لا الطعام ولاغيره. (اوجزالمسالك الى موطا مالك:٣/٤٢٠).

قال الشيخ أحمد الدردير المالكي في الشرح الكبير: ندب فطر قبل ذهابه في عيد الفطر، تأخيره في عيد النحر. (فصل فى احكام صلاة العيدالجزء الاول).

وقال الشوكاني: والحكمة في تأخير الفطر يوم الأضحى أنه يوم تشرع فيه الأضحية والأكل منها فشرع أن يكون فطره على شيء منها، قاله ابن قدامة. (نيل الاوطارشرح منتقى الاخبار:٣/٣٠٨،باب استحباب الاكل قبل الخروج فى الفطردون الاضحى).

بدایۃ المجتہد میں ہے:

قال ابن رشد: أجمعوا على أنه يستحب أن يفطر في عيد الفطر قبل الغدو إلى المصلىٰ وأن لا يفطر يوم الأضحى إلا بعد الانصراف من الصلاة. (بداية المجتهد ونهاية المقتصد:١/١٦١، الباب الثامن في صلاة العيدين).

هذا ملخص من "البواقيت الغالية في تحقيق الأحاديث العالية:١/ ٢٢٤_٢٢٥، للشيخ محمد يونس الجونفوري، السهارنفوري).

وانظر المزيد من البحث : مصنف ابن أبي شيبة :٢/ ١٦٠، مسندأحمد:٣/ ٢٨،ترمذي:٧١، فتح الباري:٤/ ٣٧٣، عمدة القاري:٣/ ٣٦٤،شرح طيبي:٢/ ٢٩٢،مرقات المفاتيح:٢/ ٢٥٠، مراقی الفلاح:٣١٨، الدررشرح الغرر:١/ ١٤٢).

وانظر أيضاً مزيد التفصيل في البواقيت الغالية في تحقيق الأحاديث العالية:١/ ٢٢٤_٢٢٥للشيخ محمديونس الجونفوري، السهارنفوري۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مسجد میں نماز عیدین مکرر پڑھنے کا حکم:

سوال: بعض مرتبہ یورپ وامریکہ میں ایک وقت میں عید کی نماز پڑھنا مشکل ہوتا ہے تو یکے بعد دیگرے عید کی نماز چند مرتبہ مسجد میں پڑھتے ہیں،اس طرح کرنا درست ہے یا نہیں؟اس میں مسجد وغیر مسجد کا فرق ہے یانہیں؟

الجواب: یورپ وامریکہ میں عید کی نماز عام طور پر تین قسم کی جگہوں پر پڑھی جاتی ہے:

(۱) جماعت خانہ میں جہاں نمازِ پنجگانہ،نمازِ جمعہ وغیرہ پڑھی جاتی ہیں،مگر اس کو مسجد شرعی کی نیت سے نہیں خریدا گیا،یعنی زمین وقف کی نہیں ہوتی،اور لوگ اپنے اپنے وقت میں نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں تکرارِ جماعت مکروہ نہیں ہے۔

(۲) عیدگاہ یعنی کھلے میدان میں عید کی نماز ادا کی جاتی ہے یا بعض جگہوں پر نمازِ عید کے لیے کوئی بڑا ہال کرایہ پر لیا جاتا ہے۔اس کا حکم بھی یہی ہے کہ اس میں تکرارِ جماعت مکروہ نہیں ہے۔

(۳) مسجد شرعی:۔اس کا عمومی حکم یہ ہے کہ جماعتِ ثانیہ مکروہ ہے،لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہیئت اولی کی تبدیلی کے ساتھ بلا کراہت جائز ہے۔

درمختار میں ہے:

ويكره تكرار الجماعة بأذان وإقامة في مسجد محلة لا في مسجد طريق ومسجد لا إمام له ولامؤذن. وفي الشامية: عبارته في الخزائن ...أو كان مسجد طريق جاز إجماعاً كما في مسجد ليس له إمام ولامؤذن ويصلي الناس فيه فوجاً فوجاً والمراد بمسجد المحلة ماله

إمام وجماعة معلومون كما في الدرر وغيرها. (الدر المختار مع الشامی:۱/۵۵۳،سعید).

نیز مذکور ہے:

وقدمنا في باب الأذان عن آخر شرح المنية عن أبي يوسفؒ أنه إذا لم تكن الجماعة على الهيئة الأولىٰ لا تكره، وإلا تكره وهو الصحيح، وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة، كذا في البزازية، انتهىٰ، وفي التاتارخانية: عن الولوالجية: وبه نأخذ.

(شامی:۱/۵۵۳،سعید).

شرح منیۃ المصلی میں ہے:

وأما من حيث جواز التعدد وعدمه فالأولىٰ هو الاحتياط لأن الخلاف فيه أقوى إذا الجمعة جامعة للجماعات (وهكذا العيد) ولم تكن في زمن السلف تصلى إلا في موضع واحد من المصر وكون الصحيح جواز التعدد للضرورة للفتوى لايمنع شرعية الاحتياط للتقوى. (شرح منية المصلی:۵۵۲،سهیل).

خلاصہ بہشتی زیور میں ہے:

اسی طرح مکروہ تحریمی ہے ہر فرض کی دوسری جماعت ان چار شرطوں سے:

(۱) مسجد محلّہ کی ہو اور عام رہ گزر نہ ہو، اور مسجد محلّہ کی یہ تعریف لکھی ہے کہ وہاں کا امام اور نمازی معین ہوں۔

(۲) پہلی جماعت بلند آواز سے اذان واقامت کہہ کر پڑھی گئی ہوں۔

(۳) پہلی جماعت ان لوگوں نے پڑھی ہوں جو اس محلّہ میں رہتے ہوں اور جس کو اس مسجد کے انتظام کا اختیار حاصل ہے۔

(۴) دوسری جماعت اس ہیئت اور اہتمام سے ادا کی جائے جس ہیئت واہتمام سے پہلی جماعت ادا کی گئی ہے، اور یہ چوتھی شرط امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے، یعنی دوسری جماعت اس ہیئت سے ادا نہ کی جائے جس ہیئت سے پہلی جماعت ادا کی گئی ہے تو دوسری جماعت مکروہ نہ ہوگی۔ (دین کی باتیں:۱۱۰).

معلم الفقہ میں ہے:

سوال: جمعہ کی جماعت ہو جانے کے بعد ۱۰،۱۵ آدمی آگئے یہ لوگ اسی مسجد میں جمعہ مع خطبات سے پڑھیں یا باجماعت جماعت ظہر ادا کریں؟

جواب: چونکہ تعددِ جماعت جمعہ بمذہب صحیح جائز ہے اور بروز جمعہ جس شخص پر جمعہ فرض ہے اس کو ظہر پڑھنا

درست نہیں ہے اس لیے ان کو چاہئے کہ جمعہ بجماعت مع خطبہ ادا کریں اسی مسجد میں ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے اور اولیٰ یہ ہے کہ دوسری مسجد میں ہوں۔ (معلم الفقہ ترجمہ مجموعۃ الفتاویٰ:۲:۳۷۲).

لیکن "الوصية الإخوانية في حكم الجماعة الثانية" میں مفتی رشید احمد صاحبؒ نے عدم جواز کو ترجیح دی ہے اور ایک اثر نقل فرمایا ہے: "عن خرشة بن الحر أن عمر رضي الله عنه كان يكره أن يصلى بعد صلاة الجمعة مثلها" (رواه الطحاوي بسند صحيح: ۱/۲۳٤، في باب التطوع بعد الجمعة كيف هو) اس سے ظاہر ہے کہ ہیئت اولیٰ پر دوبارہ نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

پھر مذکورہ رسالہ کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

جماعتِ ثانیہ کا عام رواج جو ہوگیا ہے اس میں مندرجہ ذیل قبائح ہیں:

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کے طریق سے مخالفت۔

(۲) جماعت کی تقلیل اور تہاون۔

(۳) جماعت اصلیہ کے ساتھ شرکت میں تکاسل اور اس کی عادت پڑ جانے کا سبب۔

(۴) افتراق کی صورت اور اس کا سبب۔ (خاص طور پر عید کی نماز جو کہ اعلام الدین میں سے ہے اور تمام مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا مظہر ہے)۔ (احسن الفتاوی:۳/ ۳۲۵، ۳۲۸، "الوصية الإخوانية فى الحكم الجماعة الثانية").

خلاصہ یہ ہے کہ دفع حرج کی وجہ سے مثلاً مسجد چھوٹی ہے اور مجمع بڑا ہے اور دوسرا کوئی انتظام بھی نہیں ہوسکتا ہے تو عیدین کی نماز مکرر پڑھنا جائز ہے چاہے مسجد میں ہو یا عید گاہ وغیرہ میں، لیکن محض تساہل اور سستی کی خاطر ہر گھنٹہ نماز پڑھنا جیسا کہ یورپ کی بعض مساجد میں ہوتا ہے یہ درست نہیں ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:
﴿وأذن فی الناس بالحج یأتوک رجالاً
وعلی کل ضامر یأتین من کل فج عمیق﴾
(سورۃ الحج)
وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
﴿من حج للہ فلم یرفث ولم یفسق
رجع کیوم ولدتہ أمہ﴾
(متفق علیہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:
﴿وللہ علی الناس حج البیت
من استطاع إلیہ سبیلاً﴾
وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
حین سئل ما یوجب الحج :
”الزاد والراحلۃ“

(ترمذی شریف)

باب ...... ﴿۱﴾

حج کے شرائط اور ارکان وغیرہ کا بیان

باب ﴿۱﴾

حج کی فرضیت، شرائط، ارکان وغیرہ کا بیان

حج کی رقم موجود ہے تو مکان بنانے میں خرچ کرنے یا حج کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کرایہ کے مکان میں رہتا ہے اور اس کے پاس حج کی رقم موجود ہے کیا یہ رقم ذاتی مکان کی خریداری میں خرچ کرنا چاہئے یا حج پہلے کرنا چاہئے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اس شخص نے اگر حاجیوں کے نکلنے سے پہلے رقم مکان بنانے میں خرچ کرلی تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر حاجیوں کے نکلنے تک رقم موجود ہے تو پہلے حج کرنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

فضلاً عما لا بد منه كما مر في الزكاة ومنه المسكن ومرمته ولو كبيراً يمكنه الاستغناء ببعضه، والحج بالفاضل فإنه لايلزمه بيع الزائد، نعم هو الأفضل،وعلم به عدم لزوم بيع الكل والاكتفاء بسكنى الإجارة بالأولىٰ، وكذا لوكان عنده مالو اشترى به مسكناً وخادماً لايبقى بعده مايكفي للحج لايلزمه،خلاصة، وحررفي النهر أنه يشترط بقاء رأس مال لحرفته إن احتاجت لذلك، وإلا لا، وفي الأشباه: معه ألف وخاف العزوبة إن كان قبل خروج أهل بلده فله التزوج ولو وقته لزمه الحج.وفي الشامية:قوله لايلزمه تبع في عزوذلك إلى الخلاصة ما في البحر والنهر، والذي رأيته في الخلاصة هكذا وإن لم يكن له مسكن ولاشيء من ذلك، وعنده دراهم تبلغ به الحج وتبلغ ثمن مسكن وخادم وطعام وقوت وجب عليه الحج، وإن جعلها في غيره أثم. لكن هذا إذاكان وقت خروج أهل بلده كما

صرح به في اللباب أما قبله فيشتري به ماشاء لأنه قبل الوجوب كما في مسئلة التزوج الآتية، وعليه يحمل كلام الشارح، فتدبر. (الدرالمختارمع الشامي:٢/٤٦١،سعيد).

فتح القدیر میں ہے:

وذكر المصنف في التجنيس: أنه إذاكان له مال يكفي للحج وليس له مسكن ولاخادم أوخاف العزوبة فأراد أن يتزوج ويصرف الدراهم إلى ذلک، إن كان قبل خروج أهل بلده إلى الحج يجوز لأنه لم يجب الأداء بعد، وإن كان وقت الخروج فليس له ذلک لأنه قد وجب عليه. (فتح القدير:٢/٣٢٤، رشيديه).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اگر مکان کی ضرورت حج سے پہلے ہی پیش آ گئی اوراس مجبوری کی وجہ سے مکان بنالیا تو اس کے ذمہ حج فرض نہیں ہوا تھا، اگر وقتِ حج یعنی جس وقت کہ لوگ آس پاس سے حج کے لیے جارہے تھے اس وقت تو مکان کی ضرورت نہ تھی، بلکہ بعد میں ضرورت پیش آئی اوراس میں روپیہ خرچ کرلیا تو اس کے ذمہ حج فرض ہو چکا تھا۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۰/۲۹۰،مبوب ومرتب)۔واللہ ﷻ اعلم۔

حج کی فرضیت کے بعد بیوی بچوں کا منع کرنا:

سوال: ایک شخص حج کے لیے جانا چاہتا ہے اور بیوی بچے مکان میں رہنے سے ڈرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ حج کے لیے نہ جائیں تو کیا کرنا چاہئے اور حج فرض اور نفل میں کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟

الجواب: جس شخص پر حج فرض ہو اس کو اسی سال حج کرنا ضروری ہے تاخیر کرنا صحیح نہیں ہے، اور بیوی بچوں کا انکار کرنا صحیح نہیں، اس کی طرف خیال نہ کرے جبکہ شرائط موجود ہوں اور موانع نہ ہوں، اور مرد کے خیال میں عورت، بچوں کے لیے کوئی خطرہ نہ ہو، ہاں نفل حج ہو تو اس میں مصلحت دیکھی جائے گی یعنی گھر والوں کے لیے اطمینان کے اسباب مہیا کردے پھر حج کرے، مصلحت کا خیال رکھ کر خود فیصلہ کرلے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وروينا عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: من ملک زاداً وراحلة تبلغه إلى بيت الله الحرام، فلم يحج فلا عليه أن يموت يهودياً أونصرانياً، ألحق الوعيد عمن أخر الحج عن أول أوقات الإمكان. (بدائع الصنائع:٢/١١٩، سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وكذا إن كرهت خروجه زوجته وأولاده أومن سواهم ممن تلزمه نفقته وهو لايخاف الضيعة عليهم فلا بأس بأن يخرج . (الفتاوى الهندية:١/٢٢١ـوكذا في الفتاوى التاتارخانية:٢/٥٧٧).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

فرضیتِ حج کے بعد اسی سال حج کرنے کے لیے جانا ضروری ہے جب کہ کوئی شرعی عذر نہ ہو بلا وجہ سال دو سال تاخیر کرنے پر فاسق وگنہگار ہوگا اور اگر حج ادا نہ کر سکا تو سخت وعید اور سزا کا مستحق ہوگا۔(فتاویٰ رحیمیہ:۵/۲۱۵)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

مطلق نیت سے فرضیت کی ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک شخص نے والد کے اخراجات سے ۱۹ سال کی عمر میں حج کرلیا تھا لیکن یہ یاد نہیں کہ فرض حج کی نیت کی تھی تو اس کا فرض ادا ہوا تھا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں جب مطلق نیت کی تھی تو حج فرض ادا ہو گیا تھا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ولو أطلق نية الحج صرف للفرض .(الدر المختار ٢/٤٨٦، سعيد).

شامی میں ہے:

قوله ولو أطلق نية الحج بأن نوى الحج ولم يعين فرضاً ولا نفلاً . (رد المحتار ٢/٤٨٦) وطحطاوى على الدر ١/٤٩٢)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

عورت کا خسر کے ساتھ سفرِ حج پر جانے کا حکم:

سوال: ایک عورت پر حج فرض ہے، لیکن اس کے پاس محرم کو ساتھ لے جانے کا خرچہ نہیں ہے، اور اس کے خسر حج کے لیے جانے والے ہیں تو کیا یہ عورت اپنے خسر کے ساتھ حج فرض کے لیے جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں عورت اپنے حقیقی خسر کے ساتھ سفر حج میں جاسکتی ہے، ہاں اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو خلوت سے بچے، مرد دوسرے مردوں کے ساتھ رہے اور عورت دیگر عورتوں کے ساتھ رہے، اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تب بھی تہمت اور وساوس سے بچنے کے لیے الگ الگ رہنا چاہیے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

والمحرم الزوج ومن لا يجوز مناكحتها على التأبيد بقرابة أو رضاع أو مصاهرة، كذا في الخلاصة . (الفتاوى الهندية: ١/٢١٩).

شامی میں ہے:

قوله مع زوج أو محرم والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التابيد بقرابة أو رضاع أو صهرية كما في التحفة .(شامي: ٢/٤٦٤، سعيد).

دوسری جگہ مذکور ہے:

قوله مصاهرة وموطؤات أبنائه وأبناء أولاده وإن سفلوا .(شامي:٣/٢٨، سعيد).

زبدۃ المناسک میں ہے:

حج کے سفر میں عورت کے ساتھ وہ محرم آدمی ہونا ضروری ہے جس سے اس عورت کو تا زندگی نکاح کرنا حرام ہو اور یہ حرمت قرابت کے سبب سے ہو یا دودھ پینے سے ہو یا حرمت مصاہرت نکاح۔ (زبدۃ المناسک، واجب ادا ہونے کی تیسری شرط، ص۳۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

داماد کے ساتھ سفر حج پر جانے کا حکم:

سوال: عورت اپنے داماد کے ساتھ سفر حج میں جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں عورت اپنے داماد کے ساتھ سفر حج میں جاسکتی ہے، لیکن فتنہ کا اندیشہ ہو تو نہ جائے، نیز خلوت وغیرہ سے اجتناب کرنا چاہئے۔

قال الله تعالىٰ : ﴿حرمت عليكم... وأمهات نسائكم﴾.

وعن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه قال: حرم من النسب سبع و من الصهر سبع ثم قرأ حرمت عليكم أمهاتكم .(رواه البخاري، مشكاة :٢/٢٧٥).

وفي الشامي : فصل في المحرمات...وأمهات الزوجات. (فتاوى الشامية:٣/٢٨، فصل فى المحرمات ، سعيد).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

داماد اپنی ساس کے لیے محرم ہے ان میں ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے، فتاوی عالمگیری میں ہے: **القسم**

الثاني المحرمات بالصهرية : وهي أربع فرق الأولىٰ أمهات الزوجات. (عالمگیری) مگر آج کل فتنہ کا زمانہ ہے، سسرالی رشتہ سے احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً جب کہ جوان ہوں۔(فتاوی رحیمیہ:۸/۲۸۷۔وکذا فی معلم الحجاج: ص۹۵۔وعزیز الفتاویٰ:۳،۴/۷۵)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

عورت اپنے شوہر، حقیقی بھائی، چچا، ماموں، رضاعی بھائی اور اپنے داماد کے ساتھ حج کو جاسکتی ہے، نیز اپنی لڑکی کی موت کے بعد بھی داماد کے ساتھ حج کو جاسکتی ہے۔(ایضاح المسائل:ص۱۲۳،نعیمیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

دادی کے دوسرے شوہر کے ساتھ سفر حج کا حکم:

سوال: ایک عورت اپنی دادی کے دوسرے شوہر کے ساتھ سفر حج پر جاسکتی ہے یا نہیں؟ جبکہ یہ شخص اس عورت کا حقیقی دادا نہیں ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دوسرے شوہر کی اس کی دادی سے شادی اور ہمبستری کرنے سے حرمت علی التابید ثابت ہو جاتی ہے، لہذا سفر حج پر جانا درست ہے، کیونکہ یہ عورت اس شخص کی پوتی کے درجہ میں ہوگئی۔

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما الفرقة الثانية فبنت الزوجة وبناتها وبنات بناتها وبنيها وإن سفلن، وأما بنت زوجته فتحرم عليه بنص الكتاب العزيز، إذا كان دخل بزوجته فإن لم يكن دخل بها فلا تحرم لقوله :" وربائبكم اللاتي في حجوركم من نسائكم اللاتي دخلتم بهن " الخ، وسواء كانت بنت زوجته في حجره أو لا، عند عامة العلماء .

وأما بنات بنات الربيبة وبنات أبنائها وإن سفلن فتثبت حرمتهن بالإجماع وبما ذكرنا من المعنى المعقول، لا بعين النص، إلا على قول من يرى الجمع بين الحقيقة والمجاز في لفظ واحد عند إمكان العمل بهما . (بدائع الصنائع ۲/۲۵۹، النوع الثاني في المحرمات بالمصاهرة، سعيد).

شامی میں ہے:

ويدخل أي في قوله وبنت زوجته بنات الربيبة والربيب وثبتت حرمتهن بالإجماع، وقوله تعالى: وربائبكم ، بحر. (شامی: ۳/۳۱،سعید).

لیکن عورت محرم سے مطمئن نہ ہوتو سفر کرنا جائز نہیں۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

ولهذا قالوا : إن المحرم إذا لم يكن مأموناً عليه لم يجز لها أن تسافر معه . (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۲٤، سعید) ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بہن کے پوتے کے ساتھ سفر حج پر جانے کا حکم:

سوال: ایک عورت اپنی بہن کے پوتے کے ساتھ حج کے لئے جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں حرمت علی التابید ہونے کی وجہ سے سفر حج پر جانا درست ہے، کیونکہ یہ عورت اس کے باپ کی خالہ ہے اور باپ کی خالہ اپنی خالہ کے حکم میں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں عالمگیری میں ہے:

القسم الأول المحرمات بالنسب:۔ وهن ... وخالات آبائه وأمهاته . (الفتاوی الهندية: ۱/ ۲۷۳، فی بیان المحرمات۔ وبدائع الصنائع: ۲/ ۲۵۷، فصل ومنهاان تكون المرأة محللة، سعید).

واللہ تعالیٰ اعلم۔

حنفی قافلہ کے ساتھ دو عمر رسیدہ خواتینِ شافعیہ کے سفر حج کا حکم:

سوال: حج کا حنفی قافلہ جا رہا ہے ان کے ساتھ شافعی مسلک کی دو عمر رسیدہ خواتین بغیر محرم کے جانے کی درخواست کرتی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ ان کے نزدیک جائز ہے، یعنی ایک بڑی جماعت کے ساتھ بغیر محرم کے حج میں جانا جائز ہے۔ اب ان کو ساتھ لیجانے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں چونکہ مذہبِ شافعی میں اس طرح سفر کرنے کی گنجائش ہے، لہذا قافلہ والے ان کو ساتھ لے جاسکتے ہیں یہ جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وقال الشافعيؒ: يجوز لها الحج إذا خرجت في رفقة ومعها نساء ثقات لحصول الأمن بالمرافقة . (الهداية: ۱/ ۲۳۳).

وفي غنية الناسک : المحرم أو الزوج لامرأة بالغة ولو عجوزاً ومعها غيرها من النساء الثقات والرجال الصالحين كبير في مسيرة سفر. (غنية الناسك: ۱۰، ادارة القرآن).

مرقات میں ہے:

وقال الشافعيؒ: يلزمها إذا كان معها امرأة ثقة ... ومذهب الشافعيؒ إذا وجدت نسوة ثقات فعليها أن تحج معهن . (مرقات :۵/۲٦۸، ملتان).

شرح مہذب میں ہے:

أما حكم المسئلة فقال الشافعيؒ والأصحاب: لا يلزم المرأة الحج إلا إذا أمنت على نفسها بزوج أو محرم نسب أو غير نسب أو نسوة ثقات فأي هذه الثلاثة وجد لزمها الحج بلا خلاف . (شرح المهذب ۸٦/۷، دار الفكر)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

سفر حج میں شوہر کا انتقال ہوجائے تو عورت کے لیے حج کا حکم:

سوال: اگرکسی عورت کا شوہر سفر حج میں انتقال کرجائے تو عدت کیسے گزارے گی، نیز حج کرے گی یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مکہ مکرمہ اوروطن دونوں میں جوقریب ہووہاں واپس لوٹ جائے، اور وہیں عدت گزارلے، وہاں سے نہ نکلے، اورحج کے ایام میں اگرمحرم ساتھ ہوتو صاحبین کے مذہب کے مطابق حج کرسکتی ہے، اس زمانہ میں اگرصاحبین کے مذہب کواختیارکیاجائے تو درست ہے۔

ملاحظہ ہوغنیۃ الناسک میں ہے:

وأما شرائط وجوب الأداء فخمسة على الأصح... الخامس عدم عدة عليهامطلقاً سواء كانت من طلاق بائن أورجعي أووفات...فإن حجت وهي في العدة جازت بالاتفاق وكانت عاصية والعدة أقوى في منع الخروج من عدم المحرم حتى منعت مادون السفر فإن لزمتها في السفر...فإن كان إلى كل من بلدها ومكة أقل من مدة السفر تخيرت أو إلى أحدها سفر دون الآخر تعين أن تصير إلى الآخر أو كل منهما سفر فإن كانت في مصر قرت فيه إلى أن تنقضي عدتها ولاتخرج وإن وجدت محرماً عند أبي حنيفةؒ، وقالا: لها أن تخرج إذا وجدت محرماً وإن كانت في قرية أومفازة لا تأمن على نفسها ومالها فلها أن تمضي إلى موضع آمن فلا تخرج عنه حتى تمضي عدتها وإن وجدت محرماً عنده خلافاً لهما .(غنية الناسك فى بغية المناسك:۱۲، شرائط وجوب الاداء ،ادارة القرآن۔وكذا فى ارشاد السارى الى مناسك الملا على القارى:٦٤ ،بيروت).

زبدۃ المناسک میں ہے کہ اگر حج نہ کرے گی تو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، لہٰذا معذور سمجھی جائے گی اور حج کرنا جائز ہوگا۔ (ملخص از زبدۃ المناسک: ۳۶، واجب ادا ہونے کی چوتھی شرط، مکتبہ اشرفیہ).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

موجودہ زمانہ میں اپنے ملک کی حدوں سے نکلنے کے بعد مکہ سے پہلے قانونی مشکلات کی وجہ سے نہ قیام ممکن ہوتا ہے اور نہ سفر سے واپسی آسان ہوتی ہے، پھر قافلہ حج میں بڑی تعداد میں خواتین ہوتی ہیں ان کے ساتھ کسی خاتون کے رہنے میں فتنہ کے مواقع کم ہو جاتے ہیں اس لیے اگر ہندوستان سے نکلنے کے بعد شوہر کی وفات ہوگئی تو سفر حج مکمل کر لینے کی گنجائش ہونی چاہئے، اور امام شافعیؒ کی اس رائے کو اختیار کرنا چاہئے کہ اگر رفقائے سفر میں کچھ ثقہ خواتین بھی موجود ہوں تو عورت محرم کے بغیر بھی ان کے ساتھ سفر حج کر سکتی ہے۔

يجوز لها الحج إذا خرجت في رفقة ومعها نساء ثقات لحصول الأمن بالمرافقة. (الهداية مع الفتح: ۲/ ٤٢٠) (جدید فقہی مباحث: ۱۳/ ۱۳۵، ادارۃ القرآن)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بغیر محرم کے سفر کرنے پر ایک حدیث سے استدلال کا جواب:

سوال: کیا عورت بغیر محرم کے سفر حج کر سکتی ہے یا نہیں؟ جب کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ عورت عراق سے مکہ سفر کرے گی اور صرف اللہ تعالیٰ کا خوف ہوگا۔

الجواب: عورت بغیر محرم کے سفرِ شرعی طے نہیں کر سکتی، شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا بغیر محرم کے سفر حج کی بھی اجازت نہیں، اور یہ ممانعت حدیث سے ثابت ہے۔ (ہاں بعض اکابرؒ فرماتے ہیں کہ اگر عمر رسیدہ خاتون کے بغیر محرم جانے میں فتنہ نہ ہو، اجنبیوں کے ساتھ اختلاط وخلوت نہ ہو تو اس کے لیے عورتوں کے قافلہ میں جانے کی گنجائش ہے)۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث میں ہے:

عن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تسافر سفراً يكون ثلاثة أيام فصاعداً إلا ومعها أبوها أو ابنها أو زوجها أو أخوها أو ذو محرم منها. (مسلم شريف: ١/ ٤٣٤، باب سفر المرأة مع محرم الى حج وغيره)

سوال میں پیش کی گئی حدیث ملاحظہ فرمائیں:

لترين الظعينة ترتحل من الحيرة حتى تطوف بالكعبة لا تخاف أحداً إلا الله. (رواه البخاري: ۱/۵۰۷).

اس حدیث شریف کا جواب یہ ہے کہ اس میں امن وامان بیان کرنا مقصود ہے، عورت کا بغیر محرم کے سفر کا جواز بیان کرنا مقصود نہیں ہے، اس لیے کہ ابتداء حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیشین گوئیاں سنا رہے تھے کہ ایسا زمانہ بھی آئے گا اور اتنا امن وامان ہوگا کہ عورت حیرہ سے مکہ مکرمہ تک سفر کرے گی اور کوئی خوف وہراس نہ ہوگا سوائے اللہ تعالیٰ کے یعنی ایسا امن وامان ہوگا جس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ نیز ذخیرۂ احادیث میں ایسی بہت ساری مثالیں موجود ہیں کہ بیان کرنے کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے اور اصل حکم دوسری جگہ مذکور ہوتا ہے، جسکی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

حدیث پاک میں آتا ہے:

وعن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والذي نفسي بيده لو لم تذنبوا لذهب الله تعالىٰ بكم ولجاء بقوم يذنبون ويستغفرون الله تعالىٰ فيغفر لهم. (رواه مسلم: ۲/۳۵۵، باب سقوط الذنوب بالاستغفار والتوبة).

اس حدیث شریف میں کوئی گناہ کی فضیلت بیان کرنا یا گناہ پر ابھارنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ توبہ کتنی محبوب اور مطلوب چیز ہے، اور جہاں تک گناہ کا تعلق ہے تو اس کا حکم دیگر احادیث سے معلوم ہوگا کہ کتنا مذموم اور خطرناک ہے اور اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرنا ہے۔

(اس حدیث کی ایک توجیہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کے کلام کی روشنی میں یہ ہوسکتی ہے: کہ فتنہ نہ ہونے کی صورت میں عورت کے لیے اکیلے سفر کی گنجائش ہے، کما سیأتي).

حاصل کلام یہ ہے کہ عورت کے لیے بغیر محرم کے سفرِ شرعی کی اجازت نہیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عمر رسیدہ خاتون کا بغیر محرم کے سفر حج کرنے کا حکم:

سوال: ایک عورت کی عمر تقریباً ۷۵ سال ہے، حج کی رقم اس کے پاس موجود ہے لیکن اس کا کوئی محرم نہیں، وہ حج پر ایسے قافلہ کے ساتھ جانا چاہتی ہے جس میں کافی ساری خواتین موجود ہیں، اس قافلہ میں اس کا ایک چچازاد بھائی بھی ہے، اس کو حج کا بے انتہا شوق ہے، کیا یہ حنفی عورت حج پر جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: عام طور پر فقہاء یہ تحریر فرماتے ہیں کہ بغیر محرم کے حج کا سفر کرنا جائز نہیں ہے۔

لیکن حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ ایک ۷۵ سالہ عورت قابل اعتماد عورتوں کے قافلہ کے ساتھ حج کے لیے جاسکتی ہے یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحبؒ نے اجازت مرحمت فرمائی اور دلیل میں درمختار کی یہ عبارت پیش فرمائی:

أما العجوز التي لا تشتهي فلا بأس بمصافحتها ومس يدها إذا أمن، ومتى جاز المس جاز سفره لها، ويخلو إذا أمن عليه وعليها، وإلا لا. (الدر المختار:٦/٣٦٨، سعيد).

فیض الباری میں ہے:

وفي كتب الحنفية عامة عدم جواز السفر إلا مع محرم قلت: ويجوز عندي مع غير محرم أيضاً بشرط الاعتماد والأمن عن الفتنة، وقد وجدت له مادة كثيرة في الأحاديث، أما في الفقه، فهو مسائل الفتن. (فيض الباری:٢/٣٩٧).

حاشیہ میں مرتب صاحب لکھتے ہیں:

منها: أمر النبي صلى الله عليه وسلم أبا العاص أن يرسل زينب رضى الله عنها مع رجل لم يكن لها محرماً، ومجيىء عائشة رضى الله عنها في قصة الإفك. (حاشية فيض الباری:٢/٣٩٧).

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا:

حنفی مذہب میں تو اس صورت میں بھی اجازت نہیں اور شافعی مذہب میں اگر ثقہ عورتیں ہمراہ ہوں تو اجازت ہے اور حنفی کو کسی خاص مسئلہ میں شافعی کی تقلید بوقتِ ضرورت جائز ہے، ضرورت کا فیصلہ میں نہیں کرسکتا۔ اشرف علی ۲۳/ رمضان ۱۳۵۷ھ۔ (مجالس حکیم الامت: ص ۲۹۰، مرتب حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ)۔

بعض حضرات نے حدیث "**لترين الظعينة ترتحل من الحيرة حتى تطوف بالكعبة لا تخاف الا الله**" (بخاری:١/٥٠٧) کی روشنی میں فتنہ نہ ہونے کی صورت میں عورت کے لیے تنہا سفر کی گنجائش بیان کی ہے۔

نوٹ: یاد رہے کہ یہ ایک توجیہ کے مطابق ہے ورنہ اس حدیث سے استدلال اور اس کا جواب ذکر کیا جاچکا، لہٰذا تعارض نہ سمجھا جائے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حج کے سفر میں جانے کی وجہ سے ایامِ غیابت کی تنخواہ کا حکم:

سوال: ایک مدرس فرض حج کے لیے جانا چاہتا ہے کیا وہ ان ایام کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مدرس کے ساتھ معاہدہ یا مدرسہ کا قانون ہے تو اس پر عمل کیا جائے ورنہ دیگر مدارس کے قانون پر عمل کیا جائے، ہمارے ہاں فرض حج کے لیے تنخواہ کے ساتھ رخصت دینے کا معمول ہے۔

فتاویٰ الشامی میں ہے:

أما لو شرط شرطاً تبع كحضور الدرس أياماً معلومة في كل جمعة فلا يستحق المعلوم إلا من باشر خصوصاً إذا قال: من غاب عن الدرس قطع معلومة فيجب اتباعه. (فتاوى الشامية: ٤/٤١٩، سعيد).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

البتہ معلوم وعرف کے موافق ایام تعطیل ورخصت کی تنخواہ ان کو دینا درست ہے اور اس بارہ میں امام ومؤذن ودیگر ملازمین وقف مساوی ہیں۔ (عزیز الفتاوی: جلد پنجم ششم ۲۵۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اشہر حج میں مکہ مکرمہ جانے سے فرضیتِ حج کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص یکم شوال کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوا مگر اس کے پاس حج کرنے کا خرچہ نہیں ہے، اور نہ اس سال حج کرنے کا ارادہ ہے، تو کیا اس پر حج فرض ہوگا یا نہیں؟ ہاں اس کے پاس ویزا موجود ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں خرچہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر حج فرض نہیں ہوا۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

والحاصل أن الزاد لابد منه ولو لمكي كما صرح به غير واحد كصاحب الينابيع والسراج، وما في الخانية والنهاية من أن المكي يلزمه الحج ولو فقيراً لازاد له نظر فيه ابن الهمام، إلا أن يراد ما إذا كان يمكنه الاكتساب في الطريق، وأما الراحلة فشرط للآفاقي دون المكي القادر على المشي، وقيل شرط مطلقاً، لأن ما بين مكة وعرفات أربع فراسخ، ولا يقدر كل واحد على مشيها، كما في المحيط، وصحح صاحب اللباب في منسكه الكبير الأول، ونظر فيه شارحه القاري، بأن القادر نادر ومبنى الأحكام على الغالب. (فتاوى الشامية: ٢/٤٦٠، سعيد).

شرح لباب میں ہے:

والزاد فقط في حق المكي أي ومن في حكمه ممن ليس يوجد في حقه تلك المسافة،

إن قدر علی المشي أي بلا كلفة ومشقة وإلا فكالآفاقي،أي وإن لم يقدر المكي على المشي فحكمه كالآفاقي في اشتراط الراحلة له أيضاً . (شرح اللباب :٤٥،بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

السادس الاستطاعة: ۔ وهي القدرة على زاد يليق بحاله ولو لمكي ملكاً لا بالإباحة .

(غنية الناسك :٤، باب شرائط الحج ،ادارة القرآن).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

زادِ راہ پر قادر ہونے کی شرط عام ہے اہل مکہ اور غیر اہل مکہ سب کے لیے ہے، لیکن راحلہ (سواری) پر قادر ہونا غیر اہل مکہ یعنی آفاقی کے حق میں شرط ہے..اگر وہ بلا مشقت پیدل چلنے پر قادر نہیں ہے تو وہ بھی سواری پر قادر ہونے کی شرط میں آفاقی کے حکم میں ہے۔(عمدۃ الفقہ :۴/۳۷،مجددیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ایام حج تک رہنے کا ویزانہ ہونے پر فرضیت کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص پہلی مرتبہ عمرہ کے لیے رمضان میں گیا اور شوال تک رہا شوال کا چاند بھی طلوع ہوگیا اس حال میں کہ وہ سعودی میں تھا لیکن قانوناً اس کے لیے رہنا درست نہیں ہے کیا اس پر حج فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر ویزا بڑھانا ممکن ہے اور رہنے کی استطاعت بھی ہے یا اپنے ملک جا کر دوبارہ آنے کی استطاعت بھی ہے تو حج فرض ہوگا،ورنہ نہیں،البتہ بعض علماء کا قول ہے کہ اگر استطاعت ہو تو مکہ مکرمہ سے حج بدل کرا دینا چاہئے۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مسائل میں ہے:

بعض اوقات لوگ شوال، ذوالقعدہ میں مکہ مکرمہ آجاتے ہیں حج ان پر فرض ہوتا ہے، لیکن ان کا ویزا زمانہ حج کا نہیں ہوتا ہے اور قانونی اعتبار سے وہ حج تک نہیں رک سکتے ،ایسی صورت میں اگر ان پر حج فرض باقی ہو تب تو ان کو پوری پوری کوشش کرنی چاہئے کہ کس طرح وہ حج کر لیں۔

لیکن اگر قانونی مجبوری کے تحت حج تک اس کا قیام ممکن نہ ہو تو پھر حج اس پر فرض نہیں ہوگا،اس لیے کہ استطاعتِ سبیل جس کو قرآن نے حج فرض ہونے کے لیے شرط قرار دیا ہے اس کے حق میں مفقود ہے، نیز بعض حضرات کی غلط فہمی کے پیشِ نظر عرض ہے کہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو لوگ حج ادا کر چکے ہیں ان پر حج کے زمانہ میں عمرہ کرنے کی وجہ سے دوبارہ حج فرض نہیں ہو جاتا۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۵۶،نعیمیہ)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

اگر شوال وہیں شروع ہوگیا اور اس کے پاس حج کے مصارف بھی ہوں تو حج فرض ہوجائے گا، اگر حکومت کی طرف سے حج تک ٹھہرنے کی اجازت نہ ہوتو فرضیتِ حج میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ اس پر حج بدل کرانا فرض ہے مکہ مکرمہ ہی سے حج کرادے، بعد میں خود حج کی استطاعت ہوگئی تو دوبارہ کرے۔(احسن الفتاوی :۴/ ۵۱۹).

مزید ملاحظہ ہو: آپ کے مسائل اوران کا حل:۴/ ۳۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

صفامروہ کی توسیع کے بعد سعی کا حکم:

سوال: آج کل صفامروہ کی عرضاً بہت توسیع ہورہی ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ توسیع والی جگہ اصل مسعی سے ہٹی ہوئی ہے اس لیے توسیع کے بعد مسعی محل تأمل ہے، تو یہ بات درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اولاً یہ معلوم ہونا چاہئے کہ صفا اور مروہ دو پہاڑوں کے نام ہیں، اور پہاڑ طویل اور عریض ہوتا ہے لہذا توسیع کے بعد بھی مسعیٰ میں کوئی خلل نہیں ہوگا، بلکہ کسی زمانہ میں تو ان دونوں پہاڑوں کے درمیان مکانات تھے اور لوگ مکانات سے باہر کی طرف سعی کرتے تھے۔

لسان العرب میں ہے:

الصفا: العريض من الحجارة الأملس جمع صفاة يكتب بالألف ...ومنه الصفا و المروة وهما جبلان بين بطحاء مكة و المسجد... الصفا اسم أحد جبلي المسعى و الصفا موضع بمكة. (لسان العرب:۷/ ۳۷۱).

یاد رہے کہ جبل لمبے چوڑے پہاڑ کو کہتے ہیں۔

لسان العرب میں ہے: " **الجبل اسم لكل وتد من أوتاد الأرض إذا عظم وطال.** (لسان العرب تحت مادة الجبل:۱۱/ ۹۶).

چھوٹے کو جبل نہیں کہتے، جب صفامروہ لمبے چوڑے پہاڑ ہیں تو مسعی بھی چوڑا ہوگا۔

نیز مذکور ہے:

المرو...واحدتها مروة...ومروة المسعى التي تذكر مع الصفا وهي أحد رأسيه الذين ينتهي السعي إليها سميت بذلك...والمروة جبل مكة شرفها الله تعالىٰ في التنزيل العزيز

﴿ إن الصفا والمروة من شعائر الله ﴾. (لسان العرب:۸۹/۱۳).

نیز ملاحظہ ہو: المعجم الوسيط:۸٦٥۔والمنجد في الاعلام:۳٤٥۔ومعجم البلدان:۴۱۱/۳۔وعمدة القاری:۲۲۸/۷۔والجامع لاحکام القرآن:۲/۲).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

سعی کا صفامروہ کے درمیان ہونا سعی کا رکن ہے اس طرح پر کہ صفامروہ کی اصل چوڑائی سے اِدھر اُدھر باہر نکل کر سعی نہ کرے، منسک الکبیر میں اس کو سعی کا رکن قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے، پس اگر مسعیٰ (سعی کی جگہ) سے باہر سعی کی تو جائز نہیں ہے۔

فائدہ مہمہ: شیخ عبدالرحمٰن المرشدیؒ نے کنز کی اپنی شرح میں ذکر کیا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیانی مسافت سات سو پچاس ذراع ہے، پس اس حساب سے مکمل سعی یعنی ساتوں چکر کی مسافت پانچ ہزار دو سو ذراع (ہاتھ) ہوئی، اور شمنی میں ہے کہ صفا و مروہ کا درمیانی فاصلہ سات سو چھیاسٹھ ذراع ہے، مسعیٰ کے عرض کے متعلق علامہ شیخ قطب الدین حنفی نے اپنی تاریخ الفاکہی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ پینتیس ذراع ہے اور جب مسعیٰ میں آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی کی ہے وہ عریض تھا بعدازاں اس قدیم مسعیٰ کے عرض میں مکانات تعمیر ہو گئے، پھر خلیفہ مھدیؒ نے ان مکانات کو منہدم کرا دیا اور ان میں سے بعض کو مسجد حرام میں داخل کرا دیا اور بعض کو چھوڑ دیا اس وقت مسعیٰ کا جس قدر عرض رہ گیا اب تک وہی ہے اور آج کل اسی میں سعی کی جاتی ہے۔

(از منحة،ملخصاً عن حاشية المدني،وغنية ،ملخصاً عن منحة).

(اب حکومتِ سعودیہ نے مسجد حرام کی توسیع کی تو مسعیٰ کو بھی نئے سرے سے بہت خوبصورت انداز پر تعمیر کرایا ہے اور درمیان میں پارٹیشن کر کے صفا سے مروہ کا راستہ الگ اور مروہ سے صفا کا راستہ الگ کر دیا ہے تا کہ سعی کرنے والوں کو دقت نہ ہو، مؤلفؒ)

(عمدۃ الفقہ :حصہ چہارم، کتاب الحج:۲۰۰،مجددیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

طواف میں اضطباع کا حکم:

سوال: طواف میں اضطباع صرف تین چکروں میں کرنا چاہئے جیسا کہ رمل کرتے ہیں یا پورے طواف میں کرنا چاہئے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں پورے طواف میں اضطباع کرنا سنت ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن ابن يعلى عن أبيه عن النبي صلى الله عليه وسلم طاف بالبيت مضطبعاً وعليه برد. (روه الترمذي:١/١٧٤،فيصل).

غنیۃ الناسک میں ہے:

فيطوف بالبيت سبعة أشواط وراء الحطيم مضطبعاً في جميعها. (غنية الناسك:٥٤،كراچى).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

فيطوف سبعة أشواط وقد اضطبع قبل ذلک كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية:١/٢٢٥).

نیز ملاحظہ ہو: شامی :٢/٤٩٥،سعيد-وزبدة المناسك مع عمدة السالك:١٤١)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

حج کا احرام باندھتے وقت ناخن وغیرہ کاٹنے کا حکم:

سوال: اگر حج کے دنوں میں کسی نے احرام باندھنے کی نیت کی تو اس سے پہلے ناخن اور مونچھوں کا کاٹنا اور صفائی کرنا مستحب ہے یا نہیں؟ جب کہ ایامِ عشرہ کی وجہ سے اس شخص نے واجب قربانی بھی خریدی یا ارادہ ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں احرام باندھتے وقت ناخن اور مونچھوں کا کاٹنا اور صفائی کرنا مستحب نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث شریف میں ہے:

عن أم سلمة رضي الله تعالىٰ عنها عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا دخلت العشر وأراد أحدكم أن يضحي فلا يمس من شعره وبشره شيئاً. وفي رواية عن أم سلمة رضي الله تعالىٰ عنها ترفعه قال: إذا دخل العشر وعنده أضحية يريد أن يضحي فلا يأخذن شعراً ولا يقلمن ظفراً. (رواهما مسلم) **قال الملا علي القاريؒ: أن النهي للتنزيهية فخلافه خلاف الأولىٰ ولا كراهة فيه.** (المرقات:٣/٣٠٧، ملتان).

غنیۃ الناسک میں ہے:

فإذا أراد أن يحرم يستحب له قبل الغسل كمال التنظيف بأن يقص شاربه ويقلم أظفاره وينظف إبطيه...تنبيه : وينبغي أن يستثنىٰ منه من يحرم في العشر وهو يريد التضحية فإن

المستحب لمن يريد التضحية أن لا يأخذ شعره ولايقلم ظفره في العشرحتى يضحي لما في صحيح مسلم... (غنية الناسك: ٣٤، کراچی)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

ذی قعدہ میں عمرہ کیا تو قصر کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ذی قعدہ میں عمرہ کیا اب یہ سوچا کہ قصر کرلوں تا کہ حج میں حلق ہو سکے تو اس کے لیے قصر بہتر ہے یا حلق؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں صراحۃً قصر کے افضل ہونے کی عبارت کسی فقہ کی کتاب میں نہیں ملی، لیکن فقہاء اور شراح حدیث نے متمتع کے لیے قصر کا ذکر کیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ چند دنوں کے بعد حج کا احرام باندھنا ہے پھر حلق کرنا ہے اس لیے متمتع قصر کرلے اس سے معلوم ہوا کہ شخص مذکور بھی قصر کرلے تا کہ حج کے لیے بال رہ جائیں اور حلق ہو سکے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن جابر بن عبد اللّٰه رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: أهل النبي صلى اللّٰه عليه وسلم هو وأصحابه بالحج وليس مع أحد منهم هدي غير النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وطلحة رضي اللّٰه تعالىٰ عنه وقدم علي رضي اللّٰه تعالىٰ عنه من اليمن ومعه هدي، فقال: أهللت بما أهل النبي صلى اللّٰه عليه وسلم، فأمر النبي صلى اللّٰه عليه وسلمأصحابه أن يجعلوها عمرة ويطوفوا ثم يقصروا أويحلقوا إلا من كان معه الهدي الخ.... (رواه البخاري: ١/٢٢٤).

عمدۃ القاری میں ہے:

"قصروا" أمرهم بالتقصير لأنهم يهلون بعد قليل بالحج وأخر الحلق لأن بين دخولهم وبين يوم التروية أربعة أيام فقط. (عمدة القاري: ٧/١١٥، ملتان).

مرقات میں ہے:

" وقصروا " قال الطيبيؒ وإنما قصروا مع أن الحلق أفضل لأن يبقى لهم بقية من الشعر حتى يحلق في الحج، وليكون شعرهم في ميزان حجتهم أيضاً سبباً لزيادة أجرهم وليكونوا داخلين في المقصرين والمحلقين جامعين بين العمل بالرخصة والعزيمة.

(مرقات: ٥/٢٩٧، ملتان)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

طوافِ نفل کا طوافِ صدر کے قائم مقام ہونے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے طوافِ زیارت کے بعد طوافِ نفل کیا تو طوافِ وداع کے قائم مقام ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں طوافِ زیارت کے بعد کیا جانے والا نفل طواف طوافِ وداع کے قائم مقام ہے۔

ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں ہے:

والشرط أصل النية لا التعيين حتى لوطاف بعد طواف الزيارة لايعين شيئاً أو نوى تطوعاً كان للصدر لأن الوقت تعين له، بدائع. (غنية الناسك في بغية المناسك: ١٠١، ادارة القرآن).

بدائع الصنائع میں ہے:

فـأما تعيين النية فليس بشرط حتى لوطاف بعد طواف الزيارة لايعين شيئاً أونوى تطوعاً كان للصدر، لأن الوقت تعين له فتنصرف مطلق النية إليه كما في صوم رمضان. (بدائع الصنائع: ٢/ ٢١٦، سعيد).

زبدۃ المناسک میں ہے:

مسئلہ: اس طواف میں اگر صدر کی نیت نہ کی تب بھی جائز ہو جائے گا، پس اگر کسی نے طوافِ زیارت کے بعد نفلی طواف کرلیا ہو اور چلتے وقت طواف نہ کیا تو بھی ادا ہوگیا۔ (زبدۃ المناسک مع عمدۃ السالک: ۲۲۸، مکتبہ اشرفیہ)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

مطاف میں حجرِ اسود کی لکیر کا حکم:

سوال: آج کل مطاف سے حجرِ اسود کی لکیر مٹادی ہے اگر حاجی لکیر سے پہلے طواف ختم کرلے یا لکیر کے بعد طواف شروع کرلے تو کیا حکم ہوگا؟ اور کیا لکیر کا موجود ہونا بدعت ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں نہیں تھی، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں شروع ہوئی۔

الجواب: حجرِ اسود کی لکیر طائفین کی آسانی کے لیے تھی تاکہ حجرِ اسود کی محاذات بآسانی معلوم ہوسکے، اس کو باقی رکھنا آسانی کے لیے بہتر ہے، نیز جو عمل خلفائے راشدین یا صحابہ کے زمانہ میں صحابہ نے بغیر نکیر کیا ہو وہ بدعت نہیں، اگر اپنے خیال میں حجرِ اسود کے بالمقابل طواف شروع کیا اور اس پر ختم کیا تو طواف ہو جائے گا، احتیاطاً ذرا پہلے سے شروع کرنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن جابر رضي الله تعالیٰ عنه قال: لما قدم النبي صلى الله عليه وسلم مكة دخل المسجد فاستلم الحجر ثم مضیٰ علی يمينه. (رواه الترمذی:۱/۱۷٤،باب كيفية الطواف).

شرح لباب میں ہے:

ثم يقف مستقبل البيت بجانب الحجر الأسود مما يلي الركن اليماني بحيث يصير جميع الحجر عن يمينه ويكون منكبه الأيمن عند طرف الحجر فنوى الطواف وهذه الكيفية مستحبة أي للخروج عن خلاف من يشترط المرور علی الحجر بجميع بدنه.قال الكرماني: وهو الأكمل والأفضل عند الكل لأن الخروج عن الخلاف مستحب بالإجماع.

(شرح لباب المناسك:١٤٤،بيروت).

کثرتِ طواف کی افضلیت:

سوال: کثرتِ طواف افضل ہے یا کثرتِ عمرہ؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں کثرتِ طواف افضل ہے، بشرطیکہ طواف میں عمرہ جتنا وقت صرف کرے ۔

ملاحظہ ہو شرح لباب میں ہے:

بقي الكلام في أن إكثار الطواف أفضل أم إكثار الاعتمار؟ والأظهر تفضيل الطواف لكونه مقصوداً بالذات ولمشروعيته في جميع الحالات ولكراهة بعض العلماء إكثارها في سنة. (شرح لباب المناسك: ٢٠١،فصل فاذافرغ من السعي،بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

والطواف أفضل من العمرة إذا شغل به مقدار زمن العمرة وتمامه في المنحة ورد المحتار وقد قيل سبع أسابيع من الأطوفة كعمرة. (غنية الناسك فی بغية المناسك:٧٤،فصل فيماينبغی له الاعتناء بعد الفراغ من السعي ايام مقامه مكة).

وكذا فی الشامی: ٢/٥٠٢، مطلب الصلاة افضل من الطواف وهو افضل من العمرة،سعيد).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

طواف بکثرت کرنا عمرے بکثرت کرنے سے افضل ہے کیونکہ طواف ایسی عبادت ہے جو بالذات مقصود ہے اور یہ تمام حالات میں مشروع ہے جب کہ ایک سال میں کثرت سے عمرے کرنا بعض فقہاء کے نزدیک مکروہ ہے، اور جب علامہ قاضی ابراہیم بن ظہیرہ مکی سے دریافت کیا گیا کہ طواف افضل ہے یا عمرہ تو انہوں نے فرمایا ارجح یہ ہے کہ طواف کو عمرہ پر فضیلت اس وقت ہے جب کہ اتنا وقت طوافوں میں مشغول رہے جتنے وقت میں عمرہ ادا کرے۔ (عمدۃ الفقہ :۴/۳۰۵، مجددیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مسجد حرام کی توسیع کے بعد مسعیٰ کا حکم:

سوال: مسجد حرام کی توسیع کے بعد مسعیٰ جو کہ مسجد میں شامل ہوگیا مسجد کا حکم ہوگا یعنی حائضہ اور جنبی کا داخلہ ممنوع ہوگا یا مسعی اپنے احکام پر باقی رہے گا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مسعیٰ مسجد حرام کے ضمن میں آگیا لیکن مسجد حرام کے حکم میں نہیں ہے بلکہ اپنے سابقہ حکم پر باقی رہے گا یعنی حائضہ اور جنبی وغیرہ کا داخلہ ممنوع نہ ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں مجمع الفقہی الاسلامی کا متفقہ فیصلہ:

القرار الثالث: ــ بشأن حكم المسعىٰ بعد التوسعة السعودية هل تبقى له الأحكام السابقة أم يدخل حكمه ضمن حكم المسجد؟

الحمد لله، والصلاة والسلام على من لانبي بعده، سيدنا ونبينامحمد وعلى آله وصحبه وسلم.. أما بعد:

فإن مجلس المجمع الفقهي الإسلامي برابطة العالم الإسلامي في دورته الرابعة عشرة المنعقدة بمكة المكرمة التي بدأت يوم السبت ٢٠ من شعبان ١٤١٥هـ ٢١/١/١٩٩٥م، قد نظر في هذا الموضوع، فقرر بالأغلبية أن المسعىٰ بعد دخوله ضمن مبنى المسجد الحرام لا يأخذ حكم المسجد ولا تشمله أحكامه، لأنه مشعر مستقل يقول الله عزوجل: ﴿إن الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت أو اعتمر فلا جناح عليه أن يطوف بهما﴾ [البقرة:١٥٨] وقد قال بذلك جمهور الفقهاء، ومنهم الأئمة الأربعة، وتجوز الصلاة فيه متابعة للإمام في المسجد الحرام، كغيره من البقاع الطاهرة، ويجوز المكث فيه والسعي

للحائض والجنب، وإن كان المستحب في السعي الطهارة، والله أعلم.

وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه، وسلم تسليماً كثيراً والحمد لله رب العلمين.

رئيس مجلس المجمع الفقهي الإسلامي:ـ عبد العزيز بن عبدالله بن باز.

نائب الرئيس:ـ أحمد محمد علي.

التوقيعات :

محمد بن جبير، عبد الله عبد الرحمٰن البسام، عبد الرحمٰن حمزة المرزوقي۔ (مجلة المجمع الفقهي الإسلامي:٢٩٥). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

حالتِ احرام میں مرد کے لیے ٹخنے کھلے رکھنے کا حکم:

سوال: حالتِ احرام میں مرد کے لیے پیر کا کونسا حصہ کھلا رکھنا ضروری ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مرد کے پیر کی بیچ کی ہڈی اور دونوں ٹخنے کھلے رکھنا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما قال: سمعت النبى صلى الله عليه وسلم يقول: إذا لم يجد إزاراً فليلبس السراويل، وإذا لم يجد النعلين فليلبس الخفين، وليقطعهما أسفل من الكعبين. (رواه النسائى:١/٩۔والبخارى:١/٢٤٨،عن ابن عمررضى الله تعالىٰ عنهما).

کعب کی تشریح ملاحظہ فرمائیں:

لسان العرب میں ہے:

وكعب الإنسان: ما أشرف فوق رسغه عندقدمه، وقيل هو العظم الناشزفوق قدمه، وقيل هو العظم الناشزعند ملتقى الساق والقدم، وقيل الكعبان من الإنسان: العظمان الناشزان من جانبي القدم، وقال ابن الأثير: الكعبان العظمان الناشزان عند مفصل الساق والقدم. (لسان العرب:١/٧١٨۔وتاج العروس:١/٤٥٦).

معجم مقاییس اللغۃ میں ہے:

كعب الرجل: وهو عظم طرفي الساق عند ملتقى القدم والساق. (معجم مقاييس اللغة:٥/١٨٦).

القاموس الفقہی میں ہے:

العظم الناشز عند ملتقى الساق والقدم، المفصل بين الساق والقدم، وعند الجعفرية: هو العظم المرتفع في ظهر القدم الواقع فيمابين المفصل والمشط، ونسبه بعضهم إلى محمد بن الحسنؒ وحكاه الرافعيؒ وجهاً للشافعية. (القاموس الفقهی:۳۱۹).

مذکورہ بالا کتب لغات سے کعب کے دو معنی معلوم ہوتے ہیں: (۱) پشتِ قدم پر ابھری ہوئی ہڈی (۲) ٹخنہ وہ اٹھی ہوئی ہڈی ہے جو پنڈلی اور قدم کے جوڑ پر ہے دونوں جانب۔ پس ہر پاؤں میں دو ٹخنے ہیں۔ لہذا حالتِ احرام میں دونوں کو کھلا رکھنا ضروری ہے۔

شراح حدیث کی تشریح ملاحظہ فرمائیں:

علامہ بدرالدین عینی عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

قوله: وليقطعهما أسفل من الكعبين، كشف الكعبين في الإحرام وهماالعظمان الناتئان عند مفصل الساق والقدم، ويؤيده ماروا ه ابن أبي شيبة عن جريرعن هشام ابن عروة عن أبيه قال: إذا اضطر المحرم إلى الخفين خرق ظهورهما وترك فيهما قدر ما يستمسك رجلاه، وقال بعضهم: وقال محمدبن الحسنؒ ومن تبعه من الحنفية: الكعب هناهو العظم الذي في وسط القدم عند مقعد الشراك، وقيل : إن ذلك لايعرف عند أهل اللغة، قلت: الذي قال: لايعرف عند أهل اللغة، هو ابن بطال، والذي قاله هو لايعرف، وكيف والإمام محمد بن الحسنؒ إمام في اللغة والعربية ؟(عمدۃ القاری:۱۵۴۲/۵۸/۶،باب مالایلبس المحرم من الثياب ،ملتان۔وکذا فی فتح الباری:۴۰۳/۳).

حضرت شیخ ''اوجز المسالک'' میں فرماتے ہیں:

قوله : وليقطعهما من الكعبين المراد بهما ههنا عندنا معشر الحنفية معقدالشراك وهو المفصل الذي في وسط القدم بخلاف المراد في الوضوء ... وقال المجد: الكعب كل مفصل للعظام والعظم الناشز فوق القدم والناشزان من جانبيهما.

قال الحافظ: وهماالعظمان الناتئان عند مفصل الساق والقدم، ويؤيده ماروا ه ابن أبي شيبة عن جريرعن هشام ابن عروة عن أبيه قال: إذا اضطرالمحرم إلى الخفين خرق ظهورهما وترك فيهما قدر مايستمسك رجلاه ،...انتهیٰ.

قلت: وليت شعري كيف أيد الحافظ كلامه بهذا الأثر، فإنه صريح في أن المراد منه مفصل القدم لأنه ورد في روايات كثيرة أنه صلى الله عليه وسلم كان يمسح على ظهور الخفين ولم يقل أحد: إن محل المسح هو العظم الناتئ عند مفصل الساق و القدم وأيضاً قوله: وترك فيهما قدر ما يستمسك رجلاه: يومي إلى قول الحنفية، كما لا يخفىٰ، وماحكاه الحافظ، وقيل: إن ذلك لايعرف عند أهل اللغة، تعقبه العيني وقال: محمدؒ إمام في اللغة والعربية، وقال الرازي في "تفسيره": كان الأصمعي يختار هذا القول...

(اوجزالمسالك:٦/٣٦٨،باب ما ينهى عنه من لبس الثياب في الإحرام، دارالقلم، دمشق).

نیز کتبِ فقہ کے حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

غنية الناسك: ٤٥، كراچي-والشامي:٢/٤٩٠-والدرالمختار مع حاشية الطحطاوي:١/٤٩٤-وارشادالساري الى مناسك الملاعلى القاري مع شرح اللباب:١٣١،بيروت-ومعلم الحجاج:٢٣٦-وزبدة المناسك مع عمدة السالك:١٠٤-وعمدة الفقه:٤/١٤٠، كتاب المناسك،مجدديه).

اکثر عوام وخواص میں یہ مشہور ہے کہ فقط پیر کی بیچ کی ہڈی کھلی رکھنا ضروری ہے، یہ بالکل غلط ہے، بلکہ جانبین کے دونوں ٹخنے جو وضو میں دھوئے جاتے ہیں ان کا کھلا رکھنا بھی ضروری ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عورتوں کے لیے رمل، مقام ابراہیم کے پیچھے نماز، اور تلبیہ بالجہر کا حکم:

سوال: کیا اسلامی تاریخ میں کہیں مذکور ہے کہ عورتیں رمل نہیں کرسکتیں اور میلین اخضرین کے درمیان بھی دوڑ نہیں لگاسکتیں، اور مقام ابراہیم کے قریب نماز نہیں پڑھ سکتیں، نیز تلبیہ بھی زور سے نہیں پڑھ سکتیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ممانعت منقول ہے، اور ازواج مطہرات نے یہ اعمال کیے ہیں یا نہیں؟

الجواب: عورتوں کے لیے بعض چیزوں کی ممانعت ہیں۔ مثلاً زور سے تلبیہ نہ پڑھیں، طواف میں اضطباع نہ کریں، طواف میں رمل نہ کریں، میلین اخضرین کے درمیان دوڑ نہ لگائیں، صفا پر نہ چڑھیں، ہجوم کے وقت حجر اسود کو بوسہ نہ دیں، نیز ہجوم کے وقت مقام ابراہیم کے قریب نماز بھی نہ پڑھیں۔

روایات کی روشنی میں ان مذکورہ اعمال کی ممانعت ثابت ہے، نیز حضرت ہاجرہ کا عمل مردوں کے لیے برقرار رکھا گیا، اور عورتوں کے لیے باقی نہیں رکھا گیا، کیونکہ دوڑنا ان کا ایک وقتی عمل تھا، اور ضرورت کی وجہ سے تھا ہاں مردوں کے لیے اس کو بطورِ یادگار رکھا گیا۔

ملاحظہ ہو اعلاء السنن میں ہے:

عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنه قال: ليس على النساء رمل بالبيت، ولابين الصفا والمروة. (اخرجه الدرقطني:۱/۲۸۷، ورجاله ثقات).

وعن ابن عمررضي الله تعالىٰ عنه قال: لاتصعد المرأة على الصفا والمروة، ولاترفع صوتها بالتلبية. (رواه الدارقطني:۱/۲۸۷،ورجاله ثقات). (اعلاء السنن:۱۵/۲۲۸، باب لاترفع المرأة صوتها بالتلبية ولاترمل ولاتسعى ولاتستلم الحجر الا ان تجد الموضع خالياً).

مسندالامام الشافعی میں ہے:

عن منبوذ بن أبي سليمان عن أمه أنها كانت عند عائشة رضي الله تعالىٰ عنها زوج النبي صلى الله عليه وسلم فدخلت عليها مولاة لها، فقالت لها: يا أم المؤمنين طفت بالبيت سبعاً، واستلمت الركن مرتين أوثلا ثاً فقالت لها عائشة: لا أجرک الله ،لا أجرک الله، تدفعين الرجال ،ألا كبرت الله ومررت. (مسندالامام الشافعی:۳۴۵).

مسند امام شافعیؒ کے حاشیہ میں ہے:

قد فهمنا من الحديث السابق؛ أنه إذا اشتد الزحام على الحجر الأسود فلا داعي لانتظار الرجال ولتزاحمهم، وقد بين هذا الحديث أن النساء أولىٰ بهذا الحكم وأنهن لا ينبغي لهن أن تزاحمن الرجال لما في ذلک من الإخلال بالأدب، ولذا أنكرت عائشة على مولاتها مدافعتها الرجال واستلام الركن ودعت بأن يحرمها الله الأجر، وقالت لها: ألا كبرت ومررت أي هذا الذي كان ينبغي لک. (حاشية مسند الامام الشافعي:۳۴۵،رقم الحاشية ل).

نیز ملاحظہ ہو: تحفة الفقهاء: ۲/۴۱۴ـوغنية الناسك: ۴۹ـومعلم الحجاج:۱۱۰)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

حالتِ احرام میں عورتوں کو چہرے پر پردہ لٹکانے کا حکم:

سوال: حالتِ احرام میں عورتوں کے بارے میں احناف کا مذہب یہ ہے کہ اپنا چہرہ کھلا رکھتے ہوئے چہرے پر کوئی کپڑا لٹکالے۔لیکن عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ عورتوں کو اس میں حرج ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض عورتیں جو پردہ نشین ہوتی ہیں لیکن ان دنوں میں بالکل ہی پردہ ترک کر دیتی ہیں،جس میں فتنہ کا اندیشہ ہے، اور بعض پردہ نشین عورتیں حجاب پر مصر ہوتے ہوئے چہرے پر کپڑا لٹکاتی ہیں،جس کی وجہ سے ان کو راستہ دیکھنے

میں اورطواف کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں، لہذا قابل غور بات یہ ہے کہ ان دوسبب (۱) حرج (۲) فتنہ کی وجہ سے عام برقعہ استعمال کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے یا کوئی اورصورت دفعِ حرج کی ہوتو بتائے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عورتوں کوعام حجاب استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، اگر پورا ایک دن استعمال کیا تو دم واجب ہوگا، اسوجہ سے عورتوں کا احرام چہرے میں ہے یعنی اصل یہ ہے کہ چہرہ کھلا ہونا چاہئے، کوئی کپڑا چہرے سے مس نہ ہو، لیکن چونکہ فتنہ کا اندیشہ ہے اس وجہ سے کپڑا لٹکانے کی اجازت دی ہے، اس طور پر کہ چہرے سے مس نہ ہو، اور یہ بات ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ثابت ہے، آپ اس طرح فرمایا کرتی تھیں، اگرحرج ہے تو چنددن خوشی سے برداشت کرلیا جائے کہ سفرحج تو ہے ہی مشقتوں کا سفر اورقاعدہ ہے " الأجر بقدر التعب " مشقت کے بقدرثواب ملتا ہے، لہذا اس کومشقت اورحرج نہ سمجھیں، علاوہ ازیں اگرعورتیں عام لوگوں کے مجمع میں تو برقعہ استعمال کرلیں، اور جب اپنی قیام گاہ پر پہونچیں تو ہٹادے، اس صورت میں چونکہ پورادن برقعہ استعمال نہیں کیا، لہذا دم لازم نہیں ہوگا، البتہ ایک دن سے کم چہرہ ڈھانپا گیا اس وجہ سے صدقۂ فطر کی مقدار فدیہ واجب ہوگا۔

چہرے پر کپڑ الٹکانا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

سنن ابی داود میں ہے:

حدثنا أحمد بن حنبل نا هشيم نا يزيد بن أبي زياد عن مجاهد عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: كان الركبان يمرون بنا ونحن محرمات مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فإذا حاذوا بنا سدلت إحدانا جلبابها من رأسها على وجهها فإذا جاوزونا كشفناه.

(سنن ابی داود: ۱/ ۲۵۴، وفیہ یزیدبن ابی زیادوھوضعیف ،وابن ماجہ:ص ۲۱۰،باب المحرمة تسدل الثوب على وجهها).

(۲) مسنداحمد میں ہے:

حدثنا عبد الله حدثني أبي ثنا هشيم قال: أنا يزيد بن أبي زياد عن مجاهد عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: كان الركبان يمرون بنا ونحن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم محرمات... الخ. (مسنداحمدبن حنبل:٦/ ٣٠۔وفیہ یزیدبن ابی زیادوھوضعیف۔وسنن کبری للبیھقی:٥/٤٨،باب المحرمة تلبس الثوب من علو فيسترو جههاو تجافى عنه،دار المعرفة).

مسند امام شافعی میں ہے:

أخبرنا سعيد بن سالم، عن ابن جريج، عن عطاء، عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما قال: تدلي عليها من جلا بيبها ولا تضرب به، قلت: ما تضرب به؟ فأشار لي كما تجلبب المرأة ثم أشار لي ما على خدها من الجلباب، فقال: لا تغطيه فتضرب به على وجهها فذلك الذي لا يبقى عليها، ولكن تسدله على وجهها، كما هو مسدولاً ولا تقلبه ولا تضرب به ولا تعطفه . (مسندالامام الشافعی:۱/۳۰۳/۷۸۸،الباب الرابع فیمایلزم المحرم عندتلبسه بالاحرام،دارالمعرفة).

سنن کبری میں ہے:

عن معاذة عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: المحرمة تلبس من الثياب ماشاء ت إلا ثوباً مسه ورس أو زعفران ولا تتبرقع ولا تلثم وتسدل الثوب على وجهها إن شاء ت.

(السنن الکبریٰ للبیهقی:۵/۴۷،باب المرأة لاتنتقب فی احرامها ولاتلبس القفازین ، بیروت).

المحلیٰ بالآثار میں ہے:

ومن طريق حماد بن سلمة عن قيس بن سعد عن عطاء عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما قال: المحرم يغطي مادون الحاجب والمرأة تسدل ثوبها من قبل قفاها على هامتها.

(المحلی لابن حزم:۵/۷۸،۷۹).

موطا امام مالک میں ہے:

عن فاطمة بنت المنذر أنها قالت: كنا نخمر وجوهنا ونحن محرمات ونحن مع أسماء بنت أبي بكر الصديق رضي الله تعالىٰ عنهما فلا تنكره علينا. وقال الزرقاني: يحتمل أن يكون ذلك التخمير سدلاً كما جاء عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: ...الخ. (موطاء امام مالك مع الحاشية:۳۳۴،باب تخمیر المحرم وجهه، آرام باغ کراچی۔وکذا فی المستدرك للحاکم:۱/۴۵۴۔وصحیح ابن خزیمة:ص۲۶۹۰).

مذکورہ بالا احادیثِ مبارکہ میں سدل کا لفظ مذکور ہے جس کے معنی لٹکانے کے ہیں، اور لٹکانا تب ہوگا جب چہرے کے ساتھ نہ لگے، ورنہ اس کو چہرے پر پڑنا کہتے ہیں۔

ملاحظہ ہو تاج العروس میں ہے:

سدل الشعر والثوب والستر يسدله وأسدله أي أرخاه وأرسله، وقال أبوعبيد: السدل

المنهي عنه في الصلاة هو إسبال الرجل ثوبه من غير أن يضم جانبيه فإن ضمهما فليس بسدل . (تاج العروس :۳۷٤/۷۔وکذا فی لسان العرب:۳۳۳/۱۱).

فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیں:

مذہبِ احناف:

بدائع الصنائع میں ہے:

و عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت:كان الركبان يمرون بنا ونحن محرمات مع رسول الله صلى الله عليه وسلم...الخ. فدل الحديث على أنه ليس للمرأة أن تغطي وجهها وأنها لو أسدلت على وجهها شيئاً وجافته عنه لا بأس بذلك ولأنها إذا جافته عن وجهها صار كما لوجلست في قبة أو استترت بفسطاط . (بدائع الصنائع:۱۸۲/۲،سعید).

ارشادالساری میں ہے:

قوله ليس للمرأة الخ...قال العلامة السيد محمد يٰس مير غني: ولو سدلت على وجهها شيئاً وجافته أي أبعدته عنه جاز بل ندب أو وجب كما في الكبير عن النهاية نعم ينبغي أن بحضرة الرجال سدلته ، و أن بدونهم رفعته ، يكره لها أن تلبس البرقع لأنه يمس الوجه ، فلو استمر يوماً أو ليلة لزمه دم ، وهل لو استمر قدر أحدهما إذا كان متفرقاً جمع ؟ الذي يفهم من أبواب كثيرة أن حكم المجتمع إذا بلغ ذلك كحكمه ، وقال شيخنا : لم أر نصاً صريحاً في الباب، وإن كان أقل من يوم أو ليلة صدقة، فلو لبست البرقع عند حضور الرجال ، نزعته عند عدمه لايضر إذا عادت إليه مرة أخرى، ويكون الموجب واحداً إلا إذا عزمت عند النزع أن لا تعود، فيتكرر الموجب، والله أعلم...

وقد ذكروا أن المرأة إذا غطت وجهها بلا حائل يوماً كاملاً أوليلة فعليها دم ، وإلا فصدقة وصرحوا بأنها إذا فعلت ذلك لضرورة تخير في الكفارة ؛ كذا في البحر الزاخر وغيره... والغالب في نساء أهل مكة لبسهن البراقع حيث خروجهن إلى الركوب فإذا ركبن كشفن وجوههن لركوبهن في الشقادف المستورة فلا يستمر ستر وجوههن بل يكون ذلك في كل مرة أقل من ساعة فلكية ، فحيث كان ذلك يلزمهن لكل مرة قبضة من طعام . (ارشاد الساری علی شرح اللباب :۳٤۳،فصل فی تغطية الرأس والوجه ،بیروت۔وکذا فی غنية الناسك فی بغية المناسك:٤۹،فصل فی

احرام المرأة ،ادارة القرآن كراجي ـوالدرالمختار مع الشامي:٢/٥٢٧،سعيد ـواوجزالمسالك: ٣/٣٢١ ـوبذل المجهود:٩/٦٢ ـوحاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:١/٥٢١).

مذہبِ مالکیہ:

حاشیۃ الدسوقی میں ہے:

حرم بالإحرام ...وستر وجهه أو بعضه إلا لستر عن أعين الناس فلا يحرم بل يجب إن ظنت الفتنة بها بلا غرز بإبرة أو نحوها ولاربط أي عقد قوله إلا لستر... أي إلا إذا أرادت بستر وجهها الستر عن أعين الناس فلا يحرم ستره حينئذٍ حيث كان الستر من غير غرز وربط. حاصله : أنه متى أرادت الستر عن أعين الرجال جاز لها ذلک مطلقاً علمت أو ظنت الفتنة بها أم لا، نعم إذا علمت أوظنت الفتنة بهاكان سترها واجباً. (حاشية الدسوقي مع الشرح الكبير:٢/٨٦،فصل حرم بالاحرام ،دارالفكر ـوكذا في الفقه الاسلامي وادلته:٣/٢٣٤،محظورات الاحرام،دارالفكر).

مذہبِ شافعیہ:

شرح مہذب میں ہے:

ويحرم على المرأة ستر الوجه ...ويجوز أن تستر من وجهها ما لا يمكن ستر الرأس إلا بستره لأنه لايمكن ستر الرأس إلا بستره فعفي عن ستره فإن أرادت ستر وجهها عن الناس سدلت على وجهها شيئاً لا يباشر الوجه لما روت عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: كان الركبان...الخ .(شرح المهذب :٧/٢٥٠،دارالفكر).

مذہبِ حنابلہ:

المغنی میں ہے: **إن المرأة يحرم عليها تغطية وجهها في إحرامها كما يحرم على الرجل تغطية رأسه ... فأما إذا احتاجت إلى ستر وجهها لمرور الرجال قريباً منها فإنها تسدل الثوب من فوق رأسها على وجهها ، روي ذلک عن عثمان ﷺ وعائشة رضي الله تعالىٰ عنهاوبه قال عطاءؒ ومالکؒ والثوريؒ والشافعيؒ وإسحاقؒ ومحمد بن الحسنؒ ولا نعلم فيه خلافاً ، وذلک لما روي عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت:كان الركبان يمرون بنا...الخ** .(المغنی لابن قدامة الحنبلی:٣/٣٠٥،دارالكتب العلمية)ـ**واللہ ﷻ اعلم ـ**

سعی کو مؤخر کرنے کا حکم:

سوال: طوافِ زیارت کو ایام نحر سے مؤخر کرنا جائز نہیں ہے، لیکن سعی کا کیا حکم ہے؟ کیا سعی کی تاخیر ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: احناف کے نزدیک سعی واجب ہے، بلاعذر تاخیر مکروہ اور خلافِ سنت ہے۔
ملاحظہ ہو شرح لباب میں ہے:

إذا فرغ من الطواف أي الطواف الذي بعده سعي، فالسنة أن يخرج للسعي على فوره أي ساعته من غير تاخير فإن أخره لعذر أي لضرورة أو ليستريح أي ليحصل له الراحة أو تعود إليه القوة، فلا بأس به أي لا يكون مسيئاً وإن أخره لغير عذر أي من استراحة وغيرها فقد أساء أي لتركه المولاة التي هي سنة بين الطواف والسعي ولاشيء عليه أي من الجزاء بالدم أو الصدقة... السعي المطلق بين الصفا والمروة واجب إجماعاً على الرجال والنساء.

(شرح اللباب: ۱۸۹، باب السعی بین الصفا والمروة، بیروت).

وفيه أيضاً: فصل في مكروهاته: ... وتاخيره أي تاخير السعي عن وقته أي عن زمانه المختار تاخيراً كثيراً من غيرعذر. (شرح اللباب: ۱۹۹، مکروهات السعی، بیروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

ولا يجب الإتيان به بعد الطواف فوراً بل لو أتى به بعد زمان ولو طويلاً لا شيء عليه والسنة الاتصال به... فإن أخره لعذر أو ليستريح من تعبه لابأس به وإن أخره لغيرعذر فقد أساء ولاشيء عليه. (غنية الناسك: باب السعی بین الصفا والمروة، ص ٦٨، کراچی۔ وکذا فی حاشية الطحطاوی علی الدر المختار: ۱۔ وزبدة المناسك: ۱٤۲)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

وقوفِ مزدلفہ کے دوران جنون لاحق ہونے سے حج کا حکم:

سوال: ایک عورت کو وقوفِ مزدلفہ کے دوران جنون کا دورا پڑا اور اب تک یہ کیفیت باقی ہے اور یہ عورت طوافِ زیارت سے محروم رہی اب حلال ہونے کی کیا صورت ہے؟ نیز تاخیر کا کیا کفارہ ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اس عورت کی طرف سے اگر کسی نے طوافِ زیارت کرلیا تو اس کا حج ادا ہوجائے گا، پھر افاقہ کے بعد اس عورت پر طوافِ زیارت کرنا لازم ہوگا، اور تاخیر کی وجہ سے اس پر کوئی کفارہ

وغیرہ واجب نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ حالتِ عذر ہے جو معاف ہے۔
ملاحظہ ہو لباب المناسک میں ہے:

ولو أحرم صحيح أي عاقل ليس فيه مرض الجنون ثم جن فأدى المناسک أي بمباشرته لها أي بنيابة عنه في بعضها ثم أفاق بعد سنين يجزئه عن الفرض إلا أنه يلزمه الطواف فإنه يشترط فيه أصل النية ولا تجزء فيه النية. (لباب المناسك مع شرحه: ٤٢، باب شرائط الحج، بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

ولو أحرم صحيح ثم جن فقضى به أصحابه المناسک ونووا عنه في الطواف به ثم أفاق ولو بعد سنين أجزأه عن الفرض ويجوز النيابة عنه في نية الطواف للضرورة وإن لم تجز في نفس الطواف لإمكانه محمولاً فإن طافوا به ولكنهم لم ينووا عنه لزمه الطواف بعد الإفاقة.

(غنية الناسك: ٤، شرائط الحج، ادارة القرآن۔ وشرح اللباب: ٢٥٧، بيروت).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر کسی صحیح عاقل نے احرام باندھا یعنی احرام باندھتے وقت اس میں جنون کا مرض نہیں تھا پھر اس کو جنون لاحق ہوگیا یا احرام باندھتے وقت افاقہ تھا اور وہ نیت اور تلبیہ کو سمجھتا تھا اور اس نے نیت اور تلبیہ ادا کیا پھر اس نے مناسک اس طرح پر ادا کیے کہ اس کی طرف سے نیابۃً کسی دوسرے شخص نے بعض مناسک ادا کیے اور اسے بھی ساتھ ہی رکھا اور اس کی طرف سے طواف زیارت کی نیت کی پھر حج کرنے کے بعد اس مجنون کو افاقہ ہوا اگرچہ کئی سال کے بعد ہوا تو وہ حج فرض ادا ہو جائے گا اور اس کی طرف سے طواف زیارت کی نیت میں نیابت ضرورت کی وجہ سے جائز ہے لیکن نفس طواف میں نیابت جائز نہیں ہے۔ (عمدۃ الفقہ حصۂ چہارم، کتاب الحج، ۳۲، مجددیہ، وزبدۃ المناسک، تیسری شرط عقل ص۴۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

طواف زیارت سے پہلے انتقال ہونے پر حج کا حکم:

سوال: اگر وقوف عرفہ کے بعد طواف زیارت سے پہلے کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کے حج کا کیا حکم ہے؟

الجواب: فرضیتِ حج کے بعد اسی سال حج کے لیے گیا تو طواف زیارت کی وصیت لازم نہیں حج

ہوگیا، اس لیے کہ جب پہلے سال حج کیا تو وہ اپنی استطاعت کے موافق جتنا کر سکتا تھا کر گزرا، اور اگر فرضیت کے بعد تاخیر کی تھی تو تقصیر کی وجہ سے دم کی وصیت لازم ہے۔

ملاحظہ ہو سنن کبری میں ہے:

من وقف معنا بعرفة فقد تم حجه. (السنن الکبری للبیھقی:۵/۱۱٦،دارالمعرفة).

شرح لباب میں ہے:

إذا مات بعد الوقوف بعرفة وأوصى بإتمام الحج تجب البدنة لطواف الزيارة وجاز حجه أي صح وكمل لكن في الطرابلسي عن محمد فيمن مات بعد وقوفه بعرفة، وأوصى بإتمام الحج يذبح عنه بدنة للمزدلفة والرمي والزيارة والصدر وجاز حجه فهذا دليل على أنه إذا مات بعرفة بعد تحقق الوجوب يجبر عن بقية أعماله البدنة، فلا ينافي ما في المبسوط أنه يجب البدنة لطواف الزيارة إذا فعل بقية الأعمال إلا الطواف ويؤيده ما في فتاوى قاضيخان والسراجية أن الحاج عن الميت إذا مات بعد الوقوف بعرفة جاز عن الميت،لأنه أدى ركن الحج أي ركنه الأعظم الذي لا يفوت إلا بفواته لقوله صلى الله عليه وسلم" الحج عرفة ".

(شرح اللباب:۲۵۸،فصل فی شرائط صحة الطواف،بیروت۔وکذا فی غنیة الناسك:۹۵،باب طواف الزیارة،کراچی۔ومعلم الحجاج:۱۷۹)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

جمعہ کے دن عرفہ واقع ہو تو حج اکبر کہنے کا حکم:

سوال: جمعہ کے دن عرفہ واقع ہو تو اس لوگ حج اکبر کہتے ہیں اور اس میں ستر حج کا ثواب بتلاتے ہیں شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب: حج اکبر کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، لیکن جمعہ کے دن عرفہ واقع ہو تو لوگ اس کو حج اکبر کہتے ہیں یہ صحیح اور درست نہیں ہے، ہاں نفسِ فضیلت ثابت ہے اگر چہ حدیث ضعیف ہے لیکن فضائل میں معتبر ہے، یعنی ثواب کی امید رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے:

" أفضل الأيام يوم عرفة إذا وافق يوم الجمعة وهو أفضل من سبعين حجة في غير جمعة "

یعنی دنوں میں افضل ترین دن عرفہ کا دن ہے، جب عرفہ جمعہ کے دن واقع ہو تو وہ حج ان ستر حج سے افضل اور بہتر ہے جو جمعہ کے علاوہ میں ہو۔

ملاعلی قاریؒ نے مستقل رسالہ ”الحظ الأوفر فی الحج الأکبر“ تحریر فرمایا ہے، اس میں سے کچھ ملخصات پیشِ خدمت ہیں:

اعلم أن العلماء اختلفوا في وصف الحج بالأكبر فقال بعضهم : إنما قيل له الحج الأكبر لأنه يقال في حق العمرة إنها الحج الأصغر لقلة عملها ومشقتها أو لنقصان مقامها ورتبتها. وقال مجاهد : الحج الأكبر هو القران والحج الأصغر هو الإفراد من القران، وهو الملائم لمذهبنا، وجمهور العلماء المحققين والمحدثين الجامعين بين طرق ما ورد في حجه صلى اللّٰه عليه وسلم وشرف وكرم وعظم،على مابينه الحافظ ابن حزم في تصنيف مختص بهذا الباب، وتبعه الإمام النوويؒ وغيره في ذلك، وقرروه وجعلوه هو الصواب،ثم روى عكرمة عن ابن عباس رضي اللّٰه تعالیٰ عنه” أن يوم الحج الأكبرهو يوم عرفة “ يعني ولو لم يكن يوم الجمعة، وروى ذلك أيضاً مرفوعاً وروي عن عمر بن الخطاب رضي اللّٰه تعالیٰ عنه موقوفاً وهوقول جماعة من أكابر التابعين كعطاء وطاووس ومجاهد وسعيد بن مسيب وغيرهم من أئمة الدين فأخرج ابن أبي حاتم، وابن مردويه، و الفقيه أبو الليث السمرقندي في تفسير قوله تعالیٰ :”يوم الحج الأكبر“ التوبة:۳، عن المسور بن مخرمة أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: يوم عرفة هذا هو يوم الحج الأكبر“ وفي هذا إشارة إلى المعنى المشتهر فتدبر...وقال جماعة: يوم الحج الأكبر هو يوم النحر فقد روي عن يحيى بن الجزار قال: خرج علي رضي اللّٰه تعالیٰ عنه يوم النحرعلى بغلة بيضاء يريد الجبانة فجاء ہ رجل وأخذ بلجام دابته وسأله عن يوم الحج الأكبر فقال: يومک هذا خل سبيلها، وكذا روى الترمذي عنه، ورواه أبوداود عن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالیٰ عنه، ويروى ذلک عن عبد اللّٰه بن أبي أوفى، والمغيرة بن شعبة، وهوقول الشعبي، والنخعي، وسعيد بن جبير، والسدي، قلت: ولعله سمي بالحج الأكبر لأن أكثر الأعمال الحج يفعل فيه من الرمي والذبح والحلق وغيرها... ونقل في التتارخانية عن المحيط: أن الحج الأكبر المذكور في الآية هوطواف الإفاضة أي لأنه يتم به الحج، فإنه آخر أركانه...وروى ابن جريج عن مجاهد: يوم الحج الأكبر أيام منى كلها، وكان سفيان الثوريؒ يقول: يوم الحج الأكبر أيام منى كلها...وقال عبد اللّٰه بن الحارث بن نوفل: يوم الحج الأكبر اليوم الذي حج فيه رسول اللّٰه صلى اللّٰه

عليه وسلم، وهوظاهر فإنه ظهر فيه عز المسلمين وذل المشركين، وهو قول ابن سرينؒ....

فالحاصل: أن في يوم الحج الأكبر أربعة أقوال: الأول: أنه يوم عرفة، والثاني: أنه يوم النحر، والثالث: أنه طواف الإفاضة، والرابع: أنه يوم أيام الحج كلها، ولا تعارض في الحقيقة لأن الأكبر والأصغر أمران نسبيان، فحج الجمعة أكبر من حج غيرها وحج القران أكبرمن حج الإفراد والحج مطلقاً أكبر من العمرة، ويسمى الجميع بالحج الأكبرويتفاوت كل بحسب مقامه الأنور...

وأما إطلاق الحج الأكبرعلى حج مخصوص بطريق العموم على يوم عرفة إذا وافق يوم الجمعة على ما اشتهرعلى الألسنة، وألسنة الخلق أقلام الحق، فإنما هو أمرآخر وصار اصطلاحاً عرفياً في الأثر... وذكر الإمام الزيلعيؒ في شرح كنز الدقائق وهو من جملة الأئمة الحنفية، ومن أجلة المحدثين في الملة الحنيفية عن طلحة بن عبيد اللّٰه وهو أحد العشرة المبشرين تغمدهم بالرضوان والمغفرة، أنه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: أفضل الأيام يوم عرفة إذا وافق يوم الجمعة وهو أفضل من سبعين حجة في غيرجمعة ''رواه رزين بن معاوية في تجريد الصحاح، وأما ما ذكره بعض المحدثين في إسناد هذا الحديث بأنه ضعيف فعلى تقدير صحته لايضر في المقصود فإن الحديث الضعيف معتبر في فضائل الأعمال عند جميع العلماء من أرباب الكمال، وأما قول بعض الجهال: إن هذا الحديث موضوع، فهو باطل مصنوع مردود عليه، ومنقلب إليه لأن الإمام رزين بن معاوية العبدري من كبراء المحدثين ومن عظماء المخرجين، ونقله سند معتمد عند المحققين، وقد ذكره في تجريد صحاح الست، فإن لم يكن رواية صحيحة فلا أقل من أنها ضعيفة،كيف وقد اعتضد بما ورد أن العبادة تضاعف في يوم الجمعة مطلقاً بسبعين ضعفاً بل بمائة ضعف هذا وذكر النوويؒ في منسكه أنه قيل: إذا وافق يوم عرفة يوم الجمعة غفر لكل أهل الموقف... ولاشك أن يوم الجمعة أفضل أيام الأسبوع، وأن يوم عرفة أفضل أيام السنة، فإذا اجتمعا فهو نور على نور يهدي اللّٰه لنوره من يشاء ومن لم يجعل اللّٰه له نوراً فما له من نور.

(''الحظ الاوفر فی الحج الاکبر'' للعلامة الملا علی القاریؒ علی هامش شرح اللباب:۵۲۶۔۵۳۰، باب المتفرقات، بیروت).

مزید ملاحظہ فرمائیں: فتاوی الشامی:۲/۶۲۲،سعید۔وحاشیة الطحطاوی علی الدرالمختار:۱/۵۵۹۔واتحاف السادة المتقین شرح احیاء علوم الدین:۴/۲۷۴۔وامدادالمفتین:جلددوم،۵۰۰،کتاب الحج،دارالاشاعت۔وفتاوی محمودیہ:۱۰/۲۹۴۔فتاوی فریدیہ:۴/۲۴۹،باب تفسیرالحج و شرائطہ وارکانہ۔وفتاوی رحیمیہ:۲/۴۷۔**واللہ ﷻ اعلم**

ہجوم کی وجہ سے رات کے وقت رمی کرنے کا حکم:

سوال: ہجوم کی وجہ سے رات کے وقت رمی کرنا مردوں کے لیے جائز ہے یا نہیں؟اوراس میں کراہت ہے یانہیں؟

الجواب: چونکہ آج کل شدید ازدحام عذر ہے لہذا رات کو رمی کرنا بلاکراہت جائز ہونا چاہئے۔

حدیث شریف میں ہے:

عن ابن عمررضي اللّٰه تعالیٰ عنه أن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم رخص للرعاء أن یرموا لیلاً.(رواه البزاروابن ابی شیبة والدارقطنی من طریق عمروبن شعیب عن ابیه عن جده وزاد وای ساعة شائوامن النهار)

ہدایہ میں ہے:

و إن أخر إلی اللیل رماه ولاشيء علیه لحدیث الرعاء انتهیٰ.(الهدایة:۱/۲۵۳).

بدائع الصنائع میں ہے:

أما یوم النحر فأول وقت الرمي منه ما بعد طلوع الفجر الثاني من یوم النحر، فلا یجوز قبل طلوعه... فکان آخره وقت الرمي کسائر الأیام فإن لم یرم حتی غربت الشمس فیرمی قبل طلوع الفجر من الیوم الثاني أجزأه ولا شيء علیه في قول أصحابنا...والصحیح قولنا لماروي أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم أذن للرعاء أن یرموا باللیل ولایقال: إنه رخص لهم ذلک لعذر، لأنا نقول ماکان لهم عذر، لأنه کان یمکنهم أن یستنیب بعضهم بعضاً فیأتي بالنهار فیرمي، فثبت أن الإباحة (ما)کانت لعذر فیدل علی الجوازمطلقاً... وأما وقت الرمي من الیوم الأول والثاني من أیام التشریق وهو یوم الیوم الثاني والثالث من أیام الرمي فبعد الزوال حتی لا یجوز الرمي فیهما قبل الزوال في الروایة المشهورة عن أبي حنیفةؒ ...فإن أخر الرمي فیهما إلی اللیل فرمی قبل طلوع الفجرجاز ولا شيء علیه لأن اللیل وقت

الرمي في أيام الرمي لمارويناه من الحديث. (بدائع الصنائع:۲/۱۳۷، سعید).

غنیۃ الناسک میں ہے:

تنبيه: قد تبين مما قدمنا أنهم جعلوا خوف الزحام عذراً للمرأة ولمن به علة أوضعف في تقديم الرمي قبل طلوع الشمس أوتأخيره إلى الليل. (غنية الناسك: ۱۰۰، باب رمي الجمار، ادارة القرآن).

وأيضاً فيه: أن الليالي في الحج في حكم الأيام الماضية. (غنية الناسك:۹۷، باب رمي الجمار).

زبدۃ المناسک میں ہے:

مرد اور عورت کے لیے عذر میں رمی کا حکم یکساں ہے مگر عورت کو اژدحام کی وجہ سے رات کو رمی کرنا افضل ہے۔ (زبدۃ المناسک مع عمدۃ السالک:۱۸۴).

مسائل ومعلوماتِ حج وعمرہ کے حاشیہ میں مذکور ہے:

بوجہ ہجوم امید ہے کہ ان شاء اللہ کراہت نہیں رہے گی۔ (حاشیہ مسائل ومعلومات حج وعمرہ:ص ۸۶).

اس کتاب کے مولف حضرت محمد معین الدین احمد صاحب کا بیان ہے کہ اس کتاب کو متفق علیہ اور زیادہ مستند بنانے کے لیے میں نے ضروری سمجھا کہ پاکستان کے حنفی فقہ کے دو مما لک یعنی دیوبندی اور بریلوی دونوں کے چوٹی کے علمائے کرام اور مفتی صاحبان سے اس کی توفیق اور تصدیق کرائی جائے۔

چنانچہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحبؒ، مدرسہ عربیہ انوار العلوم کے شیخ الحدیث علامہ سید احمد سعید کاظمیؒ، اور دارالعلوم امجدیہ کراچی کے مولانا مفتی ظفر علی نعمانی مدظلہ نے محض خدمتِ دین کی خاطر اس کی تصدیق اور توثیق فرما کر مجھ کو ممنون ومشکور ہونے کا موقع دیا، فجزاهم الله احسن الجزاء۔

(مسائل ومعلومات حج وعمرہ:ص ۴)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یازدہ دوازدہ کو قبل الزوال رمی کرنے کا حکم:

سوال: احناف کے نزدیک ۱۱، ۱۲ کی رمی قبل الزوال جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ جائز کہتے ہیں؟

الجواب: مذہب احناف میں مشہور اور ظاہر الروایۃ کے موافق ۱۱، ۱۲ کو رمی قبل الزوال جائز نہیں ہے، البتہ امام صاحب سے غیر مشہور روایت ہے جس کو علامہ کاسانی نے بدائع الصنائع میں اور حاکم شہید نے نقل کیا ہے، لیکن یہ مرجوح اور کمزور ہے لہذا اس پر فتویٰ نہیں دیا گیا۔

ملاحظہ ہو شرح اللباب میں ہے:

وقت رمي الجمار الثلاث في اليوم الثاني والثالث من أيام النحر بعد الزوال فلا يجوز قبله أي قبل الزوال فيهما في المشهور أي عند الجمهور كصاحب الهداية وقاضيخان والكافي والبدائع وغيرها، وقيل يجوز الرمي فيهما قبل الزوال لما روي عن أبي حنيفة أن الأفضل أن يرمى فيهما بعد الزوال، فإن رمى قبله جاز، فحمل المروي من فعله صلى الله عليه وسلم على اختيار الأفضل كما ذكره صاحب المنتقى والكافي والبدائع وغيرها، وهو خلاف ظاهر الرواية .(لباب المناسك مع شرحه، ص۲٦۲، باب رمی الجمار وأحكامه).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما وقت الرمي من اليوم الأول والثاني من أيام التشريق وهو اليوم الثاني والثالث من أيام الرمي فبعد الزوال حتى لا يجوز الرمي فيهما قبل الزوال في الرواية المشهورة عن أبي حنيفة وروي عن أبي حنيفة أن الأفضل أن يرمى في اليوم الثاني والثالث بعد الزوال فإن رمى قبله جاز وجه هذه الرواية أن قبل الزوال وقت الرمي في يوم النحرفكذا في اليوم الثاني والثالث لأن الكل أيام النحر .(بدائع الصنائع :۲/۱۳۷، سعيد).

حاشیۃ الہدایہ میں ہے:

ذكره الحاكم الشهيد أنه كان أبوحنيفةؒ يقول الأفضل أن يرمى في اليوم الثاني والثالث بعد الزوال فإن رمى قبله جاز .(حاشية الهداية :۱/۲۵۲).

مزید ملاحظہ ہو: الدر المختار مع الشامي: ۲/ ۵۲۰، سعيد ۔ وغنية الناسك فی بغية المناسك : ص۹۷۔ والمبسوط للعلامة السرخسی: ٤/٦٨۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

یوم النحر کی رمی کے بعد دعاء کے لیے کھڑے ہونے کا حکم:

سوال: جب پہلے دن یوم النحر کو جمرہ عقبہ کی رمی کرے تو دعا کے لیے الگ ہوکر کھڑا ہونا چاہئے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں دعا کے لیے کھڑا ہونا ثابت نہیں ہے اس لیے رمی کے بعد وہاں نہ ٹھہرے۔

الدرالمختار میں ہے:

فلا يقف بعد الثالثة ولا بعد رمي يوم النحر لأنه ليس بعده رمي. وفي الشامي (قوله فلا يقف بعد الثالثة)أي جمرة العقبة لأنها ليس بعدها رمي في كل يوم قال في اللباب والوقوف عند الأوليين سنة في الأيام كلها . (الدر المختار مع الشامی:۲/۵۲۱).

شرح اللباب میں ہے:

ولا يقف عندها في جميع أيام الرمي للدعاء. (شرح اللباب :۲۶۹، بیروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

وإذا فرغ من الرمي لا يقف للدعاء عند هذه الجمرة (أي عقبة) في الأيام كلها بل ينصرف داعياً. (غنية الناسك فی بغية المناسك :ص۹۲، ادارة القرآن).

نیز ملاحظہ ہو: فتاوی قاضی خان:۱/۲۹۶علی ہامش الہندیۃ، وعمدۃ الفقہ :۴/۴۴۹، ومعلم الحجاج:ص۱۷۲۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مزدلفہ کے علاوہ دوسری جگہ سے کنکریاں اٹھانے کا حکم:

سوال: ایک شخص مزدلفہ سے رمی کے لیے کنکریاں اٹھانا بھول گیا، یہاں تک کہ منی پہنچ گیا تو دوسری کسی جگہ سے کنکریاں اٹھا سکتا ہے؟ اور اس پر کوئی کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مزدلفہ سے کنکریاں اٹھانا مستحباتِ حج میں سے ہے، تو اگر بھول گیا تو منی سے بھی اٹھا سکتا ہے اور کوئی چیز واجب نہیں ہوگی، ہاں جمرات کے قریب سے اٹھانے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔

ملاحظہ ہو شرح اللباب میں ہے:

يستحب أن يرفع من المزدلفة بسبع حصيات مثل النواة أو الباقلاء وهو المختار ... ويجوز أخذها من كل موضع أي بلا كراهة إلا من عند الجمرة، أي فإنه مكروه لأن جمراتها الموجودة علامة أنها المردودة، فإن المقبولة منها ترفع لتثقيل ميزان صاحبها، إلا أنه لو فعل ذلک جاز وكره ... والمسجد أي مسجد الخيف وغيره فإن حصى المسجد صار محترماً يكره إخراجه خصوصاً بقصد ابتذاله ومكان نجس فإن فعل جاز وكره. (شرح اللباب ، ص۲۴۵، فصل فی رفع الحصی ، بیروت).

نیز ملاحظہ ہو: غنية الناسك فی بغية المناسك : ص ۹۰، فصل فی اضافة من المشعر ودفع الحصی من مزدلفة۔ **واللہ ﷻ اعلم،**

جمرات سے مقبول کنکریاں اٹھائی جاتی ہیں اس روایت کی تحقیق:

سوال: روایت میں آتا ہے کہ مقبول کنکریاں اٹھائی جاتی ہیں اور مردود وہیں پڑی رہتی ہیں کیا یہ روایت صحیح ہے؟

الجواب: مذکورہ بالا روایت ضعیف ہے، لیکن اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے زمانہ میں اس کے اٹھانے کا انتظام نہیں تھا حالانکہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو حج مسلمانوں نے کئے، ایک حج حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں اور دوسرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود تھے، مگر کنکریوں کی تعداد بہت کم تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبول کنکریاں اٹھائی جاتی تھیں اور مردود باقی رہ جاتی تھیں، مگر روایت کے ضعف کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقینی نہیں بلکہ گمان کے درجہ میں ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں:

عن أبي الطفيل قال سألت ابن عباس رضي اللّٰه تعالى عنه عن الحصى الذي يرمى في الجمار منذ قام الإسلام، فقال: ما تقبل منهم رفع وما لم يتقبل منهم ترك ولو لا ذلك لسد ما بين الجبلين. (السنن الكبرى للبيهقي: ١٢٨/٥، باب أخذ الحصى لرمى جمرة العقبة، بيروت).

اس روایت کی سند میں یزید بن سنان راوی ضعیف ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مزدلفہ سے کنکریاں اٹھانے کا حدیث سے ثبوت:

سوال: فقہاء مزدلفہ سے کنکریاں اٹھانے کو مستحب قرار دیتے ہیں احادیث میں اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب: مزدلفہ سے کنکریاں اٹھانا احادیث سے ثابت ہے۔

ملاحظہ فرمائیں مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

عن جابر رضي اللّٰه تعالى عنه قال: لما بلغنا وادي محسر قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: خذوا حصى الجمار من وادي محسر وعن مجاهد قال: كان يحمل الحصى من المزدلفة لرمي الجمار وعن إسماعيل بن عبد الملك قال: قال لنا سعيد بن جبير: خذوا الحصى من حيث شئتم وعن مكحول قال: يأخذون من المزدلفة. (مصنف ابن أبي شيبة: ٢٠٠/٤، وزاد المعاد: ٢٥٤/٢)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں قصر کا حکم:

سوال: عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں قصر کا حکم حج کی وجہ سے ہے یا سفر کی وجہ سے؟ کیا اہل مکہ بھی قصر کریں گے؟

الجواب: عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں قصر کا حکم سفر کی وجہ سے ہوتا ہے، حج کی وجہ سے نہیں بلکہ حج اور قصر میں کوئی تعلق ہی نہیں، کیونکہ حج تو مشقتوں کا نام ہے اس کے ساتھ قصر مناسب ہی نہیں، لہذا قصر سفر کی وجہ سے ہوگا۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن ابن مسعود رضي الله تعالىٰ عنه قال: صليت مع النبي صلى الله عليه وسلم بمنىٰ ركعتين ومع أبي بكررضي الله تعالىٰ عنه ومع عمررضي الله تعالىٰ عنه ومع عثمان رضي الله تعالىٰ عنه ركعتين صدراً من خلافته. (رواه الترمذي في باب ماجاء في تقصير الصلاة بمنى:١/١٧٧).

معارف السنن میں ہے:

يقول الإمام الخطابي في "معالمه" (٢/٢١١): ليس في قوله :" فصلى بنا ركعتين"دليل على أن المكي يقصر الصلاة بمنى، لأن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان مسافراً بمنىٰ فصلى صلاة المسافر، و لعله لو سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صلا ته لأمره بالإتمام وقد يترک صلى الله عليه وسلم بيان بعض الأمور في بعض المواطن اقتصاراً ، خصوصاً في مثل هذا الأمر الذي هو من العلم الظاهر العام، وكان عمر بن الخطاب رضي الله تعالىٰ عنه يصلي بهم فيقصر، فإذا سلم، التفت فقال: " أتموا يا أهل مكة، فإنا قوم سفر". (معارف السنن:٦/١٩٨، بحث ان القصر للسفر او للنسك،سعيد).

عمدة القاری میں ہے:

وقال أكثر أهل العلم منهم عطاء والزهري والثوري والكوفيون وأبوحنيفة وأصحابه والشافعي وأحمد وأبوثور: لا يقصر الصلاة أهل مكة بمنىٰ وعرفات لانتفاء مسافة القصر، وقال الطحاوي: وليس الحج موجباً للقصر لأن أهل منىٰ وعرفات إذا كانوا حجاجاً أتموا، وليس هو متعلقاً بالموضع ، وإنما هو متعلق بالسفر، وأهل مكة مقيمون هناک لا يقصرون، ولما كان المقيم لا يقصر لو خرج إلى منىٰ كذلک الحاج. (عمدة القاری:٥/٣٧٥،

باب الصلاة بمنی،ملتان)۔

درس ترمذی میں ہے:

جمہور کی طرف سے علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ ” فصلي بنا ركعتين“ سے اس بات پر استدلال کرنا درست نہیں کہ مکی بھی منی میں قصر کریگا اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو منی میں مسافر تھے اور آپ نے مسافروں والی نماز پڑھی جہاں تک نماز سے فراغت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتمام کا حکم دینے کا تعلق ہے سو آپ نے اس کی ضرورت اس لیے نہ محسوس فرمائی کہ پہلے آپ اس کی وضاحت فرما چکے تھے جب کہ یہ مسئلہ بھی بالکل واضح اور عام تھا۔ (درس ترمذی:۳/۱۴۰)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

طوافِ زیارت سے پہلے اور بعد میں خون نظر آنے پر طواف کا حکم:

سوال: ایک عورت نے عید کے تیسرے دن طوافِ زیادت کیا اور اس کے بعد طوافِ وداع کیا اور اپنے وطن ہندوستان چلی گئی، طواف سے پہلے ۴ دن حیض آیا تھا اور پاک ہوئی تھی، پھر طواف کیا تھا، جب گھر پہنچ گئی تو پاکی کے آٹھ دن بعد پھر خون شروع ہوا اور ۵ دن جاری رہا، سابقہ عادت ۷ دن تھی، اب اس کا طواف ہوا یا نہیں؟ اب وہ کیا کرے گی؟

الجواب: امام محمدؒ کے مسلک کے مطابق دس دن کے اندر خون اور طہر برابر ہونے کا اعتبار کر کے خون کو حیض شمار کرے اور پاکی کو حد فاصل شمار کرلے تو آسانی ہوگی، یعنی صورتِ مسئولہ میں امام محمدؒ کے قول کے مطابق ابتدائی ۴ دن کا خون حیض شمار ہوگا اور اس کے بعد پاکی کے ایام شمار ہوں گے، لہذا طواف صحیح اور درست ہوگیا۔ اس کے بعد جو خون آیا وہ استحاضہ ہے، چونکہ عورت اپنے وطن واپس جا چکی ہے، لہذا اس قول پر فتویٰ دینے میں آسانی ہے اور حرج وتنگی کو دور کرنا ہے، تو مناسب یہ ہے کہ اس کو اختیار کیا جائے۔

شرح النقایہ للشیخ الیاس زادہ میں ہے:

والأصل عند محمد وهو الأصح وعليه الفتوىٰ أن الطهر المتخلل بين الدمين إذا كان دون ثلاثة أيام لا يصير فاصلاً وهذا بالاتفاق فإذا بلغ الطهر ثلاثة أيام أو أكثر ينظر فإن استوى الطهر بالدم في أيام الحيض أو كان الدم غالباً لا يصير الطهر فاصلاً أيضاً وإن كان الطهر غالباً يصير فاصلاً وحينئذٍ ينظر إن لم يمكن أن يجعل واحد منهما بانفراده حيضاً لا يكون شيء منه حيضاً وإن أمكن أن يجعل واحد منهما بانفراده حيضاً إما المتقدم أو

المتأخر يجعل ذلك حيضاً وإن أمكن أن يجعل كل واحد منهما حيضاً بانفراده يجعل أسرعهما إمكاناً حيضاً وهو الدم المتقدم على الطهر وهو لا يجوز بداية الحيض ولا ختمه بالطهر ولو رأت ثلاثة دماً وستة طهر وثلاثة دماً فحيضها الثلاثة الأولى لأنها أسرعهما إمكاناً. (شرح النقاية للشيخ الياس زاده على هامش شرح النقاية للملا على القارى: ۸۳/۱، سعيد).

شرح الوقایہ میں ہے:

وفي رواية محمدؒ عنه أنه لا يفصل إن أحاط الدم بطرفيه في عشرة أو أقل ......يشترط مع هذا كون الطهر مساوياً للدمين أو أقل. (شرح الوقاية: ۱۱۱/۱).

عمدۃ الرعایۃ میں ہے:

أن عند محمدؒ يشترط لكون الطهر المتخلل المذكور حيضاً شروط ثلاثة أحدها أن تكون إحاطة الدم بطرفيه في عشرة أيام أو أقل وثانيها أن يكون مجموع الدمين نصاباً وثالثها أن يكون الطهر المتخلل مساوياً للدمين المحيطين أو أقل من مجموعهما فإن كان أكثر من مجموعهما يعد فاصلاً... (عمدة الرعاية تعليقات شرح الوقاية: ۱۱۱/۱).

البحر الرائق میں ہے:

وفي معراج الدراية معزياً إلى فخر الأئمة لو أفتىٰ مفتٍ بشيء من هذه الأقوال في مواضع الضرورة طلباً للتيسير كان حسناً. (البحر الرائق: ۱۹۳/۱، كوئته ـ والشامي: ۲۸۹/۱، مطلب لو افتى مفت...، سعيد)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

چار دن کی پاکی کے بعد طواف کرلیا پھر خون شروع ہونے پر طواف کا حکم:

سوال: ایک عورت کو ۳ دن حیض آیا پھر چار دن پاک رہی اس پاکی میں اس نے طواف زیارت کرلیا پھر ایک دن خون آیا، تو کیا اس کا طواف زیارت ہوا یا دوبارہ کرنا پڑے گا؟ جبکہ وہاں کا ہجوم اور تکلیف اتنی زیادہ ہے کہ اکثر وہی سبب حیض بن جاتی ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مدتِ حیض میں طہرِ متخلل دمِ متوالی کی طرح ہے لہذا طواف حیض میں شمار ہوگا، اب اگر عورت مکہ مکرمہ میں ہے تو دوبارہ طواف کرلے ورنہ دم واجب ہوگا۔

ہدایہ اول میں ہے:

والطهر إذا تخلل بين الدمين في مدة الحيض فهو كالدم المتوالي. (الهداية:۱/۶۶).

شامی میں ہے:

ثم اعلم أنه لا يشترط استمرار الدم فيها بحيث لا ينقطع ساعة لأن ذلک لا يكون إلا نادراً بل انقطاعه ساعة أو ساعتين فصاعداً غير مبطل أي لأن العبرة لأوله وآخره. (شامی ۱/ ۲۸۴، باب الحيض، سعيد).

عمدۃ الرعایۃ میں ہے:

أن عند محمدؒ يشترط لكون الطهر المتخلل المذكور حيضاً شروط ثلاثة أحدها أن تكون إحاطة الدم بطرفيه في عشرة أيام أو أقل وثانيها أن يكون مجموع الدمين نصاباً وثالثها أن يكون الطهر المتخلل مساوياً للدمين المحيطين أو أقل من مجموعهما فإن كان أكثر من مجموعهما يعد فاصلاً ... (عمدة الرعاية تعليقات شرح الوقاية:۱/۱۱۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حالتِ حیض میں طوافِ زیارت کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت کو حیض کی وجہ سے طوافِ زیارت میں تاخیر ہوئی لیکن وہ کسی صورت میں نہیں ٹھہر سکتی، تو بغیر طوافِ زیارت کے حلال ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور فرض طواف کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں کوشش کرنی چاہئے کہ کسی طرح ٹھہر جائے اور طوافِ زیارت پاکی کی حالت میں کرلے، لیکن باوجود کوشش کے ٹھہر نہیں سکتی اور طوافِ زیارت حالتِ حیض میں کرلیا تو طواف ادا ہو جائے گا، اور بدنہ یعنی بڑے جانور کی قربانی لازم ہوگی، اور وہ قربانی حرم کے ساتھ مخصوص ہوگی۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

فأما الطهارة عن الحدث والجنابة والحيض والنفاس فليست بشرط لجواز الطواف وليست بفرض عندنا بل واجبة حتى يجوز الطواف بدونها. (بدائع الصنائع:۲/۱۲۹، سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

وإنما لزمت البدنة فيما إذا طاف جنباً لأنها جناية أغلظ فيجب جبر نقصانها بالبدنة إظهاراً للتفاوت بين الأصغر والأكبر ويلحق به ما إذا طافت حائضاً أو نفساء وليس موضعاً ثالثاً. (البحر الرائق:۳/۷۱، كوئته).

شامی میں ہے:

تنبیه : نقل بعض المحشین عن منسک ابن أمیر حاج : لو هم الرکب علی القفول ولم تطهر فاستفتت هل تطوف أم لا ؟ قالوا: یقال لها لا یحل لک دخول المسجد، وإن دخلت وطفت أثمت وصح طوافک وعلیک ذبح بدنة وهذه مسألة کثیرة الوقوع یتحیر فیها النساء. (شامی:۲/۵۱۹، مطلب فی طواف الزیارة، سعید).

بدائع الصنائع میں ہے:

فإذا طاف من غیرطهارة فما دام بمکة تجب علیه الإعادة، لأن الإعادة جبر له بجنسه وجبر الشيء بجنسه أولی. (بدائع الصنائع: ۲/۱۲۹، سعید).

فتاویٰ ابن تیمیہ میں ہے:

عند هؤلاء (الأئمة الأربعة) لوطاف جنباً أومحدثاً أوحاملاً للنجاسة، أجزأه الطواف، وعلیه دم لکن اختلف أصحاب أحمد: هل هذا مطلق في حق المعذور الذي نسي الجنابة ؟ وأبوحنیفة یجعل الدم بدنة، إذا کانت حائضا أو جنباً فهذه التي لم یمکنها أن تطوف إلا حائضاً أولی بالعذر فإن الحج واجب علیها ولم یقل أحد من العلماء أن الحائض یسقط عنها الحج، ولیس من أقوال الشریعة أن تسقط الفرائض للعجزعن بعض ما یجب فیها، کما لو عجز عن الطهارة في الصلاة فلو أمکنها أن تقیم بمکة حتی تطهر وتطوف وجب ذلک بلا ریب فأما إذا لم یکن ذلک، فإن أوجب علیها الرجوع مرة ثانیة کان قد أوجب علیها سفران للحج بلا ذنب لها، وهذا بخلاف الشریعة .

ثم هي أیضاً لا یمکنها أن تذهب إلا مع الرکب، وحیضها في الشهرکالعادة، فهذه لایمکنها أن تطوف طاهراً، البتة. وأصول الشریعة مبنیة علی أن ما عجز عنه العبد من شروط العبادات یسقط عنه،... کما لو عجز الطائف أن یطوف بنفسه راکباً، وراجلاً فإنه یحمل ویطاف به. ومن قال : أنه یجزئها الطواف بلا طهارة إن کانت غیر معذورة مع الدم کما یقوله من أصحاب أبي حنیفة، وأحمد، فقولهم لذلک مع العذر أولی وأحری، وأما الاغتسال فإن فعلته فحسن، کما تغتسل الحائض و النفساء للاحرام، و اللّٰہ أعلم. (فتاوی ابن تیمیة :۲۶/۲۴۳، دار العربیة بیروت طبع جدید).

علامہ ابن تیمیہؒ کی عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے مذہب کے مطابق عجز کی وجہ سے حالت حیض میں طواف کرلیا تو دم واجب ہوگا اور طواف صحیح ہوگا، کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں، اور غسل بھی کرلے تو اچھا ہے۔

جدید فقہی مباحث میں ہے:

ایسی عورت کے لیے مجبوری کی وجہ سے ناپاکی کی حالت میں طواف کر لینے کی گنجائش ہے، کیونکہ دوبارہ اس کا وطن سے واپس آکر طواف کرنا دشوار ہے، اور جب تک طواف نہ کرے وہ اپنے شوہر کے لیے حرام ہے، اور فقہاء حنفیہ کے یہاں ناپاکی کی حالت میں طواف کیا جائے تب بھی طواف ہوجاتا ہے (تاتارخانیہ ۲/۵۱۶-۵۱۷) البتہ دم واجب ہوگا اور دم میں بدنہ واجب ہوگا۔ (جدید فقہی مباحث: ۱۳/ ۱۳۵، ادارۃ القرآن)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دورانِ طوافِ وداع حیض شروع ہونے پر طواف کا حکم:

سوال: ایک عورت طواف وداع کررہی تھی اور درمیان میں حیض آگیا تو طواف کا کیا حکم ہوگا؟ اس کی قضاء ہے یا نہیں؟

الجواب: حائضہ پر طواف وداع واجب نہیں ہے، اور درمیان میں شروع ہوا اور ترک کیا تو بھی قضا واجب نہیں ہے۔

بخاری شریف میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله تعالى عنه قال: أمر الناس أن يكون آخر عهدهم بالبيت إلا أنه خفف عن الحائض. (بخاري شريف: ١/ ٢٣٦، باب طواف الوداع).

تبیین الحقائق میں ہے:

ولو حاضت... عند الصدر تركته كمن أقام بمكة أي لو فعلت جميع أفعال الحج غير طواف الصدر فحاضت عنده تركت طواف الصدر كما يتركه من أقام بمكة ولا شيء عليه لتركه لقول ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه... وذكرت عائشة رضي الله عنها لرسول الله صلى الله عليه وسلم أن صفية بنت حيي رضي الله تعالىٰ عنها حاضت بعد ما طافت بعد الإفاضة فقال: فلتنفر إذاً. متفق عليه. (تبيين الحقائق باب التمتع، ٢/ ٥١ـ وشرح اللباب: ص ٢٨٠).

واللہ ﷻ اعلم۔

عورت کے بال کینسر کی وجہ سے گر جانے پر قصر کا حکم:

سوال: ایک عورت کے سر کے بال کینسر کی وجہ سے گر گئے ہیں تو وہ حج وعمرہ میں قصر کس طرح کرے گی، اور حلال ہونے کی کیا شکل ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عورت سر پر قینچی چلائے جو بال آجائے اور کٹ جائے ٹھیک ہے اگر بالکل بال نہ ہو اور نہ کٹے تب بھی ٹھیک ہے حلال ہو جائیگی، جیسے گنجا جس کے سر پر بالکل بال نہ ہو، اس کے بارے میں فقہاء نے فرمایا کہ استرہ چلا دے اگر چہ بال نہ آئے، لیکن عورت حلق نہیں کرسکتی۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

ويجب إجراء الموسى على الأقرع. وفي الشامية: قوله ويجب إجراء الموسى على الأقرع، هو المختار كما في الزيلعي والبحر واللباب وغيرها، وقيل استحباباً قال في شرح اللباب، وقيل استناناً وهو الأظهر. (فتاوی الشامی:۲/۵۱۶، سعید).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قوله ويجب إجراء الموسى، أي على الأصح وقيل يستحب هندية، قوله على أقرع مثله إذا جاء وقت الحلق ولم يكن على رأسه شعر، بأن حلق قبل ذلك وإنما وجب إجراء الموسى لأنه لما عجز عن الحلق والتقصير يجب عليه التشبه بالحالق كالمفطر في شهر رمضان يجب عليه التشبه بالصائم ولأن الواجب عليه إجراء الموسى. (حاشية الطحطاوی علی الدر المختار:۱/۵۰۷، کوئٹہ۔ وکذا فی الفتاوی الهندیة:۱/۲۳۱).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولاحلق على المرأة لماروي عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال ليس على النساء حلق وإنما عليهن تقصير وروت عائشة رضي الله تعالىٰ عنها أن النبي صلى الله عليه وسلم أنه نهى المرأة أن تحلق رأسها ولأن الحلق في النساء مثلة ولهذا لم تفعله واحدة من نساء رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكنها تقصر فتأخذ من أطراف شعرها قدر أنملة لماروي عن عمر رضي الله تعالىٰ عنه أنه سئل فقيل له كم تقصر المرأة فقال: مثل هذه وأشار إلى أنملته. (بدائع الصنائع:۲/۱۴۱، سعید۔ وکذا فی غنية الناسك:۹۲، ادارة القرآن۔ وشرح اللباب:۱۲۸، بیروت۔ والفتاوی الهندیة:۵/۳۵۸)۔ **واللہ سبحانہ اعلم۔**

طوافِ زیارت کے بعد ۲ دن خون آنے پر طواف کا حکم:

سوال: ایک عورت کو تین دن خون آیا پھر پانچ دن پاک رہی اوراس میں طواف زیارت کرلیا پھر دو دن خون آیا تو کیا یہ طواف امام محمدؒ کے مسلک کے موافق حالت حیض میں ہوا یا پاکی میں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ۵ دن کی پاکی ایام حیض میں ہونے کی وجہ سے دم متوالی کی طرح ہے لہٰذا طوافِ زیارت امام محمد کے مسلک کے موافق بھی حالت حیض ہی میں شمار ہوگا۔

ہدایہ اول میں ہے:

والطهر إذا تخلل بين الدمين في مدة الحيض فهو كالدم المتوالي. (الهداية: ۱/۶۶).

شامی میں ہے:

ثم اعلم أنه لا يشترط استمرار الدم فيها بحيث لا ينقطع ساعة لأن ذلك لا يكون إلا نادراً بل انقطاعه ساعة أو ساعتين فصاعداً غير مبطل أي لأن العبرة لأوله وآخره. (شامی ۱/ ۲۸۴، باب الحيض، سعيد).

عمدۃ الرعایۃ میں ہے:

أن عند محمدؒ يشترط لكون الطهر المتخلل المذكور حيضاً شروط ثلاثة أحدها أن تكون إحاطة الدم بطرفيه في عشرة أيام أو أقل وثانيها أن يكون مجموع الدمين نصاباً وثالثها أن يكون الطهر المتخلل مساوياً للدمين المحيطين أو أقل من مجموعهما فإن كان أكثر من مجموعهما يعد فاصلاً ... (عمدة الرعاية تعليقات شرح الوقاية: ۱/۱۱۱)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

چھ دن کی پاکی میں طوافِ زیارت کرلیا پھر ۳ دن خون آنے پر طواف کا حکم:

سوال: ایک عورت کو تین دن خون آیا پھر ۶ دن پاک رہی اوراس میں طواف زیارت کرلیا پھر تین دن خون آیا تو کیا امام محمدؒ کے نزدیک یہ طواف زیارت حالتِ حیض میں ہوا یا طہر میں؟

الجواب: امام محمدؒ کے مسلک کے مطابق دس دن کے اندر خون اور طہر برابر ہونے کا اعتبار کرکے خون کو حیض شمار کرے اور پاکی کو حد فاصل شمار کرلے تو آسانی ہوگی، یعنی صورتِ مسئولہ میں امام محمدؒ کے قول کے مطابق ابتدائی ۳ دن حیض کے شمار ہوں گے، اوراس کے بعد ۶ دن پاکی کے ایام شمار ہوں گے، لہٰذا طواف صحیح اور درست ہوگیا۔ اس کے بعد جو خون آیا وہ استحاضہ ہے، بظاہر امام محمدؒ کے مذہب میں عورتوں کے لیے آسانی ہے،

بوقتِ ضرورت اس قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے۔

شرح النقایہ للشیخ الیاس زادہ میں ہے:

والأصل عند محمد وهو الأصح وعليه الفتوىٰ أن الطهر المتخلل بين الدمين إذا كان دون ثلاثة أيام لا يصير فاصلاً وهذا بالاتفاق فإذا بلغ الطهر ثلاثة أيام أو أكثر ينظر فإن استوى الطهر بالدم في أيام الحيض أو كان الدم غالباً لا يصير الطهر فاصلاً أيضاً وإن كان الطهر غالباً يصير فاصلاً وحينئذٍ ينظر إن لم يمكن أن يجعل واحد منهما بانفراده حيضاً لا يكون شيء منه حيضاً وإن أمكن أن يجعل واحد منهما بانفراده حيضاً إما المتقدم أو المتأخر يجعل ذلک حيضاً وإن إمكن أن يجعل كل واحد منهما حيضاً بانفراده يجعل أسرعهما إمكاناً حيضاً وهو الدم المتقدم على الطهر وهو لايجوز بداية الحيض ولا ختمه بالطهر ولو رأت ثلاثة دماً وستة طهر وثلاثة دماً فحيضها الثلاثة الأولى لأنها أسرعهما إمكاناً. (شرح النقاية للشيخ الياس زاده على هامش شرح النقاية للملا على القارى: ۸۳/۱،سعيد).

شرح الوقایہ میں ہے:

وفي رواية محمدؒ عنه أنه لا يفصل إن أحاط الدم بطرفيه في عشرة أو أقل ... يشترط مع هذا كون الطهر مساوياً للدمين أو أقل. (شرح الوقاية: ۱۱۱/۱).

عمدۃ الرعایۃ میں ہے:

أن عند محمدؒ يشترط لكون الطهر المتخلل المذكور حيضاً شروط ثلاثة أحدها أن تكون إحاطة الدم بطرفيه في عشرة أيام أو أقل وثانيها أن يكون مجموع الدمين نصاباً وثالثها أن يكون الطهر المتخلل مساوياً للدمين المحيطين أو أقل من مجموعهما فإن كان أكثر من مجموعهما يعد فاصلاً ... (عمدة الرعاية تعليقات شرح الوقاية: ۱۱۱/۱)

البحر الرائق میں ہے:

وفي معراج الدراية معزياً إلى فخر الأئمة لو أفتىٰ مفتٍ بشيء من هذه الأقوال في مواضع الضرورة طلباً للتيسير كان حسناً. (البحر الرائق: ۱۹۳/۱، كوئته ـ والشامى: ۲۸۹/۱،مطلب لو افتى مفت ..، سعيد)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اہل حل کے لیے طوافِ وداع کا حکم:

سوال: ایک شخص جدہ میں ملازمت کررہا ہے، اور بیس یا پچیس سال سے مقیم ہے نہ کہ متوطن، صرف وہ کام کرتا ہے، حج سے فارغ ہونے کے بعد جدہ جارہا ہے تو اس پر طواف وداع واجب ہے یا مستحب؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں شخص مذکور نے جدہ کو وطن نہیں بنایا صرف مقیم ہے، لہٰذا واپسی میں طوافِ وداع واجب ہوگا، لیکن اگر اس نے جدہ کو اپنا وطن بنالیا اور وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو پھر طوافِ وداع مستحب ہے، اس لیے کہ اہل مکہ اور اہل حل یعنی میقات کے اندر رہنے والوں کے لیے طوافِ وداع واجب نہیں صرف مستحب ہے۔

ملاحظہ فرمائیں غنیۃ الناسک میں ہے:

هو واجب على كل حاج آفاقي مفرد أو قارن أو متمتع بشرط كونه مدركاً مكلفاً غير معذور فلا يجب على معتمر ولا على أهل مكة ومن أقام بها قبل حل النفر الأول وأهل الحرم والحل والمواقيت وفائت الحج والمحصر والمجنون والصبي والحائض والنفساء إلا أنه يندب لأهل مكة ومن في حكمهم كما في الدر والنهر وغيرهما ومعنى قولهم ومن أقام بها أي نوى الإقامة الأبدية بها واتخذها داراً. (غنية الناسك فی بغية المناسك، ص۱۰۱، باب طواف الصدر، ادارة القرآن).

شرح اللباب میں ہے:

طواف الصدر واجب على الحاج الآفاقي أي دون المكي والميقاتي ... ولا على أهل مكة حقيقة أو حكماً والحرام كأهل منى والحل كالوادي والخليص وجدة والمواقيت أي المعينة للآفاقيين ... ومن نوى الإقامة الأبدية أي الاستيطان. (شرح اللباب، ص:۲۷۹، باب طواف الصدر، بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

ولا يسقط عنه هذا الطواف بنية الإقامة ولو سنين ويسقط بنية الاستيطان بمكة أو بما حولها قبل حل النفر الأول. (غنية الناسك، ص:۱۰۲، باب طواف الصدر، ادارة القران۔ وزبدة المناسك: ص۲۲۹، وفتاوى فريدية: ٤/٢٣٩، باب تفسير الحج وشرائطه)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عن ابن عباسؓ قال: ﴿وقت رسول الله ﷺ لأهل المدينة ذا الحليفة ولأهل الشام الجحفة ولأهل نجد قرن المنازل ولأهل اليمن يلملم فهن لهن ولمن أتى عليهن من غير أهلهن لمن كان يريد الحج والعمرة فمن كان دونهن فمهله من أهله ...﴾

(متفق عليه)

باب ......(۲)

بغیر احرام کے میقات تجاوز کرنے کا بیان

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:
﴿لاتجاوزوا الوقت إلا بإحرام﴾

(مصنف ابن أبي شيبة)

باب ......﴿۲﴾

بغیر احرام کے میقات تجاوز کرنے کا بیان

میقات سے بغیر احرام کے تجاوز کرنے کا حکم:

سوال: جنوبی افریقہ سے جو شخص حج کے ارادہ یا عمرہ کے ارادہ سے یا کسی اور وجہ سے سیدھے مکہ مکرمہ جاوے مکہ مکرمہ ہی کے ارادہ سے تو کیا جدہ میں احرام باندھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر جدہ میں احرام باندھا تو دم واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر سیدھے مکہ مکرمہ جانا چاہے تو میقات سے پہلے احرام باندھنا ضروری ہے، بغیر احرام کے تجاوز کرنا گناہ ہے، اور جدہ میں احرام باندھنا درست نہیں اگر ایسا کیا تو دم واجب ہوگا اور گنہگار ہوگا۔

ملاحظہ ہو شرحِ لباب میں ہے:

من جاوز وقته أي ميقاته الذي وصل إليه سواء كان ميقاته الموضع المعين له شرعاً أم لا غيرمحرم ثم أحرم أي بعد المجاوزة أو لا أي لم يحرم بعدها، فعليه العود أي فيجب عليه الرجوع إلى وقت أي إلى ميقات من المواقيت، وإن لم يعد فعليه دم، لمجاوزة الوقت، فلو أحرم آفاقي داخل الوقت أي في داخل الميقات وأهل الحرم أي أحرموا من الحل للحج ...فعليهم العود إلى وقت أي ميقات شرعي لهم، لارتفاع الحرمة وسقوط الكفارة، وإن لم يعودوا فعليهم الدم والإثم لازم لهم، فإن عاد قبل شروعه في طواف أو وقوف سقط الدم.

(اللباب مع شرحه: ٩٤-٩٥، بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

ومن دخل مكة أو الحرم بلا إحرام فعليه أحد النسكين، فلو أحرم به بعد تحول السنة أو قبله من مكة أو خارجها داخل المواقيت أجزأه وعليه دم المجاوزة، فإن عاد إلى ميقات ولبى عنده سقط عنه دم المجاوزة أيضاً. (غنية الناسك في بغية المناسك:ص ۳۱،ادارة القرآن۔وكذا في الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۱).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

حدود میقات کے باہر سے جو شخص بھی براہِ راست مکہ مکرمہ کا سفر کرے، اس کے لیے میقات سے احرام باندھ کر آگے بڑھنا ضروری ہے، اب چونکہ ہوائی جہاز ہی کا سفر ہوتا ہے اور غالباً جہاز قرنِ منازل اور یلملم دونوں مقامات سے گزرتا ہے، اور دونوں ہی میقات ہیں، جہاز کس وقت میقات کے مقابل آیا اس کا صحیح اندازہ دشوار ہے، لہذا حجاج کو چاہئے کہ آغازِ سفر میں ہی احرام باندھ لیں، البتہ جو حجاج پہلے مدینہ جانا چاہیں، وہ احرام نہ باندھیں، کیونکہ میقات سے ان کا سفر حرم کی طرف نہ ہوگا، اور احرام ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو میقات سے حرم کی طرف جارہے ہوں۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/۲۳۹، نعیمیہ).

مزید ملاحظہ ہو: عمدۃ الفقہ: حصۂ چہارم: ۹۹، مجددیہ۔ وایضاح المسائل: ص ۱۲۳۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میقات سے گزرتے وقت مدینہ منورہ کا قصد ہو تو احرام کا حکم:

سوال: ایک شخص حج کے لیے جانا چاہتا ہے، ایجنٹ نے بتایا کہ پہلے مدینہ منورہ جانا ہے لہذا اس شخص نے احرام نہیں باندھا اور مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوگیا، جدہ پہنچنے کے بعد ایجنٹ نے بتلایا کہ پہلے مکہ مکرمہ جانا ہے تو اب وہ شخص کیا کرے گا؟ احرام کہاں سے باندھے؟ نیز دم واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں میقات سے گزرتے وقت حرم شریف کا قصد نہ تھا بلکہ مدینہ منورہ کا قصد تھا لہذا احرام باندھنا ضروری نہ تھا، اس لیے دم واجب نہیں ہے، لیکن اب جدہ میں قصد بدل گیا اور مکہ مکرمہ جانا ہے، تو جدہ ہی میں احرام باندھ لے پس کوئی جزا واجب نہیں ہوگی۔

شرح لباب المناسک میں ہے:

ومن جاوز وقته أي الذي وصل إليه حال كونه يقصد مكاناً في الحل كبستان بني عامر أو جدة مثلاً بحيث لم يمر على الحرم و ليس له عند المجاوزة قصد أن يدخل الحرم بعد

دخول ذلک المکان ثم بدا له أي ظهور أي حارث أن يدخل مكة أي أو الحرم ولم يرد نسكاً حينئذٍ فله أن يدخلها أي مكة، وكذا الحرم بغير إحرام. (شرح اللباب :ص۹٦،بیروت۔وغنية الناسك:۳۲).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

جو حجاج پہلے مدینہ جانا چاہیں، وہ احرام نہ باندھیں، کیونکہ میقات سے ان کا سفر حرم کی طرف نہ ہوگا، اور احرام ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو میقات سے حرم کی طرف جارہے ہوں۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۳۹،نعیمیہ).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر اس اکا ارادہ حج یا عمرہ کا نہ ہو بلکہ اس کا ارادہ بستانِ بنی عامر وغیرہ میں کسی ضرورت کے لیے جانے کا ہو تو اس پر کچھ واجب نہیں...پھر اس کے بعد اس کو کوئی ایسا امر پیش آیا جس کی وجہ سے اس کو مکہ مکرمہ یا حرم میں کسی اور جگہ جانا پڑا اور وہ اس وقت حج یا عمرہ کا ارادہ کرے تو اس کا میقات تمام زمینِ حل ہے۔(عمدۃ الفقہ :حصۂ چہارم:۱۰۴، مجددیہ).

امداد الفتاوی میں ہے:

سوال: یمنی مدینہ منورہ جانے کے قصد سے نکلا بوقتِ گزرنے میقات یلملم کے احرام نہیں باندھا جب جدہ شریف پہنچا پھر مکہ معظّمہ جانے کا ارادہ کیا اور جدہ سے احرام باندھ لیا تو اب دم واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب: اس کا احرام جدہ سے صحیح ہوا اور اس پر کوئی جنایت لازم نہیں آئی۔(امداد الفتاوی:۲/۱۶۲)۔واللہ ﷻ اعلم۔

جدہ میں چند گھنٹے رکنا ہو تو بغیر احرام کے میقات سے گزرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے ارادہ کرلیا کہ چند گھنٹے جدہ میں رک جائے گا، پھر حرم شریف میں داخل ہوگا تو بغیر احرام کے میقات سے گزر سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی اس کا جدہ سے احرام باندھنا صحیح ہوگا یا دم لازم ہوگا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ چونکہ ہوائی جہاز میقات کے اوپر یا اس کی محاذات میں سے گزرتا ہے، لہذا میقات کی محاذات سے پہلے احرام باندھنا ضروری ہے، اگر کسی نے جدہ میں ایک دن یا چند گھنٹے ٹھہرنے کی نیت کرلی اور جدہ تک احرام کو ٹال دیا تو ایسا کرنا درست نہیں، بلکہ ایک حیلہ ہے، حیلہ ضرورت کے وقت حرام یا مکروہ سے بچنے کے لیے کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسا حیلہ جس سے ایک حکم شرعی باطل ہوجائے، درست نہیں، یہ یوم سبت والوں کے حیلہ کی طرح ہے، جس پر قرآن کریم میں سخت وعید موجود ہے، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ

نے معارف القرآن: ۷/۵۲۳، پر تحریر فرمایا ہے، لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے حیلے اس وقت جائز ہوتے ہیں جب کہ انھیں شرعی مقاصد کے ابطال کا ذریعہ نہ بنائے۔

باقی یہ بات کہ جو شخص یہاں سے مدینہ منورہ جا کر وہاں سے عمرہ کا ارادہ کر کے احرام باندھ لے، یہ کوئی حیلہ نہیں، ایک تو اس وجہ سے کہ مدینہ منورہ کا سفر بذاتِ خود مقصود ہے بلکہ مدینہ میں دو مقاصد ہیں، (۱) مسجد نبوی، کما قال النبي صلى الله عليه وسلم لا تشد الرحال إلا إلى ثلثة مساجد...الخ. (۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت ہے، کما روي عن ابن عمر ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من زار قبري وجبت له شفاعتي". (رواه ابن خزيمة في صحيحه والدارقطني والبيهقي وآخرون واسناده حسن كما في آثار السنن للعلامة النيموي ص۳۳۹) اور اگر بالفرض مدینہ منورہ کو مقصود نہ بنائیں، بلکہ فقط عمرہ یا حج فقط مقصود ہو تو بھی اس کا حاصل یہ ہوگا کہ یہ شخص مکہ مکرمہ براستہ مدینہ جانا چاہتا ہے اور میقات سے نکلنا چاہتا ہے، تو اس کے راستہ میں دو میقات پڑیں گے، ایک ابعد من مکہ اور دوسرا اقرب الی مکہ، اور ایسا شخص اقرب الی مکہ میقات کو اختیار کر سکتا ہے، کما ہو مذکور فی کتب الفقہ۔

اور فقہاء کرام نے جو مسئلہ تحریر فرمایا ہے کہ اگر حل میں کسی جگہ کا ارادہ کیا تو احرام کے بغیر جا سکتا ہے، یہ حیلہ اس شخص کے لیے کارآمد ہے جس کا واقعی اس جگہ کا ارادہ ہو اول درجہ میں۔ كما قال العلامة الشامي: لكن لا تتم الحيلة إلا إذا كان قصده لموضع من الحل قصداً أولياً كما قررناه. (الشامي:۲/۴۷۷، سعيد).

بہر حال اس اہم اور پاکیزہ سفر میں اس قسم کے حیلوں سے بچنا چاہئے، اگر کبھی کسی حنفی ڈرائیور کو روزانہ آنا پڑتا ہو اور عمرہ کا موقعہ نہیں مل سکتا ہو تو واقعی یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

جدہ ائیر پورٹ پر احرام باندھنے کا حکم:

سوال: جو لوگ جدہ میں مقیم نہیں ہیں وہ جدہ ائیر پورٹ پر احرام باندھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں جدہ ائیر پورٹ پر احرام باندھنا درست نہیں ہے بلکہ میقات سے گزرنے سے پہلے یعنی جب ہوائی جہاز یلملم کی محاذات سے گزرے اس سے قبل احرام باندھنا ضروری ہے، ورنہ دم واجب ہوگا۔

ملاحظہ ہو شرحِ لباب میں ہے:

من تجاوز وقته أي ميقاته الذي وصل إليه سواء كان ميقاته الموضع المعين له شرعاً أم

لا غير محرم ثم أحرم أي بعد المجاوزة أو لا أي لم يحرم بعدها، فعليه العود أي فيجب عليه الرجوع إلى وقت أي إلى ميقات من المواقيت، وإن لم يعد فعليه دم لمجاوزة الوقت، فلو أحرم آفاقي داخل الوقت أي في داخل الميقات وأهل الحرم أي أحرموا من الحل للحج ...فعليهم العود إلى وقت أي ميقات شرعي لهم، لارتفاع الحرمة وسقوط الكفارة، وإن لم يعودوا فعليهم الدم والإثم لازم لهم، فإن عاد قبل شروعه في طواف أو وقوف سقط الدم . (اللباب مع شرحه:۹٤ـ۹٥، بیروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

ومن دخل مكة أو الحرم بلا إحرام فعليه أحد النسكين، فلو أحرم به بعد تحول السنة أو قبله من مكة أو خارجها داخل المواقيت أجزأه، وعليه دم المجاوزة، فإن عاد إلى ميقات ولبى عنده سقط عنه دم المجاوزة أيضاً. (غنية الناسك في بغية المناسك:ص ۳۱،ادارة القرآن۔و كذا في الفتاوى الهندية:۱/ ۲۲۱).

مزید ملاحظہ ہو: فتاویٰ ہندیہ:۱/۲۲۱۔عمدۃ الفقہ :حصۂ چہارم:۹۹،مجددیہ۔وایضاح المسائل:ص۱۲۳۔واللہ ﷻ اعلم۔

جدہ کے قصد سے میقات بغیر احرام کے تجاوز کرنے کا حکم:

سوال: میرا بیٹا جدہ میں رہتا ہے عمرہ کے لیے جاتے وقت میں جدہ میں احرام باندھ سکتا ہوں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا ارادہ صرف بیٹے کی ملاقات ہے پھر وہاں سے تبعاً عمرہ کے لیے بھی نیت ہے تو جدہ میں بیٹے کی ملاقات وزیارت کے بعد عمرہ کا احرام باندھنا درست ہے۔کوئی جزاء واجب نہ ہوگی ،لیکن اگر آپ کا قصد اولاً عمرہ کا ہے پھر سوچا کہ بیٹے کی بھی ملاقات کرلے تو میقات سے احرام باندھنا ضروری ہے،ورنہ دم لازم ہوگا،گویا اصلاً نیت کا اعتبار ہے اوردل کا حال اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے،لہذا بلا ضرورت حیلوں سے بچنا اس مبارک سفر میں بہت ضروری ہے۔

شرح لباب المناسک میں ہے:

ومن جاوز وقته أي الذي وصل إليه حال كونه يقصد مكاناً في الحل كبستان بني عامر أو جدة مثلاً بحيث لم يمر على الحرم و ليس له عند المجاوزة قصد أن يدخل الحرم بعد دخول ذلک المكان، ثم بدا له أى ظهور أي حارث أن يدخل مكة أي أو الحرم ، ولم يرد

نسكاً حينئذٍ فله أن يدخلها أي مكة وكذا الحرم بغير إحرام، وفيه إشكال إذ ذكر الفقهاء في حيلة دخول الحرم بغير إحرام أن يقصد بستان بني عامر ثم يدخل مكة، وعلى ماذكره المصنفؒ وقررناه لم تحصل الحيلة كما لايخفىٰ، فالوجه في الجملة أن يقصد البستان قصداً أوّلياً ولايضره قصده دخول الحرم بعده قصداً ضمنياً أوعارضياً ،كما إذا قصد مدني جدة لبيع وشراء أو لا، ويكون في خاطره أنه إذا فرغ منه أن يدخل مكة ثانياً بخلاف من جاء من الهند مثلاً بقصد الحج أو لا، وأنه يقصد دخول جدة تبعاً ولو قصد بيعاً وشراء لايقال.

(لباب المناسك مع شرحه:ص۹۶،بيروت۔وغنية الناسك :۳۲).

ارشادالساری میں ہے:

قال في ردالمحتار عند قول صاحب الدر: وهذه حيلة الآفاقي يريد دخول مكة بلا إحرام، ثم إن هذه الحيلة مشكلة، لما علمت من أنه لا يجوز له مجاوزة الميقات بلا إحرام ما لم يكن أراد دخول مكان في الحل لحاجة، وإلا فكل آفاقي يريد دخول مكة لا بد أن يريد دخول الحل .... قال العلامة الرافعي في تقريره : قوله: لكن ينافيه قولهم ثم بدا له دخول مكة الخ، يندفع الإشكال في هذه المسئلة بأن المجوز لدخول مكة غير محرم أحد أمرين: الأول: أن يقصد الحل لحاجة، ثم يبدو له دخول مكة، وهذا ما ذكره في الكافي واللباب والبدائع. والثاني: أن يقصد دخول الحل قصداً أوّلياً مع قصد دخول مكة قصداً ضمنياً، وهو ما أشار له في البحر، وذكره في شرح اللباب، وهو مرادهم بالحيلة. (ارشاد الساری الی مناسك الملا علی القاری علی هامش شرح اللباب:۹۷، فصل فی مجاوزة الميقات بغيراحرام ، بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

وعن هذا قيل: إن حيلة آفاقي يريد دخول مكة لحاجة بلا إحرام أن يقصد البستان لكن لا تتم الحيلة إلا لمن يقصد البستان قصداً أوّلياً بحيث لا يكون سفراً إلا لأجله. (غنية الناسك فی بغية المناسك :۳۲، مطلب دخول الآفاقي الحل لحاجة)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

ڈرائیور اور ایجنٹ وغیرہ کے لیے بغیر احرام کے میقات تجاوز کرنے کا حکم:

سوال: کیا ایجنٹ اور ڈرائیور وغیرہ کے لیے بغیر احرام کے مکہ مکرمہ جانا جائز ہے یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں

کہ ہمارے لیے حرج ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ ایجنٹ اورڈرائیورحضرات اگرروزانہ باربارجاتے ہیں توان کے لیےحرام باندھنا ضروری نہیں ہوناچاہئے،لیکن جوحضرات باربارنہیں جاتے مثلاً ایجنٹ لوگ عامۃً روزانہ نہیں جاتےلہٰذاان کے لیےاحرام باندھناضروری ہوگا۔

ملاحظہ ہو''نئے مسائل اورعلماء کے فیصلے''میں مذکورہے:

موجودہ حالات میں جب کہ تجار،دفاترمیں کام کرنے والے،ٹیکسی چلانے والے،اوردیگرپیشہ ورانہ کام کرنے والےکبھی ہرروزکبھی دوسرے تیسرے دن،اوربعض لوگوں کوتوایک دن میں ایک سے زیادہ دفعہ حرم میں داخل ہوناپڑتاہے،ایسی حالت میں اس طرح کےلوگوں کوہربارا حرام اوراادائے عمرہ کی پابندی بے حدمشقت طلب اوردشوارہے،اس لیےان حضرات کے لیےبغیراحرام باندھےحدودِحرم میں داخلہ کی گنجائش ہوگی۔(نئے مسائل اورعلماءہند کے فیصلے:۴۷،ازحضرت قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمی)۔

عمدۃ القاری میں ہے:

قال أبوعمر: لا أعلم خلافاً بين فقهاء الأمصار في الحطابين ومن يدمن الاختلاف إلى مكة ويكثره في اليوم والليلة أنهم لا يأمرون بذلک لما عليهم فيه من المشقة. (عمدة القارى: ۵۳۵/۷، باب دخول الحرم ومكة بغيراحرام،دارالحديث ملتان).

ہدایہ میں ہے:

من كان داخل الميقات له أن يدخل مكة بغير إحرام لحاجته لأنه يكثر دخوله مكة وفى إيجاب الإحرام في كل مرة حرج بين. (الهداية: ۲۳۵/۱،فصل في المواقيت).

جدیدفقہی مباحث میں ہے:

اب سوال یہ پیداہوتاہےکہ آج کل کےزمانہ میں کاروباری لوگوں کوکثرت کےساتھ بارباآنےاورجانے کی ضرورت ہوتی ہےمثلاً اہل مکہ کوباربارمدینہ جاناپڑتاہےاوراہل مدینہ کوباربارمکہ مکرمہ اپنےکاروبارکےلیے جاناپڑتاہےتواگران پرہرمرتبہ احرام باندھ کرعمرہ کاحکم لگایاجائےگاتوشدیدمشقت اورحرج لازم آجاتاہےتوان کےلیےشرعی طورپرکوئی رعایت اورگنجائش ہوسکتی ہےیانہیں؟

تواس کاجواب یہ ہےکہ جولوگ مہینےدومہینےمیں آتےجاتےہیں ان کےحق میں توکوئی گنجائش نہ ہوگی،البتہ جولوگ روزانہ یاہرہفتہ آتےجاتےہیں ان لوگوں کےلیےبلااحرام میقات سےگزرنےکےدوطریقےہم

کونظر آتے ہیں:.....

طریقہ دوم: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ میقات کے باہر سے لکڑیاں لانے والے اورعمال اورتجاراورکمانے والے جوباربار جاتے آتے ہیں ان کے لیے بلااحرام میقات سے گزرتے رہنے کی اجازت ہے۔

اس لیے کہ اگر ہرباران پراحرام کی پابندی لگائی جائے گی تو سخت مشقت کا خطرہ ہے، مصنف ابن ابی شیبہ اورنخب الافکاروغیرہ میں ابن عباسؓ کی روایت اس طرح کے الفاظ سے مروی ہے:

عن ابن عباس رضي اللّٰه تعالىٰ عنهما قال: لا يدخل أحد مكة إلا بإحرام إلا الحطابين والعمالين وأصحاب منافعهما، الحديث. (نخب الافكار قلمي:٥/٢١٩، مصنف ابن ابي شيبة:٤/٢١١، طحاوي شريف من عطاء:١/٤٣٨، تلخيص الحبير:١/٢١١۔ (جدید فقہی مباحث:۱۳/۱۶۱،۳۵،۳۷، ادارۃ القرآن).

اس سلسلے میں مقالہ نگاروں کی دورائیں ہیں، بیشتر حضرات نے ضرورت، حاجت شدیدہ اورمشقت کی وجہ سے جمہورائمہ کے مسلک کوراجح قرار دیتے ہوئے بغیراحرام کے اندرداخل ہونے کی اجازت دی ہے، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔ مولانا مصلح الدین بڑودوی۔

مولانا زبیر احمد قاسمی۔ مولانا عزیز اختر قاسمی۔

مولانا محبوب علی وجیہی۔ مولانا عتیق احمد قاسمی۔

مولانا جمیل احمد نذیری۔ مولانا عبدالقیوم پالنپوری۔

مولانا اسعد اللہ قاسمی۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی۔ مولانا ابرار خان ندوی۔

مولانا محمد ابرار الحق قاسمی۔ مولانا محمد نور قاسمی۔

مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی۔ مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

مولانا صدر عالم قاسمی۔ مولانا خورشید احمد اعظمی،

مولانا منظور احمد قاسمی۔ مولانا عبدالمفتاح عادل۔

مولانا اختر ضیاء قاسمی۔ مولانا محمد عمر فلاحی۔

(جدید فقہی مباحث:۱۳/۱۹، تلخیص از مقالات بابت حج وعمرہ، ادارۃ القرآن).

مزید ملاحظہ فرمائیں: جدید فقہی مسائل:۱۸۲/۲،نعیمیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بحری جہاز سے جدہ آنے والوں کے لیے احرام کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص ہندوستان یا پاکستان سے بحری جہاز کے ذریعہ جدہ آتا ہے جب کہ یلملم دور ایک کنارہ پر بغیر حقیقی محاذات کے رہ جاتا ہے، تو کیا یہ شخص جدہ سے احرام باندھ سکتا ہے؟

الجواب: اس مسئلہ میں ہمارے اکابرؒ کا کچھ اختلاف ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ جدہ تک احرام مؤخر کر سکتا ہے، لیکن حضرت مولانا یوسف بنوریؒ فرماتے تھے کہ جدہ تک احرام مؤخر کرنا جائز نہیں ہے، بایں ہمہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ احوط یہ ہے کہ یلملم کی محاذات سے قبل ہی احرام باندھ لیا جائے۔

ملاحظہ ہو جواہر الفقہ میں ہے:

ایسے حالات میں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلافِ رائے ہے، احتیاط اسی میں ہے کہ بحری جہاز میں یلملم ہی سے احرام باندھ لیں، یا ساحلِ جدہ پر اترنے سے پہلے احرام باندھ لیں، کیونکہ حسب تصریحِ فقہاء محلِ اختلاف میں احتیاط کا پہلو اختیار کرنا بہتر ہے، تا کہ اپنی عبادت کے جواز میں کسی کا اختلاف نہ رہے، اس کے علاوہ احرام کو میقات سے پہلے باندھنا سب ہی کے نزدیک افضل ہے، بلکہ بعض روایاتِ حدیث میں اپنے گھر سے ہی احرام باندھ کر چلنے کی فضیلت آئی ہے، شرط یہ ہے کہ محظوراتِ احرام میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو اور جس کو یہ خطرہ ہو کہ محظوراتِ احرام سے بچنا اس تمام عرصہ میں اس کے لیے مشکل ہوگا، اس کے لیے آخری حد تک مؤخر کرنا بہتر ہے، ایسے شخص کو آخری حد میں اتنی احتیاط کر لینا چاہئے کہ اس کا احرام علماء کے اختلاف سے نکل جائے۔
(جواہر الفقہ:۴۸۹/۱،مواقیت احرام،دارالعلوم کراچی)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

پانی کے جہاز سے جانے کے لیے جو قدیم ایام سے راستہ تھا تو یلملم کی محاذات پر پہونچ کر احرام باندھا جاتا تھا، یہی ہندوستان کے اکابر علماء فقہاء کا معمول رہا، اب بھی احوط یہی ہے، اگر چہ موجودہ اہل جغرافیہ کا قول یہ ہے کہ اب راستہ میں نہ یلملم آتا ہے اور نہ اس کی محاذات آتی ہے، بلکہ جدہ سے احرام باندھنا لازم ہے، مگر احتیاط کا تقاضا وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔(فتاوی محمودیہ:۳۷۹/۱۰،مبوب ومرتب)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: عمدۃ الفقہ: حصہ چہارم، ص ۹۰-۹۳ پاک وہند کے حجاج کے لیے میقات کا مسئلہ، مجددیہ۔ وفتاوی رحیمیہ: ۶/ ۴۰۷-۴۱۰۔ واحسن الفتاوی: ۴/ ۵۶۴۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:
﴿فمن تمتع بالعمرة إلى الحج
فما استيسر من الهدى﴾
عن أنس رضي اللّٰہ تعالیٰ عنه قال:
سمعت النبي صلى اللّٰہ عليه وسلم يقول:
﴿لبيك بعمرة وحجة﴾
(ترمذی)

باب......﴿۳﴾

قران، تمتع اور افراد کا بیان

باب ﴿۳﴾

قران، تمتع اور افراد کا بیان

افراد کی نیت کے بعد قران کرنے سے حج کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص حج افراد کی نیت کرے پھر حج کے افعال شروع کرنے سے پہلے قران کا ارادہ کرلے تو یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں حج کے افعال شروع کرنے سے پہلے قران کی نیت کرنا صحیح ہے اور دم قران واجب ہوگا، البتہ اس طرح کرنا برا ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

والقران لغة الجمع بين شيئين، وشرعاً أن يهل أي يرفع صوته بالتلبية بحجة وعمرة معاً حقيقة أوحكماً بأن يحرم بالعمرة أولاً ثم بالحج قبل أن يطوف لها أربعة أشواط، أوعكسه بأن يدخل إحرام العمرة على الحج قبل أن يطوف للقدوم وإن أساء. وفي الشامية: قوله وإن أساء أي وعليه دم شكر لقلة إساءته، ولعدم وجوب رفض عمرته. (الدرالمختار مع الشامی:۲/۵۳۱،سعید).

مزید ملاحظہ ہو: البحر الرائق:۲/۳۵۶، کوئٹہ۔وفتاوی هندیه:۱/۲۳۷۔وبدائع الصنائع:۲/۱۶۷،سعید۔ ومعلم الحجاج:۱۷۲)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

قربانی پر قادر ہونے کے باوجود افراد کرنے کا حکم:

سوال: ایک مالدار شخص اپنی بیوی، دو بیٹیاں اور ایک بہن سمیت حج افراد کے لیے گیا، واپسی پر کسی عالم کا قول ذکر کیا گیا کہ حج افراد صرف غریبوں کے لیے ہے، جب اس نے بذاتِ خود اس عالم سے دریافت کیا تو عالم نے کہا کہ ابتداء اسلام میں وہ لوگ افراد کرتے تھے جو قربانی پر قادر نہیں ہوتے تھے...اب یہ شخص جاننا چاہتا ہے کہ کیا حج افراد صرف غریبوں کے لیے ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اس عالم صاحب کا یہ کہنا درست نہیں ہے، بلکہ قربانی پر قادر حضرات بھی حج افراد کر سکتے ہیں، ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ احناف کے نزدیک قران سب سے افضل ہے لیکن افراد بھی سب کے لیے مشروع ہے۔

ملاحظہ ہو شرح لباب میں ہے:

القران أفضل من الإفراد أي بالحج والتمتع والأولیٰ أن یقول أفضل من التمتع والإفراد لأن التمتع عندنا أفضل من الإفراد خلافاً لمالکؒ، والشافعيؒ حیث قالا: إن الإفراد أفضل مطلقاً. (لباب المناسك مع شرحه: ۲۸٤، باب القران، بیروت).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما بیان مایحرم به فما یحرم به في الأصل ثلاثة أنواع الحج وحده والعمرة وحدها والعمرة مع الحج وعلی حسب تنوع المحرم به یتنوع المحرمون و هم في الأصل أنواع ثلاثة مفرد بالحج ومفرد بالعمرة وجامع بینهما فالمفرد بالحج هو الذي یحرم بالحج لاغیر والمفرد بالعمرة هو الذي یحرم بالعمرة لاغیر. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱٦۷، سعید)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

قارن کے طوافِ عمرہ اور طوافِ قدوم میں تداخل کا حکم:

سوال: اگر کوئی قارن طواف قدوم کی نیت طواف عمرہ میں کرلے تو کراہت ہوگی یا بلا کراہت جائز ہوگا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں طوافِ عمرہ میں طوافِ قدوم کی نیت کرنا بلا کراہت جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن جابر رضي الله تعالیٰ عنه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قرن الحج والعمرة فطاف لهما طوافاً واحداً. (رواه الترمذی:۱/۱۸۸).

تفسیر مظہری میں ہے:

إنه صلی الله علیه وسلم لما قدم مكة طاف وسعى بين الصفا والمروة، ثم لم يقرب الكعبة بطوافه بها حتى رجع من عرفة، رواه البخاري، قلت: وذلک الطواف والسعي كان لعمرته وكفاه عن طواف القدوم لحجه. (التفسیر المظهری: ۱/۲۳۰، بلوچستان).

فتح القدیر میں ہے:

وروى أحمد من حديث الهرماس بن زياد الباهلي أن رسول الله صلى عليه وسلم قرن في حجة الوداع بين الحج والعمرة، وروى البزار بإسناد صحيح إلى ابن أبي أوفى قال: إنما جمع رسول الله صلى الله عليه وسلم بين الحج والعمرة، لأنه علم أن لايحج بعد عامه ذلک، وروى أحمد من حديث جابر رضي الله عنه" أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قرن الحج والعمرة فطاف لهما طوافاً واحداً. (فتح القدیر:۲/۵۲۳،باب القران،دارالفکر).

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قران فرمایا تھا اور عمرہ اور طواف قدوم دونوں کے لیے ایک ہی طواف فرمایا تھا۔

معارف السنن میں ہے:

قال شيخنا رحمه الله تعالىٰ: ويمكن أن يقال: إن الطواف الأول يوم القدوم كان للعمرة وتداخل فيه طواف القدوم...قال الراقم: لا شک أن طواف القدوم تحية للبيت كتحية المسجد بالركعتين، ومن دخل المسجد وصلى السنة ونوى التحية فيها دخل صلاة التحية في السنة. (معارف السنن:۶/۳۶۹،بحث طواف القارن،سعید).

درس ترمذی میں ہے:

ان چار طوافوں میں سے حنفیہ کے نزدیک ایک طواف نہ کرنے کی گنجائش ہے، اور وہ اس طرح کہ طواف عمرہ ہی میں طواف قدوم کی نیت کرلے، تو الگ طواف قدوم کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ (درس ترمذی:۳/۲۲۲، کراچی).

معلم الحجاج میں ہے:

مسئلہ: وقوف سے پہلے اگر کسی نے نفل طواف کرلیا اور طواف قدوم کی نیت نہیں کی تو بھی طواف قدوم ہوگیا، طواف قدوم کی خاص طور سے نیت کرنا ضروری نہیں۔ (معلم الحجاج:۱۶۲،طواف قدوم کے احکام)۔واللہ ﷻ اعلم۔

متمتع اور مفرد کے لیے حج کی سعی عید سے پہلے کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی متمتع یا مفرد حج کی سعی عید سے پہلے کرنا چاہے تو کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کرسکتا ہے تو اس کے لیے طواف ضروری ہے یا نہیں ؟ اور طواف احرام میں کرے گا یا بغیر احرام کے نیز سعی کی تقدیم کی کیا دلیل ہے؟ جب کہ احناف کے ہاں قاعدہ ہے: ”من قدم شيئاً من نسكه أو أخر فليهرق لذلك دماً “؟

الجواب: احادیث میں آتا ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سعی فرمائی تھی اور چونکہ ان میں سے ہر ایک کا وقت مذکور نہیں ہے اس لیے اس کی تقدیم میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لہذا صورتِ مسئولہ میں متمتع اور مفرد حج کی سعی عید سے پہلے کرسکتے ہیں، اگر چہ افضل یہ ہے کہ طواف زیارت کے بعد کرے۔ سعی بغیر طواف کے مشروع نہیں، نیز طواف اور سعی حالتِ احرام میں کرے، اور ”من قدم شيئاً من نسكه...الخ، یہ قاعدہ رمی، ذبح، حلق کے بارے میں ہے نہ کہ طواف زیارت اور سعی کے بارے میں۔

ملاحظہ فرمائیں احادیث میں دو سعیوں کا ذکر ملتا ہے لیکن وقت مذکور نہیں ہے:

عن ابن أبي ليلىٰ،عن علي رضى الله تعالىٰ عنه أنه طاف لهما طوافين وسعى لهما سعيين، وقال: هكذا رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم صنع. سنن دارقطني:۲/۲٦۳/۱۳۰ . **وعن عمران بن حصين أن النبي صلى الله عليه وسلم طاف طوافين وسعى سعيين.** دارقطني: ۲/۲٦٤).

حلیۃ الاولیاء میں ہے:

عن رجل من بني عذرة أنه سمع علي بن أبي طالب رضي الله تعالىٰ عنه لبىٰ بحجة وعمرة معاً قال مسعر: قلت لبكير: طاف لهما طوافين وسعى لهما سعيين قال: نعم، رواه عباد بن صهيب عن مسعر مثله، وزاد هكذا رأيت النبي صلى الله عليه وسلم صنع. (حلية الاولياء:۷/۲۳۱، بيروت ـ والسنن الكبرى للبيهقي:٥/۱۰۸،دارالمعرفة،بيروت)

غنیۃ الناسک میں ہے:

وإن أراد تقديم السعي لزمه أن يتنفل بطواف بعد إحرامه للحج يضطبع فيه ويرمل ثم يسعىٰ بعده ولوطاف للقدوم مع أنه ليس بسنة في حقه وسعى بعده وكان قد أحرم قبلهما للحج وقع سعيه معتبراً فلا يأتي به بعد طواف الزيارة. (غنية الناسك: ۱۱۵، كراچى۔وكذا فى الشامى: ۲/ ۵۱۸، سعيد)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حجِ قران میں عمرہ سے قبل حیض آنے پر قران کا حکم:

سوال: ایک عورت نے قران کیا عمرہ کرنے سے پہلے اس کو حیض آ گیا ابھی تک طوافِ عمرہ نہیں کیا تھا کہ افعالِ حج شروع ہوگئے، اب اس پر دم ہے یا نہیں؟ اور قران صحیح ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عمرہ چھوٹ جانے کی وجہ سے قران باطل ہوگیا، اور دمِ قران ساقط ہوگیا البتہ ایامِ تشریق کے بعد عمرہ کی قضا لازم ہوگی، اور رفضِ عمرہ کی وجہ سے ایک دم لازم ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں لباب المناسک میں ہے:

الثالث:۔ أن يطوف للعمرة كله أو أكثره قبل الوقوف بعرفة فلو لم يطف لها حتى وقف بعرفة بعد الزوال ارتفضت عمرته أي ولو من غير نية رفضه إياها ثم إذا ارتفضت عمرته فعليه دم لرفضها وقضاؤها بعد أيام التشريق وبطل قرانه وسقط عنه دمه أي دم القران للشكر المترتب على نعمة الجمع من أداء النسكين. (لباب المناسك مع شرحه: ۲۸۵، فصل فى شرائط صحة قران، بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

ولو لم يطف لعمرته أو طاف لها أقله ولو بعذر كحيض مثلاً حتى وقف بعرفة ارتفضت عمرته وإن لم ينو الرفض، لأنه تعذر عليه أداؤها...وبطل قرانه وسقط عنه دمه وعليه قضاؤها بعد أيام التشريق ودم رفضها. (غنية الناسك فى بغية المناسك: ۱۰۹، فصل فى صفة القران المسنون، ادارة القرآن۔وكذا فى الهداية: ۱/ ۲۶۰، باب القران۔ واللہ ﷻ اعلم۔

متمتع کا ایک سے زائد عمرے کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص حج کے لیے چلا جائے، اور تمتع کرے تو حلال ہونے کے بعد مکہ مکرمہ میں رہ کر

بار بار عمرے کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں متمتع ایک سے زائد عمرے کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں ہے:

ویعتمر قبل الحج ما شاء وما في اللباب: ولا یعتمر قبل الحج فغیر صحیح لأنه بناء علی أن المکي ممنوع من العمرة المفردة، وهو خلاف مذهب أصحابنا جمیعاً لأن العمرة جائزة في جمیع السنة بلاکراهة إلا في خمسة أیام، لا فرق في ذلک بین المکي والآفاقي صرح به في النهایة والمبسوط والبحر وأخي زاده والعلامة قاسم وغیرهم رحمهم الله تعالیٰ، کذا في المنحة بل المکي ممنوع من التمتع والقران وهذه عمرة مفردة لا أثر لها في تکرر تمتعه. (غنیة الناسك فی بغیة المناسك:۱۱۵،فصل فی کیفیة اداء التمتع المسنون ،ادارة القرآن۔وشرح اللباب:۳۱۲، بیروت).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

راجح قول یہی ہے کہ اشہر حج میں متمتع آفاقی یوم عرفہ ویوم نحر اور ایام تشریق کے علاوہ باقی دنوں میں نفلی عمرہ بدوں حرج کرسکتا ہے، مصنف ارشادالساری تحریر فرماتے ہیں کہ ناواقف متمتع حجاج کو جاہل معلم نفلی عمرہ سے روکتے ہیں، یہ غلط ہے، غریب ناواقف حجاج ایسی عبادت سے محروم رہتے ہیں جس کو وہ لوگ اپنے وطن میں نہیں کرسکتے، ایک بڑی عبادت سے محروم رہتے ہیں (ص۱۹۴) لہٰذا عمرہ کرنے میں حرج نہیں، جائز ہے، احقر کا عمل یہی ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ:۲/۷۲).

معلم الحجاج میں ہے:

متمتع ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ حج سے پہلے کرسکتا ہے۔ (معلم الحجاج:۲۵۶،مسائلِ تمتع ادارة القرآن۔وزبدة المناسک مع عمدة السالک:۳۱۳۔۳۱۹ تمتع ادا کرنے کے طریقہ کا بیان)۔واللہ ﷻ اعلم۔

متمتع عمرہ کرنے کے بعد مدینہ طیبہ چلا گیا پھر واپسی پر عمرہ کا حکم:

سوال: ایک آدمی حج کے لیے جاتا ہے اور حج تمتع کرتا ہے مکہ مکرمہ پہونچنے کے بعد عمرہ کرتا ہے اس کے بعد مدینہ طیبہ جاتا ہے تو یہ شخص مدینہ طیبہ سے واپس مکہ مکرمہ آتے ہوئے دوبارہ عمرہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی یہ تمتع پر تمتع شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مدینہ طیبہ سے واپسی پر دوسرا عمرہ کرنے کی گنجائش ہے اور تمتع پر تمتع بھی شمار نہیں ہوگا، البتہ صرف حج کا احرام باندھنا بہتر ہے۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

جس شخص نے اشہر حج میں عمرہ کرلیا ہے اس کے بعد مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا، پھر اس سال حج کر کے وطن واپس ہوگا، امام صاحب کے نزدیک وہ شخص متمتع ہے، اس کو ایک عمرہ کر لینے کے بعد حج سے پہلے مدینہ سے چل کر عمرہ کرنے سے امام صاحب منع فرماتے ہیں، اور صاحبین کے نزدیک مدینہ طیبہ چلے جانے کی وجہ سے اس کا تمتع باطل ہوگیا، اب اگر دوبارہ وہ عمرہ کرے گا تو تمتع صحیح ہوجائے گا۔ (فتاوی محمودیہ: ۳۹۳/۱۰، مبوب ومرتب)۔

احسن الفتاوی میں ہے:

اگر کوئی آفاقی اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بعد مدینہ منورہ یا جدہ وغیرہ چلا جائے تو واپسی کے وقت اس کے لیے حج افراد کا احرام باندھنا بہتر ہے، امام صاحبؒ کے نزدیک وطن اصلی کے سوا کسی دوسرے مقام کی طرف سفر سے تمتع باطل نہیں ہوتا اور صاحبینؒ کے نزدیک باطل ہوجاتا ہے، چونکہ پہلا عمرہ تمتع کا شمار نہ ہوا اس لیے اب نئے سرے سے تمتع یا قران جو بھی چاہے کرسکتا ہے، اور امام صاحبؒ کے مذہب کے مطابق وہ بحکم مکی ہے اس لیے قران تو نہیں کرسکتا، البتہ اس کا تمتع کا عمرہ باقی ہے، اور اس کے بعد حج سے قبل دوسرے عمرہ کا جواز مختلف فیہ ہے، قول اعدل یہ ہے کہ آفاق (بلکہ مکہ سے بھی جائز ہے) سے جائز ہے، اس لیے مدینہ طیبہ سے واپسی پر عمرہ کا احرام باندھنے میں چنداں حرج نہیں، معہذا اختلاف سے بچنے کے لیے صرف حج ہی کا احرام باندھنا بہتر ہے۔

(احسن الفتاوی: ۵۱۴/۴)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تمتع سے متعلق چند سوالات:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں: ایک شخص آفاقی اشہر حج میں مکہ مکرمہ گیا، اور عمرہ ادا کیا عمرہ کی ادائے گی کے بعد مدینہ منورہ چلا گیا، واپسی پر دوسرا عمرہ کیا پھر حج کا حرام مکہ مکرمہ سے باندھا۔

(۱) کیا اس کا تمتع صحیح ہے یا نہیں؟

(۲) اس پر دمِ تمتع ہے یا نہیں؟

(۳) کیا اس پر کوئی دمِ جبر ہے یا نہیں؟

(۴) تمتع پہلے عمرہ سے منعقد ہوا یا دوسرے عمرہ سے؟

(۵) آفاقی کے لیے اشہرِ حج میں ایک سے زائد عمرے کرنا صحیح ہے یا نہیں؟
(۶) مدینہ منورہ سے فقط حج کا احرام باندھا تو تمتع صحیح ہوگا یا نہیں؟
(۷) کیا اس پر کوئی دم جبر ہوگا یا نہیں؟
(۸) آفاقی حاجی کا اشہرِ حج میں میقات سے باہر نکلنا کیسا ہے؟
(۹) ان دو صورتوں میں بہتر صورت کونسی ہے؟ (المستفتی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مہتمم مدرسہ ہٰذا)

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جوابات مرحمت فرمائے۔ ملاحظہ ہو:

الجواب: اشہرِ حج میں عمرہ کر کے اگر کوئی شخص مدینہ طیبہ چلا گیا پھر وہاں سے واپسی کے بعد صرف حج کا احرام باندھ کر آیا تو اس کا تمتع صحیح ہوگا، یہ امام صاحب کے نزدیک ہے بخلافِ صاحبین کے ان کے نزدیک پہلا تمتع باطل ہوگیا، ہاں اگر پھر مدینہ منورہ سے عمرہ کا احرام باندھ کر آئے اور پھر حج کرے تو ان کے نزدیک تمتع صحیح ہوجائے گا، مگر امام صاحب کے نزدیک ایسا نہ کرے۔ معلم الحجاج: ص ۲۱۸، میں مولانا شبیر محمد کے حاشیہ سے حاشیہ نمبر ا سے یہ عبارت لی گئی ہے۔

اس عبارت سے آپ کے تمام سوالات کے جوابات صراحۃً یا اشارۃً نکل آئے اب نمبروار لیجیے:

(۱) صاحبین کے نزدیک اس کا تمتع صحیح ہے۔
(۲) ان کے نزدیک دم تمتع واجب ہے۔
(۳) میقات سے باہر چلے جانے کی وجہ سے اس کا پہلا تمتع باطل ہوگیا، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس پر دم جبر واجب ہو۔ ''یہ صاحبینؒ کے مذہب کے مطابق ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر دم جبر نہیں ہوگا، اور فتویٰ اسی پر ہے''
(۴) دوسرے عمرہ سے تمتع منعقد ہوا۔
(۵) اس میں اختلاف ہے، معلم الحجاج ص ۲۲۱، پر یہ مسئلہ مذکور ہے۔ (یعنی متمتع ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ حج سے پہلے کر سکتا ہے، معلم الحجاج: ص ۲۵۶، ادارۃ القرآن، اور حاشیہ نمبر ا میں اختلاف نقل کیا ہے، کما تقدم۔
(۶) امام صاحب کے نزدیک اس کا تمتع ادا ہوجائیگا۔
(۷) اس پر دم جبر واجب نہیں۔ ''یہی امام صاحب کا مذہب ہے''
(۸) نامناسب ہے۔
(۹) بہتر صورت امام صاحب کے نزدیک یہی ہے کہ مدینہ طیبہ سے فقط حج کا احرام باندھ کر آئے۔

عبادات میں بروقت اختلاف امام صاحب کے قول پر فتویٰ ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

یہ فتویٰ فتاویٰ محمودیہ میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ملاحظہ ہو: ۳۹۱/۱۰، مبوب ومرتب۔
دلائل کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

شرح اللباب:۳۱۳،بیروت۔وغنية الناسك فی بغية المناسك:۱۱۵،ادارة القرآن۔وزبدة المناسك مع عمدة السالك:۳۱۳۔ومعلم الحجاج:۲۵۶۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

متمتع کا بغیر احرام کے حج کی سعی کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے تمتع میں حلال ہونے کے بعد نفل طواف کیا اور حج کی سعی اس نفل طواف کے بعد کر لی بغیر احرام کے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: حج کی سعی اگر وقوفِ عرفہ سے پہلے کرے تو احرام شرط ہے، اور وقوفِ عرفہ کے بعد کرنا ہے تو بغیر احرام کے مسنون ہے۔بصورتِ مسئولہ بظاہر وقوفِ عرفہ سے پہلے کی ہے لہذا بغیر احرام کے صحیح نہیں ہوئی دوبارہ کرنا لازم ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں غنیۃ الناسک میں ہے:

الرابع تقديم الإحرام عليه وأما بقاء الإحرام حالة السعي، فإن كان سعيه للحج قبل الوقوف فيشترط، أو بعد الوقوف فلا يشترط، بل و يسن عدمه. (غنية الناسك :۷۱، فصل في ركن السعي و شرائطه ،ادارة القرآن۔وص ۱۱۵۔والشامی:۵۱۸/۲،سعید۔ولباب المناسك مع شرحه:۱۹۳،فصل فی شرائط صحة السعي ، بيروت).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

حج یا عمرہ کے احرام کا سعی پر مقدم ہونا پس اگر کوئی شخص احرام سے پہلے سعی کرے گا تو جائز ودرست نہ ہوگی، لیکن احرام کا حج کے ابتداء میں منعقد ہو جانے کے بعد سعی تک باقی رہنا ضروری نہیں ہے، پس اگر حج کی سعی وقوفِ عرفہ سے پہلے (یعنی طوافِ قدوم کے بعد) کرے تو احرام کا موجود ہونا شرط ہے خواہ وہ حاجی قارن ہو یا متمتع یا مفرد ہو، اگر حج کی سعی وقوفِ عرفات کے بعد (طوافِ زیارت کے بعد) کرے تو اب احرام کا باقی رہنا شرط نہیں ہے کیونکہ اب اس کو احرام سے حلال ہونے کے بعد سعی کرنا جائز ہے بلکہ اب مسنون یہی ہے کہ احرام سے فارغ ہو کر سعی کرے۔(عمدۃ الفقہ :حصۂ چہارم ۱۹۸،شرائط صحتِ سعی، مجددیہ).

معلم الحجاج میں ہے:

تیسری شرط: احرام حج یا عمرہ کا سعی پر مقدم ہونا، اگر کوئی شخص احرام سے پہلے سعی کرے گا تو صحیح نہ ہوگی اگر چہ طواف کے بعد ہو اور احرام کا باقی رہنا سعی تک ضروری نہیں، بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر حج کی سعی کرتا ہے (خواہ قارن ہو یا متمتع یا مفرد) اور وقوفِ عرفہ سے پہلے کرتا ہے تو احرام کا ہونا سعی کے وقت شرط ہے اور اگر وقوفِ عرفہ کے بعد سعی کرتا ہے تو احرام کا باقی رہنا شرط نہیں، بلکہ احرام کا نہ ہونا مسنون ہے۔ (معلم الحجاج: ۱۶۹، شرائط سعی، ادارۃ القرآن)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

چند بال کاٹنے سے حلال ہونے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے حج تمتع کیا، عمرہ کرنے کے بعد صرف چند بال کٹوائے پھر اس کے بعد حج کا احرام باندھا تو اس پر کیا لازم ہے؟ دم ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنے دم؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں متمتع عمرہ سے چند بال کٹوانے کی وجہ سے حلال نہیں ہوا سابقہ احرام باقی ہے، اور چونکہ دو تین دن کپڑے بھی پہنے ہونگے، اس لیے ایک دم اور ایک صدقہ لازم ہوگا۔ صدقہ اس لیے کہ حالتِ احرام میں چند بال کاٹے، اور دم اس لیے کہ سلے ہوئے کپڑے وغیرہ پہنے، ممکن ہے کہ دوسری جنایات کا بھی ارتکاب کیا ہوگا لیکن تداخل کی وجہ سے صرف ایک دم لازم ہے، اور متمتع کے لیے حج کے افعال شروع کرنے سے پہلے حلق لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

يبتدئ من الميقات في أشهر الحج فيحرم بالعمرة ويدخل مكة فيطوف لها ويسعىٰ لها ويحلق أو يقصر وقد حل من عمرته.

قال المحشي: قوله" وقد حل من عمرته "ظاهره لزوم الحلق في التمتع وليس كذلك بل لو لم يحلق حتى أحرم بالحج وحلق بمنىٰ كان متمتعاً. (الهدايه مع الحاشية: ١/ ٢٦٠).

وقال الطحطاويّ في حاشيته على الدر المختار: قوله "يحلق" إنما ذكر الحلق لبيان تمام العمرة لا لأنه شرط في التمتع لأنه مخير بينه وبين بقائه محرماً بها إلى أن يدخل إحرام الحج.

(حاشية الطحطاوى على الدر المختار: ١/ ٥١٦، باب التمتع، كوئته).

تداخلِ جنایات کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں غنیۃ الناسک میں ہے:

وإذا اختلف جنس الجناية تعذر التداخل إلا إذا فعلها على قصد رفض الإحرام، فإن المحرم إذا نوى رفض الإحرام، فجعل يصنع ما يصنعه الحلال من لبس الثياب و التطيب والحلق و الجماع وقتل الصيد، فعليه دم بجميع ما ارتكب. (غنية الناسك:۱۲۹،باب الجنايات،ادارة القرآن)۔**واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وأتموا الحج والعمرة للہ﴾
وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
﴿العمرة إلى العمرة كفارة لما بينهما﴾
(متفق علیہ)

باب...... ﴿٤﴾

عمرہ کا بیان

باب……﴿۴﴾

عمرہ کا بیان

حج کے بعد تنعیم سے عمرہ کرنے کا حکم:

سوال: سعودی عرب میں بعض حضرات پمفلٹ تقسیم کرتے ہیں اور اس میں لکھا ہوتا ہے کہ حج کے بعد تنعیم سے عمرہ نہ کریں، اور زبانی بھی کہتے ہیں کہ حج کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے عمرہ نہیں کیا، جبکہ ہمارے حضرات بکثرت حج کے بعد عمرے کرتے ہیں اور اس کو باعث ثواب سمجھتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: احناف کے نزدیک حج کے دنوں کے علاوہ پورے سال عمرہ کرنا ثواب کا کام ہے، یعنی ۹ ذی الحجہ سے ۱۳ ذی الحجہ تک عمرہ نہ کرے، باقی سال میں کسی بھی وقت عمرہ ہوسکتا ہے۔

جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حج سے فارغ ہوئیں تو جو عمرہ ان کے ذمہ باقی تھا اس کی قضا کے لیے تنعیم گئیں، ان کے ساتھ ان کے بھائی عبدالرحمٰن بھی تھے، اور دونوں نے تنعیم سے ۱۴، ذی الحجہ کی رات کو عمرہ کیا، (بخاری شریف جلد اول، ص ۲۱۲)، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ اپنی بہن کو حرم سے باہر لیجا کر عمرہ کرادے، پھر حضرت عائشہ فرماتی ہیں ”حتی فرغت وفرغ أي عبد الرحمن أيضاً “كما في الشرح” من الطواف ثم جئته بسحر فقال: هل فرغتم “ (صحيح البخاري: ۱/۲۱۲)، نیز بعض روایات میں ” فرغتما “ بھی آیا ہے۔

موطا امام مالک میں مذکور ہے:

كانت عائشة رضي الله تعالىٰ عنها تعتمر بعد الحج من مكة في ذي الحجة ثم تركت بعد ذلك فكانت تخرج قبل هلال المحرم حتى تأتي الجحفة فتقيم بها حتى ترى الهلال فإذا رأت الهلال أهلت بعمرة. (الموطا:ص۳۸۲).

وفي الأوجز: ولعل ذلك لتحصيل الفصل بين الحج والعمرة امتثالاً لأمر أمير المومنين كما سيأتي قريباً في باب العمرة، أفصلوا بين حجكم وعمرتكم فإن ذلك أتم لحج أحدكم ولعمرته أن يعتمر في غير أشهر الحج. (اوجز المسالك:٦/٥٥٥،دار القلم دمشق).

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ذی الحجہ میں حج کے بعد عمرہ کرتی تھیں پھر چھوڑ دیا پھر محرم کے چاند ہونے سے پہلے جحفہ آتی تھیں اور وہاں اقامت کر کے محرم کے چاند کے بعد عمرہ کا احرام باندھ لیتیں۔

اوجز میں ہے: یہ اس لئے تا کہ امیر المومنین کے حکم کی اطاعت ہو انھوں نے فرمایا تھا کہ حج اور عمرہ میں فاصلہ رکھو یہ حج اور عمرہ کی تکمیل کے لئے بہتر ہے کہ اشہر حج کے بعد عمرہ کرے۔

نیز اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ﷺ نے حج کے بعد عمرہ نہیں کیا تو ہم بھی نہ کریں تو چونکہ مہاجرین کی جلدی واپسی مطلوب تھی اس لیے وہ جلدی واپس ہوئے اور عمرہ نہیں فرمایا، اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ عمرہ نہیں کرنا چاہئے، اگر کوئی یہ کہے کہ ۱۴ تاریخ کو سب حاجیوں کی واپسی ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ﷺ واپس ہوئے تھے تو کیا یہ بات قابل تسلیم ہوگی؟ اسی طرح یہ بات بھی قابل تسلیم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے بعد ذی الحجہ میں عمرہ نہیں کیا تو ہمیں بھی نہیں کرنا چاہئے، ان کو موقعہ ہی نہیں ملا تھا، اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ فرماتے اور ان کی اتباع میں اکثر لوگ عمرہ کرتے اور ۱۴ کو واپس بھی ہوتے تو کتنی دقت ہوتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حیض کی وجہ سے عمرہ کا احرام کھولنے کا حکم:

سوال: پندرہ سال کی ایک لڑکی نے عمرہ کا احرام باندھا پھر حیض کی وجہ سے عمرہ نہیں کیا گھر واپس چلی گئی اور احرام کھولدیا تو اب عمرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں حیض کی وجہ سے عمرہ چھوڑ دیا تو رفضِ عمرہ کے حکم میں ہے، لہذا عمرہ کی قضا اور ایک دم لازم ہے۔

ملاحظہ فرمائیں غنیۃ الناسک میں ہے:

فإن رفضها فعليه دم لرفضها وقضاؤها لصحة الشروع فيها.(غنية الناسك:١٢٤،ادارة القرآن)

درالمختار میں ہے:

حج فأهل بعمرة يوم النحر أوفي ثلاثة أيام بعده لزمته بالشروع لكن مع كراهة التحريم ورفضت وجوباً تخلصاً من الإثم وقضيت مع دم للرفض، وفي الشامية: قوله بالشروع: لأن الشروع فيها ملزم . (الدرالمختار:مع الشامی:٢/٥٨٨، سعيد).

فتح القدیر میں ہے:

وكل شيء رفضه يجب لرفضه دم وقضاؤه، فإن كان عمرة لم يلزمه في قضائها سوى عمرة . (فتح القدير:٣/١٢٠،دارالفكر)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

حالتِ حیض میں عمرہ ادا کرنے کا حکم:

سوال: ایک عورت عمرہ کیلیے جانا چاہتی ہے اور اس کا قیام مکہ مکرمہ میں صرف ٦ دن ہے وہ فی الحال مدینہ منورہ میں ہے لیکن اس کو معلوم ہے کہ اس کا حیض دس دن تک رہتا ہے نیز وہ اپنے اہل خانہ سے علیحدہ بھی نہیں رہ سکتی ہے، اور اہل خانہ عمرہ کے لیے جا رہے ہیں، سفر کی ترتیب بدلنا بھی انتہائی مشکل ہے، اب یہ عورت کیا تدبیر اختیار کرے اور عمرہ کس طرح ادا کرے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں وہ عورت اپنے اہل خانہ کے ساتھ مکہ مکرمہ جائے اور پاک ہونے کے بعد عمرہ کرے، اور اگر واپسی تک پاکی کی کوئی شکل نہ نکل سکے اور مجبوری کی وجہ سے حالتِ حیض میں عمرہ کرلیا تو دم واجب ہوگا، اور یہ دم حرم کے ساتھ خاص ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں شامی میں ہے:

ولو طاف للعمرة كله أوأكثره أوأقله ولوشوطاً جنباً أوحائضاً أونفساء أومحدثاً فعليه شاة لافرق فيه بين الكثيروالقليل والجنب والمحدث، لأنه لامدخل في طواف العمرة للبدنة ولا للصدقة. (فتاوى الشامى:٢/٥٥١،سعيد۔وكذا فى اللباب مع شرحه: ٣٩٠،بيروت).

البحرالرائق میں ہے:

قوله أوطاف لعمرته وسعى محدثاً ولم يعد، أي تجب شاة لتركه الواجب وهوالطهارة،

قيد بقوله ولم يعد، لأنه لوأعاد الطواف طاهراً فإنه لا يلزمه شيء لارتفاع النقصان بالإعادة، ولايؤمربالعود إذا رجع إلى أهله لوقوع التحلل بأداء الركن مع الحلق و النقصان يسير، وما دام بمكة يعيد الطواف، لأنه الأصل ... ولو قال المصنف محدثاً أوجنباً لكان أولىٰ، لأنه لافرق بين الحدثين في طواف العمرة. (البحر الرائق:۳/۲۲، کوئٹہ)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

عمرہ کرنے کے بعد قصر نہ کرنے پر عمرہ کا حکم:

سوال: ایک عورت نے عمرہ کے بعد اپنے بالوں کو نہیں کاٹا پھر دوسرے دن یاد آیا تو قصر کیا تو عمرہ صحیح ہے یا نہیں؟ کوئی دم واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عورت کا عمرہ صحیح ہے ہاں جب تک قصر نہیں کیا تھا احرام جاری تھا پھر قصر کے بعد احرام اتر گیا، لیکن قصر سے پہلے اگر کوئی خلافِ احرام کام نہیں کیا ہے تو کوئی جزاء لازم نہیں ہے اور اگر خلافِ احرام کچھ کام کیا ہے تو اس کی تفصیل درج کر کے سوال کیا جائے اس کے موافق جواب دیا جائے گا۔

ملاحظہ فرمائیں بدائع الصنائع:

أن الحلق أو التقصير واجب لما ذكرنا فلا يقع التحلل إلا بأحدهما ولم يوجد فكان إحرامه باقياً. (بدائع الصنائع:۲/۱۴۰، سعید).

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

وفي حق المعتمر لايختص بالزمان وبالمكان بلا خلاف، وفي الهداية: والتقصير والحلق في العمرة غيرمؤقت بالزمان بالإجماع، فإن لم يقصرحتى رجع وقصر فلا شيء عليه في قولهم جميعاً. (الفتاوی التاتارخانیة:۲/۵۴۴،فی الحلق و التقصیر،ادارة القرآن۔و کذا فی شرح اللباب :۲۵۴،فصل فی زمان الحلق و مکانه و شرائط جوازه ،بیروت)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

دوائی سے حیض روکنے کے بعد عمرہ کرلیا پھر خون نظر آنے پر عمرہ کا حکم:

سوال: ایک عورت مدینہ منورہ میں ہے اس نے ایام حیض میں چند قطرے تین دن تک دیکھے، پھر دوائی کھا کر پاک ہوئی پانچویں دن عمرہ کیا دس دن پورے ہونے سے قبل پھر خون دیکھا کیا اس کا عمرہ ہوا یا نہیں؟ دم واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ ایام عادت میں دوبارہ خون شروع ہوا، لہذا حالتِ حیض میں عمرہ

شمار ہوگا، اس لیے اب دوبارہ عمرہ کرے، اگر اعادہ نہیں کیا تو دم لازم ہوگا۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

اعلم أنه لايشترط استمرار الدم فيها بحيث لاينقطع ساعة،لأن ذلك لايكون إلا نادراً بل انقطاعه ساعة أوساعتين فصاعداً غيرمبطل كذا في المستصفى بحر،أي لأن العبرة لأوله وآخره. (فتاوى الشامي:١/٢٨٤،باب الحيض،سعيد).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر کسی حیض والی عورت کا خون کسی دوا سے یا بغیر دوا کے منقطع ہوگیا یا پوری طرح منقطع نہیں ہوا پس اس نے غسل کیا یا نہیں، اور طواف کیا پھر اس کا خون عادت کے دنوں میں دوبارہ شروع ہوگیا، تو اس کا طواف حالتِ حیض میں شمار ہوگا، یعنی دوا سے کوئی فرق نہ ہوگا دم متوال کے حکم میں ہوکر عمرہ حیض میں شمار ہوگا۔ (مستفاد از عمدۃ الفقہ: ۵۲۶/۴، مجددیہ).

مزید ملاحظہ ہو: الفتاوى الهندية:١/٢٤٧۔والدرالمختارمع الشامي:٢/٥٥١،سعيد۔ والبحرالرائق:٣/٢٢، كوئته۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عن الفضل بن عباس رضي اللّٰه تعالیٰ عنه أن امرأة من خثعم قالت: یارسول اللّٰه إن أبي أدرکته فریضة اللّٰه في الحج، وهو شیخ کبیر لا یستطیع أن یستوی علی ظهر البعیر، قال: "حجي عنه"

(رواہ الترمذی)

حج بدل کا بیان

باب......﴿۵﴾

حج بدل کا بیان

حج بدل کرنے سے فرضیتِ حج کا حکم:

سوال: ایک صاحب حج بدل کے لیے گیا، اس نے اپنا حج نہیں کیا بعض علماء کہتے ہیں کہ چونکہ یہ مکہ مکرمہ پہونچ گیا تو اس پر اپنا حج فرض ہو گیا اب آئندہ سال تک ٹھہر کر حج کرنا ضروری ہوا کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: اکثر علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ شخص دوسرے کی قدرت کیساتھ قادر ہوا اور قاعدہ ہے " القادر بقدرة الغير ليس بقادر" یعنی دوسرے کی قدرت کے ساتھ قادر ہونے والا حقیقت میں قادر نہیں کہلائے گا، اس لیے اس پر حج فرض نہیں ہوا، اور آئندہ سال تک رہنا بھی قانوناً اور عادةً ایک مشکل ترین کام ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں ہے:

أفتىٰ سيدي عبد الغني النابلسي... أنه في هذا العام لايمكنه الحج عن نفسه، لأن سفره بمال الآخر، فيحرم عن الآمر ويحج عنه، وفي تكليفه بالإقامة إلى قابل ليحج عن نفسه ويترك عياله ببلده، حرج عظيم، وكذا في تكليفه بالعود وهو فقير، حرج عظيم أيضاً. (فتاوى الشامي:۲/۶۰٤، مطلب في حج الصرورة، سعيد).

ارشاد الساری میں ہے:

والحق أنه يجب عليه أحد النسكين إذ لا حج إلا من الاستطاعة، والحاج عن الغير قد تلبس بالإحرام عن غيره، ولا يمكنه أن يصرفه إلى نفسه، فلو وجب عليه الحج لبقي إلى

العام القابل، وربما لا يجد استطاعة في مكثه وانقطاعه، فالعمرة تكفي في إسقاط الواجب، ولم يعين الفقهاء الحج في الوجوب على من دخل مكة، فتنبه. (ارشادالساری الی مناسک الملا علی القاری:۴۹۷،باب الحج عن الغیر، بیروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

الفقير المأمور فإنه إذا وصل إلى الميقات لا يصير كالمكي لأن قدرته بقدرة غيره وهي لا تعتبر فلا يجب عليه، بخلاف المتنفل لنفسه لأنه إذا وصل إلى الميقات صار قادراً بقدرة نفسه، وإن كان سفره تطوعاً ابتداءً، كذا في المنحة ورد المحتار في الحج عن الغير...وإن كان مأموراً، فعليه أن يحرم من الميقات عن الآمر، لأن سفره بماله فلا يمكنه أن يحرم لنفسه، ثم إذا وصل إلى مكة فقيل يجب عليه كالمتنفل لنفسه، وقيل لا، ورجحه في رد المحتار قال: لأن قدرته بقدرة الغير فلا تعتبر. (غنية الناسك فی بغية المناسك:٦،ادارة القرآن)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

غیر حاجی کے لیے حج بدل کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے اپنا حج نہیں کیا اور حج بدل کے لیے جانا چاہتا ہے تو اس میں کراہت ہے یا نہیں اگر ہے تو کونسی تنزیہی یا تحریمی؟

الجواب: افضل یہ ہے حج بدل کرنے والا پہلے اپنا حجِ فرض کر چکا ہو، لیکن شرط اور ضروری نہیں ہے، ہاں اگر مامور پر حج فرض ہو چکا ہے اور حج بدل کے لیے جا رہا ہے تو اس کے لیے مکروہِ تحریمی ہے اور آمر کے حق میں کراہتِ تنزیہی ہے۔

ملاحظہ ہو شرح اللباب میں ہے:

ولا يشترط لجواز الإحجاج أن يكون الحاج المأمور قد حج عن نفسه، أي عندنا وعند مالكؒ، فيجوز حج الصرورة، وهو الذي لم يحج عن نفسه، إلا أن الأفضل كما قال في البدائع: أن يكون قد حج عن نفسه، أي للخروج عن الخلاف الذي هو مستحب بالإجماع، ولأنه بالحج عن غيره يصير تاركاً لإسقاط الفرض عن نفسه، فيتمكن في هذا الإحجاج ضرب كراهة، ولأنه أعرف بالمناسك فكان أفضل، ومثله في فتاوى الظهيرية،

....قال ابن الهمام : والذي يقتضيه النظر أن حج الصرورة عن غيره إن كان بعد تحقق الوجوب عليه بملك الزاد والراحلة والصحة فهو مكروره كراهة تحريم، وفي إرشاد الساري: قوله قال ابن الهمام: قال في البحر: والحق أنها تنزيهية على الآمر، وتحريمية على الصرورة المأمور الذي اجتمعت فيه شروط الحج ، ولم يحج عن نفسه ، لأنه أثم بالتأخير. (شرح اللباب مع ارشادالساری:۴۹۶،باب الحج عن الغیر، بیروت).

وقال الشاميؒ في رد المحتار: وهذا لاينافي كلام الفتح،لأنه في المأمور، ويحمل كلام الشارح على الآمر، فيوافق ما في البحرمن أن الكراهة في حقه تنزيهية، وإن كانت في حق المأمور تحريمية. (ردالمحتار:۲/۶۰۳،مطلب فی حج الصرورۃ ، سعید).

مزید ملاحظہ فرمائیں :احسن الفتاوی:۴/۵۱۲۔وفتاوی رحیمیہ:۳/۱۲۰۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حج بدل میں قران اورتمتع کرنے کا حکم:

سوال: حج بدل میں قران اورتمتع کرسکتا ہے یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگرآمر نے صراحۃً قران اورتمتع سے ممانعت کردی ہے تو جائزنہیں ورنہ جائز ہے۔

ملاحظہ ہودرمختار میں ہے:

ودم القران والتمتع والجناية على الحاج فإن أذن له الآمر بالقران والتمتع و إلا فيصير مخالفاً، فيضمن، وفي الشامية : قوله على الحاج: أي المأمورأما الأول (أي دم القران والتمتع) فلأ نه وجب شكراً على الجمع بين النسكين، وحقيقة الفعل منه وإن كان الحج يقع عن الآمر لأنه وقوع شرعي لاحقيقي. (الدرالمختار مع الشامی: ۲/۶۱۱،باب الحج عن الغیر، سعید۔ومثلہ فی البحرالرائق:۳/۶۵، کوئٹہ).

شرح لباب المناسک میں ہے:

فصل في شرائط جواز الإحجاج ...الثالث عشر: عدم مخالفة فلو أمره بالإفراد فقرن أي عن الآمر، فهومخالف ضامن عند أبي حنيفةؒ وعندهما يجوز ذلك عن الآمراستحساناً ...أو تمتع ... لم يقع حجه عن الآمر و يضمن النفقة... (شرح اللباب:۴۸۸،فصل فی شرائط

جواز الاحجاج، بیروت).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

حج بدل میں افراد کرنا چاہئے آمر کی اجازت سے تمتع وقران بھی کرسکتا ہے، مگر دم شکر مامور پر ہوگا، اگر آمر بخوشی دم شکر کی قیمت ادا کردے تو جائز ہے، اس زمانہ میں عرفاً آمر کی طرف سے تمتع وقران ودم شکر کا اذن ثابت ہے، اس لیے صراحۃً اذن ضروری نہیں، معہذا صراحۃً اذن حاصل کرلینا بہتر ہے۔(احسن الفتاوی:۴/۵۱۳)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

بغیر وصیت کے میت کی طرف سے حج بدل کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص پر حج فرض ہوگیا لیکن وہ حج نہ کرسکا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا، نیز وصیت بھی نہیں کی تھی تو اس کی طرف سے کوئی شخص حج بدل کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر کوئی شخص بطور تبرع واحسان میت کی طرف سے حج بدل کرنا چاہے تو ان شاء اللہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ذمہ فارغ کردیں گے۔

ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

من عليه الحج إذا مات قبل أدائه فإن مات عن غير وصية يأثم بلا خلاف، وإن أحب الوارث أن يحج عنه حج، وأرجو أن يجزئه إن شاء الله تعالىٰ كذا ذكره أبوحنيفةؒ. (الفتاوى الهندية:١/٢٥٨).

شامی میں ہے:

وإن لم يوص به، فحج الوارث عنه أوحج عنه غيره جاز. (فتاوى الشامي:٢/٥٩٩، سعيد).

شرح لباب المناسک میں ہے:

في مناسک السروجي: لومات رجل بعد وجوب الحج ولم يوص به فحج رجل عنه، أوحج عن أبيه أو أمه عن حجة الإسلام من غير وصية، قال أبوحنفةؒ: يجزئه إن شاء الله تعالىٰ. (شرح اللباب:٤٧٩، فصل في شرائط جواز الاحجاج، بيروت).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اگر بغیر وصیت کوئی وارث اپنے حصہ سے حج ادا کردے یا اپنی طرف سے اپنے مال سے ادا کردے تو امید ہے

کہ وہ میت مواخذہ سے بری ہو جائے۔ (فتاوی محمودیہ:۱۰/۴۲۱،مبوب ومرتب)۔واللہ ﷻ اعلم۔

آمر کے وطن سے حج بدل کرانے کا حکم:

سوال: اگر کسی کے ذمہ حج فرض ہے اور اس کا انتقال ہوا وہ ہندوستان میں رہتا تھا اب اگر کوئی شخص اس کی طرف سے بجائے ہندوستان کے جنوبی افریقہ سے حج کرے تو یہ درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب: آمر کے وطن سے حج کرنا ضروری ہے، جب کہ متروکہ تہائی مال میں گنجائش ہو ورنہ میقات سے پہلے پہلے جس جگہ سے ہو سکے استحساناً وہاں سے کرا دیا جائے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بھی آمر کے وطن یعنی ہندوستان سے حج کرائے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

شروط الحج عن الغيرعشرون... الحادي عشر أن يحج عنه من وطنه إن اتسع، وإلا فمن حيث يبلغ .(فتاوى الشامي:٢/ ٦٠٠،مطلب شروط الحج عن الغير،سعيد).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قوله من بلده ، وإن كان للموصي أوطان حج عنه من أقرب أوطانه إلى مكة، لأنه متيقن به وقوله من بلده محله ما إذا كان له بلد، أما إذا لم يكن له وطن فمن حيث مات بحر. (حاشية الطحطاوى على الدر المختار:١/ ٥٥٠باب الحج عن الغير، كوئته).

شرح لباب المناسک میں ہے:

الثامن أن يحج عنه من وطنه إن اتسع الثلث أي ثلث مال الميت، وإن لم يتسع أي الثلث يحج عنه من حيث يبلغ، أي استحساناً... لعل المكان مقيد بما قبل المواقيت، وإلا فبأي شيء يمكن أن يحج عنه من مكة، وكذا الحكم إذا أوصىٰ أن يحج عنه بماله وسمى مبلغه، فإنه إن كان يبلغ أن يحج عنه من بلده حج عنه منه وإلا فمن حيث يبلغ .(شرح لباب المناسك:٤٨٣،فصل في شرائط جواز الاحجاج، بيروت).

احسن الفتاوی میں ہے:

اگر زندہ معذور کے امر سے یا مردہ کی وصیت سے حج بدل کیا جا رہا ہو تو موصی یا آمر کے وطن سے حج کرنا ضروری ہے، اگر ثلث مال ناکافی ہو اور ورثاء زیادہ کی اجازت نہ دیں تو جہاں سے بھی ثلث مال سے حج

ہو سکے ،اگر موصی یا آمر نے خود کوئی جگہ یا کچھ مال متعین کر دیا ہو تو وہیں سے کیا جائے اگر چہ مکہ ہی سے ہو مگر صاحبِ استطاعت کے لیے ایسا کرنا مکروہ ہے اگر حج کا امر یا وصیت نہیں کی بلکہ کسی کی طرف سے تبرعاً کوئی شخص حج کرنا چاہتا ہے،تو مکہ سے بھی جائز ہے،البتہ صاحبِ استطاعت کے لیے میقات سے کرانا افضل ہے۔

(احسن الفتاوی:۴/۵۱۹۔وعمدۃ الفقہ:۴/۳۴۹،مجددیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

اجرت دیکر حج بدل کرانے کا حکم:

سوال: اگر کسی دوسرے کو اپنی طرف سے حج کرنے کے لیے اجرت دی تو صحیح ہے یا نہیں؟یعنی استئجار علی الحج جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں کرایہ دیکر حج بدل کرانا جائز نہیں ہے،حج ایک مہتم بالشان عبادت ہے جس کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنانے کی گنجائش نہیں ہے،ورنہ اخلاص بھی ختم ہو جائے گا،لیکن اگر کسی نے کرالیا تو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ حج آمر کی طرف سے ادا ہو جائے گا اور اجارہ فاسد ہو جائے گا،مامور کو صرف نفقہ ملے گا مستحقِ اجرت نہ ہوگا۔

ملاحظہ ہو الدر المختار میں ہے:

في شرائط نيابة في الحج الفرض...منها عدم اشتراط الأجرة، فلو استأجر رجلاً بأن قال: استأجرتك على أن تحج عني بكذا، لم يجز حجه، وإنما يقول: أمرتك أن تحج عنه بلا ذكر إجارة . (الدرالمختار مع الشامي:٢/ ٦٠٠، سعيد).

شامی میں ہے:

قوله لم يجز حجه عنه، كذا في اللباب، لكن قال شارحه: وفي الكفاية يقع الحج عن المحجوج عنه في رواية الأصل عن أبي حنيفة ، وبه كان يقول شمس الأئمة السرخسي وهو المذهب، وصرح في الخانية: بأن ظاهر الرواية الجواز، لكنه قال أيضاً: وللأجير أجر مثله... هذا، وإنما جاز الحج عنه لأنه لما بطلت الإجارة بقي الأمر بالحج، فتكون له نفقة مثله. قلت: وعبارة كافي الحاكم على ما نقله الرحمتي: رجل استأجر رجلاً ليحج عنه قال: لا تجوز الإجارة ، وله نفقة مثله. و تجوز حجة الإسلام عن المسجون إذا مات فيه قبل أن يخرج . ومثله في البحر عن الإسبيجابي: لا يجوز الاستئجار على الحج، فلو دفع إليه الأجر

فحج يجوز عن الميت، وله من الأجر مقدار نفقة الطريق، و يرد الفضل على الورثة، إلا إذا تبرع به الورثة أو أوصى الميت بأن الفضل للحاج. ملخصاً. (فتاوى الشامي:٢/ ٦٠١،مطلب في الاستئجار على الحج، سعيد۔وقاضيخان على هامش الهندية: ١/ ٣١١).

غنیۃ الناسک فی بغیۃ المناسک میں ہے:

وصورة الأمر به بأن قال له أمرتک أن تحج عني بكذا، من غير ذكر الإجارة، فإن قال: استأجرتک على أن تحج عني بكذا، لا يجوز الاستئجار بالإجماع عندنا. (غنية الناسك في بغية المناسك:١٧٣،باب الحج عن الغير،ادارة القرآن).

شرح لباب المناسک میں ہے:

وقد صرح بهذا التعليل الكرماني فقال: لأنه إذا فسدت الإجارة بقي الأمر بأداء الحج عنه، فيجب نفقة مثله، وفي الكفاية: لو استأجر للحج عنه من الميقات وقع الحج عن المحجوج عنه في رواية الأصل عن أبي حنيفةؒ، انتهىٰ، وبه كان يقول شمس الأئمة السرخسيؒ وهو المذهب، والله أعلم. (شرح اللباب: ٤٨٠، بيروت).

بعض کتبِ فقہ سے جواز مترشح ہے، لیکن ہمارے اکابرؒ نے احتیاطاً عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، تاکہ حج میں اخلاص کی روح باقی رہے۔

جواز والی عبارت ملاحظہ فرمائیں، التحریر المختار میں ہے:

قوله ولاضرورة للا ستئجار على الحج الخ... قد يقال: الضرورة في هذا الزمن داعية للقول بصحة الاستئجار عليه، لعدم من يقوم به عن الغير مكتفياً بنفقة الذهاب والإياب، فهو كالاستئجار على تعليم القرآن الذي قال بصحته المتأخرون، وحينئذٍ يستحق المأمور أجرة زيادة عن النفقة للذهاب والإياب. (التحريرالمختارعلى الشامي:٢/ ١٧١،سعيد۔وكذا في ١٧٢، سعيد)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:
﴿ففدیة من صیام أو صدقة أو نسک﴾
عن ابن عباس رضي اللّٰہ تعالیٰ عنھما قال:
﴿من قدم شیئاً من حجه أو أخره
فلیهرق لذلک دماً﴾
(مصنف ابن أبي شیبة)

باب ...... ﴿٦﴾

جنایات کا بیان

باب ﴿۶﴾

جنایات کا بیان

دم وغیرہ واجب ہو تو حرم شریف میں ذبح کرنے کا حکم:

سوال: اگر حج میں دم یا صدقہ کفارہ وغیرہ جو واجب ہوتا ہے تو اس کو کہاں ادا کرے؟ حرم میں بھیجنا ضروری ہے یا باہر بھی کر سکتا ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ہدی کا جانور چاہے وہ شکرانہ کی ہدی ہو یا جنایت کی حدودِ حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے، پس ہدایا کا حدودِ حرم کے علاوہ کسی اور جگہ ذبح کرنا جائز نہیں ہے ہاں صدقہ میں اختیار ہے لیکن حرم کے مساکین پر خرچ کرنا افضل ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولا يجوز ذبح الهدايا إلا في الحرم، لقوله تعالىٰ في جزاء الصيد:﴿هدياً بالغ الكعبة﴾. فصار أصلاً في كل دم هو كفارة...ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان، ومكانه الحرم، قال عليه الصلاة والسلام:" منىٰ كلها منحر، وفجاج مكة كلها منحر...." (الهداية:۱/۳۰۱).

شرح لباب المناسک میں ہے:

في أحكام الدماء وشرائط جوازها...والثالث ذبحه في الحرم، بالاتفاق سواء وجب شكراً أو جبراً سوى الهدي الذي عطب في الطريق . (لباب المناسك مع شرحه:۴۳۲،فصل فی احكام الدماء وشرائط جوازها،بيروت).

وفيه أيضاً: ولا يشترط في التصدق به أي بلحمه عدد المساكين ...ولا فقراء الحرم فلو تصدق به على غيرهم أي غير فقراء الحرم...جاز وفقراء الحرم أفضل، أي مطلقاً. (لباب المناسك مع شرحه: ٤٣٥، فصل فی احکام الدماء و شرائط جوازها، بیروت).

مزید ملاحظہ فرمائیں: الفتاوی الہندیہ: ۱/۲۴۴۔ وفتاوی رحیمیہ: ۵/۲۳۴۔ وعلم الفقہ: ۵/۵۶۳۔ واللہ ﷻ اعلم۔

رمی، ذبح وحلق کے درمیان تقدیم وتاخیر سے دم کا حکم:

سوال: رمی، ذبح، حلق میں ائمہ ثلاثہؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک ترتیب مسنون ہے واجب نہیں، آج کل کے فقہاء کی آراء ذکر کریں؟

الجواب: نظام الفتاوی میں ہے:

سوال: خود مذبح میں یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ لوگوں کے ہجوم اور جانوروں کی کثرت کی بناء پر طبیعت گھبراتی ہے اور چوٹ لگنے کا بھی اندیشہ ہے اور اوپر سے ۳ میل پیدل گرمی میں چلنا پڑتا ہے اس موقع پر گاڑی ملنا بھی مشکل اور غریب لوگوں کے پاس کرایہ بھی نہیں ہوتا لہذا ان وجوہات کے ماتحت ضرورت سمجھ کر کیا کسی حنفی کو حق ہے کہ اس خاص مسئلہ میں شوافع کے مسلک پر عمل کرے کہ ان کی کتابوں سے عدم وجوبِ ترتیب ظاہر ہے؟

الجواب: تقریب فہم کے لئے چند عبارات پیش کی جاتی ہیں:

(۱) وأما ترك الواجبات بعذر فلا شيء عليه، ثم مرادهم بالعذر مايكون من الله تعالىٰ، فلو كان من العباد فليس بعذر، (إلى قوله) بخلاف ماذا منعه خوف الزحام فإنه من الله تعالىٰ، فلا شيء عليه. (غنية الناسك فی بغية المناسك: ص ١٣٨).

(۲) وفي الشامية: إن ترك الواجب بعذر مسقط للدم.

(۳) ولو طاف المفرد وغيره قبل الرمي والحلق لا شيء عليه ويكره، لترك السنة. (زبدة المناسك: ص ١٦٦).

ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "الترتيب بين الرمي والذبح والحلق" اگر چہ فی نفسہ واجب ہے لیکن عذر شرعی کی وجہ سے اگر چھوٹ جائے یا ٹوٹ جائے اس پر عمل نہ ہو سکے تو اس پر دم جنایت وغیرہ یا کوئی وزر یا کفارہ وغیرہ لازم نہ آئیگا بلکہ ادائیگی حج بلا کراہت مکمل ہو جائیگی۔ (نظام الفتاوی: ۱/۱۵۸)۔

جدید فقہی مباحث میں ہے:

سوال: رمی ذبح حلق میں احناف کے یہاں ترتیب رکھنا ضروری ہے آج کل کے مشکل ترین حالات میں ترتیب برقرار رکھنا انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے مشکل ہوگیا ہے تو کیا اس کے حل کے لئے عدم وجوب کے قائلین اور احناف میں صاحبین کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے؟

اس مسئلہ میں مقالہ نویسوں کی جملہ دو رائیں ہیں:

(۱) ان میں زیادہ تر حضرات نے صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کے مسلک پر حالات وزمانہ کے پیش نظر فتویٰ دیا جن میں چند اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔　　(۶) مفتی شبیر احمد قاسمی۔
(۲) مولانا ذخور شید انور اعظمی۔　　(۷) مولانا راشد حسین ندوی۔
(۳) مولانا ارشاد الحق قاسمی۔　　(۸) مولانا انوار الحق رحمانی۔
(۴) مولانا عبد اللطیف مظاہری۔　　(۹) مفتی انور علی اعظمی۔
(۵) مولانا مصلح الدین بروڈوی۔　　(۱۰) مولانا شمس پیرزادہ۔

دلائل:۔ عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله تعالیٰ عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم وقف في حجة الوداع بمنیٰ للناس يسئلونه، فجاء رجل فقال: يا رسول الله لم أشعر، فحلقت قبل أن أذبح، فقال: " اذبح ولا حرج " فجاءه آخر، فقال: لم أشعر، فنحرت قبل أن أرمي فقال: " ارم ولا حرج " فما سئل النبي صلى الله عليه وسلم عن شيء قدم أو أخر إلا قال: " افعل ولا حرج ". متفق عليه.

(امام بخاریؒ نے اس روایت کو مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف مقامات پر نقل فرمایا ہے)۔

قال محمدؒ: وبالحديث الذي روي عن النبي صلى الله عليه وسلم نأخذ، أنه قال: " لا حرج في شيء من ذلک" وقال أبوحنيفةؒ: لا حرج في شيء من ذلک ولا كفارة، إلا في خصلة واحدة، المتمتع والقارن إذا حلق قبل أن يذبح، قال: عليه دم، وأما نحن، فلا نرى عليه شيئاً.

(موطا امام محمدؒ: ص ۲۳۵)۔

دوسری رائے:　(۱) مفتی عبد الرحیم قاسمی۔
(۲) مولانا ابراہیم فلاحی۔

(۳) مولانا منظور احمد قاسمی۔
(۴) مفتی حبیب اللہ قاسمی۔
ان حضرات نے ترتیب کو واجب قرار دیا ہے۔

دلائل: ــ (۱) **ويبدء إذا وافى منى برمي جمرة العقبة ثم بالذبح إن كان قارناً أو متمتعاً ثم بالحلق، لحديث عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ”إن أول نُسُكِنَا في هذا اليوم أن نرمي ثم نذبح ثم نحلق“ ولأن الذبح والحلق من أسباب التّحلّل، ألا ترى أن تحلّل المحصر بالذبح، فيتقدم الرمي عليها.** (المبسوط للسرخسي: ٤/٦٤، باب رمي الجمار).

(۲) اعلم أن في يوم النحر أربعة نسک رمي ونحر وطواف على ترتيب ما ذكر والترتيب في الثلاثة واجب. (العرف الشذى: ١/ ٨٢).

جدید فقہی مسائل میں مذکور ہے:

فقہاء احناف میں بھی صاحبین کے نزدیک ترتیب سنت ہے واجب نہیں، اگر ان افعال میں بھی کچھ تقدیم وتاخیر ہو جائے تو کچھ واجب نہیں ہوتا۔

” أما عندهما فعدم التاخير سنة حتى لو ذبح قبل التحلّل بالحلق لاشيء عليه ....
(الشامي: ٢/ ٢٥٠ ـو بدائع الصنائع: ٢/ ١٤١).

اور صاحبینؒ کا قول بھی درحقیقت امام ابوحنیفہؒ ہی کا ایک قول ہوتا ہے بلکہ جہاں صاحبینؒ کی رائے ایک طرف اور امام صاحبؒ کی رائے ایک طرف ہو وہاں بعض اہل علم کے نزدیک دونوں قول میں سے ایک پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہوتی ہے۔ (شرح عقود رسم المفتي: ١٩، مکتبہ دار الاشاعة).

اس لئے فی زماننا صاحبینؒ کی رائے پر فتویٰ دینا اور اس پر عمل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔
(جدید فقہی مسائل: ۲/۲۰۰).

خلاصہ: جدید فقہی مباحث میں مختلف فیصلے علماء ہند کے جو بیان کئے ہیں ان میں ایک فیصلہ یہ ہے:
حنفیہ کے قول کے مطابق ۱۰ ذی الحجہ کے مناسک رمی ذبح اور حلق کو ترتیب کے ساتھ انجام دینا واجب ہے، اور صاحبین اور کثیر فقہاء کے یہاں مسنون ہے، جس کی خلاف ورزی سے دم واجب نہیں، حجاج کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو ترتیب کی رعایت کو ملحوظ رکھے، تاہم ازدحام اور موسم کی شدت، اور مذبح کی دوری وغیرہ کی وجہ سے

صاحبین اور دیگر ائمہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے، لہذا یہ مناسک اگر ترتیب کے خلاف ہوں تو بھی دم واجب نہیں ہوگا۔ (جدید فقہی مباحث: ۱۳/ ۵۹۹).

انمول حج میں مفتی سید مصلح الدین احمد بروڈوی نے چھٹی فقہی کانفرنس منعقدہ شیخ الہند ہال دیو بند کے حوالہ سے نقل فرمایا: یوم النحر کے افعال میں عدم لحاظِ ترتیب موجب نہیں:

تجویز (۳) رمی، ذبح اور حلق میں ترتیب:

تمتع اور قران کرنے والے کے لئے رمی، ذبح، اور حلق کے درمیان امام اعظمؒ کے قول پر جو مفتیٰ بہ ہے ترتیب لازم ہے، اس کے ترک سے دم واجب ہوتا ہے، جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک یہ ترتیب سنت ہے اس کے ترک پر دم واجب نہیں ہے۔

آج کل حجاج ازدحام یا دیگر پریشان کن اعذار کے پیش نظر اگر ترتیب قائم نہ رکھ سکیں تو صاحبین کے قول پر عمل کی گنجائش ہے۔ (چھٹا فقہی اجتماع بمقام شیخ الہند ہال دیو بند، منعقدہ ۲۶، ۲۷، ۲۸، مارچ ۱۹۹۷ء۔ انمول حج: ص ۱۱۵).

مفتی شبیر احمد مرادآبادی کے مقالہ کا خلاصہ:

افعالِ حج میں سے یوم النحر میں: (۱) رمی (۲) ذبح (۳) حلق (۴) طوافِ زیارت ہیں۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ طوافِ زیارت کو ترتیب میں باقی رکھنا مسنون ہے، کسی کے نزدیک واجب نہیں ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ طوافِ زیارت کے علاوہ باقی امورِ ثلاثہ میں ترتیب واجب ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب بدلنے کی دو صورتیں ہیں: (۱) عمداً ترتیب بدل دی جائے (۲) جاہلاً یا نسیاناً بدل جائے۔ دونوں کی الگ الگ تفصیل ہے۔

اگر جان بوجھ کر ترتیب بدل دی تو امام ابوحنیفہؒ نیز امام مالکؒ، امام شافعیؒ (نووی ج:۱ ص:۴۲۱) اور امام احمدؒ (البحر الرائق: ۳/ ۲۴) کی ایک روایت کے مطابق اس پر دم واجب ہوجائیگا، مگر امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے مشہور قول کے مطابق، نیز صاحبینؒ کے نزدیک اس پر دم واجب نہ ہوگا، اس لئے کہ ترتیب ان سب کے نزدیک سنت ہے اور ترکِ سنت کی وجہ سے دم واجب نہیں ہوتا، نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی جس روایت سے امام ابوحنیفہؒ نے استدلال فرمایا ہے وہ روایت ضعیف ہے، علامہ بدرالدین عینیؒ نے طحاوی کی شرح نخب الافکار (قلمی) میں "ولا یصح ذلک عنه" فرما کر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس اثر کو ضعیف قرار دیا ہے جس سے وجوبِ دم کا ثبوت ہوتا ہے۔ (نخب الأفكار قلمي ج:٥ ص:٨١).

اگر مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یا بھول کی وجہ سے ترتیب بدل دی تب بھی امام صاحبؒ کے قولِ مشہور کے

مطابق دم واجب ہوجاتا ہے، جیسا کہ عام کتبِ فقہ میں امام صاحبؒ کا یہ قول ملتا ہے، مگر امام محمدؒ نے "کتاب الحجة علیٰ أهل المدینة" میں امام صاحبؒ کا قول صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ عبارت یہ ہے:

" أخبرنا محمدؒ عن أبي حنيفةؒ في الرجل يجهل وهو حاج فيحلق رأسه قبل أن يرمي الجمرة أنه لا شئ عليه. (كتاب الحجة:۲/ ۳۷۱).

اس کے نیچے تعلیق میں مفتی سید مہدی حسن صاحب فرماتے ہیں: فإن الأحاديث الواردة في الباب إنما تدلّ علیٰ من جهل عن شيء ولم يشعر به ثم فعل خلافه فلا شيء عليه ولا دم، ومن علم الترتيب بين الواجبات ثم خالفه عمداً وقدم الشيء أو أخره عن موضعه فهو غير داخل في الأحاديث المذكورة. (تعليق ۲: / ۳۷۱).

صاحبینؒ، ائمہ ثلاثہؒ، حسن بصریؒ، قتادہؒ.... اور جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ بھول ونسیان اور جہالت سے ترتیب بدل جانے کی وجہ سے دم لازم نہیں ہوتا ہے، اس کو حضرات علماء امت نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے: فإن أخل بترتيبها ناسياً أوجاهلاً بالسنة فلا شيء عليه في قول كثير من أهل العلم منهم الحسن وطاؤس ... وإليه ذهب الشافعيؒ وأحمدؒ وإسحاقؒ...وقال ابن عباس رضي الله تعالیٰ عنهما: عليه دم، وهو قول النخعيؒ...وإليه ذهب أبو حنيفةؒ والنخعيؒ وابن الماجشونؒ. (معارف السنن:۶ / ۲۱۰، سعيد۔ وأوجز المسالك :۳ / ۷۱۵).

امام صاحبؒ کی دلیل ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اثر ہے۔ عن ابن مسعود رضي الله تعالیٰ عنه قال: من قدم نسكاً علیٰ نسک فعليه دم. قلت: هكذا هو في غالب النسخ، ويوجد في بعضها ابن عباس رضي الله تعالیٰ عنهما وهو أصح. وقال: إبراهيم ابن مهاجر ضعيف. (نصب الراية:۳/ ۱۲۹).

جمہور کی دلیل ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی وہ روایت جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف حضرات نے ترتیب کی رعایت نہ کرنے کے بارے میں سوال کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے جواب میں فرمایا: " افعل ولاحرج ". (بخاری شريف:۱/ ۲۳۲).

حاصل بحث:۔

اب پوری بحث پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جمہور کے دلائل زیادہ مضبوط اور زیادہ صحیح ہیں، اور تطبیق کی بہترین شکل یہ ہوسکتی ہے کہ صحیحین کی مرفوع روایات میں کفارہ لازم نہ ہونے کی بات اس صورت میں ہے کہ جب لاعلمی یا بھول سے ترتیب بدل دی ہو اور حضرت ابن عباسؓ کے اثر میں کفارہ اس وقت لازم سمجھا جائے جبکہ

جان بوجھ کر ترتیب بدل دی ہو لہذا ایسی صورت میں تمام روایات پر عمل کرنا سب کے نزدیک ممکن ہو سکتا ہے اس لئے اگر کوئی شخص لاعلمی یا بھول سے ترتیب بدل دے تو اس پر کفارہ لازم نہ ہونا چاہئے، اور جو شخص جان بوجھ کر ترتیب بدل دیگا اس پر کفارہ لازم ہو جائیگا، ایسی صورت میں بہت ساری دشواریاں ختم ہو سکتی ہیں، لہذا متمتع اور قارن اگر رمی، ذبح، اور حلق کے درمیان عمداً بلا عذر ترتیب بدل دیگا تو دم واجب ہوگا، اور اگر پریشان کن اعذار یا جہالت کی وجہ سے ترتیب قائم نہ رکھ سکے، تو صاحبینؒ کے قول اور امام صاحبؒ کے قولِ غیر مشہور پر عمل کی گنجائش ہوگی، اور ترتیب کے بدل جانے کی وجہ سے وجوب دم کا حکم نہ لگایا جائے۔(جدید فقہی مباحث:۱۳/۱۷۳).

وجوبِ ترتیب پر آیتِ کریمہ سے شبہ اور اس کا جواب:

بعض حضرات نے وجوب ترتیب کے لیے باری تعالیٰ کے فرمان: ﴿ولا تحلقوا رؤوسكم حتى يبلغ الهدي محله﴾ سے دلالت النص کے طور پر استدلال فرمایا، جس کا بیان یہ ہے کہ دلالت النص کی تعریف یہ ہے کہ مسکوت منطوق کے مقابلہ میں اولیٰ بالحکم ہو جیسے ﴿لا تقل لهما أف﴾ میں " أف " منطوق ہے اور برا بھلا کہنا مسکوت ہے لیکن برا بھلا کہنا اولیٰ بالنہی ہے۔

اسی طرح ﴿ولا تحلقوا رؤوسكم حتى يبلغ الهدي محله﴾ آیت کریمہ میں محصَر کو تقدیم نحر علی الاطلاق کا حکم دیا گیا، چنانچہ حلق کو ذبح پر مقدم کرنا بالاجماع جائز نہیں اور موجب دم ہے، تو جب محصر (جس نے احرام باندھا اور پھر حج کرنے سے روک دیا گیا) کا یہ حکم بیان کیا کہ ہدی ذبح ہونے کے بعد حلق کرے تو قارن وغیرہ کا بطریق اولیٰ یہ حکم ہونا چاہئے کہ ذبح سے پہلے حلق درست نہ ہو، اور ترتیب توڑنے پر دم لازم ہو، کیونکہ اس کو تو روکا بھی نہیں گیا، لہذا بطریق اولیٰ ترتیب لازم ہونی چاہئے؟

الجواب: اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ محصَر نے فقط حج کا احرام باندھا، پھر حج کے افعال سے روک لیا گیا، اس نے حج کا کوئی رکن ادا نہیں کیا، فقط احرام باندھا ہے اور احرام حج کے لیے شرط کا درجہ رکھتا ہے۔

اور حلال ہونے کے لیے افعال حج میں سے کوئی ایک کام کرنا ضروری ہے، تاکہ حلال ہونا اس فعل پر مرتب ہو جائے، پس محصر کے لیے ہدی کا حرم میں ذبح ہونا ضروری ہے۔

بخلافِ قارن و متمتع کہ وہ حج کے کئی افعال کر چکے ہیں، مثلاً وقوف عرفہ وغیرہ، اب فقط نحر اور حلق باقی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ محصر کو حلق سے پہلے حج کا کوئی ایک فعل تو کرنا چاہئے کیونکہ اکثر تو احرام باندھنے کے بعد ہی روکا جائیگا تو وہ فعل قربانی ہے، لیکن غیر محصر اگر حلق سے پہلے قربانی نہ کرے تو اور بہت سارے افعال کر چکا

ہے۔

احرام شرط کا درجہ رکھتا ہے۔ قال في غنية الناسک: الإحرام قبل الوقوف بعرفة ... وهو شرط ابتداء حتی صح تقديمه على الوقت، وله حكم الركن انتهاءً.(غنية الناسك:۲۱، ادارة القرآن،عمدة الفقه:۶۹/۴).

پس عام متمتع اور قارن کا حکم محصر سے مختلف ہوگا، بنابریں قارن ومتمتع کے لیے ترتیب کا وہی حکم ہوگا جو تفصیلی فتویٰ میں لکھا جا چکا ہے، فلیراجع۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ویکس (vicks) استعمال کرنے پر وجوبِ کفارہ کا حکم:

سوال: محرم اگر ویکس (vicks) اور دیپ ہیٹ (deep heat) استعمال کرے تو جزا واجب ہوگی یا نہیں؟ جب کہ دونوں میں تیز بو ہوتی ہے، اور ویکس میں کافور کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ دونوں دواؤں میں کافور ۵۲ فیصد شامل ہوتا ہے لہذا ان کا استعمال احرام کی حالت میں صحیح نہیں ہے، اگر محرم نے استعمال کرلیا تو کفارہ لازم ہوگا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر محرم نے ایک عضو یا اس کے بقدر استعمال کیا تو دم واجب ہوگا، اور اگر ایک عضو سے کم استعمال کیا تو صدقہ لازم ہوگا۔

شرح لباب المناسک میں ہے:

ولو تداوى بالطيب أي المحض الخالص أو بدواء فيه طيب أي غالب ولم يكن مطبوخاً فالتصق أي الدواء على جراحته تصدق أي إذا كان موضع الجراحة لم يستوعب عضواً أو أكثر، إلا أن يفعل ذلك مراراً فيلزمه دم لأن كثرة الفعل قامت مقام كثرة الطيب. (شرح لباب المناسك مع ارشاد الساری:۳۵۲،فصل فی التداوی بالطیب ،بیروت۔ومثله فی غنية الناسك فی بغية المناسك:۱۳۳،مطلب فی التداوی بالطیب،ادارة القرآن).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

فإذا استعمل الطيب فإن كان كثيراً فاحشاً ففيه الدم، وإن كان قليلاً ففيه الصدقة، ... حتى لو تطيب به عضواً كاملاً يكون كثيراً يلزمه دم، وفيما دونه صدقة. (الفتاوى الهندية:۱/ ۲۴۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

محرم کا خوشبودار چیز کھانے پر کفارہ کا حکم:

سوال: اگر محرم نے خوشبودار چیز کھالی تو اس پر کفارہ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: خالص خوشبو کھانا امام صاحبؒ کے نزدیک محظوراتِ احرام میں سے ہے پس اگر کسی نے زیادہ خوشبو کھالی تو اس پر دم لازم ہوگا، اور اگر تھوڑی سی کھائی تو صدقہ واجب ہوگا، ہاں خوشبودار چیز کسی اور کھانے والی شئ میں پکا کر کھانے سے کوئی جزا لازم نہیں ہے، اسی طرح بغیر پکائے استعمال کی جائے لیکن خوشبودار چیز مغلوب ہو تب بھی کوئی جزا لازم نہیں البتہ کراہت سے خالی نہیں اس لیے بچنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں ہے:

فلو أكل طيباً كثيراً وهو أن يلتصق بأكثر فمه يجب الدم، وإن كان قليلاً بأن لم يلتصق بأكثر فمه فعليه الصدقة، هذا إذا أكله كما هو من غير خلط أو طبخ، فلو جعله في الطعام وطبخه فلا بأس بأكله، لأنه خرج من حكم الطيب وصار طعاماً، وكذلك كل ما غيرته النار من الطيب فلا بأس بأكله، و لو كان ريح الطيب يوجد منه، وإن لم تغيره النار يكره أكله، إذا كان يوجد منه رائحة الطيب، وإن أكل فلا شيء عليه، كذا في شرح الطحاوي . (غنية الناسك في بغية المناسك: ١٣٢، مطلب في اكل الطيب و شربه، ادارة القرآن).

لباب المناسک میں ہے:

وأكل طعام أي غير مطبوخ يوجد منه رائحة الطيب بخلاف المطبوخ، فإنه لا يكره، وكذا إذا كان المخلوط غير مطبوخ ولم يوجد منه الريح، فإنه حينئذٍ مغلوب مستهلك فلا شيء عليه، وكذا حكم الشراب، وهذا كله عند أبي حنيفةؒ، وأما عندهما فلا شيء عليه بأكل الزعفران، فإنه يستعمل في الأطعمة فالتحق بها، ولأبي حنيفةؒ أنه طيب حقيقة، ولا تسقط هذه الحقيقة إلا لضرورة التبعية للطعام بأن كان في طعام مسته النار أو لم تمسه، كذا في الشمني . (لباب المناسك مع شرحه: ١٣٤، فصل في مكروهاته، بيروت۔ وفتاوى هنديه: ١/ ٢٤١)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ناریل (coconut) کا تیل استعمال کرنے کا حکم:

سوال: حالتِ احرام میں ناریل (coconut) کا تیل علاجاً یا بغیر علاج کے استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ناریل (coconut) کا تیل اگر محرم نے کامل عضو پر استعمال کیا تو دم لازم ہوگا، اور اگر عضو سے کم ہو تو صدقہ واجب ہے۔

ملاحظہ ہو شرح لباب میں ہے:

ولو ادهن أي بدهن مطيب وهو ما ألقي فيه الأنوار، كدهن البنفسج والورد والياسمين والبان والخيري، والظاهر أن هذه الأشياء لها دهن مأخوذ منها فيكون غير ما ألقي فيه الأنوار فإنه نوع آخر من الدهن المطيب والمقصود أنها وسائر الأدهان التي فيها طيب إذا استعمل به عضواً كاملاً على ما في البدائع فعليه دم أي اتفاقاً، وفي الأقل من عضو صدقة. (لباب المناسك مع شرحه:۳۵۹،فصل فی الدهن،بیروت).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ونوع ليس بطيب بنفسه ولكنه أصل للطيب يستعمل على وجه التطيب ويستعمل على وجه الدواء كالزيت والشيرج و يعتبر فيه الاستعمال فإن استعمل استعمال الأدهان في البدن، يعطى له حكم الطيب، وإن استعمل في مأكول أوشقاق رجل لا يعطى له حكم الطيب، كذا في البدائع، فإذا استعمل الطيب فإن كان كثيراً فاحشاً ففيه الدم، وإن كان قليلاً ففيه الصدقة ،كذا في المحيط...حتى لو طيب به عضواً كاملاً يكون كثيراً يلزمه دم وفيما دونه صدقة .(الفتاوی الهندیة:۱/ ۲٤۰ ـو کذا فی بدائع الصنائع:۲/ ۱۹۰،سعید).

زبدۃ المناسک میں ہے:

تیسری قسم وہ ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے تو خوشبو نہیں ہے لیکن اس میں خوشبو بنائی جاتی ہے...تو اس میں استعمال کا اعتبار ہوگا، پس اگر اس کو تیل لگانے کے طور پر استعمال کیا ہے تو خوشبو کا حکم ہوگا، اور اگر کھانے میں یا بِوائی کے اندر بھرنے میں استعمال کیا ہے تو اس کے واسطے خوشبو کا حکم نہ ہوگا، ایسا ہی سرسوں کا تیل یا کھوپرے کا تیل وغیرہ ہو تو بھی یہی حکم ہے۔(زبدۃ المناسک:۳۴۸).

لیکن علاجاً استعمال کرنے سے جزا واجب نہ ہوگی۔

ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں ہے:

أما إذا استعملهما على وجه التداوي أو الأكل فلا شيء عليه بالإجماع.(غنیة الناسك: ۱۳۳، مطلب فی الادهان، ادارة القرآن).

لباب المناسک میں ہے:

و أما إذا استعمله علی وجه التداوي أو الأکل فلا شيء علیه أي اتفاقاً انتهیٰ. (لباب المناسك مع شرحه:۳۵۹،فصل فی الدهن،بیروت)۔واللہ ﷻ اعلم۔

حالتِ احرام میں روغن زیتون استعمال کرنے پر کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کسی محرم نے زیتون کا تیل زخم وغیرہ پر لگایا یا ہاتھ پر ملا تو جزا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر زیتون کا تیل بطور علاج استعمال کیا تو کوئی کفارہ لازم نہیں ہے، لیکن اگر ویسے ہی استعمال کیا تو عضو کامل پر ہو تو دم لازم ہے اور اس سے کم پر ہو تو صدقہ لازم ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

سمت الزیت طیباً (في حدیث أم سلمة رضي الله تعالیٰ عنها) و لأنه أصل الطیب بدلیل أنه یطیب بإلقاء الطیب فیه، فإذا استعمله علی وجه الطیب کان کسائر الأدهان المطیبة، ولأنه یزیل الشعث الذي هو علم الإحرام و شعاره، وعلی ما نطق به الحدیث، فصار جارحاً إحرامه بإزالة علمه فتکاملت جنایته فیجب الدم.... ولو داوی بالزیت جرحه أو شقوق رجلیه فلا کفارة علیه، لأنه لیس بطیب بنفسه و إن کان أصل الطیب، لکنه ما استعمله علی وجه الطیب فلا تجب به الکفارة.... (بدائع الصنائع:۲/۱۹۰،سعید۔و کذا فی فتاوی الهندیة:۱/۲٤۰)۔

عالمگیری میں ہے:

فإذا استعمل الطیب فإن کان کثیراً فاحشاً ففیه الدم، و إن کان قلیلاً ففیه الصدقة ... حتی لو طیب به عضواً کاملاً یکون کثیراً یلزمه دم، و فیما دونه صدقة. (الفتاوی الهندیة:۱/۲٤۰)۔

زبدۃ المناسک میں ہے:

تیسری قسم وہ ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے تو خوشبو نہیں ہے لیکن اس میں خوشبو بنائی جاتی ہے اور پھر خوشبو کے طور پر بھی کام میں آتی ہے، اور دوا کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے جیسے زیتون اور تل کا تیل تو اس میں استعمال کا اعتبار ہوگا، پس اگر اس کو تیل لگانے کے طور پر استعمال کیا ہے تو خوشبو کا حکم ہوگا، اور اگر کھانے میں یا بوائی کے اندر بھرنے میں استعمال کیا ہے تو اس کے واسطے خوشبو کا حکم نہ ہوگا۔ (زبدۃ المناسک:۳۴۸)۔واللہ ﷻ اعلم۔

حالتِ احرام میں سگریٹ پینے کا حکم:

سوال: حالتِ احرام میں سگریٹ پینے میں کوئی کراہت ہے یا نہیں؟

الجواب: احرام اور بغیر احرام دونوں حالتوں میں سگریٹ پینا مکروہ ہے اور حالتِ احرام میں کراہت شدید ہے، لہٰذا اس سے اجتناب لازم اور ضروری ہے جن حضرات نے مباح فرمایا ہے وہ اس لیے کہ اس زمانہ میں اسکا ضرر اور شدید اسراف واضح نہیں ہوا تھا۔ نیز اس کی بدبو سے اکثر لوگوں کو اذیت پہنچتی ہے، اس وجہ سے بدبودار چیز کھا کر مسجد میں جانا بھی منع ہے۔

ملاحظہ ہو مسلم شریف میں ہے:

عن أبي سعيد الخدري رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: لم نعد أن فتحت خيبر فوقعنا أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم في تلك البقعة الثوم، والناس جياع، فأكلنا منها أكلاً شديداً ثم رجعنا إلى المسجد، فوجد رسول الله صلى الله عليه وسلم الريح، فقال: "من أكل من هذه الشجرة الخبيثة شيئاً، فلا يقربنا في المسجد... (مسلم شريف: ۱/ ۲۰۹).

قال الإمام النوويؒ في شرح هذا الحديث: قال العلماء ويلحق بالثوم والبصل والكراث كل ماله رائحة كريهة من المأكولات وغيرها... قال القاضي: وقاس العلماء على هذا مجامع الصلاة غير المسجد كمصلى العيد والجنائز ونحوها من مجامع العبادات، وكذا مجامع العلم والذكر والولائم ونحوها. (شرح المسلم للنوويؒ: ۱/ ۲۰۹).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سگریٹ پینا مکروہ ہے، بغیر منہ صاف کیے ہوئے مسجد میں جانا جس کی بدبو سے دوسروں کو اذیت پہنچے منع ہے:

وأكل نحو الثوم: أي كبصل ونحوه مما له رائحة كريهة للحديث الصحيح في النهي عن قربان آكل الثوم والبصل المسجد، قلت: علة النهي أذى الملائكة وأذى المسلمين. (الشامي: ۱/ ۶۶۱، سعید۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۸/ ۳۸۹، مبوب ومرتب).

مزید ملاحظہ ہو: فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۲۴۱۔ ۲۴۵۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حالتِ احرام میں صابون کے استعمال پر کفارہ کا حکم:

سوال: حالتِ احرام میں صابون استعمال کرنے پر کوئی جزا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صابون کے ذریعہ ہاتھوں کی صفائی مقصود ہے خوشبو مقصود نہیں ہے، نیز اس کو دیکھنے والا طیب اور خوشبو نہیں سمجھتا بلکہ صفائی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس میں خوشبو کے اجزاء قلیل اور صفائی کے اجزاء زیادہ ہیں، لہٰذا اس میں دم واجب نہیں ہاں صدقہ دینا چاہئے۔

غنیۃ الناسک میں ہے:

وغسل الرأس واللحية والجسد بالسدر ونحوه...بخلاف غسله بصابون أو دلوك وأشنان فإنه لايكره إلا أن يزيل الوسخ. (غنية الناسك في بغية المناسك:٤٧،فصل في مكروهات الاحرام،ادارة القرآن).

لباب المناسک میں ہے:

الغسل أي الاغتسال بالماء القراح ، وماء الصابون والأشنان ، ويكره بالسدر لكن يستحب أن لا يزيل الوسخ بأي ماء كان بل يقصد الطهارة أو دفع الغبار والحرارة. (لباب المناسك مع شرحه:١٣٥،فصل في مباحاته،بيروت).

معلم الحجاج میں ہے:

خالص صابون میں کوئی چیز واجب نہیں ہے، لیکن محرم کو میل دور کرنا مکروہ ہے۔(معلم الحجاج:۲۳۱)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حالتِ احرام میں ماسک (Mask) باندھنے سے کفارہ کا حکم:

سوال: اگر مرد احرام کی حالت میں گرد وغبار سے بچنے کے لیے ماسک باندھے تو کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ماسک چونکہ چہرے کے چوتھائی یا زیادہ حصہ کو چھپالیتا ہے لہٰذا اگر ایک مکمل دن یا ایک مکمل رات یا زیادہ پہنا ہے تو دم واجب ہوگا، اور اس سے کم استعمال کیا ہے تو صدقہ لازم ہوگا۔ نیز گرد وغبار اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ اس کو عذر قرار دیا جائے۔

غنیۃ الناسک میں ہے:

وأما تعصيب الرأس والوجه فمكروه مطلقاً موجب للجزاء بعذر أو بغير عذر للتغليظ إلا أن صاحب العذر غير آثم. (غنية الناسك:٤٧،اداره القرآن).

لباب المناسک میں ہے:

ولوغطى جميع رأسه أو وجهه أي جميع وجهه بمخيط أو غيره يوماً وليلة وكذا مقدار أحدهما فعليه دم أي كامل بلا خلاف وفي الأقل من يوم وكذا من ليلة صدقة، والربع منهما كالكل قياساً على مسحهما...وعن أبي يوسفؒ أنه يعتبر أكثر الرأس على ما نقل عنه صاحب الهداية والكافي والمبسوط وغيرهم، ونقله في المحيط والذخيرة والبدائع والكرماني عن محمد، لكن قال الزيلعيؒ: وقياس قول محمد أن يعتبر الوجوب فيه بحسابه من الدم انتهىٰ، وكذا الحكم في الوجه على ما نص عليه في المبسوط والوجيز وغيرهما... ولوعصب من رأسه أو وجهه أقل من الربع أي يوماً أو ليلة فعليه صدقة أي اتفاقاً. (اللباب مع شرحه: ٣٤١، فصل فی تغطية الرأس والوجه، بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

ولو عصب رأسه أو وجهه يوماً أوليلة فعليه صدقة إلا أن يأخذ قدر الربع فدم. (غنية الناسك: ١٣٦، الفصل الثالث فی تغطية الرأس والوجه۔ومثله فی الشامی: ٤٨٨/٢، سعيد)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

سلے ہوئے جوتے پہننے پر کفارہ کا حکم:

سوال: احرام کی حالت میں تینوں ٹخنے کھلے رکھنا ضروری ہے، لیکن خیاطت جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلے ہوئے جوتے پہننا جائز نہیں ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟

الجواب: احرام کی حالت میں اصل حکم تو یہ ہے کہ تینوں ٹخنے کھلے رہنا چاہئے، اور اگر کھلے نہ ہو تو کاٹ لینا چاہئے، اگر سلے ہوئے پہننا ناجائز ہوتا تو پھر کاٹنے کے کیا معنیٰ؟ جب کہ احادیث اور کتبِ فقہیہ کی عبارات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کھلے نہ ہوں تو کاٹ لے، معلوم ہوا کہ سلائی مطلقاً ممنوع نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن عبد الله بن عمر ﷺ أن رجلاً سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم ما يلبس المحرم من الثياب فقال: لا تلبسوا القميص... ولا الخفاف إلا أحد لا يجد نعلين فيلبس خفين وليقطعهما أسفل من الكعبين...الخ. (متفق عليه، مشكاة: ٢٣٥/١، باب مايجتنبه المحرم).

غنیۃ الناسک میں ہے:

ولبس الخفين والجوربين إلا أن لا يجد نعلين فليقطعهما حتى يكونا أقل من الكعبين كما في الصحيح . (غنية الناسك: ٤٤،فصل فى محرمات الاحرام).

شرح لباب میں ہے:

والنعلين أي ولبس النعلين وإن جوز لبس غيرهما مما لا يستر الكعبين في وسط الرجلين. (شرح لباب المناسك:١٠٣،باب الاحرام، بيروت).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولا يلبس مخيطاً قميصاً أو قباء أو سراويل أو عمامة أو قلنسوة أوخفاً إلا أن يقطع الخف أسفل من الكعبين كذا في فتاوى قاضيخان. والكعب هنا المفصل الذي في وسط القدم عند مقعد الشراک كذا في التبيين.(الفتاوى الهندية:١/٢٢٤).

غنیۃ الناسک میں ہے:

كان نعله صلى الله عليه وسلم مخصرة معقبة ملسنة مثنى شراكهما صفراء من جلود البقر والمخصرة هي اللتي لها خصر دقيق والمعقبة هي اللتي لها عقب أي سير من جلد في مؤخر النعلين يمسک به عقب القدم والملسنة هي اللتي في مقدمها طول على هيئة اللسان وذلک لأن سبابة رجله صلى الله عليه وسلم كانت أطول أصابعه، فكان في مقدم النعل بعض طول يناسب تلک الأصبع، وكان له نعل من طاق ونعل من أكثر وكان لبعض نعاله قبال واحد.(غنية الناسك:٣٦،ادارة القرآن).

مزید ملاحظہ ہو:فتاوى الشامى:٢/٤٩٠،سعيد۔وزبدة المناسك:١٠٣۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

وقوفِ مزدلفہ نہ کرنے پر کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کسی نے مزدلفہ کا واجب وقوف چھوڑ دیا تو اس پر دم واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر بغیر عذر کے ترک کر دیا تو دم واجب ہے لیکن عذر کی وجہ سے ترک کیا تو دم لازم نہیں ہے۔

لباب المناسک میں ہے:

ولو ترك الوقوف بالمزدلفة أي في فجر يوم النحر بلا عذر لزمه دم وإن تركه بعذر بأن كانت به علة أي مرض مانع من وقوفه بها أوصنف أي في بيته أو مشيه أو كانت امرأة أي ونحوها من نفوس الرجال تخاف الزحام أي في طريق منى أي في ضيق أماكنها فلا شيء أي من الدم و الصدقة عليه أي على تاركه.

(لباب المناسك مع شرحه: ٣٩٤،فصل في الجنايات في الوقوف بالمزدلفة،بيروت).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما حكم فواته عن وقته أنه إن كان لعذر فلا شيء عليه لماروي أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قدم ضعفة أهله ولم يأمرهم بالكفارة وإن كان فواته لغيرعذر فعليه دم لأنه ترك الواجب من غير عذر. (بدائع الصنائع: ٢/١٣٦، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: البحرالرائق: ٣/٥٦، كوئته۔والدرالمختار: ٢/٥١١،سعيد۔عمدة الفقه: ٤/٢٢٨،مجدديه)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

وقوفِ مزدلفہ بغیر عذر کے ترک کرنے پر دم کا حکم:

سوال: کچھ مرد اور عورتیں عرفات سے مزدلفہ پہونچے اور ابھی فجر طلوع نہیں ہوئی تھی کہ ڈرائیور نے ان کو نکالدیا یہ لوگ پھر واپس مزدلفہ نہیں آئے تو دم واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دم واجب ہے اس لئے کہ وقوفِ مزدلفہ طلوعِ فجر سے طلوعِ شمس تک واجب ہے اور بغیر عذر کے واجب کا ترک پایا گیا، اور ڈرائیور کا نکالدینا کوئی عذر نہیں۔

ملاحظہ ہو الجوہرۃ النیرۃ میں ہے:

وهذا الوقوف عندنا واجب وليس بركن حتى لو تركه بغيرعذر يلزمه دم. (الجوهرة النيرة: ١/١٩٤).

فتاویٰ الشامی میں ہے:

قوله ثم وقف هذا الوقوف واجب عندنا لا سنة والبيتوتة بمزدلفة سنة مؤكدة إلى الفجر لا واجبة، خلافاً للشافعيؒ فيهما، كما في اللباب وشرحه، قوله ووقته الخ...أي وقت جوازه

قال في اللباب: وأول وقته طلوع الفجر الثاني من يوم النحر وآخره طلوع الشمس منه فمن وقف بها قبل طلوع الفجر أو بعد طلوع الشمس لايعتد به وقدر الواجب منه ساعة ولو لطيفة . (فتاوی الشامی:۲/۵۱۱،سعید).

شرح لباب میں ہے:

والوقوف بمزدلفة أي ولو ساعة بعد الفجر، وفي إرشاد الساری: أي عرفية لا نجومية.

(شرح اللباب مع ارشاد الساری:۷٦،فصل فی واجباته،بیروت).

احسن الفتاوی میں ہے:

اگر وقوفِ مزدلفہ کسی قدرتی عذر کی وجہ سے نہ ہوسکا مثلاً کوشش کے باوجود عرفات سے مزدلفہ طلوع آفتاب سے قبل نہ پہونچ سکا تو کوئی جزا واجب نہیں۔البتہ مخلوق کی طرف سے کسی رکاوٹ کی وجہ سے یا عمداً ترک وقوف سے دم واجب ہے۔(احسن الفتاوی:۴/۵۲۱)۔واللہ ﷻ اعلم۔

مزدلفہ اور منیٰ کے درختوں کی شاخیں کاٹنے پر تاوان کا حکم:

سوال: کچھ عورتوں نے مزدلفہ اور منی کے درختوں کی شاخیں تراشی کیا ان پر تاوان لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں درختوں کی شاخیں کاٹنے اور تراشنے کی وجہ سے جو نقصان ہوا ہے اس کے بقدر تاوان لازم ہوگا،اور اگر کوئی نقصان نہیں ہوا تو تاوان بھی لازم نہیں ہے۔

لباب المناسک میں ہے:

إذا جنى على نبات الحرم أي بقطعه أو قلعه أو رعيه فعليه قيمته كبيراً كان الشجر أو صغيراً فيشتري بها أي بقيمته طعاماً من الحبوب الذي يؤكل منها يتصدق به على الفقراء أي فقراء الحرم أو غيره . (لباب المناسك مع شرحه:٤٢٥،فصل فی جزاء الاشجار الحرم ونباته،بیروت).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ويجوز أخذ الورق من شجر الحرم ولاضمان فيه إذا كان لايضر بالشجر كذا في السراج الوهاج. (الفتاوی الهندية:١/٢٥٣).

الفقہ الاسلامی میں ہے:

قطع ورق الشجر بالمحجن والعصا، والسواك، وقطع الشجر للبناء والسكنى

بموضعه وقطعه لإصلاح الحوائط والبساطين. لقوله صلى الله عليه وسلم يوم فتح مكة: "إن هذا البلد حرمه الله يوم خلق السموات والأرض فهو حرام بحرمة الله إلى يوم القيامة، ولا يعضد شوكه، ولا ينفر صيده ولا يلتقط لقطته إلا من عرفها، ولا يختلى خلاه فقال ابن عباس ﷺ: يارسول الله! إلا الإذخر، فإنه لقينهم وبيوتهم، فقال: "إلا الإذخر" و يجب عند الجمهور ضمانه خلافاً للمالكية. (الفقه الاسلامی وادلته:۳/۳۲۸،دار الفکر)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

طوافِ زیارت کو ایامِ نحر سے مؤخر کرنے پر کفارہ کا حکم:

سوال: قواعد کی کتاب میں مرقوم ہے کہ اگر محرم طوافِ زیارت کو ایامِ نحر سے مؤخر کرے تو صاحبین کے نزدیک دم واجب نہیں ہے کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں صاحبین کا مذہب یہی ہے، ابوزید دبوسی کی کتاب "تأسیس النظر" میں قاعدہ مرقوم ہے کہ محرم اگر طوافِ زیارت کو ایامِ نحر سے مؤخر کرے تو امام صاحب کے نزدیک دم واجب ہے اور صاحبین کے نزدیک کچھ واجب نہیں ہے۔ اور اس کی تائید کتبِ فقہ سے بھی ہوتی ہے۔ اگر چہ گنہگار ہوگا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

(الواجب دم على محرم بالغ)... أو أخر الحاج الحلق أو طواف الفرض عن أيام النحر لتوقتهما بها أي الحلق وطواف الفرض بأيام النحر عند الإمام. (الدر المختار مع الشامی:۲/۵۵۵، باب الجنایات،سعید)۔

وفي الطحطاوي: قوله أو أخر الحاج الحلق هذا عند الإمام وعندهما لا يلزم بالتأخير في المناسك شيء. (حاشية الطحطاوی علی الدر المختار:۱/۵۲۵)۔

ہدایہ میں ہے:

ومن أخر الحلق حتى مضت أيام النحر فعليه دم عند أبي حنيفةؒ وكذا إذا أخر طواف الزيارة وقالا: لا شيء عليه في الوجهين. (الهداية:۱/۲۷۶۔وکذا فی البحر الرائق:۳/۲۴،کوئٹہ۔وفتح القدیر:۳/۶۱،دار الفکر۔ واللہ ﷻ اعلم۔

طوافِ زیارت نہ کرنے پر کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص طوافِ زیارت نہ کرے تو جماع کے حق میں حلال نہ ہوگا تو کتنے دم لازم ہوں گے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس شخص پر دودم لازم ہوں گے ایک تو ایام نحر سے طوافِ زیارت کو مؤخر کرنے کا اور دوسرا طوافِ زیارت سے قبل جنسی تعلقات قائم کرنے کا، اور اس دم میں بدنہ واجب ہوگا، اور پہلے دم میں بکری واجب ہے یا اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ بھی کافی ہے، لیکن صاحبین کے نزدیک ایام نحر سے تأخیر کی وجہ سے کوئی دم لازم نہیں فقط بدنہ لازم ہوگا، اور اگر پوری عمر طواف نہیں کیا تو بدنہ کی وصیت کرنا لازم ہے۔

غنیۃ الناسک میں ہے:

ويمتد وقت صحته إلى آخر العمر لكن يجب فعله في أيام النحر ولياليها المتخللة بينهما منها فلو أخره عنها ولو إلى اليوم الرابع الذي هو آخر أيام التشريق وليلته منه كره تحريماً ولزمه دم وهو الصحيح، ولو مات قبل فعله قالوا: يجب عليه الوصية ببدنة لأنه جاء العذرمن قبل من له الحق وإن كان آثماً بتأخير، تأمل. (غنية الناسك: ٩٥، باب طواف الزيارة).

فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله أوقبل الخ...حاصله أن دواعي الجماع كالمعانقة والمباشرة الفاحشة والجماع فيما دون الفرج والتقبيل واللمس بشهوة موجبة للدم، أنزل أو لا، قبل الوقوف أو بعده، ولايفسد حجه شيء منها كما في اللباب. (فتاوى الشامي: ٢/ ٥٥٤، سعيد).

ولو ترك الطواف كله أوطاف أقله وترك أكثره أي ورجع إلى أهله فعليه حتماً أي وجوباً اتفاقاً أن يعود بذلك الإحرام ويطوفه أي لأنه محرم في حق النساء ...ولا يجزئ عنه أي عن ترك الطواف الذي هوركن الحج البدل. (شرح لباب المناسك: ٣٨٣، فصل في حكم الجنايات في طواف الزيارة).

وفيه أيضاً: شرائط وجوب البدنة بالجماع أربعة :الأول أن يكون الجماع بعد الوقوف والثاني أن يكون قبل الحلق والطواف، أي عند الجمهور، وأما على قول المحققين :فقبل الطواف مطلقاً سواء حلق أم لا. (لباب المناسك مع شرحه: ٣٧٨، بيروت).

مزید ملاحظہ ہو: عمدۃ الفقہ: ۴/ ۵۱۹، مجددیہ۔ واحسن الفتاوی: ۴/ ۵۴۸۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نفل طواف کا ایک شوط چھوڑنے کی وجہ سے کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے جلدی کی وجہ سے نفل طواف کا ایک چکر چھوڑ دیا تو اس پر جزاء واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں صدقہ واجب ہوگا اور صدقہ سے مراد صدقۃ الفطر ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

لو ترک أكثر أشواط الصدر لزمه دم وفي الأقل لكل شوط صدقة. (الدرالمختار مع الشامي: ۲/ ۴۹۶، سعید).

فتاوی قاضیخان میں ہے:

وإن ترک من طواف الصدر أربعة أشواط كان عليه الدم لأن ترک الأكثر كترک الكل، وإن ترک الأقل كان عليه صدقة. (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندية: ۱/ ۲۹۴).

غنیۃ الناسک میں ہے:

وإن ترک أقله فعليه لكل شوط صدقة. (غنية الناسك: ۱۴۷، ادارة القرآن۔ ولباب المناسك مع شرحه: ۴۴۰، فصل كل صدقة تجب في الطواف، بيروت).

معلم الحجاج میں ہے:

مسئلہ: اور اگر ایک یا دو تین شوط طوافِ صدر کے یا طوافِ قدوم کے ترک کرے تو بدلے ہر شوط کے صدقہ کامل دے۔ (معلم الحجاج: ۲۷۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

۱۳ تاریخ کی رمی قبل الظہر کرنے پر وجوبِ کفارہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے حج کے موقعہ پر عید کے دن اور عید کے دو دن کنکریاں اپنے اپنے وقت پر ماری، لیکن ۱۳ تاریخ کی صبح کو رمی کی ظہر تک نہیں ٹھہرا تو اس پر کوئی جزاء واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اس طرح کرنا مکروہ ہے، ۱۳ تاریخ کی رمی کے لیے ظہر تک ٹھہرنا چاہئے، اور زوال کے بعد رمی کر کے واپس آنا چاہئے یہی اولیٰ اور بہتر ہے، لیکن ظہر سے پہلے رمی کرنے سے کوئی دم وغیرہ واجب نہیں ہے، کیونکہ خلافِ اولیٰ فعل کے مرتکب ہونے سے کوئی جزاء واجب نہیں ہوتی۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وإن قدم الرمي فيه أي في اليوم الرابع على الزوال جاز أي صح عند الإمام استحساناً مع الكراهة التنزيهية. (الدرالمختارمع الشامي:۲/ ۵۲۱،مطلب فی وقت الرمي فی اليوم الرابع،سعيد۔وكذا فی لباب المناسك وشرحه:۲۶۷،فصل فی وقت الرمي فی اليوم الرابع من ايام الرمي،بيروت)۔

غنیۃ الناسک میں ہے:

فإن رمیٰ قبل الزوال في هذا اليوم (اليوم الرابع) صح عند أبي حنيفةؒ مع الكراهة التنزيهية، وهوقول عكرمة وطاؤس وإسحاق بن راهويه رحمهم الله تعالىٰ، وهو استحسان غايته لأنه لما ظهر أثرالتخفيف فيه بالترك فلأن يظهر أثر التخفيف فيه بالتقديم أولىٰ. (غنية الناسك فی بغية لامناسك:۹۸،فصل فی صفة رمي الجمارفی اليوم الثالث والرابع)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

طواف کی نماز ادا کئے بغیر واپسی پر جزاء کا حکم:

سوال: ایک عورت کے ذمہ طواف کی دوگانہ لازم تھی اور وہ ادا کیے بغیر گھر واپس آ گئی، اب کفارہ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ طواف کی دو رکعت واجب ہے، لیکن جگہ اور وقت کے ساتھ خاص نہیں، لہٰذا گھر پر ادا کرلی تو کوئی دم وغیرہ لازم نہیں ہے، ہاں اس طرح کرنا مکروہِ تنزیہی ہے۔

ملاحظہ ہو لباب المناسک میں ہے:

صلاة الطواف واجبة ولاتختص بزمان ولامكان أي باعتبار الجواز والصحة وإلا فباعتبار الفضيلة تختص بوقوعها عقيب الطواف إن لم يكن وقت كراهة...ولاتفوت أي إلا بأن يموت فلو تركها لم تجبر بدم وفيه أنه لم يتصور تركها... ولو صلاها خارج الحرم ولو بعد الرجوع إلى وطنه جاز ويكره أي كراهة تنزيهية لتركه الاستحباب. (لباب المناسك مع شرحه:۱۷۱،فصل فی ركعتی الطواف)۔

غنیۃ الناسک میں ہے:

ولا تختص بزمان ولامكان، فلو صلاها خارج الحرم ولو بعد الرجوع إلى وطنه جاز وكره تنزيهاً، ولايفوت ما دام حياً. (غنية الناسك:۶۲،فصل من الواجبات ركعتاالطواف ۔وكذا فی

ردالمحتار:۲/ ۴۷۰،سعید۔وحاشية الطحطاوی علی الدر المختار:۱/ ۴۸۶،کوئٹه۔وزبدة المناسك:۱۲۹۔وآپ کے مسائل اوران کاحل:۴/ ۱۱۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بوقتِ احصار بلا قربانی حلال ہونے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص کو احرام میں محصر ہونے کا خطرہ ہے اور وہ کہدے جہاں میں محصر ہوا وہاں حلال ہو جاؤں گا تو بغیر قربانی کے حلال ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مشہور مذہب کے مطابق بغیر قربانی کے حلال ہونا جائز نہیں ہے، لیکن اگر جنگ وغیرہ کوئی پریشان کن حالات شروع ہو جائے اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو بحالتِ مجبوری بغیر قربانی کے حلال ہونا درست ہے، جیسا کہ امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔

ملاحظہ ہو زبدۃ المناسک میں ہے:

دوسری ضرورت یہ پیش آئے کہ ہدی نہیں ملتی بسببِ عجز مسکینی کے مثلاً جدہ یا کامران وغیرہ سے حکام نے جہازوں کو روکدیا بلکہ واپس کردیا تو اغنیاء وہاں جہاز ہی میں سے اگر مل سکا تو جانور لے کر ذبح کر سکتے ہیں یا واپس ہو کر وطن وغیرہ میں کرلیں گے، مگر مساکین کس طرح کریں تو اس کا حیلہ یہ لکھتے ہیں کہ جب حج کرنے کو جانا ہو تو احرام باندھنے کے وقت یہ شرط کرلے کہ اگر میں محصر ہو جاؤں تو حلال ہو جاؤں گا (اس کو اشتراط الاحلال عندالاحرام کہتے ہیں) تو محصر ہونے کے وقت بغیر ذبح کرنے ہدی کے بھی حلال ہونا جائز لکھتے ہیں، لیکن مشہور مذہب وہی ہے کہ بغیر ذبح کرنے کے حلال نہ ہوگا اور اشتراط کو معتبر نہیں سمجھا گیا لیکن کرمانی اور سروجی نے امام محمدؒ سے روایت کی ہے کہ اگر یہ شرط احلال کی احرام کے وقت ہو اور محصر ہوا تو جائز ہے حلال ہونا بغیر ہدی کے اور کیونکہ اب اس زمانہ میں بہت ہی انقلاب ہو رہا ہے اگر کہیں جنگ وغیرہ شروع ہو جانے کی وجہ سے ایسی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں تو ناچاری میں گنجائش نکل سکتی ہے، مطلقاً احلال جائز نہیں ہے۔ (زبدۃ المناسک:۴۳۱۔۴۳۲)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ما لم يذبح لايحل وهو قول عامة العلماء سواء شرط عند الإحرام الإهلال بغير ذبح عند الإحصار أو لم يشترط، ويجب أن يواعد يوماً معلوماً يذبح عنه فيحل بعد الذبح ولايحل قبله. (الفتاوى الهندية:۱/ ۲۵۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ: ﴿ومن یعظم شعائر اللہ فإنها من تقوی القلوب﴾

وقال تعالیٰ: ﴿إن أول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکاً وهدی للعلمین، فیه آیات بینات مقام إبراهیم ومن دخله کان آمناً﴾

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

"إن الإیمان لیأرز إلی المدینة کما تأرز الحیة إلی جحرها"

(رواہ البخاری)

باب......﴿۷﴾

حرمین شریفین کے احکام کا بیان

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

إن إبراهیم حرم مکة فجعلها حراماً

وإني حرمت المدینة حراماً ما بین مأزمیها..."

(رواہ مسلم)

فصل اول

حرم مکی سے متعلق احکام

برکات وتجلیاتِ بیت اللہ شریف کا پس منظر:

سوال: کعبۃ اللہ کیا ہے؟ اور حجِ بیت اللہ کی برکات کیا ہیں؟

الجواب: اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا اس عالم میں عظیم ترین مرکز، بارگاہ قدس کے مرکز تجلیات کا نام بیت اللہ الحرام اور کعبۃ اللہ ہے، رحمتِ ازلیہ کا خزانہ، مغفرت ورحمت کا گہوارہ، اور روحانی سیر وسیاحت کرنے والوں کا ربانی مرکز ضیافت ہے، جہاں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیض اٹھاتا ہے، اس لیے ہر مستطیع شخص پر زندگی میں اس مقام اقدس کی حاضری کے لیے کم ازکم ایک مرتبہ کا حکم دیا گیا، صاحب استطاعت پر عمر میں ایک مرتبہ اس بارگاہ پر حاضری کا نام حج بیت اللہ ہے جو دینِ اسلام کا پانچواں رکن اور اہم ترین شعائر اللہ میں شمار ہوتا ہے، جس سے مرکز رحمت ومرکز تجلیات کے انوار وبرکات سے نورِ ایمانی میں مزید روشنی وجلا پیدا ہو اور رحمت ازلیہ کے جلووَں سے بہرہ نصیب ہو، اور اقطارِ عالم کے مسلمانوں کے لیے آہ وبکا سے سامان مغفرت کرنے والوں اور اخلاص وتوبہ وانابت الی اللہ والوں کا یہ عظیم الشان اجتماع طرح طرح کی برکات کا وسیلہ بنتا ہے، پھر قدم قدم پر شعائر اللہ کی تقدیس وتعظیم کے جلوے، مقربینِ بارگاہ کی یادگاریں، کہیں حجر اسود کی نورانیت کا جلوہ، کہیں مقام ابراہیم کی مقناطیسی کشش، کہیں صفا مروہ کے انوار وبرکات، کہیں وادی عرفات کی تجلیات، کہیں مزدلفہ ومنی کے انوار، غرض قدم قدم پر مغفرت ورحمت کے وعدے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج مادیت کے پرآشوب دور کے باوجود سبھی ہزاروں دلوں میں حج بیت اللہ کی صحیح تڑپ موجود ہے کہ ذرا بھی جس قلب میں ایمان کا نور موجود ہے حج

بیت اللہ کے لیے بیتاب ہے، ظاہر ہے کہ اصلی مقصد تو ان عبادات سے رضاء الٰہی سامانِ آخرت کی تدبیر، اور آخرت کی نعمتوں کا استحقاق ہے لیکن شریعتِ مقدسہ اسلامیہ کی یہ جامعیت ہے کہ دینی منافع کے ساتھ ساتھ دنیوی منافع بھی وابستہ کردئے گئے، دنیائے اسلام کے بہترین دماغ، فکر وسیاست کے ماہرین، اربابِ صلاح وتقوی، اربابِ بیعت وارشاد، علماء ومحدثین غرض ہر طبقہ اور ہر مزاج کے لوگ پھر عوام وخواص ارباب دولت وارباب طاقت سب ہی کے عظیم ترین اجتماع کا جس کی نظیر عالم میں کہیں نہیں ملتی، کس قدر عجیب انتظام ہے، ہر ذوق اور ہر مکتبِ فکر کا شخص اپنی اپنی حاجت وغایت کی تسکین کا سامان کرسکتا ہے، اتحادِ عالمِ اسلامی کے روح پرور مناظر مشکلاتِ عالم اسلامی کی تشفی انگیز تجاویز اور تعلیم وتربیت اور افادہ واستفادہ کے لیے ایسے قابل غنیمت مواقع کہاں میسر آسکتے ہیں، بہر حال تجارت واقتصاد کی تنظیمات ہوں یا علم ومعرفت کے خزانے، ارادت وسیاست کے مسائل ہوں یا اتحادِ عالم کے خواب سب ہی کی تکمیل کا سامان یہاں موجود ہوتا ہے قرآنِ کریم کے دو لفظوں میں یہ سب کچھ آگیا ہے۔(۱) **وإذ جعلنا البيت مثابةً للناس وأمناً.** (البقرة ع ۱۵) اور جب مقرر کیا ہم نے خانۂ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی۔(ترجمہ شیخ الہندؒ)(۲) **ليشهدوا منافع لهم.** (الحج ع ۴) تاکہ پہنچیں اپنے فائدہ کی جگہوں پر۔(ایضاً).

قرآنِ کریم کی آیاتِ کریمہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ قیامِ عالم اور بقاءِ کائنات کا ذریعہ ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کا یہ گھر دنیا میں باقی رہیگا دنیا قائم رہے گی اور جس وقت اللہ تعالیٰ شانہ اس دنیا کو ختم کرنے کا ارادہ فرمائے گا اس کعبہ کو ویران کردیا جائیگا گویا کعبہ اور بیت اللہ میں بقاءِ عالم کا راز ہے یہ مرکزِ عالم ہے اور اس مرکز کے ختم ہونے کے بعد فناءِ عالم کا سلسلہ شروع ہوجائیگا۔ پھر جس طرح عالم کی ظاہری بقاء کا راز بیت اللہ الحرام کے بقاء میں ہے ٹھیک اسی طرح روحانی ہدایتِ ربانی کا سلسلہ بھی اسی بیت اللہ سے قائم ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسمانی ہدایت وانوار کا فیضان بارگاہِ عرش عظیم سے اس بیت عظیم پر ہوتا ہے اور عالم میں اسی بیت کو منبعِ ہدایت وچشمۂ ارشاد بنایا گیا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿**إن أول بيت وضع للناس للذى ببكة مباركاً وهدىً للعالمين**﴾ (آل عمران ع ۱۰) **بیشک سب سے پہلا گھر** جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور ہدایت جہاں کے لوگوں کو (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

بیت المعمور جو ساتویں آسمان پر طواف گاہِ ملائک ہے اسی کے بالمقابل اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل ہی سے زمین پر اس مقام کو مرکز تجلیات بنایا اور تاریخ انسانی کے ادوار میں بیت اللہ کی تعمیر ہوتی رہی، ملائکہ کرام، انبیاء عظام اور مقربینِ بارگاہ کے طوافوں، نمازوں، دعاؤں اور نالہائے عشق ومحبت نے اس کو ایسا ''بقعہ نور'' بنادیا کہ

عقل حیران ہے، یہی وجہ ہے کہ عشاق کو نہ طواف سے سیری ہوتی ہے اور نہ دیدار سے۔ (دیکھنا اس کا عبادت ہے)۔ اور ”بیت اللہ“ کی یہی معنویت ہے جس کی وجہ سے اسے نمازوں اور نمازیوں کا قبلہ بنا کر مزید بارگاہِ قدس کی تجلیات کا نقطہ و مرکز بنایا گیا، اہل بصیرت جانتے ہیں کہ جہاں کوئی ایک صالح اور مقربِ بارگاہ جلوہ افروز ہوتا ہے وہاں رحمتِ خداوندی اور انوارِ الٰہی متوجہ ہوتے ہیں، پس جہاں فرشتوں، رسل، وانبیاء اور مقربینِ بارگاہ کی دعوات وعبادات وتسبیحات وتجلیات کا مرکز ہو اس کی برکات کا کیا ٹھکانا، حق تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ کے امیدوار اپنے گناہوں سے توبہ کر کے جہاں عالم کے گوشہ گوشہ سے جمع ہو کر والہانہ انداز میں کبھی آہ وبکا اور گریہ وزاری میں مشغول ہوتے اور کبھی سربسجود ہوتے ہیں ایسے مقام اقدس کی برکتوں کا کیا کہنا، جس مقام مقدس پر احادیثِ نبویہ کے مطابق ایک سوبیس رحمتیں روزانہ نازل ہوتی ہیں ۶۰ طائفین کے لیے ۴۰ نمازیوں کے لیے ۲۰ زائریں و دیدار کرنے والوں کے لیے اس کی مقناطیسی کشش کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور جو سعید روحیں تینوں قسم کی عبادتوں سے سرشاد ہوں ان کی سعادتوں کا کیا کہنا۔ (اقتباسات از ماہنامہ ”بینات“ محرم الحرام ۱۳۸۷ھ از حضرت مولانا محمد یوسف بنوری قدس سرہ).

حق تعالیٰ کی توجہ کعبہ کی طرف زیادہ ہے، سو جس کی آنکھیں ہیں وہ جانتے ہیں دیکھتے ہیں کہ واقعی کعبہ پر تجلیات الٰہی بہت زیادہ ہیں، توجہ سے یہی مراد ہے اور وہی تجلیات روحِ کعبہ اور حقیقتِ کعبہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ کعبۂ ظاہری کی چھت پر بھی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت گو صورتِ کعبہ سامنے نہیں مگر حقیقتِ کعبہ یعنی تجلی تو سامنے ہے۔

مسلمان دراصل تجلی الٰہی کا استقبال کرتے ہیں، کعبہ کی دیواروں کا استقبال نہیں کرتے، مگر چونکہ تجلی الٰہی کا احساس ہر شخص کو نہیں ہوتا اس لیے حق تعالیٰ نے اس خاص بقعہ کی حد مقرر فرمادی جس پر ان کی تجلی دوسرے مکانوں سے زیادہ ہے، پس یہ عمارت محض اس تجلی اعظم کی جگہ دریافت کرنے کے لیے ہے ورنہ خود عمارت مقصود بالذات نہیں، چنانچہ انہدام عمارت کے بعد نماز کا موقوف نہ ہونا اور کعبہ کی چھت پر نماز کا درست ہونا اس کی دلیل ہے، فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے اسی لیے وہ فرماتے ہیں کہ قبلہ وہ ہے جو کعبہ کی محاذات میں آسمان تک اور اس سے نیچے زمین کے اسفل طبقات تک ہے۔

عمارتِ کعبہ کو اور اس جگہ کو تجلی الٰہی سے تلبس ہے اس تلبس کی وجہ سے اس میں بھی برکت آگئی ہے، یہی تجلی اہل لطائف کے نزدیک معنی ہیں ﴿الرحمن علی العرش استوی﴾ کے یعنی عرش پر تجلی رحمانیت ہوتی ہے، یہ معنی ہرگز نہیں کہ عرش پر خدا تعالیٰ بیٹھے ہیں، عرش حق تعالیٰ کا مکان نہیں ہوسکتا کیونکہ عرش محدود ہے اور

ذاتِ خداوندی غیر محدود ہے، محدود کسی طرح غیر محدود کا مکان نہیں ہوسکتا، بس ''استوی علی العرش'' کے معنی وہی ہیں کہ حق تعالیٰ کی تجلی صفت رحمانیت کے اعتبار سے اس پر ہوتی ہے اس واسطے ﴿الرحمن علی العرش استوی﴾ فرمایا'' اللہ علی العرش استوی'' نہیں فرمایا کیونکہ اللہ علم ذات ہے اور رحمٰن اسم صفت ہے اس سے معلوم ہوگیا کہ عرش محلِ ذات نہیں بلکہ مظہر صفت رحت ہے کہ وہاں تجلی رحمت اور مکانات سے زیادہ ہے، یہ استقبالِ قبلہ کا راز ہے۔ (اقتباسات از'' محاسن اسلام'' ص ۱۶ از حضرت حکیم الامت قدس سرہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایک لاکھ کا ثواب پورے حرم شریف میں ملنے کا حکم:

سوال: ایک لاکھ کا ثواب صرف مسجد حرام کے ساتھ خاص ہے یا پورے حرم میں ہے؟

الجواب: بہتر یہ ہے کہ مسجد حرام کا اہتمام کیا جائے، لیکن اگر مشکل ہو تو مکہ مکرمہ میں کسی بھی جگہ تضعیف کی امید رکھنا چاہئے، اگر چہ روایاتِ صحیحہ میں مسجد حرام کا لفظ ہے، اور مسجد حرام بیت اللہ کے اردگرد احاطہ کو کہتے ہیں، پورے مکہ مکرمہ پر مسجد حرام کا اطلاق نہیں کیا جاتا، نیز اس میں مسجد حرام کی خصوصی شان کا اظہار ہے، خصوصاً عصر حاضر میں ہوٹلوں میں نماز پڑھنے والوں کے لیے تنبیہ بھی ہے، ہاں مطلق حسنات میں تضعیفِ اجر پورے حرم شریف میں ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایات سے ثابت ہے اگر چہ روایات ضعیف ہیں۔

ملاحظہ ہو حضرت شیخ اوجز المسالک میں فرماتے ہیں:

السادس: ۔ أن التضعيف يختص بنفس المسجد الحرام أو يعم جميع مكة من المنازل والشعاب وغير ذلك أم يعم جميع الحرم الذي يحرم صيده قال العيني فيه خلاف والصحيح عند الشافعية أنهم يعم جميع مكة وصحح النووي أنه جميع الحرم.

قال القاريّ اختلفوا في محل هذه المضاعفة على أربعة أقوال: ۔ الأول: الحرم، والثاني: مسجد الجماعة، وهو ظاهر كلام أصحابنا، واختاره بعض الشافعية، والثالث: أنه مكة، والرابع: أنه الكعبة، وهو أبعدها. (أوجز المسالك ۴/۲۰۲ جديد، باب ما جاء في مسجد النبوي، دار القلم دمشق۔ وكذا في فتح الملهم بشرح صحيح مسلم: ۳/۴۱۶).

علامہ شامی فرماتے ہیں:

واختلف في المراد بالمسجد الحرام قيل مسجد الجماعة، وأيده المحب الطبري،

وقيل الحرم كله، وقيل الكعبة خاصة، وجاء ت أحاديث تدل على تفضيل ثواب الصوم وغيره من القربات بمكة، إلا أنها في الثبوت ليست كأحاديث الصلاة فيها، وذكر البيري في شرح الأشباه في أحكام المسجد: أن المشهور عند أصحابنا أن التصعيف يعم جميع مكة بل جميع حرم مكة الذي يحرم صيده كما صححه النووي. (الشامی: ۲/۵۲۵،سعید).

غنیۃ الناسک میں ہے:

واختلف في المراد بالمسجد الحرام الذي فيه المضاعفة فقيل: مسجد الجماعة حول الكعبة، وقيل: الحرم كله والأول مذهب الإمام مالك رضي الله تعالى عنه وجزم به النووي في المجموع والتهذيب، وقال الأسنوي: أنه الظاهر واختاره ابن حجر في التحفة وصححه وأيده المحب الطبري بأن الإشارة في المستثنى منه إلى مسجد الجماعة فليكن المستثنى كذلك، قال في الكبير هو ظاهر مذهب أصحابنا. كما يؤخذ من تخصيص المضاعفة بالفرائض، ومن قول ابن الهمام في صلاة الظهر يوم النحر أنها في المسجد الحرام أولى لثبوت مضاعفة الفرائض فيه وبعكسه قال ابن حجر: هي بمنى أفضل منها بالمسجد الحرام وإن فاتته مضاعفته على الأصح، وكذا يؤخذ من فرع ذكره في شرح المنية قال: وإن فاتته الجماعة في مسجد حية فإن أتى مسجد آخريدركها فيه فهو أفضل إلا في المسجد الحرام، ومسجد النبي صلى الله عليه وسلم، كذا في مختصر البحر. فما في رد المحتار: وذكر البيري في شرح الأشباه أن المشهور عند أصحابنا أن التضعيف يعم جميع مكة بل جميع حرمها الذي يحرم صيده، كما صححه النووي، ليس كما ينبغي نعم مضاعفة الحسنة مطلقاً بمائة ألف تعم الحرم كله لحديث وإن لم يكن في الثبوت كأحاديث مضاعفة الصلاة في المسجد الحرام. (غنية الناسك في بغية المناسك، ص۷۶، مطلب في مضاعفة الصلاة في المسجد الحرام).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ مسجد حرام میں کئی گنا ثواب ہوتا ہے جو روایت میں وارد ہوا ہے ان میں مسجد حرام سے کیا مراد ہیں اور اس بارے میں چار قول ہیں:

(۱) یہ کہ اس سے مراد کعبۂ معظّمہ (بیت اللہ شریف) ہے۔ اس قول کی بنا پر مقام حطیم اس میں داخل ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ بعض علماء نے کہا ہے اس سے مراد مسجد جماعت ہے خواہ وہ حصہ ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد تھا یا زیادہ حصہ ہو جو بعد میں ابتک اضافہ ہوتا رہا ہے اور علماء حنفیہ کے نزدیک یہی ظاہر ہے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شہر مکہ مکرمہ کی تمام سرزمین ہے اگرچہ وہ مسجد حرام سے باہر ہو اور (۴) چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام حدودِ حرم کی تمام سرزمین ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۴/۶۶۳، مجددیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حرم شریف میں نماز باجماعت کی تضعیفِ اجر کا حکم:

سوال: حرم مکی میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ ہے تو جماعت کے ساتھ ۲۵۔۲۷ ہوگا یا ایک لاکھ ہوگا؟

الجواب: تضعیف کا ایک مطلب وہی ہے جو سوال میں مذکور ہے یعنی ۲۵ یا ۲۷ لاکھ اور تضعیف کا دوسرا مطلب حضرت شیخ زکریاؒ نے (فضائل نماز: باب دوم ص ۳۴۷) یہ بیان کیا کہ ۲۵ کے عدد تک ضرب کے ساتھ تضعیف کرتے رہیں تو جماعت کی ایک نماز تین کروڑ پینتیس لاکھ چون ہزار چار سو بتیس ہو جائیگی، پھر اس عدد کو ایک لاکھ میں ضرب دیدیں تو اس کا حاصل ضرب حرم مکی کا ثواب ہوگا، اور ایک ہزار میں ضرب دیں تو اس کا حاصل حرم مدنی اور بیت المقدس کی مسجد کی جماعت کا ثواب ہوگا ۲۵ کے عدد کی تضعیف کا نقشہ درجِ ذیل ہے خوب سمجھ لیجئے۔

۱	۱	۲x	۲=
۲	۲	۲x	۴=
۳	۴	۲x	۸=
۴	۸	۲x	۱۶=
۵	۱۶	۲x	۳۲=
۶	۳۲	۲x	۶۴=
۷	۶۴	۲x	۱۲۸=
۸	۱۲۸	۲x	۲۵۶=

۹	۲۵۶	۲x	۵۱۲=
۱۰	۵۱۲	۲x	۱۰۲۴=
۱۱	۱۰۲۴	۲x	۲۰۴۸=
۱۲	۲۰۴۸	۲x	۴۰۹۶=
۱۳	۴۰۹۶	۲x	۸۱۹۲=
۱۴	۸۱۹۲	۲x	۱۶۳۸۴=
۱۵	۱۶۳۸۴	۲x	۳۲۷۶۸=
۱۶	۳۲۷۶۸	۲x	۶۵۵۳۶=
۱۷	۶۵۵۳۶	۲x	۱۳۱۰۷۲=
۱۸	۱۳۱۰۷۲	۲x	۲۶۲۱۴۴=
۱۹	۲۶۲۱۴۴	۲x	۵۲۴۲۸۸=
۲۰	۵۲۴۲۸۸	۲x	۱۰۴۸۵۷۶=
۲۱	۱۰۴۸۵۷۶	۲x	۲۰۹۷۱۵۲=
۲۲	۲۰۹۷۱۵۲	۲x	۴۱۹۴۳۰۴=
۲۳	۴۱۹۴۳۰۴	۲x	۸۳۸۸۶۰۸=
۲۴	۸۳۸۸۶۰۸	۲x	۱۶۷۷۷۲۱۶=
۲۵	۱۶۷۷۷۲۱۶	۲x	۳۳۵۵۴۴۳۲=
مجموعہ	۳۳۵۵۴۴۳۲		

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حرم شریف میں تضعیفِ اجر تمام طاعات سے متعلق ہے:

سوال: اگر کسی شخص نے حرم شریف میں یا پورے حرم میں زکوٰۃ ادا کی تو کیا اس کو بھی ایک لاکھ کا ثواب ملے گا یا یہ زیادتی صرف نماز کے ساتھ خاص ہے؟

الجواب: حرم شریف میں ثواب کی زیادتی تمام طاعات سے متعلق ہے، یعنی حرم شریف میں کسی بھی قسم کی عبادت یا نیکی کا کام کیا جائے اس کا ثواب بڑھ جاتا ہے، بعض احادیث وآثار اور اقوال فقہاء میں اس کے دلائل موجود ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں مستدرک حاکم میں ہے:

مرض ابن عباس رضي الله عنه مرضاً شديداً، فدعا ولده فجمعهم، فقال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من حج من مكة ماشياً حتى يرجع إلى مكة كتب الله له بكل خطوة سبع مائة حسنة كل حسنة مثل حسنات الحرم، قيل: وماحسنات الحرم؟ قال: بكل حسنة مائة ألف حسنة. (المستدرك على الصحيحين:١/٦٠٦).

وعلى هامشه: قال: إسناده ضعيف. قال الذهبي: ليس بصحيح أخشى أن يكون كذباً، قال أبوحاتم في عيسى بن سورة: منكر الحديث. (حاشية المستدرك لصالح اللحام:١/٦٠٦، دارابن حزم).

شعب الایمان میں ہے:

عن جابربن عبد الله رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلاة في مسجدي هذا أفضل من ألف صلاة فيما سواه إلا المسجد الحرام، والجمعة في مسجدي هذا أفضل من ألف جمعة فيما سواه إلا المسجد الحرام، وشهر رمضان في مسجدي هذا أفضل من ألف شهر رمضان فيما سواه إلا المسجد الحرام. (الجامع لشعب الايمان للبيهقي:٨/٨٦، الدار السلفية).

قال المختار أحمد الندوي في تحقيق هذا الحديث: في إسناده من لم نعرفه، أبوالحسن محمد بن رافع بن إسحٰق الخزاعي، لم نعرفه من ترجم له. (تعليق المختاراحمدالندوی علی شعب الايمان للبيهقي:٨/٨٦).

وكذا ذكره الحافظ المنذري هذا الحديث في الترغيب والترهيب:(٢/٢١٧، بيروت).

وقال المحقق مصطفى محمد عمارة في شرح هذا الحديث: ثم استثنى صلى الله عليه وسلم مسجد مكة البيت الحرام، لفضله عند الله وعظيم درجته، وكثرة ثواب العبادة فيه. (حاشية الترغيب والترهيب:٢/٢١٣).

جامع الاحادیث للسیوطی میں ہے:

قال النبي صلى الله عليه وسلم: رمضان بمكة أفضل من ألف رمضان بغيرمكة. البزارعن ابن عمرؓ۔ (جامع الاحادیث للسیوطی:٤/٤٢٨/١٢٥٨٩،دارالفکر).

قال الشيخ الألباني: في سنده عاصم بن عمرالعمري، ضعيف،بل قال ابن حبان: منكر الحديث جداً، يروي عن الثقات مالايشبته حديث الإثبات،٢/٢٣٠، وتفرد به عاصم بن عمر، لانعلمه عن النبي صلى الله عليه وسلم إلا من هذا الوجه، وعاصم متفق على ضعفه. (سلسلة الضعيفة والموضوعة:٢/٢٣٢).

وكذا ذكره ابن كثير في جامع المسانيد والسنن:٢٨/٧٨٢٧،دارالفكر۔والهيثمي:في مجمع الزوائد:٣/١٤٥، دارالفكر).

مصنف عبدالرزاق میں ہے:

عن مجاهد يقول: رأيت عبد الله بن عمرو بن العاص ؓ بعرفة، ومنزله في الحل ومصلاه في الحرم، فقيل له: لم تفعل هذا ؟ فقال: لأن العمل فيه أفضل، والخطيئة أعظم فيه. (مصنف عبدالرزاق:٥/٢٨،المجلس العلمی۔وکذا فی الدرالمنثور:٦/٢٩،دارالفکر).

درمنثور میں ہے:

عن مجاهد قال: تضاعف السيئات بمكة كما تضاعف الحسنات.

(الدرالمنثور:٦/٢٩،دارالفکر).

وأخرج الأزرقي والجندي والبيهقي في الشعب وضعفه عن ابن عباس ؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أدركه شهر رمضان بمكة فصامه كله وقام منه ما تيسر كتب الله له مائة ألف شهر رمضان بغير مكة... (الدرالمنثور:٢/٢٦٨،سورۃ آل عمران،دارالفکر۔وکذا ذکره الازرقی فی تاریخ مکة :٢/٣٩٤، ریاض).

فتاویٰ الشامی میں ہے:

وجاء ت أحاديث تدل على تفضيل ثواب الصوم وغيره من القربات بمكة إلا أنها في الثبوت ليست كأحاديث الصلاة فيها. (الفتاوی الشامی:٢/٥٢٥،سعید).

قوله هذه المضاعفة خاصة بالفرض...وكيف لايحصل مضاعفة النافلة فيه مع أن

حسنات الحرم كل حسنة بمائة ألف حسنة ، كماقال ابن عباس رضي الله عنه كما نقله السغدي عن الحموي عن ابن العماد وصلاة النافلة في حرم مكة لا تخرج عن كونها حسنة . (التحرير المختار مع الشامی:۱/۸٦،سعید).

غنیۃ الناسک میں ہے:

وهي لخصوصية المساجد الثلاثة، لا لخصوصية الصلاة فتلتحق بها فيها بقية القربات كالصوم والاعتكاف والصدقة والذكر والقراءة.(غنية الناسك :٧٦،ادارة القرآن).

شیخ محدث احمد علی سہارنپوری فرماتے ہیں:

ثم لا يخفى أن الحكم في غير الصلاة من العبادات كذلك في المضاعفة، وقد روى ذلك البيهقي عن جابر رضي الله عنه .(حاشية صحيح البخاری:۱/۱۵۹، رقم الحاشية: ۱۱، فيصل).

شرح لباب المناسک میں ہے:

ويستحب أن يصوم ما أمكنه أيام مقامه بالحرمين أي لتضاعف الحسنة في حرم مكة، وكذا في حرم المدينة، وإن لم يرد بها المضاعفة الكمية، لكن لا يخلوعن المضاعفة الكيفية . (شرح لباب المناسك :۵۸۵،فصل ويستحب ان يصوم...،بيروت)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

طوافِ بیت اللہ اور صفا مروہ کی سعی کی حکمت:

سوال: میں حج میں شریک تھا ایک صاحب جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے دریافت کرنے لگے کہ کعبہ کے طواف اور صفا مروہ کی سعی میں کیا حکمت ہے ایسے لوگوں کو کیا جواب دینا چاہئے؟

الجواب: انبیاء علیہم السلام خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف اور سعی فرمائی، ان کی اقتداء اور مشابہت بہت بڑی سعادت ہے، انوار اور فیوضات کے حصول کا ذریعہ ہے لوگ دنیا میں مشہور کھلاڑیوں کی مشابہت حاصل کر کے فخر کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں، کیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مشابہت اور اتباع برکات کے حصول کا ذریعہ نہیں ہوگی؟ یقیناً ہوگی۔ آیتِ کریمہ: ﴿ **ومن يطع الرسول فقد أطاع الله**﴾.(سورة النساء) اور حدیث شریف: "**من تشبه بقوم فهو منهم**". (أبو داود). ہمارے سامنے ہونا چاہئے، نیز بیت اللہ شریف اللہ تعالیٰ کا گھر اور دین کی علامت ہے، اس کے چکروں میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ زمین اور دنیا گول ہے، یعنی میں دین کو پھیلانے کے لیے اور دین کا سکہ جمانے کے لیے پوری زمین کا چکر لگانے کا عہد

کرتا ہوں۔﴿ وما أرسلناک إلا کافة للناس بشیراً ونذیراً ﴾ کوسامنے رکھتے ہوئے دین کا ڈنکا بجاتا رہوں گا۔اور صفامروہ کی سعی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی طلبِ رزق کی یادگار ہے۔جس میں اشارہ ہے کہ طلبِ رزق کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہوں گا،لیکن اس میں طواف کی طرح گولائی نہیں اس لیے رزق کی طلب میں زیادہ محنت اور پوری دنیا چھان مارنے کی ضرورت نہیں،ہاں دین کے لیے محنت پوری زمین پر محیط ہونا چاہئے،یادرہے کہ سعی دینی فعل بھی ہے جو باعثِ اجروثواب ہے اور واجب ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

آبِ زمزم اپنے گھر پر کھڑے ہوکر پینے کا حکم:

سوال: آبِ زمزم اگر اپنے گھر میں پینا چاہے تو کھڑے ہوکر پینا چاہئے یا بیٹھ کر پینا بہتر ہے؟

الجواب: آبِ مزم کھڑے ہوکر پینا اور بیٹھ کر پینا دونوں بلاکراہت جائز ہے،لیکن کھڑے ہوکر پینا اولیٰ وبہتر ہے۔

ملاحظہ ہو نورالایضاح میں ہے:

وشرب ماء زمزم والتضلع منه واستقبال البيت والنظر إليه قائماً. (نورالایضاح:ص ۱۷۱).

اعلاءالسنن میں ہے:

واستحب علماؤنا أن يشرب ماء زمزم قائماً ويشير إليه ما في حديث ابن عباس رضي اللّٰه تعالىٰ عنهما آية ما بيننا و بين المنافقين أنهم لايتضلعون من زمزم والتضلع لايتأتى إلا قائماً وأخرج البخاري عن الشعبي أن ابن عباس رضي اللّٰه تعالىٰ عنهما حدثه قال: سقيت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من زمزم فشرب وهوقائم. (اعلاء السنن: ۱۰/۲۱۳،ادارة القرآن).

مرقات المفاتیح میں ہے:

فإنه مخصص بماء زمزم وشرب فضل الوضوء، كما ذكره بعض علمائنا، وجعلوا القيام فيهما مستحباً وكرهوه في غيرهما، إلا إذاكان ضرورة، ولعل وجه تخصيصهما أن المطلوب في ماء زمزم التضلع ووصول بركته إلى جميع الأعضاء، وكذا فضل الوضوء مع إفادة الجمع بين طهارة الظاهر والباطن وكلاهماحال القيام أعم وبالنفع أتم. (مرقات المفاتیح: ۸/۲۱۸، ملتان).

خصائل نبوی میں ہے:

بعض علماء نے زمزم پینے کو بھی اس ممانعت میں داخل فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نوش فرمانے کو ازدحام کے عذر یا بیان جواز پر حمل فرمایا ہے، لیکن علماء کا مشہور قول یہ ہے کہ زمزم اس نہی میں داخل نہیں اس کا کھڑے ہوکر پینا افضل ہے۔ (خصائل نبوی:۱۴۸، دارالاشاعت).

شامی میں ہے:

لكن قال في المعراج قائماً وخيره الحلواني بين القيام والقعود وفي الفتح وإن شاء قاعداً وأقره في البحر.

اس کے بعد فرماتے ہیں: **وفي السراج ولا يستحب الشرب قائماً إلا في هذين الموضعين أي فضل الوضوء وزمزم**. (فتاوی الشامی:۱/۱۲۹، سعید).

ہاں علامہ شامی کی رائے یہ ہے: **والحاصل أن انتفاء الكراهة في هذين الموضعين محل كلام فضلاً عن استحباب القيام فيهما**. (فتاوی الشامی:۱/۱۳۰، سعید).

علامہ رافعیؒ نے علامہ شامیؒ کے اباحت والے اس قول کو رد فرمایا ہے، اور یہ دیگر کتبِ فقہ کے موافق ہے۔

ملاحظہ ہو تقریرات الرافعی میں ہے:

(قوله أفاد أن المقصود من قوله قائماً عدم الكراهة) فيه أن صريح كلام المصنفؒ أن الشرب قائماً مستحب لأنه في صدد عد المستحبات، لا في بيان عدم الكراهة. (تقريرات الرافعي:۱/۱۸، كتاب الطهارة، سعيد).

عام طور پر زمزم کے آداب ذکر کیے جاتے ہیں وہ حج کے موقعہ اور حرم میں حاضری کے وقت سے متعلق ہیں، لیکن احادیث میں جو ماءِ زمزم کے فضائل مذکور ہیں وہ مطلق ہیں۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خير ماء على وجه الأرض ماء زمزم فيه طعام طعم وشفاء سقم... الحديث، رواه الطبراني في الكبير ورواته ثقات، ورواه ابن حبان أيضاً. وعن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ماء زمزم لما شرب له ... الخ. رواه الدارقطني وابن ماجه ومثله في مسند أحمد. (فتح القدير:۲/۵۰۵-۵۰۷، دارالفكر).

نیز جوآداب حرم میں ملحوظ ہوتے ہیں ان کی رعایت غیر حرم میں بھی مناسب ہے۔

ملاحظہ ہو کتاب الفتاوی میں ہے:

چونکہ زمزم کی عظمت کا پہلو کچھ حج ہی سے متعلق نہیں بلکہ ہر وقت اور ہر جگہ ہے اس لیے یہ سمجھنا درست نہیں کہ حج کے موقعہ سے زمزم پینے کے احکام الگ ہیں اور عام حالات میں الگ۔ (کتاب الفتاوی:۴/۸۲).

زبدۃ المناسک میں زمزم پینے کی ترتیب کے تحت مذکور ہے:

کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور داہنے ہاتھ میں لیکر پیئے اور بائیں ہاتھ سے پینا مکروہ ہے اور تین سانس میں پیئے اور ہر دفع کے شروع میں بسم اللہ کہے اور سانس لینے میں الحمد للہ کہنا مستحب ہے۔ (زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک:ص۱۳۷)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

آبِ زمزم گھر لانے کا حکم:

سوال: زمزم کا پانی گھر لانے کا ثبوت احادیث وآثار میں ہے یا نہیں؟

الجواب: زمزم کا پانی گھر لانے کا ثبوت احادیث وآثار میں ملتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ترمذی شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها أنها كانت تحمل من ماء زمزم وتخبر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يحمله .قال أبوعيسىٰ : هذا حديث حسن غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه. (جامع الترمذی:۱/۱۹۰، کتاب الحج).

قال الدكتور بشار عواد: هو حديث ضعيف، فقد قال البخاري: لايتابع عليه، وخلاد لايعرف بتوثيق، وقد ساق له الذهبي في "الميزان" حديثاً آخر من مناكيره، وقوله "حسن غريب" هكذا في التحفة وأكثرالنسخ التي بين أيدينا، وفي تهذيب الكمال "غريب" فقط وقد استظهرت عليه عدد من النسخ الخطية ، ولعل الصواب ما أثبتناه، وهوالذي نقله الذهبي في "الميزان" والشوكاني في "نيل الأوطار" وغيرهما. (جامع الترمذی بتحقیق الدکتور بشارعواد:۳/۲۸٤/۹٦۳).

وقال الشيخ الألباني: صحيح . (جامع الترمذی بتحقیق الشیخ الالبانی : ۳/۲۹٥/۹٦۳، وصحیح وضعیف سنن الترمذی للشیخ الالبانی:۲/٤٦۳/۹٦۳).

وقال ايضاً في " الصحيحة " (۸۸۳/۵۷۲/۲) : خلاد بن يزيد الجعفي هذا وهوثقة كما قال ابن حبان، فإنه روى عنه جماعة وقال: ربما أخطأ، وقال الحافظ في " التقريب ":صدوق ربما وهم.

وله شاهد من طريق أبي الزبيرقال: كنا عند جابر بن عبد الله ،فتحدثنا، فحضرت صلاة العصر فقام ،فصلى بنا في ثوب واحد قد تلبب به، ورداؤه موضوع، ثم أتي بماء زمزم فشرب، ثم شرب، فقالوا: ما هذا ؟ قال: هذا ماء زمزم، قال فيه رسول الله صلى الله عليه وسلم:" ماء زمزم لما شرب له " قال: ثم أرسل النبي صلى الله عليه وسلم وهو بالمدينة ، قبل أن تفتح مكة، إلى سهيل بن عمرو رضي الله تعالىٰ عنه: أن أهد لنا من ماء زمزم، ولا يترك، قال: فبعث إليه بمزادتين.

قلت: وإسناده جيد، رجاله كلهم ثقات.

واستهداؤه صلى الله عليه وسلم للماء من سهيل له شاهد من حديث ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما أخرجه البيهقي، انتهىٰ.

معارف السنن میں ہے:

والحديث هذا دل على جواز حمل ماء زمزم وأنه صلى الله عليه وسلم كان يحمله، فإذن هوسنة مطلوبة ، وقد أخرج الطبري في " القرى" عدة روايات من رواية الأزرقي وأبي موسى المديني والواقدي ما ملخصه: أنه صلى الله عليه وسلم بعث إلى سهيل بن عمرورضي الله تعالىٰ عنه يستهديه من ماء زمزم فبعث إليه براويتين، وجعل عليهما كراً غوطياً." والكر" جنس من ثياب غلاظ. وعن عطاء :" أن كعب الأحبار كان يحمل معه من ماء زمزم ويتزوده إلى الشام"، أخرجه الطبري عن الواقدي.(معارف السنن:٤٢٧/٦،سعيد).

مصنف عبدالرزاق میں ہے:

عن ابن جريج قال: حدثني ابن أبى حسين أن النبي صلى الله عليه وسلم كتب إلى سهيل بن عمرو رضي الله تعالىٰ عنه: ... إلى قوله فبعث بهما إلى النبي صلى الله عليه وسلم. (مصنف عبدالرزاق:١١٩/٥،باب حمل ماء زمزم،المجلس العلمی).

مجمع الزوائد میں ہے:

عن حبيب بن أبي ثابت قال: سألت عطاء أحمل ماء زمزم فقال: قد حمله رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وحمله الحسن رضي اللّٰه تعالىٰ عنه وحمله الحسين رضي اللّٰه تعالىٰ عنه. (مجمع الزوائد:۲۸۷/۳،باب في زمزم،دارالفكر).

وفي الشامي: و يستحب حمله إلى البلاد، فقد روى الترمذي عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها... وفي غير الترمذي أنه كان يحمله وكان يصبه على المرضى ويسقيهم وأنه حنك به الحسن رضي اللّٰه تعالىٰ عنه والحسين رضي اللّٰه تعالىٰ عنه، من اللباب وشرحه. (فتاوى الشامي :۶۲۵/۲،سعيد)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

خانۂ کعبہ کے غلاف کے ٹکڑے کو خریدنے کا حکم:

سوال: خانۂ کعبہ کے غلاف کے ٹکڑے کو خریدنا جائز ہے یانہیں؟ اوراگر کسی ذمہ دار کی طرف سے مفت میں مل جائے تو لینا درست ہے یانہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ غلاف اگر بادشاہ یا حکومت کی طرف سے ہو تو حکومت جس کو دینا چاہے دے سکتی ہے، نیز اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت کو مسجد حرام اور بیت اللہ کے مصالح میں خرچ کر سکتے ہیں، اور اگر کسی فقیر کی ملک میں آیا تو وہ بھی فروخت کر سکتا ہے۔ اور اگر اوقاف کا مال ہو تو واقف کے شرائط کے موافق دیا جاسکتا ہے۔

شرح لباب میں ہے:

إذا صارت خلقاً إن شاء باعها وصرف ثمنها في مصالح البيت، وإن شاء ملكها لأحد أي ولو لواحد من المسلمين إذا كان من المساكين، وإن شاء فرقها على الفقراء أي جميع منهم سواء من أهل مكة وغيرهم، ويستوي بنوشيبة وخدمهم فيهم، ولا بأس بالشراء منهم ... إذا نقله الإمام للخدام أو لآخر من المسلمين، فجائز كما تقدم أن الأمر فيه إلى الإمام، وهو محمول على ما قدمناه من أن هذا إذا كانت الكسوة من عند الإمام، بخلاف ما إذا كانت من وقف، فإنه يراعى شرط واقفه في جميع الأحكام. (شرح اللباب :ص۵۴۵،فصل امر كسوة الكعبة زادها الله شرفاً وكرماً الى السلطان،بيروت).

ارشادالساری میں ہے:

قال العلامة قطب الدين الحنفي: والذي يظهر لي أن الكسوة إن كانت من قبل السلطان من بيت المال فأمرها راجع إليه يعطيها لمن شاء من الشيبيين أوغيرهم، وإن كانت من أوقاف السلاطين وغيرهم، فأمرها راجع إلى شرط الواقف فيها، فهي لمن عينها له، وإن جهل شرط الواقف فيها عمل بما جرت به العوائد السالفة كما هو الحكم في سائر الأوقاف، وكسوة الكعبة الشريفة الآن من أوقاف السلاطين، ولم يعلم شرط الواقف فيها وقد جرت عادة بني شيبة أنهم يأخذون لأنفسهم الكسوة العتيقة بعد وصول الكسوة الجديدة فيبقون على عادتهم فيها والله أعلم، اهـ. رد المحتار. أقول: وفي زماننا يصنع الكسوة من خزينة جلالة الملك المعظم عبد العزيز آل سعود حفظه الله تعالیٰ، وهو أمر بإعطاء الكسوة العتيقة لبني شيبة، فلا شك في جواز الشراء منهم، والله أعلم. (ارشاد الساری لحسین بن محمدسعید عبدالغنی المکی الحنفی:ص٥٤٥،فصل امر کسوۃ الکعبۃ زادھا اللہ شرفاً وکرماً الی السلطان،بیروت).

بخاری شریف کے حاشیہ میں ہے:

وقال ابن الصلاح: الأمر فيها إلى الإمام، يصرفه في مصارف بيت المال بيعاً وعطاءً، واحتج بما ذكره الأزرقي في أن عمر رضي الله تعالیٰ عنه كان ينزع كسوة الكعبة كل سنة فيقسمها على الحاج، وعند الأزرقي عن ابن عباس رضي الله تعالیٰ عنهما وعائشة رضي الله تعالیٰ عنها أنهما قالا: ولا بأس أن يلبس كسوتها من صارت إليه من حائض وجنب وغيرهما، انتهى. (بخاری شریف: ۲۱۷/۱، باب کسوۃ الکعبۃ رقم الحاشیۃ۵)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

فصل دوم

حرم مدنی، روضۂ مبارکہ کی زیارت اور توسل کے احکام

مدینہ منورہ کو یثرب کہنے کا حکم:

سوال: بعض شعراء اپنے اشعار میں مدینہ منورہ کو یثرب کہتے ہیں کیا ایسا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: مدینہ منورہ کا پرانا نام یثرب ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے اور زمانۂ ہجرت کے بعد اس کا نام مدینۃ الرسول ہو گیا، لفظِ یثرب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لیے پسند نہیں فرمایا، چونکہ یثرب کے معنی فساد کے ہے یا تثریب ملامت کرنے کو کہتے ہیں یا یثرب بن قانیہ کی طرف منسوب ہے جو ارم کی اولاد میں سے تھے حدیث میں آتا ہے۔ " من سمى المدينة يثرب فليستغفر الله "۔

ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں ہے:

سعيد بن يسار يقول: سمعت أبا هريرة رضي الله عنه يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " أمرت بقرية تأكل القرى يقولون: يثرب وهي المدينة، تنفي الناس كما ينفي الكير خبث الحديد ". سميت بيثرب بن قانية من ولد إرم بن سام بن نوح ؛ لأنه أول من نزل بها، حكاه أبو عبيد البكري. (عمدة القاري: ٧/٥٦٦، ومثله في فتح الباري: ٤/٨٨ كتاب فضائل المدينة)

"يقولون يثرب" أراد أن بعض المنافقين يقولون للمدينة: يثرب، يعني يسمونها بهذا الاسم، واسمها الذي يليق بها المدينة، وقد كره بعضهم من هذا تسمية المدينة يثرب... وروى أحمد من حديث البراء بن عازب رضي الله عنه رفعه: " من سمى المدينة

يشرب فليستغفر اللّٰه تعالى، هي طابة " وروى عمر بن شبة من حديث أبي أيوب " أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يحب الاسم الحسن ويكره الاسم القبيح". (عمدة القارى: ۵۷۶/۷-۵۷۷ ، ومثله فى فتح البارى : ۸۷/٤، كتاب الفضائل)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

تحقیقِ حدیث" من سمى المدينة يثرب فليستغفر اللّٰه "

سوال: حدیث " من سمى المدينة يثرب فليستغفر اللّٰه "اس کا کیا درجہ ہے؟

الجواب: روایتِ مذکورہ بالا کی سند میں ایک راوی یزید بن ابی زیاد ضعیف ہے،لیکن اس کی حدیث موضوع نہیں ، بلکہ شواہد کی وجہ سے حسن ہے۔

مسند احمد میں ہے ملاحظہ فرمائیں:

حدثنا عبد اللّٰه حدثني أبي ثنا إبراهيم بن مهدي قال: ثنا صالح بن عمر عن يزيد بن أبي زياد عن عبد الرحمن بن أبي ليلى عن البراء قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم:"من سمى المدينة يثرب فليستغفر اللّٰه عز وجل هي طابة ، هي طابة ". (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۲۸۵/٤).

قال شعيب الأرنؤوط في تعليقه على مسند الإمام أحمد:

إسناده ضعيف لضعف يزيد بن أبي زياد ولاضطرابه فيه. (تعليق شعيب الأرنؤوط:۲۸۵/٤، رقم الحديث ۱۸۵٤۲، القاهرة).

وقال الهيثمي في" مجمع الزوائد" :

رواه أحمد وأبو يعلى ورجاله ثقات. (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۳۰۳/۳،دارالفكر).

وذكر العلامة المناوي في"فيض القدير":

عن البراء بن عازب ورواه أيضا أبويعلى وقال الهيثمي: ورجاله ثقات، وأورده ابن الجوزي في الموضوعات. (فيض القدير شرح الجامع الصغير للمناوى ۳۰۳/٦).

وقال ابن الجوزي في " الموضوعات ":

هذا حديث لا يصح، تفرد به صالح عن يزيد، قال ابن المبارك: ارم بيزيد، وقال أبو حاتم الرازي: كل أحاديثه موضوعة، وقال النسائي: متروك الحديث. (الموضوعات:۲۲۰/۲).

وقال الحافظ في " القول المسدد ":

الحديث الحادي عشر قال الإمام أحمد... أخرجه ابن الجوزي في الموضوعات من طريق أحمد بن إبراهيم الموصلي عن صالح بن عمر وأعله بيزيد بن أبي زياد ولم يصب فإن يزيد وإن ضعفه بعضهم من قبل حفظه وبكونه كان يلقن فيتلقن في آخرعمره، فلا يلزم من شيء من ذلک أن يكون كل ما يحدث به موضوعاً، وقد أورد الدارقطني في الأفراد وقال: تفرد به صالح ابن عمرعن يزيد يعني بهذا الإسناد، وأخرجه ابن عدي في الكامل في ترجمة يزيد بن أبي زياد وضعف يزيد، وقد رواه أبو بكربن مردوية في تفسيره من طريق أبي يوسف القاضي عن يزيد بن أبي زياد فقال: عن ابن عباس رضي الله عنه بدل البراء رضي الله عنه... وشاهده ما أخرجه مالک والبخاري ومسلم والنسائي من حديث أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " أمرت بقرية تأكل القرى يقولون يثرب وهي المدينة ". الحديث. (القول المسدد: ۱/ ٤٠. ومثله فی تنزيه الشريعة المرفوعة: ٢/ ١٧٤).

قال أبو إسحق الحويني الأثري في "النافلة في الأحاديث الضعيفة والباطلة" (١/ ٢١/ ٤٣): أخطأ ابن الجوزي رحمه الله مرتين: (١) أنه جعل هذا الحديث موضوعاً، ولا حجة له. (٢) أنه نقل ما قيل في يزيد بن أبي زياد القرشي، وليس هو راوي الحديث، فإن راوي الحديث هنا هو يزيد بن أبي زياد القرشي الكوفي وهوصدوق، لكنه كان تغير، فضعف لذلک.

أما بالنسبة لرجال السند:

(١) صالح بن عمر الواسطی: نزل حلوان، قال أبو طالب عن أحمد بن حنبل لا بأس به. وقال أبو زرعة: ثقة، ذكره ابن حبان فی كتاب الثقات. روی له البخاری فی (الأدب)، ومسلم. (تهذيب الكمال فی أسماء الرجال: ١٣/ ٧٠، رقم: ٢٨٣١) وقال الذهبی فی" ميزان الاعتدال" (٦/ ٩٩): صالح بن عمر، ثقة.

فأما صالح بن عمر الواسطی فهو ثقة بالاتفاق.

(٢) يزيد بن أبی زياد القرشی الهاشمی أبو عبد الله الكوفی: قال أحمد بن حنبل: لم يكن بالحافظ، وقال فی موضع آخر: حديثه ليس بذلك. قال يحيی بن معين: لا يحتج بحديثه، ليس بالقوی، ضعيف الحديث، قال العجلی: جائزالحديث، وكان بآخرة يلقن. قال أبو زرعة: لين، يكتب حديث ولايحتج به. قال أبو حاتم: ليس

بالقوی. (تهذیب الکمال فی أسماء الرجال :۱۳۵/۳۲، رقم:۶۹۹۱)

قال الذهبی فی" میزان الاعتدال" (۹۷/۶) : قال یحیی : لیس بالقوی، لا یحتج به. قال ابن المبارك: إرم به. قال شعبة : كان یزید بن أبی زیاد رفاعا. قال وكیع: لیس بشیء۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

حدیث" المدينة تنفي الناس" کا مطلب:

سوال: حدیث میں آتا ہے" **المدينة تنفي الناس كما ينفي الكير خبث الحديد**" (صحیح البخاری: ۲۵۲/۱) مدینہ منورہ لوہار کی بھٹی کی طرح ہے یہ خرابی اور شر کو صاف کرتا ہے، حالانکہ وہاں فسق و فجور پایا جاتا ہے پھر حدیث کا کیا مطلب ہے؟

الجواب: عام طور پر اس کے دو جواب دئے جاتے ہیں:

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود و منافقین مراد نہیں۔ (فتح الباری ۸۸/۴، عمدة القاری ۵۷۷/۷).

(۲) یہ ہمیشہ کے لیے ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ مدینہ شریروں کو نکالتا رہیگا یہاں تک کہ نکالنے کی تکمیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ہو جائے گی۔ (هذا ملخص ما فی لامع الدراری: ۲۴۵/۲) ۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

مسجد نبوی میں چالیس نمازوں کی فضیلت:

سوال: مدینہ منورہ میں چالیس نمازوں کی فضیلت احادیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ جب کہ حج، عمرہ کرنے والے اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

الجواب: مسجد نبوی میں چالیس نمازوں کی فضیلت احادیث سے ثابت ہے، لہذا اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ملاحظہ فرمائیں مجمع الزوائد میں ہے:

عن أنس بن مالك رضی اللہ عنہ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من صلى في مسجدي هذا أربعين صلاة لاتفوته صلاة كتب له براءة من النار وبراءة من العذاب وبرئ من النفاق.

قلت: روى الترمذي بعضه. ورواه أحمد والطبراني في الأوسط ورجاله ثقات.

(مجمع الزوائد: ۸/۴، باب فیمن صلی بالمدینة اربعین صلاة، دارالفکر).

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جو شخص میری مسجد میں چالیس نمازیں اس طرح ادا کرے کہ اس کی کوئی نماز فوت نہ ہو تو اس کے لیے دوزخ سے براءت اور عذاب سے براءت اور نفاق سے براءت لکھی جائے گی۔

وكذا ذكره الحافظ المنذري في الترغيب والترهيب: (۱۰۶/۳) **وقال: رواه أحمد ورواته رواة الصحيح والطبراني في الأوسط، وهوعند الترمذي بغيرهذا اللفظ. وكذا في مسند الإمام أحمد بن حنبل:**(۱۵۵/۳).

اس حدیث پر البانی صاحب کا اعتراض اور اس کے جوابات تفصیل کے ساتھ ''فتاوی دارالعلوم زکریا جلد اول ابواب الحدیث والآثار'' کے تحت ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مسجد نبوی کے اضافہ شدہ حصہ میں تضعیفِ اجر کا حکم:

سوال: تضعیفِ اجر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد کی جو حدود تھیں اس کے ساتھ خاص ہے یا پورے اضافہ شدہ حصہ سے متعلق ہے؟

الجواب: مسجد نبوی میں چاہے جتنا بھی اضافہ ہوجائے تمام اضافہ شدہ حصہ مسجد نبوی کے حکم میں ہوکر زیادتی ثواب کا حکم اس سے متعلق ہوگا۔

تضعیفِ اجر کی روایات ملاحظہ فرمائیں:

مسلم شریف کی روایت میں ایک ہزار کا تذکرہ ہے۔

عن أبي هريرة ﷺ يبلغ به النبي صلى الله عليه وسلم قال: صلاة في مسجدي هذا أفضل من ألف صلاة فيما سواه إلا المسجد الحرام. (رواه مسلم:۱/۴۴۶،باب فضل الصلاة بمسجدي مكة والمدينة)

فیض القدیر اور سنن ابن ماجہ کی روایت میں ۵۰ ہزار کا ذکر ہے، البتہ روایت ضعیف ہے۔

ملاحظہ فرمائیں فیض القدیر میں ہے:

عن أنس بن مالك ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صلاة الرجل في بيته بصلاة، وصلاته في مسجد القبائل بخمس وعشرين، وصلاته في مسجد الذي يجمع فيه الناس أي الجمعة بخمس مائة صلاة، وصلاته في المسجد الأقصى بخمس آلاف،

وصلاته في مسجدي بخمسين ألف صلاة، وصلا ته في المسجد الحرام بمائة ألف صلاة.
قال ابن حجرؒ: سنده ضعيف.

(فيض القدير:٤/٢١٩/٥٠٧٩ـوسنن ابن ماجه:١٠٢،باب ماجاء فى الصلاة فى المسجدالجامع).

فتح الملہم میں ہے:

قوله في مسجدي هذا، أي مسجد المدينة النبوي لامسجد قباء وغيره قال النوويؒ: ينبغي أن يحرص المصلي على الصلاة في الموضع الذي كان في زمانه صلى الله عليه وسلم دون ما زيد فيه بعده، لأن التضعيف إنما ورد في مسجده، وقد أكده بقوله هذا بخلاف مكة فإنه يشمل جميع مكة، بل صحح النوويؒ يعم جميع الحرم، ووافقه السبكي وغيره على الاختصاص بذلك الموضع، واعترضه ابن تيميةؒ وأطال فيه، والمحب الطبري وأورد آثاراً استدلالاً بها وبأنه سلم في مسجد مكة أن المضاعفة لاتختص بماكان موجوداً في زمنه صلى الله عليه وسلم، وبأن الإشارة في الحديث إنما هي لإخراج غيره من المساجد المنسوبة إليه عليه السلام، وبأن الإمام مالكاًؒ سئل عن ذلك فأجاب بعدم الخصوصية وقال: لأنه عليه السلام أخبر بما يكون بعده، وزويت له الأرض، فعلم بما يحدث بعده ولولا هذا ما استجازه الخلفاء الراشدون أن يستزيدوا فيه بحضرة الصحابة ﷺ ولم ينكره ذلك عليهم، وبما في تاريخ المدينة عن عمرؓ أنه لما فرغ من الزيادة قال: لوانتهى إلى الجبانة، وفي رواية إلى ذى الحليفة لكان الكل مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم، وبما عن أبي هريرة ﷺ أنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لو زيد في هذا المسجد ما زيد لكان الكل مسجدي، وفي رواية لو بنى هذا المسجد إلى صنعاء كان مسجدي، هذا خلاصة ماذكره ابن حجرؒ في " الجوهر المنظم في زيارة القبر المكرم " والله أعلم.

وقال الشيخ بدر الدين العينيؒ: ما حاصله: أنه اذا اجتمع الاسم والإشارة كما في قوله صلى الله عليه وسلم" مسجدي هذا " هل تغلب الإشارة أو الاسم؟ فيه خلاف فمال النوويؒ إلى تغليب الإشارة وأما مذهبنا فالذي يظهرمن قولهم إن الاسم يغلب الإشارة، والله سبحانه وتعالىٰ أعلم بالصواب. (فتح الملهم بشرح صحيح مسلم:٣/٤١٦ـوهكذا ذكره الشيخ فى اوجز

المسالك:٤/١٩٨، باب ماجاء في مسجد النبي صلى الله عليه وسلم،دار القلم ،دمشق).

فیض الباری میں ہے:

بقي أن الفضل يقتصرعلى المسجد الذي كان في عهد صاحب النبوة خاصة أو يشمل كل بناء بعده أيضاً فالمختارعند العينيؒ أنه يشمل الكل وذلك لأن الحديث ورد بلفظ "مسجدي هذا" فاجتمع فيه الإشاره والتسمية وفي مثله يعتبر بالتسمية كما يظهر من الضابطة التي ذكرها صاحب الهداية. (فيض الباري:٢/٤٣٤،باب فضل الصلاة في مسجدمكة)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

روضۂ اقدس کی زیارت کی نیت سے سفر کرنے کا حکم:

سوال: مدینہ منورہ کے سفر میں خالص روضۂ اقدس کی زیارت کی نیت کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: روضۂ اقدس کی زیارت کی نیت سے سفر کرنا افضل اور بہتر ہے، علماء فقہاء اور مشائخ وغیرہ حضرات نے یہی تحریر فرمایا ہے، اور باعث ثواب وفضیلت ہے، لہذا اس مبارک سفر میں روضۂ اطہر کی نیت کرنا چاہئے۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث شریف میں ہے:

(١) **"من زار قبري وجبت له شفاعتي"**. (اخرجه البيهقي في شعب الايمان:٨/٦٩/٣٨٦٢).

یعنی جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت اس شخص کے حق میں واجب ہوگئی۔

(٢) **"من زار قبري كنت له شفيعاً"**. (السنن الكبرى للبيهقي:٥/٢٢٨).

یعنی جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میں اس شخص کے حق میں شفاعت کروں گا۔

(٣) **"من زارني بالمدينة محتسباً كنت له شفيعاً"**. (بيهقي في شعب الايمان:٨/٩٥/٣٨٦٠).

(٤) **"من حج فزار قبري بعد موتي كان كمن زارني في حياتي"**. (اخرجه الطبراني في الكبير:١٢/٤٠٦).

(٥) **"من زارني بعد موتي فكأنما زارني في حياتي"**. (اخرجه الدارقطني:٣/٣٣٣/٢٦٩٤).

(٦) **"من حج البيت ولم يزرني فقد جفاني"**. (جامع الاحاديث حرف الميم).

(٧) **"من جاء ني زائراً لا يعلمه حاجة إلا زيارتي كان حقاً علي أن أكون له شفيعاً يوم**

القيمة". (روه الطبراني فی الكبيروالاوسط).

احادیث کی تحقیق سے قبل فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیں:

محقق ابن ہمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

والأولیٰ فيما يقع عند العبد الضعيف تجريد النية لزيارة قبر النبي صلى الله عليه وسلم ثم إذا حصل له إذا قدم زيارة المسجد أو يستفتح فضل الله سبحانه في مرة أخرى ينويهما فيها لأن في ذلک زيادة تعظيمه صلى الله عليه وسلم وإجلاله ويوافق ظاهر ما ذكرنا من قوله عليه الصلاة والسلام "لا تعمله حاجة إلا زيارتي". (فتح القدير:۳/ ۱۸۰،مسائل منثورة،دارالفكر).

علامہ سید احمد طحطاوی مراقی الفلاح کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

الأولیٰ في الزيارة تجريد النية لزيارته صلى الله عليه وسلم. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح:۷٤٥،فصل فی زيارة النبی صلی الله عليه وسلم، قديمی).

وفي الطحطاوي على الدر: ويوافقه ظاهرماذكرنا من قوله صلى الله عليه وسلم "من جاءني زائراً لايعمد حاجة إلا زيارتي كان حقاً علي أن أكون له شفيعاً يوم القيمة" انتهى.

(حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:۱/ ٥٦٢، کوئٹه).

علامہ شامیؒ محقق ابن ہمام کی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ونقل الرحمتي عن العارف المنلاجامي أنه أفرز الزيارة عن الحج حتى لايكون له مقصد غيرها في سفره. (الفتاوی الشامی:۲/ ٦۲۷،مطلب فی تفضيل قبره المكرم صلى الله عليه وسلم،سعيد)

وكذا فی غنية الناسك فی بغية المناسك:۲۰۲،خاتمة فی زيارة قبرسيد المرسلين صلى الله عليه وسلم، ادارة القرآن).

ابوزکریا انصاری شافعیؒ فرماتے ہیں:

وسن زيارة قبر النبي صلى الله عليه وسلم، ولو لغيرحاج أومعتمر...وسن لمن قصد المدينة لزيارته... (فتح الوهاب:۱۷٥).

علامہ ابن عاشر مالکی فرماتے ہیں:

إذا خرج الحاج من مكة يستحب له الخروج من كذا ولتكن نيته وعزيمته وكليته زيارته

صلی اللّٰہ علیه وسلم وزیارة مسجده ومایتعلق بذلک لایشترک معه غیره لأنه صلی اللّٰہ علیه وسلم متبوع لا تابع فهو رأس الأمر المطلوب والمقصود الأعظم فإن زیارته صلی اللّٰہ علیه وسلم سنة مجمع علیها وفضیلة مرغب فیها. (الدر الثمین والمورد المعین لابن عاشر المالکی:۳۸۳)

المغنی لابن قدامہ حنبلی میں ہے:

ویستحب زیارة قبر النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم، لماروی الدارقطني بإسناد عن ابن عمر ﷺ قال: قال رسول اللّٰہ علیه وسلم: "من حج فزار قبري بعد وفاتي فكأنما زارني في حیاتي" وفي روایة "من زار قبري وجبت له شفاعتي"... عن أبي هریرة ﷺ أن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: "ما من أحد یسلم علي عند قبري إلا رد اللّٰہ علي روحي حتی أرد علیه السلام". (المغنی لابن قدامة الحنبلي:۳/۵۸۸،فصل فی استحباب زیارة قبره صلی اللّٰہ علیه وسلم،دار الکتب العلمیة، بیروت).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

روضۂ اطہر کی زیارت کا قصد مقدم رکھے۔ (فتاوی محمودیہ:۱۰/۴۴۱،مبوب ومرتب).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

مدینہ طیبہ کی حاضری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کی زیارت کی نیت سے ہونی چاہئے یہی افضل ہے۔ (فتاوی رحیمیہ:۲/۳۷۳).

فتاوی بینات میں ہے:

واضح رہے کہ روضۂ اطہر کی زیارت کی نیت سے سفر کرنے میں کوئی قباحت نہیں، بلکہ باعث فضیلت اور ثواب ہے۔ (فتاوی بینات:۳/۱۳۶، کتاب الحج).

روضۂ مبارکہ کی زیارت کی نیت سے سفر کرنے پر اشکالات:

اشکال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ زیارت کی تمام احادیث یا ضعیف ہیں یا موضوع، لہذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہے؟

ملاحظہ فتاوی علماء البلد الحرام میں مذکور ہے:

وأما الأحادیث التي في فضل قبره علیه الصلاة والسلام؛ فكلها ضعیفة أو موضوعة،...

وكلها باطلة، لا أصل لها... الشيخ ابن جبرين۔فتاوى في التوحيد:ص(۲۳۔۲۵)۔(فتاوى علماء البلدالحرام: ۱ ۰ ٤)

الجواب: احادیثِ زیارت کی تحقیق درجِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

(۱)"من زارقبري وجبت له شفاعتي". أخرجه البيهقي في شعب الإيمان (۸/۹٦/۳۸٦۲) وابن عدي في الكامل (٦/۳٥١)من حديث موسى بن هلال العبدي، عن عبد اللّٰه بن عمر العمري، عن نافع، عن ابن عمرمرفوعاً.

تكلموا في سنده على موسى بن هلال وعبد اللّٰه بن عمر العمري، أما موسى بن هلال، فقال الذهبي: هو صالح الحديث، وقال ابن عدي: أرجو أنه لاباس به، وروى عنه أحمد بن حنبل وغيره...فهوحسن الحديث.

وقد تابعه غيره في هذاكما أخرج الطبراني في الكبير (۱۲/۲۹۱/۱۳۱٤۹) من حديث عبد اللّٰه بن محمد العبادي البصري،ثنامسلم بن سالم الجهني،حدثني عبيد اللّٰه بن عمر، عن نافع، عن سالم عن ابن عمر رضي الله عنهما بمعناه.

قال الهيثمي في المجمع (٤/٥): رواه الطبراني في الأوسط والكبيروفيه مسلمة بن سالم وهو ضعيف.

وعبد اللّٰه بن محمد العبادي تابعه من هو أحسن منه، مسلم بن حاتم الأنصاري وقد وثقه الترمذي والطبراني وابن حبان. (التهذيب: ۱۰/۱۲٥).

ومسلمة بن سالم الجهني صحح له ابن السكن فهوثقة عنده فهوصالح للمتابعات.

أماعبد اللّٰه بن عمرالعمري، فهوحسن الحديث واستدل بحديثه من رد هذه الرواية كابن عبد الهادي كما في تنقيح التنقيح(۱/۱۲۲).

وموسى روى هذا عن عبيد اللّٰه الثقة الحافظ أيضاً. أخرجه الدارقطني(۳/۳۳٤/۲٦۹٥).

وأقر الألباني ثبوت الروايتين بالطريقين كما في الإرواء (٤/۳۳۷).

وكذا صححها عبدالحق الأشبيلي وصححه السبكي والسيوطي.

قال أحمد: عبد اللّٰه بن عمر العمري صالح لا بأس به، قد روى عنه الناس، ولكن ليس مثل أخيه عبيد اللّٰه؛ فإن أحمد نزل به بالنسبة لأخيه على ما نبّه عليه السخاوي في "فتح المغيث" (۱/۸٤۳)

وقال ابن معين: ليس به بأس، يكتب حديثه. وقول ابن معين: "ليس به بأس " أى ثقة، كما في كتب الجرح والتعديل.

وقال العجلي: لا بأس به (الثقات ،ص٢٣٩). ووثقه الخليلي، وابن شاهين في ثقاته (ص١٥١) وحسن له أبو يعلى الموصلي، والترمذي. وجوز البخاري حديثه، كما في جزء رفع اليدين، وذكره في صحيحه في كتاب العلم، فجزم الكرماني أنه العمري، ومال إليه البدر العيني.

وفي "الكامل" (١٤٦١/٤) لا بأس به ، وإنما قيل فيه لا يلحق أخاه، وإلا فهو في نفسه صدوق لا بأس به .

والحاصل أن الحديث حسن، ولا بد . كما في "رفع المنارة" (ص٣١٨).

وله شواهد: كحديث (٢) " من زار قبري كنت له شفيعاً ". (البيهقي في الكبرى:٢٢٨/٥) وإن كان ضعيفا؛ لأن فيه سوار بن ميمون - مجهول الحال - وقال العقيلي: الرواية لينة.

(٣) وحديث " من زارني بالمدينة محتسبا كنت له شفيعا". (الشعب ٩٥/٨) رقم: ٣٨٦٠) وفي سنده محمد بن إسماعيل بن أبي فديك، وثقه جماعة كابن حبان، وصحح الحاكم حديثه، وحسنه الترمذي. وقال الذهبي: وثق . فمثله يقبل في المتابعات.

ولأحاديث الزيارة غيرهذا كحديث" ليهبطن عيسى ابن مريم حكماً عدلاً وإماماً مقسطاً وليسلكن فجاً حاجاً أو معتمراً أو بنيتهما وليأتين قبري حتى يسلم علي ولأردن عليه" أخرجه الحاكم (٥٩٥/٢) وقال: هذاحديث صحيح الإسناد. وسلمه الذهبي، فهوحسن على الأقل.

(٤) وحديث " من حج فزار قبري بعد موتي كان كمن زارني في حياتي ". الحديث. أخرجه الطبراني في " الكبير" (٤٠٦/١٢)، والبيهقي في " السنن " (٢٤٦/٥).

لكن تكلموا فيه على حفص بن سليمان، وليث بن أبي سليم.

أما حفص بن سليمان، فإنه ليس بالكذاب، كيف وهو إمام قراء ة تقرأ في أكثر بلدان الإسلام! بل هو ضعيف، وضعفه بسبب إشتغاله بالقرآن أكثر، كما قال الذهبي في" سير أعلام النبلاء " (٢٦٠/٥)، وكما قال السبكي في"شفاء السقام " (ص٢٥).

وأما ليث بن أبي سليم، فهو صدوق في نفسه ، لكنه يخطيء فمثله يقبل في المتابعات والشواهد .

ولحفص متابع وهو الليث بن بنت الليث قال حدثتني عائشة بنت يونس امرأة الليث ... (أخرجه الطبراني في " الكبير" ١٢/٤٠٦) ، ولكن هذا ضعيف جداً. والمتابع الثاني جعفر بن سليمان الضبعي، لكن في سنده أبو بكر محمد بن السري يروي المناكير (لسان الميزان ٥/١٧٤)، ونصر بن شعيب ضعيف(لسان الميزان ٢/٢٥١).

(٥) وحديث " من زارني بعد موتي فكأنما زارني في حياتي ". أخرجه الدارقطني (٣/٣٣٣-٣٣٤، رقم:٢٦٩٤)۔ والبيهقي في " الشعب" (٨/٩٠، رقم: ٣٨٥٥).

لكن تكلموا فيه علي خالد بن طهمان، لكنه صدوق، وكان قد اختلط، وتابعه ابن عون، ويقال: أبو عون ، وهو ثقة ثبت.

وعلى هارون بن قزعة ، أو أبو قزعة ، ذكره ابن حبان في " الثقات " وذكره ابن الجارود في " الضعفاء " ويروي عنه عامر الشعبي، فيكون هارون بن أبي قزعة ثقة عنده، وقال ابن معين: إذا حدث الشعبي عن رجل فسماه فهو ثقة ، يحتج به. (التهذيب ٥/٦٧) فيحتج بمثله خاصة في المتابعات والشواهد .

وبقي شيخ هارون مبهم عن رجل من ولد حاطب، وجوابه ما قاله الذهبي: أجود حديث في الزيارة إسناداً حديث حاطب. وأقره السخاوي والسيوطي.

وللمزيد من البحث انظر" رفع المنارة " (ص٢٨٠).

(٦) و حديث" من حج البيت ولم يزرني فقد جفاني"

أخرجه ابن عدي، والدارقطني وغيرهما، وليس بموضوع، كماظنه ابن الجوزي وابن تيمية، بل سنده حسن عند جمع ، وضعيف عندجمع. (التعليق الممجد على مؤطامحمد للعلامة اللكنوی:٣/٤٨١، باب قبر النبي صلى الله عليه وسلم ومايستحب من ذلك،دارالقلم).

وفي "كشف الخفاء" : ...قال الحافظ ابن حجرؒ في تخريج أحاديث مسند الفردوس: أسنده عن ابن عمرؓ وهوعند ابن عدي وابن حبان في الضعفاء وفي غرائب مالک للدارقطني وفي الرواة عن مالک للخطيب انتهیٰ، ومع هذا فلا ينبغي الحكم عليه بالوضع، فتدبر. (كشف الخفاء: ٢/٢٤٥/٢٤٦٠).

وانظر: (تنزيه الشريعة :٢/١٧٢ ـوالمغني للعراقي:١/٢٦٥)

(۷) وحديث :" من جاء ني زائراً لا يعلمه حاجة إلا زيارتي كان حقاً علي أن أكون له شفيعاً يوم القيمة " .

قال الهيثمي في " المجمع": رواه الطبراني في الأوسط (۱۰/۲۵۹/٤٧٠٤) والكبير (۱۰/٤٣٢/١٢٩٧١) وفيه مسلمة بن سالم الجهني، وهو ضعيف. (مجمع الزوائد:٤/٢،باب زيارة سيدنارسول الله صلى الله عليه وسلم،دار الفكر).

وفي المغني للعراقي:" من جاء ني زائراً لا يهمه إلا زيارتي كان حقاً على الله سبحانه أن أكون له شفيعاً" الطبراني من حديث ابن عمر رضي الله عنه وصححه ابن السكن. (المغنى :١/٢٦٥).

قال المحقق محمد فؤاد عبدالباقي :"من زار قبري وجبت له شفاعتي"رواه الدارقطني وغيره وصححه عبدالحق ..."من جاء ني زائراً..." رواه الجماعة منهم الحافظ أبوعلي بن السكن في كتابه المسمىٰ بـ " السنن الصحاح " فهذان إمامان صححان هذين الحديثين وقولهما أولىٰ من قول من طعن في ذلک، نقله السندیؒ. (تعليق محمد فؤاد على سنن ابن ماجة:٢/١٠٣٩/٣١١٢،باب فضل المدينة ، بيروت۔ وكذا فی حاشية السندی علی ابن ماجة:٦/١٥٢).

قال العلامة اللكنويؒ: وقد ورد في فضله أحاديث، فمن ذلک "من زار قبري وجبت له شفاعتي" أخرجه الدارقطني وابن خزيمة وسنده حسن، وفي رواية الطبراني "من جاء ني زائراً لا تعمله حاجة إلا زيارتي كان حقاً علي أن أكون له شفيعاً " وعند ابن أبي الدنيا عن أنس: "من زارني محتسباً كنت له شفيعاً وشهيداً " وأكثرطرق هذه الأحاديث وإن كانت ضعيفة، لكن بعضها سالم عن الضعف القادح، وبالمجموع يصل القوة،كماحققه الحافظ ابن حجرؒ في" التلخيص الحبير" والتقي السبكي في كتابه " شفاء السقام في زيارة خير الأنام " وقد أخطأ بعض معاصريه، وهو ابن تيمية حيث ظن أن الأحاديث الواردة في هذا الباب كلها ضعيفة بل موضوعة. (التعليق الممجد على مؤطا محمد:٣/٤٨٢،باب قبرالنبي صلى الله عليه وسلم،دار القلم).

قال الحافظ ابن حجرؒ: فائدة: طرق هذا الحديث كلها ضعيفة لكن صححه من حديث ابن عمر رضي الله عنه أبوالسكن في إيراده إياه في اثناء السنن الصحاح له، وعبد الحق في الأحكام في سكوته عنه، والشيخ تقي الدين السبكي من المتأخرين باعتبارمجموع الطرق، وأصح ماورد في ذلک ماروا ه أحمد وأبوداود من طرق أبي صخرحميد بن زياد عن يزيد بن عبد الله بن قسيط عن أبي

هريرة رضي الله عنه مرفوعاً:" ما من أحد يسلم علي إلا رد الله علي روحي حتى أرد عليه السلام". (تلخيص الحبير: ٣/٢٥٦/١٠٧٧، باب دخول مكة وبقية اعمال الحج).

وقال السخاوي: قال الذهبي: طرقه كلها لينة، لكن يقوي بعضها ببعض.
(المقاصد الحسنة: ٤١٠/١١٢٥، بيروت).

قال المناوي: قول ابن تيمية موضوع غير صواب. (فيض القدير: ٦/١٨١/١٧١٥).

وللمزيد من البحث انظر "رفع المنارة" (٣٠٠-٣٠٢).

دوسرا اشکال اور اس کا جواب:

سلفی حضرات روضۂ کی نیت سے سفر کرنے کو اس حدیث "لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد..." کے خلاف سمجھتے ہیں ملاحظہ ہو: فتاوی علماء البلد الحرام: ۴۰۰۔ اس کا کیا جواب ہے؟ نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کوہِ طور پر جانے اور حضرت ابو بصرہ غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انکار سے استدلال کرتے ہیں کہ انہوں نے حدیث "لا تشد الرحال ..." پیش فرمائی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لو أدركتك قبل أن تخرج ماخرجت"، یعنی پہلے سے یہ حدیث معلوم ہوتی تو میں کوہِ طور کا سفر نہیں کرتا، اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: حدیث شریف "لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد" میں مستثنیٰ منہ مسجد ہے، اور اس پر نحوی، عقلی، تعاملی دلائل موجود ہیں، نحوی یہ ہے کہ مستثنیٰ متصل کا تقاضا یہی ہے، عقلی یہ ہے کہ زیارتِ والدین، طلبِ علم وغیرہ کے لیے سفر مکروہ نہ بن جائے، نقلی دلیل مسند احمد کی حدیث "لا تشد الرحال إلى مسجد ليصلى فيه إلا إلى ثلاثة مساجد ..." ہے، اور تعاملی دلیل یہ ہے کہ کتبِ فقہ میں زیارتِ مدینہ منورہ کا باب موجود ہے اور اگر مسجد مقصود ہوتی تو ایک لاکھ کا ثواب چھوڑ کر ایک ہزار کے لیے سلف کا سفر کرنا نامعقول ہے۔ نیز اگر بالفرض مستثنیٰ منہ عام تسلیم کیا جائے تو پھر بھی احادیث کا تقاضا یہ ہوگا کہ ان تین مساجد کے علاوہ دوسری جگہ کے لیے سفر مناسب نہیں اور زیادہ مفید نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ کا سفر ناجائز ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بھی یہی فرما ہے۔ دلائل احادیث کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنا خاتم الأنبياء ومسجدي خاتم مساجد الأنبياء أحق المساجد أن يزار وتشد إليه الرواحل المسجد الحرام ومسجدي ... قال الهيثمي: رواه البزار وفيه موسى بن عبيدة وهو ضعيف.

(مجمع الزوائد: ٤/٤، باب قوله لاتشدالرحال...، دارالفکر).

(۲) وعن جابر ﷺ قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: خير ماركبت إليه الرواحل مسجد إبراهيم عليه السلام ومسجدي. قال الهيثمي: رواه أحمد والطبراني في الأوسط، وإسناده حسن. (مجمع الزوائد: ٤/٣، باب قوله لاتشدالرحال...، دارالفکر).

(۳) وعن شهر قال: سمعت أباسعيد الخدرى ﷺ وذكر عنده صلاة في الطور، فقال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" لاينبغي للمطي أن تشد رحاله إلى مسجد يبتغي فيه الصلاة غيرالمسجد الحرام والمسجد الأقصى ومسجدي هذا...رواه أحمد وشهرفيه كلام وحديثه حسن . (مجمع الزوائد: ٤/٣، باب قوله لاتشدالرحال...، دارالفکر).

(۴) وعن يعقوب بن مجمع بن جارية عن أبيه قال: جاء عمربن الخطاب ﷺ فقال: لوكان مسجد قباء في أفق من الآفاق ضربنا إليه أكباد المطي. (مصنف عبدالرزاق: باب ماتشد اليه الرحال ،والصلاة فی مسجدقباء، ٥/١٣٣/٩١٦٣).

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

والوجه الثاني : أنه يجوزالسفر إليها، قاله طائفة من المتأخرين، منهم أبوحامد الغزالي، وأبوالحسن بن عبدوس الحراني، والشيخ أبومحمد المقدسي. وما علمته منقولاً عن أحد من المتقدمين، بناء على أن الحديث(أي لا تشد الرحال...)لم يتناول النهي عن ذلک، كما لم يتناول النهي عن السفر إلى الأمكنة التي فيها الوالدان، والعلماء والمشايخ، والإخوان، أو بعض المقاصد من الأمور الدنيوية المباحة. (اقتضاء الصراط المستقيم: ٢/١٨٣، المکتبة الرشد، الریاض).

فیض الباری میں مولانا شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں:

وأحسن الأجوبة عندي أن الحديث لم يردفي مسألة القبورلمافي المسند لأحمد "لاتشد الرحال إلى مسجد ليصلى فيه إلا إلى ثلاثة مساجد" فدل على أن نهي شد الرحال يقتصرعلى المساجد فقط، ولاتعلق له بمسألة زيارة القبور، فجره إلى المقابر مع كونه في المساجد ليس بسديد. (فیض الباری: /٤٣٣).

عمدۃ القاری میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

قال الإمام النوويؒ: معناه" لا فضيلة في شد الرحال إلى مسجد ما غيرهذه الثلاثة ونقله

عـن جـمهور العلماء، وقال ابن بطال: هذاالحديث إنما هوعند العلماء في من نذرعلى نفسه الصلاة في مسجد من سائر المساجد غير الثلاثة المذكورة. (عمدة القارى:٥/٥٦٤،دارالحديث ملتان).

فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

أجـابـوا عن الحديث بأجوبة: منها أن المراد أن الفضيلة التامة إنما هي في شد الرحال إلـى هـذه الـمسـاجـد بخلاف غيرها فإنه جائز وقد وقع في رواية لأحمد...بلفظ " لا ينبغي للمطي أن تعمل " وهولفظ ظاهر في غير التحريم .

ومنها أن النهي مخصوص لمن نذرعلى نفسه الصلاة في مسجدمن سائر المساجدغير الثلاثة فإنه لايجب الوفاء به .

ومـنهـا أن الـمراد حكم المساجد فقط وأنه لاتشدالرحال إلى مسجد من المساجد للصلاة فيـه غيـرهـذه الثلا ثة وما قصد غير المساجد لزيارة صالح أوقريب أوصاحب أوطلب علم أوتـجارة أونزهة، فلا يدخل في النهي، ويؤيده ماروى أحمد من طريق شهربن حوشب قال: سـمعت أباسعيد الخدري رضي الله عنه وذكـرعـنده صلاة في الطور، فقال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاينبغي للمطي أن تشد رحاله إلى مسجد يبتغي فيه الصلاة غير المسجد الحرام والـمسـجد الأقصى ومسجدي هذا، وشهرحسن الحديث وإن كان فيه بعض الضعف. (فتح الباری:)واحسن الفتاوی:٤/٥٥٠).

تیسرا اشکال اور اس کا جواب:

بعض حضرات روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سفر کی ممانعت میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں، قـــال الـنبي صـلى الله عليه وسلم: " لا تجعلوا قبري عيداً " قبر کے لیے سفر کرنے سے عید کا سماں ہوگا۔ اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: أخرج أبوداود (باب زيارة القبور،ص٢٧٩) والبيهقي في شعب الإيمان (٦/٥٢-٥٣) عـن أبـي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لا تجعلوا بيوتكم قبوراً ولا تجعلوا قبري عيداً وصلوا عليّ فإن صلا تكم تبلغني حيث كنتم".

الجواب: جمہور نے اس حدیث کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں:

(۱) عید کی طرح زیارت کے لیے کوئی خاص تاریخ یا دن متعین نہ کیا جائے۔

(۲) قبر مبارک پر عید کی طرح زیب وزینت کے ساتھ لہو ولعب کے لیے اجتماع نہ کیا جائے، بلکہ زیارت دعا اور سلام کے لیے حاضری دی جائے۔ (احسن الفتاوی: ۴/۵۵۱).

اعلاء السنن میں ہے:

وأجابوا عن حديث" لا تتخذوا قبري عيداً " بأن معناه لا تتخذوا لها وقتاً مخصوصاً لا تكون الزيارة إلا فيه، أو لا تتخذوه كالعيد في الحلوف عليه وإظهار الزينة والاجتماع للهو وغيره كما يفعل في الأعياد، بل لا يؤتى إلا للزيارة والدعاء والسلام والصلاة ثم ينصرف عنه. (اعلاء السنن: ۱۰/۴۹۹).

بذل المجہود میں ہے:

أي لا تجعلوا زيارة قبري عيداً أو لا تجعلوا قبري مظهرعيد فإنه...لهو وسرور وحال الزيارة خلاف ذلک، وقيل: يحتمل أن يكون المراد الحث على كثرة زيارته، ولا يجعل كالعيد الذي لا يأتي في العام إلا مرتين. قال الطيبي: نهاهم عن الاجتماع لها اجتماعهم نزهة وزينة وكانت اليهود والنصارى تفعل ذلک بقبور أنبيائهم، فأوردهم القصوة والغفلة. (بذل المجهود: ۹/۳۹۷).

وفي فتح الملک المعبود تكملة المنهل العذب المورود (لأمين محمود خطاب من علماء الأزهر الشريف) **أي لا تجعلوا زيارة قبري في الفرح والسرور كالعيد بل اجعلوها زيارة عظة واعتبار. روى أبو هريرة رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: زوروا القبور فإنها تذكركم الآخرة. أخرجه ابن ماجه.** (۲/۲۵۴).

نیز اگر " **لا تجعلوا قبري** " کا مطلب سفر کی ممانعت ہو تو بغیر سفر کے جانا تو سب کے ہاں جائز ہے، نیز مسجد نبوی کی نیت سے سفر کو مخالفین بھی جائز سمجھتے ہیں، تو ان دونوں صورتوں میں اجتماع اور ہجوم پھر بھی ہوگا، تو ان کے ہاں عید کی طرح سماں ہوگا، پھر اس کو جائز کیسے کہتے ہیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

روضۂ اقدس کی زیارت کے آداب اور صلاۃ وسلام کا طریقہ:

سوال: مولانا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم

سے شفاعت طلب کرنے کے بارے میں صحیح طریقہ جاننا چاہتا ہوں، برائے مہربانی مجھے بتلا دے؟

الجواب: جب مسجد میں داخل ہونے لگے تو ان تمام آداب کی رعایت کرے جو مسجدوں میں داخل ہونے کے لیے مسنون ہیں، یعنی نہایت خشوع وخضوع وانکساری کے ساتھ دایاں پاؤں پہلے داخل کرے اور یہ دعا پڑھے" بسم اللّٰه والحمد للّٰه والصلاة والسلام على رسول الله ،اللّٰهم اغفرلي ذنوبي وافتح لي أبواب رحمتك " باب جبرئیل سے داخل ہونا افضل ہے، باب السلام یا کسی اور دروازے سے داخل ہونا بھی جائز ہے۔ داخل ہو کر دو رکعت نماز تحیۃ المسجد پڑھے، اگر ممکن ہو تو ریاض الجنہ میں پڑھے، لیکن اگر زیادہ بھیڑ ہو تو مسجد میں کسی بھی جگہ پڑھ لے بشرطیکہ مکروہ وقت نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھنے کے آداب وطریقہ:

نماز تحیۃ المسجد اور حمد وثنا و دعا سے فارغ ہو کر توبہ واستغفار کرے اور پھر روضۂ مبارک پر حاضر ہو جائے، اور دل کو تمام دنیاوی خیالات سے فارغ کر کے نہایت ادب وتواضع، خشوع وخضوع ذلت وانکسار، خشیت ووقار کے ساتھ مواجہہ شریف میں قبلہ کی طرف پشت کر کے چہرۂ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو جائے، نظریں نیچی رکھے، وہاں کی زیب وزینت کی طرف نظر نہ کرے، اور خلاف ادب کوئی حرکت نہ کرے زیادہ قریب بھی نہ کھڑا ہو، نہ جھکے، نہ جالی مبارک کو ہاتھ لگائے، نہ بوسہ دے، نہ سجدہ کرے، نہ حجرۂ مبارک کا طواف کرے، غرض خلاف ادب کوئی کام نہ کرے، اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر اس طرح کھڑا ہو جس طرح نماز میں کھڑے ہوتے ہیں۔ (لباب المناسك مع شرحه:٥٥٦) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلال وقدر ومنزلت کو دل میں حاضر رکھتے ہوئے درمیانہ آواز سے سلام پڑھے نہ زیادہ بلند آواز ہو نہ بالکل آہستہ ہو، اس طرح سلام پڑھے۔" السلام عليک أيها النبي ورحمة الله وبركاته " اس قدر سلام پڑھنا حدیث شریف سے ثابت ہے، اور بعض نے طویل کو اختیار کیا ہے کثرتِ درود کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے یہ پڑھ سکتے ہیں:

السلام عليک يارسول الله، السلام عليک ياحبيب الله، السلام عليک ياخليل الله، السلام عليک ياخير خلق الله، السلام عليک ياصفوة الله، السلام عليک ياخيرة الله، السلام عليک ياسيد المرسلين، السلام عليک يا إمام المتقين، السلام عليک يامن أرسله اللّٰه رحمة للعٰلمين، السلام عليک ياشفيع المذنبين، السلام عليک يامبشر المحسنين، السلام عليک ياخاتم النبيين، السلام عليک وعلى جميع الأنبياء والمرسلين، والملائكة

المقربين، السلام عليك وعلى آلك، وأهل بيتك، وأصحابك أجمعين، وسائر عباد الله الصالحين، جزاك الله عنا أفضل وأكمل ماجزیٰ به رسولاً عن أمته، ونبياً عن قومه، و صلى الله وسلم عليك أزكیٰ وأعلیٰ وأنمیٰ صلاة صلها على أحد من خلقه، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لاشريك له، وأشهد أنك عبده ورسوله وخيرته من خلقه، وأشهد أنك بلغت الرسالة، وأديت الأمانة، ونصحت الأمة، وأقمت الحجة، وجاهدت في الله حق جهاده، وعبدت ربك حتى أتاك اليقين، وصلاة الله وملائكته وجميع خلقه من أهل سمٰواته وأرضه عليك يارسول الله، اللّٰهمّ آته الوسيلة والفضيلة والدرجة العالية الرفيعة وابعثه مقاماً محموداً الذي وعدته، واعطه المنزل المقعد المقرب عندك، ونهاية ماينبغي أن يسئله السائلون، ربنا آمنا بما أنزلت واتبعنا الرسول فاكتبنا مع الشاهدين، آمنت بالله وملائكته وكتبه ورسله ويوم الآخر وبالقدر خيره وشره، اللّٰهمّ فثبتنا على ذلك ولاتردنا على أعقابنا ربنا لاتزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة، إنك أنت الوهاب، وهيئ لنا من أمرنا رشداً، ربنا اغفرلنا ولآبائنا ولأمهاتنا وذرياتنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان ولاتجعل في قلوبنا غلاً للذين آمنوا ربنا إنك رؤف رحيم، ذو الفضل العظيم .

کسی شخص کی طرف سے سلام عرض کرنے کا طریقہ:

اگر کسی شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام پیش کرنے کو کہا ہو تو اپنے سلام سے فارغ ہو کر اس شخص کی طرف سے سلام یوں عرض کرے: " السلام عليك يارسول الله من فلان بن فلان يستشفع بك إلى ربك" (فلان بن فلان کی جگہ اس شخص کا اور اس کے باپ کا نام لے) نام یاد نہ ہو تو اس طرح عرض کرے:" السلام عليك يارسول الله من الذي أوصاني بالسلام عليك يستشفع بك إلى ربك" اگر بہت سے لوگوں نے کہا تھا اور نام یاد نہیں تو اس طرح عرض کرے:" السلام عليك يارسول الله من جميع من أوصاني بالسلام عليك يستشفعون بك إلى ربك".

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سلام کا طریقہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھنے کے بعد ایک ہاتھ دائیں طرف ہٹ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرہ مبارک کے سامنے کھڑا ہو کر اس طرح سلام پڑھے:

السلام عليک ياخليفة رسول الله، السلام عليک ياصفي رسول الله، السلام عليک ياصاحب رسول الله، السلام عليک يا وزير رسول الله، السلام عليک يا ثاني رسول الله في الغار ورفيقه في الأسفار وأمينه على الأسرار، السلام عليک يا علم المهاجرين والأنصار، السلام عليک يامن اعتقه الله من النار، السلام عليک يا أبابكر الصديق، السلام عليک ورحمة الله وبركاته، جزاک الله عن رسوله وعن إسلام وأهله خير الجزاء، ورضي الله عنک أحسن الرضا.

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سلام کا طریقہ:

پھر ایک ہاتھ اور دائیں طرف ہٹ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرۂ مبارک کے سامنے کھڑا ہو کر اس طرح سلام پڑھے:

السلام عليک ياأمير المؤمنين عمر الفاروق، السلام عليک يامن كمل به الأربعين، السلام عليک يامن استجاب الله فيه دعوة خاتم النبيين، السلام عليک يامن أظهر الله به الدين، السلام عليک يامن أعز الله به الدين، السلام عليک يامن نطق بالصواب ووافق قوله محكم الكتاب، السلام عليک يامن عاش حميداً وخرج من الدنيا شهيداً، جزاک الله عن نبيه وخليفته وأمته خير الجزاء، السلام عليک ورحمة الله وبركاته.

دونوں حضرات پر مشترکہ سلام:

بعض علماء نے کہا ہے کہ حضرت عمرؓ پر سلام پڑھنے کے بعد نصف ہاتھ کے قریب واپس بائیں طرف ہٹ کر حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ دونوں حضرات کے درمیان کھڑے ہو کر پھر اس طرح مشترکہ سلام کرے:

السلام عليكما يا وزيري رسول الله، السلام عليكما يا معيني رسول الله، السلام عليكما يا ضجيعي رسول الله ورفيقيه ومشيريه والمعاونين له على القيام في الدين والقائمين بعده بمصالح المسلمين جزاكم الله أحسن الجزاء، جئناكما نتوسل بكماإلى رسول الله ليشفع لنا ويسئل ربنا أن يتقبل سعينا ويحييناعلى ملته ويميتناعليها ويحشرنا في زمرته، السلام عليكما ورحمة الله وبركاته.

شفاعت کی درخواست کا طریقہ:

اس کے بعد بائیں طرف ہٹ کر دوبارہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہہ شریف میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ وسلام پڑھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا مانگے اور شفاعت کی درخواست کرے، اور بہتر یہ ہے کہ سلام کے بعد یہ کہے:

یارسول اللّٰہ قد قال اللہ سبحانہ وقولہ الحق:﴿ولو أنھم إذ ظلموا أنفسھم جاء وک فاستغفروا اللّٰہ واستغفرلھم الرسول لوجدوا اللّٰہ توابًا رحیمًا﴾ فجئناک ظالمین لأنفسنا مستغفرین من ذنوبنا فاستغفرلنا واشفع لنا إلی ربنا واسئلہ أن یمن علینا لسائرمطلوباتنا وأن یمیتناعلی سنتک وأن یحشرنا في زمرتک وأن یوردناحوضک وأن یسقینابکأسک غیر خزایا ولا نادمین .

پھر تین مرتبہ یہ کہے: ’’ **یارسول اللّٰہ أسألک الشفاعۃ** ‘‘.

(ملخص از عمدۃ الفقہ:٤/٦٩٢۔٦٩٦،زوار اکیڈمی۔ولباب المناسك مع شرحہ:٥٥٨۔٥٦١،فصل ولوتوجہ الی الزیارۃ،بیروت۔والفتاوی الھندیۃ:١/٢٦٥۔وفتح القدیر:٣/٩٥،دارالفکر۔واعلاء السنن:١/٥٠٢).

واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استشفاع اور توسل کا حکم:

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر حاضری کے وقت ان سے استشفاع یعنی شفاعت طلب کرنا کہ آپ ہماری شفاعت فرمادیں جائز ہے یا نہیں؟ اور توسل کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استشفاع اور توسل جائز ہے اور علمائے دیوبند اس کے قائل ہیں، امام مالکؒ سے ابوجعفر منصور نے سوال کیا کہ کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی طرف منہ کر کے دعا کروں یا قبلہ کی طرف تو انہوں نے فرمایا:

’’فقال :لا تصرف وجھک عنہ وھو وسیلتک ووسیلۃ أبیک آدم علیہ السلام إلی اللّٰہ تعالیٰ یوم القیٰمۃ، بل استقبلہ واستشفع بہ إلی ربک یشفعک،قال اللّٰہ تعالیٰ:﴿ولو أنھم إذ ظلموا أنفسھم جاء وک فاستغفروا اللّٰہ واستغفرلھم الرسول لوجدوا اللّٰہ توابًا رحیمًا﴾

(ترتیب المدارك للقاضی عیاض:١/٢١١، فی باب اخبارمالكؒ مع الملوك ووعظہ ایاھم).

حافظ ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

روى أبو الفرج ابن الجوزي بسنده إلى ميسرة قال: قلت: يارسول الله متى كنت نبياً قال: " لما خلق الله الأرض واستوىٰ إلى السماء فسواهن سبع سمٰوات وخلق العرش كتب على ساق العرش " محمد رسول الله، خاتم الأنبياء " وخلق الله الجنة التي أسكنها آدم وحواء فكتب اسمي على الأبواب والأوراق والقباب والخيام، وآدم بين الروح والجسد فلما أحياه الله تعالىٰ نظر إلى العرش، فرأى اسمي فأخبره الله أنه سيد ولدك، فلما غرهما الشيطان، تابا واستشفعا باسمي إليه ".

پھر اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: عن عبدالرحمن بن زيد بن أسلم عن أبيه عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لما أصاب آدم الخطيئة رفع رأسه فقال: يارب بحق محمد إلا غفرت لي فأوحى إليه وما محمد؟ ومن محمد؟ فقال: يارب إنك لما أتممت خلقي رفعت رأسي إلى عرشك فإذا عليه مكتوب: " لا إله إلا الله محمد رسول الله " فعلمت: أنه أكرم خلقك عليك إذ قرنت اسمه مع اسمك، فقال: نعم، قد غفرت لك وهو آخر الأنبياء من ذريتك، ولولاه ماخلقتك". (الفتاوی لابن تیمیة: ۲/ ۱۵۰، المقالة الاولیٰ "مقالة ابن عربی...").

اس سے قطع نظر کے ان روایات کا کیا درجہ ہے اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ضعیف ہے، حافظ ابن تیمیہؒ نے ان روایات کو استشہاد میں پیش فرمایا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس شخص کا قصہ ذکر کیا جو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر آیا اور توسل کیا۔

(فتح الباری: ۵/ ۲٦۵).

ابن کثیرؒ نے "البدایۃ والنہایۃ" میں آدم علیہ السلام کا توسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (البدایة والنهایة: ۱/ ۱۸۰).

وحكى ابن كثير عن البيهقي عن أبي صالح عن مالك قال: أصاب الناس قحط في زمن عمر بن الخطاب رضي الله عنه فجاء رجل إلى قبر النبي صلى الله عليه وسلم فقال: يارسول الله استسق الله لأمتك فإنهم قد هلكوا، فأتاه رسول الله صلى الله عليه وسلم في المنام فقال: " ائت عمر فاقرأه مني السلام، واخبرهم أنهم مسقون، وقل له عليك الكيس، الكيس"

فأتى الرجل عمر رضي الله عنه فأخبر عمر رضي الله عنه فقال: يارب ما آلو إلا ما عجزت عنه. وهذا اسناد صحيح كذا قال الحافظ ابن كثيرؒ في البداية والنهاية: ۹۸/۷، في حوادث ثمانية عشر طبعة ملونة الرياض).

وروى ابن أبي شيبة بإسناد صحيح من رواية أبي صالح السمان عن مالك الداري وكان خازن عمر رضي الله عنه قال: أصاب الناس قحط في زمن عمر رضي الله عنه فجاء رجل إلى قبر النبي صلى الله عليه وسلم فقال: يارسول الله استسق لأمتك فإنهم قد هلكوا، فأتى الرجل في المنام فقيل له ائت عمر، الحديث، وقد روى سيف في الفتوح أن الذي رأى في المنام المذكور هو بلال بن الحارث المزني رضي الله عنه أحد الصحابة. (فتح الباري: ۲/۴۹۵، باب سوال الناس الامام الاستسقاء)

اشاعت التوحید کے متفقہ قابل اعتماد شخصیت اور اس کے اکابر کے استاذ وشیخ حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ تعالیٰ تلمیذ حضرت گنگوہی تحریراتِ حدیث میں تحریر فرماتے ہیں:

وروى البيهقي وابن أبي شيبة أن بلال بن الحارث رضي الله تعالىٰ عنه جاء إلى قبر النبي صلى الله عليه وسلم قال: يارسول الله استسق لأمتك فإنهم قد هلكوا فأتاه رسول الله صلى الله عليه وسلم في المنام وأخبرهم أنهم يسقون، روى البيهقي في دلائل النبوة عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم:" لما اقترف آدم الخطيئة قال: يارب أسألك بحق محمد إلا ما غفرت لي قال الله: فقد غفرت لك ولولا محمد ماخلقتك، رواه الحاكم أيضاً وصححه، ورواه الطبراني وزاد وهو آخر الأنبياء من ذريتك. روى الدارمي عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: انظروا إلى قبر رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجعلوا منه كوة إلى السماء ففعلوا فمطروا قال العلامة ابن حجرؒ في " الجوهر المنظم "روى بعض الحفاظ عن أبي سعيد السمعاني أنه روي عن علي أنهم بعد دفن النبي صلى الله عليه وسلم جاء اعرابي فقال: يارسول الله جئتك تستغفرلي إلى ربي فنودي من القبر الشريف قد غفرلك وأتت" لعله قالت"صفية عمة النبي صلى الله عليه وسلم بعد وفاته" ألا يارسول الله أنت رجاء نا، وكنت بنابراً ولم تك جافياً " وسمع الصحابة ولم ينكرها أحد. (تحريراتِ حديث: ۲۵۶).

یہ کتاب حضرت مولانا حسین علی کی زندگی میں ملتان سے چھپی اس کے سرورق پر لکھا ہے ملنے کا پتہ الحاج مولانا حسین علی صاحب ڈاکخانہ واں بھچراں ضلع میانوالی پنجاب۔ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مولانا

محمد طاہر صاحب پنج پیری مولانا غلام اللہ خان صاحب مولانا سید عنایت اللہ شاہ گجراتی صاحب حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب، حضرت مولانا سرفراز خان صاحب، حضرت مولانا عبدالہادی شاہ منصوری کے چہیتے اور پیارے اور قابل اعتماد شیخ ہیں۔

ملا علی قاری کی المسلک المتقسط اور اس کے حاشیہ ارشاد الساری میں روضہ اقدس کے سامنے صلاۃ وسلام کی لمبی عبارت لکھنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

ثم أي في تلک الساعة يطلب الشفاعة أي في الدنيا بتوفيق الطاعة وفي الآخرة بغفران المعصية، فيقول يارسول الله أسألک الشفاعة ثلا ثاً، لأنه أقل مراتب الإلحاح. (شرح اللباب مع ارشاد الساری: ۵۶۰، بیروت)۔

قاری سعید احمد صاحب مفتی اعظم مظاہر العلوم سہارنپور نے معلم الحجاج میں صلاۃ وسلام کے مفصل الفاظ ذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے: اس کے بعد آپ کے وسیلہ سے دعا کرے اور شفاعت کی درخواست ان الفاظ سے کرے۔" یا رسول اللّٰہ أسألک الشفاعة وأتوسل بک إلی اللّٰہ في أن أموت مسلماً علی ملتک وسنتک"۔ (معلم الحجاج: ۳۸۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حضرت آدم علیہ السلام کے توسل والے قصہ کی تحقیق:

سوال: حضرت آدم علیہ السلام نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا مانگی تھی اور دعا قبول ہوئی، حدیث میں پورا قصہ مذکور ہے، سنداً اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب: أخرج الحاكم بسنده عن عمربن الخطاب رضي اللّٰہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ عليه وسلم: " لما اقترف آدم الخطيئة قال: يا رب أسألک بحق محمد لما غفرت لي، فقال اللّٰہ: يا آدم وكيف عرفت محمداً ولم أخلقه، قال: يا رب لأنک لما خلقتني بيدک ونفخت في من روحک رفعت رأسي فرأيت علی قوائم العرش مكتوباً:" لا إله إلا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ " فعلمت أنک لم تضف إلی اسمک إلا أحب الخلق إليک، فقال اللّٰہ: صدقت يا آدم إنه لأحب الخلق إلي ادعني بحقه فقد غفرت لک ولولا محمد ما خلقتک " وصححه، وتعقبه الذهبي فقال: بل موضوع، وعبد الرحمن واهٍ، رواه عبد اللّٰہ بن سلم الفهري ولا أدري من ذا عن إسماعيل بن مسلمة عنه. (المستدرک للحاکم

مع التلخيص للذهبي :٢/٦١٥، ذكر أخبار سيد المرسلين ، كتاب التاريخ).

وأخرجه البيهقي عن الحاكم في " دلائل النبوة "(٤٨٩/٥) في باب ما جاء في تحدث رسول الله صلى الله عليه وسلم بنعمة ربه عز وجل وما جاء في خصائصه. وقال: تفرد به عبد الرحمن بن زيد بن أسلم من هذا الوجه عنه، وهو ضعيف.

ولكن قال الذهبي في " الميزان "(٥٠٤/٢) في ترجمة عبد الله بن مسلم :

روى عن إسمعيل بن مسلمة بن قعنب عن عبد الرحمن بن زيد بن أسلم خبراً باطلاً "فيه يا آدم لولا محمد ما خلقتک " رواه البيهقي في دلائل النبوة ، وأقره الحافظ في "اللسان"(٣٦٠/٣)، ولكن لم ينفرد عبد الله بن مسلم به فقد تابعه غيره في هذا كما أخرجه الطبراني في" المعجم الصغير"(٨٢/٢) من حديث محمد بن داود بن أسلم الصدفي المصري ثنا أحمد بن سعيد المدني الفهري ثنا عبد الله بن إسماعيل المدني عن عبد الرحمن بن زيد بن أسلم عن بيه عن جده عن عمر بن الخطاب بمعناه .

لكن هذا السند فيه من لم أجد تراجمهم. وقال الهيثمي في " المجمع "(١٥٣/٨): رواه الطبراني في الأوسط والصغير، وفيه من لم أعرفهم .

ورواه أبو نعيم أيضاً في كتاب دلائل النبوة من طريق الشيخ أبي الفرج عن سليمان بن أحمد بن رشدين عن أحمد بن سعيد الفهري عن عبد الله بن إسماعيل المدني عن عبد الرحمن بن زيد بن أسلم عن أبيه عن عمر الخطاب رضي الله عنه، ونقله عنه ابن تيمية في" فتاواه " (١٥١/٢) مستشهداً به .

والحاصل أن الحديث تفرد به عبد الرحمن بن زيد بن أسلم وهو ضعيف ضعفه الكل، إلا ابن عدي فإنه قال في "الكامل"(١٥٨٥/٤): له أحاديث حسان ...وهو ممن احتمله الناس وصدقه بعضهم وهو ممن يكتب حديثه .

وله شاهد قوي فقد أخرج الحافظ أبو الحسن بن بشران بسنده عن ميسرة قال: قلت: يا رسول الله متى كنت نبياً ؟ قال: لما خلق الله الأرض واستوى السماء فسواهن سبع سموات... وفي آخره : فلما أحياه الله تعالى(آدم) نظر إلى العرش فرأى اسمي، فأخبره الله أنه سيد ولدک، فلما غرهما الشيطان، تابا، واستشفعا باسمي إليه. وأخرجه

ابن الجوزي في الوفاء بفضائل المصطفى من طريق ابن بشران، ونقله عنه ابن تيميةؒ في "فتاواه"(۲/ ۱۵۰) مستشهداً به .

وقال المحقق السيد عبد اللّٰه بن الصديق الغماري:"إسناد هذا الحديث قوي، وهو أقوى شاهد وقفت عليه لحديث عبد الرحمن بن زيد" وكذا قال الحافظ ابن حجر.

قلت: إسناده مسلسل بالثقات، ما خلا راوٍ واحدٍ صدوق .

فالصواب أن هذا الإسناد من شرط الحسن على الأقل، ويصححه من يدخل الحسن في الصحيح من الحفاظ كابن حبان والحاكم .

فقول الذهبي والألباني: موضوع، غير صواب .

وللمزيد من البحث انظر "رفع المنارة" (ص۲۴۲-۲۴۹)۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔

اقسام توسل اوران کا شرعی حکم:

سوال: اگر کوئی شخص مقبرہ میں جاکر کسی بزرگ کی قبر پر حاضر ہوجائے اور یوں کہدے کہ اے فلاں بزرگ آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد عطا کردے، یا یہ کہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مجھے اولاد دیدیں، یا یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس بزرگ کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں، ان تینوں صورتوں کا شرعاً کیا حکم ہے۔

الجواب: (۱) یہ کہنا کہ آپ میرے لیے دعا کیجئے سماع موتی پر مبنی ہے، جو زمانۂ قدیم سے مختلف فیہ ہے، اس کی قدرے تفصیل متفرقات الجنائز میں گزرچکی ہے، سلام کا سننا تو روایات سے ثابت ہے، لیکن اس کے علاوہ مختلف فیہ ہے، لہذا یہ الفاظ نہیں کہنا چاہئے۔

(۲) اور یہ کہنا کہ آپ مجھے اولاد عطا کردیں شرک ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، اس کو مجاز عقلی پر بھی محمول نہیں کرسکتے کیونکہ مجاز عقلی مثلاً "أنبت الربيع البقل"، موسم بہار نے سبزی اگائی اس میں کہنے والے کا عقیدہ ہے کہ بہار کچھ نہیں کرسکتی، بہار تو صرف انبات کا وقت اور سبب ہے، جبکہ یہاں بزرگ کو عوام سب کچھ سمجھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ربیع تو انبات کے لیے سببِ ظاہری ہے، جبکہ بزرگ اولاد کا سببِ ظاہری نہیں ہے۔

اور (۳) تیسری صورت یعنی بزرگ کے وسیلہ سے دعا علماء دیوبند کے نزدیک درست ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی توسل کو سلف سے نقل کیا اور توسل بالذات میں اگر مقصود توسل بالمحبت ہو تو اس کو جائز کہا ان کی کتاب

”قاعدۃ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ“ کی فوٹو کاپی ملاحظہ کیجئے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ وسیلہ بالذات کو تاویل کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس زمانہ کے بعض غیر محتاط مؤلفین اس کو صریح شرک گردانتے ہیں اور اس کے مرتکب کو دین سے خارج اور مخلد فی النار سمجھتے ہیں۔
چنانچہ ابوبکر الجزائری کا کلام ان کی کتاب عقیدۃ المؤمن سے ملاحظہ فرمائیں:

ل الشیخ الألبانی فی التوسل وأنواعه وأحكامه ص ٦٨ : ولكن هذا مدفوع بأن أنه الخطمي.

ریف کے محقق نسخوں میں بھی الخطمی آیا ہے۔

ہو سنن ترمذی بتحقیقِ شیخ البانی: قال أبوعيسى: هذا حديث حسن صحيح غريب لا نعرفه ـذا الوجه من حديث أبي جعفر و هو الخطمي. قال الألباني: صحيح. (ترمذی ۳۵۷۸/۵۶۹۔وھکذا فی صحیح وضعیف سنن ترمذی للشیخ الالبانی(۳۵۷۸)۔وتعلیق بشارعوادعلی مذی: ۳۵۷۸/۵۳۷/۵۔وبتحقیق محمدفؤاد:۳۵۷۸/۵۳۱/۵۔وعارضة الاحوذی:ص ۸۱۔وجامع سنن لابن کثیر:۶۳۳۲/۲۳۵۷/۵).

ان میں سے بعض نسخوں کی فوٹو کاپی ملاحظہ فرمائیں:

﴿ترمذی شریف بتحقیقِ بشارعواد﴾

۵۳۷

قَال: حَدَّثَنَا شُعبةُ، عن أبي جَعْفرٍ، عن عُمارةَ بن خُزَيْمةَ بن ثَابتٍ، عن عُثمانَ بن حُنَيْفٍ أنَّ رَجُلاً ضَرِيرَ الْبَصرِ أتى النبيَّ ﷺ فقال: ادْعُ الله أنْ يُعافِيَني قال: «إنْ شِئْتَ دَعَوْتُ، وإنْ شِئْتَ صَبرْتَ فَهو خَيْرٌ لَكَ». قال: فَادْعهُ، قال: فَأمرهُ أنْ يَتوضَّأ فَيُحْسنَ وُضُوءَهُ وَيَدْعُو بهذا الدُّعَاءِ: «اللَّهُمَّ إنِّي أسْألُكَ وَأتَوجَّهُ إلَيْكَ بِنَبيِّكَ محمدٍ نَبيِّ الرَّحْمةِ، إنِّي تَوَجَّهْتُ بِكَ إلى رَبِّي في حَاجَتِي هذه لِتُقْضى لي، اللَّهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ»[1].

هذا حديثٌ حَسَنٌ صحيحٌ غريبٌ لاَ نَعرِفهُ إلاَّ من هذا الْوَجْهِ، من حديثِ أبي جَعْفرٍ وهو الْخَطْميُّ[2].

عقيدة المؤمن

ومن تلك التوسلات الباطلة الممنوعة :

١ ـ دعاء الأولياء والصالحين :

إن دعاء الصالحين والاستغاثة بهم ، والتوسل بـ
دين الله تعالى قربة ولا عملاً صالحاً فيتوسل به أبداً
في عبادة الله محرما ، يخرج فاعله من الدين ، ويو
جهنم

تأليف

ابوبكر جابر الجزائري

شیخ عبدالوہاب نجدیؒ نے بھی مسئلہ توسل میں میانہ روی اختیار فرمائی ہے
فقہی مسائل سے متعلق ہے، اگر چہ ہمارے نزدیک مکروہ ہے، (نہ حرام نہ بدعت
انکار نہیں کرتے ہیں، کیونکہ اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے پر انکار روا نہیں
عبارت ملاحظہ فرمائیں: **فقال: فالفرق ظاهراً جداً، وليس الكلام مما**
بالتوسل بالصالحين، وبعضهم يخصه بالنبي صلى الله عليه وسلم،
ويكرهه، فهذه المسألة من مسائل الفقه، وإن كان الصواب عندنا
فلا ننكر على من فعله، ولا إنكار في مسائل الاجتهاد. (فتاوى الشيـ
مجموعة المؤلفات القسم الثالث: ص٦٨)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

روایتِ توسل میں ابوجعفر کے ساتھ لفظِ خطمی کی مکمل تحقیق

سوال: توسل بالذات کی روایت جو ترمذی شریف میں ہے اکثر ر

شیخ عبدالوہاب نجدیؒ نے بھی مسئلہ توسل میں میانہ روی اختیار فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ مسئلہ توسل فقہی مسائل سے متعلق ہے، اگر چہ ہمارے نزدیک مکروہ ہے، (نہ حرام نہ بدعت) لیکن پھر بھی کرنے والوں پر ہم انکار نہیں کرتے ہیں، کیونکہ اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے پر انکار روا نہیں۔

عبارت ملاحظہ فرمائیں: **فقال: فالفرق ظاهراً جداً، وليس الكلام مما نحن فيه، فكون بعض يرخص بالتوسل بالصالحين، وبعضهم يخصه بالنبي صلى الله عليه وسلم، وأكثر العلماء ينهى عن ذلك ويكرهه، فهذه المسألة من مسائل الفقه، وإن كان الصواب عندنا قول الجمهور من أنه مكروه، فلا ننكر على من فعله، ولا إنكار في مسائل الاجتهاد.** (فتاوى الشيخ الإمام محمد بن عبد الوهاب في مجموعة المؤلفات القسم الثالث:ص٦٨)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

روایتِ توسل میں ابوجعفر کے ساتھ لفظِ خطمی کی مکمل تحقیق:

سوال: توسل بالذات کی روایت جو ترمذی شریف میں ہے اکثر روایات میں " أبو جعفر الخطمي "

کا ذکر ہے جو ثقہ راوی ہے، لیکن ترمذی کے ہندی نسخوں میں "وھو غیر الخطمي" آیا ہے فتاوی دار العلوم جلد اول (ص ۱۹۸) میں ان ہندی نسخوں کی تغلیط کی گئی ہے اور "وھو الخطمي" کو صحیح قرار دیا گیا ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے تقریب التہذیب (۷۴۸) میں ترمذی کے حوالہ سے "لیس ھو الخطمي" ذکر فرمایا ہے اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: توسل کی روایت میں ابوجعفر کے ساتھ "الخطمي" ہی صحیح ہے اس لیے کہ کتبِ کثیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے مثلاً مسند احمد، مستدرک حاکم، معجم کبیر وصغیر، معرفۃ الصحابہ، نسائی، عمل الیوم واللیلۃ، تہذیب الکمال للحافظ المزی، فتاوی ابن تیمیہ، بیہقی دلائل النبوۃ، مسند الصحابہ، تحفۃ الاشراف، وغیرہ ان تمام کتب میں "وھو الخطمي" کا ذکر ہے، لہذا حافظ ابن حجرؒ کو وہم ہوا ہے کہ انہوں نے ترمذی شریف کے غلط نسخہ پر اعتماد کرتے ہوئے غیر خطمی تحریر فرمایا۔ نیز ابوجعفر خطمی مدنی ہے اور جن روایات میں ان کے ساتھ مدنی آیا ہے اس سے بھی مدنی ہی مراد ہے۔

ملاحظہ فرمائیں مسند احمد میں ہے:

عن شعبة عن أبي جعفر المديني قال: سمعت عمارة بن خزيمة بن ثابت يحدث عن عثمان بن حنيف الحديث، وعن جماد يعني ابن أبي سلمة قال ثناأبوجعفر الخطمي عن عمارة ... (مسنداحمد: ٤/١٣٨).

معجم صغیر میں ہے:

عن روح بن القاسم عن أبي جعفر الخطمي المدني عن أبي أمامة بن سهيل بن حنيف عن عمه... (المعجم الصغير للطبراني: ١/١٨٣).

دلائل النبوۃ میں ہے:

عن شعبة، عن أبي جعفر الخطمي، قال: سمعت عامر بن خزيمة بن ثابت يحدث عن عثمان بن حنيف... ورويناه في كتاب الدعوات بإسناد صحيح عن روح بن عبادة عن شعبة، ففعل الرجل فبرأ. وكذلك رواه حماد بن سلمة عن أبي جعفر الخطمي. وعن روح بن القاسم، عن أبي جعفر المديني وهو الخطمي، عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف عن عمه عثمان بن حنيف قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وجاء ه رجل ضرير... وعن إسماعيل بن شبيب عن أبيه عن روح بن القاسم، عن أبي جعفر المديني، عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف أن رجلاً كان يختلف إلى عثمان بن عفان ﷺ... الحديث. (دلائل النبوة

للبیهقی:٦/١٦٦،باب ما فی تعلیمه الضریر...دارالکتب العلمیة).

معرفۃ الصحابہ میں ہے:

حدثنا سليمان بن أحمد، قال: حدثنا إدريس بن جعفر، ثنا عثمان بن عمربن فارس ح، وحدثنا أبوبكربن مالك،حدثنا عبد الله بن أحمد،حدثني أبي، ثناعثمان بن عمر، ثنا شعبة، عن أبي جعفر الخطمي، ثنا سليمان عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف، عن عمه عثمان بن حنيف... الحديث. وعن عبد الله بن أحمد بن حنبل،حدثني أبي، ثناروح ، ثناشعبة، عن أبي جعفر المديني، سمعت عمارة بن خزيمة.... و رواه حماد بن سلمة عن أبي جعفر الخطمي، عن عمارة بن خزيمة مثله. وعن أبي سعيد و اسمه شبيب بن سعيد من أهل البصرة عن أبي جعفر المديني،عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف... الحديث. (معرفة الصحابةلابی نعیم الاصبهانی:٣/٣٦٧/٤٩٤٤،٤٩٤٥،٤٩٤٦،تحت ترجمة عثمان بن حنيفالانصاری،دارالکتاب العلمیة بیروت).

مستدرک حاکم میں ہے:

أخبرنا حمزة بن العباس العقبي ببغداد ثنا العباس بن محمد الدوري ثنا عون بن عمارة البصري ثنا روح بن القاسم عن أبي جعفرالخطمي عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف عن عمه عثمان بن حنيف ﷺ أن رجلاً ضرير البصر...الحديث. وعن أحمد بن شبيب بن سعيد الحبطي حدثني أبي عن روح بن القاسم عن أبي جعفر المدني وهوالخطمي عن أبي أمامة .... الحديث. (المستدرك للحاکم:١/٦٨٦/١٩٢٩،١٩٣٠،کتاب الدعاء،دارابن حزم).

عمل الیوم واللیلہ میں ہے:

أخبرني أبوعروبة قال: حدثنا العباس بن الفرج الرياشي والحسن بن يحيى الرُّزِّي قالا: حدثنا أحمد بن شبيب بن سعيد ثناأبي عن روح بن القاسم عن أبي جعفر المدني ــ وهو الخطمي ــ عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف قال:سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وجاء إليه رجل ضرير... الحديث. (عمل الیوم واللیلة لابن السنی،باب مایقول لمن ذهب بصره:٢/٦٠٧،دارابن حزم-وعمل الیوم واللیلة للنسائی:ص٢٠٤،ذکرحدیث عثمان بن حنیف ،دارالفکر).

تہذیب الکمال میں ہے:

أخبرنا أبوالفرج بن قدامة، وأبوالحسن ابن البخاري، وأبوالغنائم بن علان، وأحمد بن

شيبان، قالوا: أخبرنا حنبل ...عن عثمان بن عمر، قال: حدثنا شعبة، عن أبي جعفر وهو الخطمي، قال: سمعت عمارة ... الحديث. (تهذيب الكمال:۳۵۹/۱۹،تحت ترجمة عثمان بن حنيف،مؤسسة الرسالة).

تمام روایات کا خلاصہ نقشۂ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:
(خطمی ،مدیني اور مدنی ایک ہی راوی کی مختلف نسبتیں ہیں)

راوی حدیث	راوی حدیث کی مختلف نسبتیں	راوی حدیث	صحابیؓ	کتب
شعبة	ابوجعفروهو الخطمی	عن عمارة	عثمان بن حنيفؓ	تهذيب الكمال
	عن ابی جعفر	عن عمارة	عثمان بن حنيف	سنن كبرى للنسائی،مسنداحمد، عمل اليوم الليلة للنسائی،مسندعبد بن حميد
	الخطمی	عن عامربن خزيمة و ابوامامة، وعمارة	عثمان بن حنيف	دلائل النبوة للبيهقی، معرفة الصحابة،معجم الصحابةلابن القانع،علل الحديث لابن ابی حاتم
	المدينی		عثمان بن حنيف	دلائل النبوة للبيهقی، معرفة الصحابة، مسند احمد،جامع المسانيد والسنن لابن كثير

	المدنی	عمارة	عثمان بن حنیف	ابن ماجه،صصحیح ابن خزیمة
روح بن قاسم	المدنی وهوالخطمی	ابوامامة	عثمان بن حنیفؓ	مستدرک للحاکم،عمل الیوم واللیلة لابن السنی
	المدینی وهوالخطمی	ابوامامة	عثمان بن حنیف	دلائل النبوة للبیهقی
	الخطمی المدنی	ابوامامة	عثمان بن حنیف	معجم صغیروکبیرللطبرانی
	الخطمی		عثمان بن حنیف	مستدرک للحاکم،
حمادبن سلمة	ابوجعفر	عمارة	عثمان بن حنیف	عمل الیوم واللیلة للنسائی
	الخطمی	عمارة	عثمان بن حنیف	معرفة الصحابة،مسند احمد،دلائل النبوة للبیهقی،جامع المسانیدوالسنن لابن کثیر
شبیب بن سعید	المدینی	ابوامامة	عثمان بن حنیف	معرفة الصحابة،

علامہ ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ ترمذی میں غیرالخطمی آیا ہے، لیکن امام ترمذیؒ کے علاوہ بقیہ تمام علماء نے فرمایا کہ یہ ابوجعفرالخطمی ہے اور یہی صحیح ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ ابن تیمیہ میں ہے: **ومنها ما رواه النسائي وابن ماجه أيضاً وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه من حديث أبي جعفر وهوغيرالخطمي، هكذا وقع في الترمذي، وسائر العلماء قالوا: هو أبوجعفرالخطمي وهوالصواب.** (مجموع فتاوى ابن تيمية: ١/٢٦٦).

وقال الشيخ الألباني في التوسل وأنواعه وأحكامه ص۲۸ : ولكن هذا مدفوع بأن الصواب أنه الخطمي.

نیز ترمذی شریف کے محقق نسخوں میں بھی الخطمی آیا ہے۔

ملاحظہ ہو سنن ترمذی بتحقیقِ شیخ البانی: **قال أبوعيسىٰ: هذا حديث حسن صحيح غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه من حديث أبي جعفر و هو الخطمي. قال الألباني: صحيح.** (ترمذی شریف:۵/۵۶۹/۳۵۷۸۔وھکذا فی صحیح وضعیف سنن ترمذی للشیخ الالبانی(۳۵۷۸)۔وتعلیق بشارعوادعلی سنن ترمذی: ۵/۵۳۷/۳۵۷۸۔ وبتحقیق محمدفؤاد:۵/۵۳۱/۳۵۷۸۔وعارضة الاحوذی:ص۸۱۔وجامع المسانیدوالسنن لابن کثیر:۵/۲۳۵۷/۶۳۳۲)۔

ان میں سے بعض نسخوں کی فوٹو کاپی ملاحظہ فرمائیں:

﴿ترمذی شریف بتحقیقِ بشارعواد﴾

ے کی تو یں یہی آیا ہے۔

ن ترمذی بتحقیقِ شیخ البانی: قال أبوعیسیٰ: هذا حديث حسن صحيح غريب لا نعرفه الوجه من حديث أبي جعفر و هو الخطمي. قال الألباني: صحيح. (ترمذی /۳۵۷۸۔وھکذا فی صحیح وضعیف سنن ترمذی للشیخ الالبانی(۳۵۷۸)۔وتعلیق بشارعوادعلی : ۳۵۷۸/۵۳۷/۵۔ وبتحقیق محمدفؤاد: ۳۵۷۸/۵۳۱/۵۔وعارضۃ الاحوذی: ص ۸۱۔وجامع لابن کثیر: ۶۳۳۲/۲۳۵۷/۵).

ان میں سے بعض نسخوں کی فوٹو کاپی ملاحظہ فرمائیں:

﴿ترمذی شریف بتحقیقِ بشارعواد﴾

۵۳۷

ي: حَدَّثَنَا شُعبةُ، عن أبي جَعْفرٍ، عن عُمارةَ بن خُزَيْمةَ بن ثَابتٍ، عن مانَ بن حُنَيْفٍ أنَّ رَجُلاً ضَرِيرَ الْبَصرِ أتى النبيَّ ﷺ فقال: ادْعُ الله أنْ فِيَني قال: «إنْ شِئْتَ دَعَوْتُ، وَإنْ شِئْتَ صَبرْتَ فَهو خَيْرٌ لَكَ». قال: عهُ، قال: فَأمرهُ أنْ يتوضأَ فَيُحْسنَ وُضُوءَهُ وَيَدْعُو بهذا الدُّعَاءَ: «اللَّهُمَّ أسألُكَ وَأتَوجَّهُ إلَيْكَ بِنَبيِّكَ محمدٍ نَبيِّ الرَّحْمةِ، إنِّي تَوَجَّهتُ بِكَ إلى في حَاجَتي هذه لِتُقْضى لي، اللَّهُمَّ فَشفِّعْهُ فِيَّ»[1].

هذا حديثٌ حَسَنٌ صحيحٌ غريبٌ لاَ نَعْرِفهُ إلاّ من هذا الْوَجْهِ، من يثِ أبي جَعْفرٍ وهو الْخَطْميّ[2].

﴿ترمذی شریف بتحقیق احمد شاکر﴾

Pictures\untitled8.bmp not found.

﴿عارضۃ الاحوذی شرح الامام ابن العربی المالکی﴾

Pictures\untitled9.bmp not found.

٣٥٧٨ - حَدَّثَنَا مَحْمُودُ بْنُ غَيْلَانَ. حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عُمَرَ. حَدَّثَنَا شُ
أَبِي جَعْفَرٍ عَنْ عِمَارَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَيْفٍ أَنَّ رَجُلاً ضَرِيرَ
أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: آدْعُ اللهَ أَنْ يُعَافِيَنِي قَالَ: إِنْ شِئْتَ دَ
وَإِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ. قَالَ: فَادْعُهُ، قَالَ: فَأَمَرَهُ أَنْ يَتَوَضَّأَ فَيُحْسِنَ
وَيَدْعُو بِهٰذَا الدُّعَاءِ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ
تَوَجَّهْتُ بِكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي هٰذِهِ لِتُقْضَى لِي، اللَّهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ.

قَالَ: هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ
حَدِيثِ أَبِي جَعْفَرٍ وَهُوَ الْخَطْمِيُّ، وَعُثْمَانُ بْنُ حُنَيْفٍ هُوَ أَخُو سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ

٣٥٧٧ - (أبو داود) الصلاة: باب في الاستغفار.
٣٥٧٨ - (النسائي في عمل اليوم والليلة) (ص/٢٠٤) باب ذكر حديث عثمان بن حنيف
ماجه) إقامة الصلاة والسنة فيها: باب ما جاء في صلاة الحاجة.

دَعَوْتَ وَإِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قَالَ فَادْعُهُ قَالَ فَأَمَرَهُ أَنْ يَتَو
فَيُحْسِنَ وُضُوءَهُ وَيَدْعُو بِهٰذَا الدُّعَاءِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِ
مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ إِنِّي تَوَجَّهْتُ بِكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي هٰذِهِ لِتُقْضَى لِي ا
فَشَفِّعْهُ فِيَّ قَالَ هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ
الْوَجْهِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي جَعْفَرٍ وَهُوَ الْخَطْمِيُّ وَعُثْمَانُ بْنُ حُنَيْفٍ هُوَ أَ
سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ حدثنا عَبْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَخْبَرَنَا إِسْحٰقَ

﴿ترمذی شریف بتحقیقِ مصطفیٰ محمد حسین الذہبی﴾

Pictures\untitled11.bmp not found.

Pictures\untitled10.bmp not found.

﴿تحفۃ الاشراف للامام المزی: ۷/۲۳۶﴾

Pictures\untitled12.bmp not found.

﴿ترمذی شریف بتحقیقِ مصطفیٰ محمد حسین الذہبی﴾

(١١٩) باب [م ١١٨ - ت تابع ١٢٧]

٣٥٧٨ - حَدَّثَنَا مَحْمُودُ بْنُ غَيْلاَنَ، حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عُمَرَ، حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ، عَنْ عُمَارَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ، عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَيْفٍ: أَنَّ رَجُلاً ضَرِيرَ الْبَصَرِ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ادْعُ اللَّهَ أَنْ يُعَافِيَنِي، قَالَ: «إِنْ شِئْتَ دَعَوْتُ، وَإِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ» قَالَ: فَادْعُهْ، قَالَ: فَأَمَرَهُ أَنْ يَتَوَضَّأَ فَيُحْسِنَ وُضُوءَهُ وَيَدْعُوَ بِهَذَا الدُّعَاءِ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ، إِنِّي تَوَجَّهْتُ بِكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي هَذِهِ لِتُقْضَى لِيَ، اللَّهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ».

قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ لاَ نَعْرِفُهُ إِلاَّ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي جَعْفَرٍ، وَهُوَ الْخَطْمِيُّ.

وَعُثْمَانُ بْنُ حُنَيْفٍ هُوَ أَخُو سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ.

﴿تحفۃ الاشراف للامام المزی: ۷/۲۳۶﴾

٣٥٩ ـ ومن مسند

عثمان بن حُنيف الأنصاري عن النبي ﷺ

وهو أخو سهل بن حنيف، وعم أبي أمامة بن سهل بن حنيف

٩٧٦٠ حديث: أن رجلا ضرير البصر أتى النبي ﷺ فقال: ادع الله أن يعافيني.. الحديث. ت في الدعوات (١٢٧ : ٥) عن محمود بن غيلان، عن عثمان بن عمر، عن شعبة، عن أبي جعفر الخطمي، عن عمارة بن خزيمة بن ثابت، عنه به. وقال: حسن صحيح غريب، لا نعرفه إلا من حديث أبي جعفر الخطمي. س في اليوم والليلة

﴿ترمذی شریف بتحقیق محمود محمد محمود حسن نصار﴾

(١١٩) بَاب

[المعجم:١١٨ ـ التحفة: تابع١٢٧]

٣٥٧٨ ـ حَدَّثَنَا مَحْمُودُ بْنُ غَيْلَانَ، حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عُمَرَ، حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ، عَنْ عُمَارَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ، عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَيْفٍ أَنَّ رَجُلاً ضَرِيرَ الْبَصَرِ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: ادْعُ اللَّهَ أَنْ يُعَافِيَنِي، قَالَ: «إِنْ شِئْتَ دَعَوْتُ وَإِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ» قَالَ: فَادْعُهُ قَالَ: فَأَمَرَهُ أَنْ يَتَوَضَّأَ فَيُحْسِنَ وُضُوءَهُ وَيَدْعُوَ بِهَذَا الدُّعَاءِ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ إِنِّي تَوَجَّهْتُ بِكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي هَذِهِ لِتُقْضَى لِيَ، اللَّهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ».

قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ لا نَعْرِفُهُ إِلا مِنْ هَذَا الْوَجْهِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي جَعْفَرٍ وَهُوَ الْخَطْمِيُّ، وَعُثْمَانُ بْنُ حُنَيْفٍ هُوَ أَخُو سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ.

حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی اس مقام پر وہم ہوا کہ ہے انہوں نے تح
حدیث میں بحوالہ مستدرک حاکم ابو جعفر کے ساتھ المدائنی تحریر فرمایا ہے جب کہ مستدرک حاکم (١/٤١٦/
کتاب صلاۃ التطوع) میں ابو جعفر المدینی آیا ہے اور دوسری جگہ (١/٦٨٧/١٩٣٠، کتاب الدعاء) میں الم
الخطمی آیا ہے۔

تحریرات حدیث کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وروى الحاكم في مستدركه في ص ٤٠٧ في باب صلاة التطوع حدثنا أبو ا
محمد بن يعقوب...ثنا شعبة عن أبي جعفر المدائني قال: سمعت عمارة بن خزيمة.
قوله أخبرنا أبومحمد عبد العزيزبن عبد الرحمن بن سهل الدباس بمكة من أصل كتا
عن روح بن القاسم عن أبي جعفر المدائني وهو الخطمي عن أبي أمامة بن سهل بن ح

﴿ترمذی شریف بتحقیق محمود محمد محمود حسن نصار﴾

حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی اس مقام پر وہم ہوا کہ ہے انہوں نے تحریراتِ حدیث میں بحوالہ مستدرک حاکم ابوجعفر کے ساتھ المدائنی تحریر فرمایا ہے جب کہ مستدرک حاکم (۱/۴۱٦/۱۱۸۰، کتاب صلاۃ التطوع) میں ابوجعفر المدنی آیا ہے اور دوسری جگہ (۱/٦۸۷/۱۹۳۰، کتاب الدعاء) میں المدنی وہو الخطمی آیا ہے۔

تحریراتِ حدیث کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وروى الحاكم في مستدركه في ص ۱۷۰ في باب صلاة التطوع حدثنا أبو العباس محمد بن يعقوب...ثنا شعبة عن أبي جعفر المدائني قال: سمعت عمارة بن خزيمة...إلى قوله أخبرنا أبومحمد عبد العزيزبن عبد الرحمن بن سهل الدباس بمكة من أصل كتابه... عن روح بن القاسم عن أبي جعفر المدائني وهو الخطمي عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف

...

مزید براں حضرت مولانا نے ابوجعفر المدائنی پر امام مسلم کے حوالہ سے کلام فرمایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:
اعلم یاأخي في ابتداء صحیح المسلم صـ۴، سطر أخیر: فأما ما کان منها عن قوم هم عند أهل الحدیث متهمون أو عند الأکثر منهم، فلسنا نتشاغل بتخریج حدیثهم، کعبد اللّٰه بن مسور أبي جعفر المدائني...وأشباههم من اتهم بوضع الأحادیث وتولید الأخبار، وفي صـ۱٦ ، سطر أخیر: حدثنا عثمٰن بن أبي شیبة قال: نا جریر عن رقبة أن أبا جعفر الهاشمي المدني کان یضع أحادیث کلام حق ولیست من أحادیث النبي صلی اللّٰه علیه وسلم وکان یرویها عن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم. (تحریراتِ حدیث:۲۵۳، کتاب الدعوات).
چونکہ راوی حدیث کی نسبت مولانا پر مخفی ہوگئی، لہذا راوی پر تنقید بھی بے جا ہوگئی۔ واللہ ﷻ اعلم۔

روایتِ توسل میں قصہ عتبی کی تحقیق:

سوال: آپ نے فتاویٰ دار العلوم زکریا ج اول ص ۲۴۱ پر عتبی کا واقعہ نقل کیا ہے اس میں عتبی فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا: "السلام علیک یارسول اللّٰه" میں نے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ولو أنهم إذ ظلموا أنفسهم جاء وک فاستغفروا اللّٰه ...الخ﴾ اور میں اپنے گناہوں سے توبہ کر کے آیا ہوں، آپ اللہ تعالیٰ کے پاس میری شفاعت کیجیے اور وہ اشعار پڑھے جو حجرہ شریفہ کے ستونوں پر مرقوم ہیں، پھر اعرابی چلا گیا اور مجھے نیند آ گئی، خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عتبی! اعرابی کے پاس جاؤ اور اس کو مغفرت کی بشارت سناؤ۔

اس واقعہ کے بارے میں آپ نے نشر الطیب ص ۳۵۰ سے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ حجت ہے، کیونکہ خیر القرون کا واقعہ ہے اور کسی سے نکیر بھی منقول نہیں، انتہی۔

لیکن سلفی حضرات اس واقعہ کو موضوعی قرار دیتے ہیں اور اس کو من گھڑت کہتے ہیں، لہذا اس کی تحقیق مطلوب ہے؟

الجواب: عتبی کے واقعہ کو بہت سارے مفسرین اور مشائخ نے اس کی شہرت کی بنا پر تاریخی واقعہ سمجھ کر تسلیم کرلیا ہے، اگرچہ سند کے اعتبار سے یہ واقعہ مخدوش ومجروح ہے، تسلیم کرنے والوں میں چند حضرات کے اسماء درج ذیل ہیں:

(۱) عبد الہادی محمد بن خرسہ الدمشقی نے الاسعاد کے حاشیہ میں لکھا ہے: ذكر قصة العتبي هذه جماعة من الحفاظ والمحدثين منهم الإمام النوويؒ في كتابه "المجموع" ،"والأذكار"، ومنهم الحافظ ابن كثيرؒ في "تفسيره"، والحافظ السخاويؒ في " القول البديع" قال المحدث الغماريؒ في رده على من حكم على القصة بالوضع الحكاية ضعيفة إذ لم يذكرفي روايتها كذاب أومتهم بالكذب لاسيما وقد أخرجها الإمام البيهقيؒ في الشعب، وذكرها الحافظ ابن كثيرولم يتعقبها، والإمام ابن الجوزي، والإمام ابن العساكرؒ في التاريخ على أننا لم نذكرها استدلالاً وحتجاجاً لأننا لا نستدل بالحكاية ولانحتج بها، وإنما ذكرناها استيناساً وإيضاحاً لماقدمناه من أن الآية تفيد العموم . (حاشية الاسعاد : ص٥٦).

جن حضرات نے اس قصہ کو بغیر کسی تردید کے لکھا ہے، ان میں چند کے نام یہ ہیں:

حافظ ابن كثير القرشي الدمشقي .تفسيرابن كثير: (٥٧٠/١)، ومختصرتفسيرابن كثير: (٣٠٢/٢)، التفسيرالوسيط لمحمد بن سيد الطنطاوي: (٩٨٥/١)، الحاوي الكبير للعلامة أبوالحسن الماوردي: (٢٩٠/٥، فصل فاما زيارة قبر...الخ كتاب الحج)، وسبل الهدي والرشاد في سيرة خيرالعباد لمحمدبن يوسف الصالحي الشامي: (٣٩٠/١٢)، والمغني في فقه الإمام أحمد بن حنبلؒ لابن قدامة المقدسي : (٥٨٨/٣)، وحاشية الجمل على المنهج للعلامة الشيخ سليمان الجمل: (٢٨٥/٢)، ومعجم ابن عساكر: (٣٦٣/١)، وخلاصة الوفا بأخبار دار المصطفى: (٥٧/١)، ومختصرتاريخ دمشق ابن منظورعن محمد بن حرب : (٤٠٨/٢)، والدرالمنثورللسيوطي: (٥٧٠/١)، عن أبي الحرب الهلالي. والمجموع شرح المهذب: (٢١٧/٨)، والأذكار للنوويؒ: (٤٤٠، كتاب أذكار الحج)، والإيضاح: (٤٩٤)، ومقالات الكوثري: (٣٨٧).

وفي معجم ابن العساكر: (٧٣٨/٣٦٣/١) حدثنا عبد الغالب بن ثابت بن ماهان أبونصر الرافقي قاضيها بها وكان شيخاً مسناً وذكر لي أنه سمع من أبي الحسين بن المقتدي ببغداد ومن ابن طوق بالموصل واحترقت كتبه، قال: أنبأ ابن طوق الموصلي بالموصل سنة تسع وخمسين وأربعمائة بإسناد لا أذكره الآن عن العتبي أنه قال: كنت جالساً عند قبر رسول الله صلى الله عليه وسلم وإذا بأعرابي قد أقبل على ناقة له فنزل وعقلها ودنا إلى حجرة النبي صلى الله عليه وسلم وأنشأ يقول من البسيط :

ياخيرمن دفنت بالقاع أعظمه ☆ فطاب من طيبهن القاع والأكم

نفسي الفداء لقبر أنت ساكنه ☆ فيه العفاف وفيه الجود والكرم

ثم قال الأعرابي وجدت الله تعالىٰ يقول: ﴿ولو أنهم إذ ظلموا أنفسهم جاء وک فاستغفروا الله واستغفرلهم الرسول لوجدوا الله تواباً رحيماً﴾ وقدجئتک يارسول الله مستغفراً من ذنبي مستشفعاً بک إلى ربي، وانصرف. قال العتبي: فنمت فرأيت النبي صلى الله عليه وسلم في النوم، فقال لي يا عتبي الحق الأعرابي فقل له إن الله عزوجل قد غفرله. وهذا إسناد منقطع.

اس کے ساتھ مشابہ یہ قصہ دوسرے راویوں سے بھی مروی ہے۔اوراس کی متعدداسانید ہیں۔

سلفی حضرات اس واقعہ پر متعدداشکالات کرتے ہیں:

(۱)عتبی کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی،آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تین دن بعد کیسے حاضر ہوئے۔

(۲)اس میں اضطراب ہے ایک روایت میں قبر پراپنے آپ کوڈالنے کاذکر ہے،دوسری روایت میں نہیں،ایک روایت میں قبرمیں سے آواز آنے کاذکر ہے:" أنه قد غفر لک" دوسری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں تشریف لانے اورخوشخبری دینے کاذکر ہے:" أنه قد غفر لک".

(۳)اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہہ بات چیت کاذکر ہے،جب کہ وفات کے بعدایسا کرنا ناممکن ہے"لیکن خلافِ عادت یہ ہوسکتا ہے"۔

(۴)عتبی کے قصہ کی اسنادتاریک ہے۔

(۵)اس میں یہ اضطراب بھی پایا جاتا ہے کہ یہ قصہ عتبی سے مروی ہے یامحمد بن حرب ہلالی عن الاعرابی سے یامحمد بن حرب الہلالی عن ابی محمدالحسن الزعفرانی عن الاعرابی جب کہ زعفرانی امام شافعیؒ کے تلمیذ ہیں،اوران کی وفات ۲۴۹ھ میں ہوئی،وہ اس اعرابی سے کیسے روایت کرسکتے ہیں جوبہت زمانہ پہلے گزرچکاہو۔

(۶)پھرکبھی عتبی سے روایت کرتے ہیں،جورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعرابی کے پاس پہونچے اور خوشخبری دینے پرمامورہوئے،حافظ ابن عبدالہادی نے الصارم المنکی میں لکھاہے کہ بعض حضرات اس واقعہ کوعتبی سے بلاسندنقل کرتے ہیں اوربعض محمد بن حرب عن الاعرابی نقل کرتے ہیں،اوربعض محمد بن حرب عن ابی الحسن الزعفرانی عن الاعرابی نقل کرتے ہیں،نیزاس قصہ کوامام بیہقی نے شعب الایمان میں تاریک سندکیساتھ نقل کیا ہے۔

(۷)غماریین کے تلمیذرشیدمحمودسعیدممدوح رفع المنارۃ میں تحریرفرماتے ہیں:" وهي حكاية غير صحيحة

الإسناد لكن الشاهد من ذكرها هو بيان أن العلماء ذكروها استيناساً لبيان أن الآية تفيد العموم. وحديث عرض الأعمال يؤيد الاستدلال بهذه الآية وهوقوله صلى الله عليه و سلم:"حياتي خيرلكم، ومماتي خيرلكم تحدثون ويحدث لكم وتعرض علي أعمالكم فما وجدت خيراً حمدت الله وما وجدت غيرذلك استغفرت لكم" وهوحديث صحيح. (رفع المنارة:۷۷، لمحمود سعيد ممدوح).

ہمارے اکابرؒ اس واقعہ کو اس کی شہرت اور متعدد اسانید کی بناپر تسلیم کرتے ہیں شیخ عطیہ سالم نے نور الدین زنگی کے زمانہ کا مشہور واقعہ کہ دو نصرانیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک کی بے حرمتی کا ارادہ کیا تھا، اور اپنے گھر سے روضہ اقدس تک سرنگ بنارہے تھے، اس دوران بادشاہ نے خواب دیکھا اور پھر ان کو گرفتار کر کے سزادی گئی، اس واقعہ کو اس کی شہرت کی بناپر، اور اس وجہ سے کہ بادشاہ نے تمام اہل مدینہ کی ضیافت کی تھی تاکہ ان دو آدمیوں کو پہچان لیں، جنہوں نے گستاخی کا ارادہ کیا تھا، اور اس مکان کا نام (جس میں اہل مدینہ کی ضیافت کی تھی) ''دارالضیافۃ'' تھا، جو کچھ عرصہ قبل تک موجود تھا، اور پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے اردگرد سیسے کی دیوار بنائی تھی اور سیسہ پگھلانے کا مکان ''دارالرصاصۃ'' کچھ عرصہ قبل تک محفوظ تھا، اس بنیاد پر اس واقعہ کو تسلیم کرلیا ہے، اگر چہ اس کی متصل سند موجود نہیں۔ (السوال والجواب في آيات الكتاب:۲۷۷،۲۷۸، للشيخ عطية سالم رحمه الله تعالىٰ).

اسی طرح یہ واقعہ بھی مشہور ہے اور کتب فقہ و تفسیر میں مذکور ہے، اور عتبی کے اشعار بھی روضہ اقدس پر تحریر شدہ ہیں۔ ایسے واقعات میں شہرت سے کام چل سکتا ہے۔ ہمارے لوگ جو اپنے آپ کو یوسفزئی اور عمرخیل اور ابا خیل کہتے ہیں، کیا وہاں تک صحیح نسب نامہ بیان کر سکتے ہیں، ہرگز نہیں، لیکن اس قسم کے واقعات کے لیے شہرت کافی ہے، حضرت مولانا سرفراز صفدرؒ نے بھی اس قسم کے معاملات میں شہرت کو کافی سمجھا ہے، ان کی کتاب تسکین الصدور ص۳۶۳۔۳۶۴ کے ایک ورق کی فوٹو کاپی ملاحظہ فرمائیں۔

ی صلی اللہ علیہ وسلم فجاء
ی السلام علیک یا رسول
اللہ یقول ولو انّھم اذ
سھم جاؤک فاستغفروا
ر لھم الرسول لوجدوا
رحیما وقد جئتک
ذنبی مستشفعا بک الی
یر ابن کثیر ج۱ ص۵۲)

ہیں کہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کے
پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا
السلام علیک یا رسول اللہ۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ
ارشاد سنا ہے اور اگر بے شک وہ لوگ جب کہ انہوں نے
اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے پس وہ اللہ
تعالیٰ سے معافی مانگتے اور ان کے لیے رسول بھی
اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول
کرنیوالا مہربان پاتے اس لیے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے
کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی پیش کرنے آیا ہوں

بعد اس نے دردِ دل سے چند اشعار پڑھے اور اظہار عقیدت اور جذبہ محبت کے پھول
لا گیا اور اسی واقعہ کے آخر میں مذکور ہے کہ خواب میں اس کو کامیابی کی بشارت
رت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عتبیؒ جا کر اس اعرابی سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ
غفرت کر دی ہے۔
م نوویؒ نے کتاب الاذکار ص۱۸۵ طبع مصر میں اور علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد النسفیؒ
۷۱۰ھ نے اپنی تفسیر المدارک جلد۱ ص۳۹۹ میں اور علامہ تقی الدین سبکیؒ نے شفاء
یں اور شیخ عبد الحق رحؒ نے جذب القلوب ص۱۹۵ میں اور علامہ بحر العلوم عبد العلیؒ نے
ی ص۲۸ طبع لکھنو میں نقل کیا ہے اور علامہ علیؒ بن عبد الکافی السبکیؒ اور علامہ سمہودیؒ

-

ی فی ذلک مشھورۃ وقد حکاھا
فی المناسک من جمیع المذاھب

عتبیؒ کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب
کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مؤرخین

۳۶۴

والمؤرخون وکلهم استحسنوها الخ (شفاء السقام ص ۶۱) نے اس کو ذکر کیا ہے اور س
(وفاء الوفا ج ۲ ص ۴۱۱)
قرار دیا ہے۔

اور خطیب قسطلانیؒ اور علامہ زرقانیؒ نے بھی اس الحکایۃ المشہورۃ کا
(المواھب مع الزرقانی ج ۸ ص ۳۰۶) اور اسی طرح شیخ محمد بخیت الحنفیؒ نے اپنی کت
وسن الاعتقاد (ص ۵۱ ر ۳۲ د طبع مصر) میں تذکرہ کیا ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ
اس رنگ میں نہیں کہ عتبیؒ کوئی بڑے پایہ کا بزرگ اور ثقہ راوی تھے جن کی اس ک
جا رہی ہے فرض کیجئے کہ وہ بادہ مست بھی ہوں جیسا کہ بعض کتابوں میں اس
اور بعض معاصرین نے اس کو پلّے باندھ لیا ہے بلکہ استدلال اس انداز سے
کارروائی کو ہر مکتب فکر کے علماء کرام کی اکثریت نے مستحسن سمجھ کر اس پر عمل کیا
اور تعامل علماء و فقہاء سے یہ کارروائی جواز کا درجہ رکھتی ہے حضرت ابن عباسؓ
کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے
کا روزہ رکھتے ہیں آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اس دن تم کیوں روزہ رکھتے ہو انہوں
اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون اور
غرق کیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شکریہ کے طور پر روزہ رکھا تھا اس لیے ہم

ہیں آپؐ نے فرمایا کہ ہمارا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تمہاری نسبت
خود بھی عاشورہ کا روزہ رکھا اور امت کو بھی حکم دیا (او کما قال مشکوٰۃ ج ۱ ص
اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں کہ یہودی یہودیت پر قائم رہ کر ثقہ اور عادل راوی
بات اس لحاظ سے حجت ہو گئی بلکہ ان کا یہ فعل ایک اچھا فعل تھا اس لیے آپؐ
بھی عمل کیا اور امت کو بھی حکم دیا اسی طرح اس واقعہ کو سمجھئے۔ اور اسی طرح
نے قدیماً و حدیثاً اس کو نقل کیا ہے اور حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ مواہب میں
صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزی رحمہم اللہ تعالیٰ محمد بن حرب ہلالیؒ سے
کہ میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت ک
یا خیر الرسل اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد فرمایا

عتبی کا تعارف:

بعض لوگ عتبی کو مجہول کہتے ہیں ان کے تعارف کے لیے چند عبارتیں بھی دیکھ لیجئے۔

في كتاب : تبصير المنتبه بتحرير المشتبه لابن حجر العسقلاني:(۱/۲۳۲):

العتبى :محمد بن عبيد الله البصري الأخباري،مشهور.

وفي كتاب : الإكمال لابن ماكولا :(۱/۳۸۱) :

باب العتبي والقيني والقتبي : أما العتبي بعين مهملة وتاء ساكنة معجمة باثنتين من فوقها وباء معجمة بواحدة فهو محمد بن عبيد الله العتبي الأخباري، بصري.

وفي كتاب العبر في خبر من غبر للذهبي(۱/۷٦) :

وفيها العتبي الأخباري وهو أبو عبد الرحمن محمد بن عبيد الله بن عمرو الأموي أحد الفصحاء الأدباء من ذرية عتبة بن أبي سفيان بن حرب، كان من أعيان الشعراء بالبصرة، سمع أباه وسمع أيضاً من سفيان بن عيينة عدة أحاديث، والأخبار أغلب عليه .

وفي كتاب معجم الشعراء للمرزباني(۱/۱۰۱):

أبو عبد الرحمن العتبي محمد بن عبيد الله بن عمرو بن معاوية بن عمرو بن عتبة بن أبي سفيان صخر بن حرب بن أمية بن عبد شمس، بصري علامة راوية للأخبار والآداب وكان حسن الصورة جميل الأخلاق وبلغ سناً عالية وكان حسن الخضاب ويلبس الطيالس الزرق ولقب الشقراق للون خضابه وشدة حمرة وجهه وتلون طيالسته، وكان عمرو بن عتبة يغمز في نسبه، وتتابعت على العتبي مصائب بالذكور من ولده في الطاعون الكائن بالبصرة سنة تسع وعشرين ومائتين وقبل ذلک فمات منهم ستة فراثاهم بمراث كثيرة منها قوله :

كل لساني عن وصف ما أجد ... وذقت ثكلاً ما ذاقه أحد

ماعالج الحزن والحرارة في...الاحشاء من لم يمت له ولد.

وفي كتاب والوافي بالوفيات للصفدي (۱/۱۵۴) :

العتبي الأخباري محمد بن عبيد الله بن عمرو بن معاوية بن عمرو بن عتبة بن أبي سفيان الأموي المشهور بالعتبي البصري الأخبارى أحد الأدباء الفصحاء، مات له بنون فكان يرثيهم

وقصيدته في ولده مشهورة منها :

الصبر يحمد في المواطن كلها ... إلا عليک فإنه مذموم

روى عن أبيه وعن سفيان بن عتبة ولوط ابن مخنف، وروى عنه أبوحاتم السجستاني وأبو الفضل الرياشي وإسحاق بن محمد النخعي، وقدم بغداد وحدث بها، وكان مشتهراً بالشراب، وكان هو وأبوه سيدين أديبين فصيحين، ومن تصانيفه: كتاب الخيل، كتاب أشعار الأعاريب، وأشعار النساء اللاتي أحببن ثم أبغضن، وكتاب الذبيح، وكتاب الأخلاق وغير ذلک ...

وفي كتاب وفيات الأعيان وأبناء أبناء الزمان أحمد بن محمد المشهور بابن خلكان :

۶۶۳ـ العتبي أبوعبد الرحمن محمد بن عبيد الله بن عمرو بن معاوية بن عمرو بن عتبة بن أبي سفيان صخر بن حرب بن أمية بن عبد شمس القرشي الأموي المعروف بالعتبي، الشاعر البصري المشهور....

وفي كتاب: سير أعلام النبلاء :

۲۹ــــ العتبي العلامة الأخباري الشاعر المجود، أبوعبد الرحمن محمد بن عبيد الله بن عمرو بن معاوية بن عمرو بن عتبة بن أبي سفيان بن حرب الأموي ثم العتبي البصري، روى عن: ابن عيينة، وأبي مخنف، ووالده، وعنه: أبوحاتم السجستاني، وإسحاق بن محمد النخعي، وكان يشرب، وله تصانيف أدبيات وشهرة، مات سنة ثمان وعشرين ومائتين .

وانظر للمزيد : تاريخ بغداد لأحمد بن على أبوبكر الخطيب البغدادى(۲/۳۲۶/۵۱۸)، وتوضيح المشتبه في ضبط أسماء الرواة وأنسابهم وألقابهم وكناهم لابن ناصر الدين الدمشقي: (۸۹/۶)، والمنتظم لابن الجوزي:(۳۴۷/۳)، والنجوم الزاهرة في ملوک مصر والقاهرة لابن تغري بردي:(۲۳۱/۱)، وكتاب الأنساب المتفقة لابن القيسراني:(۳۳/۱)، وكتاب الأنساب للسمعاني :(۱۴۹/۴) . واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی قصہ عتبی کے قصہ سے مختلف ہے:

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس ایک اعرابی کے آنے کا قصہ عتبی سے مروی ہے، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اس قسم کا ایک قصہ مروی ہے، کیا دونوں ایک ہے یا مختلف؟ سلفی حضرات

دونوں کوایک قرار دے کر باعثِ اضطراب گردانتے ہیں، دونوں قصوں کی کیا تفصیل ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دونوں قصے الگ الگ ہیں، اوراس کی وضاحت امام قرطبی، صاحب کنز العمال، صاحب المنتخب، صاحب مغنی، وغیرہ حضرات نے کی ہے، لہٰذا دونوں کوایک کہہ کراضطراب ثابت کرنا بے انصافی ہے، کیونکہ اضطراب ثابت کرنے کے لیے جودلائل پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک دلیل بھی دل کونہیں لگتی۔

عتبی کا قصہ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

وقد ذكر جماعة منهم الشيخ أبو منصور الصباغ في كتاب " الشامل" الحكاية المشهورة عن العتبي قال: كنت جالساً عند قبر النبي ﷺ فجاء أعرابي فقال: السلام عليك يا رسول الله، سمعت الله يقول: ﴿ ولو أنهم إذ ظلموا أنفسهم جاءوك فاستغفروا الله واستغفرلهم الرسول لوجدوا الله تواباً رحيماً ﴾. وقد جئتك مستغفراً لذنبي مستشفعاً بك إلى ربي، ثم أنشأ يقول :

ياخيرمن دفنت بالقاع أعظمه ☆ فطاب من طيبهن القاع والأكم

نفسي الفداء لقبر أنت ساكنه ☆ فيه العفاف وفيه الجود والكرم

ثم انصرف الأعرابي، فغلبتني عيني، فرأيت النبي ﷺ في النوم فقال: "يا عتبى! الحق الأعرابي فبشره أن الله قد غفرله ". (تفسير ابن كثير: ١/ ٥٧٠).

مذکورہ بالاقصہ کوعلامہ نوویؒ، ابن کثیرؒ، سیوطیؒ، باجیؒ، ثعالبیؒ، ابن قدامہؒ، بیہقیؒ، ماوردیؒ، ابن عساکرؒ، قرطبیؒ، ابن الجوزیؒ، قسطلانیؒ، سبکیؒ، نیز ماضی قریب کے علماء میں سے شیخ صابونیؒ، شیخ کوثریؒ، اورمولانا تھانویؒ وغیرہ ان تمام حضرات نے بغیر کسی نکیر کے اپنی کتب میں جگہ دی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کی روایت کنز العمال میں ہے، ملاحظہ فرمائیں:

قال ابن السمعاني في الذيل: أنا أبوبكرهبة الله بن الفرج ،أنا أبوالقاسم يوسف بن محمد بن يوسف الخطيب،أناأبوالقاسم عبدالرحمن بن عمروبن تميم المؤدب، ثناعلى بن إبراهيم بن علان، أناعلى بن محمد بن على، ثنا أحمد بن الهيثم الطائى،ثناأبى عن أبيه عن سلمة بن كهيل عن أبى صادق عن على بن أبى طالب رضى الله تعالىٰ عنه قال: قدم عليناأعرابى بعدمادفنارسول الله صلى الله عليه وسلم بثلاثة أيام، فرمى بنفسه على قبرالنبى

صلى الله عليه وسلم وحثا من ترابه على رأسه، وقال: يارسول الله ! قلت: فسمعنا قولك، ووعيت عن الله فوعينا عنك، وكان فيما أنزل الله عليك:﴿ولو أنهم إذ ظلموا أنفسهم جاؤك فاستغفروا الله ....﴾ وقد ظلمت نفسي وجئتك تستغفرلي، فنودي في القبر: "أنه قدغفرلك".

قال في المغني: الهيثم بن عدى متروك. (كنزالعمال:۲/۳۸٦،سورة النساء،تفسیرالقرطبی:۵/۱۷۲).

مذکورہ بالا دونوں روایتوں کے مضمون میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی وجوہات کی بناپر دونوں قصے الگ الگ ہیں:

(۱)حضرت علیؓ کے قصہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تین دن بعد کی صراحت ہے جب کہ عتبی نے اپنے زمانہ کا واواقعہ بیان کیا،اوران کا انتقال ۲۲۸ھ میں ہوا۔

(۲)حضرت علیؓ کے قصہ میں "حثاعلى رأسه من ترابه" کا ذکر ہے،اورعتبی کے قصہ میں نہیں۔

(۳)حضرت علیؓ سے مروی قصہ میں اعرابی کے اشعار نہیں ہیں،اورعتبی کے قصہ میں اشعار موجود ہیں۔

(۴)حضرت علیؓ سے مروی قصہ میں قبر مبارک سے آواز آنے کا ذکر ہے "فنودى من القبر" جب کہ عتبی کے قصہ میں خواب کا تذکرہ ہے۔

(۵)حضرت علیؓ کی روایت میں "ظلمت نفسي وجئتك" کے الفاظ ہیں،اورعتبی کے قصہ میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔

(٦)دونوں روایتیں سنداً بھی بالکل علیحدہ ہیں۔

ان وجوہات کی بناپر دونوں میں واضح فرق ہے،لہذا دونوں کوایک کہہ کراضطراب قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا۔

واللہ ﷻ اعلم۔

فصل سوم
شعائر حج سے متعلق احکام

شعائر حج کی معنوی تحقیق:

سوال: مزدلفہ، عرفات، منیٰ، وادی محسر، مسجد نمرہ، مسجد خیف، صفا، مروہ کے کیا معنی ہیں؟

الجواب: مزدلفہ "إزدلاف" سے ہے اس کے معنی قرب کے ہے، اس جگہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

یا عرفات سے نکلتے ہی یہ قریب ہے۔

یا حضرت آدم علیہ السلام حضرت حواء کے قریب آئے تھے۔

یا لوگ زلف اللیل یعنی رات کے ایک حصے میں یہاں پہنچتے ہیں۔

☆ عرفات یا عرف سے ہے اس کے معنی خوشبو، کیونکہ یہاں منیٰ "جو مذبح ہے" کے مقابلے میں خوشبو ہے۔ منیٰ میں ذبائح کی وجہ سے یہ بات نہیں۔

یا دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام وحواء کا تعارف ہوا۔

یا جبریل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو افعال حج سکھائے تو حضرت ابراہیم نے فرمایا "عرفت" یعنی میں نے سیکھ لیا۔

یا عرفہ کی رات جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر اپنے صاحبزادے کے ذبح کا خواب دیکھا تو پہچان گئے کہ یہ خواب اپنے ظاہر پر ہے اور ذبح کا حکم مطلوب ہے۔

☆ منیٰ کے معنی خون گرانا ہے، چونکہ وہاں قربانیوں کا خون گرایا جاتا ہے اس لیے یہ وادی منیٰ سے

موسوم ہوئی۔

یا تمنا سے ہے، یعنی دعاؤں کے ذریعے تمنا پوری ہونے کی یہ جگہ ہے۔ شاعر کہتا ہے:

بوادی منیٰ نلنا المنیٰ إذ تبسمت ☆ لیال وأیام ملاح المباسم

ترجمہ: وادی منیٰ میں ہم نے تمناؤں کو پایا جبکہ وہ دن رات مسکرائے جس کا محل تبسم ظاہر ہو کر چمکا۔

سرور بعید واجتماع أحبة ☆ وقرب وقربان وخیر مواسم

ترجمہ: عید کی خوشی ہے اور دوستوں کا اجتماع ہے، اللہ تعالیٰ کا قرب وقربانی اور بہترین موسم ہے۔

☆ محسِّر بکسر السین تھکانے کے معنی میں ہے، چونکہ یہاں ابرہہ کے لشکر کے ہاتھی تھک کر آگے بڑھنے سے عاجز ہو گئے تھے اس لئے یہ وادی اس نام سے موسوم ہوئی۔

☆ مسجد نمرہ:۔ نمرہ اس چادر کو کہتے ہیں جس میں سیاہ وسفید خطوط ہوں، شاید وہاں کے پہاڑ کا کچھ حصہ سیاہ وکچھ سفید ہوگا۔

☆ مسجد خیف:۔ خیف پہاڑ کے پست حصہ کو کہتے ہیں جو پانی کے بہاؤ کی جگہ سے اونچا ہو۔

☆ صفا صاف پتھر کو اور مروہ چمکدار پتھر کو کہتے ہیں۔

یا صفا پر آدم صفی اللہ علیہ السلام بیٹھے تھے اور مروہ پر ان کی مرأۃ یعنی اہلیہ بیٹھی تھیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

منیٰ اور مزدلفہ کا مکہ مکرمہ سے اتصال کا حکم:

علماء کرام قدیم زمانہ سے منیٰ کو مکہ مکرمہ سے الگ شمار کرتے رہے ہیں اور جس حاجی کے قدوم مکہ سے "یوم الترویہ" تک ۱۴ دن بنتے ہوں اس کو مسافر شمار کرتے رہے ہیں، لیکن آج کل مکہ مکرمہ کی آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے بہت سارے مفتی حضرات نے منیٰ کو مکہ مکرمہ میں شامل ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا بلکہ بعض مفتی حضرات نے مزدلفہ کو بھی حدودِ مکہ مکرمہ میں شامل فرمایا۔

بندہ فقیر کے خیال میں منیٰ اور مزدلفہ دونوں مکہ مکرمہ سے علیحدہ ہیں اور دونوں کو الگ شمار کرنا چاہئے۔

مختصر دلائل حسبِ ذیل درج ہیں:

(۱) شیخ سبیل نے اگرچہ منیٰ کو مکہ مکرمہ کے تحت اور اس کا حصہ فرمایا ہے، لیکن سعودی ائمہ منیٰ کی جامع مسجد میں جمعہ نہیں پڑھتے، نہ ایام حج میں جمعہ پڑھتے ہیں، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد، ایام منیٰ سے پہلے اور اس کے بعد بہت سارے لوگ وہاں خیموں کی صفائی اور سامان کی دیکھ بھال میں مشغول رہتے ہیں، لیکن جمعہ

کی نماز نہیں ہوتی، اگر یہ مکہ مکرمہ کا حصہ ہوتا تو وہاں جمعہ کا اہتمام ہوتا، عزیزیہ کو مکہ مکرمہ کا حصہ سمجھتے ہیں لہذا وہاں کی مساجد میں ہمیشہ نماز جمعہ ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ منیٰ کا مکہ مکرمہ کے ماتحت ہونا صرف انتظامی عمل ہے۔

(۲) فقہاء اور محدثین نے کتاب الجمعہ میں پانچ قسم کے مقامات بیان کیے ہیں:

(الف) **مصر، وتجب فيه الجمعة وهو ما يعد في الأمصار عند ذكر الأمصار أو ما لا يسع أكبر مساجده أهله أو ما يوجد فيه مرافق الحياة العامة أو ما فيه أسواق وسكك ولها رساتيق أو ماله أمير وقاض ينفذ الأحكام والحدود والقصاص بالفعل أو بالقوة وغيره من التعريفات.** (شامی وطحطاوی)

(ب) **القرية الكبيرة التي فيها الأسواق تجب فيها الجمعة.** (طحطاوی)

(ج) **القرية الصغيرة في فناء المصر، تجب فيها الجمعة.** (طحطاوی)

(د) **القرية الصغيرة خارج فناء المصر.** (مجمع الانهر)

(٥) **الصحارى والبراري.** (بدائع الصنائع ومجمع الانهر)

اب منیٰ کا مصر اور قریہ کبیرہ نہ ہونا تو ظاہر ہے، نیز منیٰ قریہ صغیرہ فی فناء المصر بھی نہیں اس لیے کہ منیٰ فناء المصر یعنی شہر کی ضرورت نہیں، حاجیوں کی ضرورت ہے اور قریہ صغیرہ بھی نہیں بلکہ میدان ہے، لہذا اس کو مصر کے ساتھ ملانا معقول نہیں۔

عالمگیری میں ہے:

"**الصحيح ما ذكر أنه يعتبر مجاوزة عمران المصر لاغير إلا إذا كان ثم قرية أو قرى متصلة بربض المصر فحينئذٍ تعتبر مجاوزة القرى**". (الفتاوی الهندية: ١/١٣٩، في صلاة المسافر).

شامی میں ہے:

"**وأشار إلى أنه يشترط مفارقة ماكان من توابع موضع الإقامة كربض المصر وهو ماحول المدينة من بيوت ومساكين فإنه في حكم المصر وكذا القرى المتصلة بالربض في الصحيح.**" (فتاوی الشامی: ٢/١٢١، سعيد).

مسافر ہونے کے لیے شہر کے کنارے کے مکانات سے تجاوز شرط ہے کیونکہ وہ شہر کے حکم میں ہے، نیز جو بستیاں شہر سے متصل ہوں وہ بھی شہر کے حکم میں ہیں، شہر کے کنارے پر جو بیوت ہوں شاید ان کو ربض اس لیے کہتے ہیں

کہ وہاں چرواہے بھیڑ بکریوں کے لیے باڑے بنا کر بٹھاتے تھے۔

یاد رہے منیٰ نہ تو مکہ مکرمہ کا تابع ہے اور نہ وہاں آبادیاں ہیں کہ ان کو چھوٹی بستی قرار دے کر مکہ کا تابع کیا جائے، بلکہ وہ خالی میدان ہے، ہاں عالمگیری کی ایک عبارت سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید منیٰ مکہ مکرمہ کا تابع ہو۔

''وإن اتخذ المسلمون مصراً في أرض موات لايملكها أحد فإن كان بقرب ذلك قرى لأهل الذمة فعظم المصرحتى بلغ تلك القرى وجاوزها فقد صارت من جملة المصر''. (الفتاوی الهندية:١/٢٥١،الباب الثامن فی الجزية ،فصل فی احداث البيع و الكنائس).

لیکن اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ کسی چھوٹی بستی پر شہر احاطہ کرے تو وہ شہر کے تابع بن جائے گی یہاں منیٰ کوئی چھوٹی بستی تھوڑی ہے کہ اس پر شہر نے احاطہ کیا ہو بلکہ وہ میدان ہے اور صحراء ہے اور شہر کی ضروریات کے لیے بھی نہیں، نیز اس پر شہر نے احاطہ بھی نہیں کیا ہے بعض اطراف میں تو لمبے چوڑے پہاڑ ہیں، ہاں اگر کوئی چھوٹی بستی کسی بڑے شہر کے بغل میں آجائے تو وہ شہر کا حصہ بن جائیگی۔

طحطاوی میں ہے:

ويشترط أن يكون قد جاوز أيضاً ما اتصل به أي بمقامه من فناء ه كما يشترط مجاوزة ربضة وهوماحول المدينة من بيوت ومساكين، فإنه في حكم المصروكذا القرى المتصلة بربض المصر يشترط مجاوزتها في الصحيح''.(حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح:٤٢٣،باب صلاة المسافر).

لیکن منیٰ تو گاؤں ہی نہیں اور نہ مزدلفہ بستی ہے یہ مسئلہ چھوٹی بستی میں ہے اگر بڑا قصبہ کسی شہر سے متصل ہو تو دونوں الگ شمار کیے جائیں گے مگر یہ کہ باقاعدہ الحاق ہو جائے۔

لہٰذا بندہ کا خیال یہ ہے کہ قدیم فقہاء کے فرمان کے موافق منیٰ اور مزدلفہ دونوں کو الگ شمار کیا جائے۔

احسن الفتاوی (۷۴/۴) میں ہے:

دو بستیوں کے درمیان وجود مزارع یا قدر غلوہ ۱۶ـ۱۳۷ میٹر علامت انقطاع ہے، لہٰذا اگر دو مواضع عرف عام میں ایک ہی شہر کے دو محلے سمجھے جاتے ہوں تو فصل مذکور کے باوجود دونوں کو ایک موضع قرار دیا جائے۔

فتاوی رحیمیہ (۳٦۴/٦) میں مرقوم ہے:

وطنِ اصلی یا وطنِ اقامت کی آبادی سے باہر ہو جانے پر شرعی مسافر کا اطلاق ہوگا، دوسری آبادی اگر چہ متصل ہو مگر دوسری آبادی ہے، دونوں کے نام الگ ہیں حکومت اور کارپوریشن یعنی (میونسپلٹی۔نگر پالیکا) نے دونوں

آبادیوں کے حدود الگ الگ مقرر کیے ہیں، اس لئے وہ دونوں دو مستقل آبادیاں (یعنی شہر) شمار ہوں گی، اور شرعی مسافر کا اطلاق اس وقت ہوگا جب کہ اپنی آبادی یعنی شہر کے حدود تجاوز کرے، اور اگر متصل ہونے کی وجہ سے کارپوریشن نے دونوں کو ایک کردیا ہو تو اب وہ آبادی شہر کا محلّہ ہے اور وہ محلّہ شہر کا جز ہے لہذا اب اس سے تجاوز ہونے پر مسافرت کے احکام جاری ہوں گے۔

(۴) منیٰ کو علیحدہ شمار کرنے میں اکابر علماء کی موافقت بھی ہے اور بغیر ضرورت کے اکابر کے قول کو چھوڑنا مصلحت اور اچھی بات نہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مکہ، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ الگ الگ مقامات ہیں، ان میں مجموعی طور پر پندرہ دن رہنے کی نیت سے آدمی مقیم نہیں ہوتا، پس جو شخص ۸ ذی الحجہ کو منیٰ جانے سے پندرہ دن پہلے مکہ مکرمہ آیا ہو تو وہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہوگیا اور وہ منی عرفات اور مزدلفہ میں بھی مقیم ہوگا اور پوری نماز پڑھے گا، لیکن اگر مکہ مکرمہ آئے ہوئے ابھی پندرہ دن پورے نہیں ہوئے تھے کہ منیٰ کو روانگی ہوگئی، تو یہ شخص مکہ مکرمہ میں بھی مسافر ہوگا اور منیٰ عرفات اور مزدلفہ میں بھی قصر نماز پڑھے گا۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۴/۱۲۱).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

سوال: جو شخص یکم ذی الحجہ کو مکہ شریف پہنچے اور بیس روز قیام کی نیت کرے تو وہ شخص قیام مکہ معظّمہ میں نماز پوری پڑھے گا یا قصر کرے گا؟ ایسا شخص مقیم ہے یا مسافر؟

الجواب حامداً ومصلیاً: وہ شخص مقیم نہیں بلکہ مسافر ہے اس کو چاہئے کہ مکہ مکرمہ میں بھی قصر کرے اور منیٰ عرفات اور مزدلفہ میں بھی قصر کرے...الخ، بحر: ۲/۱۴۳، (فتاوی محمودیہ: ۳/۱۸۴).

فائدہ: اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ اور منیٰ دونوں الگ الگ مقامات ہیں لہذا اقامت کی نیت صحیح نہ ہوگی، اور بدستور مسافر رہے گا اور قصر کرے گا۔

خیر الفتاوی میں ہے:

عرفات کے بارے میں زیادہ بحث کی حاجت نہیں ہے کیونکہ حجاج وہاں رات نہیں گزارتے اور دن میں کہیں چلے جانا یہ نیتِ اقامت پر اثر انداز نہیں، البتہ مزدلفہ میں رات گزارنا یا مکہ میں نیت اقامت کے لیے مبطل ہوگا کیونکہ مزدلفہ نہ مکہ میں داخل ہے نہ ہی فناء مکہ میں داخل ہونے کی کوئی دلیل ہمارے سامنے ہے، نیز مزدلفہ منیٰ کے ساتھ متصل نہیں بلکہ منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان وادی محسر حائل ہے، درمختار میں ہے: المزدلفة کلها موقف الا

وادی محسر ہو وادبین منی ومزدلفۃ ۔ بالفرض متصل بھی ہو تو بھی پورے مزدلفہ کو جو تقریباً دو میل تک پھیلا ہوا ہے، منیٰ کے تابع قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا مثلاً کسی شہر کے متصل دس میل کا طویل عریض میدان ہے تو اس پورے میدان کو شہری فناء تصور کرنا کیوں کر درست ہوگا؟ جب مزدلفہ نہیں تو عرفات بطریق اولیٰ فناء مکہ میں داخل نہ ہوگا، جب کہ منی اور عرفات کے درمیان تقریباً چھ میل کا فاصلہ ہے، فوجی انتظامی لحاظ سے حفاظتی چوکیوں کا عرفات سے آگے واقع ہونا یہ کچھ مفید نہیں کیونکہ شاید ایسی چوکیاں پورے راستے پر بنائی جاتی ہیں، جیسے طریق مکہ اور مدینہ پر چوکیاں تعمیر کی گئی ہیں ۔ منی ومکہ یہ دونوں تو حسبِ تصریح فقہاء بلاشبہ دو مستقل مواضع ہیں ان میں سے ہر ایک کی مستقل حد بندی موجود ہے یہ ابتداء منی ہے مناسک حج کے اعتبار سے بھی یہ دونوں مواضع ہمیشہ کے لیے شہر ہی تصور کیے جائیں گے، جو احکام منی سے متعلق ہیں وہ اسی قطعہ میں ادا کیے جائیں گے، مکہ میں ان کی ادائیگی جائز نہ ہوگی اور اسی طرح اس کے برعکس، علاوہ ازیں ایک شخص جب مکہ مکرمہ سے روانہ ہو کر منی کی حدود میں داخل ہوا تو اس پر صادق آئے گا کہ وہ مکہ سے نکل گیا ہے اور یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ منی میں ہے مکہ میں نہیں ہے ایک شہر کے مختلف محلوں کے بارے میں ایسی نفی صحیح نہیں ہے یوں کہنا درست نہیں ناظم آباد میں ہے کراچی میں نہیں ان وجوہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جن مواضع کو مستقل قرار دیا ہے اور ان سے متعلق شرعی احکام بھی الگ الگ ہیں اور ان کی واضح طور پر قطعی حد بندی موجود ہے تو انھیں سفر کے بارے میں دو الگ مواضع شمار کیا جائے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں شخصِ مذکور حج سے قبل مقیم نہ ہوگا جیسا کہ تمام فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے۔

"أن الحاج إذا دخل مكة في أيام العشر ونوى الإقامة نصف شهر لايصح لأنه لابد له من الخروج إلى عرفات فلا يتحقق الشرط". (البحر: ۲/۱۴۳) فقط واللہ اعلم۔ (خیر الفتاویٰ: ۴/۲۴۸).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

جہاں ٹھہرنے کی نیت کی وہ جگہ ٹھہرنے کے لائق ہو یعنی شہر یا بستی ہو، اگر جنگل یا دریا یا غیر آباد جزیرہ میں ٹھہرنے کی نیت کی تو صحیح نہیں، جب کہ مزدلفہ ایسا نہیں۔

نیز اگر کوئی شخص دو مقاموں میں پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ دونوں مقام مستقل جدا جدا ہوں جیسے مکہ اور منی یا کوفہ اور حیرہ تو وہ مقیم نہ ہوگا۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/۴۱۵۔۴۱۶).

معلم الحجاج میں ہے:

جو حاجی مسافر مکہ مکرمہ میں ایسے وقت آئے کہ آٹھویں تاریخ تک پندرہ روز سے کم ہیں اور وہ مکہ مکرمہ میں پندرہ روز یا زیادہ اقامت کی نیت کرے تو اس کی نیت اقامت صحیح نہ ہوگی وہ مسافر رہے گا، کیونکہ آٹھویں تاریخ

کووہ منی اور نویں کو عرفات ضرور جائیگا اس لیے ایسے شخص کو قصر کرنا چاہئے ۔(معلم الحجاج:۱۵۷).

(۴) منی کو الگ شمار کرنے میں سہولت اور آسانی بھی ہے اس لیے کہ لاکھوں حاجیوں کے یوم الترویہ تک مکہ مکرمہ میں ۱۴ دن یا اس سے کم بنتے ہوں تو منی کے ایام کو علیحدہ کر کے وہ مسافر بن جائیگا جس کو نماز میں قصر کی سہولت اور مسافر ہونے کی وجہ سے قربانی واجب نہ ہونے کی سہولت مل جائیگی ۔

"**إن النبي صلى الله عليه وسلم قال لمعاذبن جبل وأبي موسى الأشعري عند ما أرسلهما إلى اليمن فقال لهما: يسرا ولاتعسرا، وبشراولا تنفرا، وكذلك قال عليه الصلاة والسلام: يسروا ولاتعسروا، وبشروا ولاتنفروا، واعلموا أن أحداً منكم لن يدخل الجنة بعمله**". (بخاری:۲/۶۲۲، باب بعث ابی موسی ومعاذ الی الیمن قبل حجۃ الوداع، ومسلم).

وقال عليه الصلاة والسلام: لاتشددوا فيشدد الله عليكم،فإن قوماً شددوا على أنفسهم فشدد عليهم فتلك بقاياهم في الصوامع .(اخرجه ابوداود برقم٤٩٠٤).

وقال اللّٰه تعالىٰ في رخصة إفطار المريض والمسافر:﴿يريد الله بكم اليسر، ولايريد بكم العسر﴾.

ويدل على اعتبار اليسر واقعة تمرة خيبر في الحديث المشهور وفي آخره: لا تفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيباً .(رواہ البخاری:۱/۲۹۳،باب اذا اراد بیع تمربتمر).

لیکن سہولت کا یہ مطلب نہیں کہ حرام کو حلال اور غلط کو صحیح کہہ دیا جائے ۔

(۵) اتصال یا انفصال کے باوجود عرف عام اور حکومتی تحدید میں اختلاف ہو جائے تو اعتبار عرف عام کا ہونا چاہئے ۔

احسن الفتاوی میں ہے:

دو بستیوں کے درمیان وجود مزارع یا قدر غلوہ ۱۶۔۱۳۷ میٹر علامت انقطاع ہے، لہذا اگر دو مواضع عرف عام میں ایک ہی شہر کے دو محلے سمجھے جاتے ہوں تو فصل مذکور کے باوجود دونوں کو ایک موضع قرار دیا جائے ۔(احسن الفتاوی:۴/۷۴).

عرف وعادت کو حکومت کی حد بندی پر ترجیح دینی چاہئے جب تک عرف نص کے خلاف نہ ہو تو عرف پر عمل کرنا چاہئے ،اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿**وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف**﴾ معروف سے مراد عرف وعادت کے موافق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "ماراه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن".

شارح مجلّہ لکھتے ہیں: ان العرف والعادة يكون حجة اذا لم يكن مخالفاً للنص۔(۸۱/۱-۸۹-وشرح عقود رسم المفتي: ٤١) بلکہ بعض صورتوں میں اگر نص کی بنیاد عرف پر ہو تو عرف ہی کو بنیاد بنایا جائیگا، مثلاً پرانے زمانے میں حطہ وشعیر کیلی تھے تو ربا وغیرہ میں احادیث میں ان کو کیلی قرار دیا گیا، لیکن جب بعد والے زمانے میں یہ وزنی بن گئے تو ان کو وزنی قرار دیا جائیگا، جیسے اس زمانے میں لوگ کیل کو جانتے بھی نہیں تو حطہ وشعیر کو وزنی قرار دینا نص کی تبدیلی نہیں بلکہ نص کا منشا اور اساس سمجھنا ہے۔

علامہ شامی نے ابن ہمامؒ سے امام ابو یوسفؒ کے قول کی ترجیح نقل فرمائی ہے: عن الثاني اعتبار العرف مطلقاً ورجحه الكمال وخرج عليه سغدي آفندي۔(الدر المختار:١٧٦/٥، باب الربا، سعيد۔وشرح مجلة: ٨١/١، المادة:٣٦).

خلاصہ یہ ہے کہ اگر نص خود عرف کا تابع ہو تو عرف کی تبدیلی سے نص کا ترک لازم نہیں آتا، کیونکہ اصل عرف ہے لہذا عرف کا اعتبار ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

دیگر مفتیانِ کرام کی آراء:

جن مفتیانِ کرام وعلماءِ عظام کا اسی کے مطابق فتویٰ ہے ان کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

(۲) مفتی محمد حسین، دارالافتاء والارشاد، جامعۃ الرشید کراچی۔

(۳) مفتی عبدالواحد، جامعہ مدینہ کریم پارک وادی روڈ لاہور۔

(۴) مفتی عصمت اللہ، دارالافتاء، دارالعلوم کراچی۔

(۵) حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے استفسار پر سعودی عرب کے دارالافتاء "رئاسة ادارة البحوث العلمية والافتاء" کے نام ایک سوال ارسال فرمایا کہ: پہلے زمانے میں منیٰ اور مکہ دو الگ مقامات شمار کئے جاتے تھے، مگر آج کل ان دونوں میں اتصال اور قرب پایا جاتا ہے، تو کیا یہ دونوں جگہیں ایک ہی شمار ہونگی، یا الگ الگ؟ اس پر "اللجنة الدائمة" نے جواب دیا کہ "یہ دونوں الگ الگ جگہیں ہیں، اور قرب واتصال کا کوئی اعتبار نہیں۔

اس جواب پر وہاں کے بڑے مفتیان کرام کے دستخط ہیں مثلاً:

بسم الله الرحمن الرحيم

المملكة العربية السعودية
رئاسة ادارة البحوث العلمية والإفتاء
الأمانة العامة لهيئة كبار العلماء

الرقم :
التاريخ :
المرفقات :

فتوى رقم (٢٢١٧١) وتاريخ ٢١/ ١١/ ١٤٢٢ هـ .

الحمد لله وحده والصلاة والسلام على من لانبي بعده .. وبعد :-

فقد اطلعت اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء على ماورد إلى سماحة المفتي العام من المستفتي/ محمد تقي العثماني والمحال إلى اللجنة من الأمانة العامة لهيئة كبار العلماء برقم (٦٧٣٨) وتاريخ ٢٠/٧/١٤٢٢ هـ وقد سأل المستفتي عما يلي :-

السؤال الثاني : في الأزمنة السالفة كان « منى » يعد موضعا مستقلا و « مكة المكرمة » بلدة مستقلة ، ومن هنا يختلف فيهما حكم السفر والاقامة . وأما في العصر الراهن فقد نشأ بينهما كمال اتصال واقتراب حسب العمران كما لا يخفى على الزائر ، فالمسئول منكم أن حكومتكم هل تعامل هذين الموضعين معاملة موضع واحد أو بلدة واحدة اليوم ، ومنى يعد من مكة المكرمة أم لا ؟ فالرجاء منكم ايضاح هذا الأمر كمال الايضاح لتوقف مسألة نية الإقامة فيه .

الجواب : أهل مكة إذا حجوا أخذوا حكم الحجاج في القصر والجمع لأن الذين حجوا مع النبي ﷺ من أهل مكة لم يأمرهم بالإتمام ولا اعتبار لقرب بنيان مكة من المشاعر .. وبالله التوفيق ..

وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم ،،،،،

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء

عضو	عضو	الرئيس
صالح بن فوزان الفوزان	عبدالله بن عبدالرحمن الغديان	عبدالعزيز بن عبدالله بن محمد آل الشيخ
عضو	عضو	عضو
عبدالله بن محمد المطلق	عبدالله بن علي الركبان	أحمد بن علي سير المباركي

(۶) اسی طرح الدکتور سعید احمد عنایۃ اللہ وغیرہ جو مدرسہ صولتیہ کے دراسات علیا کے اساتذہ میں سے ہیں، نے ۲۰۰۴ء میں موسم حج میں اسی قسم کا ایک استفتاء مفتی مملکت سعودی عرب الشیخ عبد العزیز کی خدمت میں بھیجا تھا کہ منیٰ، مزدلفہ اور عرفات الگ الگ ہیں یا شہر مکہ کے تابع ہیں؟

جواباً مفتی صاحب نے انھیں فون پر کہا کہ ان مذکورہ مقامات کی مستقل حیثیت ہے اور وہ مکہ مکرمہ شہر کا حصہ نہیں۔

(۷) حضرت مولانا عبد الحفیظ مکی صاحب، جو کئی سالوں سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں، فرماتے ہیں کہ منیٰ ہر حالت میں مکہ مکرمہ سے منفصل جگہ ہے، نیز فرماتے ہیں: بعض حضرات کا یہ فرمانا کہ اس وقت مکہ مکرمہ اور منیٰ کا اتصال ہو چکا ہے، تو یہ امر واقعہ کے خلاف ہے، شرعاً اتصال نہیں ہوا، اس راقم نے بمعیت مفتی ابولبابہ صاحب، حضرت مفتی عبد الحمید صاحب اور دیگر حضرات کے ساتھ گاڑی سے منیٰ سے مکہ مکرمہ اور مکہ سے منی جانے والے ہر راستہ پر جاکر وہ مسافت ناپی جو دونوں کے درمیان ہے تو کسی طرف سے بھی ۹۰۰ میٹر سے کم نہ تھی تو اتصال شرعاً کیسے ہوگا؟

(۸) حضرت مولانا مفتی احمد ممتاز صاحب دامت برکاتہم، رئیس دار الافتاء جامعہ خلفاء راشدین، کراچی کا اس بارے میں مفصل فتویٰ ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں: بندہ کا مدرسہ صولتیہ جانا ہوا، حضرت مولانا ہشیم صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ سے اس موضوع پر تفصیلی بات ہوئی، اس وقت ان کی رائے کا مدار اتصال اور محاذات پر تھا، جس پر بندہ نے عرض کیا کہ زیر بحث مسئلہ میں قریتین کا اتصال نہیں، بلد اور مفازہ کا ہے...آخر میں انھوں نے فرمایا کہ اس پر آج تک ہم نے غور نہیں کیا۔

(۹) مذکورہ بالا فتویٰ میں مفتی عبد الرحمٰن الکوثر بن مولانا مفتی عاشق الٰہی بلند شہری، استاذ جامعہ طیبہ مدینہ منورہ کا فتویٰ بھی شامل ہے، آپ نے حال (۱۴۲۸ھ) میں منیٰ اور اس کے مضافات کا مشاہدہ کر کے تحریر فرمایا ہے کہ: دونوں الگ الگ جگہیں ہیں ہمارے ادراک کے مطابق عرف میں منیٰ کو مکہ مکرمہ کا محلّہ نہیں کہا جاتا ہے، اور منیٰ میں تو آبادی بھی نہیں ہے۔

(۱۰) مفتی محمد عبد اللہ مفتی جامعہ خیر المدارس، ملتان نے بھی ہر طرح سے منیٰ کے مکہ مکرمہ کا جزء ہونے کی نفی کی ہے نہ منیٰ فناء مکہ ہے، نہ حقیقۃً یا حکماً مکہ مکرمہ سے متصل ہے۔

(۱۱) حضرت مولانا مفتی اسماعیل طوروصاحب جامعہ اسلامیہ صدر راولپنڈی نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ عرفاً منیٰ اور مکہ الگ الگ مقامات ہیں، اور منیٰ مکہ مکرمہ کی فنا بھی نہیں، اس لیے کہ اگر شہر کی ضروریات کی بنا پر اسے فنا قرار دے رہے ہیں تو یہ بات تو فرضیت حج کے روز اول سے پائی جاتی ہے، مگر پھر بھی فقہاء کرام نے منیٰ کو مکہ کی فنا

نہیں قرار دی اور اتمام کا حکم نہیں دیا۔

(۱۲) مفتی انعام اللہ، جامعہ اسلامیہ اسلام آباد نے مسئلہ ہذا کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، قائلین اتحاد موضعین کے ہر مستدل اور ہر شبہ کا جواب دیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ فقہاء کے نزدیک اتحاد وانفصال کی تعریف میں مختلف اقوال ہیں، پھر ۶/ اقوال نقل فرما کر لکھتے ہیں کہ: قطع نظر اس سے کہ ان اقوال میں راجح کیا ہے؟ بظاہر نظر کرنے سے مذکورہ بالا فقہی اقوال میں سے کسی بھی قول کے مطابق دونوں جگہوں میں اتصال نہیں۔ اور نہ عرفاً یہ دونوں جگہیں ایک ہیں، بلکہ الگ الگ ہیں ،اس لیے کہ:

۱- اگر عرف میں منیٰ کا مکہ سے اتصال ہو چکا ہوتا تو اس مسئلہ پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

۲- پچھلا عرف دونوں میں بالاتفاق انفصال کا تھا، اور اس عرف قدیم کے تبدیل ہونے کے ٹھوس دلائل نہیں ہیں۔

۳- لوگ کہتے ہیں: یوم الترویۃ کو حاجی مکہ سے منیٰ جائیں گے، چلے جاتے ہیں، چلے گئے اور رمی اور قربانی کے بعد حجاج منیٰ سے مکہ واپس لوٹتے ہیں، واپس آتے ہیں، یہ سب دونوں مقامات میں مغایرت کی دلیل ہے، اسی طرح ﴿ثم أفيضوا من حيث أفاض الناس﴾ یا ﴿فمن تعجل في يومين فلا إثم عليه﴾ یا ﴿فإذا أفضتم من عرفات فاذكروا الله﴾... ان آیات میں بھی مکہ، عرفات، مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان آنا جانا مراد ہے۔

الغرض کثیر تعداد میں مفتیان کرام قدیم قول کی طرف مائل ہیں، اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ اور لوگ اس پرانے قول کے عادی ہیں، نیز مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت فیوضہم نے اس مسئلہ پر بحث کے دوران یہ فرمایا تھا کہ جب تک اس مسئلہ پر اتفاق یا تحقیق نہ ہو تو پرانا فتویٰ چلنا چاہئے پرانے فتویٰ میں دونوں جگہیں یعنی منیٰ اور مکہ مکرمہ الگ الگ شمار کی جاتی ہیں اور اس مجلس کے مفتی حضرات نے حضرت مفتی رفیع صاحب سے اتفاق فرمایا۔ مفتی صاحب نے یہ بات حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری مہتمم جامعہ خیر المدارس کے جواب میں فرمائی، مولانا حنیف صاحب نے استفسار فرمایا کہ جب تک اتفاق یا تحقیق نہ ہو تو ہم عوام کو کیا بتائیں تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ پرانا فتوی چلنا چاہئے، دوسرے مفتیان کرام نے اس کے ساتھ اتفاق کیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اتحاد والوں کے دلائل پر ایک نظر:

قائلین اتحادِ منیٰ ومکہ مکرمہ کے بعض شواہد وشبہات اوران کے جوابات مختصراً عرض کیے جاتے ہیں:

(۱) عموماً اس موضوع پر مقالہ نگار حضرات فضیلۃ الشیخ حضرت عبداللہ بن سبیل کے فتویٰ سے استدلال کرتے ہیں۔

اس بارے میں بہتر یہ ہے کہ اپنے طور پر کوئی اندازہ لگانے کے بجائے وہاں کے حضرات سے رجوع کرنا چاہئے، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے مسجد حرام کے معمرترین امام فضیلۃ الشیخ سے اسی سلسلہ کا استفسار فرمایا جس کے جواب میں فضیلۃ الشیخ نے جو تحریر فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''منیٰ شہر مکہ کا ایک حصہ اور محلّہ بن گیا'' ان کے جواب کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

الذي يظهر لنا أن منىٰ أصبحت اليوم جزء من مدينة مكة ... إن حكومة المملكة العربية السعودية تعد منىٰ من مكة على اعتبار أنها حي من أحيائها إلا أن الحكومة تمنع البناء فيها لمصلحة عامة ؛ لأنه لا يجوز لأحد أن يتملك ولا يختص بمنىٰ ولا غيرها من المشاعر لقول النبي صلى الله عليه وسلم :'' منىٰ مناخ من سبق''.

الجواب: حضرت مفتی احمد ممتاز صاحب جامعہ خلفاء راشدین کراچی نے اس کا جواب دیا ہے:

(۱) صرف سماحۃ الشیخ کی رائے کو عرف اغلب واشہر سمجھنا درست نہیں۔

(۲) بظاہر حضرت کے فتویٰ میں تعارض ہے۔ فرماتے ہیں کہ حکومت منیٰ کو مکہ کا ایک محلّہ قرار دیتی ہے اور اپنا بھی یہی رجحان ذکر کیا، پھر آگے کہتے ہیں: حکومت وہاں بنا اور تعمیرات سے روکتی ہے'' تو اب محلّہ اور عدم بنا جمع نہیں ہوسکتے، کیونکہ شہر کی آبادی سے باہر میدان کو کسی طرح بھی محلّہ مصر نہیں کہا جاتا، بلکہ شہر سے متصل آبادی محلّہ جو کسی وجہ سے مسمار ہوگیا، اسے بھی اب شہر کا محلّہ نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا منیٰ مکہ مکرمہ کا محلّہ کیسے ہوسکتا ہے؟ البتہ شہر کے قرب وجوار میں آباد محلوں کو شہر کا حصہ کہا جاتا ہے۔

لہٰذا اگر ان کی یہ خاص رائے ہے کہ میدان جو آبادی سے باہر ہو شہر کا حصہ ہے تو سب پر حجت نہیں۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ '' لأنه لا يجوز لأحد أن يتملك ...'' سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت منیٰ اور دوسرے مشاعر کو شہر مکہ سے الگ کرنا چاہتی ہے اس لیے وہاں کسی کو تعمیر کی اجازت نہیں دیتی۔

(۴) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ چار باتوں کی وجہ سے منیٰ کو فناء مکہ کہنا چاہئے: (۱) وہاں قربان گاہ ہے۔ (۲) حجاج کی اجتماع گاہ ہے۔ (۳) گاڑیوں کی پارکنگ ہے۔ (۴) تفریح گاہ ہے۔

الجواب: یہ بات چند وجوہ کی بناپر صحیح نہیں۔

(۱) وہاں مصالح میں سے ایسی کوئی چیز نہیں جو مکہ مکرمہ کے ساتھ خاص ہوں وہاں تمام انتظامات ادائے مناسک کے لیے کئے جاتے ہیں اور اہل مکہ ان سے تبعاً استفادہ کرتے ہیں، مگر تبعاً استفادہ کرنے سے ان کو مصالح مکہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ قربان گاہ بھی اداء مناسک، دم شکر وغیرہ کے لیے ہے، اس کے ضمن میں اگر اہل مکہ کو پابند کیا گیا کہ وہ بھی اضحیہ یہیں کیا کریں تو یہ انتظام تبعی ہے، اس کی وجہ سے منیٰ فناء مکہ نہیں۔

(۲) اگر بالفرض قربان گاہ کو مصلحت شہر کہہ کر اس کو فناء کہا جائے تو فناء وہ خاص احاطہ ہوگا جو قربان گاہ کے لیے مختص ہے، اس کی وجہ سے منیٰ کا پورا میدان فناء نہ بنے گا۔

(۳) وہاں لوگ گاڑیاں بوقتِ ضرورت قرب بلد کی وجہ سے پارک کرتے ہیں، پارکنگ کے لیے وہ جگہ مقرر نہیں۔

(۴) وہاں تفریح کے لیے کوئی مخصوص پارک وغیرہ نہیں ہے، لوگ ویسے ہی چلے جاتے ہیں۔

(۵) منیٰ میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ شیخین کے ہاں جائز، امام محمدؒ کے ہاں جائز نہیں، اگر منیٰ فناء مکہ ہوتا تو شیخین اور امام محمدؒ کے درمیان اس اختلاف کی نوبت ہی نہ آتی، اس لیے کہ فناء چاہے شہر سے متصل ہو یا منفصل وہاں ہر صورت میں جمعہ درست ہے۔

یہ اختلاف واضح دلیل ہے کہ منیٰ فناء مکہ نہیں۔

(۶) اگر بالفرض منیٰ میں اہل مکہ کی تفریح گاہ اور کھیل کی جگہ ہے، تب بھی یہ حاجت یا مصالح بلد میں داخل نہیں۔

الموفقات میں ہے:

أما الحاجات فمعناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسعة ورفع الضيق المودى في الغالب إلى الحرج والمشقة ... (الموفقات: ۲/ ۹).

(۷) اگر قربان گاہ ہونے کی وجہ سے منیٰ کو فناء مکہ کہتے ہیں تو موقف ہونے کی بناء پر مزدلفہ اور عرفات کو بھی فنا کہنا چاہئے جہاں جہاں علت ہو وہاں حکم آئیگا۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ مزدلفہ اور عرفات چونکہ مکہ سے دور ہیں اس لئے اسے فناء مکہ نہیں قرار دے سکتے؟ تو علامہ شرنبلالی کی تحقیق کے مطابق یہ اعتراض قابل اعتماد نہیں، ان کے یہاں مصالح کا اعتبار ہے، دوری کا نہیں۔

(۸) منیٰ کے فناء ہونے کے بارے میں جو روایات ذکر کی گئیں وہ سب کتاب الجمعہ کی عبارات ہیں، جمعہ اور عیدین حوائج مصر میں سے ہیں، لیکن قصر حوائج میں سے نہیں۔ مراقی الفلاح میں ہے: **ولا يلحق فناء المصر بالمصرفى حق المسافر، يلحق الفناء بالمصرفى حق صلاة الجمعة**. (مراقی الفلاح: ص۲۵۴).

(۳) ایک عام بات جس کی بنیاد پر اس بحث کی ضرورت پیش آئی وہ یہ ہے کہ یوں کہا جاتا ہے کہ: ”اب صورت حال یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی آبادی منیٰ سے بھی متجاوز ہو چکی ہے اور منیٰ مکہ مکرمہ کا ایک حصہ ہے“ اگر چہ پہلے دونوں الگ الگ تھے۔ اسی بنا پر بہت سے حضرات اتحاد کے قائل ہیں، مختلف الفاظ میں سب یہی بات کہتے ہیں۔ بعض مفتی حضرات نے فرمایا کہ انھوں نے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں حج کے زمانے میں ایک فتویٰ ۲۰۰۰ء مطابق ۱۴۲۰ھ میں لکھا تھا اور اس پر مفتیان واردین مدرسہ صولتیہ کی تصدیقات بھی ہیں مثلاً مفتی شبیر احمد مراد آبادی صاحب، مفتی فاروق میرٹھی صاحب، مفتی احمد خان پوری صاحب، مفتی سلمان منصور پوری وغیرہ، نیز یہی بات اسلامک فقہی اکیڈمی کے دسویں فقہی سمینار میں کہی گئی: ”پہلے دونوں کی آبادیاں الگ تھیں، مگر اب مکہ شہر پھیلتے ہوئے منیٰ کی آبادی سے متصل ہو گیا“ پھر مقالہ نگار حضرات مثلاً حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب، مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا ارشاد القاسمی صاحب وغیرہ سب نے متفق اللسان ہو کر اس کو دلیل بنایا کہ دونوں کی آبادیوں میں اتصال ہو چکا ہے (ماخوذ از تحقیق سلسلہ نمبر ۶، ادارہ غفران راولپنڈی)۔

الجواب: اس کا جواب تو ظاہر ہے کہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ ماضی بعید میں تو منیٰ میں آبادی کا ہونا مسلم ہے، لیکن موجودہ دور میں منیٰ میں سرے سے آبادی ہے ہی نہیں کہ مکہ مکرمہ سے متصل قرار دیا جاسکے، نیز محلّہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مکانات اور گلیاں ہوں، لیکن منیٰ میں ایسا نہیں۔

(۴) اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ منیٰ میں اگر چہ پورا سال آبادی نہیں رہتی فقط حج کے زمانے میں ہوتی ہے، لیکن سال بھر آباد رہنا کوئی ضروری شرط نہیں کما قال الآفندی رحمہ اللہ: ”بقاؤھا مصراً لیس بشرط“ لہٰذا حج کے زمانے میں اسے مصر قرار دینا چاہیے۔

الجواب: یہ خیال درست نہیں، علامہ آفندیؒ کے قول ”بقاؤھا مصراً لیس بشرط“ کا مطلب یہ ہے کہ مصر بننے کے لیے اس کی مصریت کی بقاء شرط نہیں، عارضی طور پر بھی مصر بن سکتا ہے، لیکن عارضی طور پر مصر اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ وہ پہلے سے قریہ ہو، جنگل اور ویرانہ تو کبھی بھی مصر نہیں بنتا۔

(۵) ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ دونوں کی بلدیہ ایک ہے۔ (ندائے شاہی، ص ۵۳، دسمبر ۲۰۰۴ء)۔

الجواب: چونکہ منیٰ میں پورا سال کوئی کام نہیں ہوتا لہٰذا مکہ مکرمہ کی بلدیہ وہاں کام کرتی ہے الگ بلدیہ کی ضرورت نہیں پڑی یہ مکہ مکرمہ کے جزء ہونے کی دلیل نہیں، نیز بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی اپنی بلدیہ ہے۔ واللہ اعلم بذلک۔

(۶) آج کل منیٰ کی حالت پر غور کریں تو منیٰ یورپ کا ایک ترقی یافتہ شہر ظاہر ہوتا ہے، وہاں جدید ائر

کنڈیشن خیمے ہیں، دفاتر ہیں نیز دیگر بہت سی سہولیات ہیں، اس لیے اسے جنگل نہیں کہا جا سکتا بلکہ آبادی ہے۔

الجواب: (۱) یہ مکانات پختہ نہیں، فقہاء پختہ مکانات کی شرط لگاتے ہیں۔ (۲) خیموں میں کوئی مستقل رہائش نہیں اختیار کرتا، اور آبادی کے لیے موضع لبث وقرار شرط ہے۔ (۳) عرب شہزادے اس سے بھی بہترین خیمے جنگلوں میں لگاتے ہیں، لیکن ان کو کوئی آبادی نہیں کہتا۔ (۴) شاہی محل منیٰ میں ہے وہاں خدام اور محافظ رہتے ہیں مگر آبادی بننے کے لیے ان کی رہائش کا اعتبار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ منیٰ میں نہ مکانات متصل ہیں، نہ وہ جائے قرار ہے، نہ وہاں لوگ عادۃً رہائش اختیار کرتے ہیں، بلکہ شرعاً وہاں رہائش اچھی بھی نہیں۔

عن عائشة رضي الله عنها قالت: قلت يا رسول الله! ألا نبني لك بناء بمنىٰ يظلك؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لا منىٰ مناخ من سبق". (ترمذی: ۱/۱۷۷، باب ما جاء في أن منى مناخ من سبق و كذا في أبو داود و ابن ماجه)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

ایام حج میں منیٰ میں جمعہ قائم کرنے کا حکم:

سوال: زمانہ قدیم کے فقہاء نے منیٰ میں ایام حج میں جمعہ کا جواز لکھا ہے، لیکن قدیم زمانہ میں وہاں قریہ کی شکل کی آبادی تھی، جبکہ اب وہاں مستقل آبادی نہیں ہے، تو اب اس زمانہ میں منیٰ میں جمعہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہو سکتا ہے تو واجب ہے یا جائز؟

الجواب: (۱) آج کل منیٰ میں قانونی طور پر آبادی نہیں ہے، کئی سالوں سے وہاں کے مکانات کو گرا کر وہاں کی آبادی ختم کر دی گئی ہے، حج صرف خیموں میں ہوتا ہے، جیسا کہ مولانا عبد الحفیظ مکی صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرمایا ہے، لہذا یہ قریہ نہیں۔

(۲) فقہاء کرام ابواب الجمعہ میں فرماتے ہیں کہ: شیخین کے یہاں امیر کی موجودگی میں منیٰ میں جمعہ جائز اور عرفات میں بالاتفاق جائز نہیں، پھر اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ ''منیٰ قریہ ہے، اور حج کے زمانے میں مصر بن جاتا ہے'' لہذا منیٰ میں جمعہ جائز ہے اور عرفات خالی صحرا ہے یا جنگل ہے، لیکن یاد رہے کہ آج کل منیٰ قریہ نہیں ہے، لہذا حج کے زمانے میں مصر نہیں بنے گا، کیونکہ مصر بننے سے پہلے ضروری ہے کہ مستقل قریہ ہو مگر جب منیٰ صحراء ہے تو حج کے زمانے میں مصر نہیں ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

وتجوز بمنى إن كان الأمير أمير الحجاز أو كان مسافراً عندهما وقال محمد: لا جمعة بمنى لأنها من القرى، حتى لايعيد بها. ولهما أنها تتمصر في أيام الموسم، وعدم التعييد للتخفيف، ولا جمعة بعرفات في قولهم جميعاً، لأنها فضاء وبمنى أبنية. (الهداية: ١/١٦٧، باب صلاة الجمعة).

اور ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ کھلے میدان میں جمعہ نہیں۔

قال ابن الهمام: إذا سافر الخليفة فليس له أن يجمع في القرى كالبراري. (هدايه مع الفتح ٢/٣٥، ٥٤، دار الفكر).

بلکہ عرفات کی جو حالت فقہاء نے بیان کی ہے، موجودہ زمانے کا منیٰ اس سے قریب ہے، کیونکہ ملازمین اور عملہ کے رہنے کا اعتبار نہیں، اور ان کے علاوہ مستقل رہائش پذیر لوگ وہاں نہیں ہیں۔

ہاں قدیم زمانہ میں منیٰ آباد تھا، جیسا کہ کتبِ فقہ سے ظاہر ہے اور اسی وجہ سے فقہاء مصر کی تعریف میں آبادی کا ذکر کرتے وقت منیٰ کی آبادی کا ذکر فرماتے ہیں۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

والمصر في ظاهر الرواية: الموضع الذي يكون فيه مفتٍ وقاضٍ يقيم الحدود وينفذ الأحكام، وبلغت أبنيتها أبنية منىٰ هكذا في الظهيرية وفتاوى قاضيخان. (الفتاوى الهندية: ١/١٤٥).

(۳) نیز بعض سلف سے منیٰ میں جمعہ نہ پڑھنا منقول ہے۔

ملاحظہ ہو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

عن عبد الملک عن عطاء قال: سمعته ــ وسئل: على أهل منىٰ جمعة؟ قال: إنما هم سفر. وعن خالد بن أبي عثمان قال: شهدت عمر بن عبد العزيز لا يجمع بمنىٰ. (مصنف ابن ابی شيبة: ٨/٣٣٢، المجلس العلمي، ماقالوا بمنىٰ جمعة ام لا؟).

مؤطا امام مالک میں ہے:

قال مالکؒ في إمام الحاج: إذا وافق يوم الجمعة يوم عرفة أو يوم النحر أو بعض أيام التشريق أنه لايجمع في شيء من تلک الأيام. (مؤطا امام مالکؒ: ص٤٢٦).

ابن منذر نیسابوری کی اوسط میں ہے:

ذکر حدیث :جاء رجل من الیهود إلی عمر رضی اللہ عنہ، فقال : آیة من کتاب اللّٰه تقرؤونها...إني لأعلم الیوم الذي أنزلت فیه والمکان الذي نزلت فیه...إلی آخر الحدیث، قال أبوبکر: ففي الجمع بین هذا الحدیث وحدیث جابر رضی اللہ عنہ أن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم صلی الظهر بعرفة بیان ودلیل علی أن لاجمعة بمنیٰ ولاعرفة، وقال مالکؒ: لایجمع الإمام وهومسافر في بر أوبحر. (الاوسط لابن المنذر:۱۷۰۹/۳٤۹/٥،من تجب علیه الجمعة).

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

ولا جمعة بمنیٰ وعرفة نصاً لأنه لم ینقل فعلهاهناک. (الفقه الاسلامی و ادلته:۲٦۹/۲،دارالفکر).

کشاف القناع (فقہ حنبلی کی کتاب ہے) میں ہے:

ولاجمعة بمنیٰ وعرفة نصاً ،لأنه لم ینقل فعلها هناک، وللسفر. (کشاف القناع:۱۲٤/٤،باب صلاة الجمعة).

خلاصہ یہ ہے کہ منیٰ میں جمعہ نہیں پڑھنا چاہئے ۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:
﴿فانکحوا ما طاب لکم من النساء ...﴾
وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
”یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج
فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج...“

کتاب النکاح

باب ﴿۱﴾

منگنی اور خطبہ نکاح کابیان

فصل اول

مخطوبہ کو دیکھنے اور بات چیت کرنے کا بیان

منگنی اور اس میں پائی جانے والی رسموں کا حکم:

سوال: شریعتِ مطہرہ میں منگنی کی کیا حقیقت ہے؟ اور اس میں پائی جانے والی رسموں کا کیا حکم ہے؟

الجواب: نکاح سے قبل شادی کی نیت سے لڑکا لڑکی کو دیکھ لے، اس کے بعد دونوں خاندان آپس میں رشتۂ نکاح طے کرلیں، اور وعدۂ نکاح وغیرہ ہوجائے، نیز اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ تحفے تحائف وغیرہ دینا چاہیں تو از راہِ الفت ومحبت دے سکتے ہیں، فرمانِ نبوی "تھادوا تحابوا" کی وجہ سے قوی امید ہے کہ عقد نکاح انجام پائے اور دونوں خاندانوں کی تمنائیں پوری ہوں، نیز لڑکی کو دیکھتے وقت مختصر سی بات چیت کرنے کی بھی گنجائش ہے، شریعتِ مطہرہ میں یہ منگنی کی حقیقت ہے، اور منگنی صرف وعدۂ نکاح ہے حقیقۃً نکاح نہیں ہے لہذا نکاح کے احکام جاری نہ ہوں گے۔

اس کے علاوہ تمام رسومات قابل ترک ہیں، اور ہر جگہ کی رسم ورواج مختلف ہوتے ہیں، موجودہ زمانہ میں اس ملک کے رسوم میں سے چند قابل تذکرہ یہ ہیں: مثلاً پورا دن اسٹیج پر ساتھ بیٹھ کر میاں بیوی کی طرح باتیں کرنا، مصافحہ کرنا، ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنانا، ہال سجانا اور اس میں مختلف رسوم کا برتنا، خصوصاً اس جیسے موقعہ پر ویڈیو کیمرہ کے ذریعہ تصویریں کھینچنا، اجنبی مرد واجنبی عورتوں کا باہمی اختلاط، نیز ان رسومات کی پابندی کی وجہ سے بہت سی مرتبہ لڑکی والے تنگ دستی کا شکار ہوجاتے ہیں، اور قرض لینا پڑتا ہے، جب کہ بلا ضرورت قرض لینے کی حدیث شریف میں ممانعت موجود ہے۔

الغرض ان خرافات کو چھوڑ کر "الدین یسر" پر عمل کرتے ہوئے ایسے مصائب وتکالیف کا شکار ہونے

سے حتی الامکان اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔
دلائل حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

عن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: جاء رجل إلى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: إني تزوجت امرأة من الأنصار، قال: فانظر إليها فإن في أعين الأنصار شيئاً. (رواه مسلم،مشكاة شريف:٢/٢٦٨).

عن سهل بن سعد رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: ذكر لرسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم امرأة من العرب فأمر أبا أسيد أن يرسل إليها فأرسل إليها فقدمت فنزلت في أجم بني ساعدة فخرج رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حتى جاء ها فدخل عليها فإذا امرأة منكسة رأسها فلما كلمها رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قالت: أعوذ باللّٰه منک، قال:قد عذتک مني، فقالوا لها: أتدرى من هذا؟ فقالت: لا، فقالوا: هذا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم جاء ک ليخطبک قالت:أنا كنت أشقى من ذلک. (رواه مسلم:٢/١٦٩).

طحطاوی میں ہے:

قوله والنظر إليها قبله، أي فإنه مندوب،لأنه داعية للألفة فينظر إلى وجهها وكفيها وإن لم تأذن له هي أو وليها إذا علم أنه يجاب في نكاحها. (حاشية الطحطاوي على الدرالمختار:٢/٥،كوئته)

شامی میں ہے:

قال في شرح الطحاوي: لو قال: هل أعطيتنيها؟ فقال: أعطيت، إن كان المجلس للوعد فوعد. (فتاوى الشامي:٣/١١،سعيد).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

مرد کے لیے جائز ہے کہ وہ اس خاتون کو دیکھ لے جس سے وہ رشتہ چاہ رہا ہے،عورت کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ پیغام دینے والے مرد کو دیکھ لے، رشتہ کا طے ہوجانا شرعاً ''نکاح کا وعدہ'' ہے جس میں قانونی لزوم نہیں ہے منگنی کے طور پر انگوٹھی دینا، کچھ نقد دینا، یا کپڑے پہنانا، یا کوئی اور تحفہ دینا نکاح کے لیے رضامندی کی علامت ہے، لیکن اس طرح کے عمل کی وجہ سے نکاح پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی:ص۳۶،۳۷).

کفایت المفتی میں ہے:

منگنی میں مقصود وعدۂ نکاح ہوتا ہے، یعنی منگنی کے وقت جو الفاظ کہے جاتے ہیں وہ وعدۂ نکاح کے ہوتے

ہیں نکاح منعقد کرنا مقصود نہیں ہوتا، اسی لیے نکاح دوبارہ مجلس منعقد کر کے کیا جاتا ہے۔ (کفایت المفتی: ۵/۵۱، دارالاشاعت)۔

آپ کے مسائل میں ہے:

سوال کا ماحصل یہ ہے کہ منگیتر سے ملاقات کرنا اس سے ٹیلیفون وغیرہ پر بات کرنا اور اس کے ساتھ گھومنا پھرنا صحیح نہیں لیکن اگر معاشرے میں عام ہو اور اس کو کوئی برا بھی نہ سمجھتا ہو تو کیا حکم ہے؟

جواب: نکاح سے پہلے منگیتر اجنبی ہے لہذا نکاح سے پہلے منگیتر کا حکم بھی وہی ہوگا جو غیر مرد کا ہے کہ عورت کا اس کے ساتھ اختلاط جائز نہیں اور معاشرے میں کسی چیز کا رواج ہو جانا کوئی دلیل نہیں ایسا غلط رواج جو شریعت کے خلاف ہو خود لائق اصلاح ہے نیز زیادہ تعلقات کی نکاح سے قبل اجازت نہیں نہ میل جول کی اجازت ہے اور نہ خلوت و تنہائی کی، نکاح سے قبل ملنا جلنا بجائے خود غیر اخلاقی حرکت ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۵/۳۴، ۳۵)

بہشتی زیور میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی منگنی کی رسموں کو بیان کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

غرض ان سب خرافات کو چھوڑ دینا واجب ہے، بس ایک پوسٹ کارڈ یا زبانی گفتگو سے پیغام نکاح ادا ہو سکتا ہے، جانب ثانی اپنے طور پر ضروری باتوں کی تحقیق کر کے ایک پوسٹ کارڈ سے یا فقط زبانی وعدہ کر لے، منگنی ہو گئی۔ (بہشتی زیور حصہ ششم ص۲۲)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

منگنی کے لیے لڑکی سے بات چیت کرنے کا حکم:

سوال: منگنی کے لیے لڑکی کو دیکھنا جائز ہے کیا بات چیت کرنا بھی درست ہے؟

الجواب: شادی کے ارادہ سے منگیتر کو دیکھتے وقت مختصر سی بات چیت کرنا جائز ہے، لیکن محبت والی گفتگو اور کافی دیر تک میاں بیوی کی طرح بات کرنے میں فتنہ ہے اور جائز نہیں ہے۔

مختصر بات چیت کرنے کی اجازت احادیث کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں:

سنن ابن ماجہ میں ہے:

عن المغيرة بن شعبة قال: أتيت النبي صلى الله عليه وسلم فذكرت له امرأة أخطبها فقال: اذهب فانظر إليها، فإنه أجدر أن يؤدم بينكما، فأتيت امرأة من الأنصار فخطبتها إلى أبويها وأخبرتهما بقول النبي صلى الله عليه وسلم، فكأنهما كرها ذلك، قال: فسمعت ذلك المرأة و هي في خدرها فقالت: إن كان رسول الله صلى الله عليه وسلم أمرك أن

تنظر فانظر وإلا فأنشدک، كأنها أعظمت ذلک، قال: فنظرت إليها فتزوجتها، فذكر من موافقتها. (ابن ماجه:۱/۱۳٤).

سنن نسائی میں ہے:

ثابت البناني يقول: كنت عند أنس بن مالک رضي الله تعالىٰ عنه، وعنده ابنة له، فقال: جاء ت امرأة إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فعرضت إليه نفسها فقالت: يارسول الله ألک فيّ حاجة. (سنن نسائی:۲/۷۵).

عن سهل بن سعد رضي الله تعالىٰ عنه قال: ذكر لرسول الله صلى الله عليه وسلم امرأة من العرب، فأمر أبا أسيد أن يرسل إليها، فأرسل إليها، فقدمت فنزلت في أجم بني ساعدة، فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى جاء ها فدخل عليها، فإذا امرأة منكسة رأسها فلما كلمها رسول الله صلى الله عليه وسلم قالت: أعوذ بالله منک، قال: قد عذتک مني، فقالوا لها: أتدرى من هذا؟ فقالت: لا، فقالوا: هذا رسول الله صلى الله عليه وسلم جاء ک ليخطبک قالت: أنا كنت أشقى من ذلک. (رواه مسلم:۲/۱٦۹).

عن عبد الرحمن بن حنظلة الغسيل قال: حدثتني خالتي سكينة بنت حنظلة وكانت بقبا تحت ابن عم لها توفي عنها، قال: دخل علي أبوجعفرمحمد بن علي وأنا في عدتي فسلم ثم قال: كيف أصبحت يا بنت حنظلة، فقلت بخير وجعلک الله بخير، فقال: أنا من قد علمت قرابتي من رسول الله صلى الله عليه وسلم وقرابتي من علي بن أبي طالب رضي الله تعالىٰ عنه وحقي في الإسلام وشرفي في العرب، قالت: فقلت: غفر الله لک يا أباجعفر أنت رجل يؤخذ منک ويروى عنک تخطبني في عدتي؟ فقال: ما فعلنا إنما أخبرتک بمنزلي من رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قال: دخل رسول الله صلى الله عليه وسلم على أم سلمة بنت أمية بن المغيرة المخزومية وتأيمت من أبي سلمة بن عبد الأسد وهو ابن عمها فلم يزل يذكرها بمنزلته من الله تعالىٰ حتى أثر الحصير في كفه من شدة ما كان يعتمد عليه فما كانت تلک خطبة. (السنن الكبرى للبيهقي:۵/۱۷۸،باب التعريض بالخطبة،دارالمعرفة بيروت).

وعن عبد الرحمن بن القاسم عن أبيه أنه كان يقول في قول الله عزوجل: ﴿ولا جناح عليكم فيما عرضتم به من خطبة النساء﴾ أن يقول الرجل للمرأة وهي في عدة من وفاة

زوجها إنک علی لکریمة وإني فیک لراغب وإن اللّٰه لسائق إلیک خیراً ورزقاً ونحو هذا من القول، وعن مجاهد في هذه الآیة قال: هوقول الرجل للمرأة في عدتها إنک لجمیلة وإنک لتعجبیني ویضمر خطبتها فلا یبدیه لها هذا کله حل معروف. (السنن الکبری للبیهقي:۱۷۸/۵،باب التعریض بالخطبة،دار المعرفة بیروت)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

شادی کے ارادہ سے لڑکی کو خطوط لکھنے کا حکم:

سوال: (۱)اگرکسی لڑکی کی پہچان کرنی ہوشادی کے ارادہ سے تو کیااس کوخطوط لکھنااوراس کا جواب دینادرست ہے یانہیں؟ (۲)اگراس کوپہچان لیایاپہلے سے پہچانتا ہوپھربھی خطوط لکھنا کیسا ہے؟

(الف)جب کہ ان خطوط میں محبت وعشق کی باتیں ہوں۔

(باء)جب کہ ان خطوط میں محبت کی باتیں نہ ہوں کیاحکم ہے؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں شادی کے ارادہ سے دیکھنےاورمختصر بات کرنے کی اجازت ہےتو پھر خط لکھنا بھی شرعاًدرست ہے،ہاں لطف اندوزی اورٹائم پاس نہ ہو،نیز جس طرح دیکھنے کے وقت تاکید کی گئی ہے کہ لڑکااورلڑکی شرعی حدود کی رعایت کریں،اسی طرح خط لکھتے وقت بھی شرعی حدود کی رعایت ضروری ہے،جب احادیث مبارکہ سے دیکھنے کی اجازت ہے تو خط لکھنااس سے کم درجہ ہے،نیز خط کے ذریعہ جب ضروری معلومات حاصل ہوجائے تو سلسلۂ خطوط بند ہوجانا چاہئے۔

(۲)لڑکی کوپہچان لیااورضروری معلومات حاصل ہوگئی تواب خط لکھنادرست نہیں چاہے محبت وعشق کی بات ہویانہ ہواس لیے کہ جب تک عقد نکاح نہیں ہوااجنبیہ کے حکم میں ہے۔

طحطاوی میں ہے:

قوله والنظر إلیها قبله، أي فإنه مندوب، لأنه داعیة للألفة فینظر إلی وجهها وکفیها وإن لم تأذن له هي أو ولیها إذا علم أنه یجاب في نکاحها. (حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار:۲/۵،کوئٹہ)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

منگنی کے بعد بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنے کا حکم:

سوال: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

زید نے ایک لڑکی کوپیغام نکاح دیااورقبول بھی کرلیا گیا،پس زیداپنی مخطوبہ کے ساتھ قبل النکاح بات چیت

کرسکتا ہے یانہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے بوقت ضرورت بات کرنے کی اجازت دی ہے اور جب رشتہ طے ہوگیا تو یہ ضرورت پوری ہوگئی اب بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنے میں کوئی ضرورت نہیں ہے، نیز اپنی مخطوبہ کے ساتھ نکاح سے پہلے مزے لے کر بات چیت کرنا شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے اور اس سے بڑی خطرناک حالت یہ ہے کہ بہت سی جگہوں پر دیکھا گیا کہ شادی سے قبل اپنی مخطوبہ کو کار میں لے گھومتے ہیں اس میں خلوت بھی ہے، یہ بالکل جائز نہیں، یہ بات ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ مخطوبہ اجنبیہ کے حکم میں ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

ولا يكلم الأجنبية. (الدر المختار:٦/٣٦٩،سعيد).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

ان دونوں کا شادی سے پہلے تنہائی میں یکجا ہونا حرام ہے۔وفي الأشباه : الخلوة بالأجنبية حرام. "الدر المختار:٣/٣٢٣"۔(مجموعہ قوانین اسلامی:ص ۳۷،دفعہ ۱۱ مع الحاشیہ).

آپ کے مسائل میں ہے:

نکاح سے پہلے منگیتر اجنبی ہے،لہذا نکاح سے پہلے منگیتر کا حکم بھی وہی ہوگا جو غیر مرد کا ہے کہ عورت کا اس کے ساتھ اختلاط جائز نہیں اور معاشرے میں کسی چیز کا رواج ہوجانا کوئی دلیل نہیں ایسا غلط رواج جو شریعت کے خلاف ہو خود لائق اصلاح ہے، نیز زیادہ تعلقات کی نکاح سے قبل اجازت نہیں ،نہ میل جول کی اجازت ہے اور نہ خلوت وتنہائی کی ،نکاح سے قبل ملنا جلنا بجائے خود غیر اخلاقی حرکت ہے۔(آپ کے مسائل اور ان کا حل:۵/۳۴،۳۵)

۔واللہ ﷻ اعلم۔

شادی کے ارادہ سے لڑکی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا حکم:

سوال: بخدمت جناب حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہ،السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں ڈاکٹر ہوں کسی نیک سیرت ڈاکٹرنی سے شادی کا ارادہ رکھتا ہوں، آج کل معاشرے کی خرابی کی وجہ سے میں ڈرتا ہوں ، یہاں ہسپتال میں ایک نوجوان نیک سیرت (بظاہر) ڈاکٹرنی کام کرتی ہے ،نمازوں کی پابند ہے سر پر اسکاف ہے، فی الحال میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، کیا میرے لیے اس بات کی گنجائش ہوگی کہ میں شادی کے ارادہ سے اس لڑکی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرلوں اور اندرونی حالات کا اندازہ لگاؤں ،تاکہ اطمینان

ہوجائے ،شریعت کی روشنی میں رہبری فرمائے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں آپ کا تحریر کردہ طریقہ شریعت کی نگاہ میں جائز ودرست نہیں، کسی لڑکی کے اخلاق وعادات کا علم اس کے پڑوسیوں اور خاندان کی عورتوں سے بہتر طریقہ پر دریافت ہوسکتا ہے، نیز عورتیں کسی عورت کے مزاج کو بہتر طریقہ پر سمجھ سکتی ہیں، اسی طرح آپ نے اس لڑکی کی شکل وصورت بھی دیکھ لی ہے اب اس کو بار بار دیکھنا بھی روانہیں ہے۔

ملاحظہ ہونصب الرایۃ میں ہے:

قال عليه السلام :" لا يخلون رجل بامرأة، ليس منها بسبيل، فإن الشيطان ثالثهما" قلت: وقد روي من حديث عمر رضي الله تعالىٰ عنه، وابن عمر رضي الله تعالىٰ عنه وجابر بن سمرة رضي الله تعالىٰ عنه، وعامر بن ربيعة رضي الله تعالىٰ عنه، وليس فيه قوله:" ليس منها بسبيل". (نصب الراية: ٤/ ٢٤٩، المكتبة المكية).

ہدایہ میں ہے:

ولا يجوز أن ينظر الرجل إلى الأجنبية إلا إلىٰ وجهها وكفيها، فإن كان لا يأمن الشهوة لا ينظر إلىٰ وجهها إلا لحاجة، لقوله صلى الله عليه وسلم:" من نظر إلىٰ محاسن امرأة أجنبية عن شهوة صب في عينه الآنک يوم القيامة " فإن خاف الشهوة لم ينظر من غير حاجة تحرزاً عن المحرم، وقوله لا يأمن يدل علىٰ أنه لا يباح إذا شک في الاشتهاء، كما إذا علم أو كان أكبر رأيه ذلک. (الهداية: ٤/ ٤٥٨، كتاب الكراهية، فصل في الوطئ والنظر واللمس).

درمختار میں ہے:

ولا يكلم الأجنبية . (الدر المختار: ٦/ ٣٦٩، سعيد).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

ان دونوں کا شادی سے پہلے تنہائی میں یکجا ہونا حرام ہے۔ **وفي الأشباه :الخلوة بالأجنبية حرام.** "الدر المختار: ٣/ ٢٢٣"۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: ص٣٧، دفعہ ١١ مع الحاشیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

چہرے اور ہاتھ کے علاوہ حصہ کو دیکھنے کا حکم:

سوال: اگر کسی لڑکی سے شادی کا ارادہ ہو تو اس کے چہرے اور ہاتھ کے علاوہ بدن کے دیگر حصہ کو

دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے بوقت ضرورت لڑکی کو دیکھنے کی اجازت دی ہے اور ضرورت چہرے اور کفین کو دیکھنے سے پوری ہوجاتی ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ذراعین کی بھی گنجائش ہے، اس سے تجاوز کرنے میں نہ ضرورت ہے اور اس کی اجازت ہے، لہٰذا بدن کے دیگر حصہ کو دیکھنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

ملاحظہ فرمائیں اعلاء السنن میں ہے:

عن جابر رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " إذا خطب أحدكم المرأة فإن استطاع أن ينظر إلىٰ ما يدعو إلىٰ نكاحها فليفعل" قلنا: ليس المراد التعميم بل المقصود منه الإشارة إلىٰ أن هذا النظر للضرورة، فينبغي أن لا يجاوز حد الضرورة، والضرورة تندفع بالنظر إلى الوجه والكفين فلا ينبغي أن يتجاوزهما. (اعلاء السنن: ۳۷۸/۱۷، باب جوازالنظرالی المخطوبة، ادارة القرآن).

مرقات المفاتیح میں ہے:

إنما يباح له النظر إلىٰ وجهها وكفيها فحسب، لأنهما ليسا بعورة في حقه فيستدل بالوجه على الجمال وضده، وبالكفين على سائر أعضائها باللين والخشونة. (مرقات شرح مشكاة: ۱۹۵/٦، باب النظرالی المخطوبة، ملتان).

ہدایہ میں ہے:

ومن أراد أن يتزوج امرأة فلا بأس بأن ينظر إليها وإن علم أن يشتهيها لقوله صلى اللّٰه عليه وسلم فيه: أبصرها فإنه أحرى أن يؤدم بينكما، ولأن مقصوده إقامة السنة لاقضاء الشهوة. (الهداية: ۴۵۹/۴، كتاب الكراهية، وكذا فی الشامی: ۳۷۰/٦، سعيد).

وعن أبي يوسفؒ أنه يباح النظر إلىٰ ذراعيها أيضاً لأنه يبدومنهاعادة. (فتاوی الشامی: ۳۷۰/٦، سعيد۔ ومثله فی الهداية: ۴۵۹/۴، كتاب الكراهية) ۔**واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

فصل دوم

خطبۂ نکاح اوراس کے متعلقات کا بیان

خطبۂ نکاح اوراس میں امابعد کہنے کا ثبوت:

سوال: خطبۂ نکاح کا پڑھنا اوراس میں امابعد کہنا، ان دونوں کا شرعاً کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نکاح کا خطبہ مسنون ہے اوراس میں امابعد کہنا بھی روایات سے ثابت ہے۔

ملاحظہ فرمائیں مجمع الزوائد میں ہے:

عن عبد اللّٰہ بن مسعود رضي اللّٰہ تعالیٰ عنه قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یعلمنا خطبة الحاجة فیقول:" إن الحمد للّٰہ نحمده ونستعینه ونعوذ باللّٰہ من شرور أنفسنا ومن سیئات أعمالنا من یهده اللّٰہ فلا مضل له ومن یضلل فلا هادي له، وأشهد أن لا إله إلا اللّٰہ وحده لاشریک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله". قال أبوعبیدة: وسمعت من أبي موسیٰ یقول: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول: فإن شئت أن تصل خطبتک بآي من القرآن تقول: " اتقوا اللّٰہ حق تقاته...الآیة، اتقوا اللّٰہ الذي تساء لون به، الآیة، اتقوا اللّٰہ وقولوا قولاً سدیداً یصلح لکم أعمالکم ویغفرلکم ذنوبکم ومن یطع اللّٰہ ورسوله فقد فاز فوزاً عظیماً﴾ أما بعد " ثم تکلم بحاجتک. قلت: رواه أبوداود: (ص۲۸۸ باب فی خطبة النکاح) **وغیره خلا حدیث أبي موسیٰ. رواه أبویعلیٰ** (۷۱۸۶/۳۷۷/۶) **والطبراني في الأوسط** (۷۸۶۸/۴۲۴/۸) **والکبیر باختصار ورجاله ثقات، وحدیث أبي موسیٰ متصل،**

وأبوعبيدة لم يسمع من أبيه. (مجمع الزوائد:٢٨٨/٤،باب خطبة الحاجة،دارالفكر).

(ورواه الترمذي في خطبة النكاح ، وقال: حديث عبد الله حديث حسن ـ والبيهقي في الكبرىٰ في باب ماجاء في خطبة النكاح :١٤٦/٧، دارالمعرفة ـ وابن ماجة باب في خطبة النكاح ـ والدارمي في سننه ،في خطبة النكاح:١٩١/٢).

وقال الإمام أبوداود: حدثنا محمد بن كثير أنا سفيان عن أبي إسحٰق عن أبي عبيدة عن عبدالله بن مسعود رضي الله تعالىٰ عنه في خطبة الحاجة في النكاح وغيره. (سنن ابی داود:ص٢٨٨،باب خطبة النكاح،فيصل).

"الآثار لأبي يوسف" میں ہے:

قال: حدثنا يوسف عن أبيه عن أبي حنيفةؒ عن القاسم بن عبدالرحمن عن أبيه عن ابن مسعود رضي الله تعالىٰ عنه أنه قال في خطبة النكاح :"إن الحمد لله نحمده... إلىٰ قوله فقد فاز فوزاً عظيماً... ثم قال: أما بعد ذلكم" ثم يذكر حاجته. (الآثار لابی یوسف القاضیؒ :٦٢١/١٤١/٢).

وفي الدعاء للطبراني بسنده عن عبد الله بن مسعود رضي الله تعالىٰ عنه قال: علمنارسول الله صلى الله عليه وسلم خطبة الحاجة "الحمد لله... إلىٰ قوله:﴿يا أيها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم﴾ إلىٰ آخر الآية، أما بعد" واللفظ لحديث حماد عن شعبة. (الدعاء للطبرانی باب خطبة النكاح :٨٥٧/٦/٣)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

خطبۂ نکاح عقدِ نکاح سے پہلے مسنون ہے:

سوال: نکاح کا خطبہ پہلے پڑھنا چاہئے یا بعد میں بھی پڑھ سکتے ہیں ،اگر کسی نے چھوڑ دیا تو کیا حکم ہے؟ اور نکاح کے بعد "بارك الله وبارك عليك وجمع بينكما في خير" کے علاوہ دعا کا کیا حکم ہے؟

الجواب: عقدِ نکاح سے پہلے خطبہ پڑھنا مسنون ہے،اور بعد میں پڑھنا بھی جائز ہے،اگر کسی نے خطبہ چھوڑ دیا تب بھی نکاح صحیح ہوجائے گا،لیکن خلافِ سنت ہوگا،اور نکاح کے بعد "بارك الله لك وبارك عليك وجمع بينكما في خير" یہ دعا افضل اور بہتر ہے حدیث شریف سے ثابت ہے،ہاں دیگر ادعیہ کی بھی گنجائش ہے جو حمد وثناء پر مشتمل ہوں زمانۂ جاہلیت کے مشابہ نہ ہوں۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث شریف میں خطبہ کا تذکرہ پہلے ہے:

عن عبد اللّٰہ بن مسعود رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: علمنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خطبة الحاجة: الحمد للّٰہ أو إن الحمد للّٰہ نحمدہ .. .إلیٰ قولہ ومن یطع اللّٰہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیماً، ثم یتکلم بحاجتہ. (رواہ الدارمي فی سننہ:۲/۱۹۱).

وذکر الهیثمي في المجمع فقال: قال أبوعبیدة: وسمعت من أبي موسیٰ یقول: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: فإن شئت أن تصل خطبتک بآي من القرآن تقول: ''اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ...إلی قولہ...ومن یطع اللّٰہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیماً﴾أما بعد'' ثم تکلم بحاجتک. (مجمع الزوائد:٤/٢٨٨،باب خطبة الحاجة، دارالفکر).

ابوداود شریف میں ہے:

عن رجل من بني سلیم قال: خطبت إلی النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم أمامة بنت عبد المطلب فأنکحني من غیر أن یتشهد، أي یخطب فدل علی جواز النکاح بغیر خطبة.

(ابوداودشریف مع الحاشیة :ص۲۸۹).

الفقہ الاسلامی میں ہے:

یستحب للزواج أن یخطب قبل العقد فإن عقد الزواج من غیر خطبة جاز فالخطبة مستحبة غیر واجبة . (الفقہ الاسلامی وادلتہ:۷/۱۲۲، دارالفکر).

عن أبي هریرة رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان إذا رفأ الإنسان إذا تزوج قال: '' بارک اللّٰہ لک وبارک علیک وجمع بینکما في خیر''. (رواہ ابوداود: ۱/۲۹۰).

عمدة القاری میں ہے:

روی الطبراني في الکبیر من حدیث معاذ بن جبل رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم شهد أملاک رجل من الأنصار، فخطب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وأنکح الأنصاري وقال: علی الألفة والخیر والبرکة والطائر المیمون والسعة في الرزق،...وأخرجه النسائي من روایة أشعث عن الحسن عن عقیل بن أبي طالب أنہ تزوج امرأة من بني حبشم فقالوا: بالرفاء والبنین، فقال: لاتقولوا هکذا ولکن قولوا: کما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ

وسلم :"اللّٰهم بارک لهم وبارک عليهم وهومرسل...ولأنه من أقوال الجاهلية والنبي صلى الله عليه وسلم كان يكره ذلك لموافقتهم فيه وهذا هوالحكمة في النهي، وقيل لإنه لا حمد فيه ولا ثناء ولاذكرالله عزوجل. (عمدة القاری:۱۴/۱۱۴،باب کیف يدعى للمتزوج ،ملتان).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

ويندب إعلانه وتقديم خطبة أي على العقد. (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:۲/۵،کتاب النکاح،کوئٹہ).

مزید ملاحظہ ہو: کفایت المفتی:۵/۱۵۱۔وفتاوی محمودیہ:۱۰/۵۹۰،مبوب ومرتب۔وفتاوی رحیمیہ:۲/۲۰۴).

والله ﷻ اعلم۔

بغیر خطبہ کے نکاح کا حکم:

سوال: اگرکسی نے بغیر خطبہ کے نکاح پڑھایا تو شرعاً کیسا ہے؟اور خطبہ ضروری نہ ہونے کی کیا دلیل ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں بغیر خطبہ کے نکاح صحیح اوردرست ہے،لیکن خلافِ سنت ہے اس لیے کہ نکاح سے پہلے خطبہ مسنون ہے۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث شریف میں بغیر خطبہ کے نکاح ثابت ہے:

عن رجل من بني سليم قال: خطبت إلى النبي صلى الله عليه وسلم أمامة بنت عبدالمطلب فأنكحني من غير أن يتشهد، أي يخطب فدل على جواز النكاح بغيرخطبة.

(ابوداودشریف:ص۲۸۹).

بذل المجہود میں ہے:

رجل من بني سليم هوعباد بن شيبان السلمي وهوحفيد عباد المذكور، قوله فأنكحني من غيرأن يتشهد أي يخطب فدل هذا على جواز النكاح بغيرخطبة وفي هامشه للشيخ زكريا: ويستدل له أيضاً بحديث الصحيحين "زوجتكما بما معك من القرآن" كما في الأوجز. (بذل المجهودمع الحاشية:۶/۲۴).

عمدۃ القاری میں ہے:

استحب العلماء الخطبة عند النكاح، وقال الترمذي: وقد قال بعض أهل العلم: إن النكاح جائز بغيرخطبة وهوقول سفيان الثوري وغيره من أهل العلم، قلت: وأوجبها أهل الظاهر فرضاً واحتجوا بأنه صلى الله عليه وسلم خطب عند تزوج فاطمة رضي الله تعالىٰ عنها، وأفعاله على الوجوب، واستدل الفقهاء على عدم وجوبها بقوله في حديث سهل بن سعد: قد زوجتكها بما معک من القرآن" ولم يخطب. (عمدة القاری:۱۴/۹۸، باب الخطبة، ملتان).

مزید ملاحظہ ہو: کفایت المفتی:۵/۱۵۱۔ وفتاوی رحیمیہ:۲/۱۰۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

خطبۂ نکاح سننے کا حکم:

سوال: اگرایک آدمی نکاح کی مجلس میں بیٹھ گیا یا مسجد میں بیٹھا ہوا تھا جب نکاح کا خطبہ شروع ہوا تو چلا گیا، اس پر کوئی گناہ ہے یا نہیں؟

الجواب: نکاح کا خطبہ مسنون ہے اوراس کے لیے بیٹھنا واجب نہیں ہے، لیکن پہلے سے بیٹھا ہو پھر خطبہ شروع ہوجائے تو اب سننا واجب ہے۔ لہذا اٹھ کر چلے جانے پر گنہگار ہوگا اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو اعلاء السنن میں ہے:

قال الشيخ: ولم أطلع على رواية فقهية في هذاالباب أنه هل يجب الجلوس لاستماع هذه الخطبة أم لا؟ نعم، ذكرفي "الدرالمختار" في باب الجمعة أنه يجب الاستماع لسائر الخطب، كخطبة النكاح وخطبة عيد وختم على المعتمد، لكن لايلزم منه وجوب الجلوس كما في خطبة النكاح لا يجب الجلوس لكن إن جلس يجب استماعه، والظاهرأن يقال: إنه لايجب الجلوس لخطبة العيد كمالايجب نفس خطبة العيد، ولكن إن جلس يجب استماعه، كماقالوا: إن من حضرالتلاوة يجب استماعه مع عدم وجوب الجلوس له، فإن ظفر أحد بالرواية الفقهية في هذا الباب فليخبرنا أو يلحق بهذا المقام.

......فثبت أن التخلف عن خطبة العيد جائز. وأما إذا جلس لها فيكره الكلام وترک الاستماع لها، كماصرح به في الدر. (اعلاء السنن:۸/۱۴۴، کیفیة صلاة العیدین، ادارة القرآن).

ابن ماجہ شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھنا واجب نہیں ہے بلکہ اختیار رہے۔ ملاحظہ ہو:

عن عبداللّٰہ بن السائب ﷺ قال حضرت العید مع رسول اللّٰہ ﷺ فصلی بنا العید ثم قال: قد قضینا الصلاۃ فمن أحب أن یجلس للخطبة فلیجلس ومن أحب أن یذهب فلیذهب.

(رواہ ابن ماجة: ص ۹۱، باب ماجاء فی انتظار الخطبة بعد الصلاۃ، قدیمی۔ وابوداؤد: ۱/۱۶۳، باب الجلوس للخطبة، وقال: هذاحدیث مرسل۔ والنسائی: ۱/۲۳۳، باب التخییر بین الجلوس للخطبة).

شراح حدیث نے بھی یہی تشریح فرمائی ہے کہ بیٹھنا واجب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو: (عون المعبود: ۴/۱۲۔ وحاشیة السندی علی سنن النسائی: ۳/۴۳۔ وفتح الباری لابن رجب الحنبلی: ۶/۱۴۸).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: کوئی خطیب صاحب نکاح کا خطبہ پڑھ رہے ہوں، یا منبر پر تقریر کرنے کے لیے خطبہ مسنونہ پڑھ رہے ہوں، اس وقت حاضرین کا آپس میں بات چیت کرنا یا کوئی دنیوی کام کرنا کیسا ہے؟

الجواب: جائز نہیں ہے، **قال في العلائیة وکذا یجب الاستماع لسائر الخطب کخطبة النکاح وخطبة عید...** (احسن الفتاویٰ: ۵/۳۵).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

سننا سب خطبوں کا واجب ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۱/۴۵۸).

امداد المفتین میں ہے:

خطبہ عید کا پڑھنا اور سننا سنتِ مؤکدہ ہے، لیکن جب خطبہ پڑھا جائے تو خطبہ سننا واجب ہو جاتا ہے اس وقت کلام وغیرہ کرنا ناجائز ہے اور شور مچانا سخت گناہ ہے۔ (امداد المفتین: ۱/۳۳۰، بحوالہ درمختار۔ وامداد الفتاویٰ: ۱/۴۵۸۔ وفتاویٰ محمودیہ: ۸/۴۵۶، مبوب ومرتب)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نکاح کے بعد اجتماعی دعا کا حکم:

سوال: عقد نکاح کی مجلس کے اختتام پر عام طور پر اجتماعی دعا کرتے ہیں شریعت میں اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب: مجلس نکاح کے اختتام پر اجتماعی دعا کا ثبوت طبقاتِ ابن سعد کی ایک روایت میں ملتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

قال: أخبرنا بكار بن محمد قال: حدثني أبي أن أم محمد بن سيرين صفية مولاة أبي بكر بن أبي قحافة رضي اللّٰه تعالىٰ عنهما، طيبها ثلاثة من أزواج النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فدعوا لها وحضر أملاكها ثمانية عشر بدرياً فيهم أبي بن كعب رضي اللّٰه تعالىٰ عنه يدعو وهم يؤمنون . (الطبقات الكبرى لابن سعدتحت ترجمة محمدبن سيرين:۱۹۳/۷، بيروت).

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ حضرت صفیہ جو محمد بن سیرین کی والدہ ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی باندی تھی بیان کرتی ہیں کہ جب میرا نکاح ہونے والا تھا تو مجھے تین ازواج مطہرات نے خوشبو لگا کر آراستہ کیا اور دلہن بنایا اور مجلس نکاح میں ۱۸ بدری صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ دعا فرماتے تھے اور دیگر حضرات آمین کہتے تھے۔

نیز خطبۂ نکاح درحقیقت خطبۂ حاجت ہے اور لوگوں کی حاجت میں مجلس نکاح میں نکاح پڑھانے کے ساتھ دعا بھی شامل ہوتی ہے، اسی طرح نکاح کا ایجاب وقبول تو ہر ایک آدمی کرسکتا ہے، پھر اس کے لیے کسی خاص شخصیت کو بلانے کا مقصد ان سے دعا کرانا ہوتا ہے، اس لیے اس میں دعا بھی مقصود ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام سلیمؓ کے گھر تشریف لے گئے تو ام سلیمؓ نے آپ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کی درخواست کی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔

ملاحظہ فرمائیں مسلم شریف میں ہے:

عن أنس رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: دخل النبي صلى اللّٰه عليه وسلم علينا وما هو إلا أناْ وأمي وأم حرام خالتي فقال: قوموا فلأصلي بكم في غير وقت صلاة، فصلى بنا...ثم دعا لنا أهل البيت بكل خير من خير الدنيا والآخرة، فقالت أمي: يارسول اللّٰه! خويدمك ادع اللّٰه له، قال: فدعا لي بكل خير، وكان في آخر ما دعا لي به أن قال: "اللّٰهمّ أكثر ماله وولده وبارك له فيه. (رواه مسلم:۲۹۸/۲،۲۳٤/۱).

لیکن اس عمل کو سنت نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ کرنے والے پر نکیر نہیں کرنی چاہئے۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عقد نکاح کے بعد دعا میں "بارک اللّٰہ علیک" کا مطلب:

سوال: نکاح کی دعا میں "بارک اللّٰہ لک وبارک علیک" کہتے ہیں، اس میں علیک کا کیا مطلب ہے؟ اور علیک اور لک میں کیا فرق ہے؟ بظاہر تو علیک ضرر کے لیے آتا ہے۔

الجواب: بارک اللہ لک میں لام فائدہ اورآسانی کے لیے ہےیعنی آپ کوآسانیوں اورراحتوں میں برکت عطافرمائے۔اورعلیک کے ساتھ دوبارہ بارک کوذکرفرمایا تاکہ نکاح میں سرورشہر کے بعدغموم دہر کی طرف اشارہ ہویعنی جومشقتیں آپ پرآنے والی ہیں اوران کا آنا یقینی ہے کیونکہ سرورشہر کے بعدغموم دہرہوتا ہے،لہذا ان مشقت والے کاموں میں اللہ تعالیٰ برکتیں عطافرمائیں،نکاح میں سرورکی لذتوں کے بعدنان نفقہ بیوی کے مطالبات اولادکی تربیت،تعلیم وغیرہ،آدمی کی آزادی کے بعدپابندی،یہ سب وہ مشقتیں ہیں جوناقابل انکار ہیں،دعامیں ان مشقتوں میں بھی خیراورنفع اوربہترمستقبل کی طلب ہے،ایسی جامع اوربہتردعاسینہ نبوت ہی سے برآمدہوسکتی ہے۔

ملاحظہ ہوابوداودشریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا رفأ الإنسان إذا تزوج قال: "بارک اللّٰه لک وبارک عليک وجمع بينكما في خير". (رواه ابوداود: ١/٢٩٠).

قال المناوي: "بارک الله لک" في زوجتک، "وبارک عليک" أي أدخل عليک البركة في مؤنتها ويسرهالک وأعاد العامل لزيادة الابتهال. (فيض القدير: ١/٤٠٦).

وفيه أيضاً: وقال أولاً بارک اللّٰه لأنه المدعو إصالة أي بارک الله لک في هذا الأمر، ثم ترقى منه ودعا لهما وعداه بعلىٰ لأن المدار عليه في الذراري والنسل لأنه المطلوب بالتزوج وحسن المعاشرة والموافقة والاستمتاع بينهماعلى أن المطلوب الأول النسل وهذا تابع. (فيض القدير: ٥/١٧٦).

وفي المرقات: وبارک عليكما بنزول الخيروالرحمة والرزق والبركة في الذرية وجمع بينكما في خير أي في طاعة وصحة وعافية وسلامة وملاء ة وحسن معاشرة وتكثير ذرية صالحة. (المرقات: ٥/٢١٥).

لسان العرب میں ہے:

بارک اللّٰه الشيء وبارک فيه وعليه، وضع فيه البركة ويقال بارک الله لک وفيک وعليک. (لسان العرب: ١٠/٣٩٥، دارالفکر).

القاموس الوحید میں ہے:

بارک اللہ علی الشيء، خیر وبرکت والا کرنا۔ (القاموس الوحید:۱/۱۶۱۔ ولغات الحدیث:۱/۵۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بروزِ جمعہ مجلس نکاح منعقد کرنے کی فضیلت:

سوال: جمعہ کے دن مجلس نکاح منعقد کرنے کی کوئی فضیلت وارد ہوئی ہے یا نہیں؟

الجواب: بروزِ جمعہ نکاح کی فضیلت ایک حدیث سے ثابت ہے، لیکن یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے، اس لیے اس کو مسنون نہیں کہنا چاہئے، زیادہ سے زیادہ مستحب اور بہتر عمل کہہ سکتے ہیں۔ نیز مالکیہ شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں بھی مستحب ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث میں ہے:

قال الإما م أبو يعلى الموصلي: حدثنا عمروبن الحصين، حدثنا يحيى بن العلاء، حدثنا عبد الله بن عبدالرحمن، عن أبي صالح، عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه قال: يوم السبت يوم غرس وبناء، ويوم الإثنين يوم السفر...ويوم الجمعة يوم تزويج وباء ة. (مسندابی یعلی الموصلی:٦/١٦٦/٢٥٥٧).

وقال الهيثمي في "المجمع": فيه يحيى بن العلاء وهومتروك. (مجمع الزوائد: ٤/٣٢٩/٧٥٠٩۔ وتهذيب التهذيب:١١/٢٢٨).

وقال الحافظ في "التقريب"(٤٨٩)**:عمروبن الحصين العقيلي البصري، متروك.**

قال السخاوي: ويروى في أيام الأسبوع من المرفوع..."الجمعة يوم خطبة النكاح"أخرجه أبويعلىٰ من حديث ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما، وهوضعيف وأخرجه تمام في فوائده.

(المقاصد الحسنة: ص٤٧٣ رقم ١٣٥٤).

وانظر؛ كشف الخفاء:٢/٣٩٧/٣٢٥٥۔ والشذرة فی الاحاديث المشتهرة:٢/٢٧٠/١١٦٦۔ وتمييز الطيب من الخبيث: ص٢٠١۔

اس حدیث کے ہم معنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند سے دوسری روایت بھی مروی ہے، لیکن ابن جوزی نے فرمایا یہ حدیث موضوع ہے۔

ملاحظہ ہو''الموضوعات'' میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:''إن يوم السبت يوم مكرومكيدة...إلىٰ قوله وقال: يوم الجمعة يوم خِطبة ونكاح، قالوا:ولم يارسول الله قال: لأن الأنبياء ينكحون ويخطبون فيه لبركة يوم الجمعة''. هذا حديث موضوع على رسول الله صلى الله عليه وسلم وفيه ضعفاء ومجهولون ويحيى بن عبد الله، قال فيه يحيى: ليس بشيء، والسمرقندي الزاهد، ليس حديثه بشيء. (الموضوعات لابن الجوزي:٢/٧١،باب ذكرايام الاسبوع كلها).

الفقہ الاسلامی میں ہے:

ويستحب أن ينعقد النكاح يوم الجمعة مساء، لحديث أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه مرفوعاً:''أمسوا بالأملاك، فإنه أعظم للبركة''ولأن الجمعة يوم شريف ويوم عيد والبركة في النكاح مطلوبة، فاستحب له أشرف الأيام طلباً للبركة، والإمساء به؛ لأن في آخر النهار من يوم الجمعة ساعة الإجابة. (الفقه الاسلامی وادلته:٧/١٢٤،المبحث الخامس،مندوبات عقدالزواج ،دارالفکر۔ وکذا فی حاشية الطحطاوی على الدرالمختار:٢/٥،کتاب النکاح،کوئٹه).

امام ابوالقاسم مالکی فرماتے ہیں:

وتستحب الخطبة يوم الجمعة بعد العصر. (فتاوى البرزلى جامع مسائل الاحكام لما نزل من القضايا بالمفتين والحكام للامام ابى القاسم بن احمد المالكى:٢/١٨٢).

تحفۃ المحتاج ونہایۃ المحتاج میں ہے:

ويسن أن يعقد في يوم الجمعة. (تحفة المحتاج ونهاية المحتاج :٧/٢٥٥وكذا فى اعانة الطالبين:٣/٥٤٣).

المغنی میں ہے: ويستحب عقد النكاح يوم الجمعة لأن جماعة من السلف استحبوا ذلك منهم سمرة بن حبيب وراشد بن سعيد وحبيب بن عتبة ولأنه يوم شريف ويوم عيد فيه خلق الله آدم عليه السلام والمساية أولىٰ بأن أبا حفص روى بإسناده عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه ''أمسوا بالأملاك، فإنه أعظم للبركة''ولأنه أقرب إلى مقصوده. (المغنى لابن قدامة الحنبلى:٧/٤٣٥،دارالکتب العلمية)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿ولا تنکحوا المشرکات حتیٰ یؤمن...﴾

(سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۲۲۱)

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

”لا نکاح إلا بشہود“

فیما ینعقد بہ النکاح وما لا ینعقد

فصل اول

نکاح کے ارکان، شرائط وغیرہ کا بیان

فون پر ایجاب وقبول کرنے سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک صاحب کی لڑکی کو ایک لڑکا لے کر بھاگ گیا، والدین کی اجازت کے بغیر، پھر اس لڑکے نے اپنے رشتہ دار عالم سے فون پر نکاح پڑھوایا، لڑکی کا بیان ہے کہ نکاح کے وقت ہم دونوں گاڑی میں تھے اور تیسرا کوئی نہیں تھا، اس عالم نے فون پر مجھ سے پوچھا کہ پوری زندگی رہنا ہے، پھر اس لڑکے سے کچھ بات کی مجھے اس کا علم نہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس لڑکی کا نکاح ہوا یا نہیں؟ اور شریعت کی نگاہ میں ان دونوں کا کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ جب کہ لڑکا جعلی کاغذات پیش کرتا ہے، کیا لڑکا ایسی حرکت کر کے لڑکی لے جاسکتا ہے؟ کیا لڑکی کے والدین دوسری جگہ اس لڑکی کی شادی کرا سکتے ہیں؟ برائے مہربانی رہنمائی فرمائے۔

الجواب: مذکورہ بالا نکاح چند وجوہات کی بنا پر منعقد نہیں ہوا۔(۱) ایجاب وقبول نکاح کا رکن ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے کلام کو سنے حقیقتاً یا حکماً، اس نکاح میں دونوں کو معلوم نہیں فون پر کیا بات چیت ہوئی۔(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ نکاح میں شہادت ضروری ہے، یعنی بوقتِ نکاح دو گواہوں کا ہونا شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ نکاح غیر کفو میں ہے کیونکہ لڑکا فاسق وفاجر ہے اور لڑکی عالمہ ہے، نیز لڑکی کے والدین بھی اس نکاح پر راضی نہیں ہیں، اس بنا پر بھی یہ نکاح قابل اعتراض ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت کی نگاہ میں اس نکاح کی کوئی حیثیت نہیں، اور جعلی کاغذات کی وجہ سے حکم شرعی پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، نکاح مفقود ہونے کی وجہ سے لڑکے اور لڑکی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں، لڑکے کو ایسی ناپاک

حرکتوں سے باز آنا چاہئے اور غضب الٰہی سے ڈرنا چاہئے، نیز لڑکی اور لڑکی کے والدین آئندہ نکاح میں خودمختار ہیں جہاں چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔
ملاحظہ فرمائیں بدائع الصنائع میں ہے:

وأما ركن النكاح فهو الإيجاب والقبول وذلك بألفاظ مخصوصة أو ما يقوم مقام اللفظ ... وأما بيان شرائط الجواز والنفاذ فأنواع...ومنها: ـ الشهادة وهي حضور الشهود...قال عامة العلماء: إن الشهادة شرط جواز النكاح لما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال:" لا نكاح إلا بشهود " وروي" لا نكاح إلا بشاهدين " وعن عبد الله بن عباس رضي الله تعالىٰ عنه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال:" الزانية التي تنكح نفسها بغير بينة " ولو لم تكن الشهادة شرطاً لم تكن الزانية بدونها، ولأن الحاجة مست إلى رفع تهمة الزنا عنها ولا تندفع إلا بالشهود... (بدائع الصنائع:۲/۲۲۹،۲۵۲،کتاب التكاح،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وأما ركنه فالإيجاب والقبول كذا في الكافي...وأما شرائطه...منها: ـ سماع كل من العاقدين كلام صاحبه هكذا في فتاوى قاضيخان. (الفتاوى الهندية:۱/۲۶۷،كتاب النكاح ،الباب الاول).

البحر الرائق میں ہے:

ولم يذكر المصنفؒ شرائط الإيجاب والقبول...منها: ـ سماع كل منهما كلام صاحبه لأن عدم سماع أحدهما كلام صاحبه بمنزلة غيبته كما في الوقاية. (البحرالرائق:۳/۸۳،كتاب التكاح ،المكتبة الماجدية).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما شرائط اللزوم...منها: ـ الدين في قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ حتى لو أن أمرأة من بنات الصالحين إذا زوجت نفسها من فاسق كان للأولياء حق الاعتراض عندهما، لأن التفاخر بالدين أحق من التفاخر بالنسب والحرية والمال والتعيير بالفسق أشد وجوه التعيير. (بدائع الصنائع:۲/۳۲۰،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

(ومنها: - الديانة) تعتبر الكفاءة في الديانة وهذا قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ وهو الصحيح كذا في الهداية، فلا يكون الفاسق كفأً للصالحة كذا في المجمع. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۹۱، الباب الخامس في الاكفاء).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

ایجاب وقبول کرنے والوں میں سے ہر ایک کا ایجاب وقبول کے الفاظ کا حقیقتاً یا حکماً سننا اور سمجھنا کہ یہ الفاظ انعقاد نکاح کے لیے ہیں۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: ص ۴۷، باب سوم ارکان نکاح، دفعہ ۳۱).

نیز مذکور ہے:

کفاءت کا اعتبار مندرجہ ذیل امور میں کیا جائے گا: (۱) لڑکا دینداری اور تقویٰ میں لڑکی کے ہم پلہ ہو۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: ص ۹۵، کفاءت کا بیان، دفعہ ۱۱۷).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

فاسق شخص ایسی عورت کا کفو نہیں جو خود بھی نیک ہو اور اس کا والد بھی نیک ہو، بحوالہ عالمگیری وشامی۔ (احسن الفتاویٰ: ۵/ ۲۵).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

حق کفاءت زوجہ کو اور اس کے اولیاء کو بھی حاصل ہے، لہذا کسی عورت نے اپنا نکاح جان بوجھ کر کسی غیر کفو میں کرلیا، تو اولیاء کو نکاح فسخ کرانے کا اختیار ہوگا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: ۹۸، کفاءت کا بیان، دفعہ ۱۲۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایجاب وقبول کی مجلس بدلنے سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ایک لڑکی سے نکاح اس طریقہ پر کیا کہ دو مسلمان گواہوں نے شوہر کے ایجاب کو الگ مجلس میں سنا پھر یہ گواہ لڑکی کے پاس آئے اور اس کا قبول دوسری مجلس میں سنا، تو کیا یہ نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایجاب وقبول کی مجلس بدل جانے کی وجہ سے نکاح منعقد نہیں ہوا۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وأما الذي يرجع إلى مكان العقد فهو اتحاد المجلس إذا كان العاقدان حاضرين وهو أن يكون الإيجاب والقبول في مجلس واحد حتى لو اختلف المجلس لاينعقد النكاح بأن

کانا حاضرین فأوجب أحدهما فقام الآخر عن المجلس قبل القبول أو اشتغل بعمل یوجب اختلاف المجلس لا ینعقد. (بدائع الصنائع:۲/۲۳۲،شرائط رکن النکاح، سعید).

درمختار میں ہے:

ومن شرائط الإیجاب والقبول اتحاد المجلس لو حاضرین. وفي الشامي: قال في البحر: فلو اختلف المجلس لم ینعقد، فلو أوجب أحدهما فقام الآخر أو اشتغل بعمل آخر بطل الإیجاب. (الدرالمختار مع الشامی:۳/۱٤،سعید).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

ایجاب وقبول سے متعلق شرائط:۔ (الف) مجلس کا متحد ہونا، یہ ضروری ہے کہ ایجاب وقبول ایک مجلس میں ہو، اگر ایجاب کے بعد اور قبول سے پہلے مجلس بدل جائے یا دوسرے فریق کی طرف سے کوئی ایسا عمل صادر ہو جس سے اس کا اعراض اور بے توجہی ظاہر ہو تو ایجاب بیکار ہو جائے گا، اور قبولیت معتبر نہ ہوگی۔ (مجموعہ قوانین اسلامی:ص ۴۰، دفعہ ۲۲). واللہ تعالیٰ اعلم۔

بغیر گواہوں کے نکاح کرنے کا حکم:

سوال: کسی شہر میں صرف دو مسلمان ہیں ایک مرد اور ایک عورت، دوسرے مسلمان ان سے تقریباً ۲۵۰۰ کیلو میٹر دور رہتے ہیں، تو یہ دونوں شادی کیسے کریں جب کہ کوئی گواہ موجود نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں بغیر گواہوں کے نکاح جائز اور درست نہیں ہے، ہاں یہ کر سکتے ہیں کہ کسی دوسرے ملک میں فون کے ذریعہ سے وکیل بنادے پھر وکیل مجلس نکاح میں گواہوں کے سامنے ان دونوں کی طرف سے نکاح پڑھادے، اور ان کو اطلاع دیدے، اس صورت میں ایک شخص جانبین کا وکیل بن سکتا ہے یا علیحدہ وکیل ہو تب بھی صحیح ہے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے دونوں مسلمانوں کے ملک کا سفر کرلے اور وہاں جا کر مسلمانوں کے اجتماع میں نکاح کرلیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

أجمع أصحابنا أن الواحد یصلح وکیلاً في النکاح من الجانبین. (الفتاوی الهندیة:۱/۲۹۹)

درمختار میں ہے:

ویتولی طرفي النکاح واحد بإیجاب یقوم مقام القبول في خمس صور کأن کان ولیاً أو وکیلاً من الجانبین، وفي الشامي: قوله ولیاً أو وکیلاً من الجانبین کزوجت ابني بنت أخي أو زوجت موکلي فلاناً أوموکلتي فلانة، قال ط: ویکفي شاهدان علی وکالته، ووکالتها وعلی العقد لأن الشاهد یتحمل الشهادات العدیدة، وقدمنا أن الشهادة علی الوکالة لا تلزم إلا عند الجحود. (الدرالمختارمع الشامی:۳/۹٦،سعید).

فتاویٰ فریدیہ میں ہے:

نکاح میں ایک آدمی طرفین کا قائم مقام ہوسکتا ہے۔ (فتاویٰ فریدیہ:۴/۳۹۲).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

سوال: ایک شخص نے بذریعہ تار اپنے مرشد کو اطلاع دی کہ میرا نکاح فلاں عورت کے ساتھ پڑھادیا جائے، اس صورت میں کیا حکم ہے؟

الجواب: مرشد اس حالت میں نکاح پڑھا سکتا ہے، اور ایجاب وقبول اس فریق کی طرف سے کرسکتا ہے جس نے بذریعہ خط یا تار کے اجازت دی ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۷/۱۴۰).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

ایک ہی شخص مرد وعورت دونوں کی طرف سے وکیل ہوسکتا ہے۔ (مجموعہ قوانین اسلامی:۸٦،دفعہ۹۹).

واللہ ﷻ اعلم۔

بذریعہ خط نکاح کا حکم:

سوال: ایک عورت نے خط میں کسی مرد کو لکھا کہ میں نے تمہارے ساتھ نکاح کرلیا ہے اور مرد نے خط پڑھ کر قبول کیا تو نکاح ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مرد دو گواہوں کے سامنے خط پڑھ کر قبول کرلے تو نکاح صحیح ہوگا، ورنہ تنہائی میں خط پڑھ کر قبول کر لینے سے نکاح نہیں ہوتا، گواہوں کا سننا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وأما بیان شرائط الجواز والنفاذ فأنواع...ومنها: ۔ الشهادة وهي حضور الشهود ...

قال عامة العلماء: إن الشهادة شرط جواز النكاح لما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال:" لا نكاح إلا بشهود " وروي " لا نكاح إلا بشاهدين " وعن عبد الله بن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال:" الزانية التي تنكح نفسها بغير بينة " ولو لم تكن الشهادة شرطاً لم تكن الزانية بدونها، ولأن الحاجة مست إلى رفع تهمة الزنا عنها ولا تندفع إلا بالشهود... (بدائع الصنائع:۲/۲۲۹، ۲۵۲، کتاب النکاح، سعید).

درمختار میں ہے:

قال: ينعقد النكاح بالكتاب كما ينعقد بالخطاب، وصورته :أن يكتب إليها يخطبها فإذا بلغها الكتاب أحضرت الشهود وقرأته عليهم وقالت: زوجت نفسي منه أوتقول: إن فلاناً كتب إلي يخطبني فاشهدوا أني زوجت نفسي منه، أما لو لم تقل بحضرتهم سوى زوجت نفسي من فلان لا ينعقد لأن سماع الشطرين شرط صحة النكاح، وبإسماعهم الكتاب أو التعبير عنه منها قد سمعوا الشطرين بخلاف ما إذا انتفيا. (فتاوی الشامی:۳/۱۲، مطلب التزوج بارسال الکتاب، سعید).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

جواز نکاح کی صورت یہ ہے کہ جس مردکوعورت نے ایسا لکھا ہے وہ دوگواہوں کے سامنے عورت کی تحریر کو سنا کر یہ کہے کہ میں نے قبول کیا غرض دوگواہوں کا ہونا اوراعادۂ تحریرِعورت کا کرنا اوراس کے بعدروبروگواہ کے قبول کرنا شرط جواز ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۷/۱۰۰).

مزید ملاحظہ ہو: مجموعہ قوانین اسلامی:۴۷، دفعہ ۳۱۔ وفتاویٰ محمودیہ:۱۰/۶۷۴، مبوب ومرتب)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نکاحِ موقت میں توقیت کا حکم:

سوال: کیا نکاحِ موقت صحیح ہے یا نہیں؟ نیز توقیت کا کیا حکم ہے اورفتویٰ کس پر ہے؟

الجواب: نکاحِ موقت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے کچھ مدت تک کے لیے نکاح کرلے، مثلاً ایک مہینہ کے لیے، اس کا حکم یہ ہے کہ ظاہر مذہب کے موافق یہ نکاح صحیح نہیں ہے، لیکن امام زفرؒ کے نزدیک نکاح صحیح ہے اورتوقیت کی شرط باطل ہے اوراسی پرفتویٰ ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

والنكاح الموقت باطل، مثل أن يتزوج امرأة بشادة شاهدين عشرة أيام، وقال زفرؒ: هو صحيح لازم، لأن النكاح لايبطل بالشروط الفاسدة. (الهداية:۲/۳۱۳، كتاب النكاح).

فتح القدیر میں ہے:

والنكاح باطل، وقال زفرؒ: هوجائز لأن النكاح لايبطل بالشروط الفاسدة، بل تبطل هي ويصح النكاح... ومقتضى النظر أن يترجح قوله، لأن غاية الأمر أن يكون الموقت متعة وهو منسوخ، لكن نقول المنسوخ معنى المتعة على الوجه الذي كانت الشرعية عليه وهو ما ينتهي العقد فيه بانتهاء المدة ويتلا شئ... وأنا لا أقول بذلک وإنما أقول: ينعقد مؤبداً ويلغو شرط التوقيت فحقيقة إلغاء شرط التوقيت هو أثر النسخ. (فتح القدير:۳/۲۴۹، دارالفكر).

شامی میں ہے:

وبطل نكاح متعة وموقت ثم ذكرفي الفتح دلائل حرمة المتعة... ثم قال: رجح قول زفرؒ بصحة الموقت على معنى أنه ينعقد مؤبداً ويلغو التوقيت. (الشامي:۳/۵۱، سعيد)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اخرس کے نکاح کا طریقہ اور ایجاب وقبول کا حکم:

سوال: میں نے سنا ہے کہ نکاح میں ایجاب وقبول کا ہونا ضروری ہے تو اخرس کس طرح نکاح کرے گا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جو اخرس لکھنا جانتا ہو اس کا ایجاب وقبول بذریعہ تحریر معتبر ہوگا، اور جو تحریر نہیں جانتا ہے اس کا معروف اشارہ ایجاب وقبول کے لیے معتبر ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله واستحسن الكمال اشتراط كتابته حيث قال: وقال بعض الشافعية: إن كان يحسن الكتابة لايقع طلاقه بالإشارة لاندفاع الضرورة بماهوأدل على المراد من الإشارة، وهو قول حسن، وبه قال بعض مشايخنا، قلت: بل هذا القول تصريح بما هو المفهوم من ظاهر الرواية ففي الكافي الحاكم الشهيد ما نصه: فإن كان الأخرس لا يكتب وكان له إشارة تعرف في طلاقه ونكاحه وشرائه وبيعه فهوجائز، وإن كان لم يعرف ذلک منه أوشک فيه فهو باطل،

فقد رتب جواز الإشارة على عجزه عن الكتابة، فيفيد أنه إن كان يحسن الكتابة لاتجوز إشارته. (فتاوى الشامي:۳/۲٤۱، كتاب الطلاق،سعيد).

وفي المبسوط للإمام السرخسيؒ:

وإن كان الأخرس لا يكتب وكانت له إشارة تعرف في طلاقه ونكاحه وشرائه وبيعه فهو جائز استحساناً. (المبسوط:٦/١٤٤،باب طلاق الاخرس،ادارة القرآن).

وفي الطحطاوي على الدرالمختار: (قوله واستحسن الكمال اشتراط كتابته) قال في البحر: وقال بعض المشايخ: إن كان يحسن الكتابة لايقع طلاقه بالإشارة لاندفاع الضرورة بما هو أدل على المراد من الإشارة، قال في فتح القدير: وهوحسن حلبي، قال في النهر: والخلاف إنما هو في قصر صحة تصرفاته على الكتابة. (حاشية الطحطاوي على الدرالمختار: ٢/١٠٨، كتاب الطلاق، كوئٹه۔ومثله فى البحرالرائق:٨/٤٧٨،مسائل شتىٰ، كوئٹه).

مذکورہ بالاعباراتِ فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اخرس کا اشارہ اس وقت معتبر ہوگا جب کہ وہ کتابت پر قدرت نہ رکھتا ہو اگر کتابت پر قادر ہے تو اشارہ غیر معتبر ہے، اسی کو قاضی مجاہدالاسلام صاحب نے اختیار فرمایا ہے۔ملاحظہ ہو: (مجموعۂ قوانین اسلامی:ص۴۴، دفعہ۲۵، ۲۶).

اس کے برخلاف دیگر بعض کتبِ فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشارہ کے لیے عدم قدرت علی الکتابۃ شرط نہیں ہے، یعنی قادر علی الکتابۃ کا اشارہ بھی معتبر ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں الاشباہ والنظائر میں ہے:

اختلفوا في أن عدم القدرة على الكتابة شرط للعمل بالإشارة أو لا، والمعتمد لا.

(الاشباه والنظائر:١/٣٧٩،احكام الاشارة ،الفن الثالث الجمع الفرق،المكتبة العصرية،بيروت۔ومثله فى تبيين الحقائق:٦/٢١٩،مسائل شتىٰ ،امداديه ملتان).

شمس الدین قاضی زادہ آفندیؒ ''نتائج الافکار'' میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے بعد فرماتے ہیں:

غاية الأمر أن يكون في المسئلة روايتان ومثل ذلک كثير. (نتائج الافكار تكملة فتح القدير:١٠/٥٢٧،مسائل شتىٰ،دارالفكر).

خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں کتابت کی اہمیت بام عروج پر ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اخرس کے لیے نکاح طلاق وغیرہ معاملات میں کتابت کی شرط لگائی جائے، تاخطِ او محفوظ باشد وبوقتِ ضرورت کار آید۔واللہ ﷻ اعلم۔

ایجاب وقبول کے جواب میں سر ہلانے سے نکاح کا حکم:

سوال: اگر کسی نے نکاح میں ایجاب وقبول کے جواب میں صرف سر ہلایا تو نکاح ہوا یا نہیں؟

الجواب: کلام پر قدرت رکھنے والا اگر صرف سر ہلا دے تو اس سے نکاح منعقد نہیں ہوگا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بھی نکاح نہیں ہوا۔

ملاحظہ فرمائیں شامی میں ہے:

(قوله احتراماً للفروج) أي لخطر أمرها وشدة حرمتها، فلا يصح العقد إلا بلفظ صريح أو كناية. (فتاوى الشامي:٣/٢١،سعيد).

مجمع الانہر میں ہے:

الإشارة إنما تعتبر إذا صارت معهودة وذلك في الأخرس دون المعتقل ولأن الضرورة في الأصل لازمة وفي العارض على شرف الزوال . (مجمع الانهر شرح ملتقى الابحر:٢/٧٣٣).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

خاموش رہنے اور سر ہلانے سے نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ:٣/٢٣٧،کتب خانہ مظہری)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قبول بالعمل سے نکاح منعقد ہونے کا حکم:

مسئلۂ مذکورہ بالا میں گزرا کہ سر ہلانے سے نکاح نہیں ہوتا، ہاں بعد میں قبول عمل سے متحقق ہو جائے گا اور نکاح صحیح ہوگا۔ جیسا کہ فضولی اگر کسی کا نکاح کرائے تو اجازت جس طرح قول سے متحقق ہوتی ہے اسی طرح فعل سے بھی متحقق ہوتی ہے اور فعلی اجازت سے بھی نکاح درست ہو جاتا ہے۔ فقہاء نے اس مسئلہ کی تصریح فرمائی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں محیط برہانی میں ہے:

إذا حلف الرجل بطلاق امرأة بعينها إن تزوجها، فزوجه رجل تلك المرأة بغير أمره و أجاز هو قولاً أو فعلاً . أو حلف بطلاق كل امرأة يتزوجها، فزوجه رجل امرأة بغير أمره فأجاز هو قولاً أو فعلاً ، قال بعض مشايخنا: إن أجاب بالقول يحنث و إن أجاز بالفعل لا يحنث . (المحيط البرهاني، الفصل الخامس و العشرون: ٣/٣١٩،نكاح الفضولي،مكتبه رشيديه ،كوئته).

نیز مذکور ہے:

ثم الفعل الذي تقع به الإجازة في نكاح الفضولي فعل هو يختص بالنكاح، وهو بعث

شيء من المهر و إن قل، و أما بعث الهدية و العطية لا يكون إجازة، لأنه لا يختص بالنكاح بل قد يكون بطراً أو أجراً فلا يكون ذلک إجازة للنكاح، هكذا حكي عن نجم الدين رحمه الله، فعلى هذا القياس لو بعث إليها شيئاً من النفقة لا تكون إجازة ؛ لأن النفقة لا تختص بالنكاح . (المحيط البرهاني، الفصل الخامس و العشرون:۳/ ۳۲۰،نکاح الفضولی،مکتبه رشیدیه، کوئٹه).

شامی میں ہے:

وفعل المسلم إنما يحمل على الكمال فيكون اقتدائه إجازة لفعله لأن الإجازة اللاحقة كالإذن السابق، و نظيره إذا أجاز نكاح الفضولي بالفعل يجوز و مجرد حضوره و سكوته وقت العقد لا يدل على الرضا فافهم.(رد المحتار، باب الجمعة:۲/ ۱٤۲،سعید).

وهل يكون القبول بالفعل كالقبول باللفظ كما في البيع؟ قال في البزازية: أجاب صاحب البداية في امراة زوجت نفسها بألف من رجل عند الشهود، فلم يقل الزوج شيئاً لكن أعطاها المهر في المجلس أنه يكون قبولاً، و أنكره صاحب المحيط، و قال الإمام مالم يقل بلسانه قبلت بخلاف البيع لأنه ينعقد بالتعاطي و النكاح لخطره لا ينعقد حتى يتوقف على الشهود و بخلاف إجازة نكاح الفضولي بالفعل لوجود القول ثمة ،اه ح. (حاشية رد المحتار، كتاب النكاح: ۳/ ۱۲،سعيد۔و البحرالرائق: ۳/ ۸۱، كتاب النكاح، كوئٹه).

قوله (فكالنكاح) أي فكما أن نكاح الفضولي صحيح موقوف على الإجازة بالقول أو بالفعل فكذا طلاقه، ح ؛ (حاشية رد المحتار : ۳/ ۲٤۲، كتاب الطلاق، سعيد).

وفي الدرالمختار: وحكمه أيضاً أخذ المالک الثمن أوطلبه من المشتري ويكون إجازة،وفي الشامي: قوله أخذ المالک الثمن الظاهرأن أل للجنس فيكون أخذ بعضه إجازة أيضاً لدلالته على الرضا ولتصريحهم في نكاح الفضولي بأن قبض بعض المهر إجازة أفاده الرملي عن المصنف. (الدرالمختارمع رد المحتار :۵/ ۱۱٤،فصل فی الفضولی،سعید).

نیز احسن الفتاویٰ میں ہے کہ قبول میں سرے سے کلام ہونا ہی ضروری نہیں ہے۔قبول بالعمل بھی متحقق ہوسکتا ہے۔(احسن الفتاویٰ ۵/ ۳۸۔وامدادالاحکام:۲/ ۲۴۲)۔واللہ ﷻ اعلم۔

جواب میں ''جی'' کہنے سے نکاح کا حکم:

سوال: اگر کسی نے نکاح میں ایجاب کے بعد ''جی'' کہا تو نکاح ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں '' جی '' کہنے سے نکاح ہوگیا۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولو قال لامرأة كنت لي أو صرت لي، فقالت: نعم، أوصرت لک كان نكاحاً كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۷۱، الباب الثاني فيما ينعقد به النكاح).

فتاویٰ ولوالجیہ میں ہے:

رجل قال لامرأة: أتزوجک بكذا وكذا، فقالت: قد فعلت، فهو بمنزلة قولها قد زوجتک، لأنها أخرجت الكلام مخرج الجواب يتضمن إعادة ما في السئوال... (الفتاوى الولوالجية: ۱/ ۳۶۲، كتاب النكاح، الفصل الثالث، بيروت).

شامی میں ہے:

وعبارة الفتح لما علمنا أن الملاحظة من جهة الشرع في ثبوت الانعقاد ولزوم حكمه جانب الرضا عديناحكمه إلى كل لفظ يفيد ذلک فلا احتمال مساوٍ للطرف الآخر. (فتاوى الشامي: ۳/ ۱۱، سعيد).

احسن الفتاوی میں ہے:

نکاح میں قبول کی بجائے الحمدللہ کہنے سے نکاح ہوجاتا ہے، اس لیے کہ صرف کلمہ ایجاب کا تملیک عین کے لیے موضوع ہونا کافی ہے کلمہ قبول میں یہ شرط نہیں ہے، بلکہ قبول میں سرے سے کلام ہونا ہی ضروری نہیں، قبول بالعمل بھی متحقق ہوسکتا ہے، مزید بریں خلاصۃ الفتاویٰ وعالمگیری میں ایسی صورت میں انعقادِ نکاح کا حکم صراحۃً موجود ہے۔ (احسن الفتاوی: ۵/ ۳۸).

فتاویٰ حقانیہ میں ہے کہ آمین کا لفظ قبول کا فائدہ دیتا ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں لڑکے کا ایجاب کے مقابلے میں آمین کہنے سے نکاح درست ہے اور مہر لازم ہے۔ (فتاوی حقانیہ: ۴/ ۳۱۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

لڑکی کے نام میں غلطی کرنے سے نکاح کا حکم:

سوال: اگر وکیل نے لڑکی کے نام میں یا اس کے والد کے نام میں غلطی کی تو کیا نکاح منعقد ہوجائے

گا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگرلڑکی مجلس نکاح میں موجودتھی اوراس کی طرف اشارہ کیا تھا تو نکاح ہوگیا اوراگر موجود نہیں تھی تو دونوں صورتوں میں نکاح نہیں ہوا یعنی لڑکی کے نام میں غلطی کی یا والد کے نام میں غلطی کی نکاح نہیں ہوا۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

غلط وكيلها بالنكاح في اسم أبيها بغيرحضورها لم يصح للجهالة، وكذا لوغلط في اسم بنته إلا إذا كانت حاضرة وأشار إليها. وفي الشامية:(قوله،لم يصح) لأن الغائبة يشترط ذكر اسمها واسم أبيها وجدها وتقدم أنه إذا عرفها الشهود يكفي ذكر اسمها فقط خلافاً لابن الفضل وعند الخصاف يكفي مطلقاً، والظاهر أنه في مسألتنا لايصح عند الكل لأن ذكر الاسم وحده لا يصرفها عن المراد إلى غيره، بخلاف ذكر الاسم منسوباً إلى أب آخر، فإن فاطمة بنت أحمد لا تصدق على فاطمة بنت محمد، تأمل، وكذا يقال فيما لو غلط في اسمها. (قوله إلا إذا كانت حاضرة) راجع إلى المسألتين، أي فإنها لوكانت مشاراً إليها وغلط في اسم أبيها أواسمها لا يضر لأن تعريف الإشارة الحسية أقوى من التسمية، لما في التسمية من الاشتراك لعارض فتلغو التسمية عندها. (الدرالمختارمع الشامی:۳/ ۲۶،سعید).

فتاویٰ فریدیہ میں ہے:

اگرلڑکی اس مجلس میں موجود نہ تھی تو یہ نکاح درست نہیں ہے، **كما في فتاوى قاضي خان: امرأة وكلت رجلاً بأن يزوجها فزوجها وغلط في اسم أبيها لاينعقد النكاح إذا كانت غائبة.** فتاوى قاضيخان على هامش الهندية: ١/ ٣٢٤۔ (فتاویٰ فریدیہ:۴/ ۴۰۸).

ہاں اگرلڑکی کے والد کے نام میں غلطی کی اور گواہ لڑکی کو اچھی طرح جانتے ہیں تو نکاح صحیح ہوجائے گا۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

جانی پہچانی عورتوں کے باپ کا نام بدل بھی جائے تو نکاح ہوجاتا ہے، اگر چہ درمختار کی عبارت سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ ایسی غلطی سے نکاح صحیح نہیں ہوتا، (درمختار کی عبارت اوپر مذکور ہوئی) لیکن جواب یہ ہے کہ اولاً تو درمختار کی عبارت میں "للجهالة" کا لفظ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلطی میں عدم جواز کی علت جہالت جو مفقود ہے۔

(ملخص از فتاویٰ دارالعلوم:۷/ ۱۲۳، مدلل ومکمل).

نیز مذکور ہے کہ وکیل یا قاضی نے غلطی سے لڑکی کا نام بدل دیا پھر بھی نکاح صحیح ہو جائے گا۔

ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

اگر چہ ظاہر عباراتِ کتبِ فقہ سے اس صورت میں واضح ہوتا ہے کہ جس کا نام وقت ایجاب وقبول لیا گیا ہے اس کے ساتھ منعقد ہو مگر بحث یہ ہے کہ قاضی اور وکیل کو پہلے بتلا دیا جاتا ہے کہ فلاں کا نکاح فلانہ سے کرانا ہے اس میں قاضی یا وکیل کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وکالت کے خلاف کرے، کیونکہ اس کے خلاف کرنے کے لیے وکیل ہی نہیں بنایا گیا، لیکن درمختار کی عبارت میں ہے کہ "وکذا غلط في اسم بنته (أي لا يصح) اس کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت میں خود باپ نے عقد نکاح کیا ہے، اور صورتِ مسئولہ میں قاضی یا وکیل نے نکاح پڑھا ہے اور وکیل خلاف کرے تو معتبر نہیں ہے، کما مر تفصیلہ۔ (فتاوی دارالعلوم: ۷/۱۲۲، مدلل ومکمل۔ وکذا فی امداد الاحکام: ۲/۲۳۰).

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکی جانی پہچانی ہے اور گواہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں تو نکاح ہو جائے گا اور غلطی مضر نہیں ہوگی، یہی فتاوی دارالعلوم کی عبارت کا مطلب ہے، اور اگر لڑکی مجہولہ ہے تو نکاح نہیں ہوگا جیسا کہ درمختار، قاضیخان اور فتاوی فریدیہ کی عبارات سے واضح ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

محض کتابت پر فرضی نکاح کا حکم:

سوال: بعض لوگ کسی ملک میں اقامہ حاصل کرنے کے لیے کورٹ میں فرضی نکاح کرتے ہیں یعنی مرد اور عورت دونوں یہ تحریر لکھتے ہیں کہ میں فلاں سے نکاح کرتا ہوں، پھر کورٹ کی جانب سے نکاح کی سند مل جاتی ہے کیا حقیقت میں یہ نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نکاح منعقد نہیں ہوا وجہ یہ ہے کہ نکاح میں جانبین سے کتابت معتبر نہیں ہے اور محض تحریری ایجاب وقبول کافی نہیں ہے، جب کہ زبان سے کچھ نہیں کہا، لہذا یہ نکاح کالعدم ہے۔

ملاحظہ فرمائیں شامی میں ہے:

قوله (ولا بكتابة حاضر) فلو كتب تزوجتك فكتبت قبلت، لم ينعقد بحر...إذ الكتابة من الطرفين بلا قول لا تكفي ... (فتاوى الشامي: ۳/۱۲، مطلب التزوج بارسال الكتاب، سعيد۔ وكذا في فتح القدير: ۳/۱۹۷، دار الفكر).

مبسوط میں ہے:

إذا كتب إليها فبلغها الكتاب فقالت: زوجت نفسي منه بغير محضر من الشهود لا

ينعقد كما في الحاضر فإن النبي صلى الله عليه وسلم قال:" لا نكاح إلا بشهود "ولو قالت: بين يدي الشهود زوجت نفسي منه لا ينعقد النكاح أيضاً لأن سماع الشهود كلام المتعاقدين شرط لجواز النكاح .(المبسوط للإمام السرخسیؒ:۵/۱۶،باب الولایة فی النکاح،ادارۃ القرآن).

البحر الرائق میں ہے:

وقيد المصنفؒ انعقاده باللفظ لأنه لا ينعقد بالكتابة من الحاضرين فلو كتب تزوجتک فكتبت، قبلت، لم ينعقد.(البحر الرائق:۳/۸۳،کوئٹہ).

امدادالفتاویٰ میں ہے:

اگر جانبین سے صرف تحریری ایجاب وقبول ہوا تو نکاح نہیں ہوگا،خواہ مجلس عقد میں دونوں موجود ہو یا نہ ہو۔ (امدادالفتاویٰ:۲/۲۳۰).

امدادالاحکام میں ہے:

اس صورت (مردوعورت رضامندی سے تحریر لکھوائے) میں نکاح درست نہ ہوگا اوراگر نام اور پورا پتہ بھی لکھا ہوا ہو جب بھی محض تحریر دکھانے سے نکاح درست نہ ہوگا۔(امدادالاحکام:۲/۲۲۰)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

عورت کے نکاح پڑھانے سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک فلسطینی مرد کا ایک تونیسی عورت کے ساتھ نکاح ہوا تونیسیا کے بلدیہ میں جو گرجہ اور کورٹ کے مشابہ ایک جگہ ہے،عورت کے والد اور بھائی کی موجدگی میں ایک مجسٹریٹ عورت نے نکاح پڑھایا،یادرہے کہ مجسٹریٹ عورت مسلمان تھی اور عورت بھی خود مجلس نکاح میں موجود تھی۔یہ نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نکاح خوان مسلمان تھی اور دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح پڑھایا لہذا نکاح صحیح ہوگیا،کیونکہ بالغہ عورت جب خود ایجاب وقبول کرسکتی ہے تو اسی طرح وہ کسی عورت کو وکیل بھی بناسکتی ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

(قوله يجعل عاقداً حكماً) لأن الوكيل في النكاح سفير ومعبر ينقل عبارة الموكل، فإذا كان الموكل حاضراً كان مباشراً لأن العبارة تنتقل إليه وهو في المجلس. (فتاوی الشامی: ۳/۲۴، سعید).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

عورت کی وکالت سے نکاح درست ہے، اگر دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول ہوا۔ (فتاویٰ دارالعلوم :۷/۹۸، مدلل ومکمل۔ ونظام الفتاویٰ:۲/۲۱۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زانیہ حاملہ سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی عورت سے زنا کیا پھر حمل ظاہر ہونے کے بعد نکاح کرنا چاہتا ہے تو کیا وضع حمل کا انتظار کرے گا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر حمل اسی کے نطفے سے ہے تو نکاح کے بعد صحبت بھی جائز ہے، اور اگر حمل دوسرے سے ہے تو نکاح جائز ہے، لیکن صحبت جائز نہیں وضع حمل کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ اور زنا تو بہر حال گناہِ کبیرہ ہے اس سے توبہ کرنا لازم ہے۔

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

رجل تزوج حاملاً من زنا منه فالنكاح صحيح عندالكل ويحل وطؤها عند الكل. (تبيين الحقائق:فصل في المحرمات، كتاب النكاح۔وهكذا في فتح القدير كتاب النكاح فصل في المحرمات،دار الفكر).

الجوهرة النيرة میں ہے:

وإذا تزوج الحامل من الزنا جاز النكاح...قوله ولا يطؤها حتى يضع حملها لقوله صلى الله عليه وسلم " لا توطأ حامل حتى تضع " إلا أن يكون هو الزاني فيجوز أن يطأها. (الجوهرة النيرة:العدة في النكاح الفاسد).

درمختار میں ہے:

وصح نكاح حبلى من زنى لاحبلى من غيره أي الزنى...وإن حرم وطؤها ودواعيه حتى تضع، متصل بالمسئلة الأولىٰ لئلا يسقي ماءه زرع غيره...لو نكحها الزاني حل له وطؤها اتفاقاً. (الدر المختار:۳/۴۸،فصل في المحرمات،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

زانی کا زانیہ کو حمل ہو تب بھی اس سے زانی کا نکاح درست ہے اور صحبت بھی درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۱/۱۲۶، مبوب ومرتب۔ وفتاویٰ حقانیہ:۴/۳۳۰۔ وامداد الاحکام:۲/۲۰۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حلالہ کی نیت سے کیا گیا نکاح لازم ہے:

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی اب اس عورت نے حلالہ کے لیے دوسرے شخص سے نکاح کیا یہ شخص طلاق دینا نہیں چاہتا ہے اور عورت بھی اس کے ساتھ رہنے پر راضی ہے تو اب اس نکاح کا کیا حکم ہے؟ اور یہ کہنا کہ اس نکاح میں حلالہ کی شرط لگائی تھی لہذا نکاح درست نہیں ہوا تو دونوں کا آپس میں رہنا درست نہیں کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نکاح صحیح اور درست ہے اب شوہر طلاق نہ دینا چاہے تو اس کی مرضی ہے کوئی اس کو مجبور نہیں کرسکتا، نیز صحیح مذہب کے موافق حلالہ کی شرط لگانے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بلکہ شرط خود باطل ہے اور نکاح صحیح ہے، اگرچہ ایسی شرط لگانا مکروہ ہے۔ اور عام طور پر طلاق کی شرط نکاح میں نہیں لگاتے بلکہ یہ نکاح سے پہلے زبانی ذکر کی ہوگی۔

ملاحظہ فرمائیں شامی میں ہے:

وكره التزوج للثاني تحريماً لحديث لعن المحلل والمحلل له بشرط التحليل كتزوجتك على أن أحللك وإن حلت للأول لصحة النكاح وبطلان الشرط فلا يجبر على الطلاق كما حققه الكمال خلافاً لمازعمه البزازي... إلى قوله: لأنه لا شك أنه شرط في النكاح لا يقتضيه العقد وهومما لايبطل بالشروط الفاسدة بل يبطل الشرط ويصح فيجب بطلان هذا وأن لا يجبرعلى الطلاق. (فتاوى الشامي:٣/٤١٥،سعيد۔ومثله في الحاشية الطحطاوي على الدر المختار:٢/١٧٦،كوئته۔والبحر الرائق:٤/٥٨،كوئته۔ومجمع الانهرفي شرح ملتقى الابحر:١/٤٣٨).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وإن كان الطلاق ثلاثاً في الحرة لم تحل له حتى تنكح زوجاً غيره نكاحاً صحيحاً ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية:١/٤٧٣)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

غیر مسلم نصرانی عورت کے ساتھ کورٹ میں نکاح کا حکم:

سوال: ایک مسلمان شخص نے المانیہ میں ایک نصرانی عورت کے ساتھ ان کے قوانین کی پیروی کرتے ہوئے جج کے سامنے کورٹ میں نکاح کیا تو یہ نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دوگواہوں کی موجودگی میں جج کے روبرو با قاعدہ ایجاب وقبول کیا تو نکاح صحیح ہوگیا اور چونکہ عورت نصرانی ہے لہذا گواہوں کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔
ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وأما المسلم إذا تزوج ذمية بشهادة ذميين فإنه يجوز في قول أبي حنيفة وأبي يوسف سواء كانا موافقين لها في الملة أومخالفين...لهما عمومات النكاح من الكتاب والسنة نحو قوله تعالىٰ: ﴿فانكحوا ما طاب لكم من النساء﴾ وقوله: ﴿ وأحل لكم ما وراء ذلكم أن تبتغوا بأموالكم﴾ وقول النبي صلى الله عليه وسلم: "تزوجوا ولا تطلقوا" وقوله صلى الله عليه وسلم: "تناكحوا " وغير ذلك مطلقاً عن غيرشرط إلا أن أهل الشهادة وإسلام الشاهد صار شرطاً في نكاح الزوجين المسلمين بالإجماع فمن ادعى كونه شرطاً في نكاح المسلم الذمية فعليه الدليل .(بدائع الصنائع:۲/ ۲٥٤،سعيد).

ہدایہ میں ہے:

قال: وإن تزوج مسلم ذمية بشهادة ذميين جاز عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد وزفر: لا يجوز...ولهما أن الشهادة شرطت في النكاح على اعتبار إثبات الملك لوروده على محل ذي خطر لا على اعتبار وجوب المهر، إذ لاشهادة تشترط في لزوم المال وهما شاهدان عليها، بخلاف ما إذا لم يسمعا كلام الزوج لأن العقد ينعقد بكلاميهما والشهادة شرطت على العقد. (الهداية: ۲/ ۳۰۷،كتاب النكاح).

نظام الفتاویٰ میں ہے:

جب عقد نکاح کی مجلس میں زوجین دونوں خود موجود تھے اگر چہ عیسائی مجسٹریٹ کے کہنے سے یا پوچھنے سے دونوں نے با قاعدہ ایجاب وقبول کرلیا تو عقد نکاح کے ارکان پائے گئے ،اور یہ دونوں میاں بیوی خود عاقد نکاح اور مباشر نکاح ہو گئے، تو بلاشبہ نکاح منعقد ہو گیا، اور مجسٹریٹ محض واسطہ ونگران کے درجہ میں رہ گیا تا کہ بوقت انکار ثبوت ہو سکے۔ (ملخص از نظام الفتاویٰ:۲/۲۱۱)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

سرکاری دفتر میں غیر مسلم جج کے روبرو دو گواہوں کی موجودگی میں با قاعدہ ایجاب وقبول ہو جانے سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور حقوق زوجیت بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ (ملخص از فتاویٰ رحیمیہ:۵/۲۴۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کا حکم:

سوال: ایک شخص شادی شدہ ہے اپنے وطن سے دوسرے ملک کسبِ معاش کے لیے چلا گیا اور وہاں رہنا شروع کر دیا لمبی مدت ہوگئی واپس اپنے گھر نہیں گیا، کبھی کبھی اپنے گھر والوں کے لیے کچھ رقم وغیرہ بھیجتا ہے اور عورت کو وہاں لانا بھی مشکل ہے، تو اس شخص کے لیے گنجائش ہے کہ اس ملک میں دوسری شادی کرلے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دونوں بیویوں کے جملہ حقوق پر قدرت ہو تو دوسرے نکاح کی اجازت ہے اور اگر قدرت نہ ہو تو ایک ہی پر اکتفا کرنا چاہئے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع﴾(سورۃ النساء،الآیۃ:۳).

پھر آگے فرمایا اگر تم حقوق کی ادائے گی سے قاصر ہو اور زیادتی کا اندیشہ ہو تو ایک کافی ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وإن خفتم أن لا تعدلوا فواحدۃ﴾(سورۃ النساء،الآیۃ:۳).

حدیث شریف میں ہے:

وعن ابن عمر رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ أن غیلان بن مسلمۃ الثقفي أسلم ولہ عشر نسوۃ في الجاھلیۃ فأسلمن معہ فقال النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم: أمسک أربعاً ففارق سائرھن .(رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ،مشکاۃ شریف:۲/۲۷٤،باب المحرمات،الفصل الثانی).

عالمگیری میں ہے:

و إذا کانت لہ امرأۃ وأراد أن یتزوج علیھا أخری وخاف أن لا یعدل بینھما لا یسعہ ذلک، وإن کان لا یخاف وسعہ ذلک، والامتناع أولیٰ و یؤجر بترک إدخال الغم علیھا کذا في السراجیۃ. (الفتاوی الھندیۃ:۱/۳٤۱،الباب الحادی عشر فی القسم).

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: واحسن الفتاوی:۵/۶۶۔۶۸۔ وکتاب الفتاوی:۴/۳۱۹۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نکاح میں شرط لگانے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے نکاح سے پہلے یہ شرط لگائی کہ لڑکی مجھے کار دے گی تو اس کا کیا حکم ہے؟ اور لینا کیسا ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نکاح میں ایسی شرط لگانا صحیح نہیں ہے شرط خود باطل ہے اور نکاح صحیح اور درست ہے، اور کار لینا رشوت کے حکم میں ہے اس کو واپس کرنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

قال رحمه الله تعالىٰ: وما لا يبطل بالشرط الفاسد القرض، والهبة، والصدقة، والنكاح، والطلاق، ...هذه كلها لا تبطل بالشروط الفاسدة لما ذكرنا من أن الشروط الفاسدة من باب الربا وأنه يختص بالمبادلة المالية، وهذه العقود ليست بمعاوضة مالية، فلا يؤثر فيها الشروط الفاسدة، ألا ترىٰ أنه عليه الصلاة والسلام أجاز العمرى وأبطل شرط المعمر. (تبين الحقائق:٤/١٣٣، كتاب البيوع،متفرقات،امداديه ،ملتان).

نظام الفتاویٰ میں ہے:

لڑکی والوں سے شادی کے لیے یا شادی کے موقع پر لڑکے والوں کا لینا یہ تلک کہلاتا ہے اور یہ عمل ورواج کافروں غیر مسلموں کا ہے، اور شریعت کی نگاہ میں ناجائز اور گناہ ہے، قرآنِ پاک میں اس کی ممانعت موجود ہے، قال الله تعالىٰ: ﴿يا ايها الذين آمنوا لا تكونوا كالذين كفروا﴾ (پ ۴) اور اس طرح لینا نکاح کی شرط کے درجہ کی چیز ہو کر حرام ورشوت کے درجہ کی چیز ہو جاتی ہے، جس کا واپس کر دینا لڑکے پر اور لڑکے والوں پر ضروری ہو جاتا ہے، اور اگر لڑکا یا لڑکے والے واپس نہ کریں تو لڑکی یا لڑکی والے خود واپس لے سکتے ہیں، بالکل اسی طرح لڑکا یا لڑکے والے لڑکی سے یا لڑکی والوں سے نکاح سے قبل نکاح کی شرط کے طور پر کچھ لیں تو شرعاً یہ چیز ممنوع اور رشوت کے درجہ میں ہو کر واجب الاعادہ ہو جاتی ہے۔ كما صرح به في الشامي:٢/٣٦٥۔ (نظام الفتاویٰ:۲/۲۱۷).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

ایسی شرطیں جو نکاح سے متعلق شریعت کے وجوبی احکام سے متصادم ہوں، جیسے یہ شرط کہ بیوی کا مہر نہیں ہوگا...من جملہ انھیں شرائط کہ یہ ہے کہ شوہر عورت اور اس کے اہل خاندان سے کوئی مالی مطالبہ کرے، ایسی شرطیں بالاتفاق نامعتبر ہیں، اور نکاح پر بالاتفاق ان کا کوئی اثر نہیں ہوگا، نکاح منعقد ہو جائے گا، اور شرطیں لغو بے اثر ہوں گی۔ (جدید فقہی مسائل:۲/۳۳)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

رخصتی سے پہلے صحبت نہ کرنے کی شرط لگانے کا حکم:

سوال: اگر کسی لڑکے نے بوقت نکاح یہ شرط لگائی کہ رخصتی سے پہلے صحبت نہیں کروں گا، اور اب تک رخصتی نہیں ہوئی، لیکن وہ لڑکا صحبت کرنا چاہتا ہے تو جائز ہے یا نہیں؟ اور جو شرط لگائی وہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اس شرط کا پورا کرنا ضروری ہے، نیز شرط نہ لگائی ہو تب بھی عرف میں قبل از رخصتی لوگ ہم بستری نہیں کرتے، اس لیے عرف کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ہم بستری سے اجتناب کرنا چاہئے، علامہ شامی فرماتے ہیں:

" والعرف في الشرع له اعتبار ☆ لذا عليه الحكم قد يدار".

(شرح عقود رسم المفتی:۳۸، دارالاشاعت).

عرف کی دیگر چند مثالیں بھی ملاحظہ فرمائیں: مثلاً اگر روٹی کو بطور قرض لیکر بعد میں واپس کردے اور تعداد کا لحاظ رکھے تو شرعاً یہ درست نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ روٹی میں کمی بیشی ہوتی ہے، لیکن عرف اور تعامل کی وجہ سے جائز ہے، اسی طرح عرف میں ننگے سر پھرنا عیب ہے تو طلبہ وعلماء کو سر چھپانا چاہئے، اسی طرح بغیر قمیص کے گھومنا عرفاً عیب ہے، تو اس طرح نہیں گھومنا چاہئے، بنابریں شرط وعرف دونوں کی وجہ سے رخصتی سے قبل ہم بستری سے بچنا چاہئے۔

قال الله تعالیٰ: ﴿يا أيها الذين امنوا أوفوا بالعقود﴾ (سورة المائدة:۱).

وفي الحديث: " أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج. (رواه البخاري:۱/۳۷۶، باب الشروط في المهر).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

تیسری قسم: کی شرطیں وہ ہیں جن سے عورت کو نفع پہنچتا ہو اور شریعت نے نہ ان کو واجب قرار دیا ہو اور نہ ان سے منع کیا ہو؛ گویا ان شرطوں کو مان کر مرد اپنے بعض ایسے حقوق سے دستبردار ہو جاتا ہے جن سے دستبردار ہونے کا اس کو اختیار رہے، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا یہ کہ اس کی اس کو اس کے شہر سے باہر نہیں لے جائے گا وغیرہ ایسی شرطوں کے ساتھ نکاح منعقد ہو جائے گا، اس پر اتفاق ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ شرطیں معتبر ہوں گی اور اس کی تکمیل واجب ہوگی یا نہیں؟ سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کا اس میں اختلاف ہے۔

مثبتین اوران کے دلائل:

جن کے نزدیک یہ شروط معتبر ہیں ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قاضی شریحؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ اسحاق بن راہویہؒ، اوزاعیؒ، وغیرہ ہیں۔

دلائل ملاحظہ ہو: (۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يا أيها الذين امنوا أوفوا بالعقود﴾ (سورة المائدة:۱).

ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں:

وكذلك كل شرط شرطه إنسان على نفسه في شيء يعمله في المستقبل فهو عقد.

وأيضاً قال: وهو عموم في إيجاب الوفاء بجميع مايشترط الإنسان على نفسه ما لم تقم دلالة تخصصه. (احكام القرآن:۳/۳۸٤،۲۸۵).

(۲) "**أحق ما أوفيتم من الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج.**" (رواه الجماعة).

(۳) یہ ایسی شرطیں ہیں جو مقاصد نکاح میں تو مانع نہیں ہیں اوراس سے ایک جائز مقصد ومنفعت متعلق ہے، تو لازم ہونا چاہئے۔ (ملخص از جدید فقہی مسائل:۳۵-۳۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نومسلمہ کا حالتِ عدت میں نکاح کا حکم:

سوال: ایک غیر مسلم عورت کا کسی غیر مسلم سے نکاح ہوا، کچھ عرصہ کے بعد عورت کی درخواست پر جج نے تفریق کردی اور شوہر نے دستخط بھی کر دیا، بعدازاں ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ عورت مسلمان ہوگئی اور مسلمان شخص سے نکاح کرلیا تو یہ نکاح ہوا یا نہیں؟ اگر نہیں ہوا تو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عدت واجب نہیں ہے، اور صاحبینؒ کے نزدیک عدت واجب ہے، علامہ شامیؒ نے امام صاحب کے قول کو راجح قرار دیا ہے لہٰذا امام صاحبؒ کے مذہب کے موافق مذکورہ بالا نکاح صحیح ہوگیا، کیونکہ کفار کے یہاں آج کل عدت کا تصور نہیں ہے اور عدت کو حق الزوج بتلاتے ہیں، نیز جب ایک حیض گزر جائے تو جماع بھی جائز ہے، اور احتیاط بہر حال پوری عدت میں ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وظاهره أنه لاعدة من الكافر عند الإمام أصلاً وإليه ذهب بعض المشايخ فلا تثبت الرجعة للزوج بمجرد طلاقها... وقيل تجب لكنها ضعيفة لاتمنع من صحة النكاح...

والأصح الأول كما في القهستاني عن الكرماني ومثله في العناية. (شامی:۳/۱۸۵،باب نکاح الکافر،سعید)۔

وفيه أيضاً:۔ أن العدة إنما تجب حقاً للزوج :أي الذي طلقها ولا تجب له بدون اعتقاده ولما قدمناه أيضاً عن ابن الكمالؒ من اعتبار دين الزوج خاصة وكذا ما قدمناه من ترجيح القول بأنه لاعدة من الكافرعند الإمام أصلاً تأمل. (فتاوی الشامی:۳/۱۸۷،باب نکاح الکافر، سعید)۔

جامع الرموز میں ہے:

واتفق المشايخ على جواز نكاح المعتدة عن كافر إلا أن بعضهم قالوا: إن العدة واجبة، وبعضهم قالوا: إنها غير واجبة وهو الأصح كما في الكرماني. (جامع الرموزللعلامة شمس الدين محمدالخراسانی القهستانی،فصل فی نکاح القن:۲/٤۹۲،المطبعة الکريمة)۔

ہدایہ میں ہے:

ولأبي حنيفةؒ أن الحرمة لايمكن إثباتهاحقاً للشرع لأنهم لا يخاطبون بحقوقه ولا وجه إلى إيجاب العدة حقاً للزوج لأنه لا يعتقده بخلاف ما إذا كانت تحت مسلم لأنه يعتقده.

(الهداية:۲/۳٤٤،نکاح اهل الشرك)۔

البحر الرائق میں ہے:

وظاهر كلام الهداية أنه لاعدة من الكافرعند الإمام أصلاً وفيه اختلاف المشايخ فذهب طائفة إليه وأخرى إلى وجوبها عنده لكنها ضعيفة لا تمنع من صحة النكاح لضعفها.

(البحرالرائق:۳/۲۰۷،باب نکاح الکافر،کوئٹہ)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

خفیۃً نکاح کے بعد علی الاعلان تجدیدِ نکاح کا حکم:

سوال: ایک شخص کی منگنی ایک لڑکی سے ہوگئی،نکاح ۸ ماہ کے بعد طے ہو چکا ہے۔مگر یہ شخص اتنی لمبی مدت انتظار نہیں کرسکتا ہے،اور چاہتا ہے کہ ابھی چند گواہوں کی موجودگی میں ولی کی اجازت سے خفیۃً نکاح کرلے تاکہ لڑکی اس کے لیے حلال ہوجائے،اور آٹھ مہینے کے بعد باقاعدہ علی الاعلان پھر سے نکاح کریں تو کیا اس طرح کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نکاح اول باقاعدہ ایجاب وقبول کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں

لڑکی کی رضامندی سے کرے تو صحیح ہے اوراس پرنکاح کے تمام احکام جاری ہوں گے،لیکن ایسا نکاح کرنا بہتر نہیں ہے کیونکہ صرف گھر والے جانتے ہیں دیگر سوسائٹی اورخاندان والے بےعلم ہیں،لہذا اتہمت کا قوی اندیشہ ہے،اورتہمت والے امور سے بچنا بےحدضروری ہے،تاکہ کسی کی عفت وپاکدامنی پرکسی کوزبان درازی کا موقع نہ ملے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں خفیۃً نکاح کرناممنوع تھااورحضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ام جمیل کے ساتھ نکاح فرمایا تھا،لیکن عام لوگ اس نکاح سے بےعلم تھے اس وجہ سے گواہی دی کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اجنبیہ کے ساتھ مشغول تھے،بعدمیں معلوم ہوا کہ وہ عورت اجنبیہ نہیں تھی بلکہ انکی بیوی تھی۔(فتاوی دارالعلوم زکریا:۱/۴۸۸،ابواب الحدیث).

درمختار میں ہے:

النكاح ينعقد بإيجاب من أحدهما وقبول من الآخر. (الدرالمختار:۳/۹،سعید۔وكذا فی الهداية:۲/۳۰۶۔والبحرالرائق:۳/۱٤٤).

ہدایہ میں ہے:

ولا ينعقد نكاح المسلمين إلا بحضور شاهدين حرين عاقلين بالغين مسلمين رجلين أو رجل وامرأتين. (الهداية:۲/۳۰٦،كتاب النكاح،وكذا فی الدرالمختار:۳/۲۱).

نیز جب پہلا نکاح ہوگیا تو اب دوسرے نکاح کی ضرورت نہیں ہے لیکن تجدید کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے،حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کی تجدید کی درخواست کی تو آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے کوئی انکارنہیں فرمایا۔

ملاحظہ ہومسلم شریف میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه قال: كان المسلمون لا ينظرون إلى أبي سفيان ولايقاعدونه فقال للنبي صلى الله عليه وسلم: يا نبي الله، ثلاث أعطنيهن قال: نعم، قال: عندي أحسن العرب وأجمله أم حبيبة رضي الله تعالىٰ عنها بنت أبي سفيان أزوجكها،قال: نعم، قال: ومعاوية تجعله كاتباً بين يديك قال: نعم ، قال: وتؤمرني حتى أقاتل الكفار كما كنت أقاتل المسلمين، قال: نعم، قال أبوزميل: ولولا أنه طلب ذلك من النبي صلى الله عليه وسلم ما أعطاه ذلك لأنه لم يكن يسأله شيئاً إلا قال: نعم. (رواه مسلم فی المناقب:۲/۳۰٤).

قال أبوعباس أحمد بن عمر القرطبي في شرحه على مسلم المسمىٰ بـ" المفهم" :
قلت: فقد ظهر أنه لاخلاف بين أهل النقل أن تزويج النبي صلى الله عليه وسلم متقدم على إسلام أبيها أبي سفيان، ولما ثبت هذا تعين أن يكون طلب أبي سفيان تزويج أم حبيبة رضي الله تعالىٰ عنها بعد إسلامه خطأً ووهماً وقد بحث النقاد عمن وقع منه ذلک الوهم فوجدوه قد وقع من عكرمة بن عمار... قلت: قد تأول بعض من صح عنده ذلک الحديث،بأن قال: إن أبا سفيان إنما طلب من النبي صلى الله عليه وسلم أن يجدد معه عقداً على ابنته المذكورة ظناً منه: أن ذلک يصح لعدم معرفته بالأحكام الشرعية لحداثة عهده بالإسلام .

(المفهم لمااشكل من تلخيص كتاب مسلم:٦/٤٥٧).

مزید ملاحظہ ہو: شرح النووی على الصحيح لمسلم :٢/٣٠٤۔وإكمال إكمال المعلم للوشتانی: ٨/٤٢٧۔ ٤٢٩۔ وتكملة فتح الملهم:٥/٢٧٠).

وفي الدر المختار: وفي الكافي: جدد النكاح بزيادة ألف لزمه ألفان على الظاهر. وفي الشامي:حاصل عبارة الكافي: تزوجها في السر بألف ثم فی العلانية بألفين ظاهر المنصوص في الأصل أنه يلزم عنده الألفان ويكون زيادة في المهر، وعند أبي يوسفؒ المهرهو الأول، لأن العقد الثاني لغو، فيلغو ما فيه، وعند الإمام أن الثاني وإن لغا لا يلغوما فيه من الزيادة.

(الدر المختار:مع الشامی:٣/١١٢،باب المهر،سعید۔وكذا فی البحر الرائق:٣/١١٣،باب الاولیاء والاكفاء،كوئٹه).

لیکن ہاں کبھی مصلحت کی وجہ سے دوسرا نکاح کیا جاتا ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

جنات سے رشتہ مناکحت کا حکم:

سوال: جنات کے ساتھ رشتہ مناکحت قائم کرسکتے ہیں یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں جنات کے ساتھ رشتہ مناکحت قائم کرنا جائز نہیں ہے یہ ہی صحیح قول ہے۔

ملاحظہ ہوعلامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله والجنية وإنسان الماء بقرينة التعليل باختلاف الجنس لأن قوله تعالىٰ:﴿ والله جعل لكم من أنفسكم أزواجاً﴾ بين المراد من قوله:﴿ فانكحوا ما طاب لكم من النساء ﴾

وهو الأنثىٰ من بنات آدم فلا يثبت حل غيرها بلا دليل ولأن الجن يتشكلون بصور شتىٰ فقد يكون ذكراً تشكل بشكل أنثىٰ ...(تنبيه) في الأشباه عن السراجية: لا تجوز المناكحة بين بني آدم والجن وإنسان الماء لاختلاف الجنس، ومفاد المفاعلة أنه لا يجوز للجني أن يتزوج إنسية أيضاً وهو مفاد التعليل أيضاً...عن زواهرالجواهر: الأصح أنه لا يصح نكاح آدمي جنية، كعكسه لاختلاف الجنس فكانوا كبقية الحيوانات. (الشامی:۳/۵ کتاب النکاح،سعید).

وفي الأشباه والنظائر: ...وبعضهم استدل بما رواه حرب الكرماني في مسائله عن أحمد وإسحاق، قال: حدثنا محمد بن يحيى القطيعي حدثنا بشر بن عمر بن لهيعة عن يونس بن يزيد عن الزهري قال: "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نكاح الجن" وهو وإن كان مرسلاً فقد اعتضد بأقوال العلماء. (الاشباه والنظائر:۳/۹۴،احکام الجان،ادارة القرآن).

وكرهه الإمام مالكؒ فقال: أخشى أن توجد بنت حاملاً وتسأل عن حملها فتقول: تزوجني جني، وبذلك يكثر الفساد. (قرة العين لعبد الله بن محمدبن الصديق الغماری ص۶۹، بیروت۔ و مثله فی " الاشباه والنظائر ":۳/۹۵،احکام الجان،ادارة القرآن).

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی دارالعلوم دیوبند:۷/۱۵۲۔ واحسن الفتاوی:۵/۳۰۔ واللہ ﷻ اعلم۔

فصل دوم

محرمات کا بیان

حرمتِ مصاہرت کے نقلی دلائل:

سوال: احناف کے ہاں زنا سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے، بعض حضرات کو اس مسئلہ میں تشفی نہیں، ان کی تشفی کے لیے احادیث اور آثار کی روشنی میں یہ مسئلہ مدلل فرمائیں؟

الجواب: زنا اگر چہ ایک سنگین جرم ہے، لیکن جزئیت ثابت ہوجاتی ہے، یعنی مزنیہ کی ماں ساس بن گئی، اور مزنیہ کی بیٹی ربیبہ بن گئی، جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے ان سے نکاح حرام ہوگیا۔

(۱) آیتِ کریمہ سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ ملتا ہے:

قوله تعالیٰ: ﴿ ولا تنكحوا ما نكح آباؤكم من النساء ﴾ والنكاح يستعمل في العقد والوطء فلا يخلو إما أن يكون حقيقة لهما على الاشتراک، وإما أن يكون حقيقة لأحدهما مجازاً للآخر وكيف ما كان يجب القول بتحريمهما جميعاً إذ لا تنافي بينهما كأنه قال عزوجل: "ولا تنكحوا ما نكح آباؤكم من النساء عقداً ووطأً". (بدائع الصنائع:۲/ ۲۶۱، واما الفرقة الرابعة، سعید۔ وکذا فی شرح النقایة:۲/ ۳۴۷، کتاب النکاح، بیروت).

قال أبوبكر: أخبرنا أبوعمر غلام ثعلب قال الذي حصلناه عن ثعلب عن الكوفيين والمبرد عن البصريين أن النكاح في أصل اللغة هو اسم للجمع بين الشيئين تقول العرب: أنكحنا الفرا فسنرى هو مثل ضربوه للأمر يتشاورون فيه ويجتمعون عليه ثم ينظر عماذا

یصدرون فیه معناه جمعنا بین الحمار وأتانه. قال أبوبکر: إذا کان اسم النکاح في حقیقة اللغة موضوعاً للجمع بین الشیئین ثم وجدناهم قد سموا الوطء نفسه نکاحاً من غیر عقد کما قال الأعشی:

ومنکوحة غیرممهورة ☆ وأخری یقال له فادها

یعني المسبیة الموطوءة بغیر مهر ولا عقد... وقد اختلف أهل العلم في إیجاب تحریم الأم والبنت بوطء الزنا فروی سعید بن أبي عروبة عن قتادة عن الحسن عن عمران بن حصین رضي اللّٰه تعالیٰ عنه في رجل زنی بأم امرأته حرمت علیه امرأته وهو قول الحسن وقتادة وکذلک قول سعید بن المسیب وسلیمان بن یسار وسالم بن عبد اللّٰه ومجاهد وعطاء وإبراهیم وعامر وحماد وأبي حنیفة وأبي یوسف ومحمد وزفر والثوري والأوزاعي ولم یفرقوا بین وطء الأم قبل التزوج أو بعده في إیجاب تحریم البنت...قال أبوبکر: قوله تعالیٰ:﴿ ولا تنکحوا ما نکح آباؤکم من النساء ﴾ قد أوجب تحریم نکاح امرأة قد وطئها أبوه بزنا أوغیره إذ کان الاسم یتناوله حقیقة فوجب حمله علیها وإذا ثبت ذلک في وطء الأب ثبت مثله في وطء أم المرأة أو ابنتها في إیجاب تحریم المرأة لأن أحداً لم یفرق بینهما و یدل علی ذلک قوله تعالیٰ: ﴿و ربائبکم اللاتي في حجورکم من نسائکم اللاتي دخلتم بهن﴾ والدخول بها اسم للوطء وهوعام في جمیع ضروب الوطء من مباح أومحظور ونکاح أو سفاح... (احکام القرآن للجصاصؒ:۲/۱۱۲ـ۱۱۴، باب مایحرم من النساء، سهیل ـ ومثله فی احکام القرآن للعثمانیؒ:۲/۲۰۰ـ۲۰۴، ادارۃ القرآن).

(۲) بعض احادیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ زنا سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے:

(۱)عن أبي هاني قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم:" من نظر إلی فرج امرأة لم تحل له أمها ولا ابنتها. (مصنف ابن ابی شیبة:۹/۹۹ـوفی اسناده حجاج بن ارطاة وقال البیهقی اسناده مجهول)

(۲)عن عائشة رضي اللّٰه تعالیٰ عنها أنها قالت: اختصم سعد بن أبي وقاص رضي اللّٰه تعالیٰ عنه وعبد بن زمعة رضي اللّٰه تعالیٰ عنه في غلام فقال سعد: هذا یارسول اللّٰه ابن أخي عتبة بن وقاص عهد إلي أنه ابنه أنظر إلی شبهه، وقال عبد بن زمعة هذا أخي یارسول اللّٰه ولد علی فراش أبي من ولیدته فنظر رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم إلی شبهه فرأی شبهاً بیناً

بعتبة فقال: هو لک یا عبد الولد للفراش وللعاهر الحجر واحتجبي منه یاسودة بنت زمعة قالت: فلم یر سودة رضي اللّٰه تعالیٰ عنها قط. (رواه مسلم:۱/ ۴۷۰).

قال ابن الترکماني في" الجوهرالنقي" (۷/ ۱۷۰): وفي قوله علیه السلام:" واحتجبي منه یا سودة"حجة لهم لأنه لما رأی الشبه بعتبة علم أنه من مائه فأجراه في التحریم مجری النسب وأمرها بالاحتجاب منه.

(۳) عبد الرزاق عن ابن جریج قال: أخبرت أبي بکربن عبد الرحمن بن أم الحکم أنه قال: قال رجل: یارسول اللّٰه ! إني زنیت بامرأة في الجاهلیة أفأنکح ابنتها؟ فقال النبي صلی اللّٰه علیه وسلم: لا أری ذلک، ولا یصلح ذلک أن تنکح امرأة تطلع من ابنتها علی ما اطلعت علیه منها. (مصنف عبدالرزاق:۷/ ۲۰۲/ ۱۲۷۸۴،باب الرجل یزنی باخت امرأته).

(۴) وقوله علیه الصلاة والسلام: لو مس امرأة بشهوة حرمت علیه أمها وبنتها. (حاشیة الکنز:ص۹۸،رقم الحاشیة ۹ بحواله عینی).

(۵) بخاری میں جریج والی حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ زانی باپ پر بھی اب کا اطلاق ہوتا ہے یعنی زنا سے جزئیت ثابت ہوجاتی ہے۔

ملاحظہ ہو بخاری میں ہے:

وقال اللیث: حدثني جعفر ابن ربیعة عن عبد الرحمن بن هرمز قال: قال أبو هریرة ﷺ: قال رسول اللّٰه صلی علیه وسلم: نادت امرأة ابنها وهو في صومعته، قالت: یاجریج قال: اللّٰهم أمي وصلاتي، فقالت:یاجریج قال:اللّٰهم أمي و صلاتي، فقالت:یاجریج قال:اللّٰهم أمي و صلاتي، قالت: اللّٰهم لایموت جریج حتی ینظر في وجوه المیامیس وکانت تأوي إلی صومعته راعیة ترعی الغنم فولدت فقیل لها ممن هذا الولد؟ قالت: من جریج نزل من صومعته قال جریج :أین هذه التي تزعم أن ولدها لي قال: یا بابوس من أبوک قال: راعي الغنم. (رواه البخاری:۱/ ۱۶۱).

(۳) بعض آثار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زنا سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے:

(۱)عبدالرزاق عن عثمان بن سعید عن قتادة عن عمران بن حصین رضي اللّٰه تعالیٰ عنه في الذي یزني بأم امرأته قد حرمتاعلیه جمیعاً. (مصنف عبدالرزاق:۷/ ۲۰۰/ ۱۲۷۷۶،باب الرجل یزنی بام

امرأته وابنتها واختها). قال الحافظ في "فتح الباري": ولا بأس باسناده.

(۲) أخبرنا عبد الرزاق قال: أخبرنا ابن جريج قال: سمعت عطاء يقول: إن زنى بأم امرأته أو ابنتها، حرمتا عليه جميعاً. (مصنف عبدالرزاق:۱۹۸/۷، باب الرجل يزنى بام امرأته وابنتها واختها).

(۳) عبد الرزاق عن معمر عن ابن جريج، وعن الشعبي عن عمرو عن الحسن قالا: إذا زنى الرجل بأم امرأته أو ابنة امرأته، حرمتا عليه جميعاً. (مصنف عبدالرزاق:۱۹۸/۷، باب الرجل يزنى بام امرأته وابنتها واختها).

(۴) عبد الرزاق عن إبراهيم بن محمد عن صفوان بن سليم عن عبد الله بن يزيد ــ مولى آل الأسود ــ أنه سأل ابن المسيب، وأباسلمة بن عبد الرحمن، وأبا بكر بن عبد الرحمن بن الحارث بن هشام، وعروة بن الزبير، عن الرجل يصيب المرأة حراماً، يصلح له أن يتزوج بابنتها؟ فقالوا: لا. (مصنف عبدالرزاق:۱۹۸/۷، باب الرجل يزنى بام امرأته وابنتها واختها).

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

(۵) عن إبراهيم وعامر: في رجل وقع على ابنة امرأته، قالا: حرمتا عليه كلاهما، وقال إبراهيم: وكانوا يقولون: إذا اطلع الرجل من المرأة على مالا يحل له، أو لمسها لشهوة، فقد حرمتا عليه جميعاً.

(۶) وعن عبد الكريم، عن عطاء قال: إذا أتى الرجل المرأة حراماً، حرمت عليه ابنتها، وإن أتى ابنتها حرمت عليه أمها.

(۷) عن عبد الله بن مسيح قال: سألت إبراهيم عن رجل فجر بأمة ثم أراد أن يتزوج أمها؟ قال: لا يتزوجها.

(۸) عن مجاهد قال: إذا قبلها أو لمسها أو نظر إلى فرجها حرمت عليه ابنتها.

(۹) وعن إبراهيم قال: إذا قبل الأم لم تحل له ابنتها، وإذا قبل ابنتها لم تحل له أمها. (مصنف ابن ابی شيبة:۹/۹۹-۱۰۰، ۳۷۰، المجلس العلمی).

بعض روایات میں ہے "لا يحرم حرام حلالاً" یعنی حرام چیز حلال چیز کو حرام نہیں کرتی ہے، مطلب یہ ہے کہ زنا سے نکاح حرام نہیں ہوتا تو زنا کی وجہ سے حرمتِ مصاہرت بھی ثابت نہیں ہونی چاہئے، اس کا جواب حضرت عطابن رباحؒ نے یہ دیا کہ باندی کے ساتھ زنا کیا پھر اس کو خرید لیا تو اس کے ساتھ وطی کرنا جائز ہے، نیز کسی عورت

کے ساتھ زنا کیا پھر اسی کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو جائز ہے حرام نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق میں ہے:

عن ابن جريج قال: سئل عطاء عن رجل كان يصيب امرأة سفاحاً، أينكح ابنتها؟ قال: لا، وقد اطلع على فرج أمها، فقال إنسان: ألم يكن يقال: لا يحرم حرام حلالاً؟ قال: ذلک في الأمة، كان يبغي بها ثم يبتاعها، أو يبغي بالحرة ثم ينكحها، فلا يحرم حينئذٍ ما كان صنع من ذلک. (مصنف عبدالرزاق: ۱۹۷/۷، باب الرجل يزنى بام امرأته وابنتها واختها).

الجوہر النقی میں ہے:

وقال ابن حزم: روينا عن مجاهد...ومن طريق شعبة عن الحكم بن عتبة قال: قال النخعي: إذا كان الحلال يحرم الحلال فالحرام أشد تحريماً، وعن الشعبي ما كان في الحلال حرام فهو في الحرام أشد، وعن ابن مغفل هي لاتحل له في الحلال فكيف تحل له في الحرام. (الجوهرالنقى: ۱۶۹/۷، باب الزنالايحرم الحلال، بيروت)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

عورت کا اپنی پوتی کے شوہر سے نکاح کا حکم:

سوال: عورت کے لیے اس کی پوتی کا شوہر محرم ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عورت کے لیے پوتی کا شوہر محرم ہے یعنی ابدی نکاح حرام ہے، نیز بیوی کی ماں، دادی، نانی سب محارم ہیں۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

وحرم بالمصاهرة بنت زوجته الموطوءة وأم زوجته وجداتها مطلقاً بمجرد العقد الصحيح. وفي الشامي: (قوله وجداتها مطلقاً) أي من قبل أبيها وأمها وإن علون، بحر.

(الدرالمختار مع الشامى: ۳/ ۳۰، فصل فى المحرمات، سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

القسم الثاني المحرمات بالصهرية: ـ وهي أربع فرق (الأول) أمهات الزوجات وجداتهن من قبل الأب والأم وإن علون. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۷۴ ـ وفتح القدير: ۳/ ۲۱۰، دارالفكر).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

جس جس سے نکاح ناجائز ہے وہ محرم، اور جس جس سے نکاح جائز ہے وہ نامحرم ہے۔ (فتاوی محمودیہ:۱۱/۳۳۰، مبوب ومرتب)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

علاتی بہن کی پوتی سے نکاح کا حکم:

سوال: علاتی بہن کی پوتی سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نسبی حرمت کی وجہ سے علاتی بہن کی پوتی سے نکاح ناجائز ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿حرمت عليكم أمهاتكم وبناتكم وأخواتكم وعماتكم وخالاتكم وبنات الأخ وبنات الأخت...﴾. (سورة النساء:الآية:٢٣).

ہدایہ میں ہے:

ولا بأخته ولا ببنات أخته ولا ببنات أخيه ولا بعمته ولا بخالته لأن حرمتهن منصوص عليها في هذه الآية، وتدخل فيها العمات المتفرقات والخالات المتفرقات بنات الأخوة المتفرقين لأن جهة الاسم عامة. (الهداية:٢/٣٠٧،فصل فه المحرمات).

وفي فتح القدير: وفي بنات الأخ والأخت وبناتهن وإن سفلن. (فتح القدير:٣/٢٠٩،فصل فى المحرمات، دار الفكر).

کتاب المبسوط میں ہے:

والسابع بنات الأخت تثبت حرمتهن بقوله تعالىٰ: ﴿وبنات الأخت﴾ ويستوي في ذلك أولاد بنات الأخت لأب وأم أو لأب أو لأم. (المبسوط للإمام السرخسیؒ:٥/٤٦٤،كتاب النكاح).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وأما الأخوات فالأخت لأب وأم والأخت لأم وكذا بنات الأخ والأخت وإن سفلن.

(الفتاوى الهندية:١/٢٧٣).

فتاوی دار العلوم میں ہے:

علاتی بہن کی پوتی حرام ہے:

تمام مفسرین اور علماء اہل سنت وجماعت اس پر متفق ہیں کہ آیتِ کریمہ ﴿ وبنات الأخت ﴾ سے ہر قسم کی بہن کی اولاد اور اولاد کی اولاد سے نکاح حرام ہے، یعنی خواہ بہن عینی حقیقی ہو یا علاتی یعنی صرف باپ شریک ہو، یا اخیافی یعنی صرف ماں میں شریک ہو۔ پس علاتی بہن کی پوتی سے نکاح قطعاً حرام ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۷/۳۱۶، مدلل ومکمل)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک شخص کے لیے اس کے والد کی مدخولہ یعنی سوتیلی ماں کی بہن محرم ہے یا نہیں؟ یعنی اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں والد کی مدخولہ یعنی سوتیلی ماں کی بہن محرم نہیں ہے، اس سے نکاح کرنے کی گنجائش ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿ وأحل لكم ماوراء ذلكم ﴾.

وفي روح المعاني للعلامة الآلوسي البغدادي الحنفي: ﴿ ما وراء ذلكم ﴾ إشارة إلى ما تقدم من المحرمات أي أحل لكم نكاح ما سواهن انفراداً وجمعاً. (روح المعانی: ۵/۴، القاهرة).

شامی میں ہے:

ولا تحرم بنت زوج الأم ولا أمه ولا أم زوجة الأب ولا بنتها. (شامی: ۳/۳۱، فصل فی المحرمات، سعید).

فتح القدیر میں ہے:

فلذا أجاز التزويج بأم زوجة الابن وبنتها، وجاز للابن التزوج بأم زوجة الأب وبنتها.

(فتح القدیر: ۳/۲۱۱، فصل فی المحرمات، دار الفکر).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

خالہ سے نکاح حرام ہے مگر خالہ وہ ہے جو حقیقی والدہ کی بہن ہو سوتیلی والدہ والد کی دوسری بیوی کی جو بہن ہے، وہ خالہ نہیں اس سے نکاح حرام نہیں لہذا لڑکے کا نکاح والد کی دوسری بیوی کی حقیقی بہن سے درست ہے، اگر کوئی اور رشتہ حرمت ورضاعت وغیرہ کا نہ ہو۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۱/۲۷۱، مبوب ومرتب)۔

فتاوی دارالعلوم دیو بند میں ہے:

دو بہنیں حقیقی ان میں سے ایک باپ کے نکاح میں ہو اور دوسری بیٹے کے نکاح میں یہ درست ہے شرعاً اس میں کچھ حرج نہیں، ﴿ وأحل لكم ما وراء ذلكم ﴾ میں داخل ہے، اصل یہ ہے کہ دو بہنوں کا ایک شخص کے نکاح میں اکٹھا ہونا منع ہے، باپ بیٹے کے نکاح میں ہونا ممنوع نہیں ہے۔ (فتاوی دارالعلوم: ۷/ ۱۷۶، مدلل ومکمل، دارالاشاعت).

احسن الفتاوی میں ہے:

سوال: زید کی زوجہ ہندہ کا انتقال ہوگیا، زید نے کسی عورت سے نکاح کیا اس عورت سے ایک لڑکا پیدا ہوا اب اس لڑکے کا نکاح زید کی زوجہ اولیٰ متوفیہ کی ہمشیرہ سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ہوسکتا ہے۔ (احسن الفتاوی: ۵/ ۸۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دو بھائیوں کا ماں بیٹی سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال: زید وعمر دو حقیقی بھائی ہیں، دونوں ایک ہی گھر میں زید ماں سے اور عمر بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس طرح نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اس طرح نکاح کرنا صحیح اور درست ہے، اور یہ آیتِ کریمہ: ﴿ وأحل لكم ما وراء ذلكم ﴾ میں داخل ہو کر حلال ہے، اور کوئی وجہ حرمت بھی موجود نہیں ہے۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

لڑکی کی شادی زید کے بھائی سے ہوئی اور لڑکی کی والدہ کی شادی زید سے ہوئی تو دونوں صحیح ہیں۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۱/ ۲۸۱، مبوب ومرتب).

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی دارالعلوم دیو بند: ۷/ ۱۷۶، مدلل ومکمل۔ وامداد الاحکام: ۲/ ۲۵۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ساس کی سوکن سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک شخص اپنی ساس کی سوکن سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی ساس کی سوکن محرمات میں سے ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ساس کی سوکن کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے، کیونکہ ساس کی سوکن بیوی کے نہ تو فروعات میں سے ہے اور نہ اصول میں سے ہے، بلکہ ﴿ وأحل لكم ما وراء ذلكم ﴾ میں داخل ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے:

المحرمات بالمصاهرة أربع فرق: الفرقة الأولىٰ:۔ أم الزوجة وجداتهامن قبل أبيها وأمها وإن علون، قال الله عزوجل: ﴿حرمت عليكم أمهاتكم...وأمهات نسائكم﴾

وأما الفرقة الثاية:۔ فبنت الزوجة وبناتهاوبنات بناتها وبنيها وإن سفلن لقول الله عزوجل: ﴿ وربائبكم اللّٰتي في حجوركم من نسائكم اللّٰتي دخلتم بهن ﴾. (بدائع الصنائع:۲/ ۲۵۸،سعيد۔وكذا فى الفتاوى الهندية:۱/ ۲۷٤،القسم الثاني المحرمات بالصهرية).

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

بیوی کے رہتے ہوئے سوتیلی ساس سے نکاح کرنا کیسا ہے؟

اگر وہ لڑکی جو بکر کے عقد میں آئی زید کی پہلی زوجہ کے شکم سے نہیں ہے،اور زید کی پہلی زوجہ بکر کی ساس حقیقی نہیں ہےتو نکاح بکر کا اس سے درست ہے،درمختار میں ہے:**فجاز الجمع بين امرأة وبنت زوجها.** (فتاوی دارالعلوم دیوبند:۷/ ۲۲۵،مدلل ومکمل)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ربیب کی مطلقہ بیوی سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک شخص کی عورت کا بیٹا ہے جو اگلے شوہر سے ہے،اس کی مطلقہ سے نکاح کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

یعنی ربیب کی مطلقہ بیوی کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ربیب کی مطلقہ بیوی کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے،کوئی وجہ حرمت کی موجود نہیں ہے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿ وأحل لكم ما وراء ذلكم ﴾

وفي روح المعاني للعلامة الآلوسي البغدادي الحنفي: ﴿ ما وراء ذلكم ﴾ إشارة إلى ما تقدم من المحرمات أى أحل لكم نكاح ما سواهن انفراداً وجمعاً. (روح المعانى:۵/ ٤،القاهرة).

شامی میں ہے:

قال الخير الرملي: ولا تحرم بنت زوج الأم ولا أمه، ولا أم زوجة الأب ولا بنتها ولا أم زوجة الابن ولا بنتها ولا زوجة الربيب ولا زوجة الراب. (فتاوى الشامى:۳/ ۳۱،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

والثالثة :ــ حليلة الابن وابن الابن وابن البنت وإن سفلوا دخل بها الابن أم لا، ولا تحرم حليلة الابن المتبنىٰ على الأب المتبنىٰ هكذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية:٢٧٤/١،القسم الثاني المحرمات بالصهرية ـو كذافي فتح القدير:٢١٢/٣،فصل في بيان المحرمات،دارالفكر).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

اپنی زوجہ کے پسر از شوہر ثانی کی زوجہ سے نکاح کرنا باوجود نکاح میں ہونے اس زوجہ کے درست ہے یعنی جمع کرنا درمیان ایک عورت کے اور اس کے پسر کی زوجہ کے شرعاً درست ہے۔(فتاویٰ دارالعلوم:۱۵۵/۷،مدلل ومکمل)۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیٹے کی ساس کے ساتھ نکاح کرنے کا حکم:

سوال: ایک لڑکی مسماۃ نذیرہ کی شادی احمد سے ہوئی اس کے بعد نذیرہ کے والدین کے درمیان طلاق ہوگئی اب احمد کے والد کا نکاح نذیرہ کی والدہ سے صحیح ہے یا نہیں؟ یعنی اپنے بیٹے کی ساس کے ساتھ نکاح کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں بیٹے کی ساس کے ساتھ نکاح کرنا درست ہے۔

شامی میں ہے:

قال الخير الرملي: ولا تحرم بنت زوج الأم ولا أمه، ولا أم زوجة الأب ولا بنتها ولا أم زوجة الابن ولا بنتها. (فتاوى الشامي:٣١/٣،سعيد).

فتح القدیر میں ہے:

فلذا أجاز التزويج بأم زوجة الابن وبنتها، وجاز للابن التزوج بأم زوجة الأب وبنتها.

(فتح القدير:٢١١/٣، فصل في المحرمات،دارالفكر).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

لڑکے کی ساس کے ساتھ باپ کا نکاح درست ہے یا نہیں؟

الجواب: ہاں، یہ رشتہ حرام نہیں حلال ہے۔(فتاویٰ رحیمیہ:۱۰۰/۲ـوفتاویٰ حقانیہ:۳۵۴/۴)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوتیلی ماں سے زنا کرنے پر حرمتِ مصاہرت کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے سوتیلی ماں سے زنا کیا تو حرمتِ مصاہرت ثابت ہوگی یا نہیں؟ یعنی وہ عورت اس کے شوہر کے لیے حرام ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جائے گی یعنی سوتیلی ماں اس کے شوہر پر حرام ہو جائے گی۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

قال في البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة على أصول الزاني وفروعه نسباً ورضاعاً وحرمة أصولها وفروعها على الزاني نسباً ورضاعاً كما في الوطئ الحلال ويحل لأصول الزاني وفروعه أصول المزني بها وفروعها. (فتاوی الشامی:۳/۳۲،فصل فی المحرمات،سعید).

فتح القدیر میں ہے:

وثبوت الحرمة بمسها مشروط بأن يصدقها أو يقع في أكبر رأيه صدقها، وعلى هذا ينبغي أن يقال في مسه إياها، لا تحرم على أبيه وابنه إلا أن يصدقاه أو يغلب على ظنهما صدقه. (فتح القدیر:۳/۲۲۲،فصل فی بیان المحرمات،دارالفکر).

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

وتحرم الموطوءة على أصول الواطئ وفروعه، ويحرم على الواطئ أصولها وفروعها وكذلك النظر إلى داخل الفرج بشهوة واللمس بشهوة. (الفتاوی التاتارخانیة:۲/۶۱۸،اسباب التحریم،ادارۃ القرآن).

فتاوی دارالعلوم میں ہے:

سوال: اگر کوئی شخص اپنے باپ کی زوجہ یعنی سوتیلی ماں سے زنا کرے تو وہ عورت اس کے باپ کے واسطے حلال رہے گی یا نہیں؟

الجواب: وہ عورت باپ کے لیے حلال نہ رہے گی، لیکن اگر ثبوت زنا کا شہادتِ شرعیہ سے نہ ہو اور باپ اس کو تسلیم نہ کرے تو پھر باپ کے ذمہ علیحدہ کرنا اس کا لازم نہیں ہے، اور اس کے حق میں حرمت ثابت نہ ہوگی۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند:۷/۳۴۱،مدلل ومکمل).

مزید ملاحظہ ہو: کفایت المفتی:۵/۱۸۰، دارالاشاعت۔ وفتاوی حقانیہ:۴/۴۱۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

خالو سے زنا کرانے پر حرمتِ مصاہرت کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت نے اپنی خالہ کے شوہر یعنی خالو سے زنا کیا تو اب دونوں کے نکاح کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زنا کاری کے سنگین گناہ کا بار توبہ کرنے تک ضرور دونوں کی گردن پر رہے گا، لیکن دونوں کے نکاح پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، نکاح برقرار رہے گا، اس لیے کہ حرمتِ مصاہرت کا تعلق صرف اصول وفروع تک محدود ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

قال في البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة على أصول الزاني وفروعه نسباً ورضاعاً وحرمه أصولها وفروعها على الزاني نسباً ورضاعاً كما في الوطئ الحلال ويحل لأصول الزاني وفروعه أصول المزني بها وفروعها. (فتاوى الشامي:۳/۳۲،فصل فی المحرمات،سعید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سالی سے زنا کرنے پر حرمتِ مصاہرت کا حکم:

سوال: دو بہنیں ہیں، دونوں کی شادی ہو چکی ہے اب چھوٹی بہن کا شوہر بڑی بہن کے ساتھ ناجائز کاموں میں ملوث ہے، حتی کہ زنا کاری تک نوبت پہونچ چکی ہے، تو کیا ایسی حالت میں اس کی اصلی عورت نکاح سے خارج ہو جائے گی یا نہیں؟ اور اگر وہ نکاح سے خارج ہو جائے تو اس کو اب کیا کرنا چاہئے؟ شریعت کی روشنی میں تشفی بخش جواب مرحمت فرمائے، عین کرم ہوگا۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چھوٹی بہن کے شوہر کا بڑی بہن کے ساتھ ملوث ہونا اور زنا کاری کرنا ناجائز بلکہ حرام ہے، اس فعل بد سے توبہ کرنا لازم ہے، اور بڑی بہن سے خلط واختلاط رکھنا ہی نہیں چاہئے، اور اس سے دور رہنا ضروری ہے، تاہم شرعاً دونوں بہنوں کے نکاح پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوا، اور ہر ایک بہن اپنے شوہر کے نکاح میں بدستور رہے گی۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وفي الخلاصة: وطئ أخت امرأته لا تحرم عليه امرأته. وفي الشامي: هذا محترز

التقييد بالأصول والفروع وقوله: لا تحرم أي لا تثبت حرمة المصاهرة، فالمعنى: لا تحرم حرمة مؤبدة. (الدرالمختارمع الشامی:۳/۳٤،فصل فی المحرمات،سعید).

البحرالرائق میں ہے:

أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة على أصول الزاني وفروعه نسباً ورضاعاً وحرمه أصولها وفروعها على الزاني نسباً ورضاعاً كما في الوطئ الحلال ويحل لأصول الزاني وفروعه أصول المزنى بها وفروعها. (البحرالرائق:۳/۱۰۱،فصل فی المحرمات،کوئٹہ).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

سالی سے زنا کرنے میں زوجہ اس کی اس پر حرام نہیں ہوئی، کیونکہ کوئی وجہ حرمت کی اس میں پائی نہیں گئی۔
(فتاویٰ دارالعلوم:۷/۳۲۸،۶۴۴، مدلل ومکمل۔وکذافی فتاویٰ محمودیہ:۱۱/۴۰۹، مبوب ومرتب)۔واللہ ﷻ اعلم۔

چچی کوشہوت سے چھونے سے حرمتِ مصاہرت کاحکم:

سوال: ایک شخص کی چچی نے اس پر ہاتھ رکھا یعنی بغیر کسی حائل کے جسم کومس کیا اور اس شخص کو اس وقت شہوت ہوگئی، تو اب اس چچی کی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مس بالشہوت ہونے کی بناپر حرمتِ مصاہرت ثابت ہوگئی، لہٰذا اس چچی کی لڑکی سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ بشرطیکہ شہوت حرمتِ مصاہرت کی حد تک پہونچ گئی ہو جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

شامی میں ہے:

وحرم أيضاً بالصهرية...وأصل ممسوسته بشهوة لأن المس والنظرسبب داع إلى الوطئ فيقام مقامه في موضع الاحتياط، هداية، واستدل لذلک في الفتح بالأحاديث والآثارعن الصحابة والتابعين، قوله بشهوة أي ولومن أحدهما...قوله بلا حائل لا يمنع الحرارة أي و لو بحائل الخ، فلو كان مانعاً لا تثبت الحرمة، كذا في أكثرالكتب، قوله و أصل ما سته أي بشهوة قال في الفتح: وثبوت الحرمة بلمسها مشروط بأن يصدقها، ويقع في أكبر رأيه صدقها. (الدرالمختارمع الشامی:۳/۳۲،فصل فی المحرمات،سعید).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

القسم الثاني المحرمات بالصهرية: ۔ وكما تثبت هذه الحرمة بالوطء تثبت بالمس والتقبيل والنظر إلى الفرج بشهوة كذا في الذخيرة،...ثم لا فرق في ثبوت الحرمة بالمس بين كونه عامداً أوناسياً أومكرهاً أومخطئاً كذا في فتح القدير، أونائماً هكذا في معراج الدراية،...ثم المس إنما يوجب حرمة المصاهرة إذا لم يكن بينهما ثوب أما إذا كان بينهما ثوب فإن كان صفيقاً لا يجد الماس حرارة الممسوس لا تثبت حرمة المصاهرة وإن انتشرت آلته بذلك وإن كان رقيقاً بحيث تصل حرارة الممسوس إلى يده تثبت كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۷٤، ۲۷٥، الباب الثالث في بيان المحرمات).

فتاوی دارالعلوم میں ہے:

چچی کا بوسہ اگر شہوت سے لیا ہے تو حرمتِ مصاہرت ثابت ہوگئی پس زید کو اس کی دختر سے نکاح کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۷/ ۳۴۱، مدلل ومکمل، دارالاشاعت).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

اگر لڑکی کے جسم پر کپڑا نہ یا ہو مگر ایسا پتلا ہو کہ جسم کی حرارت محسوس ہوگئی تو حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جائے گی۔ (فتاوی رحیمیہ: ۵/ ۲۵۵).

احسن الفتاوی میں ہے:

جانبین میں سے کسی ایک میں بوقتِ مس شہوت پیدا ہو جائے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ (احسن الفتاوی: ۵/ ۷۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حرمتِ مصاہرت ثابت ہونے کے لیے شہوت کی حد:

سوال: جس شہوت سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے اور نکاح حرام ہو جاتا ہے اس شہوت کی کیا حد ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں شہوت کی حد ایسے مرد میں جس کی صحت ایسی ہو کہ عموماً بوقتِ شہوت اسے انتشار رہتا ہو یہ ہے کہ بوقتِ مس انتشار ہو جائے اور پہلے سے انتشار ہو تو اس میں زیادتی ہو جائے، ایسے مرد میں جسے صحت کی خرابی کے باعث بوقتِ مس شہوت میں عموماً انتشار نہ ہوتا ہو اور اسی طرح عورت میں حدِ

شہوت یہ ہے کہ قلب میں حرکت مشوشہ پیدا ہو جائے، اگر پہلے سے حرکت ہوتو زیادہ ہو جائے۔(احسن الفتاوی: ۷۶/۵).

درمختار میں ہے:

والعبرة للشهوة عند المس والنظر لا بعدهما وحدها فيهما تحرك آلته أو زيادته به يفتىٰ وفي امرأة ونحو شيخ كبير تحرك قلبه أو زيادته وفي الجوهرة: لا يشترط في النظر للفرج تحرك آلته به يفتىٰ، هذا إذا لم ينزل فلو أنزل مع مس أونظر فلا حرمة به يفتىٰ، وفي الشامي: قوله به يفتىٰ، وقيل :حدها أن يشتهي بقلبه إن لم يكن مشتهياً أو يزداد إن كان مشتهياً ولا يشترط تحرك الآلة وصححه في المحيط والتحفة وفي غاية البيان وعليه الاعتماد والمذهب الأول بحر، قال في الفتح: وفرع عليه ما لو انتشر وطلب امرأة فأولج بين فخذي بنتهاخطأً لا تحرم أمها ما لم يزداد الانتشار، قوله وفي امرأة ونحو شيخ كبير، قال في الفتح: ثم هذا الحد في حق الشاب أما الشيخ والعنين وحدهما تحرك قلبه أو زيادته إن كان متحركاً لا مجرد ميلان النفس فإنه يوجد فيمن لاشهوة له أصلاً كالشيخ الفاني، ثم قال: ولم يحدوا الحد المحرم منها أي من المرأة وأقله تحرك القلب على وجه يشوش الخاطر قال ط: ولم أرحكم الخنثى المشكل في الشهوة ومقتضى معاملته بالأضر ان يجرى عليه حكم المرأة. (الدرالمختارمع الشامی:۳۳/۳،فصل فی المحرمات،سعید).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

والشهوة تعتبرعندالمس والنظر حتى لو وجدا بغير شهوة ثم اشتهى بعد الترك لاتتعلق به الحرمة وحد الشهوة في الرجل أن تنتشر آلته أوتزداد انتشاراً إن كانت منتشرةً كذا في التبيين، وهو الصحيح كذا في جواهرالأخلاطى، وبه يفتىٰ كذا في الخلاصة، هذا الحد إذا كان شاباً قادراً على الجماع فإن كان شيخاً أوعنيناً فحد الشهوة أن يتحرك قلبه بالاشتهاء إن لم يكن متحركاً قبل ذلك ويزداد الاشتهاء إن كان متحركاً كذا في المحيط، وحد الشهوة في النساء والمجبوب هو الاشتهاء بالقلب والتلذذ به إن لم يكن وإن كان فازدياده كذا في شرح النقاية للشيخ أبي المكارم، و وجود الشهوة من أحدهما يكفي وشرطه أن لاينزل حتى لو أنزل عند المس أو النظر لم تثبت به الحرمة المصاهرة كذا في التبيين، قال

الصدر الشهيد: وعليه الفتوىٰ كذا في الشمني شرح النقاية. (الفتاوی الهندية:۱/۲۷۵،القسم الثانی المحرمات بالصهرية)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بوقتِ مس شہوت نہ ہوتو حرمتِ مصاہرت کاحکم:

سوال: ایک شخص نے چچی سے کپڑا وغیرہ کچھ لیتے وقت اس کے ہاتھ کوچھولیا بغیر کسی شہوت کے پھر بعد میں یہ وسوسہ رہا یہاں تک کے شہوت ہوئی اور انتشار بھی ہوا،اب یہ شخص اس چچی کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو نکاح کرسکتا ہے یانہیں؟ جب کہ اس کو یقین ہے کہ مس کے وقت بالکل شہوت نہیں تھی۔ برائے مہربانی حکم شرعی سے مطلع فرمائے۔

الجواب: صورتِ مسؤلہ میں حرمتِ مصاہرت ثابت نہ ہونے کی وجہ سے شخصِ مذکور کے لیے چچی کی لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ بعد میں شہوت کا اعتبار نہیں مس کے وقت شہوت کا اعتبار ہے جونہیں پائی گئی۔

ملاحظہ ہوفتح القدیر میں ہے:

قوله بشهوة في موضع الحال فيفيد اشتراط الشهوة حال المس، فلو مس بغير شهوة ثم اشتهى عن ذلك المس لا تحرم عليه. (فتح القدير:۳/۲۲۲،فصل فی بیان المحرمات،دارالفکر)۔

البحر الرائق میں ہے:

والعبرة لوجود الشهوة عندالمس والنظرحتى لو وجدا بغير شهوة ثم اشتهى بعد الترك لاتتعلق به حرمة. (البحرالرائق:۳/۱۰۱،فصل فی المحرمات،کوئٹہ)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

والشهوة تعتبرعند المس والنظرحتى لو وجدا بغير شهوة ثم اشتهى بعد الترك لاتتعلق به الحرمة. (الفتاوی الهندية:۱/۲۷۵،القسم الثانی المحرمات بالصهرية۔ومثله فی الشامی:۳/۳۳،فصل فی المحرمات،سعید)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

رضاعی علاتی بھائی بہن کے نکاح کاحکم:

سوال: زید کی ایک بیوی نے ایک لڑکی کودودھ پلایا زید کی دوسری بیوی کاایک لڑکا ہے کیادونوں کانکاح جائز ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زید کا نسبی لڑکا اور رضاعی لڑکی آپس میں رضاعی علاتی بھائی بہن ہوئے اور جس طرح نسبی علاتی بھائی بہن کا آپس میں نکاح جائز نہیں، اسی طرح رضاعی علاتی بھائی بہن کا نکاح بھی جائز نہیں۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة. (رواه البخاري۔مشكاة شريف:۲/۲۷۳).

ہدایہ میں ہے:

ولبن الفحل يتعلق به التحريم وهو أن ترضع المرأة صبية فتحرم هذه الصبية على زوجها وعلى آبائه وأبنائه ويصير الزوج الذى نزل لها منه اللبن أباً للمرضعة. (الهداية:۲/۳۵۱).

شامی میں ہے:

ويثبت أبوة زوج مرضعة إذا كان لبنها منه له و إلا لا، فحرم منه مايحرم من النسب رواه الشيخان، قوله أبوة زوج مرضعة لبنها منه المراد به اللبن الذي نزل منها بسبب ولادتها من رجل زوج. (الدرالمختار مع ردالمحتار:۳/۲۱۳،سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وهذه الحرمة كما تثبت في جانب الأم تثبت في جانب الأب وهو الفحل الذي نزل اللبن بوطئه كذا في الظهيرية. ويحرم على الرضيع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جميعاً حتى أن المرضعة لو ولدت من هذا الرجل أوغيره قبل هذا الإرضاع أو بعده أو أرضعت رضيعاً أو ولد لهذا الرجل من غير هذه المرأة قبل هذا الإرضاع أو بعده أو أرضعت امرأة من لبنه رضيعاً فالكل إخوة الرضيع وأخواته وأولادهم وأولاد إخوته وأخواته. (الفتاوى الهندية:۱/۳۴۳).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاوی محمودیہ:۱۱/۳۲۴۔۳۲۸،مبوب ومرتب۔واللہ ﷻ اعلم۔

حقیقی بھائی کی رضاعی بہن کے ساتھ نکاح کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے حقیقی بھائی نے اس کی خالہ کا بچپن میں دودھ پیا تو اس خالہ کی لڑکی کے ساتھ وہ نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی حقیقی بھائی کی رضاعی بہن کے ساتھ نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں حقیقی بھائی کی رضاعی بہن کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے، یعنی جس نے خالہ کا دودھ نہیں پیا وہ خالہ کی لڑکی کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے، اور جس نے بچپن میں خالہ کا دودھ پیا وہ خالہ کی لڑکی کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتا۔

ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

وتحل أخت أخيه رضاعاً ونسباً مثل الأخ لأب إذا كانت له أخت من أمه يحل لأخيه من أبيه أن يتزوجها كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية: ۱/۳۴۳، كتاب الرضاع).

درمختار میں ہے:

وتحل أخت أخيه رضاعاً يصح اتصاله بالمضاف كأن يكون له أخ نسبي له أخت رضاعية. (الدر المختار: ۳/۲۱۷، باب الرضاع، سعید۔ وكذا في تبيين الحقائق: ۲/۱۸۴، كتاب الرضاع، امداديه۔ وفتاوى محموديه: ۱۱/۳۳۷، مبوب ومرتب)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

فصل سوم

غیر مسلم اور گمراہ فرقوں سے نکاح کا بیان

مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک مسلمان عورت نے غیر مسلم مرد سے نکاح کیا ایسے نکاح کو شریعت معتبر قرار دیتی ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت مطہرہ میں مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم مرد سے نہیں ہوسکتا، لہٰذا یہ نکاح غیر معتبر ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو أعجبکم﴾. (سورۃ البقرۃ:الآیۃ:۲۲۱).

بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها: ۔ إسلام الرجل إذا کانت المرأۃ مسلمۃ فلا یجوز إنکاح المؤمنۃ الکافر لقولہ تعالیٰ: ﴿ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا﴾، ولأن في إنکاح المؤمنۃ الکافر خوف وقوع المؤمنۃ في الکفر، لأن الزوج یدعوها إلی دینہ والنساء في العبادات یتبعن الرجال فیما یؤثروا من الأفعال ویقلدونهم في الدین إلیہ وقعت الإشارۃ في آخر الآیۃ بقولہ عزوجل: ﴿أولئک یدعون إلی النار﴾. (بدائع الصنائع:۲/۲۷۱،سعید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سنی لڑکے کا شیعہ لڑکی سے نکاح کا حکم:

سوال: کیا سنی لڑکے کا نکاح شیعہ لڑکی کے ساتھ جائز ہے یا نہیں؟ اوراس کے برعکس کیا حکم ہے؟ یعنی سنی لڑکی کا نکاح شیعہ لڑکے کے ساتھ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جوشیعہ قطعیاتِ اسلام کے خلاف کوئی عقیدہ رکھتے ہوں وہ کافر ہیں، ان کے ساتھ رشتۂ مناکحت جائز اور درست نہیں ہے۔

عام طور پر شیعہ درجِ ذیل کفریہ عقائد رکھتے ہیں:

(۱) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی الوہیت کا عقیدہ۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگانا۔

(۳) حضرت جبرئیل علیہ السلام سے غلطی ہونے کا عقیدہ۔

(۴) تحریفِ قرآن کا عقیدہ۔

(۵) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحابیت کا منکر ہونا۔ وغیرہ وغیرہ....

لہٰذا کفریہ عقائد رکھنے والے گمراہ فرقہ لوگوں کے ساتھ نکاح وغیرہ سے اجتناب لازم ہے، اور ایسے لوگوں کا حکم مرتد کی طرح ہے اور مرتد کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں ہے۔

نیز فقہاء نے کفریہ عقیدہ رکھنے والوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولوقذف عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها بالزنى كفر باللّٰه ...من أنكر إمامة أبي بكر الصديق رضي اللّٰه تعالىٰ عنه فهو كافر، وكذلک من أنكر خلافة عمر رضي اللّٰه تعالىٰ عنه...ويجب إكفار الروافض في قولهم برجعة الأموات إلى الدنيا وتناسخ الأرواح وبانتقال روح الإله إلى الأئمة، وبقولهم في خروج إمام باطن وبتعطيلهم الأمر والنهي إلى أن يخرج الإمام الباطن، وبقولهم إن جبرئيل عليه السلام غلط في الوحي إلى محمد صلى اللّٰه عليه وسلم دون علي بن أبي طالب رضي اللّٰه تعالىٰ عنه، وهؤلاء القوم خارجون عن الملة الإسلام وأحكامهم أحكام المرتدين، كذا في الظهيرية. (الفتاوی الهندية: ٢/ ٢٦٤، الباب التاسع فی احکام المرتدين۔ ومثله فی الفتاوی التاتارخانية: ٥/ ٥٣٨، کتاب احکام المرتدين، ادارة القرآن).

نیز شیعوں کی کتابوں میں بھی مذکور ہے کہ ان کا نکاح سنیوں کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں فروع کافی (شیعہ کی کتاب ہے) میں ہے:

قال أبوعبد اللّٰه: لا يزوج المؤمن الناصبة ولا يتزوج الناصب المؤمنة...عن أبي عبد اللّٰه قال: سأله أبي وأنا أسمع عن النكاح اليهودية والنصرانية فقال: نكاحهما أحب إلي من نكاح الناصبة. (فروع الكافي:٥/٣٤٨-٣٥١،باب مناكحة النصاب والشكاك).

شیعہ سنیوں کو ناصبی کہتے ہیں ملاحظہ ہو عقائد الشیعہ میں ہے:

"والناصب" في عقيدة الشيعة هو الذي يناصب آل البيت العداء، وهم أهل السنة جميعاً، لأنهم حسب معتقد الشيعة، قد ناصبوا أمير المؤمنين العداء واعتصبوا حقه في الخلافة، والخميني يعد أهل السنة من النواصب. (عقائد الشيعة فی المیزان:ص١٣٥، عقیدة التولی والتبری والنواصب..از محمد کامل الهاشمی)۔**واللہ تعالیٰ اعلم۔**

شیعہ یا قادیانی سے عدم جوازِ نکاح پر اشکال اور جواب:

سوال: اگر کوئی قادیانی یا شیعہ کی لڑکی سے نکاح کرے تو کیوں ناجائز ہے؟ حالانکہ یہ مرتد نہیں ہوئے باپ مرتد ہوا تو یہ اہل کتاب کے حکم میں کیوں نہیں؟ جب کہ بظاہر قرآن وحدیث کو بھی مانتے ہیں اور کتابی بالکل نہیں مانتے؟

الجواب: اہل کتاب وہ ہیں جو دین اسلام کو نہیں مانتے ہوں اور عیسائی یا یہودی ہوں، لیکن جو لوگ اپنے آپ کو اسلام کا ایک فرقہ سمجھ کر اسلام کی مخالفت اور جڑیں کاٹتے ہوں ایسے لوگ زندیق کہلاتے ہیں ان کے ساتھ رشتہ مناکحت قائم کرنے کی گنجائش نہیں، زندیق اور ملحد اہل کتاب کے علاوہ ہیں، نیز علماء نے شیعہ اور قادیانیوں کے عقائد کی تحقیق فرما کر ان کو مرتد قرار دیا ہے اور مرتد کے ساتھ بھی نکاح کا رشتہ جوڑنا جائز نہیں ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وكل من يعتقد ديناً سماوياً وله كتاب منزل كصحف إبراهيم عليه السلام وشيث عليه السلام وزبور داود عليه السلام فهو من أهل الكتاب فتجوز مناكحتهم وأكل ذبائحهم كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية:القسم الرابع المحرمات بالشرك:١/٢٨١).

گمراہ فرقوں سے نکاح جائز نہیں ہے۔ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولا يجوز نكاح المجوسيات والوثنيات...ويدخل في عبدة الأوثان عبدة الشمس والنجوم والصور التي استحسنوها والمعطلة والزنادقة، والباطنية والإباحية وكل مذهب يكفر به معتقده كذا في فتح القدير. (الفتاوی الهندية:القسم الرابع المحرمات بالشرك:۱/۲۸۱).

نیز مذکور ہے:

ولوقذف عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها بالزنى كفر باللّٰه...من أنكر إمامة أبي بكر الصديق رضي اللّٰه تعالىٰ عنه فهو كافر، وكذلك من أنكرخلافة عمر رضي اللّٰه تعالىٰ عنه...ويجب إكفار الروافض في قولهم برجعة الأموات إلى الدنيا وتناسخ الأرواح وبانتقال روح الإله إلى الأئمة، وبقولهم في خروج إمام باطن وبتعطيلهم الأمر والنهي إلى أن يخرج الإمام الباطن، وبقولهم إن جبرئيل عليه السلام غلط في الوحي إلى محمد صلى اللّٰه عليه وسلم دون علي بن أبي طالب رضي اللّٰه تعالىٰ عنه، وهؤلاء القوم خارجون عن الملة الإسلام وأحكامهم أحكام المرتدين كذا في الظهيرية. (الفتاوی الهندية:۲/۲۶۴،الباب التاسع فی احکام المرتدین۔ومثله فی الفتاوی التاتارخانية:۵/۵۳۸،کتاب احکام المرتدین، ادارة القرآن).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

جولوگ اسلام سے قادیانیت کی طرف گئے ہیں وہ تو مرتد ہیں اوران سے نکاح کے جواز کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،لیکن جولوگ نسلی طور پر قادیانی ہیں وہ بھی زندیق اور بددین ہیں اوران سے بھی نکاح جائز نہیں،اسی بناپر فقہاءؒ نے اہل قبلہ سے ہونے کے باوجود معتزلہ سے نکاح کی اجازت نہیں دی ہے۔**المناكحة بين أهل السنة وأهل الاعتزال لا يجوز.** (خلاصة الفتاوی:۲/۶) اس لیے قادیانی اہل کتاب کے حکم میں نہیں ہیں بلکہ زندیق ہیں اوران سے کسی قسم کا شادی بیاہ کا تعلق جائز نہیں۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۸۶،نعیمیہ دیوبند).

احسن الفتاوی میں ہے:

شیعہ عورت مسلمان مرد کے لیے حلال نہیں اس لیے کہ شیعہ کافر ہیں،بعض کے خیال میں شیعہ اہل کتاب ہیں،معہذا بوجوہِ ذیل شیعہ عورت سے نکاح جائز نہیں:

(۱)اکثر علماء شیعہ کو اہل کتاب شمار نہیں کرتے،لہٰذا احتیاط واجب ہے۔

(۲)ان کے نزدیک صرف وہ شیعہ اہل کتاب ہے جس کا باپ اوردادا بھی شیعہ ہو،اگر کوئی مسلمان شیعہ ہوگیا تو وہ اوراس کی صلبی اولاد بحکم اہل کتاب نہیں، بلکہ مرتد ہے،اورایسی عورت کے ساتھ نکاح حرام ہے،اگر شیعہ عورت

سے نکاح کی اجازت ہوگئی تو بدوں اس تحقیق کے کہ یہ شیعہ عورت اہل کتاب سے ہے یا مرتد ہے نکاح ہونے لگیں گے، اس طرح حرام کاری کا دروازہ کھل جائے گا۔

(۳) عوام کی اکثریت پہلے ہی سے شیعہ کو مسلمانوں کا فرقہ سمجھ رہی ہے شیعہ عورت سے نکاح کی اجازت عوام کے اس غلط عقیدہ کی تائید ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں بعید نہیں کہ جاہل لوگ مسلمان عورت کا نکاح شیعہ مرد سے کردیں، جو قطعاً حرام ہے، شیعہ کو مسلمان سمجھنے کے اور بھی خطرناک مفاسد ہیں ان کے ساتھ میل جول سے ایمان پر سخت خطرہ ہے.....

ان وجوہ کی بناپر شیعہ عورت سے نکاح کا ہرگز کوئی جواز نہیں۔ (احسن الفتاوی: ۵/۹۰)۔

مزید ملاحظہ ہو: فتاوی محمودیہ: ۱۰/۳۳۰، مبوب ومرتب۔ وفتاوی فریدیہ: ۴/۴۷۶، ۴۷۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کمیونسٹوں (communist) کے ساتھ نکاح کا حکم:

سوال: شریعت میں کمیونسٹوں کے ساتھ رشتہ نکاح قائم کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب: کمیونزم فکرو اعتقاد سے لے کر معیشت تک ہر باب میں ایک مستقل نظام اور تصور رکھتا ہے اس کی فکری بنیاد الحاد اور مذہب وآخرت سے انکار ہے، اس طرح جو آدمی ان تمام نظریات کے ساتھ کمیونسٹ ہو وہ نہ مسلمان ہی باقی رہتا ہے، اور نہ اس کا شمار اہل کتاب ہی میں کیا جاسکتا ہے، وہ کافروں کے زمرہ میں ہے، اور ان سے نکاح مطلقاً جائز نہیں ہے۔ نیز وہ لوگ ملک شخصی کے بھی منکر ہیں جب کہ ملک شخصی سے قرآن وحدیث مملو ہے تو اس کا انکار بھی قرآن وحدیث کا انکار ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

لا يجوز نكاح المجوسيات والوثنيات...والمعطلة والزنادقة والباطنية والاباحية وكل مذهب يكفر معتقده كذا في فتح القدير. (الفتاوى الهندية: القسم الرابع المحرمات بالشرك، ۱/۲۸۱)۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فتاوی محمودیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

کمیونزم کی ابتداء تو خدا اور دین سے بغاوت پر ہے، نیز اعتقاد کے اعتبار سے صراحۃً اسلام کے خلاف ہے، کمیونزم پر بحث کرتے ہوئے ''حکم الاسلام فی الاشتراکیۃ'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''إن العقيدة الأساسية للنظام الاشتراكي هي العقيدة المادية التي تقول: إن المادة هي أصل الأشياء، ولاشيء لغير المادة، وهذا يعني إنكار وجود الخالق العظيم سبحانه وتعالىٰ،

وبالتالي إنكار كل دين سماوي واعتبارها الإيمان بذلك أفيوناً يخدر الشعوب". ص۱۱۹،
(فتاویٰ محمودیہ:۲/۱۳۶، مبوب ومرتب)۔

مزید ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل:۱/۲۸۵۔ ومکالمہ بین المذاہب "کمیونزم" از ۲۶۱ تا ۲۶۹، مکتبہ فاروقیہ)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

ہندو عورت سے نکاح باطل ہے:

سوال: اگر کسی شخص نے ہندو عورت کے ساتھ نکاح کیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ہندو عورت کے ساتھ مسلمان مرد کا نکاح باطل ہے اس نکاح سے علیحدگی ضروری ہے، اور اولاد بھی ثابت النسب نہ ہوگی۔

ملاحظہ فرمائیں شامی میں ہے:

قلت: وفي مجمع الفتاوى: نكح كافر مسلمة فولدت منه لايثبت نسبه منه ولا تجب العدة لأنه نكاح باطل. قوله لأنه نكاح باطل أي فالوطئ فيه زنا، لا يثبت به النسب، بخلاف الفاسد فإنه وطئ بشبهة فيثبت به النسب ولذا تكون بالفاسد فراشاً لا بالباطل. (الدرالمختار مع الشامي:۳/۵۵۵، سعيد).

مبسوط میں ہے:

قال: وإذا تزوج الذمي مسلمة فرق بينهما لقوله تعالىٰ: ﴿ولاتنكحوا المشركين حتى يؤمنوا﴾ وإن أسلم بعد النكاح لم يترك على نكاحه لأن أصل النكاح كان باطلاً فبالإسلام لا ينقلب صحيحاً .(المبسوط للامام السرخسيؒ :۵/۴۵).

شامی میں ہے:

وفي المحيط :تزوج ذمي مسلمة فرق بينهما.(فتاوى الشامي :۲/۱۳۲، سعيد).

فتاوی عالمگیری میں ہے:

لا يجوز نكاح المجوسيات والوثنيات وسواء في ذلك الحرائر منهن والإماء كذا في السراج الوهاج، ويدخل في عبدة الأوثان عبدة الشمس والنجوم والصور التي استحسنوها ... وكل مذهب يكفر معتقده كذا في فتح القدير. (الفتاوى الهندية:القسم الرابع المحرمات بالشرك، ۱/۲۸۱)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

نکاحِ فاسد اور باطل میں فرق:

سوال: نکاحِ فاسد اور باطل میں کیا فرق ہے؟

الجواب: نکاحِ باطل وہ ہے جس میں محل عقد ہی مفقود ہو اور نکاحِ فاسد میں محل عقد تو موجود ہو لیکن عقد نکاح کی شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو۔ علامہ سید احمد طحطاویؒ کی مثالوں سے یہی واضح ہوتا ہے، نیز حضرت مفتی رشید احمد صاحب کے فتویٰ کا بھی یہی خلاصہ سمجھ میں آتا ہے ورنہ فقہاء کے مابین شدید اختلاف ہے، علامہ شامیؒ نے چند مقامات پر اس کا تذکرہ فرمایا ہے، بعض مواقع میں عدم فرق تحریر فرمایا ہے، لہٰذا اس مسئلہ میں علامہ طحطاوی کی عبارت واضح ہے اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں طحطاوی علی الدر المختار میں ہے:

وعدة المنكوحة نكاحاً فاسداً كنكاح بغير شهود، فلا عدة في باطل مثاله: تزوج المتزوجة عالماً بذلك . (حاشية الطحطاوي على الدرالمختار:۲/۲۲۱).

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر گواہوں کے نکاح فاسد ہے اس لیے کہ محل موجود ہے لیکن شرط نکاح (دو گواہ) مفقود ہے اور شادی شدہ سے نکاح باطل ہے، کیونکہ محل ہی مفقود ہے۔

نیز مجمع الفتاویٰ اور مبسوط کی عبارات سے بھی واضح ہے کہ کافر کا مسلم کے ساتھ نکاح باطل ہے اور زنا کے حکم میں ہے کیونکہ محل مفقود ہے۔

شامی میں ہے:

ويجب مهر المثل في نكاح الفاسد وهو الذي فقد شرطاً من شرائط الصحة كشهود ومثله تزوج الأختين معاً ونكاح الأخت في عدة الأخت ونكاح المعتدة والخامسة في عدة الرابعة...عن مجمع الفتاوى: نكح كافر مسلمة فولدت منه لايثبت النسب منه ولا تجب العدة لأنه نكاح باطل.... (فتاوى الشامي:۳/۱۳۲).

مبسوط میں ہے:

قال: وإذا تزوج الذمي مسلمة فرق بينهما لقوله تعالىٰ: ﴿ولا تنكحوا المشركين حتى يؤمنوا﴾ وإن أسلم بعد النكاح لم يترك على نكاحه لأن أصل النكاح كان باطلاً فبالإسلام لا ينقلب صحيحاً. (المبسوط للامام السرخسيؒ:۵/۴۵).

احسن الفتاوی میں ہے:

حاصل یہ ہے کہ نکاح باطل وفاسد کی تعریف بندہ جہاں تک عبارات میں غور کرنے سے سمجھا ہے کہ اگر بلالحاظ خصوصیت عاقد فی نفسہ محل عقد ہی موجود نہ ہو تو نکاح باطل ہے کنکاح منکوحة الغیر مع العلم بأنها متزوجة، کیونکہ آنِ واحد میں اجتماع الملکین ناممکن ہے اور اگر محل عقد تو موجود ہے مگر خصوصیت عاقد یا فقدانِ شرط کی وجہ سے ممنوع ہے تو نکاح فاسد ہوگا، کنکاح المحارم، یہ تعریف بیع باطل وفاسد سے قریب تر ہونے کے علاوہ عباراتِ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی مؤید ہے۔(احسن الفتاوی:۵/۶۲-۶۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بیوی کی بہن سے نکاح کرنے پر فسادِ نکاح کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے بیوی کی بہن سے نکاح کیا تو یہ نکاح فاسد ہے یا باطل؟ پھر ان سے اولاد ثابت النسب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر منکوحہ نکاح کا محل نہیں ہے یعنی کسی دوسرے کی زوجیت میں ہے تو نکاح باطل ہے اور اگر کسی دوسرے شخص کے نکاح میں مشغول نہیں ہے، اگر چہ نکاح حرام ہے لیکن فاسد ہوگا اور اولاد ثابت النسب ہوگی۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

ويجب مهر المثل في نكاح الفاسد وهو الذي فقد شرطاً من شرائط الصحة كشهود ومثله تزوج الأختين. (فتاوى الشامي:۳/۱۳۲)۔

ملاحظہ فرمائیں طحطاوی علی الدرالمختار میں ہے:

وعدة المنكوحة نكاحاً فاسداً كنكاح بغير شهود، فلا عدة في باطل مثاله: تزوج المتزوجة عالماً بذلك. (حاشية الطحطاوى على الدرالمختار:۲/۲۲۱)۔

درمختار میں ہے:

(وعدة المنكوحة نكاحاً فاسداً) فلا عدة في باطل وكذا موقوف قبل الإجازة، اختيار، لكن الصواب ثبوت العدة والنسب، بحر. (الدرالمختار مع الشامي:۳/۵۶۷،سعيد)۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

رجل مسلم تزوج بمحارمه فجئن بأولاد يثبت نسب الأولاد منه عند أبي حنيفةؒ خلافاً

لهما بناءً على أن النكاح فاسد عند أبي حنيفةؒ باطل عندهما كذا في الظهيرية. (الفتاوی الهندية:١/٥٤٠،باب ثبوت النسب)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

کتابیات سے نکاح کا حکم:

سوال: کتابیات جن سے نکاح جائز ہے آج کل کس جماعت میں شامل ہے؟ اور کیا حکم ہے؟

الجواب: موجودہ زمانہ کے اہل کتاب کے ساتھ نکاح مکروہ ہے، اگرچہ نفس جواز کا انکار نہیں، لیکن ان کے اندر زنا، فحاشی اور ناجائز تعلقات کی اتنی کثرت ہے کہ جس کو سن کر انسانیت کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے اور جس نے گویا حیوانوں کو بھی پس پشت ڈالدیا ہے۔ اس لیے عدم نکاح اولیٰ اور افضل ہے۔

نیز کتابیات سے وہ مراد ہیں جو دین سماوی کا انکار نہیں کرتے، ہاں جو انکار کرتے ہیں ان کے ساتھ نکاح بالکل حرام ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ نکاح ناپسند فرمایا اور طلاق دینے کا حکم دیا۔

ملاحظہ فرمائیں مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

عن شقيق قال: تزوج حذيفة رضي الله تعالىٰ عنه يهودية، فكتب إليه عمر رضي الله تعالىٰ عنه: أن خل سبيلها، فكتب إليه: إن كانت حراماً فخليت سبيلها، فكتب إليه: إني لا أزعم أنها حرام، ولكني أخاف أن تعاطوا المومسات منهن. (مصنف ابن ابی شیبة:٩/٨٥/١٦٤١٧، باب من كان يكره النكاح فی اهل الكتاب،المجلس العلمی)۔

وأخرج الطبراني برواية ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه قال: وقد نكح طلحة بن عبد الله رضي الله تعالىٰ عنه يهودية ونكح حذيفة بن اليمان رضي الله تعالىٰ عنه نصرانية فغضب عمر رضي الله تعالىٰ عنه غضباً شديداً حتى هم أن يسطوعليها، فقالوا: نحن نطلق ولا تغضب، فقال عمر رضي الله تعالىٰ عنه: لئن حل طلاقهن حل نكاحهن، ولكن لننزعن صفرة قماة. (رواه الطبرانی فی الكبير:١٢/١٣٠١٣،مكتبة العلوم والحكم)۔

نیز دیگر آثار بھی کراہت پر دلالت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

عن عبد الملک قال: سألت عطاء عن نكاح اليهوديات والنصرانيات؟ فكرهه، وقال: كان ذلک والمسلمات قليل.

وعن نافع عن ابن عمر رضي اللّٰه تعالیٰ عنه أنه كان يكره نكاح نساء أهل الكتاب، ولايرى بطعامهن بأساً.

وعن ميمون بن مهران ،عن ابن عمر رضي اللّٰه تعالیٰ عنه أنه كره نكاح نساء أهل الكتاب وقرأ : ﴿ولا تنكحوا المشركات حتى يؤمن ﴾. (مصنف ابن ابی شیبۃ:٩/٨٥،من کان یکرہ النکاح فی اهل الکتاب،المجلس العلمی).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ويجوز للمسلم نكاح الكتابية الحربية والذمية حرة كانت أو أمة كذا في محيط السرخسي، والأولیٰ أن لايفعل...وكل من يعتقد ديناً سماوياً وله كتاب منزل كصحف إبراهيم عليه السلام وشيث عليه السلام وزبور داود عليه السلام فهو من أهل الكتاب فتجوز مناكحتهم. (الفتاوی الهندیة:١/٢٨١).

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

اہل کتاب کے ایک مخصوص حکم کے ساتھ دوسرا مخصوص حکم بھی بیان فرمادیا،یعنی یہ کہ کتابی عورت سے نکاح کرنا شریعت میں جائز ہے،مشرکہ سے اجازت نہیں،﴿ولا تنكحوا المشركات حتیٰ يؤمن ﴾(البقرة: رکوع ٢٧) مگر یہ یاد رہے کہ ہمارے زمانہ کے ''نصاریٰ'' عموماً برائے نام نصاریٰ ہیں ان میں بکثرت وہ ہیں جو نہ کسی کتاب آسمانی کے قائل ہیں نہ خدا کے،ان پر اہل کتاب کا اطلاق نہیں ہوسکتا،لہذا ان کے ذبیحہ اور نساء کا حکم اہل کتاب کا سا نہ ہوگا،نیز یہ ملحوظ رہے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس میں فی حد ذاتہ کوئی وجہ تحریم کی نہیں،لیکن اگر خارجی اثرات وحالات ایسے ہوں کہ اس حلال سے منتفع ہونے میں بہت سے حرام کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے بلکہ کفر میں مبتلاء ہونے کا احتمال ہو تو ایسے حلال سے انتفاع کی اجازت نہیں دی جائے گی۔موجودہ زمانہ میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا،بےضرورت اختلاط کرنا،ان کی عورتوں کے جال میں پھنسنا،یہ چیزیں جو خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں وہ مخفی نہیں،لہذا ابدی اور بددینی کے اسباب وذرائع سے اجتناب ہی کرنا چاہئے۔

(تفسیر عثمانی سورۃ المائدۃ:الآیۃ:٥،ص١٤٢،رقم الحاشیۃ ١٢).

مزید ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ محمودیہ:١١/٤٥٠۔٤٥٤،مبوب ومرتب۔وجدید فقہی مسائل:١/٢٨٣ وامداد الفتاویٰ:٢/٢١٣)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

مطلق کافر کے ساتھ عقد نکاح کی ممانعت:

سوال: مسلمان عورت کا نکاح نصرانی یا یہودی سے نہیں ہوسکتا، بعض لوگ اس کی دلیل قرآن پاک سے مانگتے ہیں تو قرآنِ کریم میں: ﴿**ولا تنكحوا المشركين حتى يؤمنوا ولعبد مؤمن خير من مشرك**﴾. (سورة البقرة). وارد ہے، لیکن کوئی ایسی آیت ہے جس میں کافر، یہودی، نصرانی کے ساتھ نکاح کی بھی ممانعت ہو؟

الجواب: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**فإن علمتموهن مؤمنات فلاترجعوهن إلى الكفار، لاهن حل لهم ولاهم يحلون لهن**﴾. (سورة الممتحنة).

اس آیتِ کریمہ میں کفار مردوں کے لیے مسلمان عورتوں کے حلال نہ ہونے کا صاف ذکر ہے، کافر عام ہے چاہے مشرک ہو یا یہودی، نصرانی ہو یا ہندو سب کو شامل ہے۔

تفسیر قرطبی میں ہے:

أي لم يحل الله مؤمنة لكافر. (تفسیر قرطبی:۱۳/۴۳).

احکام القرآن میں ہے:

وروى الشيباني عن السفاح بن مطر عن داؤد بن كردوس قال: كان رجل من بني تغلب نصراني عنده امرأة من بني تميم نصرانية فأسلمت المرأة وأبى الزوج أن يسلم ففرق عمر رضی اللہ عنہ **بينهما**. (احکام القرآن للجصاص:۳/۴۳۸).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

مسلمان لڑکی کی شادی غیر مذہب والے سے قطعاً حرام ہے، یہ نکاح نہیں بلکہ حرام کاری اور زنا ہے، جو باپ اپنی لڑکی کی شادی اس طرح کردے وہ بے غیرت اور دیوث ہے، اس نے قرآنِ کریم کے حکم کو توڑا ہے، صاف صاف قرآن میں ہے: ﴿**لا هن حل لهم ولا هم يحلون لهن**﴾. (فتاوی محمودیہ:۱۱/۲۲۸، مبوب ومرتب).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:
ثلاث یا علي لاتؤخرهن الصلاة إذا أتت
والجنازة إذا حضرت والأيم إذا وجدت لها كفواً"
(المستدرك للحاكم)

فی الأولياء والأكفاء

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:
"الأيم أحق بنفسها من وليها"
(مسلم شریف)

فصل اول

ولایتِ نکاح کا بیان

عاقلہ بالغہ کا خود اپنی مرضی سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال: ایک لڑکی بالغہ ہے اور وہ خود اپنا نکاح کسی بالغ لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتی ہے لیکن اس لڑکی کے والدین ناراض ہیں، والدین چاہتے ہیں کہ اپنی لڑکی کا نکاح اس لڑکے کے ساتھ نہ ہو، تو کیا بالغہ اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عاقلہ بالغہ لڑکی اپنے نکاح کی خود مختار ہے، والدین یا ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے، نیز بلا وجہ شرعی والدین کو ناراض بھی نہیں ہونا چاہئے، ہاں اگر کوئی شرعی وجہ سے اعتراض کرے مثلاً غیر کفو میں نکاح کرلیا تو والدین یا ولی کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

(نفذ نكاح حرة مكلفة بلا ولي) وهذا عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ في ظاهر الرواية و كان أبويوسفؒ أولاً يقول: إنه لاينعقد إلا بولي إذا كان لها ولي ثم رجع وقال: إن كان الزوج كفوءاً لها جاز وإلا فلا، ثم رجع وقال: جاز سواء كان الزوج كفوءاً أولم يكن. (تبيين الحقائق:۲/۱۱۷،باب الاولياء والاكفاء،ملتان).

شامی میں ہے:

فنفذ نكاح حرة مكلفة بلا رضا ولي والأصل أن كل من تصرف في ماله تصرف في

نفسه وما لا فلا. (رد المحتار: ۳/۵۵، سعید ومثله في درالحکام شرح غررالاحکام،الجزء الاول،تحت باب الولي والاکفاء).

مبسوط میں ہے:

ألا ترى أنها لو زوجت نفسها طائعة من غير كفوء كان للأولياء حق الاعتراض فهنا أيضاً لم يوجد من الأولياء الرضا بسقوط حقهم في الكفاءة والزوج لايتمكن من إزالة عدم الكفاءة فيكون للأولياء أن يفرقوا بينهما سواء رضي بأن يتم لها مهر مثلها أولم يرض بذلك.

(المبسوط للامام السرخسیؒ الجزء الرابع والعشرون).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

صورتِ مسئلہ میں جب لڑکا اورلڑکی بالغ ہیں اور خاندان دینداری، اور پیشہ کے لحاظ سے لڑکا پست اور گراہوا نہیں ہے کہ لڑکی کے اولیاء کے لیے باعث عار ہوتو والدین رضامند ہوں یا ناراض دونوں کا نکاح درست ہے، اور بلاوجہ شرعی والدین کو ناراض نہ ہونا چاہئے، اور نکاح کردینا چاہئے، ورنہ گنہ گار ہوں گے، حدیث میں ہے:

"**من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً فإنما إثمه على أبيه** (مشکوٰۃ شریف: ۲۷، کتاب النکاح) اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: "**إذا خطب إليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه أن لا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد عريض.** (مشکوٰۃ شریف: ۲۶۷، کتاب النکاح)۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۵/۲۵۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نومسلمہ کے نکاح میں غیر مسلم کی ولایت کا حکم:

سوال: ایک عورت ابھی مسلمان ہوئی اور مسلمان کے ساتھ نکاح کا ارادہ ہے اور اس کے والد اور بھائی غیر مسلم ہیں، کیا اس کے نکاح میں باپ یا بھائی ولی بن سکتا ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مسلمان کے نکاح میں کافر ولی نہیں بن سکتا، لیکن کافر کی وکالت صحیح ہے، پس اگر نومسلمہ نے کافر باپ یا بھائی کو اپنے نکاح کا وکیل بنایا اور اس نے دو مسلمان گواہوں کے روبرو نکاح کیا تو صحیح ہے، اگرچہ عاقلہ بالغہ عورت بغیر ولی کے بھی اپنا نکاح کرسکتی ہے۔

ملاحظہ ہدایہ میں ہے:

وينعقد نكاح الحرة العاقلة البالغة برضائها وإن لم يعقد عليها ولي بكراً كانت أوثيباً

عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ في ظاهر الرواية...وفيه: لا ولاية لكافر على مسلم لقوله تعالىٰ: ﴿ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلاً﴾. ولهذا لاتقبل شهادته عليه ولايتوارثان.
(الهداية: ۲/۳۱۸، باب فی الاولیاء والاکفاء).

درمختار میں ہے:

والوالي في النكاح العصبة بنفسه بشرط حرية وتكليف وإسلام في حق مسلمة تريد التزوج. وفي الشامي: قوله تريد التزوج إشارة إلى أن المراد بالمسلمة البالغة حيث أسند التزوج إليها...وعلى ما قلنا فإذا زوجت المسلمة نفسها وكان لها أخ أوعم كافر، فليس له حق الاعتراض لأنه لاولاية له،...وإذا سقطت ولاية الأب الكافر على ولده المسلم، فبالأولىٰ سقوط حق الاعتراض على أخته المسلمة أوبنت أخيه. (الدرالمختار مع الشامی: ۳/۷٦، باب الولی، سعید۔ وکذا فی الفتاوی الهندية: ۱/۲۸٤، الباب الرابع فی الاولیاء).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

ولی کے لیے شرط ہے کہ وہ مسلمان، عاقل اور بالغ ہو خواہ مرد ہو یا عورت۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: ص۷۳، دفعہ۲۷).

البحر الرائق میں ہے:

إن الوكيل في النكاح معبر وسفير والتمانع في الحقوق دون التعبير ولا ترجع الحقوق إليه بخلاف البيع لأنه مباشرحتى رجعت الحقوق إليه. (البحرالرائق: ۳/۱۳٦، فصل فی الوکالة، کوئٹه).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

ولی اور وکیل میں فرق ہے، نکاح میں وکیل کا کام صرف الفاظ کی تعبیر کا رہتا ہے اصل ایجاب وقبول زوجین کا ہوتا ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۱/۵۳۸، مبوب ومرتب)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ولی نہ ہونے پر کافر جج کے ولی مقرر کرنے کا حکم:

سوال: اگر بالغہ یا نابالغہ لڑکی کا کوئی شرعی ولی نہ ہو تو کیا غیر مسلم جج کسی مسلمان کو اس کا ولی مقرر کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں غیر مسلم جج مسلمان لڑکی کے لیے ولی مقرر کرسکتا ہے، جیسا کہ کافر حاکم مسلمانوں کے لیے قاضی مقرر کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کان کافراً . وفي الشامي: قوله ولو کان کافراً في التتارخانیة: الإسلام لیس بشرط فیه. (الدرالمختار مع الشامی:۵/۳۶۸، کتاب القضاء، سعید)۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

فصل دوم
کفاءت کا بیان

کفو کا معیار:

سوال: جن چیزوں میں کفو کا اعتبار ہے وہ کیا ہیں؟ یعنی کفو کا معیار کیا ہے؟

الجواب: مذہب احناف کے مطابق ۶، امور میں کفو کا اعتبار ہے، جن کو علامہ حمویؒ نے شعر میں بیان فرمایا ہے:

إن الکفاء ۃ في النکاح تکون في   ست لها بیت بدیع قد ضبط

نسب وإسلام کذلک حرفة   حریة و دیانة مال فقط

(فتاوی الشامی:۳/۸۶،باب الکفاء ۃ،سعید).

ہدایہ میں ہے:

الکفاء ۃ في النکاح معتبرة قال علیه السلام:" ألا لایزوج النساء إلا الأولیاء ولایزوجن إلا من الأکفاء... ثم الکفاء ۃ تعتبر في النسب...فقریش بعضهم أکفاء لبعض والعرب بعضهم أکفاء لبعض...والکفاء ۃ في الحریة ...وتعتبر أیضاً في الدین أي الدیانة وهذا قول أبي حنیفةؒ وأبي یوسفؒ هو الصحیح لأنه من أعلی المفاخر والمرأۃ تعیر بفسق الزوج فوق ما تعیر بضعة نسبه... وتعتبر في الصنائع ...وعن أبي یوسفؒ أنه لایعتبر إلا أن یفحش کالحجام والحائک والدباغ. (الهدایة:۲/۳۲۰،۳۲۱،باب الاولیاء والاکفاء).

فتاوی عالمگیری میں ہے:

الكفاءة تعتبر في أشياء منها النسب...ومنها إسلام الآباء من أسلم بنفسه وليس له أب في الإسلام لايكون كفأً لمن له أب واحد في الإسلام كذا في فتاوى قاضيخان، ومن له أب واحد في الإسلام لايكون كفأً لمن له أبوان فصاعداً في الإسلام كذا في البدائع، والذي أسلم بنفسه لايكون كفأً للتي لها أبوان أوثلاثة في الإسلام ويكون كفأً لمثله هذا إذا كان في موضع قد تباعد عهد الإسلام وطال، وأما إذا كان العهد قريباً بحيث لايعير ولا يكون ذلك عيباً فإنه يكون كفأً كذا في السراج الوهاج...ومنها الحرية...ومنها الكفاءة في المال... ومنها الديانة...ومنها الحرفة.(الفتاوی الهندية:۱/ ۲۹۰،۲۹۱،الباب الخامس فی الاکفاء).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

اصطلاح شرع میں چند خاص امور میں شوہر کا بیوی کے ہم پلہ اور برابر ہونا کفاءت ہے۔

کفاءت کا اعتبار مندرجہ ذیل امور میں کیا جائے گا:

(۱) لڑکا دینداری اور تقویٰ میں لڑکی کا ہم پلہ ہو۔

(۲) مالیت:

(الف) شوہر بیوی کی حیثیت کے مطابق نفقہ پر قادر ہو۔

(ب) دونوں کی مالی حیثیت میں ایسا فرق نہ ہو جو لڑکی کے لیے باعث عار بنے۔

(۳) نسب میں کفاءت کا اعتبار عرب، خاص کر قریش، اور عجم کے ان خاندانوں میں کیا جائے گا جنہوں نے اپنے نسب کو محفوظ رکھا ہے، بقیہ سارا عجم ایک دوسرے کا کفو ہے، اسی اصول کے پیش نظر لڑکی اپنے ولی کا غیر کفو میں کرایا ہوا نکاح فسخ کراسکتی ہے، اور اسی کفاءت فی النسب کے پیش نظر کسی بالغہ کے غیر کفو میں کیے ہوئے نکاح کو فسخ کر دینے کا اختیار ولی کو حاصل ہوگا۔

حرفت اور پیشہ میں فرق کی وجہ سے لڑکی یا اس کے ولی کو نکاح فسخ کرانے کا اختیار نہیں ہوگا، مگر یہ کہ کوئی پیشہ معاشرہ میں بہت گرا ہوا سمجھا جاتا ہو۔

نومسلم اور خاندانی مسلمان ایک دوسرے کے کفو ہیں۔

إن أباحنيفةؒ وصاحبيهؒ اتفقوا أن الإسلام لا يكون معتبراً في حق العرب لأنهم لايتفاخرون به وإنما يتفاخرون بالنسب، فعلى هذا لوتزوج عربي له أب كافر بعربية لها

آباء في الإسلام فهو كفوء. (البحرالرائق:۳/۱۳۲).
یہ حکم اہل عرب کے بارے میں ہے، اہل عجم اس سے قدرے مختلف ہیں۔
چنانچہ ملاحظہ ہو جدید فقہی مسائل میں ہے:
عجمیوں کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ جس شخص نے خود اسلام قبول کیا ہو اور اس کے والدین کافر ہوں، اور جس کے والدین کافر ہوں اور خود مسلمان ہو وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ایسے شخص کا کفو نہیں جس کے خاندان میں دو پشتوں سے اسلام ہو۔ (جدید فقہی مسائل:۳/۷۵، اسلام میں کفاءت).
باب کفاءت میں مرد کا عورت کے ہم پلہ ہونا ضروری ہے، عورت کا مرد کے ہم پلہ ہونا ضروری نہیں ہے۔
کفاءت کا اعتبار بوقت عقد نکاح ہے، اگر شوہر نکاح کے وقت کفو تھا لیکن بعد میں کفو نہیں رہا، تو نکاح فسخ کرانے کا اختیار نہیں ہوگا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی:۹۵-۹۷، باب ہفتم کفاءت کا بیان).
نوٹ: عرفِ عام میں لڑکے والے لڑکی والوں سے کمتر سمجھے جاتے ہوں تو یہ نکاح بھی غیر کفو میں سمجھا جائے گا۔
مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل:۶۳-۱۰۵، مسئلہ کفاءت پر ایک نظر)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

آزاد بالغہ لڑکی کا نکاح غیر کفو میں منعقد ہونے کا حکم:

سوال: اگر مسلمان عاقلہ بالغہ لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرلے تو کیا اولیاء کو اس پر اعتراض کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟ جب کہ بہت سارے علماء اس نکاح کو باطل کہتے ہیں۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ظاہر الروایہ کے مطابق آزاد عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح غیر کفو میں منعقد ہو جاتا ہے، ہاں غیر کفو میں ہونے کی وجہ سے جب تک اس مرد سے اولاد نہ ہو اولیاء کو فسخ کرانے کا حق حاصل ہوگا، مجمع الفقہ الاسلامی الہند اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا یہی فتویٰ ہے، اور نکاح کے بعد بیوی شوہر کے لیے حلال ہے، اگر والدین ناراض ہوں تو مقامی جمعیت یا حاکم، عالم کے سامنے یہ مسئلہ پیش کریں، اولاً والدین کو سمجھانے کی کوشش کریں، اور اگر نکاح قائم رکھنے کی کوئی شکل نہیں بنتی تو شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اگر شوہر طلاق دینے سے انکار کرے تو پھر جمعیت یا حاکم، عالم اولیاء کے مطالبہ پر نکاح فسخ کر سکتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

وينعقد نكاح الحرة العاقلة البالغة برضائها وإن لم يعقد عليها ولي بكراً كانت أو ثيباً عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ في ظاهر الرواية وعند محمدؒ ينعقد موقوفاً...ثم في ظاهر الرواية لا فرق بين الكفو وغير الكفو لكن للولي الاعتراض في غير الكفو... ويرویٰ رجوع محمدؒ إلى قولهما. (الهداية:۲/۳۱۳،باب فی الاولیاء والاکفاء).

فتح القدیر میں ہے:

ورواية رجوعه إلى ظاهر الرواية فتحصل أن الثابت الآن هو اتفاق الثلاثة على الجواز مطلقاً من الكفء وغيره. (فتح القدير:۳/۲۵۶،دارالفکر).

شرح عنایہ میں ہے:

قوله ولكن للولي الاعتراض في غير كفء) يعني إذا لم تلد من الزوج، وأما إذا ولدت فليس للأولياء حق الفسخ كي لا يضيع الولد عمن يربيه. (شرح العناية على هامش فتح القدير:۳/۲۵۸،دارالفکر).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ثم المرأة إذا زوجت نفسها من غير كفو صح النكاح في ظاهر الرواية عن أبي حنيفةؒ وهو قول أبي يوسفؒ آخراً وقول محمدؒ آخراً أيضاً، حتى أن قبل التفريق يثبت فيه حكم الطلاق والظهار والإيلاء والتوارث وغيرذلک، ولكن للأولياء حق الاعتراض. (الفتاوى الهندية:۱/۲۹۲۔وفتاوی قاضیخان:۱/۳۵۱).

بدائع الصنائع میں ہے:

الحرة العاقلة البالغة إذا زوجت نفسها من رجل أو وكلت رجلاً بالتزويج فتزوجها أو زوجها فضولي فأجازت، جاز في قول أبي حنيفةؒ وزفرؒ وأبي يوسفؒ الأول سواء زوجت نفسها من كفؤ أو غير كفؤ بمهر وافر أو قاصر، غيرأنها إذا زوجت نفسها من غير كفؤ فللأولياء حق الاعتراض. (بدائع الصنائع:۲/۲۴۷،سعید۔وکذا فی البحرالرائق:۳/۱۲۸،کوئٹه).

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

صحتِ نکاح کے لیے مرد وعورت کا مسلمان ہونا، اور عورت کا محرمات میں سے نہ ہونا، فی حد ذاتہ کافی ہے،

قرآن مجید کے نصوصِ صریحہ اس پر دال ہیں، ﴿وأحل لكم ما وراء ذلكم أن تبتغوا بأموالكم﴾، ﴿فانكحوا ما طاب لكم من النساء﴾ اور سنتِ نبویہ نے عملی طور سے اس کی تصدیق کردی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب ہاشمیہؓ کا نکاح زید معتقؓ سے باوجود زینب کی طرف سے انشراحِ قلب نہ ہونے کے کردیا اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں صحابہ کرام کے افعال اور طرزِ عمل میں موجود ہیں کہ نسبی تفاوت کے باوجود نکاح ہوگئے۔بس نصوصِ قرآنیہ اور تعاملِ صحابہ وسلف صالحین اس امر پر دلیل قاطع ہے کہ کفاءت نسبی فی حد ذاتہ مستحب ہے انعقادِ نکاح کی شرط نہیں، اسی وجہ سے غیر کفو کا نکاح جب کہ منکوحہ اور ولی منکوحہ راضی ہوجائے صحیح اور نافذ ہوجاتا ہے۔(کفایت المفتی: ۵/۲۰۹،دارالاشاعت).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

حق کفاءت زوجہ کو اور اس کے اولیاء کو بھی حاصل ہے، لہٰذا اگر کسی عورت نے اپنا نکاح جان بوجھ کر کسی غیر کفو میں کرلیا تو اولیاء کو نکاح فسخ کرانے کا اختیار رہوگا۔(مجموعہ قوانین اسلامی: دفعہ ۱۲۲،ص ۹۸).

مجمع الفقہ الاسلامی کے گیارہویں سمینار منعقدہ اپریل ۱۹۹۹ء میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے بعد اکثر شرکاء حضرات کی رائے جو سامنے آئی وہ درج ذیل ہے:

''بغیر کفو کے نکاح صحیح ہے، اور اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہے''

ملاحظہ ہو: جدید فقہی مباحث: ۱۷/ ۲۵۱۔۲۶۶، ادارۃ القرآن).

نیز شریعتِ مطہرہ میں دیگر امثلہ موجود ہیں جن میں غیر کفو میں نکاح منعقد ہوا۔

(۱) حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح جیسا کہ مذکور ہوا۔

(۲) حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح حضرت اسامہ بن زید کے ساتھ قرار پایا۔(مسلم شریف: ۱/ ۴۸۵).

(۳) حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرب خاتون سے شادی فرمائی۔(مبسوط: ۵/ ۲۳،باب الکفاءت).

(۴) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دختر نیک اختر کو پیغامِ نکاح دیا اور منظور بھی ہوگیا مگر بتقدیر الٰہی نکاح منعقد نہیں ہوا۔(مبسوط: ۵/ ۲۳،باب الکفاءت).

علامہ شامیؒ نے غیر کفو میں نکاح کا قول حسنؒ سے نقل کیا اور اس پر فتویٰ دیا یہ ان کے زمانہ کی مصلحت ہوگی، ملاحظہ درمختار میں ہے: ويفتىٰ في غير الكفؤ بعدم جوازه أصلاً، وهو المختار للفتوىٰ لفساد الزمان، وفي الشامية: وقال شمس الأئمة: وهذا أقرب إلى الاحتياط.(الدر المختار مع الشامی: ۳/ ۵۶،سعید).

وفیه أیضاً: أما علی روایة الحسن المختار للفتویٰ من أنه لا یصح. (فتاوی الشامی:۳/ ۸٤، سعید).

لیکن موجودہ دور کی مصلحت یہ ہے کہ ظاہر الروایہ پر فتویٰ دیا جائے، کیونکہ دن بدن ایسے سیکڑوں نکاح ہو رہے ہیں، اگر نکاح منعقد تسلیم نہ کیا جائے تو سب زنا میں مبتلاء ہوں گے، نیز نکاح کے ارکان وشہادت کی موجودگی میں نکاح کا منعقد نہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب ؒ ''کتاب الفسخ والتفریق'' کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

نکاح غیر کفو میں منعقد ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلہ میں ظاہر الروایہ یہی ہے کہ نکاح منعقد ہو جائے گا، البتہ ولی کو حق اعتراض ہوگا، حسن بن زیادؒ کی روایت یہ ہے کہ نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوگا جس پر اس زمانہ کے عام علماء نے فسادِ زماں کو سامنے رکھتے ہوئے فتویٰ دیا ہے، مصنف علام نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

اس حقیر کو اس رائے سے اختلاف ہے، میرے نزدیک ظاہر الروایت پر ہی عمل ہونا چاہئے، اس لیے کہ شرائطِ انعقادِ نکاح میں سے کوئی شرط مفقود نہیں ہے اور آج کے موجودہ حالات میں بھی جب کہ خاندانی بندھنیں کمزور پڑگئی ہیں اور غیر کفو اور کفو میں شادی کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے، ایسی حالت کا بھی تقاضہ ہے کہ جو نکاح ہو چکا اسے منعقد تسلیم کیا جائے اور اگر کسی کو ضرر پہونچتا ہے تو اس کو قاضی کے سامنے اعتراض پیش کرنے کا حق دے کر اس ضرر کو دور کرنے کا راستہ نکالا جائے۔ (حاشیہ کتاب الفسخ والتفریق از مولانا عبد الصمد رحمانیؒ: ص ۱۲۰، حاشیہ نمبر ۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زبان مختلف ہونے پر کفاءت کا حکم:

سوال: زبان مختلف ہونے سے کفاءت پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اختلافِ زبان سے مسئلہ کفاءت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اس لیے کہ کفاءت کا اعتبار مندرجہ ذیل اشیاء میں ہے:

دین، نسب، حریت، مال و دولت، و حرفت، اختلافِ زبان اس میں نہیں ہے، ہاں اگر کسی زبان والے دوسری زبان والوں کو عموماً اپنے برابر نہیں سمجھتے ہوں تو پھر کفاءت کا اعتبار ہونا چاہئے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

إن الکفاءة في النکاح تکون في ست لها بیت بدیع قد ضبط
نسب وإسلام کذلک حرفة حریة و دیانة مال فقط

(فتاوی الشامی:۳/ ۸٦، باب الکفاءة، سعید).

ہدایہ میں ہے:

الكفاءة في النكاح معتبرة قال عليه السلام:" ألا لايزوج النساء إلا الأولياء ولايزوجن إلا من الأكفاء ...ثم الكفاءة تعتبر في النسب...فقريش بعضهم أكفاء لبعض والعرب بعضهم أكفاء لبعض...والكفاءة في الحرية ...وتعتبر أيضاً في الدين أي الديانة وهذا قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ هو الصحيح لأنه من أعلى المفاخر والمرأة تعير بفسق الزوج فوق ما تعير بضعة نسبه... وتعتبر في الصنائع ...وعن أبي يوسفؒ أنه لايعتبر إلا أن يفحش كالحجام والحائك والدباغ. (الهداية:۲/ ۳۲۰،۳۲۱،باب الاولیاء والاکفاء).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الكفاءة تعتبر في أشياء منها النسب...ومنها إسلام الآباء ...ومنها الحرية ...ومنها الكفاءة في المال ... ومنها الديانة...ومنها الحرفة. (الفتاوی الهندیة:۱/ ۲۹۰،۲۹۱،الباب الخامس فی الاکفاء).

امدادالاحکام میں ہے:

کفاءت نسب واسلام وحریت ودیانت ومال وحرفت میں معتبر ہے۔(امدادالاحکام:۲/۲۸۸)۔واللہ ﷻ اعلم۔

فصل سوم

وکالتِ نکاح کا بیان

عاقد کی وکالت کا حکم:

سوال: کیا زوج خود اپنے نکاح کا وکیل بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر لڑکی نے کہا کہ میرا نکاح آپ سے کرادو تو شوہر وکیل نکاح بن کر اس لڑکی کا نکاح اپنے آپ سے کرا سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ویجوز لابن العم أن یزوج بنت عمه من نفسه...وإذا أذنت المرأة للرجل أن یزوجها من نفسه فعقد بحضرة شاهدین جاز...فقوله زوجت یتضمن الشطرین ولایحتاج إلی القبول. (الهدایة:۲/۳۲۲،فصل فی الوکالة بالنکاح).

فتاوی عالمگیری میں ہے:

امرأة وکلت رجلاً بأن یزوجها من نفسه فقال: زوجت فلا نة من نفسي یجوز وإن لم تقل قبلت. (الفتاوی الهندیة:۱/۲۹۵ ـ وکذا فی الدرالمختار:۳/۹۹،سعید ـ وفتح القدیر:۳/۳۰۷،دارالفکر).

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

سوال کا ماحصل یہ ہے کہ عورت نے کہا کہ میں نے تجھ کو اجازت دی میرا نکاح اپنے ساتھ کرلو دو گواہوں کے سامنے اس شخص نے دو گواہوں کے سامنے مسجد میں اس عورت کا نکاح اپنے ساتھ کرلیا، شرعاً نکاح درست

ہوایانہ؟

الجواب: یہ نکاح منعقد ہوگیا۔ (فتاوی دارالعلوم: ۱۹۴/۸، مدلل ومکمل، دارالاشاعت۔ وفتاوی حقانیہ: ۳۸۲/۴)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وکیل کا دوسرے شخص کو وکیل بنانے کا حکم:

سوال: نکاح میں نکاح خواں وکیل سے پوچھتا ہے کیا میں نکاح پڑھالوں؟ وہ کہتا ہے ہاں، اس طرح یہ وکیل کا وکیل بن کر لڑکے سے ایجاب وقبول کرواتا ہے کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں وکیل کا وکیل بنانا جائز نہیں ہے، ہاں اگر دوسرے وکیل نے پہلے وکیل کی موجودگی میں نکاح پڑھایا تو نکاح صحیح ہوگیا، لیکن بغیر ضرورت کے وکیل بنانا معقول نہیں لہذا وکیل ہی سے ایجاب کرا کر لڑکے سے قبول کروانا چاہئے۔

ملاحظہ ہو فتاوی عالمگیری میں ہے:

الوكيل بالتزويج ليس له أن يؤكل غيره فإن وكل فزوج الثاني بحضرة الأول جاز، كذا في فتاوى قاضيخان في كتاب الوكالة. (الفتاوى الهندية: ۲۸۹/۱، الباب السادس في الوكالة بالنكاح).

فتاوی الازہر میں ہے:

سوال: شخص وكل عمه في قبول العقد فقبل منه هذه الوكالة، وعند حضور الوكيل ووالد الخاطب في بيت الخطيبة وكل عم الخاطب والد الخاطب في قبول الزواج، فقبل منه الوكالة، وعقد العقد مع والد الزوجة بحضور عم الخاطب الوكيل المذكور ولم يكن الخاطب حاضراً ولم يأذن لعمه بأن يؤكل غيره فما الحكم؟ وإذا طلقها قبل الدخول والخلوة يقع أم لا؟

الجواب: الحكم في هذا العقد والحال ماذكر الصحة.

ففي الفتاوى الخانية من كتاب الوكالة مانصه: ''الوكيل بالتزويج ليس له أن يؤكل غيره فإن وكل فزوج الثاني بحضرة الأول جاز''. وقد نقله عنها في الفتاوى الهندية من كتاب النكاح، فلوطلق الزوج المذكور بعد ذلك زوجته المرقومة ثلاثاً قبل الدخول والخلوة بعبارة واحدة بدون تفريق وقع الطلاق الثلاث. والله تعالىٰ أعلم. (فتاوى الازهر، فتاوى اعلام المفتين لدار الافتاء المصرية: ۲۰۰/۶، وكالة الوكيل بالزواج غيره فيه).

علامہ رافعیؒ نے فرمایا کہ وکیل اول کی عدم موجودگی وکیل ثانی یعنی وکیل الوکیل نکاح پڑھادے تب بھی نکاح صحیح ہوجائے گا، ملاحظہ ہوتقریرات الرافعی میں ہے:

(قوله فهذا يدل على أن الوكيل ليس له التوكيل) ما قدمه عن الخلاصة لايدل على عدم صحة توكيل الوكيل في النكاح مع معرفة المرأة الزوج والمهروالموافق لما يأتي في الوكالة من أن له التوكيل عند تقدير الثمن لحصول المقصود أن يقال هناكذلك، فحيث كان الزوج والمهر معلومين يصح توكيل الوكيل وتنزل تعيين المهرمنزلة تعيين الثمن فزال الإشكال وتبين أنه لاحاجة لحمل مافي القنية على ما إذا باشرالوكيل الثاني بحضرة الوكيل الأول جارياً على رواية عصام. (تقريرات الرافعي: على هامش الشامي:۳/۱۸۶،سعيد).

واللہ تعالیٰ اعلم۔

نکاح میں غیر مسلم کی وکالت کا حکم:

سوال: ایک لڑکی مسلمان ہوئی اس کا نکاح ہونے والا ہے اور باپ وغیرہ غیر مسلم ہیں، تو کیا اس کے نکاح میں باپ وکیل بن سکتا ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ لڑکی عاقلہ بالغہ ہے تو غیر مسلم والد نکاح کا وکیل بن سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

إن الوكيل في النكاح معبر وسفير والتمانع في الحقوق دون التعبيرولا ترجع الحقوق إليه بخلاف البيع لأنه مباشرحتى رجعت الحقوق إليه. (الهداية:۲/۳۲۲،فصل فى الوكالة بالنكاح۔ ومثله فى البحرالرائق:۳/۱۳۶،فصل فى الوكالة،كوئته).

شامی میں ہے:

الوكيل في النكاح وما بعده سفير محض فلا بد من إضافة هذه العقود المذكورة إلى المؤكل. (فتاوى الشامى:۳/۸۱۷،مطلب فى العقودالتى لابدمن اضافتهاالى المؤكل، سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

ولی اور وکیل میں فرق ہے، نکاح میں وکیل کا کام صرف الفاظ کی تعبیر کار ہتا ہے اصل ایجاب وقبول زوجین کا ہوتا ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۱/۵۳۸،مبوب ومرتب)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:
﴿وآتوا النساء صدقاتهن نحلة﴾
(سورة النساء)
قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:
”ولا مهر أقل من عشرة دراهم“
(رواه ابن أبي حاتم وحسنه ابن حجر العسقلانيؒ)

باب......﴿۴﴾

مہر کا بیان

کم سے کم مہر کی تحقیق:

سوال: کم از کم مہر کتنا ہونا چاہئے اس کی کیا مقدار ہے؟ کیا کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ کم از کم مہر کی مقدار ۱۰ درہم ہے، اس سے کم جائز نہیں ہے، اور یہ تحدید حدیث سے ثابت ہے، اور جدید وزن کے حساب سے ۳۰ گرام ۶۱۸ ملی گرام ہوتا ہے۔ جدید حساب کی تفصیل کتاب الزکوٰۃ باب اول میں ملاحظہ فرمائیں۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

رواه ابن أبي حاتم من حديث جابر رضي الله عنه عن عمروبن عبد الله الأودي بسنده، ثم أوجدنا بعض أصحابنا صورة السند عن الحافظ قاضي القضاة العسقلانيؒ الشهير بابن حجر. قال ابن أبي حاتم: حدثنا عمرو بن عبد الله الأودي حدثنا وكيع عن عباد بن منصور قال: حدثنا القاسم بن محمد قال: سمعت جابراً يقول: قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: " ولا مهر أقل من عشرة " من الحديث الطويل، قال الحافظ: إنه بهذا الإسناد حسن ولا أقل منه. (فتح القدير: ۳/۲۹۲، باب الكفاءة، دار الفكر).

یہ روایت حسن ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا، اس لیے کہ اس کی سند میں مبشر بن عبید وغیرہ ضعیف راوی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بیہقی وغیرہ کی روایت جو مشہور ہے اس کی سند میں دو راویوں پر کلام ہے (۱) مبشر بن عبید (۲) حجاج بن ارطاۃ۔ لہذا یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے، اگرچہ متعدد طرق کی وجہ سے اکثر علماء نے حسن قرار

دیا ہے۔ نیز دیگر آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاوی دارالعلوم زکریا جلداول ابواب الحدیث: ص ۳۶۲۔

فقہاء نے بھی حدیث بالا سے استدلال فرما کر دس درہم سے کم مہر جائز قرار نہیں دیا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

أقله عشرة دراهم لحديث البيهقي وغيره " لا مهر أقل من عشرة دراهم" وفي الشامي: قوله لحديث البيهقي وغيره، رواه البيهقي بسند ضعيف ورواه ابن أبي حاتم وقال الحافظ ابن حجر: إنه بهذا الإسناد حسن. (الدر المختار مع الشامي:۱۰۱/۳،باب المهر،سعيد۔ والبحر الرائق:۱٤۲/۳، كوئته).

ایضاح المسائل میں ہے:

شریعت اسلامی میں اقل مہر دس درہم ہے اس سے کم میں مہر کی تعیین صحیح نہیں ہوگی، دس درہم میں دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہوتی ہے اور یہ موجودہ گراموں کے حساب سے ۳۰ گرام ۶۱۸ ملی گرام ہوتا ہے اور دس گرام کے تولہ سے ۳ تولہ ۶۱۸ ملی گرام چاندی ہوتی ہے۔ (ایضاح المسائل: ۱۲۹).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے جس کا وزن دو تولہ ساڑھے سات ماشہ (۳۰ گرام ۶۱۸ ملی گرام) چاندی ہے لہذا کم کی مقدار ہر دور میں اور ہر ملک میں اس دور کے اور اس ملک کے وزن میں اتنی ہوگی، جس سے دو تولہ ساڑھے سات ماشہ (۳۰ گرام ۶۱۸ ملی گرام) چاندی حاصل ہو سکے، زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: ۱۰۱، دفعہ ۱۲۹).

احسن الفتاوی (۳۲/۵) میں دس درہم کی مقدار جدید حساب سے ۳۴ گرام مرقوم ہے، لیکن عام علماء نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ابن ابی حاتم کی سند کی تحقیق:

سوال: حدیث " لا مهر أقل من عشرة دراهم " رواه ابن أبي حاتم، سنداً اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب: مذکورہ بالا روایت درجہ حسن سے کم نہیں ہے، اس لیے کہ اس کی سند کے اکثر رواۃ ثقہ ہیں۔

حدیث کی سند ملاحظہ فرمائیں:

عن الحافظ قاضي القضاة العسقلانيؒ الشهير بابن حجر. قال ابن أبي حاتم: حدثنا عمروبن عبد اللّٰه الأودي(١) **حدثنا وكيع** (٢) **عن عباد بن منصور** (٣) **قال: حدثنا القاسم بن محمد**(٤) **قال: سمعت جابراً يقول: قال سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: ...الخ.** (فتح القدير:٣/٢٩٢، فصل فی الكفاءة ،دارالفكر). وينظر: (تنزيه الشريعة المرفوعة:٢/٢٠٧).

(١) عمروبن عبد الله الاودي:۔ قال ابن حجر: في "التقريب" (٤٩٢) : ثقة من العاشرة.

و قال ابوحاتم : صدوق وقال ابنه عبد الرحمن: صدوق ثقة، وقال ابوزرعة: رأيت محمدبن مسلم يعظم شأن عمرو الاودي، ويطنب في ذكره، وذكره ابن حبان في كتاب الثقات۔(تهذيب الكمال:٢٢/٩٨).

(٢) وكيع بن جراح:۔ قال أبوسفيان الكوفي: ثقة حافظ۔ (تقريب التهذيب:٦٧٤۔وتهذيب الكمال:٣٠/٤٦٢).

(٣) عباد بن منصورالناجي:۔ قال ابن حجرؒ: صدوق، رمي بالقدر، وكان يدلس، وتغير بأخرة، من السادسة۔ (تقريب التهذيب:٣٤٦،وتهذيب الكمال:١٤/١٥٦).

(٤) القاسم بن محمد بن أبي بكر الصديقؓ:۔ ثقة ، أحد الفقهاء بالمدينة، قال أيوب: ما رأيت أفضل منه، من كبار الثالثة۔(تقريب التهذيب:٥٢٦، وتهذيب الكمال:٢٣/٤٢٧)۔**واللّٰہ ﷻ اعلم۔**

مہر فاطمی اور مہر ازواجِ مطہرات کی تحقیق:

سوال: مہر فاطمی کتنا ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا مہر کتنا ہوتا تھا اور دونوں میں کتنا فرق ہے؟ یعنی مہر فاطمی اور مہر نبوی میں کیا فرق ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مہر فاطمی کی مقدار ۴۸۰ درہم ہے، اور ازواجِ مطہرات کا مہر ۵۰۰ درہم ہے، لہٰذا دونوں کے مابین ۲۰ درہم کا تفاوت ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں مسلم شریف میں ہے:

عن أبي سلمة بن عبد الرحمن أنه قال: سالت عائشة زوج النبي صلى اللّٰه عليه وسلم كم كان صداق رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قالت: كان صداقه لأزواجه ثنتي عشرة أوقية و نشاً قالت: أتدري ما النش؟ قال: قلت: لا، قالت: نصف أوقية فتلك خمس مائة درهم، فهذا صداق رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لأزواجه. (رواه الإمام مسلم رحمه اللّٰه تعالیٰ فی

صحیحه: ۱/ ٤٥٨، باب الصداق).

مجمع الزوائد میں ہے:

وعن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ قال جاء أبوبکر إلى النبي صلى الله عليه وسلم إلى قوله...قال علي رضی اللہ عنہ فأتياني و أنا في سبيل، فقالا: بنت عمک تخطب فنبهاني لأمرفقمت أجر ردائي طرف على عاتقي وطرف آخر في الأرض حتى أتيت النبي صلى الله عليه وسلم وقعدت بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت: يا رسول الله قد علمت قدمي في الإسلام ومناصحتي و إني و إني قال: وما ذاک يا علي قلت: تزوجني فاطمة قال: وما عندک قلت: فرسي و بدني يعني درعي قال: أما فرسک فلا بد لک منه، وأما بدنک فبعها، فبعتها بأربعمائة وثمانين درهماً فأتيت بها النبي صلى الله عليه وسلم فوضعتها في حجره...الخ رواه الطبراني و فيه يحيىٰ بن يعلى الأسلمي وهو ضعيف، وفي رواية قال: ما عندي إلا درع الحطمية، قال: فاجمع ما قدرت عليه وائتني به قال: فأتى باثنتي عشرة أوقية أربعمائة و ثمانين...الخ رواه البزار و فيه محمد بن ثابت بن أسلم وهوضعيف. (مجمع الزوائد ۹/ ۲۰۵، باب منه فی فضلها وتزويجها بعلي رضی الله تعالیٰ عنهما، دارالفکر).

و في شرح العلامة الزرقاني على المواهب اللدنية(۲/ ٤): **وعن أنس رضی اللہ عنہ قال: فذكرالحديث إلى قوله...قال علي رضی اللہ عنہ: فنبهاني لأمرفقمت أجر ردائي حتى أتيت النبي صلى الله عليه وسلم، فقلت: تزوجني فاطمة قال: عندک شيء فقلت: فرسي وبدني، قال: أما فرسک فلا بد لک منها و أما بدنک فبعها، فبعتها من عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بأربعمائة و ثمانين درهماً الخ.** (خرجه أبوحاتم بن حبان التميمي البستي۔وأحمد فی المناقب۔وكذا أخرجه أبوداود كلاهما بنحوه من حديث أنس).

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مہر کے بارے میں روایات میں اختلاف واقع ہوا ہے، ذکر کردہ روایات میں ۴۸۰ درہم مذکور ہے اور اسی طرح تاریخ الخمیس، ص: ۳۶۱ پر بھی ۴۸۰ درہم مرقوم ہے اور دوسری جگہ ۴۰۰ مثقال فضہ مذکور ہے، مثلاً روضۃ الاحباب، جیسا کہ ملا علی قاری نے مرقاۃ: ۶/ ۲۴۶ پر ذکر فرمایا ہے، اسی طرح فتاویٰ رحیمیہ: ۶/ ۴۴۴ پر ۴۰۰ مثقال چاندی مرقوم ہے، اور ابن ہمامؒ، ملا علی قاریؒ وعلامہ عینیؒ نے ذکر فرمایا: ’’**ومعلوم أن الصداق كان أربعمائة درهم وهي فضة**‘‘

نیز علامہ عینیؒ نے مطلق بنات کے بارے میں ذکر فرمایا:"صداق بناته أربعمائة درهم". (عمدة القاری ۱۰۲/۱٤) لیکن ان سب اقوال میں ۴۸۰ درہم والا قول راجح معلوم ہوتا ہے اسوجہ سے کہ ۴۰۰ مثقال چاندی والی روایت کو ابن جوزیؒ نے موضوعات جلد ا پر ذکر فرما کر موضوعی قرار دیا ہے، نیز ۴۰۰ درہم والی روایت مطلق بنات کے بارے میں ہے، جیسا کہ عدی بن حاتم نے ذکر فرمایا ہے (عمدة القاری:۱۰۲/۱٤) لہذا ۴۸۰ درہم والی روایات حضرت فاطمہ کے بارے میں صریح ہیں، اگرچہ بعض میں کچھ ضعف ہے، اور" ثنتي عشرة أوقية" (رواہ الترمذی:۱/۲۱۱، وقال :هذا حديث حسن صحيح ،باب ماجاء فی مهور النساء) یہ روایت بھی اس کی مؤید ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مہر فاطمی کی مقدار ۴۸۰ درہم ہے۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

۴۸۰ درہم یہ مقدار متعدد روایات، حدیث وسیرت سے ثابت ہے لہذا یہ راجح ہے۔(احسن الفتاوی:۵/۳۱).

اور ازواجِ مطہرات کا مہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق ۵۰۰ درہم ہے، البتہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ نجاشی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت واکرام کی خاطر مقرر کیا تھا، جیسا کہ علامہ نوویؒ، ملا علی قاریؒ، علامہ عینیؒ وغیرہ نے ذکر فرمایا ہے۔

پوری بحث سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مہر فاطمی اور مہر ازواجِ مطہرات کے مابین تفاوت ۲۰ درہم کا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

مہر فاطمی اور مہر ازواجِ مطہرات موجودہ اوزان میں:

سوال: موجودہ اوزان میں اور رینڈ میں مہر فاطمی اور مہر ازواجِ مطہرات کتنا ہوتا ہے؟

الجواب: موجودہ اوزان اور رینڈ میں مہر کی مقدار نقشۂ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

اقسام مہر	درہم	گرام	رنید
مہر فاطمی	۴۸۰	۱۴۶۹ گرام ۶۲۴ ملی گرام	....
مہر ازواجِ مطہرات	۵۰۰	۱۵۳۰ گرام ۹۰۰ ملی گرام	....
دونوں کا باہمی تفاوت	۲۰	۶۱ گرام ۲۳۶ ملی گرام	....

واللہ تعالیٰ اعلم۔

حنفی اور شافعی کے درمیان بوقتِ اختلاف مہر کا حکم:

سوال: اگر شافعی مرد حنفی لڑکی سے نکاح کرے اور مہر مقرر کرنے میں اختلاف ہو تو مرد کا اعتبار ہے یا عورت کا؟

الجواب: فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر عورت کا حق ہے، جو ملک بضعہ کے عوض میں اس کو ملتا ہے، لہٰذا بوقتِ اختلاف عورت کا اعتبار ہوگا۔ یعنی اگر شافعی مرد حنفی لڑکی سے شادی کرے تو ۱۰ درہم کی مقدار سے کم دینا صحیح نہ ہوگا۔

ملاحظہ ہو مبسوط میں ہے:

لأن المهر من خالص حقها فإنه بدل ما هو مملوك لها ألا ترى أن الاستيفاء والإبراء إليها والتصرف فيه كيف شاء ت. (المبسوط للسرخسي: ۱٤/٥).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولنا أن المهر ملك المرأة وحقها لأنه بضعها وبضعها حقها وملكها والدليل عليه قوله عز وجل: ﴿وآتوا النساء صدقاتهن نحلة﴾ أضاف المهر إليها فدل أن المهر حقها وملكها. (بدائع الصنائع ۵۸۳/۲، سعید).

وفي تبيين الحقائق: لأن المهر خالص حقها. (تبیین الحقائق ۱۴۰/۵، امدادیہ ملتان)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مہر مثل سے کم پر ہونے والے نکاح کا حکم:

سوال: ایک لڑکی نے ایک لڑکے سے خفیہ طور پر دو گواہوں کے سامنے نکاح کیا بظاہر لڑکا لڑکی کا کفو ہے، لڑکی کے والد ناراض ہے، ایک عالم کے سامنے مقدمہ پیش کیا اب اگر یہ نکاح مہر مثل سے کم پر ہوا ہے تو قابل فسخ ہے یا نہیں؟ اور اس میں حَکَم یا حاکم کے فسخ کے ضرورت ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ امام صاحب کے مذہب کے مطابق نکاح قابلِ فسخ ہے، لیکن اولِ وہلہ میں نہیں پہلے شوہر سے مہر مثل پورا ادا کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اگر شوہر راضی نہ ہو تو ولی عصبہ کو اختیار ہے کہ حَکَم یا حاکم سے نکاح فسخ کرادے، ہاں اگر بغیر حکم یا حاکم کے نکاح فسخ کرے گا تو فسخ نہ ہوگا، حاکم کا فیصلہ ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

قال: إذا تزوجت المرأة ونقصت عن مهر مثلها فللأولياء الاعتراض عليها عند أبي حنيفةؒ حتى يتم لها مهر مثلها أو يفارقها وقالا: ليس لهم ذلک، لهما أن ما زاد على العشرة حقها ومن أسقط حقه لايعترض عليه كما بعد التسمية و لأبي حنيفةؒ أن الأولياء يفتخرون بغلاء المهر ويتعيرون بنقصانها فأشبه الكفاءة بخلاف الإبراء بعد التسمية لأنه لايتعير به.

(الهداية ۲/ ۳۲۱۔ وهكذا في البحر الرائق: ۳/ ۱۳۴۔الدر المختار مع الشامي: ۳/ ۹۴،سعيد۔ومجمع الانهر: ۱/ ۳۴۳).

(وقوله أن يفرق) أى بالمرافعة إلى الحاكم. (بدر المنتقىٰ فى شرح الملتقىٰ على هامش مجمع الانهر ۱/ ۳۴۳).

بدائع الصنائع میں ہے:

لو تزوجت نفسها من كفء بأقل من مهر مثلها مقدار ما لا يتغابن فيه الناس بغير رضا الأولياء فللأولياء حق الاعتراض عنده، فأما أن يبلغ الزوج إلى مهرمثلها أو يفرق بينهما و عند أبي يوسف ومحمد رحمهما الله تعالى هذا ليس بشرط ويلزم النكاح بدونه حتى يثبت للأولياء حق الاعتراض (وجه) قول أبي يوسف ومحمد رحمهما الله أن المهرحقها على الخلوص كالثمن في البيع والأجرة في الإجارة فكانت هي بالنقص متصرفة في خالص حقها فيصح، ولأبي حنيفة أن للأولياء حقاً في المهرلأنهم يفتخرون بغلاء المهرويتعيرون ببخسه فيلحقهم الضرر بالبخس وهوضررالتعييرفكان لهم دفع الضررعن أنفسهم بالاعتراض ولهذا يثبت لهم حق الاعتراض بسبب عدم الكفاءة كذا هذا ولأنها بالبخس عن مهرمثلها أضرّت بنساء قبيلتها لأن مهرمثلها عند تقادم العهد تعتبر بها فكانت بالنقص ملحقه بالضرر بالقبيلة فكان لهم دفع هذا الضرر عن أنفسهم بالفسخ، والله أعلم. (بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع: ۲/ ۳۲۲،سعيد).

عالمگیری میں ہے:

ولا يكون التفريق بذلک إلا عند القاضي أما بدون فسخ القاضي فلا ينفسخ النكاح بينهما و تكون هذه فرقة بغيرطلاق حتى لو لم يكن الزوج دخل بها فلا شيء لها من المهر كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۹۲).

امدادالفتاوی میں ہے: اشتراطِ قضاءِ قاضی درفسخِ نکاح:

قاضی یعنی حاکم مسلم کے اجلاس میں رجوع کرے وہ فسخ کردیگا تو فسخ ہوجائیگا ورنہ بدونِ حکمِ حاکم مسلم کے فسخ نہ ہوگا۔(امدادالفتاوی:۲/ ۳۵۷).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

بالغہ نے اپنا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر ایسے مہر پر کرلیا جومہر مثل سے بہت کم ہے تو ولی عصبہ کوحق ہوگا کہ مہر مثل پورا کرائے اگرشوہرمہر مثل پورا کرانے پر راضی نہ ہوتو ولی قاضی کے ذریعہ تفریق کراسکتا ہے۔(مجموعہ قوانین اسلامی:ص ۱۹۱، دفعہ ۱۷)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:
”أولم ولو بشاۃ“

(رواہ البخاری)

عن أنسؓ قال: ”ما أولم النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی شيء من نسائہ ما أولم علی زینبؓ أولم بشاۃ“

(رواہ البخاری)

باب......﴿۵﴾

ولیمہ کا بیان

عقد نکاح کے بعد ولیمہ کا حکم:

سوال: عقد نکاح کے بعد میاں بیوی کے ملنے سے پہلے ولیمہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جمہور علماء کے نزدیک مسنون ولیمہ شبِ زفاف یا خلوۃِ صحیحہ کے بعد ہے، تاہم دیگر بعض علماء کے نزدیک عقد نکاح کے بعد بھی ولیمہ ہوسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن أنس بن مالک ﷺ يقول: بنى رسول الله صلى الله عليه وسلم بامرأة فأرسلني فدعوت رجالاً إلى الطعام. (رواه البخاري:۲/ ۷۷۷،باب الوليمة ولو بشاة).

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد اختلف السلف في وقتها: هل هو عند العقد أوعقيبه؟ أوعند الدخول أوعقيبه؟ أو موسع من ابتداء العقد إلى انتهاء الدخول، وعن جماعة منهم: أنها عند العقد، وعند ابن حبيب: عند العقد وبعد الدخول، وقال في موضع آخر: يجوز قبل الدخول وبعده، وقال الماوردي: عند الدخول، وحديث أنس ﷺ: فأصبح رسول الله صلى الله عليه وسلم عروساً بزينب ﷺ فدعى القوم، صريح بأنها بعد الدخول، واستحب بعض المالكية أن تكون عند البناء ويقع الدخول عقيبها، وعليه عمل الناس. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري:۱۴/ ۱۱۲،باب الصفرة للمتزوج،ملتان).

ملاعلی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں:

(أولم ولو بشاة) أي اتخذ وليمة، قال ابن الملك: تمسك بظاهره من ذهب إلى إيجابها والأكثرعلى أن الأمر للندب، قيل: إنها تكون بعد الدخول وقيل عند العقد وقيل: عندهما. (مرقات المفاتيح:٦/ ٢٥٠،باب الوليمة،ملتان).

عالمگیری میں ہے:

ووليمة العرس سنة وفيها مثوبة عظيمة وهي إذا بنى الرجل بامرأته ينبغي أن يدعو الجيران والأقرباء والأصدقاء ويذبح لهم ويصنع لهم طعاماً. (الفتاوی الهندية:٥/٣٤٣،كتاب الكراهية،الباب الثاني عشرفي الهداياو الضيافات).

کفایت المفتی میں ہے:

ولیمہ کی دعوت مسنون ہے،مگروہ دولہا والوں کی طرف سے زفاف کی صبح کو ہوتی ہے،...بعض روایات سے ثابت ہے کہ ام حبیبہؓ کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نجاشی کی موجودگی میں حضرت عثمانؓ نے کیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مہر کے چار سو دینار نجاشی نے دیئے اور ولیمہ حضرت عثمانؓ نے کھلایا یہ کھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بطور ولیمہ کے دیا گیا،اور زفاف سے پہلے دیا گیا،تو اس کا مضائقہ نہیں،کیونکہ ولیمہ دولہا کی طرف سے عقد کے وقت زفاف سے پہلے دیئے جانے کے بھی بعض علماء قائل ہیں،گو جماہیر علماء کے نزدیک زفاف کے بعد ہوتا ہے۔(کفایت المفتی:۵/۱۵۶،۱۵۷،دعوتِ ولیمہ،دارالاشاعت۔وفتاوی دارالعلوم دیوبند: ۷/۱۶۷،مدلل ومکمل)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

ولیمہ کی تاخیر کا حکم:

سوال: ولیمہ کی تاخیر کب تک درست ہے؟

الجواب: مسنون ولیمہ وہ ہے جو میاں بیوی کے ملنے کے بعد ہو،کیونکہ اس کا اصل مقصد ایک حلال وجائز تعلق کا اعلان واظہار ہے،جس رات بیوی کے ساتھ خلوت ہو اس دن یا اگلے دن ولیمہ کر لینا چاہئے،نیز تیسرے روز تک مؤخر کرنے کی بھی گنجائش ہے،لیکن تین دن سے زیادہ تاخیر درست نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں ہے:

ومنه مارواه البيهقي من حديث أنس رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:

الوليمة أول يوم حق، والثاني معروف، والثالث رياء وسمعة ، وقال صاحب التلويح: سنده صحيح فإن قلت: قد قال البيهقي: ليس هذا الحديث بقوي وفيه بكيربن خنيس تكلموا فيه، قلت: أثنى عليه جماعة منهم أحمد بن صالح العجلي، قال: كوفي ثقة، وقال البرقي عن يحيى بن معين: لا بأس به، وخرج الحاكم حديثه في المستدرك. (عمدة القاری شرح صحيح البخاری:۱۴/ ۱۳۰،باب اجابة الوليمة،ملتان).

عالمگیری میں ہے:

ولا بأس بأن يدعو يومئذٍ من الغد وبعد الغد ثم ينقطع العرس والوليمة،كذا في الظهيرية . (الفتاوى الهندية:۵/۳۴۳،كتاب الكراهية،الباب الثانی عشر فی الهدايا والضيافات).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

دعوتِ ولیمہ شادی اور رخصتی سے تین روز تک ہوتی ہے،اس کے بعد نہیں۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۲/۱۴۱،مبوب ومرتب).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

ولیمہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جس دن میاں بیوی کی خلوت ہوئی ہو،اس کے دوسرے دن دعوت کردی جائے ،حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح ہوا تو دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مدعو کیا اور کھانا کھلایا،(صحیح بخاری) دوسرے دن یا تیسرے دن بھی کھلانے کی گنجائش ہے،اس سے زیادہ تاخیر ثابت نہیں۔(کتاب الفتاویٰ:۴/۴۲۰، نکاح میں دعوت اور ولیمہ کے احکام)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عذر کی وجہ سے ایک ہفتہ کے بعد ولیمہ کا حکم:

سوال: ایک شخص کا نکاح ہوا اور بیوی کے ساتھ ملاپ بھی ہوگیا،لیکن بعض عوارض کی وجہ سے ولیمہ نہیں کرسکا،ایک ہفتہ کے بعد ولیمہ کی دعوت کرنا چاہتا ہے تو کیا اس طرح کرنا درست ہے یا نہیں؟ کیا سنت ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب: ولیمہ کا اصل مسنون وقت ملاپ کے بعد ہے،لیکن اگر کسی عارض کی وجہ سے چند دن کے بعد یا ہفتہ کے بعد ولیمہ کیا تب بھی سنت ادا ہوجائے گی،اس لیے کہ بعض روایات سے چند دن کے بعد ولیمہ کا ثبوت ملتا ہے،اور فقہاء نے جولکھا ہے کہ: **ولا بأس بأن يدعو يومئذٍ من الغد وبعد الغد ثم ينقطع العرس**

والوليمة .(الفتاوى الهندية:٥/٣٤٣).

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلسل تین دن کھلانے کے بعد ولیمہ ختم ہوا لیکن ولیمہ ہی نہیں کیا یا بعض عوارض کی وجہ سے تاخیر ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

بخاری شریف میں ہے:

حدثنامحمد بن كثيرعن سفيان عن حميدالطويل قال:سمعت أنس بن مالك ﷺ قال: قدم عبد الرحمن بن عوف ﷺ فأخى النبي صلى الله عليه وسلم بينه وبين سعد بن الربيع الأنصاري وعند الأنصاري امرأتان فعرض عليه أن يناصفه أهله وماله فقال: بارك الله في أهلك ومالك دلوني على السوق فأتي السوق فربح شيئاً من أقط وشيئاً من سمن فرأه النبي صلى الله عليه وسلم بعد أيام وعليه وضر من صفرة، فقال: مهيم ياعبد الرحمن فقال: تزوجت أنصارية، قال: فماسقت قال: وزن نواة من ذهب قال: أولم ولوبشاة. (رواه البخاري :٧٥٩/٢،باب قول الرجل لاخيه انظراى زوجي شئت ،فيصل).

سنن کبریٰ میں ہے:

عن أيوب عن محمد قال:حدثتني حفصة أن سيرين عرس بالمدينة فأولم فدعا الناس سبعاً وكان فيمن دعا أبي بن كعب ﷺ فجاء وهوصائم فدعا لهم بخير وانصرف. وكذا قاله حماد بن زيد عن أيوب سبعاً إلا أنه لم يذكرحفصة في إسناده.وقال معمرعن أيوب ثمانية أيام والأول أصح. (السنن الكبرى للبيهقي:٢٦١/٧،باب ايام الوليمة،دار المعرفة).

حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے بھی اعلاء السنن میں باب قائم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

باب جواز الوليمة إلى أيام إن لم يكن فخراً...عن حفصة بنت سيرين قالت: لما تزوج أبي دعا الصحابة سبعة أيام... (اعلاء السنن:١٣/١١،ادارة القرآن).

عقدِ نکاح کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے دعوتِ طعام کا حکم:

سوال: نکاح کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلانا مستحب ہے یا مباح یا بدعت؟

الجواب: حدودِ شریعت کے اندر رہتے ہوئے اگر لڑکی والے اپنی مرضی سے آنے والے مہمانوں کو کھلانا چاہیں تو ایک مباح امر ہے، لیکن آج کل شادی کے موقع پر جو دعوتیں ہوتی ہیں، ان میں تکلفات اور

اسراف زیادہ ہوتا ہے جو کہ مزاجِ شریعت کے بالکل خلاف ہے، لہذا اس میں اعتدال نہایت ضروری ہے یا یہ سلسلہ ختم ہی کر دینا مناسب ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کفایت المفتی میں ہے:

لڑکی والوں کی طرف سے برات کو جو کھانا کھلایا جاتا ہے اگر یہ اتفاقی ہو یا ضرورۃ دیا جائے مثلاً برات باہر سے آئی ہو اور کھانے میں بھی اسراف ریا و نمود اور پابندی رسم کو دخل نہ ہو تو ان شرائط کے ساتھ فی حدذاتہ مباح ہے۔ (کفایت المفتی: ۵/۱۵۳، دارالاشاعت).

دوسری جگہ مرقوم ہے:

لڑکی والوں کی طرف سے براتوں کو یا برادری کو کھانا دینا لازم یا سنت اور مستحب نہیں ہے، اگر بغیر التزام کے وہ اپنی مرضی سے کھانا دے دیں تو مباح ہے نہ دیں تو کوئی التزام نہیں۔ (کفایت المفتی: ۵/۱۵۷).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

یہ صحیح ہے کہ ولیمہ لڑکا یا اس کے اولیاء کریں گے، لیکن جو لوگ لڑکی والے کے مکان پر مہمان آتے ہیں اور ان کا مقصود شادی میں شرکت کرنا ہے اور ان کو بلایا بھی گیا ہے تو آخر وہ کھانا کہاں جا کر کھائیں گے، اور اپنے مہمان کو کھلانا تو شریعت کا حکم ہے اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے، البتہ لڑکے والے کی طرح مقابلہ پر ولیمہ لڑکی کی طرف سے ثابت نہیں ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۲/۱۴۲، مبوب ومرتب).

کتاب الفتاوی میں ہے:

نکاح کے موقع پر بغیر کسی جبر و دباؤ کے لڑکی والوں کی طرف سے بھی ضیافت کی گنجائش ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح پر بکرا ذبح کیا ہے اور اس پر مہاجرین وانصار کو مدعو کیا ہے، جب مرد کھانے سے فارغ ہو گئے تو کھانا ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے پاس بھیجا گیا، تاکہ جو خواتین آئیں وہ وہاں کھائیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے تفصیل کے ساتھ یہ روایت منقول ہے، جو مصنف عبدالرزاق کے چار صفحات پر مشتمل ہے، پس یہ دعوت طعام سنت تو نہیں ہے، نہ عہد صحابہ میں اس کا عمومی رواج تھا، اس لیے اس رواج دینا بھی مناسب نہیں، البتہ اس کی گنجائش ہے۔ (کتاب الفتاوی: ۴/۱۷-۴۱، نکاح میں دعوت اور ولیمہ کے احکام).

ملاحظہ ہو حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ مصنف عبدالرزاق میں ہے:

(۱) عبد الرزاق عن يحيى بن العلاء البجلي عن عمه شعيب بن خالد عن حنظلة بن

سمرة بن المسيب عن أبيه عن جده عن ابن عباس رضي الله عنه قال: كانت فاطمة تذكر لرسول الله صلى الله عليه وسلم فلا يذكرها أحد إلا صد عنه، حتى يئسوا منها فلقي سعد بن معاذ رضي الله عنه علياً فقال: إني والله ما أرى رسول الله صلى الله عليه وسلم يحبسها إلا عليك....إلى قوله فانطلق علي رضي الله عنه، فقال: يا رسول الله متى تبنيني؟ قال: الثالثة إن شاء الله، ثم دعا بلالاً، فقال: يا بلال إني زوجت ابنتي ابن عمي، وأنا أحب أن يكون من سنة أمتي إطعام الطعام عند النكاح، فأت الغنم، فخذ شاة، وأربعة أمداد أوخمسة، فاجعل لي قصعة لعلي أجمع عليها المهاجرين والأنصار، فإذا فرغت منها فآذني بها، فانطلق ففعل ما أمره، ثم أتاه بقصعة، فوضعها بين يديه، فطعن رسول الله صلى الله عليه وسلم في رأسها، ثم قال: ادخل على الناس زفةً زفةً...حتى فرغ الناس،ثم عمد النبي صلى الله عليه وسلم إلى ما فضل منها فتفل فيه، وبارك، وقال: يا بلال! احملها إلى أمهاتك، وقل لهن: كلن وأطعمن من غشيكن ... (مصنف عبدالرزاق:٥/٤٨٦_٤٨٩،رقم ٩٧٨٢،باب تزويج فاطمة رضى الله تعالىٰ عنها_ويحيى بن العلاء البجلي متروك).

اس روایت میں یحیی بن علاء بجلی راوی متروک ہے،لہذا یہ روایت قابل اعتماد نہیں ہے۔

(۲)بعض حضرات نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کی روایت سے استدلال فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو خط لکھا کہ ام حبیبہ سے میرا نکاح کرادو،اور خالد بن سعید نکاح کے وکیل بنے،اور نجاشی نے نکاح پڑھایا پھر اسی مجلس میں کھانا کھایا گیا۔

ملاحظہ ہو مستدرک حاکم میں ہے:

ثم أراد أن يقوموا فقال: اجلسوا فإن سنة الأنبياء عليهم الصلاة والسلام إذا تزوجوا أن يؤكل الطعام على التزويج، فدعا بطعام فأكلوا. (المستدرك للحاكم: ٤/٢٦/ ٦٧٧٠،ذكر أم حبيبةؓ_والاستيعاب لابن عبدالبر:١/٦٢٦،أم حبيبة بنت أبي سفيانؓ).

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

قلت: وليس ذلك بوليمة، بل هو طعام التزويج، ويلتحق به ما تعارفه المسلمون من نثر التمر ونحوه في مجلس النكاح. (اعلاء السنن:١١/١٢).

لیکن مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اسے طعام ولیمہ پر محمول فرمایا ہے،کما تقدم۔

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکی والے مہمانوں کے اکرام میں ان کو کچھ کھلا دیں تو ٹھیک ہے، لیکن مسنون نہیں ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دعوتِ ولیمہ میں منکرات ہوں تو شرکت کا حکم:

سوال: اگر دعوتِ ولیمہ میں گانا، بجانا، ویڈیو کیمرہ، عورتوں اور مردوں کا اختلاط وغیرہ منکرات ہوں تو ایسی دعوت میں شرکت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسی دعوتوں میں شرکت کی گنجائش نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں البحر الرائق میں ہے:

وإن كان هناك لعب وغناء قبل أن يحضر فلا يحضر لأنه لا يلزمه الإجابة إذا كان هناك منكر لما روي عن علي رضي الله عنه قال: صنعت للنبي صلى الله عليه وسلم طعاماً فدعوته له فحضر فرأى في البيت تصاوير فرجع. (البحر الرائق: ۸/۱۸۸، كتاب الكراهية، كوئته، كذا في الهداية: ٤/٤٥٥، كتاب الكراهية).

کتاب الفتاوی میں ہے:

گانا، بجانا، ویڈیو گرافی، نیز فوٹو گرافی، گناہ اور معصیت ہے اور جس دعوت میں معصیت کا ارتکاب ہو اس میں شرکت جائز نہیں، مشہور فقیہ علامہ شامیؒ نے اپنے زمانہ میں فسق وفجور کی کثرت کو دیکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں جب تک معلوم نہ ہو کہ دعوت میں معصیت وبدعت نہیں ہوگی، اس وقت تک اس میں شرکت نہیں کرنی چاہئے۔ ”والامتناع أصل في زماننا إلا إذا علم يقيناً أن لا بدعة ولا معصية“. (رد المحتار: ۹/۵۰۱) ہمارے اس عہد میں تو بدرجہ اولیٰ جب تک ایسی دعوتوں کے منکرات سے خالی ہونے کا اطمینان نہ ہو جائے، شرکت نہیں کرنی چاہئے، اگر سماج کے سمجھدار اور باشعور لوگ اپنے آپ کو ایسی دعوتوں سے دور رکھیں تو شاید معاشرے کی کچھ اصلاح ہو سکے۔ (کتاب الفتاوی: ۴/۴۱۴، نکاح میں دعوت اور ولیمہ کے احکام۔ وفتاوی حقانیہ: ۴/۴۲۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

باب ...... ﴿۶﴾

نکاح کے متفرق مسائل

مجلس نکاح میں وعظ ونصیحت کا حکم:

سوال: مجلس نکاح میں کسی عالم کا وعظ ونصیحت کرنا درست ہے یا نہیں؟ یا بدعت ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر اس کو سنت یا لازم نہ سمجھے، بلکہ مصلحتِ وقت سمجھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں، امورِ محدثہ کو زہر قاتل سمجھنے والے سلفی بھی اس کو جائز کہتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں فتاوی علماء البلد الحرام میں ہے:

لا مانع من القاء محاضرة نافعة على الحاضرين في أمرهم بالمعروف ونهيهم عن المنكر في حفل الزواج. (فتاوى علماء البلدالحرام: ۱۳۸۵، الباب الرابع عشر، النكاح).

کتاب الفتاوی میں ہے:

اردو میں خطبہ نکاح نہیں پڑھنا چاہئے، بہتر یہ ہے کہ پہلے اردو میں خطبہ نکاح کا مطلب بیان کر دیا جائے، پھر عربی زبان میں خطبہ پڑھ دیا جائے، اس سے ایک طرف لوگ اپنی زبان میں احکام نکاح کو سمجھ لیں گے، اور خطبہ کا اصل مقصد حاصل ہوگا، اور عربی میں خطبہ دینے سے یہ فائدہ ہوگا کہ بعینہٖ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ میں خطبہ کی ادائے گی ہوگی، اور اس کا افضل واولیٰ ہونا ظاہر ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۴/۳۰۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نصرانی عورت کے ساتھ ہونے والے نکاح کو مسجد میں رکھنے کا حکم:

سوال: ایک شخص ایک نصرانی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے لڑکی مسلمان ہونے کے لیے تیار نہیں، کیا یہ

نکاح مکروہ ہے یا بالکل جائز ہے؟ مکروہ ہونے کی صورت میں اگر لڑکے والے اس نکاح کو مسجد میں رکھنے پر مصر ہوں تو کمیٹی اجازت دے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: کتابیہ یعنی یہودی یا نصرانی عورت سے نکاح کی تفصیل گزر چکی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ مکروہ سے کم درجہ نہیں، پھر جب یہ نکاح مکروہ ہے تو مسجد کو اس مکروہ کام سے پاک رکھنا چاہئے، مسجد میں مباح باتوں کے لیے قصداً بیٹھنا بھی مکروہ ہے، مسجد میں ناپاک تیل جلانا بھی مکروہ ہے، بچے اور مجانین کو داخل کرنا بھی مکروہ ہے، تو یہ مکروہ نکاح بھی کسی اور جگہ ہونا چاہئے، اگر کمیٹی منع کرے تو بالکل بجا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نکاح پڑھانے کی اجرت کا حکم:

سوال: کیا اجرت علی النکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اجرت علی النکاح جائز ہے جب کہ اس میں جبر کا معاملہ نہ ہو بلکہ اپنے اختیار سے بلا جبر اجرت مقرر کر لی جائے، لیکن صغیرہ کا ولی نکاح خواں ہو تو صغیرہ کے مال میں سے اجرت لینا جائز نہیں، اسی طرح اگر کسی جگہ ایک ہی نکاح خواں ہو اور دوسرے کو نکاح خوانی کی اجازت نہ دیتا ہو اور اپنی صواب دید پر اجرت لیتا ہو تو اس کے لیے بھی اجرت لینا جائز نہ ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں المحیط البرہانی میں ہے:

وفي "فتاوى النسفي" وإذا كان القاضي يتولى القسمة بنفسه حل له أخذ الأجرة وكل نكاح باشره القاضي وقد وجبت مباشرته عليه كنكاح الصغار والصغائر، فلا يحل له أخذ الأجرة عليه، وما لم تجب مباشرته عليه حل له أخذ الأجرة عليه. (المحيط البرهاني:۸/۵۰۲، الفصل السابع عشر، دار احياء التراث العربي).

(ومثله في تكملة ردالمحتار على الدر المختار:۷/۵۹، سعيد۔ والفتاوى الهندية:۳/۳۴۵، الباب الخامس عشر).

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

ولو تولى نكاح صغير لايحل له أخذ شيء لأنه واجب عليه وكل ما وجب عليه لا يجوز أخذ الأجر وما لايجب عليه أخذ الأجر. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية:۵/۱۴۰).

امداد الفتاوی میں ہے:

جس طرح تعلیم قرآن، تعلیم فقہ، امامت اور اذان پر بلحاظ ضرورت کے اجرت مقررہ یا اجر مثل کا دینا یا لے لینا

درست ہے اسی طرح ملائے نکاح خواں کو حرمت وحلت نکاح کے مواقع اور مشروع صورت میں نکاح کے ایجاب وقبول اور تقرر مہر وغیرہ کے شرعی طریقے بتلا دینے کی اجرت مقررہ یا اجر مثل لینا اور عقد کرنے اور کرانے والوں کو دینا شرعاً درست ہے جس طرح مثلاً تعلیم فقہ پر اجرت کے لینے اور دینے کے بند ہو جانے میں علم فقہ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے اسی طرح ملائے نکاح خواں کی مذکورہ بالا اجرت بند ہو جانے میں نکاحوں کے شرعاً فاسد اور باطل ہو جانے اور دیگر مفاسد پیدا ہو جانے کا سخت خطرہ ہے۔ (امداد الفتاوی:۲/۲۷۱).

فتاوی فریدیہ میں ہے:

نکاح خواں کی اجرت انعام ہے کما لایخفی علی من راجع إلی العرف، اور اگر اجرت ہو تب بھی جائز ہے، لکونها أجرة علی تعلیم الإیجاب والقبول وتلقینها. (فتاوی فریدیہ:۴/۳۸۲).

کفایت المفتی میں ہے:

نکاح خوانی طرفین یعنی قاضی اور اس کو بلانے والے کی باہمی رضامندی سے لینی جائز ہے۔ (کفایت المفتی: ۵/۱۴۸، دارالاشاعت)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

لڑکی کی رخصتی میں والدین کا ساتھ جانا:

سوال: ایک لڑکی کی شادی ہوئی، اس کی رخصتی باقی ہے، بعض حضرات سے سنا ہے کہ لڑکی کے والدین لڑکی کو شوہر کے گھر پہونچا دے، اس سلسلہ میں احادیث وآثار کی روشنی میں رہنمائی فرمائے؟

الجواب: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی رخصتی کے بارے میں احادیث میں مذکور ہے کہ ان کی والدہ ام رومان رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور کچھ عورتوں نے ان کو پہونچایا، اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پہونچایا، اس سے معلوم ہوا کہ دلہن کی رخصتی میں عورتیں ساتھ جایا کرتی تھیں۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالیٰ عنها قالت: تزوجني النبي صلی الله علیه وسلم فأتتني أمي فأدخلتني الدار فإذا نسوة من الأنصار في البیت فقلن علی الخیر والبرکة وعلی خیر طائر.

(رواه البخاري: کتاب النکاح، باب الدعاء للنساء اللاتي یهدین العروس: ۲/۷۷۵).

عمدۃ القاری میں ہے:

والمراد بالنسوة الهاديات وهي أم عائشة رضي الله تعالىٰ عنها ومن معها من النساء لأن العادة أن أم العروس إذا أتت بالعروس إلى بيت زوجها يكون معها نساء قليلات كن أو كثيرات .

(عمدة القاری:۱۱۵/۱٤،باب الدعاء للنساء ،ملتان).

شامی میں ہے:

(قوله وهل يكره الزفاف) وهو بالكسر كالكتاب إهداء المرأة إلى زوجها، قاموس، والمراد به هنا اجتماع النساء لذلک لأنه لازم له عرفاً، أفاده الرحمتي. (شامی:۹/۳،کتاب النکاح، سعید).

ذخائر العقبی میں ہے:

وعن أنس رضي الله تعالىٰ عنه قال جاء أبوبكر وعمررضي الله تعالىٰ عنهما يخطبان فاطمة رضي الله تعالىٰ عنها إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فسكت ولم يرجع إليهما شيئاً فانطلقا إلى علي رضي الله تعالىٰ عنه يأمرانه بطلب ذلک...إلى قوله وأمرهم أن يجهزوها فجعل لها سرير مشرط ووسادة من أدم وحشوها ليف، وقال لعلي رضي الله تعالىٰ عنه: إذا أتتک فلا تحدث شيئاً حتى آتيک فجاء ت مع أم أيمن رضي الله تعالىٰ عنها....

(ذخائر العقبي لأحمد بن عبد الله الطبرى:۲۸/۱، باب ذكر تزويجها بعلي رضي الله تعالىٰ عنه-ومثله في سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد لمحمد بن يوسف الشامي:٤۱/۱۱،الباب التاسع في بعض مناقب السيدة فاطمة رضي الله تعالىٰ عنها بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم-وكذا في اتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب للمناوي:۵/۱،الباب الثاني في تزويجها بعلي رضي الله تعالىٰ عنه).

(''سریر مشرط'' کا مطلب کھجور کی بٹی ہوئی رسیوں سے بنی ہوئی چارپائی)۔واللہ ﷻ اعلم۔

دولہن کی کار کی تزیین کا حکم:

سوال: دولہن کی کار کو مزین کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ ایک غیر ثابت اور قابل ترک رسم ہے، اور نصاریٰ کا طریقہ ہے اس سے بچنا ضروری ہے، اگر اس کو ضروری اور سنت نہ سمجھیں تب بھی بے کار اور بے ضرورت ہونے کی وجہ سے قابل ترک ہے۔

حدیث شریف میں ہے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر قوموں کی مخصوص تہذیب وثقافت اختیار کرنے سے منع

فرمایا:" **من تشبه بقوم فهو منهم** ". (رواه أبو داود في باب لبس الشهرة).

فتاوی محمودیہ میں دولہا دولہن کے لیے پالکی کی سواری کے بارے میں مرقوم ہے:

یہ ایک غیر ثابت رسم ہے، اس کی پابندی عملی طور پر التزام مالایلتزم اور ایک رسم محض ہے، اس کو ترک کردینا چاہئے، اگر اس میں قربت کا تصور بھی ہے تو رسم سے بڑھ کر بدعت بھی ہے۔ (فتاوی محمودیہ:۱۱/۲۱۱، مبوب ومرتب).

فتاوی رحیمیہ میں شادی کے رسم ورواج کے بارے میں مرقوم ہے:

فقیہ محدث قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ تحریر فرماتے ہیں: مسلم را تشبہ بہ کفار وفساق حرام است۔ مالا بد منہ۔ (فتاوی رحیمیہ:/۱۸۹).

کفایت المفتی میں ہے:

(شادی کی رسومات ختم کرانے کی ضرورت): اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس وقت مسلمانوں کی تباہی اور اقتصادی مصیبت کی زیادہ تر وجہ یہی مسرفانہ رسوم ہیں، یہ رسوم اندر ہی اندر مسلمانوں کی دولت، عزت، خودداری کو گھن کی طرح کھائے جارہی ہیں، جو رسمیں کہ کافروں سے سیکھ کر مسلمانوں نے اختیار کرلی ہیں ان کے تو ناجائز اور واجب الترک ہونے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا.... (کفایت المفتی:۵/۱۵۵، کتاب النکاح، دار الاشاعت).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اسلامی فقہ:۲/۸۵۔۸۸، شادی بیاہ کی رسوم۔ وآپ کے مسائل اور ان کا حل:۵/۲۰۰، شادی میں ہندوانہ رسوم جائز نہیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شادی کے موقع پر مہندی لگانے کا حکم:

سوال: شادی کے موقع پر مہندی لگانے کا کیا حکم ہے؟ نیز اس میں رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے، اور عورتیں جمع ہوکر لگاتی ہیں اس میں ناچ، گانا بجانا بھی ہوتا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عورتوں کے لیے انفرادی طور پر شادی وخوشی کے موقع پر مہندی لگانا مستحب ہے، لیکن رسم ورواج کی پابندی اور گانا بجانا وغیرہ منکرات ناجائز ہیں، ان سب کا ترک لازم ہے۔

ملاحظہ ہو احسن الفتاوی میں ہے: عورتوں کے لیے مہندی لگانا مستحب ہے، مگر آج کل جو مہندی کی رسم ہے کہ دوسری عورتوں کا بھی بڑا مجمع لگ جاتا ہے یہ کئی مفاسد کا مجموعہ ہے اس لیے اس سے احتراز لازم ہے، اپنے طور پر عورتیں مہندی لگاسکتی ہیں۔ (احسن الفتاوی:۸/۱۶۰).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

عورتوں کو مہندی لگانا درست ہے، بلکہ ان کے لیے مخصوص ہے کہ ہاتھ، پیر کو لگائیں، مردوں کو ان کی مشابہت اختیار کرنا درست نہیں۔ (فتاوی محمودیہ:۱۱/۲۱۴،مبوب ومرتب)۔

حلال وحرام میں ہے:

عورتوں کے لیے چونکہ زیبائش وآرائش کی رعایت زیادہ کی گئی ہے اس لیے وہ مہندی بھی لگا سکتی ہیں، ہاتھوں میں بھی اور پاؤں میں بھی۔ (حلال وحرام:۲۰۹،ازمولانا خالد سیف اللہ صاحب)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

عقد نکاح کے موقع پر کھجور لٹانے کا حکم:

سوال: عقد نکاح کے موقع پر کھجور لٹانے کا کیا حکم ہے؟ کیا کسی روایت سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء نے عقد نکاح کے موقع پر کھجور تقسیم کرنے کی اجازت دی ہے اور لٹانے کی بھی، البتہ مسجد میں نکاح ہو تو تقسیم کرنا بہتر ہے کہ اس میں مسجد کے احترام کی رعایت ہے۔ نیز اس سلسلہ میں روایات بھی مروی ہیں، لیکن امام بیہقیؒ نے فرمایا کہ تمام روایات ضعیف ہیں۔

ملاحظہ ہو سنن کبری میں ہے:

قال الإمام البيهقيؒ وقد روي في الرخصة فيه أحاديث كلها ضعيفة. (السنن الكبرى:۷/۲۸۷)۔

روایات کی تفصیل وتحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: فتاوی دارالعلوم زکریا جلد اول ص۴۰۶ ابواب الحدیث۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

لا بأس بنثر السكر والدراهم في الضيافة وعقد النكاح كذا في السراجية. (الفتاوى الهندية:۵/۳۴۵،الباب الثالث عشر في النهبة ونثر الدراهم والسكر...)۔

کتاب الفتاوی میں ہے:

مساجد کے اندر اگر نکاح ہو تو کھجور لٹانے سے بہتر تقسیم کر دینا ہے کہ اس میں احترام مسجد کی زیادہ رعایت ہے۔ (کتاب الفتاوی:۴/۴۴۵)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

نکاح کے بعد مصافحہ ومعانقہ کا حکم:

سوال: نکاح سے فارغ ہو کر لوگ مصافحہ ومعانقہ کرتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ اگر لوگ اس کو سنت نہ سمجھیں بلکہ صرف خوشی اور اظہار محبت کا ذریعہ ووسیلہ سمجھیں اور نہ کرنے والوں پر نکیر بھی نہ کریں تو کیا

حکم ہوگا؟

الجواب: روایاتِ کثیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشی اور محبت کے اظہار کے لیے مصافحہ ومعانقہ جائز اور درست ہے، تو نکاح کے موقع پر بھی اس کی اجازت ہوگی، لیکن اس کو عبادت اور سنت سمجھنا بدعت ہے، جیسا کہ ہمارے اکابرؒ نے فرمایا ہے، عبادت سمجھنے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ نہ کرنے والوں پر نکیر اور ملامت کی جائے۔

روایات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاوی دارالعلوم زکریا جلد دوم ص۵۹۰-۵۹۳، نماز عیدین کا بیان)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

جنات سے حمل ٹھہرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت کو حمل ٹھہرا اس کو پوچھا گیا کہ بچہ کہاں سے آیا وہ کہتی ہے کہ جن سے تو کیا اس کی بات مانی جائے گی؟ کیا جنات سے حمل ٹھہر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جنات کے ساتھ مناکحت جائز نہیں ہے، جس کی تفصیل گزر گئی، البتہ جنات سے حمل ٹھہرنا ممکن ہے، اس کے باوجود عورت کی یہ بات نہیں مانی جائے گی، اس لیے کہ اس دعویٰ سے فساد پھیلنے کا خطرہ ہے۔

ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر میں ہے:

...و بعضهم استدل بما رواه حرب الكرماني في مسائله عن أحمد وإسحاق، قال: حدثنا محمد بن يحيى القطيعي حدثنا بشر بن عمر بن لهيعة عن يونس بن يزيد عن الزهري قال: "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نكاح الجن" وهو وإن كان مرسلاً فقد اعتضد بأقوال العلماء. (الاشباه والنظائر:۳/۹۴، احكام الجان، ادارة القرآن).

وكرهه الإمام مالكؒ فقال: أخشى أن توجد بنت حاملاً وتسأل عن حملها فتقول: تزوجني جني، وبذلك يكثر الفساد. (قرة العين لعبد الله بن محمد بن الصديق الغماری ص۶۹، بیروت۔ ومثله فی "الاشباه والنظائر":۳/۹۵، احكام الجان، ادارة القرآن)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

نصرانی عورت کے مشرف باسلام ہونے سے نکاح کا حکم:

سوال: اگر نصرانی آدمی کی بیوی مسلمان ہوگئی تو اس کو کیا کرنا چاہئے اور اگر نصرانی مرد مسلمان ہو اور بیوی اب تک نصرانیہ ہے تو نکاح باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب: غیر مسلم زوجین میں سے صرف بیوی اسلام لے آئے تو اگر ممکن ہو تو شوہر پر تین بار اسلام پیش کیا جائے گا، اگر شوہر نے بھی اسلام قبول کرلیا تو وہ نکاح قائم رہے گا، اور اگر اس کے بعد بھی شوہر اسلام قبول کرنے سے انکار کردے یا خاموش رہے اور اگر ممکن ہو تو قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کردے، لہذا عدت گزار کر عورت کسی مسلمان سے نکاح کرسکتی ہے، اور اگر اسلام پیش کرنا یا قاضی کے ذریعہ تفریق کرانا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں عورت کا تین حیض، یا اگر اسے حیض نہ آتا ہو تو تین ماہ گزر جانے پر، یا حاملہ ہو تو وضع حمل کے بعد نکاح ختم ہوجائے گا، اور پھر عدت کے بعد اس کے لیے نکاح کرنا جائز ہوجائے گا۔

ولو أسلم أحد الزوجين عرض الإسلام على الآخر فإن أسلم وإلا فرق بينهما كذا في الكنز، وإن سكت ولم يقل شيئاً فالقاضي يعرض الإسلام عليه مرة بعد أخرى حتى يتم الثلاثة احتياطاً كذا في الذخيرة... وإذا أسلم أحد الزوجين في دار الحرب ولم يكونا من أهل الكتاب أو كانا والمرأة هي أسلمت فإنه يتوقف انقطاع النكاح بينهما على مضي ثلاث حيض سواء دخل بها أو لم يدخل بها كذا في الكافي، فإن أسلم الآخر قبل ذلك فالنكاح باق ولو كانا مستأمنين فالبينونة إما بعرض الإسلام على الآخر أو بانقضاء ثلاث حيض.... ولو كانت لا تحيض بصغر أو كبر لا تبين إلا بمضي ثلاثة أشهر. (عالمگیری:۱/۳۳۸، وهكذا في الدر المختار مع ردالمحتار:۲/۵۳۴-۵۳۶).

وإن كانت حاملاً فحتى تضع حملها، ح من القهستاني. (ردالمحتار:۲/۵۳۷).

اور اگر صرف شوہر اسلام لے آئے اور بیوی کتابیہ ہو تو نکاح باقی رہے گا، اور اگر بیوی غیر کتابیہ ہو اور اسلام پیش کرنا ممکن ہو تو اس پر تین بار اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کرلے یا دین کتابی میں داخل ہوجائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی، اور اگر اسلام پیش کرنا یا تفریق کرنا ممکن نہ ہو تو تین حیض یا تین ماہ یا حاملہ ہو تو ولادت کے بعد نکاح خود بخود ختم ہوجائے گا۔

لو أسلم زوج الكتابية بقي نكاحهما كذا في الكنز. (عالمکیری:۱/۳۳۸).

أن زوج الكتابية إذا أسلم يبقى النكاح لجواز التزوج بها ابتداء. (البحرالرائق:۳/۲۱۱).

إذا أسلم الزوج وهي مجوسية فتهودت أو تنصرت، داما على النكاح كما لو كانت يهودية أو نصرانية من الابتداء كذا في المبسوط. (البحرالرائق:۳/۲۱۱).

(قوله ولو أسلم زوج الكتابية بقي نكاحهما) فهو مخصوص لكل من المسئلتين صادق

بصورتين مع إذا كان الزوج كتابياً أو مجوسياً لأنه يصح النكاح بينهما ابتداء فلأن يبقى أولىٰ ولو تمجست يفرق بينهما لفساد النكاح. (البحر الرائق:٣/٢١٣۔وهكذا في الدر المختار مع ردالمحتار:٣/٥٣٥)۔(مأخوذ از مجموعہ قوانین اسلامی ص٦٩۔٧٠،دفعہ٦٦۔٦٧)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

کسرِ شہوت کا علاج:

سوال: جب میں کسی مجبوری کی وجہ سے شادی نہیں کرسکتا ہوں، اور مسلسل روزے رکھنے کی وجہ سے انتہائی کمزوری لاحق ہوتی ہے حتی کہ مرنے کے قریب ہوجاتا ہوں اور شہوت علی حالہ باقی رہتی ہے تو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہے کسرِ شہوت کے لیے؟

الجواب: حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ جو شخص نکاح نہ کرسکتا ہو تو روزہ اس کے لیے بہترین ڈھال ہے، لیکن کسی پر اثر نہ ہو تو امام غزالیؒ نے فرمایا کہ بھوکا رہے، نگاہ نیچی رکھے اور ایسے کام میں دل کو مشغول کردے کہ ذہن شہوت وغیرہ کی طرف نہ جائے، اگر یہ چیزیں بھی نفع بخش ثابت نہ ہوں تو نکاح بہترین راستہ ہے، بایں ہمہ استمناء اکثر اوقات میں ناجائز ہے اور اختصاء شرعاً ممنوع ہے۔

ملاحظہ فرمائیں بخاری شریف میں ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج ومن لم يستطع فعليه بالصوم فإنه له وجاء". (رواه البخاري:٢/٧٥٨).

فتح الباری میں ہے:

وفي الحديث أيضاً إرشاد العاجز عن مؤن النكاح إلى الصوم، لأن شهوة النكاح تابعة لشهوة الأكل تقوى بقوته وتضعف بضعفه، واستدل به الخطابي على جواز المعالجة لقطع شهوة النكاح بالأدوية، و حكاه البغوي في "شرح السنة" و ينبغي أن يحمل على دواء يسكن الشهوة دون ما يقطعها إصالة لأنه قد يقدر بعد فيندم لفوات ذلك في حقه، وقد صرح الشافعية بإنه لا يكسرها بالكافور و نحوه والحجة فيه أنهم اتفقوا على منع الجب و الخصاة فيلحق بذلك ما في معناه من التداوي بالقطع أصلاً ... واستدل به بعض المالكية على تحريم الاستمناء لأنه أرشد عند العجز عن التزويج إلى الصوم الذي ينقطع الشهوة، فلو كان الاستمناء مباحاً لكان الإرشاد إليه أسهل... (فتح الباري:٩/١١١،باب قول النبي صلى الله عليه وسلم "

من استطاع الباءة فليتزوج ")۔

عمدۃ القاری میں ہے:

واستدل به الخطابي على جواز المعالجة لقطع شهوة النكاح بالأدوية، وحكاه البغوي في شرح السنة وينبغي... واستدل به بعض المالكية على تحريم الاستمناء، وقد ذكر أصحابنا الحنفية أنه يباح عند العجز لأجل تسكين الشهوة. (عمدة القارى:۱۴/۹، ملتان)۔

احیاء العلوم میں ہے:

فلينظر المريد إلى حاله وقلبه فإن وجده في العزوبة فهو الأقرب وإن عجز عن ذلك فالنكاح أولىٰ به ودواء هذه العلة ثلاثة أمور: الجوع، وغض البصر، والاشتغال بشغل يستولي على القلب، فإن لم تنفع هذه الثلاثة فالنكاح هو الذي يستاصل مادتها فقط، لهذا كان السلف يبادرون إلى النكاح وإلى تزويج البنات. (احياء علوم الدين:۳/۱۰۰، كتاب كسر الشهوتين)۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے:

وعن سعد بن أبي وقاص رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: رد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم على عثمان بن مظعون التبتل ولو أذن له اختصينا. متفق عليه. (مشكاة :۲/۲۶۷، كتاب النكاح)۔

درمختار میں ہے:

فرع في الجوهرة الاستمناء حرام وفيه التعزير، وفي الشامي: قوله الاستمناء حرام أي بالكف إذا كان لاستجلاب الشهوة أما إذا غلبته الشهوة وليس له زوجة ولا أمة ففعل ذلك لتسكينها فالرجاء أنه لا وبال عليه كما قاله أبو الليث ويجب لو خاف الزنا. (الدر المختار مع رد المحتار:۴/۲۷، سعيد)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

عزل کا حکم:

سوال: کیا اپنی بیوی سے عزل کرنا درست ہے یا نہیں؟ دور نبوی میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی اولاد کے وقفے کے لیے عزل کرے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منع حمل کی جو صورت مروج تھی اس کو فقہی اصطلاح میں

عزل کہتے ہیں،اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشادات اس کے متعلق مختلف سوالوں کے جواب میں فرمائے وہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے صاف طور پر ممانعت معلوم ہوتی ہے اور نہ صریح طور سے جائز مستفاد ہوتا ہے، البتہ اتنا ضرور واضح ہوجاتا ہے کہ آپ نے اس عمل کو پسند نہیں فرمایا، اسی لیے اس مسئلہ میں ائمہ سلف میں اختلاف رہا، بعض نے مطلقاً ناجائز قرار دیا، اور بعض نے کہا کہ یہ عمل فی نفسہ ناپسندیدہ ہے مگر خاص خاص ضرورتوں کے ماتحت اجازت بھی دی جاسکتی ہے، اور اگر کسی غرض فاسد کی وجہ سے کیا جائے تو ناجائز ہے، مثال کے طور پر یہ خیال ہو کہ لڑکی ہوگئی تو بدنامی ہوگی تو اس عمل کو جائز نہیں کہا جاسکتا، اس لیے کہ اس کی بناء وہ نظریہ ہے جس پر قرآن کریم نے جابجا نکیر فرمائی ہے، اسی طرح کوئی شخص مفلسی کے وہم سے یہ کام کرے تو بھی جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس کا مقصد اسلام کے بنیادی اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔

ان اعذار کا تذکرہ جن کو شریعت میں معتبر سمجھا گیا ہیں:

عورت اتنی کمزور ہے کہ بارِ حمل کا تحمل نہیں کرسکتی، یا کسی دور دراز کے سفر میں ہے یا کسی ایسے مقام میں ہے جہاں پر قیام وقرار کا امکان نہیں، خطرہ لاحق ہے، یا زوجین کے باہمی تعلقات ہموار نہیں، جدائی کا قصد ہے، اسی طرح اگر ماحول کے بگاڑ اور فساد زمانہ کی وجہ سے اولاد کے بگڑ جانے کا قوی امکان ہو تو ایسی صورت میں بھی عزل جائز ہوگا۔

ردالمحتار میں مرقوم ہے:

وفي الفتاوى إن خاف من الولد السوء في الحرة يسعه العزل بغير رضاها لفساد الزمان، ويحتمل أنه أراد الحاق مثل هذا العذر به كأن يكون في سفر بعيد، أو في دار الحرب فخاف على الولد، أو كانت الزوجة سيئة الخلق ويريد فراقها فخاف أن تحبل.

(ردالمحتار:۳/۱۷۶،سعید).

ان سب اعذار کا خلاصہ یہ ہے کہ شخصی اور انفرادی طور پر کسی شخص کو عذر پیش آجائے تو عذر کی حد تک اس طرح کے عمل کی گنجائش ہوگی، عذر رفع ہونے کے بعد اس کے لیے بھی درست نہیں اور عام لوگوں کے لیے اجتماعی طور پر اس کی ترویج بہر حال ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔ (ضبط ولادت کی عقلی وشرعی حیثیت از مفتی محمد شفیع صاحبؒ از ص۱۳ تا ۲۰).

کتاب الفتاوی میں ہے:

جو صورت آپ نے ذکر کی ہے، اس کو عربی زبان میں عزل کہتے ہیں، محض اس خوف سے عزل کرنا کہ اگر بچے پیدا ہوئے تو اس کی روٹی روزی کا کون نظم کرے گا؟ جائز نہیں ہے، لیکن طبی ضرورت کے تحت عزل کرنا جائز ہے۔

(کتاب الفتاوی:۴/۴۴۴،متفرقاتِ نکاح)۔واللہ ﷻ اعلم۔

عزل کے علاوہ دوسرا طریقہ استعمال کرنے کا حکم:

سوال: طریقہ (عزل) کے علاوہ جو طریقے مانعِ حمل کے اس جیسے ہیں کیا وہ بھی جائز ہیں مثلاً (Barrier Methods) وغیرہ؟

الجواب: عزل کے علاوہ منع حمل کے اور جو طریقے ہیں وہ انجکشن کی شکل میں ہو یا گولیوں کی شکل میں ہوان تمام کو اگر عذر شرعی کی وجہ سے کیا جائے تو گنجائش ہوگی، اور اگر کسی دوا کے استعمال کی وجہ سے جسمانی صحت پر منفی اثرات بھی پڑتے ہوں (جن کو سائڈ ایفکٹ (Side Effect) کہا جاتا ہے) تو ماہر طبیب کے مشورہ کے بغیر استعمال نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ قرآن وسنت کی رو سے انسانی صحت کی حفاظت ضروری ہے۔

لیکن اگر مادر رحم میں مادۂ منویہ کے پہونچ جانے کے چند ہفتے بعد ہوتو اس کو عزل نہیں کہتے، اس کا حکم یہ ہے کہ بغیر کسی سخت مجبوری اور ماہر طبیب کے مشورہ کے نہیں کرنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مسائل میں ہے:

ضبط تولید کی دوسری صورت یہ ہے کہ ''مادۂ منویہ'' تو رحم میں پہنچ جائے مگر ایسی دواؤں کا استعمال کیا جائے کہ استقرار حمل نہ ہو سکے، فقہی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی عام حالات میں ناجائز ہے اگر چہ یہ صحیح ہے کہ ابھی مادہ روح اور زندگی سے خالی ہے، اس لیے اس کو برباد کر دینا ''اصطلاحی قتل'' کے زمرہ میں نہیں آئے گا لیکن اگر اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو کچھ مدت گزرنے پر وہی ایک زندہ نفس کی شکل اختیار کر لیتا اس لیے مآل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو نفس کشی کے مترادف سمجھا جائے گا۔

فقہاء نے اس کی یہ نظیر پیش کی ہے کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں چڑیا کا انڈا توڑ دے تو جس طرح چڑیا کا مارنا دم اور کفارہ کا موجب ہوتا ہے، اسی طرح محض انڈا توڑ دینا بھی موجب دم ہوگا......

اس لیے کسی غیر معمولی عذر کے بغیر محض اولاد سے بچنے کے لیے ایسے ذرائع کا استعمال روا نہیں ہے، ہاں اگر کسی بڑی مضرت کا اندیشہ درپیش ہوتو ایسی صورت میں اس کم تر نقصان کو گوارہ کر کے اس سے بڑے دوسرے نقصان سے بچا جائے گا، مثلاً معتبر طبی اندازہ کے مطابق بچہ کی پیدائش کی صورت میں زچہ کی موت کا اندیشہ ہو یا خود زیر حمل بچہ کے سنگین موروثی مرض میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو یا زنا کا حمل ہو تو ایسے مانع حمل ذرائع کے استعمال کی اجازت ہوگی۔(جدید فقہی مسائل:۵/۱۲۷۔۱۳۰، مانع حمل دوائیں)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بغیر کسی عذر کے ۳/۴ سال کے وقفہ کا حکم:

سوال: آج کل اکثر شادی شدہ اپنی ذاتی پلاننگ کر لیتے ہیں جیسے اولاد کے لیے ۳/۴ سال کا وقفہ ضروری سمجھتے ہیں، کسی طبی مجبوری کے بغیر، یہ جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ معاش کا خطرہ بھی ذہن میں نہیں ہوتا۔

الجواب: بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ابھی سے کیوں اولاد کا بار گردن پر ڈالا جائے چند سال آزادی کی زندگی گزاری جائے، اور وہ منع حمل کی تدبیر اختیار کرتے ہیں، بظاہر یہ غرض کوئی ایسی غرض نہیں جو شریعت کے خلاف ہو اس لیے قواعد کی رو سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے، لیکن چونکہ اولاد سے اعراض کی شکل بنتی ہے اس لیے قباحت سے خالی نہیں۔ (بحث ونظر:۲/۳۵۳، ضبط ولادت اسلامی نقطہ نظر سے، زیر نگرانی حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بچے کے دودھ کی وجہ سے منع حمل کی تدبیر کا حکم:

سوال: مدتِ رضاعت میں بچے کو دودھ پلانے کی خاطر منع حمل کی تدبیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچہ شیر خوار ہے اور دوسرا حمل ٹھہر جاتا ہے، یعنی ابھی پہلی ولادت کی کمزوری سے ماں کو چھٹکارا نہیں ملا تھا کہ دوسرے کی فکر لاحق ہوگئی، نیز ماں کا دودھ بتدریج ختم ہو جاتا ہے اور پہلے کی اچھی طرح پرورش نہیں ہوتی ہے تو بچے بھی کمزور ہو جاتے ہیں اور ماں کو بھی ضرر ہوتا ہے، اس لیے اس ضرر سے بچنے کے لیے بھی منع حمل کی تدبیر اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ (بحث ونظر:۲/۳۵۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

آپریشن کے ذریعہ ضبط تولید کا حکم:

سوال: ایک عورت ۴۰ سال کی ہو چکی ہے اس کے چھ بچے ہیں اب دونوں میاں بیوی یہ چاہتے ہیں کہ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے بچے نہ ہو، کیا یہ عذر چل سکتا ہے اور آپریشن سے بندش کی اجازت ہوگی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ آپریشن کے ذریعہ بچوں کی بندش ہرگز جائز نہیں ہے، دونوں کو صبر کرنا چاہئے، نہ ہو سکے تو دوائیاں استعمال کرلے، اگر چہ یہ بھی مکروہ ہے لیکن حرام نہیں ہے۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

ضبط تولید کی چوتھی صورت نسبندی کی ہے، یعنی ایسا آپریشن جس سے دائمی طور پر قوت تولید فوت ہو جائے اور توالد و تناسل کی اہلیت باقی نہ رہے..... قرآن وحدیث کی رو سے ایک غیر اسلامی طریق کار ہے اور صحابہؓ کے طرز عمل نیز فقہاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جائز نہ ہونے پر ماہرین قانون اسلامی کا اتفاق

ہے۔(جدید فقہی مسائل:۱۴۳-۱۳۷،نس بندی)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:احسن الفتاوی:۸/ ۳۴۷-۳۵۳،ضبط تولید واسقاط حمل۔جدید فقہی مسائل:۱۴۳-۱۳۷، نس بندی)۔واللہ ﷻ اعلم۔

طالب علم کے لیے وقتی طور پر ضبط تولید کا حکم:

سوال: زید ایک طالب علم ہے اور شادی شدہ ہے،فراغت تک وقتی ضبط تولید کی کوئی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے،کیا یہ جائز ہے؟اس کا کہنا ہے کہ دورانِ تعلیم بچوں کا ہونا اپنے لیے اور تعلیم کے لیے وہ مضر سمجھتا ہے،نیز یہ بات بھی ہے کہ اس وقت چونکہ کوئی آمدنی نہیں ہے سوائے وہ جو والد کی طرف سے ملتی ہے،کیا ان حالات میں وقتی طور پر ضبط کی کوئی صورت اختیار کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: ممکن ہے کہ من جانب اللہ ضبط تولید کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اور زید کی تمنا پوری ہو جائے،تاہم اگر زید کی یہ تمنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری نہیں ہوئی تو اس نیت سے ضبط تولید درست نہیں کہ بچہ کہاں سے کھائیگا،نیز دورانِ تعلیم شادی کرنا اور بیوی کا گھر پر لانا تعلیم کے لیے مضر نہیں ہے،(جب کہ تجربہ سے مضر ثابت ہوا) تو بیچارہ بچہ بدرجہ اولیٰ مضر نہ ہوگا۔

ضبط تولید پر علماء نے کافی تفصیل سے لکھا ہے،مزید مطلوب ہو تو ان رسائل کی طرف رجوع کیا جائے جو اس مسئلہ پر لکھے گئے ہیں،مثلاً:جدید فقہی مسائل،فیملی پلاننگ اور اسلام،از ۹۲ تا ۱۴۷،واحسن الفتاوی:۸/ ۳۴۷-۳۵۳، ضبط تولید واسقاط حمل۔ضبط ولادت کی عقلی وشرعی حیثیت از مفتی محمد شفیع صاحبؒ۔و بحث ونظر،ضبط ولادت اسلامی نقطہ نظر سے،زیر نگرانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی)۔واللہ ﷻ اعلم۔

تعدد ازدواج کی حکمتیں:

سوال: ضرورت کے وقت تعدد زوجات کی کیا حکمتیں ہیں بعض حضرات تعدد ازواج کو معیوب سمجھتے ہیں؟

الجواب: (۱) پہلی حکمت:مؤمن کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تقویٰ اور پرہیزگاری کی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بعض مردوں کو قوی الشہوت بنایا ہے،ایسے لوگوں کے لیے ایک بیوی کافی نہیں،عورتوں کو بہت سے اعذار پیش آتے ہیں،وہ ہر وقت اس قابل نہیں ہوتیں کہ شوہر ان سے ہم بستر ہو سکے..اس لیے اگر ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی جائے گی تو تقویٰ کا دامن مرد کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

(۲) دوسری حکمت: نکاح کا سب سے اہم مقصد افزائش نسل ہے، اور مرد بیک وقت متعدد بیویوں سے اولاد حاصل کرسکتا ہے، پس تعدداز دواج سے مقصد نکاح کی تکمیل ہوتی ہے۔

(۳) تیسری حکمت: متعدد عورتیں کرنا مردوں کی عادت وخصلت ہے، اور کبھی مرد اس کے ذریعہ ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں، اور جائز مباہات (شان وشوکت) کی اجازت ہے، جیسے متعدد مکانات، سواریاں اور لباس رکھنا، پس تعدداز دواج بھی ایک فطری تقاضہ کی تکمیل ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ: ۵/۹۸).

فتاوی علماء البلد الحرام میں ہے:

ففي إباحة تعدد الزوجات حِكَم:

(۱) أن الإحصاء والاستقراء دل على أن عدد من يولد من الإناث أكثر من عدد من يولد من الذكور، وأن عدد من يتوفى من الذكور أكثر من عدد من يتوفون من الإناث، لكثرة ما يتعرض له الذكور دون الإناث من أسباب الموت، كالمواجهات في الحروب...فلومنع تعدد الزوجات لبقي عدد من النساء بلا أزواج، وفات عليهن المتعة وإشباع الغريزة الجنسية...

(۲) أن في تعدد الزوجات كثرة النسل، لتعدد محل الحرث، وقضاء الوطر، وفي هذا زيادة في بناء الأمة، ودعم لقوتها...وقد حث الشرع على النكاح تحقيقاً للعفة، وكثرة النسل، وصيانة للأعراض، ومحافظة على بقاء النوع.

(۳) ماجرت به سنة الله الكونية من أن النساء يحضن ويحملن ويلدن ويستمربهن دم النفاس زمناً، فإذا كان في عصمة الرجل أكثر من زوجة وجد الزوج لديه من يعف بها فرجه عن الحرام...

(۴) أن الزوجة قد تكون عقيماً، وبينها وبين زوجها وئام، ويرغب في الزواج للنسل المحبب إلى الله ...فأباح الشرع له تعدد الزوجات...إلى غيرذلک من الحكم. (فتاوى علماء البلد الحرام: ۱۴۲۰، حكمة إباحة تعدد الزوجات). واللہ ﷻ اعلم۔

﴿ضمیمہ﴾

زکوٰۃ، صوم، حج اور نکاح سے متعلق

متفرق مسائل:

معیارِ نصاب سے متعلق صاحبین کے مذہب کی تحقیق

اور بعض مفتی حضرات کا صاحبین کے قول پر فتویٰ:

سوال: سونے اور چاندی کو ملانے کے سلسلہ میں صاحبین کا کیا مذہب ہے؟ اور کیا موجودہ حالات میں اس پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صاحبین کے نزدیک سونے اور چاندی کو باعتبار اجزاء ملایا جائے گا مثلاً کسی شخص کے پاس چاندی کے نصاب کا دو تہائی موجود ہے اور سونے کے نصاب کا ایک تہائی تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر سونا نصاب کے ایک تہائی سے کم ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وقالا: بالأجزاء فإن كان من هذا ثلاثة أرباع نصاب ومن الآخر ربع ضم، أو النصف من كل أو الثلث من أحدهما والثلثان من الآخر، فيخرج من كل جزء بحسابه. (فتاوی الشامی: ۲/۳۰۳، باب زکاۃ المال،سعید۔ وبدائع الصنائع: ۲/۲۰ ۔ والهداية: ۱/۱۹۵)۔

علامہ عینیؒ البنایہ فی شرح الہدایہ میں فرماتے ہیں:

(وعندهما بالأجزاء) أى عند أبي يوسفؒ ومحمدؒ الضم بالأجزاء، وبه قال مالكؒ وأحمد في رواية، ولا يرى الشافعيؒ بالضم، وبه قال أحمد في رواية وأبوثور وأبوداود،

وذهب آخرون إلى أن الضم إنما يكون إذا كمل النصاب من أحدهما، بيان ذلك إذا كان أحدهما ثلث النصاب فلا بد أن يكون الآخر ثلثي النصاب و كذلك النصف وغيره ، ولو كانت عشرة دنانير و مائة درهم ، و قيمة الدنانير مائة يجب الضم بالاتفاق على اختلاف الترجيح عنده باعتبار القيمة وعندهما باعتبار الأجزاء...وفي الإسبيجابي وغيره معنى الضم بالأجزاء أن يكون من كل واحد منهما نصف نصاب من غير نظر إلى قيمتها أو من أحدهما نصف وربع ومن الآخر ربع ، أو من أحدهما نصف وربع وثمن ، ومن الآخر ثمن ... (وهو رواية عنه) أي الضم بالأجزاء إنما هو من مذهب صاحبيه ورواية عن أبي حنيفةؒ رواها هشام عنه ، وفي المفيد : رواها الحسن عنه . (البناية في شرح الهداية : ٤٥٤/٣ ،مكتبه رشيديه).

وللاستزادة انظر: (فتح القدير: ٢٢٢/٢، دارالفكر، وتبيين الحقائق :٢٨٢/١، وبدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ١٩/٢، وفتح باب العناية :١١٠/٢، ودررالحكام في شرح غررالأحكام :١٨٢/١، والمحيط البرهاني: ٣٨٤/٢، وغيره من الكتب الفقهية).

علامہ عینیؒ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ ضم بالا جزاء صرف صاحبینؒ کا مذہب نہیں بلکہ امام ابوحنیفہؒ سے بھی ایک روایت ہے جس کو ہشام اور حسن بن زیاد دونوں نے نقل کیا ہے۔اور امام مالکؒ کا مذہب ہے اور امام احمدؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح مروی ہے۔

اور موجودہ دور میں زر بامِ عروج پر ہے جبکہ سیم اسفل السافلین میں ہے جس کی وجہ سے نصابِ زکوٰۃ میں دقتیں پیش آتی ہیں کہ اگر سونے کو معیارِ نصاب بنائیں (جیسا کہ ہم نے مفصل تحریر کیا تھا) تو عام متوسطین زکوٰۃ، صدقہ ،قربانی وغیرہ سے سبکدوش ہو جائیں گے اور اگر چاندی معیار ہو جیسا کہ مشہور اور مفتیٰ بہ قول ہے تو ہر ایک تنخواہ دار پر ان چیزوں کا بار ہوگا جبکہ وہ بال بچوں کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے یا بیوہ عورتیں اور بالغ لڑکیاں جن کے پاس کچھ زیورات ہوتے ہیں وہ بھی پریشانی کا شکار ہو جائیں گی تو درمیانی راہ یہی ہے کہ صاحبینؒ کے مذہب کے مطابق جو کہ امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت ہے دونوں چیزوں (یعنی سونا اور چاندی) کو باعتبارِ اجزاء ملا کر نصاب مقرر کریں تو عوام الناس کے لیے زیادہ آسانی ہوگی۔ترجیح الراجح میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

عبارت ملاحظہ کیجئے:

قال أستاذنا غلام قادر النعماني: أفتى الفقهاء على قول أبي حنيفةؒ لأن قوله أحوط والفتوىٰ على قوله موافق لأصول الإفتاء لأن الأصل في العبادات الفتوىٰ على قول أبي حنيفةؒ لكن قولهما أوفق للقياس لأن على قول أبي حنيفةؒ يصير نصاب الذهب تابعاً لقيمة الفضة مع أن القيمة تابع للذهب والفضة في تعيين النصاب وأيضاً في صورة الذهب ... وأما على قولهما فيكون القيمة تابعاً للذهب والفضة ولا يكون الموجود تابعاً للمعدوم وأن قولهما أرفق بالناس فينبغي أن يفتى بقولهما في هذا الزمان وخصوصاً في مسئلة الأضحية ترفقاً بالنساء لأن أكثر النساء يوجد معهن شيء من الذهب وهو يساوي نصاب الفضة باعتبار القيمة وهن لايستعدن لبيع الذهب ولشراء الأضحية وإذا كان الانضمام بالأجزاء فحينئذٍ يكون الحكم أسهل عليهن . وقول الإمام قول المتون . (القول الراجح: ١/١٧٤).

مولانا خالد سیف اللہ صاحب فرماتے ہیں: اب ساڑھے سات تولہ سونا اور ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت میں غیر معمولی فرق پیدا ہوگیا ہے اور سونے کے ایک نصاب میں چاندی کے کئی نصاب کا خرید کیا جانا ممکن ہوگیا ہے...اگر سونے اور چاندی کی قدر میں وہی تناسب ہوتا جو صدرِ اول میں تھا، تو ''ضمِ نصاب'' کا مسئلہ عین قرین انصاف ہوتا جیسا کہ احناف کا مسلک ہے کہ اس میں فقراء کا فائدہ بھی ہے۔ مگر موجودہ حالات میں جب کہ ان دونوں کی قدر میں نمایاں فرق پیدا ہوگیا ہے، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس جزئیہ پر نظر ثانی کی جائے اور جمہور کی رائے اختیار کی جائے یا کم از کم صاحبینؒ کی رائے اختیار کی جائے کہ سونے اور چاندی کے نصاب کا انضمام اجزاء کے لحاظ سے ہو نہ کہ قیمت کے اعتبار سے۔ (جدید فقہی مسائل: ٢/١٦٩-١٧٠)۔

جدید فقہی مباحث میں ایک مقالہ نگار مفتی صاحب اپنے مقالہ میں تحریر کرتے ہیں: گزشتہ سطور میں یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ عہدِ نبوی میں ثمنین واموال تجارت میں وجوبِ زکوٰۃ کے لیے بیس مثقال سونا اور دوسو درہم کے جو نصاب متعین کیے گئے، ان میں قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا، اس لیے میری رائے میں زیادہ مناسب و متوازن طریقہ کار وہ ہوگا جس میں مجموعی طور پر دونوں نصابوں کی رعایت کی جائے اور ان میں

موجود عہدِ نبوی کی قدری مماثلت واتحاد کو بھی حتی الوسع ملحوظ رکھا جائے...

...تقویم عروض کے لیے انسب واعدل طریقہ یہ ہوگا کہ چاندی اور سونا کے ہر دو نصاب (جن کی قدر زمانہ رسالت میں متحد تھی) جمع کردئے جائیں اور ثمن رائج الوقت سے ان کی مجموعی قیمت نکال کر اس نصف کو معیار نصاب قرار دیا جائے۔

یہ طریقہ قریباً اس طرز عمل کے مشابہ ہے جو عہدِ فاروقی میں درہم کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا،...اگر دونوں نصابوں کو یکجا کر کے ان کے نصف کو معیار نصاب قرار دیا جائے تو موجودہ حالات میں یہ زیادہ مناسب اور دونوں نصابوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی بہ نسبت زیادہ معتدل ومتوازن طریقہ ہوگا،اس میں دونوں نصابوں کی فی الجملہ رعایت کے ساتھ دونوں نصابوں کے مابین دورِ نبوی میں موجود قدری مماثلت بھی ممکن حد تک ملحوظ رہے گی،نیز اس میں فقراء واصحابِ اموال دونوں کی مصالح کا فی الجملہ لحاظ ہوگا۔

اس کی تقریر دوسرے لفظوں میں یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ عروض تجارت کی زکوٰۃ میں نصف سونے اور نصف چاندی کے مخلوط نصاب کا اعتبار کیا جائے،اگر مال زکوٰۃ مجموعی قیمت دس مثقال سونا اور سو درہم چاندی کی مجموعی قیمت کے مساوی یا اس سے زائد ہو تو زکوٰۃ واجب قرار دی جائے ورنہ نہیں،اس اعتبار سے یہ طریقہ ضم ذہب وفضہ بالا جزاء کے مشابہ ہوگا۔(جدید فقہی مباحث:۷/۸۱۱۔۸۱۵)۔

سیم وزر کے درمیان باعتبارِ قیمت افراط وتفریط کی مثال یہ ہے کہ آج بتاریخ ۱۳/محرم الحرام ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۷/اکتوبر ۲۰۱۵ء سونے کی قیمت کے اعتبار سے نصابِ ذہب تقریباً: ۸۷۸, ۴۰ رینڈ بنتا ہے،اور چاندی کی قیمت کے اعتبار سے نصابِ فضہ فقط: ۶۰۵, ۴ رینڈ بنتا ہے،جبکہ دونوں نصاب کے مخلوط نصف نصف اجزاء کے اعتبار سے: ۶۴۱, ۲۲ رینڈ بنتا ہے،یہ درمیانی راہ ہے افراط وتفریط سے پاک ہے نیز عہد نبوی میں دونوں نصاب ایک دوسرے سے قریب تر تھے،بنابریں عصر حاضر کے مفتیانِ کرام کو معیارِ نصاب پر نظر ثانی اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

مکان کا قرض زکوٰۃ سے منہا کرنے کا حکم:

سوال: ایک آدمی کی زکوٰۃ کا قمری سال ۱۵ رمضان کو ختم ہورہا ہے، ۱۲ رمضان کو اس نے ۳۰ ہزار رینڈ میں ایک مکان اپنی رہائش کے لیے خریدا، بائع نے کہا ۱۰ ہزار نقد ادا کردو اور باقی ۲۰ ہزار رمضان کے بعد قسطوار چار ماہ میں ادا کردینا۔ اب سوال یہ ہے کہ مشتری مکان جب زکوٰۃ ادا کرے گا تو ۲۰ ہزار زکوٰۃ سے منہا کرے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بیس ہزار مشتری کے ذمہ قرض ہے جس کا ادا کرنا لازم اور ضروری ہے اور یہ دین مکان کی وجہ سے ہے جو کہ انسان کے لیے حوائج اصلیہ میں سے ہے بنابریں بیس ہزار قرض منہا کرکے باقی مال میں سے زکوٰۃ ادا کریگا۔

بعض آثار اور ضعیف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض منہا کیا جائیگا۔ ملاحظہ ہو اعلاء السنن میں ہے:

أخبرنا مالک، أخبرنا الزهري، عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان ﷺ كان يقول: " هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين فليؤد دينه، حتى تحصل أموالكم فتؤدوا منها الزكاة ". رواه الإمام محمد فى الموطا، و رواه في " الآثار" عن أبي حنيفةؒ: حدثنا أبوبكر، عن عثمان بن عفان ﷺ، أنه كان يقول إذا حضر رمضان: أيها الناس هذا شهر زكاتكم قد حضر، فمن كان عليه دين فليقضه، ثم ليترک ما بقي ". هذا مرسل، فإن أبابكر وهو ابن عبد الله بن أبى الجهم العدوي...لم يدرک عثمان ﷺ ظاهراً، ولكن المرسل حجة عندنا. قال المؤلف: ودلالته على الباب ظاهرة، وفى الموطا، بعد هذا الحديث: قال محمدؒ: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين، وله مال، فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلک ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة...وإن كان الذي بقي أقل من ذلک بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه لزكاة، وهو قول أبي حنيفةؒ (ص۱۶۸،۱۶۹) وقال ابن قدامة: فى المغنى: وبه قال عطاءؒ، وسليمان بن يسارؒ، وميمون بن مهرانؒ، والحسنؒ، والنخعيؒ،

والليثؒ، ومالکؒ، والثوريؒ، والأوزاعيؒ، وإسحاقؒ، وأبوثورؒ، وأصحاب الرأی...ولنا ما روی أبوعبيد في الأموال، حدثنا إبراهيم بن سعد عن ابن شهاب عن السائب بن يزيد قال: سمعت عثمان بن عفان ﷺ يقول: هذا شهر زكاتكم ...الخ. قال ذلک بمحضر من الصحابة، فلم ينكروه فدل على اتفاقهم عليه، وروی أصحاب مالکؒ عن عميربن عمران عن شجاع عن نافع عن ابن عمر ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا كان لرجل ألف درهم، وعليه ألف درهم، فلا زكاة عليه"، وهذا نص، ...قلت: والضعف على حديثه بين ...فالاحتجاج بأثر عثمان ﷺ أولی، ولكن ذكرته تأييداً. (اعلاء السنن: ۹/ ۱۳، ۱٤).

قال ابن حجرفی المطالب العالية (۹٤۲): وقال مسدد حدثنا سفيان، قال: سمع ابن شهاب السائب بن يزيد، يقول: سمعت عثمان رضی الله تعالىٰ عنه يقول: هذا شهر زكاتكم، ...الخ؛ إسناده صحيح، وهو موقوف.

فتاویٰ شامی میں ہے:

وقد عللوا سقوط الزكاة بالدين بأن المديون محتاج إلى هذا المال حاجة أصلية لأن قضاء الدين من الحوائج الأصلية والمال المحتاج إليه حاجة أصلية لا يكون مال الزكاة، تأمل. (فتاوی الشامی: ۲/ ۲٦۱، سعید).

بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها أن لا يكون عليه دين مطالب به من جهة العباد عندنا فإن كان يمنع وجوب الزكاة بقدره حالاً كان أو مؤجلاً. (بدائع الصنائع: ۲/ ٦، سعید).

امدادالاحکام میں ہے:

اس رقم پر زکوۃ واجب نہیں، قرض بہر حال مانعِ وجوبِ زکوۃ ہے،...خواہ اس کی ادا بالاقساط مشروط ہو یا بلا اقساط، واللہ اعلم۔ (امدادالاحکام: ۲/ ۲۸)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال: زید سات ہزار روپیوں کا نومہینوں سے مالک ہے اور قرضہ بھی تین ہزار روپیوں کا ہے واجب، رمضان کی برکت حاصل کرنے کے لیے اس مہینہ میں زکوۃ دینا چاہتا ہے تو اب کتنی زکوۃ دینی چاہئے؟

الجواب: جب کہ سات ہزار کا مالک ہے اور تین ہزار کا مقروض ہے اور ابھی صرف نو ماہ ہوئے ہیں، تو ابھی زکوۃ کا ادا کرنا واجب نہیں، لیکن اگر ابھی زکوۃ ادا کردی جائے تب بھی ادا ہوجائے گی، صرف چار ہزار کی ادا کردے اور تین ہزار قرض میں منہا ہوجائیں گے، پھر سال ختم ہونے پر منہا کرلیا جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۳۲۱/۹، جامعہ فاروقیہ)۔ مزید ملاحظہ ہو: (قاموس الفقہ: ۶۵/۴، وجدید فقہی مسائل: ۶۴/۲)۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ دین، استثماری دیون اور ترقیاتی قرضوں کی طرح نہیں ہے کہ جس میں مدیون بڑے بھاری معاشی فائدے حاصل کرتا ہے لہذا کل بیس ہزار رینڈ منہا کرنے کے بعد بقیہ کی زکوۃ ادا کی جائیگی۔

واللہ ﷻ اعلم۔

قرض ملنے کی امید نہ ہو تو اس پر زکوۃ کا حکم:

سوال: زید نے عمر کو مکان بنانے کے لیے بڑی رقم بطورِ قرض دی، بعض وجوہات کی وجہ سے مکان کی تعمیر کا کام ملتوی ہوگیا، پھر عمر نے وہ رقم زید کی اجازت سے مسجد کی تعمیر میں لگادی چونکہ عمر مسجد کا چیئرمین تھا لیکن بعد میں مسجد کی کمیٹی والوں نے اس کا اخراج کردیا اور قرض ادا کرنے سے بھی انکار کردیا کہ عمر اپنی ذاتی رقم سے زید کا قرضہ ادا کردے، اب بظاہر زید کے قرضہ کے وصول ہونے کی کوئی امید نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس بڑی رقم پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ نیز بالفرض اگر وصول ہوجائے تو گزشتہ کی زکوۃ ادا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اس قرض کا حکم مالِ ضمار کی طرح ہے کہ ملک تو ہے لیکن قبضہ نہیں ہے اور بظاہر واپسی کی امید بھی نہیں ہے بنابریں نہ تو فی الحال زکوۃ واجب ہے اور نہ واپسی کے بعد گزشتہ کی زکوۃ ادا کرنا لازم ہے۔

البتہ اس پر یہ اشکال وارد ہوسکتا ہے کہ زید کے پاس ثبوت ہے اور کورٹ میں جا کر مقدمہ دائر کرکے اپنا قرض وصول کرنے پر قادر ہے تو پھر مالِ ضمار کی طرح کیسے ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل کورٹ کا نظام عجیب وغریب ہے کہ کاروائی میں سالہا سال گزر جاتے ہیں اور اخراجات بھی زیادہ ہوجاتے ہیں اس کے باوجود نتیجہ مشکل سے باہر آتا ہے، پھر ہر ایک کورٹ میں جانا پسند بھی نہیں کرتا لہذا ثبوت اور بینہ کا اس زمانہ میں کوئی خاص اعتبار نہیں ہوگا۔

ہاں جس جگہ ان چیزوں کی سہولت ہو اور حقدار کا حق بینہ کے ذریعہ بآسانی حاصل ہوجاتا ہو تو وہاں حکم مختلف ہوگا عام قرض کی طرح ہوگا کہ خمس پر قبضہ کرے تو زکوۃ ادا کرے یا کئی سالوں بعد وصول ہو تو گزشتہ کی بھی واجب ہوگی۔ اور یہ حکم اُس زمانہ کے لیے تھا جس زمانہ میں اقرار کی وجہ سے دین وصول کرنا ممکن تھا، نیز علامہ شامیؒ نے علامہ رحمتی سے نقل فرمایا ہے کہ اِس زمانہ میں مدیون مقر مالدار ہوتا ہے پھر بھی دین وصول کرنا ممکن نہیں ہوتا بلکہ دین بمنزلہ عدم ہوتا ہے۔

نیز بینہ کے عدمِ اعتبار کی ایک نظیر یہ بھی ہے کہ امام محمدؒ سے منقول ہے کہ اگر مدیون بینہ کا انکار کردے تو دائن پر اس دین کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ ہر بینہ مقبول نہیں ہوتے اور ہر قاضی عادل بھی نہیں ہوتا۔
بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ مالِ ضمار جس کے وصول ہونے کی امید نہ ہو اس مال میں زکوۃ نہیں ہے۔

أخرج القاسم بن سلام الهروی فی " الأموال " (۸۹۲) **قال: حدثنا يزيد ، عن هشام ، عن الحسن ، قال:" إذا حضر الشهر الذی وقت الرجل أن يؤدی فيه زكاته أدى كل مال له وكل ما ابتاع من التجارة ، وكل دين إلا ما كان منه ضماراً لا يرجوه ".**

أخرج الإمام البيهقي في سننه الكبرى (۷۸۷٦/۱۵۰/٤)**عن أيوب بن أبي تميمة السختياني: أن عمر بن عبد العزيز كتب في مال قبضه بعض الولاة ظلماً يأمر برده إلى أهله وتؤخذ زكاته لما مضى من السنين ، ثم أعقب بعد ذلک بكتاب أن لا تؤخذ منه إلا زكاة واحدة فإنه كان ضماراً . قال أبوعبيد : يعنى الغائب الذى لا يرجى .**

فقہاء کے ہاں مالِ ضمار کی تعریف اور اس کا حکم:

قال فی البحر الرائق: وهو فی اللغة الغائب الذی لا يرجى فإذا رجی فليس بضمار ... وفی الشرع :كل مال غير مقدور الانتفاع به مع قيام أصل الملک كذا فی البدائع .

(البحرالرائق: ۲/۲۰۶، ۲۰۷). (وکذا فی البدائع: ۲/۹، سعید).

قال فی العناية: و قالوا: الضمار ما يكون عينه قائماً و لا ينتفع به ... (العناية على هامش فتح القدير: ۲/۱۶٤، دارالفکر).

قال في رد المحتار: (ولو له بينة في الأصح)...قال السرخسي: والصحيح جواب الكتاب أي الأصل إذ ليس كل قاض يعدل ولا كل بينة تقبل والجثو بين يدي القاضي ذل وكل أحد لا يختار ذلك...ومال الرحمتي إلى هذا وقال: بل في زماننا يقر المديون بالدين وبملاءته ولا يقدر الدائن على تخليصه منه فهو بمنزلة العدم . (فتاوی الشامی: ۲/۳٤٤، سعید وکذا فی: ۲/۳٦۳). (وکذا فی البحرالرائق: ۲/۲۰۷، سعید).

وقال في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح : فلو له بينة تجب لما مضى در، قال في تحفة الأخيار: وينبغي أن يجري هنا مايأتي مصححاً عن محمد من أنه لا زكاة فيه لأن البينة قد لا تقبل فيه . (حاشیة الطحطاوی، ص۷۱٦، ط: قدیمی).

قال في مجمع الأنهر: بخلاف دين على مقر ملي أي غني أو معسر لأن الدين على المعسر ليس كالهالك لإمكان الوصول بواسطة التحصيل ...أو جاحد عليه بينة هذا على قول أكثر المشايخ وعن محمد لا تجب الزكاة إذ ليس كل قاض يعدل ولا كل بينة تعدل وقال شمس الأئمة هو الصحيح كما في الخانية والتحفة . (مجمع الانہر: ۱/۲۸۸، کتاب الزکاۃ، ط: دارالکتب العلمیۃ).

امدادالفتاویٰ میں ہے:

اس میں اقوال مختلف ہیں، اور ہر جانب تصحیح بھی کی گئی ہے، جس کی تفصیل ردالمحتار میں موجود ہے، بندہ کے نزدیک ان اقوال میں سے قولِ مختار یہ ہے کہ جس قرض کے وصول ہونے کی امید ضعیف ہو یا بالکل نہ ہو قبل وصول اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اور وصول کے بعد جس قدر وصول ہوگا بعد حولانِ حول آئندہ صرف اسی قدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، **ومتمسكي فيه ما في رد المحتار بعد نقل عبارة النهر عن الخانية قوله، قلت: وقدمنا أول الزكاة اختلاف التصحيح فيه ومال الرحمتي إلى هذا ...الخ** . (امدادالفتاویٰ:۲

/۶۳)۔واللہ ﷻ اعلم۔

خیراتی ادارے اور انجمن کے اموال پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم:

سوال: لوگوں نے انجمن بنائی ہے جس میں رقم جمع رہتی ہے اور اس رقم سے اموات کے کفن دفن اور دوسرے کارِ خیر انجام پاتے ہیں، یہ رقم ہزاروں یا لاکھوں تک پہنچتی ہے، سال گزرنے کے بعد اس رقم پر زکوٰۃ لازم ہوگی یا نہیں؟ نیز خیراتی اداروں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ انجمن اور خیراتی اداروں کی رقوم چندہ دہندگان کی ملک سے نکل چکی ہیں اور انجمن وغیرہ خیراتی ادارے شخصی قانون ہے لیکن اس کا کوئی معین شخص مالک نہیں ہے، اسی وجہ سے انجمن کے اراکین میں سے کسی کے انتقال کے بعد اس رقم کا حصہ میت کے ورثاء کو واپس نہیں کیا جاتا یعنی ترکہ نہیں بنتا بنابریں اس قسم کی رقوم پر زکوٰۃ واجب اور لازم نہیں ہوگی۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وأما الشرائط إلتی ترجع الی المال فمنها الملک فلاتجب الزکاۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملک وهذا لأن فی الزکاۃ تملیکاً والتملیک فی غیر الملک لایتصور . (بدائع الصنائع:۲/۹،سعید). (وکذا فی الدر المختار: ۲/۲۷۷،سعید).

وقال فی المبسوط : قال الشیخ الإمام الأجل ...الزکاۃ لا تجب إلا باعتبار الملک والمالک ولهذا لاتجب في سوائم الوقف ولا في سوائم المکاتب . (المبسوط للامام السرخسی : ۳/۹٤، ط: بیروت).

وفی الموسوعة الفقهیة الکویتیة : الشرط الأول: کون المال مملوکاً لمعین : فلا زکاۃ فیما لیس له مالک معین ، و من هنا ذهب الحنفیة إلی أن الزکاۃ لا تجب في سوائم الوقف ، والخیل المسبلة ، لأنها غیر مملوکة . قالوا : لأن فی الزکاۃ تملیکاً ، والتملیک في غیر الملک لا یتصور. (الموسوعة: ۲۳/۲۳٦،،ط: الکویت).

کفایت المفتی میں ہے:

محلّہ کا وہ پیسہ جو جماعت کا مشترک روپیہ ہو اور لوگوں کے کام آنے کے لیے جمع ہو یا مسجد کا روپیہ ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ (کفایت المفتی:۴/۲۶۵،دار الاشاعت)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

جس مال کا کوئی متعین مالک نہ ہو بلکہ مسجد یا مدرسہ یا اور کوئی ادارے اس کے مالک ہوں ان میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (جدید فقہی مسائل:۲/۵۰)۔

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مباحث:۶/۲۰،۲۱)۔

احناف کے یہاں شخص قانونی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ملاحظہ ہو درسِ ترمذی میں ہے:

مشترک مال پر شخص قانونی کی حیثیت سے زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ (درسِ ترمذی:۲/۴۲۵)۔

مزید ملاحظہ ہو: (احسن الفتاویٰ:۱/۴۳۲)۔

قانونِ شخصی کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا،جلدِ چہارم،ص۶۶۰۔۶۶۶)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ٹیکس کی رقم واپس ملنے پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک تاجر نے ٹیکس کے محکمہ کو ایک ملین ٹیکس ادا کیا پھر محکمہ کے ساتھ مقدمہ چلا جس کی وجہ سے محکمہ نے ۲ لاکھ واپس کیے،اب اس کے ذمہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ محکمہ ٹیکس نے جو زائد رقم وصول کی،محکمہ اس کا ضامن تھا،لہٰذا یہ دین جاحد کی طرح ہوا اور دین جاحد پر بینہ ہونے کے باوجود گزشتہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے فقہاء نے اس کو مالِ ضمار میں شامل کیا ہے،اور بظاہر تاجر کے پاس ثبوت تھا اسی وجہ سے محکمہ کو کورٹ میں لے گیا،چنانچہ اس دو لاکھ میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

مالِ ضمار کی تعریف اور اس کا حکم احادیث اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں ماقبل میں مذکور ہوا،وہاں ملاحظہ کیا جائے۔مزید ملاحظہ ہو امداد الاحکام میں ہے:

...اور جتنا ٹیکس قاعدہ کے خلاف زیادہ لگایا ہے اس کا ضامن ہے۔(امداد الاحکام:۲/۶۲۴)۔

خیر الفتاویٰ میں ہے:

دین مجحود (دین انکاری) کو بالاتفاق مالِ ضمار میں شمار کیا گیا ہے، بہت سے مشائخ نے اس کے ضمار بننے کے لیے اس قید کا اضافہ کیا ہے، کہ دین مجحود پر شہادت موجود نہ ہو اور امام محمدؒ نے شہادت یعنی بینہ ہوتے ہوئے بھی اسے مالِ ضمار قرار دیا ہے مشائخ کی ایک جماعت نے اسی کو صحیح کہا ہے:

ففي الدر والشامية: وعن محمد لا زكاة فيه وهو الصحيح ذكره ابن ملك وغيره لأن البينة قد لا تقبل صححه في التحفة كما في غاية البيان وصححه في الخانية أيضاً وعزاه إلى السرخسي، بحر، وفي باب المصرف من النهر عن عقد الفرائد: ينبغي أن يعول عليه، قلت: ونقل الباقاني تصحيح الوجوب عن الكافي وهو المعتمد وإليه مال فخر الإسلام .

قاضی خان کی تصحیح بہت زیادہ وزن رکھتی ہے، عقود رسم المفتی میں ہے: **قد قال العلامة قاسم: إن قاضي خان من أحق من يعتمد على تصحيحه.** (ص ۳۳). (خیر الفتاویٰ:۳/۵۹۷)۔واللہ ﷻ اعلم۔

زکوٰۃ کی رسید سے ٹیکس کم کرانے کا حکم:

سوال: کسی ادارہ یا جمعیت کو زکوٰۃ ادا کرتے وقت وہ ادارہ یا جمعیت ایک رسید دیتی ہے، اگر اس رسید کو ہم حکومت کے ٹیکس میں دکھادے تو ایک فیصد ٹیکس منہا ہو جاتا ہے۔تو اب سوال یہ ہے کہ کیا زکوٰۃ کی رسید سے حکومت کا انکم ٹیکس منہا کرانا درست ہوگا یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: بعض حکومتوں کے ٹیکس اکثر وبیشتر ظالمانہ ہوتے ہیں لہذا اس کو کم کرنے کے لیے تدبیر اختیار کرنا اور کم کرانا جائز ہے، پس جو انکم ٹیکس حکومت کی طرف سے ظلماً عائد کیا جاتا ہے بنابریں زکوٰۃ کی رسید دکھا کر کم کرانا درست ہے۔البتہ وہ ٹیکس جو واجبی ہیں اور ان کا فائدہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیں پہنچتا ہے ایسے ٹیکس کا کم کرانا زکوٰۃ کی رسید دکھا کر جائز نہیں ہے۔ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

فأما في زماننا إنما يوجد أكثر النوائب بطريق الظلم ومن تمكن من دفع الظلم عن

نفسه فذلک خیر له ... (المبسوط للامام السرخسی : ۱۰/ ۳۵، ط: دار الفکر، بیروت).

(وکذا فی فتاوی الشامی: ۲/ ۳۳۶، سعید، و ۵/ ۳۳۲، سعید، وفتح القدیر: ۷/ ۲۳۳، وشرح العنایة: ۷/ ۲۲۲، وحاشیة الطحطاوی علی الدر: ۱/ ۳۹۰).

انکم ٹیکس یہ ناواجبی ٹیکس ہے۔ ملاحظہ ہو مولانا خالد سیف اللہ صاحب لکھتے ہیں:

انکم ٹیکس ناواجبی ٹیکس ہے اور ناواجب حد تک وصول کیا جاتا ہے اس لیے اگر بینک میں کسی مجبوری کے تحت ایسی اسکیم میں رقم رکھنی پڑی جس میں سود حاصل ہوتا ہے، اور سود مل گیا تو اس سود سے انکم ٹیکس ادا کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ بینک یا وہ ادارہ سرکاری ہی ہو...

مکان کا ٹیکس ان بلدیہ سہولتوں کے عوض وصول کیا جاتا ہے، جو حکومت عوام کو فراہم کرتی ہے، یہ ایک جائز اور منصفانہ ٹیکس ہے، جس کا نفع ٹیکس دہندہ کی طرف لوٹتا ہے، لہذا اگر اس میں سود کی رقم ادا کی جائے تو یہ سود سے استفادہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ (کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۳۱۸، ۳۱۹)۔

معلوم ہوا کہ ناواجبی ٹیکس کو کم کرانا درست ہے جبکہ واجبی ٹیکس کا نفع ٹیکس دہندہ کی طرف لوٹتا ہے اس لیے زکوٰۃ کی رسید دکھا کر کم کرانا ناجائز ہوگا کیونکہ زکوٰۃ سے استفادہ کے زمرہ میں آئیگا اور یہ ناجائز ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ العلوم زکریا، جلدِ پنجم، ص ۴۰۰-۴۰۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بیکریوں اور فیکٹریوں میں درآمد شدہ آٹے پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: بیکری یا ہوٹلوں میں اشیائے خوردنی بنا کر فروخت کی جاتی ہیں، ان اشیاء کو بنانے کے لیے سامان کے ذخائر ہوتے ہیں، مثلاً آٹے کے بیگ، شکر اور نمک کے بیگ، اور کیک وغیرہ کو سنوارنے کے لیے دیگر اشیاء، تو سال کے آخر میں ان ذخائر پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء نے اس بارے میں ایک قاعدۂ کلیہ تحریر فرمایا ہے کہ وہ آلات اور اشیاء جن کا اثر مصنوعات میں باقی نہیں رہتا اور وہ اشیاء مشاہد نہیں ہوتیں جیسے مشینیں، اور کھانے میں نمک وغیرہ تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن وہ آلات اور اشیاء جن کا اثر مصنوعات میں باقی رہتا ہے اور ان کے اجزاء موجود ہوتے ہیں

جیسے گاڑی کے پرزے، تل، آٹا وغیرہ تو ان پرزکوۃ واجب ہوگی، اس قاعدہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے آٹے کے بیگ اور کیک کے اوپر کے اجزاء جو سنوارنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان کے ذخائر پر سال گزرنے پرزکوۃ واجب ہوگی۔البتہ شکر اور نمک کے بیگ پرزکوۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں دو رائے ہیں:

(۱) قاعدۂ مذکورہ بالا کے پیشِ نظر زکوۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ اس کے اجزاء گھل مل کر ختم ہوجاتے ہیں اور مشاہد نہیں ہوتے۔کمافی البحر:۳۰۳/۷، والمحیط:۳۹۳/۲، وغیرہما من الکتب الفقہیہ۔

(۲) صاحبِ بدائع الصنائع کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ زکوۃ واجب ہوگی، کیونکہ انہوں نے چربی کو جو دباغت کے لیے استعمال کی جاتی ہے مالِ تجارت میں شامل کرکے اس پرزکوۃ کو واجب قرار دیا ہے۔جبکہ چربی کی ذات باقی نہیں رہی بلکہ تیل بن گیا اور وہ بھی کچھ دیر کے بعد سوکھ جاتا ہے۔اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ شکر اور نمک کے ذخائر پرزکوۃ واجب ہونی چاہئے۔

البتہ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ فقہاء نے نمک کے بارے میں عدمِ وجوبِ زکوۃ کا قول تحریر فرمایا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے پرانے زمانہ میں نمک بے قیمت اور بے حیثیت تھا معمولی قیمت میں بہت زیادہ میسر ہوجاتا تھا اور اکثر وبیشتر تو مفت میں حاصل ہوجاتا تھا اس وجہ سے فقہاء نے اس کو مالِ تجارت میں شامل نہیں فرمایا تھا۔

ملاحظہ ہو ملک العلماء علامہ ابوبکر ساکانیؒ بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں:

وأما الأجراء الذين يعملون للناس نحو الصباغين والقصارين والدباغين إذا اشتروا الصبغ والصابون والدهن ونحو ذلك مما يحتاج إليه في عملهم ونووا عند الشراء أن ذلك للاستعمال في عملهم هل يصير ذلك مال التجارة روى بِشر بن الوليد عن أبي يوسف أن الصباغ إذا اشترى العصفر والزعفران ليصبغ ثياب الناس فعليه فيه الزكاة والحاصل أن هذا على وجهين إن كان شيئاً يبقى أثره فى المعمول فيه كالصبغ والزعفران والشحم الذى يدبغ به الجلد فإنه يكون مال التجارة لأن الأجر يكون مقابلة ذلك الأثر وذلك الأثر مال قائم فإنه من أجزاء الصبغ والشحم لكنه لطيف فيكون هذا تجارة، وإن كان شيئاً لايبقى أثره فى المعمول فيه مثل الصابون والأشنان والقلي والكبريت فلا يكون

مال التجارة ، لأن عينها تتلف ولم ينتقل أثرها إلى الثوب المغسول حتى يكون له حصة من العوض بل البياض أصلي للثوب يظهر عند زوال الدرن فما يأخذ من العوض يكون بدل عمله لا بدل هذه الآلات فلم يكن مال التجارة . (بدائع الصنائع:٢/١٣،سعيد).

عنایہ میں ہے:

وقوله وآلات المحترفين، قيل: يريد بها ما ينتفع بعينه ولا يبقى أثره في المعمول كالصابون والحرض وغيرهما كالقدور وقوارير العطار ونحوها لكون الأجر حينئذٍ مقابلاً بالمنفعة فلا يعد من مال التجارة .

وأما ما يبقى أثره فيه كما لو اشترى الصباغ عصفراً أو زعفراناً ليصبغ للناس بالأجر وحال عليه الحول فإنه تجب فيه الزكاة إذا بلغ نصاباً لأن المأخوذ من الأجر مقابل بالعين .

(العناية على الهداية بهامش فتح القدير: ٢/١٦٤، ط: دارالفكر).

(وكذا في الفتاوى الهندية: ١/١٧٢، وفتح القدير: ٢/١٦٤،ط: دارالفكر، وفتاوى الشامي: ٢/٢٦٥، سعيد، والبحرالرائق: ٢/٢٢٦،ط:دارالمعرفة، والمحيط البرهاني:٢/٤٣٦،التراث العربي).

مذکورہ بالاعبارات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ معمول میں جس کا اثر باقی ہواور وصول شدہ اجرت میں اس لگائے ہوئے رنگ وغیرہ کا دخل ہوتو اس پر سال گزرنے کے بعد زکوۃ واجب ہوگی ،اور کیک میں آٹے کا اثر موجود ہوتا ہے اس کے ثمن میں آٹا اوراس کی بناوٹ دونوں کو شامل کیا جاتا ہے اس وجہ سے آٹے کے بیگ پر زکوۃ واجب ہوگی۔اور سنوارنے کی اشیاء پر بھی زکوۃ واجب ہوگی۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

صنعتی اوزار اور سامان دو قسم کے ہیں ،ایک وہ جن کو کسی کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اوران کا اثر اس شئی میں باقی نہیں رہتا ،دوسری وہ جو بعینہٖ اس میں لگادی جاتی ہیں ،مثلاً موٹر کی درستگی کے بعض اوزار ایسے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اس سے چیزیں ٹھیک کردی جائیں ،کاریگران سے اسی قدر کام لیتا ہے ،بڑے بڑے کارخانوں میں جو مشینیں ہیں وہ اسی نوعیت کی ہیں اور بعض سامان خاص اسی مقصد کے لیے ہوتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر

ان کوموٹر میں فٹ کر دیا جائے۔

ان دونوں میں سے پہلی قسم کی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں ہے، ان میں مشینیں، گھڑی ساز، بڑھئی، لوہار، موٹر سائیکل درست کرنے والوں اور کاشتکاروں وغیرہ کے صنعتی اوزار داخل ہیں۔ دوسری قسم کی چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہے، اس میں گھڑی، ریڈیو اور موٹر سائیکل وغیرہ کے قابل فروخت اجزاء شامل ہیں، کیوں کہ یہ مالِ تجارت کا درجہ رکھتے ہیں چنانچہ فقہاء پہلی قسم کی چیزوں کو بنیادی ضرورت (حاجتِ اصلیہ) اور دوسری قسم کی چیزوں کو قابل زکوٰۃ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں...۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۰۹)۔

جدید فقہی مباحث میں ہے:

فقہائے کرام اور مفتیانِ عظام کی تصریحات وفتاوی سے معلوم ہوا کہ وہ آلاتِ طبع ودیگر آلات جس کا اثر معمول کے اندر باقی نہیں رہتا اس کے اصل پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ اور جن آلات کا اثر معمول پر برقرار رہتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔(جدید فقہی مباحث:۷/۶۲۰)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سامان بھرنے کے خالی بیگ پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: بیکریوں اور فیکٹریوں میں اناج غلہ وغیرہ بڑی مقدار میں خریدا جاتا ہے، پھر استعمال کے بعد ان کے خالی بیگ فروخت ہوتے ہیں، تو ان خالی بیگ پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ بعض مرتبہ خریدتے وقت آگے بیچنے کی نیت ہوتی ہے۔ نیز اگر کسی نے نئے بیگ اپنے سامان کی فروخت کے لیے خریدے تو اس پر سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: موجودہ دور میں خالی بیگ تین قسم پر ہے:(۱) بڑی کمپنیاں بڑی مقدار میں خالی بیگ خریدتی ہیں اور مشتری کو سامان بھرنے کے لیے فروخت کرتی ہیں، یعنی ان کا مقصد تجارت ہے تو اس قسم کے بیگ پر یقیناً سال ختم ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (۲) دوسری قسم وہ ہے کہ دکاندار خالی بیگ خریدتے ہیں لیکن ان کا مقصد فروخت کرنا نہیں ہوتا بلکہ مشتری کو سامان بھرنے کے لیے مفت میں دیتے ہیں اور وہ بہت معمولی قسم کے ہوتے ہیں، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۳) بیکریوں اور بسکٹ وغیرہ کی فیکٹریوں میں خالی تھیلے اور بیگ اگر

فروخت ہوتے ہیں تو ان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔فقہاء کی عبارات ملاحظہ ہوفرمایئے:

قال في البدائع : وظروف أمتعة التجارة لا تكون مال التجارة لأنها لا تباع مع الأمتعة عادة و قالوا: في نخاس الدواب إذا اشترى المقاود والجلال والبراذع أنه إن كان يباع مع الدواب عادة يكون للتجارة لأنها معدة لها وإن كان لايباع معها...فلايكون مال التجارة إذا لم ينو التجارة عند شرائها. (بدائع الصنائع: ۲/۱۳،سعید).

قال في فتح القدير: وقوارير العطارين ولُجُمُ الخيل والحمير المشتراة للتجارة ومقاودها وجلالها إن كان من غرض المشتري بيعها به ففيها الزكاة وإلا فلا . (فتح القدير: ۲/۱٦٤،ط:دارالفكر). (وكذا في فتاوى الشامي : ۲/۲٦٥،سعيد،والبحرالرائق: ۲/۲۲۲،دارالمعرفة،والعناية شرح الهداية بهامش فتح القدير:۲/۱٦٤،دارالفكر). **واللہ ﷻ اعلم۔**

میراث میں سے کچھ مال چھپانے پر گزشتہ کی زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص کا انتقال تیس سال قبل ہوا تھا،مرحوم کی وراثت تقسیم ہوچکی تھی ،لیکن ایک وارث نے مرحوم کے ترکہ میں سے ایک زیور چھپالیا تھا، پھرتیس سال کے بعداس کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوا اور زیور کو ظاہر کیا،اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان ورثاء پر جن کو زیور کی بالکل خبر نہ تھی گزشتہ تیس سال کی زکوٰۃ لازم ہے یانہیں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ جن ورثاء کو معلوم نہیں تھا ان پر زکوٰۃ واجب نہیں البتہ چھپانے والے پر اس کے حصہ کے بقدر گزشتہ تیس سال کی زکوٰۃ واجب اور لازم ہوگی۔جن ورثاء کو معلوم نہیں تھا ان کے حق میں یہ زیور مالِ غائب یعنی مالِ ضمار کے حکم میں تھا کہ اس پر ملکیت بھی تام نہیں تھی اور قبضہ بھی نہیں تھا اور مالِ ضمار کا حکم یہ ہے کہ ملنے کے بعد سال ختم ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله ولا في مال مفقود ، شروع في مسألة مال الضمار...قوله بعدها أي بعد سنين ،

قوله حديث علي ﷺ لا زكاة في مال الضمار...قال في البحر: وهو في اللغة : الغائب الذى لايرجى فإذا رجي فليس بضمار وأصله الإضمار وهو التغييب والإخفاء ، ومنه أضمر في قلبه. (فتاوى الشامي:٢/٢٦٦،سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (العناية شرح الهداية:٢/١٦٤،وفتح باب العناية :٢/٨٤).

امدادالفتاویٰ میں مرقوم ہے:

اگر خود گم ہوگیا تو سالہائے گزشتہ کی زکوۃ ساقط ہوگئی، اور اگر بعد گم ہونے کے مل گیا تو دیکھنا چاہئے اگر اس سالِ زکوۃ پورا ہونے کے بعد ملا ان ایام گم گشتگی کی زکوۃ نہ آئے گی، **ولا في مال مفقود وجده بعد سنين**، رہا آئندہ کے لیے زکوۃ کا آنا اس کا حکم یہ ہے کہ اگر سوائے اس کے اس شخص کے پاس پہلے سے اس قسم کا نصاب ہے تو اس کے ساتھ اس کی زکوۃ بھی دی جائے گی۔ اور اگر نصاب سے کم ہے تب پانے کے وقت سے سال کامل گزرنا شرط ہوگا۔ **والمستفاد وسط الحول يضم إلى نصاب من جنسه فيزكيه بحول الأصل، قوله إلى نصاب قيد به لأنه لوكان النصاب ناقصاً وكمل بالمستفاد فإن الحول ينعقد عليه عند الكمال ، شامي**،... (امدادالفتاویٰ:۲/۵۳)۔

مزید دیکھئے: (عمدۃ الفقہ:۳/۲۲)۔ مالِ ضمار سے متعلق مزید تفصیلات ماقبل میں گزر چکی ہیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کتابیں خرید کر مدرسہ میں دینے سے زکوۃ کی ادائیگی کا حکم:

سوال: میں نے ایک آدمی کو ایک ہزار زکوۃ کی رقم دی مدرسہ میں دینے کے لیے، اس نے اس رقم کو اپنی کسی ضرورت میں استعمال کرلیا، پھر اس نے اس کے عوض میں مدرسہ کو کچھ کتابیں دیدی جن کی قیمت ایک ہزار تین سو رینڈ تھی، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور زکوۃ ادا ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ آپ کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی دوبارہ ادا کرنا لازم اور ضروری ہوگا، وکیل باداء الزکوۃ کا زکوۃ کی رقم اپنے استعمال میں لانا زکوۃ ادا کرنے سے پہلے درست نہیں ہے، اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی، مزید براں زکوۃ فقیر کو تملیکاً دی جاتی ہے اور کتابیں مدرسہ کے کتب خانہ میں رکھی جاتی ہیں اس میں تملیک

بھی نہیں پائی گئی۔ہاں اگر زکوٰۃ کی رقم میں تبدیلی کی اجازت ہو اور کتابیں خرید کر فقیر طلباء کو مالک بنادیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہوگی۔ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله ولو تصدق، أي الوكيل بدفع الزكاة إذا أمسك دراهم الموكل ودفع من ماله ليرجع ببدلها في دراهم الموكل صح بخلاف ما إذا أنفقها أولاً على نفسه مثلاً ثم دفع من ماله فهو متبرع ...وفيه إشارة إلى أنه لايشترط الدفع من عين مال الزكاة ولذا لو أمر غيره بالدفع عنه جاز . (فتاوى الشامي: ۲/۲٦٩، ۲۷۰، سعيد).

وقال في الدر: ويشترط أن يكون الصرف تمليكاً لا إباحة كما مر لا يصرف إلى بناء نحو مسجد ولا إلى كفن ميت وقضاء دينه...الخ. (الدرالمختار: ۲/۳٤٤، سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

وحشی جانوروں پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنے فارم میں وحشی جانوروں کو افزائش نسل کے لیے رکھا ہے، اور ان کا شکار کیا جاتا ہے اور مالک شکاری سے رقم وصول کرتا ہے، کیا ایسے جانوروں پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ یہ مطلب نہیں ہے کہ مالک زندہ جانور کو پکڑ کر فروخت کریگا بلکہ شکاری شکار کر کے مارڈالنے یا زخمی کرنے کے بعد قیمت ادا کریگا، خواہ شکاری جانور تک پہونچے یا نہ پہونچے۔بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ وحشی جانوروں کو افزائش نسل کے لیے رکھا ہے اس وجہ سے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیونکہ فقہاء نے وجوبِ زکوٰۃ کے لیے پالتو جانور کی شرط لگائی ہے۔اور اگر مخلوط ہو تو ماں کا اعتبار ہوگا، ماں پالتو ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

ملاحظہ ہو الموسوعہ میں مرقوم ہے:

ذهب أكثر العلماء إلى عدم وجوب الزكاة في بقر الوحش، وعند الحنابلة روايتان ... والرواية الثانية عندهم عدم وجوب الزكاة فيها، قال ابن قدامة: وهي أصح، وهو قول أكثر أهل العلم في عدم وجوب الزكاة في بقر الوحش...ولأنها حيوان لايجزئ نوعه في

الأضحية والهدي ، فلا تجب فيها الزكاة كالظباء ، ولأنها ليست من بهيمة الأنعام ، فلا تجب فيها الزكاة كسائرالوحوش، والسر في ذلک أن الزكاة إنما وجبت في بهيمة الأنعام دون غيرها لكثرة النماء فيها ، من درها ونسلها وكثرة الانتفاع بها لكثرتها وخفة مؤونتها وهذا المعنى يختص بها ، فاختصت الزكاة بها دون غيرها . (الموسوعة الفقهية الكويتية:٨/١٦٠).

البنایہ فی شرح الہدایہ میں ہے:

فإن قلت: اسم البقر يتناول الوحشي ولا تجب فيها الزكاة قلت: الجاموس أهلي وذلک وحشي، والوحشيات من البقر والغنم وغيرهما لايعتد به في النصاب وكذا المتولد بين أهلي ووحشي، كذا قاله الكاكي ...وعندنا إن كانت الأم أهلية تجب ، وإن كانت وحشية لا تجب وبه قال مالک. (البناية:٣/٣٨٩،مکتبہ رشیدیہ).

لیکن اگر وحشی جانوروں کو تجارت کی نیت سے رکھا ہے تو ان کی مالیت اور قیمت پر زکوۃ واجب ہوگی۔اور اگر افزائش نسل کی نیت سے رکھا ہے مگر کوئی آتا ہے تو فروخت کر دیتا ہے تو زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

ملاحظہ ہو نصب الرایہ میں ہے: **حديث آخر: رواه عبد الرزاق في مصنفه أخبرنا ابن جريج أخبرني موسى بن عقبة عن نافع عن ابن عمر ﷺ أنه كان يقول: في كل مال يدار في عبيد، أودواب ، أو بز للتجارة، تدار الزكاة فيه كل عام** . (نصب الراية:٢/٣٧٨،ط:بيروت). **وقال ابن حجر في الدراية**(١/٢٦١): **رواه عبد الرزاق بإسناد صحيح .**

مزید ملاحظہ ہو: (مجمع الأنهر:١/٢٠٧،التراث العربی ، والهداية: ١/١٩٥،ط: المصباح ، وتحفة الفقهاء: ٢/٢٧١، دار الكتب العلمية). فارم میں شکار کرنے اور اس کی خرید وفروخت سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا، جلدِ ششم ،ص:١٨٦۔١٨٩)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شیعہ فقیر کو زکوۃ دینے کا حکم:

سوال: ہمارے یہاں آسٹریلیا میں خیموں میں مسلمانوں کے ساتھ شیعہ بھی مقیم ہیں،لیکن مقامی لوگ

ان کے عقائد سے ناواقف ہیں، معلوم نہیں کہ ان کے عقائد کفریہ ہیں یا نہیں۔ جبکہ وہ تنگ دست ومحتاج ہیں تو کیا ایسے شیعہ لوگوں کو جن کے عقائد معلوم نہیں زکوٰۃ کی رقوم دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: بعض مفتی حضرات کے نزدیک شیعہ، عقائدِ کفریہ کی وجہ سے کافر ہیں لہذا ان کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہئے اگر کسی نے دیدی تو ادا نہیں ہوگی۔ البتہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نزدیک ان کے علماء کافر ہیں اور عوام جہال عقائد سے ناواقفیت کی بنا پر فاسق ہیں، ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہوگا، بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے خلاف استعمال نہ کرتے ہو۔

قال في الهندية : الرافضي إذا كان يسب الشيخين ويلعنهما والعياذ بالله فهو كافر وإن كان يفضل علياً كرم الله تعالىٰ وجهه على أبي بكر رضي الله تعالىٰ عنه لا يكون كافراً إلا أنه مبتدع...ولو قذف عائشة رضي الله تعالىٰ عنها بالزنا كفر بالله...ويجب إكفار الروافض في قولهم برجعة الأموات إلى الدنيا و بتناسخ الأرواح وبانتقال روح الإله إلى الأئمة وبقولهم في خروج إمام باطن وبتعطيلهم الأمر والنهي إلى أن يخرج الإمام الباطن وبقولهم إن جبريل عليه السلام غلط في الوحي إلى محمد صلى الله عليه وسلم دون علي بن أبي طالب رضي الله تعالىٰ عنه وهؤلاء القوم خارجون عن ملة الإسلام وأحكامهم أحكام المرتدين كذا في الظهيرية . (الفتاوى الهندية:٢/٢٦٤).

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ فرماتے ہیں: شیعہ اور قادیانی کافر ہے، بلکہ دوسرے کفار سے بھی بدتر ہیں، اور کافر کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، شیعہ اور قادیانی کو زکوٰۃ دینا سخت گناہ ہے اور زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، بلکہ ان کو کسی قسم کا بھی صدقہ دینا جائز نہیں۔ (احسن الفتاویٰ:۴/۲۸۰)۔

فتاویٰ شیخ الاسلام میں ہے: سوال: شیعی مذہب رکھنے والا مسلمان ہے یا کافر؟

جواب: شیعی مسلمان ہے یا کافر مسئلہ قابل غور اور مختلف فیہ ہے،...مولانا عبدالشکور صاحب اور بہت سے علماء ان کے کافر ہونے کے قائل ہیں بعض متوقف ہیں، بعضوں کا قول فیصل ہے کہ ان کے علماء کافر ہیں اور جہلاء فاسق ہیں، یقیناً قرآن میں تحریف کے ماننے والے، اللہ تعالیٰ کے علم یا جزئیات کا انکار کرنے والے، بدا

کے قائل ہونے والے کافر ہیں، علی ہذا القیاس حضرت صدیقہؓ پر تہمت رکھنے والے وغیرہ وغیرہ۔ (فتاوی شیخ الاسلام، ص۱۶۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مولویوں پر مالِ زکوٰۃ کھا کر امورِ دینیہ میں سستی کرنے کا الزام:

سوال: ایک مولوی صاحب نے بیان میں یوں کہا: اور خرابی یہ ہے کہ ہمارے مولوی اور طلبہ زکوٰۃ کا گندہ مال کھاتے ہیں، اس لیے دین کی خدمت میں سستی کرتے ہیں۔ کیا اس طرح کہنا صحیح ہے کہ زکوٰۃ گندہ مال ہے؟ **بینوا بالتفصیل توجروا بالأجر الجزیل .**

الجواب: بصورتِ مسئولہ اموالِ زکوٰۃ اصحابِ اموال کے حق میں میل، کچیل اور حرام اور فقراء ومساکین کے حق میں طیب، طاہر اور حلال اور پاکیزہ ہیں اور من جانب اللہ ان کا حق ہے۔ مولوی صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے۔ زکوٰۃ کا مال فقراء کے حق میں گندہ نہیں ہے اس کی چند وجوہات درجِ ذیل ہیں:

(۱) اموالِ زکوٰۃ فقراء کا حق ہے، ملاحظہ فرمایئے قرآنِ کریم میں ہے:

﴿ إنما الصدقات للفقراء والمساكين...الخ﴾. واللام في قوله : للفقراء ، للملك وللاستحقاق . (تفسیر المنار: ۱۰/۴۲۳)۔

قال اللّٰه تعالىٰ: ﴿ والذين في أموالهم حق معلوم ﴾ هو الزكاة . (الجلالین: ۱/۷۶۶)۔

(وکذا فی تفسیر القرطبی: ۳۸/۳۸، واللباب فی علوم الکتاب: ۱۹/۳۷، والکشاف: ۴/۶۱۳)۔

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ فقیر، مسکین کا خاص حق ہے اور یہ انعام اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، بالفرض اگر زکوٰۃ کا مال گندہ اور خراب ہوتا تو اللہ تعالیٰ گندے مال کو کیسے فقیر مسکین کا حق قرار دیتے؟

(۲) قرآنِ کریم میں صدقات کو اللہ تعالیٰ نے ربا کے مقابلہ میں بیان فرمایا ہے اور ربا یقیناً حرام اور گندہ ہے تو اس کی ضد یقیناً حلال اور طیب ہوئی۔

(۳) صدقہ کے بارے میں قرآن، حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود لیتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ کا مال گندہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ لینے کی نسبت اپنی طرف نہ فرماتے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے: **﴿ ألم يعلموا أن اللّٰه هو**

يقبل التوبة و يأخذ الصدقات ...الخ﴾. (التوبة:١٠٤).

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: ما تصدق عبد بصدقة من كسب طيب ولا يقبل الله إلا طيباً ولا يصعد إلى السماء إلا طيب إلا كأنما يضعها في يد الرحمن فيربيها له كما يربي أحدكم فلوه وفصيله حتى أن اللقمة أو التمرة لتأتي يوم القيامة مثل الجبل العظيم. (اخرجه ابن حبان في صحيحه رقم: ٢٧٠، وقال الشيخ شعيب: إسناده صحيح).

وأيضاً أخرجه الإمام أحمد في مسند أحمد (رقم: ٩٤٢٣)، **والحميدي في مسنده** (رقم:١١٥٤)، **والإمام الشافعي في مسنده** (رقم: ٦٠٦)، **والبيهقي في الأسماء والصفات** (رقم:٨٥٨)، **والدولابي في الكنى والأسماء** (١٢).

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب ولا يقبل الله إلا الطيب وأن الله يتقبلها بيمينه ثم يربيها لصاحبه ...الخ. (رواه البخاري، رقم: ١٤١٠، رقم: ٧٤٢٩).

وعنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما تصدق أحد بصدقة من طيب ولا يقبل الله إلا الطيب إلا أخذها الرحمن بيمينه ...الخ. (رواه مسلم، رقم: ١٠١٤).

(۴) زکوٰۃ وصدقہ کا مال گندہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے لیے کیوں پسند فرماتے؟ جبکہ احادیث میں تصریح ہے کہ جب آپ سے زکوٰۃ، صدقہ طلب کیا گیا تو آپ نے عطا فرمایا۔

ملاحظہ ہو روایت میں ہے: **عن زياد بن نعيم، أنه سمع زياد بن الحارث الصدائي يقول: أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم على قومي، فقلت: يارسول الله، أعطني من صدقاتهم، ففعل وكتب لي بذلك كتاباً...الخ. قال أبو جعفر: ...سأله من صدقة قومه، وهي زكاتهم فأعطاه منها...** (شرح معاني الآثار، رقم: ٢٧٧٢).

اس روایت سے معلوم ہوا کہ امیر صاحب کو زکوٰۃ کا مال دیا۔

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أتي بطعام سأل عنه

أهدية أم صدقة فإن قيل صدقة قال لأصحابه: كلوا ولم يأكل وإن قيل هدية ضرب بيده صلى الله عليه وسلم فأكل معهم . (رواه البخاري،رقم: ٢٥٧٦).

(۵) فقہاءِ کرام نے جن صورتوں میں سوال کرنے کو نا جائز فرمایا ہے ان میں بھی طالبِ علم اور مجاہد کو اجازت دی ہے، بقول مولوی صاحب گندے مال سے سستی پیدا ہوتی ہے تو پھر مجاہد اور طالبِ علم کے لیے کیسے درست ہوا؟ قال العلامة الشامي في رد المحتار على الدر المختار : ولا يحل أن يسأل من القوت من له قوت يومه بالفعل أو بالقوة كالصحيح المكتسب ويأثم معطيه إن علم بحاله لاعتنائه على المحرم ولو سأل للكسوة أو لاشتغاله عن الكسب بالجهاد أو طلب العلم جاز لو محتاجاً . (فتاوى الشامي: ٢/ ٣٥٥،سعيد).

وأيضاً قال: ويكون طلب العلم مرخصاً لجواز سؤاله من الزكاة وغيرها وإن كان قادراً على الكسب إذ بدونه لايحل له السؤال . (ردالمحتار:٢/ ٣٤٠،سعيد).

(۶) فقہاءِ کرام نے زکوۃ ،صدقات کا بہترین مصرف علماء، صلحاء اور دینی کام مشغولین جو فقراء ہو قرار دیا ہے، تو کیا مولوی صاحب کے بیان کے مطابق گندے مال کے لیے فقط علماء رہ گئے تھے؟ پھر فقہاء نے علماء کا مرتبہ اتنا کم کر دیا؟

قال في البحر: لو نقلها إلى فقير في بلد آخر أورع وأصلح كما فعل معاذ رضي الله تعالىٰ عنه لا يكره ولهذا قيل: التصدق على العالم الفقير أفضل كذا في المعراج .

(البحر الرائق:٢/ ٢٦٩،دار المعرفة). (وكذا في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص، باب المصرف، والدر المختار: ٢/ ٢٥٤، سعيد).

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

غریب طلباء کے لیے اسلامی مدارس میں زکوۃ دینے میں دوگنا ثواب ہے، ایک ثواب تو زکوۃ کا، دوسرا ثواب اسلامی تعلیم کی اعانت کا۔ (جواہر الفقہ: ۳/ ۲۴۴)۔

ایک حدیث شریف سے اشکال اور اس کی وضاحت:

مولانا موصوف کے ذخیرۂ معلومات میں ایسی رائے (یعنی زکوٰۃ گندہ مال ہے اس سے سستی ہوتی ہے) کے اضافہ کی وجہ شاید مسلم شریف کی ایک حدیث ہے: ...**قال: إن الصدقة لا تنبغي لآل محمد إنما هي أوساخ الناس ... الخ.** (رواه مسلم ،رقم: ١٠٧٢،باب ترك استعمال آل النبي على الصدقة).

اس حدیث کی مختصر وضاحت حسبِ ذیل ملاحظہ کیجئے:

کبھی کبھی ایک شی کی مختلف نسبتیں ہوتی ہیں ایک نسبت سے وہ شی اچھی ہوتی ہے دوسری نسبت سے بری جیسے کپڑا جب میت کا کفن ہوتو باعثِ وحشت ہے اور مزین بنا کر دولہن پر ہوتو قابل محبت ہے اسی طرح مالِ زکوٰۃ اغنیاء کے حق میں غسالہ اور اوساخ ہے اور فقیر کی طرف نسبت کرتے ہوئے حلال طیب ہے۔ **يعني كون الصدقة أوساخ الناس ليس وصفاً ذاتياً بل هو وصف حكمي .**

دوسری مثال: مالِ مسروقہ سارق کے لیے گندہ، خبیث اور حرام ہے اور مالک کے پاس پہنچ کر حلال پاکیزہ اور طیب ہے۔

اسی طرح بیع فاسد میں مشتری اول کے پاس مال کی واپسی لازم ہے لیکن مشتری آگے بیع صحیح کردے تو مشتری ثالث کے لیے حلال اور پاکیزہ ہے۔ ایک ہی مال ایک کے پاس خراب اور دوسرے کے پاس اچھا اور بہتر۔ خلاصہ یہ ہے کہ: اموالِ زکوٰۃ کے اندر دو پہلو ہیں: **(١) الصدقة إنما هي أوساخ الأغنياء لأنها تطهير لأموالهم ونفوسهم . (٢) وهي نعمة الله العظمى على عباده الفقراء لقضاء حاجاتهم.**

پھر آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت اور بزرگیت کے اظہار میں شریعت نے ان کے حق میں اوساخ الناس والا پہلو ذکر کیا، کیونکہ شریعتِ مطہرہ نے ان کو خمس کی وجہ سے مستغنی کردیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف شریعتِ مطہرہ نے اسی کو فقراء کی حاجات کے پورا ہونے کا وسیلہ بنا کر ان کے حق میں پاک صاف تسلیم کرلیا۔

شیخ ابن العربیؒ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فإن قيل: هذه أحاديث متعارضة رويتم في حديث آخر أنها أوساخ الناس وضرب النبي صلى الله عليه وسلم القيء لها مثلاً فقال: العائد في صدقته كالكلب يعود في قيئه ، ثم رويتم من طريق آخر : إن الصدقة لتقع في كف الرحمن قبل أن تقع في كف السائل، وكف

الرحمن مقدس عن القيء والوسخ .

قلنا: هذا مهم من التعارض، وهو ميدان فات علماؤنا الاستباق به ، والجواب عنه بديع ، وذلک أن الباري تعالیٰ بعث رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أفصح الخلق بأفصح الكلام فضرب الأمثال وصرف الأقوال وسلک في كل شعب من المعانی قدرة على القول واستلطافاً للقلوب في جانبی الرغبة والرهبة اللتين انتظم بهما التكليف وارتبط بهما الثواب والعقاب، وبين الأحكام الشرعية التي بعث لإيضاحها، فإن المعانی العقلية معلومة لاتفتقر إلى بيانه ، ولا تعرض هو أيضاً إليها وليست إلا أوصاف الشريعة من حسن أو قبح، أو حلال أوحرام ، أو طاعة أو معصية بصفات لأعيان قائمة بها كالصفات الحسية من الألوان والأكوان، وإنما هي عبارة عن تعلق خطاب الشرع بالعين على وجه المدح ، أوفی سبيل الذم ، فتختلف التسميات على هذه المسميات بحسب اختلاف تعلق خطاب الشارع، وقد مهدنا ذلک في كتب الأصول، فإذا ثبت هذا فليس بممتنع وصف الشيء الواحد بضدين من أحكام الشرع .

فقد تكون العين الواحدة حلالاً حراماً في حالة واحدة في حق شخصين أو في حالين في حق شخص واحد .

فالصدقة طهرة للمال في حق صاحب المال وقيء إن رجعت إليه، ورزق حسن في يد المستحق إذا حصلت في يديه ولو بقيت فی المال لغيرته وأخبثته ، فإذا خرجت عنه ، خرجت طاهرة في ذاتها فطهرته أی منعته من أن يخبث ببقائها فيه، فلا تقع فی كف الرحمن إلا و هي طاهرة مطهرة ، ولا تبقى عند الغنى إلا وتكون خبيثة مخبثة ، وضرب النبي صلى اللّٰه عليه وسلم كف السائل مثلاً بكف الرحمن ترغيباً فی العطاء ، وحثاً على الصدقة ... الخ. (كتاب القبس ، لابن العربی : ۱/ ٤١١).

نیز فقہ کا قاعدہ ہے کہ تبدیل ملک سے تبدیل عین ہو جاتی ہے، چنانچہ القواعد الفقہیۃ میں ہے:

" تبدل سبب الملک قائم مقام تبدل الذات " والأصل في ذلک ما ورد صحيحاً في لحم أهدته بريرة للنبي صلى الله عليه وسلم، فقيل له: إنه تصدق به علينا فقال: هو عليها صدقة ولنا هدية فأقام صلى الله عليه وسلم تبدل سبب الملک من التصدق إلى الإهداء فيما هو محظور عليه وهو الصدقة مقام تبدل العين. (شرح القواعد للشیخ احمد الزرقاء ص ۲۹۱).

مطلب یہ ہے فقیر کی ملک میں جانے سے پہلے میل کچیل والا ہوتا ہے لیکن فقیر کے پاس جانے کے بعد صاف اور پاک ہوجاتا ہے۔

اشکال: اس پر اشکال ہوتا ہے کہ زکوۃ کا میل کچیل تبدیل ملک سے ختم ہوجاتا ہے تو پھر آلِ محمد کے لیے بھی جائز ہونا چاہئے کیونکہ ان کی ملکیت میں آنے کے بعد پاک ہوجائیگا، پھر حرمت کے لیے اوساخ الناس ہونے کی علت بتانے کا کیا فائدہ؟

الجواب: یہ بات تو مسلم ہے کہ فقیر کے پاس آنے سے پاک ہوا لیکن لین دین تو اوساخ الناس کا ہوا اس وجہ سے آلِ محمد کو اس لین دین کی ذلتی سے بچایا گیا ہے، نیز حدیث شریف میں آتا ہے: " **اليد العليا خير من اليد السفلى** ". اسی وجہ سے کوئی نادار زکوۃ سے اپنے آپ کو بچائے اور اپنے ہاتھ کی کمائی کھائے تو بہت بہتر ہے اور لے لے تو بھی بری بات نہیں ہے۔

چنانچہ بہت سارے علماء نے زکوۃ کے اموال سے بچنے کی ترغیب دی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ (۸۱/۲) ملاحظہ فرمایئے۔

حدیث شریف کی دوسری تشریح:

اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اموالِ زکوۃ کو میل کچیل فرمایا، ناپاک اور نجس نہیں فرمایا، لہذا مسلم کی حدیث میں زکوۃ کی ناپاکی کی طرف اشارہ نہیں، بلکہ اس طرف اشارہ ہے کہ زکوۃ کا مال میل کچیل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ضرورت مند استعمال کرے، مالدار اور غنی استعمال نہ کرے۔

جیسے میلا کچیلا کپڑا پڑا ہو تو بغیر ضرورت کے لوگ استعمال نہیں کرتے، لیکن اگر کسی کو ضرورت پڑ جائے، مثلاً سفر میں ہے اور ایک کپڑا ناپاک ہوگیا اور دوسرے کپڑے نہیں ہیں تو وہی میلا کپڑا استعمال کرتے ہیں، اس

وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی ہاشم کے بارے میں فرمایا: بنی ہاشم میلا کچیلا مال استعمال نہ کریں، کیونکہ ان کو ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے بدلہ مالِ غنیمت کا خمس الخمس دیا ہے، اور آج کل چونکہ بنی ہاشم کو خمس الخمس نہیں ملتا، اس لیے بعض علماء فقرائے بنی ہاشم کے لیے زکوٰۃ کے جواز کے قائل ہیں۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (باب ۴، مصارفِ زکوٰۃ کا بیان، مسئلہ: ''بنی ہاشم اور سادات کو زکوٰۃ کی رقم دینے کا حکم)۔

اشکال اور جواب:

اشکال: ہمارے بعض اکابرؒ نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ صدقات کے کھانوں سے دل سست ہو جاتا ہے، تو اس کا کیا مطلب ہے؟

الجواب: دراصل ان اکابر کی عبارت پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد دو مقولوں پر ہے (۱) **طعام المریض یمرض القلب** (۲) **طعام المیت یمیت القلب**۔ لیکن یہ دونوں مقولے محلِ نظر ہیں، حدیث سے ثبوت درکار ہے اور وہ ندارد ہے بنابریں ہمارے مسئلہ پر کوئی اثر مرتب نہ ہوگا، جبکہ صحیح روایات میں آتا ہے کہ مسجد نبوی میں صدقات کے کھجوروں کے خوشے لٹکائے جاتے تھے اور فقیر صحابہ جو مسجد میں مقیم تھے وہ اسی پر گزارہ فرماتے تھے اور مؤرخین نے ان کے اوصاف میں سے ایک صفت بیان فرمائی ہے: **رھبان باللیل وفرسان بالنھار**، تو صدقات کی وجہ سے صحابہ تو قیام اللیل، جہاد وغیرہ دینی خدمات سے سست نہیں ہوئے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اپنی اولاد کو نفلی صدقہ دینے سے ثواب کا حکم:

سوال: بکر نامی شخص کی تین اولاد ہیں، بکر اپنی اولاد کو صدقہ دیا کرتا ہے تاکہ اولاد اس پیسے سے فون کارڈ خرید کر اس کو وقتاً فوقتاً فون کیا کرے اور میسج کیا کرے، کیا ایسے صدقہ میں ثواب ہے یا نہیں؟ کیا ایسی جگہ صدقہ بہتر ہوگا جہاں بکر خود اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کرتا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بکر کا اپنی اولاد پر نفلی صدقہ کرنا تاکہ وہ اس کے ساتھ رابطہ رکھے یہ جائز اور درست ہے بلکہ احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کا نفلی صدقہ اپنے اہل عیال اور گھر والوں پر دوسروں کے مقابلہ میں افضل اور بہتر ہے اور اس میں دوگنا ثواب ہے ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی اپنے گھر والوں پر خرچ کرے۔ ملاحظہ ہو مسلم شریف میں ہے:

عن ثوبان ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أفضل دينار ينفقه الرجل، دينار ينفقه على عياله، و دينار ينفقه على دابته في سبيل الله، و دينار ينفقه على أصحابه في سبيل الله، قال أبوقلابة: وبدأ بالعيال ثم قال أبوقلابة: وأى رجل أعظم أجراً من رجل ينفق على عيال صغار يعفهم أو ينفعهم الله به و يغنيهم. (مسلم شريف: ١/٣٢٢، ط: فيصل).

وعن زينب امرأة عبد الله قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تصدقن يا معشر النساء ولو من حليكن قالت: فرجعت إلى عبد الله فقلت إنک رجل خفيف ذات اليد وإن رسول الله صلى الله عليه وسلم قد أمرنا بالصدقة فأته فاسأله فإن كان ذلک يجزئ عني وإلا صرفتها إلى غيركم، قالت: فقال لي عبد الله بل ائتيه أنت قالت: فانطلقت ... فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: لهما أجران أجر القرابة وأجر الصدقة. (رواه مسلم: ١/٣٢٣، ط: فيصل).

قال الإمام النووي: فيه الحث على الصدقة على الأقارب وصلة الأرحام وأن فيها أجرين. (الشرح الكامل: ١/٣٢٣، ط: فيصل).

وقال العلامة العيني: وفيه الحث على الصدقة على الأقارب... الخ. (عمدة القارى: ٦/ ٤٧٥، باب الزكاة على الاقارب، ط: دارالحديث، ملتان). (وكذا في فتح البارى: ٣/٣٣٠).

وعن أبي مسعود البدري ﷺ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن المسلم إذا أنفق على أهله نفقة وهو يحتسبها كانت له صدقة. (رواه مسلم: ١/٣٢٤، ط: فيصل).

قال الإمام النووى: فيه بيان أن المراد بالصدقة و النفقة المطلقة في باقي الأحاديث إذا احتسبها ومعناه أراد بها وجه الله تعالىٰ، فلا يدخل فيه من أنفقها ذاهلاً ولكن يدخل المحتسب وطريقه في الاحتساب: أن يتذكر أنه يجب عليه الإنفاق على الزوجة وأطفال

أولاده والمملوک وغيرهم ممن تجب نفقته على حسب أحوالهم... الخ. (الشرح الكامل: ١/ ٣٢٤، ط:فيصل).

البتہ علماء فرماتے ہیں کہ یہ صدقہ اس وقت افضل ہے جب کہ اہل وعیال محتاج ہو۔ **قال الإمام النوويؒ: إن الصدقة على الأقارب أفضل من الأجانب إذا كانوا محتاجين.** (الشرح الكامل: ١/ ٣٢٣، ط:فيصل).

نیز مذکورہ صورت میں جب والد اپنے بچوں کو پیسہ دیتا ہے تو وہ پیسہ اس کی ملکیت سے خارج ہو کر بچوں کی ملکیت میں آجاتا ہے پھر وہ بچے والد کو فون کرے تو کوئی حرج نہیں ہے، یہ ان کی طرف سے صلہ رحمی ہے کہ وقتاً فوقتاً والدین کی خیر، خیریت معلوم کریں۔

بخاری شریف میں ہے:

عن أم عطية رضي الله تعالىٰ عنها قالت: بعث إلى نسيبة الأنصارية بشاة فأرسلت إلى عائشة رضي الله تعالىٰ منها فقال النبي صلى الله عليه وسلم عندكم شيء فقلت لا إلا ما أرسلت به نسيبة من تلک الشاة فقال: هات فقد بلغت محلها. (رواه البخاري، رقم: ١٤٤٦، باب قدر كم يعطى من الزكاة والصدقة).

علامہ عینیؒ حدیثِ بالا کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مطابقته للترجمة من حيث أن نسيبة أرسلت إلى عائشة رضي الله تعالىٰ عنها من الشاة التي أرسلها إليها النبي صلى الله عليه وسلم من الصدقة فلما قبلتها نسيبة دخلت في ملكها وخرجت من كونها صدقة فهذا معنى التحول. (عمدة القاري: ٦/ ٥٥٠، دارالحديث).

دوسری روایت میں ہے:

عن عامر بن سعد عن سعد بن أبي وقاص ﷺ أنه أخبره أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنک لن تنفق نفقة تبتغي بها وجه الله إلا أجرت عليها حتى ما تجعل في في امرأتک. (رواه البخاري، رقم: ٥٦).

فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

وإذا كان هذا بهذا المحل مع ما فيه من حظ النفس فما الظن بغيره مما لاحظ للنفس فيه قال: وتمثيله باللقمة مبالغة في تحقيق هذه القاعدة لأنه إذا ثبت الأجر في لقمة واحدة لزوجة غير مضطرة فما الظن بمن أطعم لقماً لمحتاج أو عمل من الطاعات ما مشقته فوق مشقة ثمن اللقمة الذي هو من الحقارة بالمحل الأدنى، وتمام هذا أن يقال وإذا كان هذا في حق الزوجة مع مشاركة الزوج لها فى النفع بمايطعمها لأن ذلک يؤثر في حسن بدنها وهو ينتفع منها بذلک وأيضاً فالأغلب أن الإنفاق على الزوجة يقع بداعية النفس بخلاف غيرها فإنه يحتاج إلى مجاهدتها، والله أعلم. (فتح الباری: ۱/۱۳۷).

نیز مختلف جہات میں صدقہ کرنے کی فضیلت بھی حدیث شریف میں آئی ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: أعتق رجل من بني عذرة عبداً له عن دبر فبلغ ذلک رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ألک مال غيره فقال: لا، فقال: من يشتريه مني فاشتراه نعيم بن عبد الله العدوي بثمان مائة درهم فجاء بها رسول الله صلى الله عليه وسلم فدفعها إليه ثم قال: ابدأ بنفسک فتصدق عليها فإن فضل شيء فلأهلک فإن فضل عن أهلک شيء فلذي قرابتک فإن فضل عن ذي قرابتک شيء فهكذا وهكذا يقول: فبين يديه وعن يمينک وعن شمالک. (رواه مسلم: ۱/۳۲۲، فيصل).

قال الإمام النوويؒ: في هذا الحديث فوائد:... ومنها أن الأفضل في صدقة التطوع أن ينوعها في جهات الخير ووجوه البر بحسب المصلحة ولا ينحصر في جهة بعينها. (الشرح الكامل: ۱/۳۲۲، ط: فيصل).

عن أبي الجويرية أن معن بن يزيد رضي الله تعالىٰ عنه حدثه قال: بايعت رسول الله صلى الله عليه وسلم أنا وأبي وجدي وخطب علي فأنكحني وخاصمت إليه كان أبي يزيد أخرج دنانير يتصدق بها فوضعها عند رجل فى المسجد فجئت فأخذتها فأتيته بها فقال: والله ما إياک أردت فخاصمته إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: لک ما نويت

یایزید ولک ما أخذت یامعن . (صحیح البخاری، رقم: ۱۴۲۲). واللہ ﷻ اعلم۔

رفاہی تنظیم میں زکوۃ دینے سے ادائیگی کا حکم:

سوال: ہم نے ایک رفاہی تنظیم شروع کی ہے، جس میں لوگوں سے زکوۃ وصول کرتے ہیں اور مستحقین تک پہنچاتے ہیں، اور مستحقین دو قسم کے ہیں: متعین اور غیر متعین۔ متعین سے اجازت حاصل ہے کہ ہم ان کے لیے زکوۃ کی رقم جمع کرے اور ان پر خرچ کرے، کبھی کبھی خرچ کرنے کے بعد زکوۃ کی رقم بچ جاتی ہے اس کو غیر متعین پر خرچ کرتے ہیں۔ مستحقین غیر متعین کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ معطین کی زکوۃ کب ادا ہوگی، جب معطین فنڈ میں جمع کراتے ہیں یا جب مستحقین تک ہم پہنچاتے ہیں؟ بعض مرتبہ زائد رقم تقسیم کرنے میں پورا سال گزر جاتا ہے، کیا ایسا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: فی زماننا عرفِ عام میں رفاہی تنظیمیں عاملین کے حکم میں ہونے کی وجہ سے مستحقین کی طرف سے وکیل ہوتی ہیں۔ بنابریں معطین کے فنڈ میں زکوۃ کی رقوم جمع کرانے سے زکوۃ ادا ہو جاتی ہے۔

اور متعین اور غیر متعین کا فرق اس وقت ہوگا جبکہ تعیین معطین کی طرف سے ہو، اگر معطی نے دیتے وقت یہ کہہ دیا کہ فلاں متعین اشخاص کو زکوۃ دی جائے تو پھر ان متعین ہی کو دینا ضروری ہوگا، اور اگر کوئی تصریح نہ ہو تو کسی بھی مستحق زکوۃ کو رقم دی جاسکتی ہے۔

صورتِ مسئولہ میں مستحقین کی تقسیم رفاہی تنظیم نے کی ہے، معطین کی طرف سے کوئی تعیین نہیں، اس لیے اس صورت میں متعین اور غیر متعین دونوں استحقاق میں یکساں ہیں۔ ہاں بلاعذر ادائیگی میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے، اور اگر تاخیر میں کوئی مصلحت ہو تو گنجائش ہے۔

قال في البحر الرائق: بخلاف ما إذا ضاعت في يد الساعي لأن يده كيد الفقراء كذا في المحيط . (البحر الرائق: ۲/ ۲۲۷، دارالمعرفة). (وكذا في فتاوى الشامي: ۲/ ۲۷۰، سعيد).

ہمارے اکثر اہل فتاویٰ نے مہتمم کو طلبہ اور معطین دونوں کا وکیل تسلیم کیا ہے اور طلبہ کے وکیل ہونے کی وجہ سے مہتمم اور اس کے ماتحت لوگوں کے قبضہ کرنے پر زکوۃ دہندگان کی زکوۃ اسی وقت ادا ہو جاتی ہے، لہذا اگر طلبہ

پر خرچ ہونے سے قبل بلا تعدی ہلاک ہو جائے تو معطین کے وکیل اور امین ہونے کی وجہ سے ان پر کوئی تاوان لازم نہ ہوگا، اور طلبہ کے وکیل ہونے کی وجہ سے معطین کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، نیز کئی سال سے جمع شدہ رقم پر کسی شخص حقیقی کی ملکیت تامہ نہ ہونے کی وجہ سے ان سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا لازم نہ ہوگا، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ معطین کے حق میں اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں، اور طلبہ اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، لہذا نہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی معطین زکوٰۃ واپس لے سکتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے بھی امداد الفتاویٰ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے مذکورہ جواب کو تحریر فرمایا ہے جس سے شبہ اور تردد بالکل مرتفع ہو جاتا ہے۔ حضرت کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

مخدومنا ومقتدانا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ ...اور دو مسئلہ فروع میں سے قابل تحقیق ہیں؛ اول مدرسہ میں جو روپیہ آتا ہے اگر یہ وقف ہے تو بقاء عین کے ساتھ انتفاع کہاں ہے، اور یہ ملک معطی کا ہے تو اس کے مرجانے کے بعد واپسی ورثاء کی طرف واجب ہے؟

جواب: مکرم ومحترم حضرت مولانا الحافظ الحاج مولوی اشرف علی صاحب دام مجدہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ...عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمالِ بیت المال معطین اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں لہذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں۔...

(۱) عمالِ بیت المال منصوب من السلطان ہیں اور سلطان کی ولایتِ عامہ ہے اس لیے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے اور مقیس میں ولایتِ عامہ نہیں اس لیے آخذین کا وکیل کیسے بنے گا کیونکہ نہ توکیل صریح ہے نہ دلالۃً ہے اور مقیس علیہ میں دلالۃً ہے کہ سب وہ اس کے زیر طاعت ہیں اور وہ واجب الاطاعت ہے۔...

بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں ایک حکومت جس کا ثمرہ تنفیذِ حدود وقصاص دوسرا انتظامِ حقوقِ عامہ۔ امر اول میں کوئی اس کا قائم مقام نہیں ہوسکتا امر ثانی میں اہل حل وعقد بوقتِ ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں وجہ یہ کہ اہل حل وعقد کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے جو بابِ انتظام سے ہے۔ لہذا امالی انتظام مدارس جو برضاء ملاک وطلبہ ابقائے دین کے لیے کیا گیا ہے بالاولیٰ معتبر ہوگا اور ذرا غور فرماویں

انتظام جمعہ کے لیے عامہ کا نصب امام معتبر ہونا ہی جزئیات میں اس کی نظیر شاید ہو سکے۔۔۔فقط والسلام۔خلیل احمد عفی عنہ۔(امداد الفتاوی:۶/۲۵۹۔۲۶۳)۔

اسی طرح تذکرۃ الرشید میں مرقوم ہے:

شبہ: مدرسہ میں جو چندہ وغیرہ کا روپیہ آتا ہے وہ وقف ہے یا مملوک؟ اگر وقف ہے تو بقاء عین واجب ہے اور صرف بالاستہلاک ناجائز، اگر مملوک ہے اور مہتمم صرف وکیل تو معطی چندہ اگر مرجائے تو غرباء وورثاء کا حق ہے اس کی تفتیش وکیل کو واجب ہے۔زمانہ شارع علیہ السلام وخلفاءؓ میں جو بیت المال تھا اس میں بھی یہ اشکال جاری ہے بہت سوچا مگر قواعدِ شرعیہ سے حل نہ ہوا اور مختلف چندوں کو خلط کرنا استہلاک ہونا چاہئے اور مستہلک ملک مستہلک ہو کر جو صرف کیا جائے اس کا تبرع ہوگا اور مالکوں کا ضامن ہوگا اگر یہ ہے تو اہل مدرسہ یا امین انجمن کو سخت دقت ہے امید ہے کہ جواب باصواب تشفی فرمادیں۔

الجواب: مہتمم مدرسہ کا قیم ونائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے جیسا امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبض ہے اس کے قبض سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگر چہ وہ مجہول الکمیۃ والذوات ہوں مگر نائب معین ہے پس بعد موتِ معطی کے ملک ورثہ معطی کی اس میں نہیں ہو سکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہو سکتا ہے بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطی کی ہوگی اور نہ خود معطی کی ملک رہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔(تذکرۃ الرشید، ص۱۶۴، شبہات فقہیہ ومسائل مختلف فیہا)۔

ان حضراتِ اکابرؒ کی تحقیق کے بعد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنے سابقہ فتوے سے رجوع فرما لیا اور ان حضرات کی تحقیق کو تسلیم فرما کر امداد المفتین میں شائع فرمادیا۔عبارت ملاحظہ کیجئے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔امابعد: تملیکِ زکوٰۃ کے مسئلہ سے متعلق میرا رسالہ جو سن ۱۳۶۱ ہجری میں لکھا گیا تھا اور امداد المفتین کا جزو ہو کر بار بار شائع ہوا اس میں مہتممین مدرسہ کا حکم عاملین صدقہ کے حکم سے مختلف اس شبہ کی بنیاد پر لکھا گیا تھا جو خود سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے پیش فرمایا لیکن جب اس شبہ کو خود حضرت نے رأس الفقہاء حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے سامنے پیش فرمایا اور حضرت موصوف نے اس کا جواب تحریر فرمایا تو حضرت حکیم الامت کا وہ شبہ رفع ہو گیا اور وہ اسی حکم پر مطمئن ہو گئے جو

حضرت ممدوح نے لکھا تھا یعنی آج کل کے مہتممین مدرسہ اور ان کے مقرر کردہ چندہ وصول کرنے والے عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہو کر فقراء کے وکیل ہیں، معطیین چندہ کی وکالت صرف اس درجہ میں ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو وکیل فقراء تسلیم کر کے اپنا چندہ ان کے حوالے کر دیا تو جب بحیثیت وکیل فقراء رقم ان کے قبضہ میں چلی گئی تو وہ فقراء کی ملک ہوگئی اور زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہوگئی بات تو اتنے ہی سے صاف ہوگئی تھی لیکن اس کی مزید تائید وتوثیق ابوحنیفہؒ وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے اس فتوے سے ہوگئی جو تذکرۃ الرشید میں مولانا صادق الیقین صاحبؒ کے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا جس میں اس کی تصریح ہے کہ اگرچہ یہ طلبہ فقراء مجہول الکمیت والذوات ہیں اس کے باوجود ان کی وکالت مہتمانِ مدرسہ کے لیے عرفی طور پر ثابت ہوگئی اور ان کا قبضہ فقراء کا قبضہ ہوگیا۔

حضرت گنگوہیؒ کے اس مدلل فتوے اور حضرت مولانا خلیل احمد قدس سرہ کی تحقیق اور اس پر حضرت حکیم الامتؒ کی تسلیم وتصدیق کے بعد مسئلہ میں تو کوئی اشکال نہیں رہا تاہم احقر نے جب پاکستان آنے کے بعد کراچی میں دار العلوم قائم کیا تو احتیاطاً یہ صورت اختیار کی کہ جن طلبہ کو دار العلوم میں داخلہ دیا جاتا ہے ان کے داخلہ فارم پر یہ توکیل کا مضمون ہر طالبِ علم کی طرف سے برائے مہتممِ مدرسہ یا جن کو وہ مامور کرے طبع کر دیا گیا ہے اور ہر داخل ہونے والا طالبِ علم باقاعدہ مہتممِ مدرسہ کو اپنی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے کا بھی وکیل بناتا ہے اور عام فقراء کی ضرورتوں پر خرچ کرنے کا بھی اس طرح مہتممِ مدرسہ ہر سال داخل ہونے والے متعین طلباء کا وکیل ہوتا ہے، اور ان کی طرف سے تمام طلباء پر خرچ کرنے کا مجاز، اس طرح مجہول الکمیت والذات ہونے کا شبہ بھی باقی نہیں رہتا اس لیے میں امداد المفتین میں اس مسئلہ سے متعلق شائع شدہ عبارت سے رجوع کر کے اسی فیصلہ کو تسلیم کرتا ہوں جو فیصلہ ان سب اکابر کا ہے یعنی موجودہ زمانے کے مہتمانِ مدارس یا ان کے مامور کردہ حضرات جو چندہ یا زکوٰۃ وصول کرتے ہیں وہ بحیثیتِ وکیل فقراء کے وصول ہوتی ہے اور ان کے قبضہ میں پہنچتے ہی معطیین زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔

ضروری تنبیہ: اس تحقیق میں مہتمانِ مدارس کے لیے ایک تو آسانی ہوگئی کہ ان کو ہر ایک شخص کا مالِ زکوٰۃ اور اس کا حساب الگ الگ لکھنے کی ضرورت نہیں رہی اور قبل از خرچ معطی چندہ کا انتقال ہو جائے تو اس کے

وارثوں کو واپس کرنے کی ضرورت نہ رہی معطیانِ چندہ کو بھی یہ فائدہ پہنچا کہ ان کی زکوۃ فوری طور پر ادا ہوگئی، لیکن مہتممانِ مدارس کی گردن پر آخرت کا ایک بڑا بوجھ آپڑا کہ وہ ہزاروں فقراء کے وکیل ہیں جن کے نام اور پتے محفوظ اور یاد رکھنا بھی آسان نہیں کہ خدانخواستہ اگر اس مال کے خرچ کرنے میں کوئی غلطی ہو جائے تو ان سے معافی مانگی جاسکے اس لیے اگر مہتممانِ مدارس نے فقراء طلباء کی ضروریات کے علاوہ کسی کام میں اس مال کو خرچ کیا تو وہ ایسا ناقابل معافی جرم ہوگا جس کی تلافی ان کے قبضہ میں نہیں اسی لیے ان سب حضرات پر لازم ہے کہ مدارس کے چندہ کی رقم کو بڑی احتیاط کے ساتھ صرف ان ضروریات پر خرچ کیا جائے جن کا تعلق فقراء طلباء سے ہے مثلاً ان کا طعام ولباس اور دواء وعلاج ان کی رہائشی ضرورتیں، ان کے لیے کتابوں کی خریداری وغیرہ۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (امداد المفتین، ص ۸۹۵، ط: دار الاشاعت)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اموالِ تجارت میں نیت کا حکم:

سوال: زمین یا دیگر عروض کے مالِ تجارت بننے کے لیے کیا شرائط ہیں، میری مراد یہ ہے کہ صرف نیت کافی ہے یا کچھ اور بھی مطلوب ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اسباب وجائیداد اور دیگر عروض کے مالِ تجارت بننے کے لیے شرط یہ ہے کہ بوقتِ شراء تجارت کی نیت ہو تب ہی مالِ تجارت میں شمار ہوگا اور سال گزرنے پر زکوۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ خریدتے وقت تو تجارت کی نیت نہیں تھی لیکن بعد میں تجارت کی نیت کرلی تو اب جب تک فروخت نہ کردے اس وقت تک مالِ تجارت میں شمار نہیں ہوگا، یعنی محض تجارت کی نیت کافی نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

ومن اشترى جارية للتجارة ونواها للخدمة بطلت عنها الزكاة لاتصال النية بالعمل وهو ترك النية وإن نواها للتجارة بعد ذلك لم تكن للتجارة حتى يبيعها فيكون في ثمنها زكاة لأن النية لم تتصل بالعمل إذ هو لم يتجر فلم تعتبر ولهذا يصير المسافر مقيماً بمجرد النية ولايصير المقيم مسافراً إلا بالسفر، وإن اشترى شيئاً ونواها للتجارة كان للتجارة

لاتصال النية بالعمل . (الهداية: ١/١٨٧).

(وكذا في المبسوط للامام السرخسيؒ:٢/٣٥٨، دارالفكر، والمحيط البرهاني :٢/٣٩١، وبدائع الصنائع: ٢/١٢، سعيد، ودررالحكام في شرح غررالاحكام: ١/١٧٤). **واللہ ﷻ اعلم۔**

شوہر کو زکوٰۃ دینے سے ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک شخص فقیر اور محتاج ہے لیکن اس کی بیوی کے پاس زیورات وغیرہ مال ہے جو نصاب سے زائد ہے تو کیا بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ کا مال دے سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی اگر دیدی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی دوبارہ ادا کرنا لازم اور ضروری ہوگا۔ملاحظہ فرمایئے قدوری میں ہے:

ولا تدفع المرأة إلى زوجها عند أبي حنيفةؒ ، وقال أبويوسفؒ ومحمدؒ : تدفع إليه .

التصحیح والترجیح میں شیخ قاسم بن قطلوبغا امام صاحبؒ کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

قوله:ولا تدفع المرأة... رجح صاحب الهداية و غيره قوله ، واعتمده النسفي و برهان الشريعة . (التصحيح والترجيح مع القدوري ،ص٢٠١،باب من يجوزدفع الصدقة اليه ومن لايجوز،ط:بيروت) . **مزید ملاحظہ ہو:** (الجوهرة النيرة :١/٤٩٤، والفتاوى الهندية :١/١٨٩، والهداية:١/٢٠٦، والقول الراجح : ١/١٨٦). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ کے بارے میں دوسرا قول:

''نئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے'' میں مرقوم ہے کہ ''مجمع الفقہ الاسلامی کے سمینار میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس صورت میں لاکھوں لاکھ کی نقد رقم ہیرے جواہرات کی صورت میں ان کے پاس محفوظ ہو جاتی ہے جو کسی بھی وقت نقد کی صورت میں منتقل ہو سکتی ہے، بحث کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی کہ ایک جہت تو یہ ہے کہ ہیرے جواہرات، سونا چاندی نہیں ہیں جو خلقۃً مالِ نامی تسلیم کئے گئے ہیں، اور اس شخص کا کام ہیرے جواہرات کی تجارت بھی نہیں ہے اور نہ فوری طور پر خریدتے وقت باضابطہ تجارت کی نیت کی گئی ہے تاکہ بسبب مال تجارت

ہونے کے اسے نامی قرار دیا جائے، اس جہت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس پر زکوۃ واجب نہ ہو۔

دوسری جہت یہ ہے کہ ہیرے جواہرات ضروریاتِ زندگی میں داخل نہیں اور اصحابِ سرمایہ اپنے خاص مصالح کے لیے اپنے روپیوں کو جن کی مقدار غیر معمولی حد تک زائد، ہیروں اور جواہرات کی صورت میں محفوظ کر کے مختلف فوائد بھی حاصل کرتے ہیں، اور انھیں اس طرح اس کا اطمینان بھی رہتا ہے کہ ان ہیروں اور جواہرات کی صورت میں گویا ''زرنقد'' ہر دم ان کے پاس محفوظ ہے اور اس کے نتیجہ میں فقراء کو شدید نقصان ہوتا ہے کہ نقد رقوم میں زکوۃ واجب ہوتی ہے جو عام حالات میں ہیرے جواہرات کی صورت میں عام اصول کے پیش نظر واجب نہیں ہوتی۔

سمینار میں شریک علماء واصحابِ افتاء میں سے ایک خاصی تعداد نے پہلی جہت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس خاص صورت میں محفوظ ہیرے جواہرات کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

جب کہ دوسری بڑی تعداد ان علماء واصحابِ افتاء کی تھی جنھوں نے دوسری جہت کو سامنے رکھتے ہوئے اس خاص صورت میں ذخیرہ کیے ہوئے ہیرے جواہرات کو حکماً مالِ تجارت تسلیم کیا اور اس پر زکوۃ واجب قرار دیا:

وجوبِ زکوٰۃ کے قائلین حضرات کے اسماء:

(۱) مولانا مجاہد الاسلام قاسمی۔

(۲) مولانا طیب الرحمٰن صاحب۔ امیر شریعت آسام۔

(۳) مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بمبئی۔

(۴) مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی۔

(۵) مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی۔

(۶) مولانا شمس پیرزادہ صاحب۔

(۷) مولانا انیس الرحمٰن صاحب قاسمی۔

(۸) مولانا عبد الرحیم صاحب بھوپال۔

(۹) مولانا مفتی عبد الرحمٰن صاحب۔

(۱۰) مولانا زبیر احمد قاسمی۔

(۱۱) مولانا رفیق المنان صاحب۔ (تفصیلی دلائل کے لیے ان کا مقالہ ملاحظہ کیجئے: جدید فقہی مباحث: ۷/۴۹۸)۔

(۱۲) مولانا مفتی نذید احمد صاحب۔

(۱۳) مولانا محمد شعیب صاحب۔ (تفصیلی دلائل کے لیے ان کا مقالہ ملاحظہ کیجئے: جدید فقہی مباحث: ۷/۶۵۲)۔

(۱۴) مولانا عتیق احمد صاحب قاسمی وغیرہم۔

فقہ الزکاۃ میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی صاحب نے بھی اسی طرف میلان کا اظہار فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

و ینبغي أن یکون هذا هو حکم اللؤلؤ و الیاقوت و الالماس و کل الأحجار الکریمة والجواهر النفیسة، فما اتخذ منها للحلیة و الزینة و لم یبلغ درجة الإسراف فلا زکاة فیه، وما جاوز المعتاد مجاوزة بینة فهو من الإسراف المحرم ، ولایصح أن یتمتع بالإعفاء من الزکاة وکذلک ما اتخذ بقصد الاکتناز جدیر أن تجب فیه الزکاة ، إذ اقتناؤه حینئذٍ حیلة للتهرب مما فی المال من حق معلوم للسائل والمحروم ، والنیة هی الفیصل في هذا، ویدل علیها مجاوزة المعتاد . (فقه الزکاة: ۱/ ۳۱۰).

مولانا خالد سیف اللہ صاحب نے راہِ عمل میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

ایک اہم مسئلہ جو موجودہ حالات میں پیدا ہوا ہے، یہ ہے کہ بعض حضرات اپنی دولت کی حفاظت اور ٹیکس سے بچاؤ کے لیے نقد رقم کو ہیرے جواہرات کی صورت میں تبدیل کر لیتے ہیں، اس تبدیلی کا مقصد گو تجارت نہیں ہوتا لیکن یہ روپیوں کی بدلی ہوئی صورت ہے لہذا کیا ایسے ہیرے اور جواہرات میں زکوۃ واجب ہوگی؟ ایک رائے یہ ہے کہ اس میں زکوۃ واجب نہ ہو...... یہی اکثر اہل علم کی رائے ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ ان ہیرے اور جواہرات کا مقصود روپیہ کا محفوظ کرنا ہے نہ کہ خود ہیرے اور جواہرات کا حصول، اس لیے گویا وہ نقد رقم ہی ہے جو ایک تبدیل شدہ صورت میں موجود ہے، لہذا اس میں بھی زکوۃ واجب ہونی چاہئے۔ راقم الحروف کے خیال میں پہلی رائے قوی ہے اور یہ دوسری رائے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے، اس لیے ایسے ہیرے و جواہرات جو استعمال کے لیے نہیں، بلکہ سرمایہ کی حفاظت کے لیے خرید کئے گئے ہوں

ان کی زکوۃ ادا کردینا بہتر ہے۔(راہِ عمل،ص۷۹۷)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ڈپازٹ کی رقم پر زکوۃ کے بارے میں مزید تحقیق:

ڈپازٹ یا زرضمانت پر زکوۃ آئے گی یا نہیں اور کس پر آئے گی اس کے فیصلے سے پہلے اس کی حیثیت کا تعین ضروری ہے،اس میں چار احتمالات ہیں جو درجِ ذیل ہے:

(۱) پہلا احتمال؛ مولانا عبیداللہ الاسعدی (جدید فقہی مباحث :۲۰/۶)اور مولانا عبداللہ القاسمی (جدید فقہی مباحث:۶/ ۳۱۱-۳۱۲) نے اس کو قرض مان کر زکوۃ کی ذمہ داری مقرض کے ذمہ قرار دی ہے۔مگر عرف وتعامل اس احتمال کو رد کرتے ہیں، کیونکہ قرض میں میعاد مقرر نہیں ہوسکتی اور جب چاہے لیا جاسکتا ہے اور ڈپوزٹ میں یہ بات مفقود ہے۔(جدید فقہی مباحث:۷/۶۳۳)۔

لیکن میعاد مقرر کرنے سے قرض کی حیثیت متاثر نہیں ہوتی بلکہ قرض میں میعاد وعدہ کی صورت میں صحیح ہے اور بڑے قرضوں کو وقت سے پہلے مانگنا مقروض پر بے تحاشا بوجھ ڈالنا ہے۔عطر ہدایہ میں مرقوم ہے:

قرض میں مدت لازم کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ مدت متعین کرنے سے فساد لازم نہیں آتا۔مدت بحیثیت شرط ہونے کے لازم ہوجاتی ہے بحیثیت قرض لازم نہیں ہوتی اگر قرض خواہ مدت ختم ہونے سے پہلے مطالبہ کرے تو اسے اس مطالبہ کا حق حاصل ہے مدیون کو چاہئے کہ اس کے مطالبہ پر ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرے۔

عطر ہدایہ کے حاشیہ میں مرقوم ہے: فقہاء کے اس میں دوقول ہیں؛(۱) یہ کہ شرط مدت سے قرض فاسد ہوجاتا ہے،اور جواب یہ ہے کہ ایک تو سود تبرعات میں ہوتا ہی نہیں اور قرض ابتداءً تبرع ہے،جیسا کہ ابن ماجہ سے مروی ہے،فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میں نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔

دوسرے؛شرط نفع بحق مقرض حرام ہے نہ بحق مستقرض...اس لیے کہ وہ تو نفع ہی کے لیے قرض لیتا ہے،

تیسرے:علقمہ بن یسار قرض لیا کرتے اس وعدہ پر کہ جب بیت المال سے ان کا حق ملے گا ادا کریں گے(موطا)

چوتھے؛ لزوم بھی ممتنع نہیں ہوسکتا اس لیے کہ نفع مقروض ہے اور امام مالکؒ سے مروی ہے کہ اگر قاضی مدت معین

کر دے تو لازم ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ حرام قاضی کے حکم سے جائز نہیں ہو سکتا اور عدم لزوم میں کاروبار بند ''ہو جائیگا'' بلکہ تجارتی قرض سود نہیں بلکہ وبال جان، برباد کن خانما ہو جائے گا البتہ قرض مجرد لزوم شرط کو نہیں چاہتا کیونکہ تبرع ہے مگر وعدہ وغیرہ سے لزوم کا مضائقہ نہیں پس یہ لزوم بمجرد قرض ہونے کے نہیں بلکہ وعدے سے ہے اور فقہاء نے وعدہ کو بوجہ حاجت لازم مان ہی لیا ہے۔ (عطر ہدایہ مع الحاشیہ ص ۲۹۳۔۲۹۴ فصل قرض کا حکم، ط: زمزم)۔

جو حضرات ڈپازٹ کو قرض قرار دیتے ہیں تو ان کے نزدیک یہ قرض مشابہ بالرہن ہے جیسے بیع الوفا بیع فی حکم الرہن ہے کہ مشتری مبیع کو کسی اور کو فروخت نہیں کر سکتا اور بیع الوفا میں زکوٰۃ کے وجوب میں شامی نے دو قول ذکر کئے ہیں: مشتری پر کما ہو العادۃ یا بائع پر کیونکہ بائع نے مبیع کو فروخت کر کے ثمن حاصل کیا اور اس کا مالک بن گیا ہے۔ (فتاویٰ شامی: ۲/۲۶۱)

اسی طرح ڈپازٹ کی رقم قرض مشابہ بالرہن ہے اور قرض میں مقرض پر زکوٰۃ ہے ڈپازٹ میں بھی مالک پر زکوٰۃ ہے جیسے بیع الوفا بیع مشابہ بالرہن ہے اور اس میں بائع پر بقولِ مختار یا مشتری پر زکوٰۃ ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے: **ومشايخ سمرقند جعلوه بيعاً جائزاً مفيداً لبعض الأحكام على ما هو المعتاد للحاجة إليه** . (الهداية: ۳/۳٤۷) **وقال العيني في البناية: قال الإمام نجم الدين النسفي: اتفق مشايخنا في هذا الزمان على صحته بيعاً**. (۱۱/٤٦).

اور درر الحکام شرح غرر الاحکام میں ہے: **بيع الوفاء قيل رهن ...وقيل بيع . ذكر في مجموع النوازل اتفق مشايخنا في هذا الزمان على صحته بيعاً على ما كان عليه بعض السلف؛ لأنهما تلفظا بلفظ البيع من غير ذكر شرط فيه والعبرة للملفوظ نصاً دون المقصود ، فإن من تزوج امرأة ومن نيته أن يطلقها بعد ما جامعها صح العقد ، وقيل قائله قاضي خان الصحيح أنه أي العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لايكون رهناً ؛ لأن كلاً منهما عقد مستقل شرعاً لكل منهما أحكام مستقلة بل يكون بيعاً** . (درر الحكام: ۲/۲۰۷، وفتاویٰ قاضي خان بهامش الهندية: ۱/۱٦٥، والبحر الرائق: ٦/۸).

فتاویٰ شامی میں ہے:

الأول أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حكم الانتفاع به إلا أنه لايملك بيعه : قال الزيلعي في الإكراه : وعليه الفتوى ، الثاني القول الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام ، حتى ملك كل منها الفسخ، صحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبيع ، ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشترى بيعه من آخر ولا رهنه وسقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما قال في البحر : وينبغي أن لايعدل في الإفتاء عن القول الجامع وفي النهر والعمل في ديارنا على ما رجحه الزيلعي.

(فتاوى الشامي: ۵/۲۷۷،سعيد).

شرح عقود رسم المفتی میں عرف کی بحث کے تحت فرماتے ہیں:

ثم اعلم أن كثيراً من الأحكام...قد تغيرت بتغير الأزمان بسبب فساد أهل الزمان أو عموم الضرورة . (شرح عقود رسم المفتي : ۷۵).

مزید ملاحظہ کیجئے: (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۲۵۵،وفتاویٰ دارالعلوم زکریا:۳/۱۵۱)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب نے بھی قرض کو ترجیح دی ہے،ان کی عبارات ملاحظہ کیجئے:

ڈپازٹ کی رقم کو رہن اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ رہن بالدرک صحیح نہیں ہوتا، كما في الهداية: ٤/٥٢٧، وغيرها : (والرهن بالدرک باطل والكفالة بالدرک جائزة) والفرق أن الرهن للاستيفاء ولا استيفاء قبل الوجوب ، وإضافة التمليک إلى زمان في المستقبل لا تجوز. وفي العناية : ١٠/١٥٦: والدرک هو رجوع المشترى بالثمن على البائع عند استحقاق المبيع . ڈپوزٹ کی رقم اس غرض کے لیے ہوتی ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کردیا تو اس سے لیا جاسکے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا ہے محض محتمل ہوتا ہے،لہذا اس ڈپوزٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے، یہ قرض ہی ہے اور مشروط بحکم العرف ہے۔(فتاویٰ عثمانی:۳/۴۲۱)۔

لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ رہن بالدرک اور آئندہ مالک مکان کی پراپرٹی کو نقصان پہونچانے میں فرق ہے اس لیے

کہ ضمان بالدرک کا مطلب یہ ہے کہ اگر آئندہ مبیع مشتری سے مستحق نے لے لیا تو مشتری کے پاس رکھے ہوئے مرہون سے اس کے ثمن کو وصول کیا جائیگا اور یہ احتمال شاذ و نادر ہے اور کرایہ دار کا مالکِ مکان کے مکان کو نقصان پہونچانا کثیر الوقوع ہے بلکہ نقصان نہ پہونچانا شاذ و نادر ہے اس لیے اس مسئلہ اور ضمان بالدرک میں فرق ہے۔

پس جس طرح قرض میں زکوٰۃ مقرض پر آتی ہے اسی طرح یہاں بھی کرایہ دار پر واجب ہوگی۔ فقہ العبادات میں ہے: **الدین القوی کبدل القرض ... وتجب الزکاة علی الدائن متی قبض منه خمس النصاب أی أربعین درهماً فأکثر، ویعتبر لما مضی من الحول، فیبدأ حوله من وقت بلوغ النصاب فیزکی عن الأعوام السابقة لما قبضه** . (فقه العبادات: ۱/ ۱٤٦).

(۲) دوسرا احتمال: مولانا یوسف لدھیانویؒ (آپ کے مسائل اوران کا حل: ۵/ ۷۷) مولانا مفتی محمد صاحبؒ (فتاوی فریدیہ: ۳/ ۴۲۱) اور مولانا شبیر احمد قاسمی (جدید فقہی مباحث: ۶/ ۲۸۳) نے اس کو امانت قرار دیا ہے لہذا زکوٰۃ امانت رکھوانے والے کے ذمہ لازم ہوگی۔ یہ احتمال بھی درست نہیں اس لئے کہ امانت غیر مضمون ہوتی ہے اور ڈپازٹ کی رقم مضمون ہوتی ہے۔ (جدید فقہی مباحث: ۷/ ۶۳۳)۔

(۳) تیسرا احتمال: عاریت کا ہے لیکن تین وجوہات کی بنا پر یہ بھی صحیح نہیں؛ (۱) ڈپوزٹ مضمون ہوتی ہے اور عاریت اس طرح نہیں۔ (۲) عاریت میں مالک کو ہر وقت رجوع کا حق ہوتا ہے اور ڈپازٹ میں متعین وقت سے پہلے رجوع نہیں کیا جا سکتا۔ (۳) علماء نے لکھا ہے کہ عاریت دراہم ودنانیر یا مکیلی وموزونی یا عددی ہو تو وہ قرض کے حکم میں ہے۔ ہدایہ میں ہے: **وعارية الدراهم والدنانير والمكيل والموزون والمعدود قرض** ۔ (۳/ ۲۶۵) اور اوپر گزر گیا کہ عرف وعادت کی رو سے یہ احتمال صحیح نہیں۔ (جدید فقہی مباحث: ۷/ ۶۳۳)۔

(۴) چوتھا احتمال: قاضی مجاہد الاسلام (فتاوی قاضی، ص ۸۵۔ ۸۷) ومفتیانِ دار العلوم حقانیہ (فتاوی حقانیہ: ۳/ ۵۰۷) ومفتی احمد خانپوری (محمود الفتاوی: ۲/ ۲۶) مفتی نسیم احمد القاسمی (جدید فقہی مباحث: ۶/ ۱۷۶)، مولانا جنید عالم ندوی قاسمی (جدید فقہی مباحث: ۶/ ۲۲۲)، مولانا حبیب اللہ قاسمی (جدید فقہی مباحث: ۶/ ۳۹۰)، مولانا انور علی اعظمی (جدید فقہی مباحث: ۶/ ۴۳۲)، مولانا شعیب مفتاحی (جدید فقہی مباحث: ۷/ ۶۳۳)، مولانا اختر امام عادل (جدید فقہی مباحث: ۷/

۸۲۰)، سب نے اس کو رہن کی طرح مانا ہے، درجِ ذیل چند وجوہات کی بنا پر:

(۱) رہن کا مقصد دین کو محفوظ کرنا ہے یعنی اگر کسی وجہ سے مدیون دین ادا نہ کرے تو رہن سے وہ اپنا حق وصول کرسکتا ہے، اور یہ چیز ڈپوزٹ میں بھی موجود ہے۔ (۲) رہن قرض کے ادا کرنے کے بعد واپس کیا جاتا ہے اسی طرح ڈپازٹ کی رقم بھی مدتِ اجارہ کے اختتام پر واپس کی جاتی ہے۔ (۳) ڈپوزٹ شئی مرہون کی طرح مضمون ہوتی ہے۔ جب ڈپوزٹ کی رقم کا رہن ہونا ثابت ہوگیا تو حکم خود بخود واضح ہوگیا کہ ڈپازٹ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں، نہ کرایہ دار پر اور نہ مالکِ مکان پر۔ اس لیے کہ وجوبِ زکوٰۃ کے لیے ملکِ تام کا ہونا ضروری ہے یعنی مال مملوک اور مقبوض ہو اس پر ملکِ تام حاصل نہیں۔ بایں طور کہ مالکِ مکان کے قبضہ میں تو ہے لیکن وہ اس کا مالک نہیں اور کرایہ دار مالک تو ہے لیکن اس کے قبضہ میں نہیں۔

فتاویٰ شامی میں ہے: **أن المراد بالملک التام المملوک رقبة ویداً . قال فی الدر: فلا زکاة علی مکاتب لعدم الملک التام ، و لا في کسب مأذون ، ولا في مرهون بعد قبضه .** (الدر المختار: ۲/۲۶۳) ، اور بحر میں ہے: **ومن موانع الوجوب الرهن إذا کان في ید المرتهن لعدم ملک الید.** (البحر الرائق: ۲/۲۰۳). مستفاد از جدید فقہی مباحث: (۷/۱۳۳)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب (جدید فقہی مسائل: ۱/۲۱۷، ۲/۴۶-۴۹) رہن کے احتمال کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس رقم کو مالِ مرہون قرار دینا تو مشکل ہی ہے اس لیے کہ مالِ مرہون امانات کے قبیل سے ہے اور امانات میں تصرف جائز نہیں اور پیشگی رقم میں مالکان تصرف کرتے ہیں لہٰذا اس کی حیثیت طویل الاجل دین کی ہے۔ (جدید فقہی مسائل: ۲/۴۸)۔

نوٹ: رہن میں مرتہن راہن کی اجازت سے تصرف کرسکتا ہے جب کہ عقدِ رہن میں تصرف کی شرط نہ ہو اور اس کا عرف بھی نہ ہو بلکہ محض وثیقہ کے لیے رکھا جائے اور انتفاع کی اجازت ہو۔ نیز مرتہن کا تصرف اس لیے ممنوع ہے کہ کل قرض جر نفعاً بن جائیگا اور یہاں یہ تب بنے گا کہ جب ڈپوزٹ کی وجہ سے کرایہ کو کم رکھا گیا ہو۔ شامی میں ہے: **في جواهر الفتاویٰ : إذا کان مشروطاً صار قرضاً فیه منفعة وهو ربا وإلا فلا بأس به... قال ط: قلت : والغالب من أحوال الناس أنهم إنما یریدون عند الدفع**

الانتفاع ، ولولاه لما أعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط ، لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع ، والله تعالیٰ أعلم . (ردالمحتار:۶/۴۸۲،سعید).

علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں : و صورة الإذن الغير المشروط ان لا يشترط المرتهن ذلک في نفس العقد ولا يدفع الدين بهذا الشرط ولا ينوى أيضاً بدفع الدين إباحته وأنه لولاه لما دفع بل قصد مجرد الحبس والتوثق وهذا ليس فيه ربا ولا شبهة الربا...لكن مع ذلک الانتفاع خلاف الأولیٰ والاحتراز عنه أولیٰ فالاحتراز في هذه الصورة تقوى والانتفاع فتوى. (الفلك المشحون ، المندرجة فی مجموعة رسائل اللكنوی:۳/۴۱۳)۔ مزید ملاحظہ کیجیے: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۶/۵۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام احتمالات میں سے ہم قرض والے احتمال کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی نظیر جدید فقہی مسائل میں یہ بیان کی ہے کہ جس طرح مکانِ موقوف کی ضروری تعمیرات کا خرچہ کرایہ دار سے بطورِ قرض قاضی کے حکم سے لیا جاسکتا ہے، اسی طرح مالکِ مکان بھی کرایہ دار سے یہ ڈپوزٹ بطورِ قرض مکان کی تعمیر کے لیے وصول کرتا ہے۔

قال في الشامية : قوله الدين القوى كقرض قلت: الظاهر أن منه مال المرصد المشهور في ديارنا؛ لأنه إذا أنفق المستاجر لدار الوقف على عمارتها الضرورية بأمر القاضي للضرورة الداعية إليه يكون بمنزلة استقراض المتولي من المستاجر، فإذا قبض ذلک كله أو أربعين درهماً منه ولو باقتطاع ذلک من أجرة الدار تجب زكاته لما مضى من السنين والناس عنه غافلون . (ردالمحتار:۲/۳۰۵).

سابقہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ڈپازٹ کی رقم قرض ہے لیکن رہن کے ساتھ مشابہ ہے جیسے رہن پر مالک کا قبضہ نہ بالفعل ہے نہ بالقوہ ہے یعنی جب چاہے مالک اس کو نہیں لے سکتا، جب تک دین ادا نہ کردے۔اسی طرح ڈپازٹ کی رقم کو مقرض جب چاہے نہیں مانگ سکتا،اس لیے بعض علماء نے اس کو رہن کی طرح مان کر مقرض ومستقرض دونوں سے زکوٰۃ کو ساقط کیا لیکن بہر حال مسئلہ قابل غور ہے اور بظاہر اس کی زکوٰۃ کرایہ دار مقرض پر عائد ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پرائز بانڈ پر وجوبِ زکوۃ کا حکم:

سوال: ہمارے بنگلہ دیش میں پرائز بانڈ (prize bond) کا بہت دستور ہے، بینک سے ۱۰۰ ٹا کا دے کر سوٹا کا کا بونڈ لیتے ہیں، ہر دو مہینے میں ایک مرتبہ بینک قرعہ اندازی کر کے چند افراد کو انعام بھی دیتا ہے، میں نے ان سے پچاس ہزار ٹا کا کا بونڈ لیا، گزشتہ چند سال سے وہ بونڈ میرے پاس موجود ہے اور انعام حاصل کرنے کی امید میں میں نے وہ بونڈ واپس نہیں کیا، اب مجھے پیسے کی ضرورت پڑی اور میں نے اس بونڈ کو واپس کیا اور اپنا پیسہ واپس لے لیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مجھ پر گزشتہ سالوں کی زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور اس بونڈ پر انعام لینے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ آپ کا مال بینک کے پاس بطورِ قرض تھا اور قرض کا حکم یہ ہے کہ وصولی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوۃ بھی ادا کرنا لازم ہے۔ ملاحظہ ہو مراقی الفلاح میں ہے:

و زكاة الدين على أقسام فإنه قوي ووسط وضعيف ؛ فالقوي وهو بدل القرض ومال التجارة ، إذا قبضه وكان على مقر ولو مفلساً... زكاة لما مضى ويتراخى وجوب الأداء إلى أن يقبض أربعين درهماً ففيها درهم لأن ما دون الخمس من النصاب عفو لا زكاة فيه وكذا فيما زاد بحسابه ... (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، ص ۷۱۵، قديمي) . وكذا في بدائع الصنائع: ۲/ ۱۰، سعيد).

پرائز بانڈ پر انعام حاصل کرنے سے متعلق تفصیلی بحث ملاحظہ کیجئے: (فتاویٰ دار العلوم زکریا جلدِ پنجم، ص ۴۷۴۔ ۴۷۶، ط: زمزم پبلشرز)۔

یہاں اتنا سمجھ لیں کہ سوٹا کا کے عوض ہزاروں ٹا کا وصول کرنا جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

غیر عالم کی کتابوں پر وجوبِ زکوۃ کا حکم:

سوال: میں عالم نہیں ہوں، لیکن کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے، گھر میں اردو، انگریزی میں کافی

ساری کتابیں جمع کر رکھی ہیں، ایک دن ایک مولانا صاحب کو گھر بلایا اور کتب خانہ دکھایا، تو انہوں نے کتب خانہ دیکھ کر کہا کہ ان کتابوں کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کتابوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ کتابوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ کتابیں بحکم عروض ہیں اور عروض میں وجوبِ زکوٰۃ کے لیے تجارت کی نیت ضروری ہے اور وہ یہاں ندارد ہے۔ نیز اس میں عالم اور غیر عالم کا کوئی فرق نہیں ہے اور جن کتبِ فقہ میں اہل علم کی قید مذکور ہے وہ قید غیر معتبر ہے، ہاں زکوٰۃ لینے کے بارے میں معتبر ہوگی کہ عالم ضروری کتابوں کی وجہ سے صاحبِ نصاب نہیں سمجھا جائیگا اور غیر عالم صاحبِ نصاب سمجھا جائیگا اور زکوٰۃ لینا ناجائز ہوگا۔ قدوری کی شرح اللباب میں ہے، ملاحظہ فرمائیں:

وعلى هذا كتب العلم لأهلها وآلات المحترفين؛ لما قلنا، هداية، أقول: وكذا لغير أهلها إذا لم ينو بها التجارة ؛ لأنها غير نامية ، غير أن الأهل له أخذ الزكاة وإن ساوت نصاباً وغيره لا، كما في الدر. (اللباب: ۱/۶۸).

قال في فتح القدير: قوله وعلى هذا كتب العلم لأهلها، ليس بقيد معتبر المفهوم فإنها لو كانت لمن ليس من أهلها وهي تساوي نصباً لا تجب فيها الزكاة إلا أن يكون أعدها للتجارة وإنما يفترق الحال بين الأهل وغيرهم أن الأهل إذا كانوا محتاجين لما عندهم من الكتب للتدريس والحفظ والتصحيح لايخرجون بها عن الفقر وإن ساوت نصباً فلهم أن يأخذوا الزكاة إلا أن يفضل عن حاجتهم نسخ تساوي نصاباً كان يكون من كل تصنيف نسختان وقيل بل ثلاث فإن النسختين يحتاج إليهما لتصحيح كل من الأخرى والمختار الأول بخلاف غير الأهل فإنهم يحرمون بها أخذ الزكاة إذا الحرمان تعلق بملك قدر نصاب غير محتاج إليه وإن لم يكن نامياً وإنما النماء يوجب عليه الزكاة . (فتح القدير: ۲/۱۶۳، دار الفكر). **وللمزيد ينظر:** (العناية شرح الهداية بهامش فتح القدير: ۲/۱۲۰، ودرر الحكام: ۱/۱۷۲).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

کتابوں میں زکوٰۃ فرض ہونے کے لیے ان کا اہل ہونے کی قید غیر معتبر ہے اس لیے کہ اگر چہ وہ شخص اہل

علم میں سے نہ ہو اور کتابیں تجارت کے لیے نہ ہوں تب بھی ان میں زکوٰۃ واجب نہیں خواہ وہ بہت زیادہ یعنی بقدر نصاب یا اس سے بھی زیادہ ہوں اس لیے کہ ان میں بڑھنے کی شرط نہیں پائی جاتی۔(عمدۃ الفقہ:۳/۲۵)۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ زکوٰۃ کی رقم بھیجنے کا حکم:

سوال: فقہاء نے لکھا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ زکوٰۃ کا مال بھیجنا مکروہِ تنزیہی ہے تو اس جزئیہ کی روشنی میں بیرونِ ملک کے سفراء مدارس کے لیے چندہ کرتے ہیں اور اموالِ زکوٰۃ بھی وصول کرتے ہیں تو ان کے حق میں کراہت ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ فقہاء کا یہ جزئیہ اتنا عام نہیں ہے بلکہ مستثنیات موجود ہیں کہ دوسری جگہ رشتہ دار ہو، یا وہاں لوگ زیادہ حاجتمند ہوں، یا پرہیزگار اور دیندار علماء، صلحاء اور طلبہ وغیرہ کے لیے بھیجی جائے تو بلا کراہت درست ہے بلکہ یہ افضل ہے۔فقہاء کی عبارات ملاحظہ ہوں:

قال في البحر الرائق: وعدم الكراهة في نقلها للقريب للجمع بين أجرى الصدقة والصلة وللأحوج لأن المقصود منها سد خلة المحتاج فمن كان أحوج كان أولى وليس عدم الكراهة منحصراً في هاتين لأنه لو نقلها إلى فقير في بلد آخر أورع وأصلح كما فعل معاذ رضي اللّٰه تعالىٰ عنه لا يكره ولهذا قيل: التصدق على العالم الفقير أفضل ،كذا في المعراج . (البحر الرائق:۲/۲۶۹،ط:دار المعرفة).

وقال في الدر: وكره نقلها إلا إلى قرابة...أو أحوج أو أصلح أو أورع أو أنفع للمسلمين أو من دار الحرب إلى دار الإسلام أو إلى طالب علم ...(الدر المختار:۲/۳۵۴،سعيد).

(وكذا في تبيين الحقائق: ۱/۳۰۵،ط: امداديه،وفتاوى الشامي: ۲/۳۵۴،سعيد،والفتاوى الهندية:۱/۱۹۰، ومجمع الانهر:۱/۲۲۶، باب في بيان احكام المصرف).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

ایک شہر سے دوسرے شہر کو زکوٰۃ بھیجنا یا منتقل کرانا اگر ہر صورت میں مکروہ ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مختلف بستیوں میں جاتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس کا انتظام فرمایا تھا کہ دوسرے شہروں میں سے زکوٰۃ منگوائی جاتی تھی، اگر اپنے عزیز رشتہ دار دوسرے شہر میں ہوں تو وہاں بھیجنا بھی مکروہ نہیں، اسی طرح زیادہ دیندار دوسری جگہ ہوں تو بھیجنا مکروہ نہیں، کتبِ فقہ: البحر الرائق، شامی، عالمگیری، ،مجمع الانہر، میں یہ مسائل مذکور ہیں، تو اگر دور دراز سے لوگ دینی مدارس میں زکوٰۃ بھیجیں جن کے رشتہ دار پڑھتے ہیں اور جہاں زیادہ حاجت مند ہیں اور جہاں زیادہ اہل دین ہیں تو کوئی کراہت نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹/۵۸۴، جامعہ فاروقیہ)۔ مزید دیکھئے: (اسلامی فقہ: ۱/۴۷۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

چاندی کی انگلیوں پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک آدمی کی تین انگلیاں کٹ گئیں، اس نے چاندی کی انگلیاں لگائیں، دوسرے مال سے ملا کر حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی یا نہیں؟ اور ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ جاہلیت کی جنگِ کلاب میں حضرت عرفہ بن اسعد رضی اللہ عنہ کی ناک کٹ گئی تھی تو انہوں نے چاندی کی لگائی لیکن وہ بدبودار ہوگئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی ناک لگانے کے لیے فرمایا۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ملاحظہ ہو:

عن عرفجة بن أسعد رضي الله عنه قال: أصيب أنفي يوم الكلاب في الجاهلية فاتخذت أنفاً من ورق فانتن علي فأمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أتخذ أنفاً من ذهب . قال أبوعيسىٰ: هذا حديث حسن غريب. (رواه الترمذي، رقم: ۱۷۷۰).

مذکورہ بالا حدیث شریف سے چاندی کی انگلیاں لگانے کا جواز مستفاد ہوتا ہے۔

وجوبِ زکوٰۃ کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر انگلیاں ہاتھ کے ساتھ اس طرح چسپیدہ ہیں کہ بآسانی نکال نہیں سکتے یعنی انسانی جسم کا ایک حصہ بن چکی ہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب اور لازم نہیں ہے اور اگر بآسانی الگ ہوسکتی ہیں تو حولانِ حول کے بعد دیگر اموال کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ میں ہے:

سونے کی ناک بنوا کر چہرے پر لگاتے ہیں اور یہ ناک بلا حرج جدا بھی ہو سکتی ہے تو اس ناک میں زکوٰۃ واجب ہے، لیکن دانت میں جو سونا لگایا یا بھرا ہوا ہے وہ اس طرح جدا نہیں ہو سکتا لہذا اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔
(امداد الفتاویٰ: ۲/ ۸۷، سونے کی بنائی ہوئی ناک یا دانتوں پر زکوٰۃ)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

بعض حالات میں بعض خاص مصلحت کے پیش نظر سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے ناک، دانت، کھوکھلے دانتوں کا سونے چاندی سے بھرنا، سونے کے تاروں سے دانت کو باندھنا وغیرہ ان کا حکم یہ ہے کہ اگر ان کو بآسانی نکالا جا سکتا ہے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیورات میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے،... لیکن اگر ان کو آسانی سے نکالا نہیں جا سکتا بلکہ وہ مستقل طور پر لگا دئے گئے ہیں اور انسان کے جسم کا ایک ایسا عضو بن جائے جس کو الگ کیا جانا ممکن نہ ہو تو اب وہ انسان کی بنیادی ضروریات میں داخل ہو گیا اور ایسی چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ (ملخص از جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۰۸، سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء پر زکوٰۃ، نعیمیہ)۔ نیز ملاحظہ فرمائیں: ایضاح المسائل: ۱۰۸، نعیمیہ۔ واللہ ﷻ اعلم۔

صدقۃ الفطر میں تاخیر کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے مجھے صدقۃ الفطر ادا کرنے کے لیے ایک چیک دیا میں بھول گیا، ابھی چند دن پہلے یاد آیا تو میں نے ادا کر دیا، کیا اس آدمی کی طرف سے صدقۃ الفطر ادا ہو گیا یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کی تحریرات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ صدقۃ الفطر کو تاخیر سے ادا کرنے سے متعلق تین اقوال ہیں؛ (۱) متون اور ظاہر الروایہ کا قول یہ ہے کہ زندگی میں کسی بھی وقت ادا کرنے سے صدقۃ الفطر ادا ہو جائیگا اور یہ ادا ہی شمار ہوگا کیونکہ اس کا وجوب زکوٰۃ کی طرح ہے، ہاں مستحب یہ ہے کہ عید الفطر کے دن عید گاہ جانے قبل ادا کر دیا جائے۔ صاحبِ بدائع، علامہ شامی وغیرہ حضرات نے اسی کو ترجیح دی ہے بنابریں اسی قول پر فتویٰ ہے۔

(۲) امام حسن بن زیادؒ کے نزدیک عیدالفطر کا دن گزر جانے سے ساقط ہوجاتا ہے جیسا کہ قربانی، ایامِ اضحیہ گزر جانے سے ساقط ہوجاتی ہے، یعنی اراقہ دم ساقط ہوجاتا ہے، محقق ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ یہ قول درست نہیں ہے۔

(۳) محقق ابن ہمامؒ نے فرمایا کہ صدقۃ الفطر کی ادائیگی مطلق عن الوقت نہیں ہے بلکہ وقت کے ساتھ مقید ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے: ''**اغنوهم في هذا اليوم عن المسألة**''

لہذا عیدالفطر کے دن کے بعد دے تو یہ قضا ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ نے بھی ابن ہمامؒ کی موافقت کی ہے۔ علامہ شامیؒ نے فرمایا کہ یہ تیسرا قول خارج عن المذہب ہے۔

قال في الهداية : وإن أخروها عن يوم الفطر لم تسقط ، وكان عليهم إخراجها، لأن وجه القربة فيها معقول، فلا يتقدر وقت الأداء فيها ، بخلاف الأضحية .

قال في فتح القدير: قوله لأن وجه...الخ، وبه يبطل قول حسن بن زيادؒ إنها تسقط كالأضحية بمضي يوم النحر ، والفرق ظاهر من كلام المصنف . (الهداية مع فتح القدير: ۲/ ۲۹۹، دار الفكر)۔

قال في الدرالمختار: تجب...موسعاً في العمر عند أصحابنا ، وهو الصحيح ، بحر عن البدائع معللاً بأن الأمر بأدائها مطلق كالزكاة على قول ،كما مر ، ولو مات فأداها وارثه جاز، وقيل مضيقاً في يوم الفطر عيناً ، فبعده يكون قضاء ، واختاره الكمال في تحريره ، ورجحه في تنوير الأبصار ، وفي الشامية : قوله هو الصحيح هو ما عليه المتون بقولهم ، وصح لو قدم أو أخر . (الدرالمختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۹، سعيد)۔

وللاستزادة انظر: (بدائع الصنائع: ۲/ ۷٤، سعيد، والبحرالرائق: ۲/ ۲٥٥، وعمدة الفقه: ۳/ ۱٦۷)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

ابواب الصوم سے متعلق متفرق مسائل:

رؤیتِ ہلال سے متعلق کینیڈا کے بعض مسائل:

سوال: خدمتِ اقدس میں عرض ہے کہ کینیڈا میں دنیا کے اطراف واکناف سے مسلمانوں کی کافی تعداد آکر آباد ہوگئی ہے۔ بودوباش بھی مخلوط ہے، مساجد میں مختلف ممالک کے لوگ جمع ہوتے ہیں، مگر رمضان اور عیدین کی تواریخ میں اختلاف ہے۔ جس کی وجہ سے ایک گھر میں دو دن الگ الگ عید منائی جاتی ہے، اس مسئلہ کو ختم کرنے کے لیے کچھ علماء کرام، کچھ مساجد اور کچھ اسلامی سنٹر نے ایک جماعت قائم کی ہے اور کمیٹی نے تمام دنیا کا ایک ہی مطلع مان کر کچھ اصول وضوابط تشکیل دیئے ہیں، جن میں امت کی سہولت کا راستہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اصول وضوابط حسبِ ذیل تحریر کئے جارہے ہیں؛

(۱) رؤیتِ ہلال کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ ۲۹ تاریخ کو چاند دیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

(۲) ثبوتِ رؤیتِ ہلال کے فیصلہ کی بنیاد عینی شہادت ہوگی۔

(۳) چاند دیکھنے کی شہادت ان لوگوں سے لی جائے گی جنہوں نے بذاتِ خود چاند دیکھا ہو، مطلع صاف ہونے کی صورت میں کم سے کم دس آدمیوں کا چاند دیکھنا ثبوتِ رؤیتِ ہلال کے لیے کافی مانا جائیگا۔ مطلع ابرآلود ہونے کی صورت میں دو عادل حضرات کی شہادت پر فیصلہ کیا جائیگا۔

(۴) ثبوتِ رؤیتِ ہلال کی تفصیلی رپورٹ دنیا کے کسی ملک سے بھی معتبر ومعتمد ذرائع سے حاصل کی جائے وہ قابل قبول ہوگی۔

(۵) جن ملکوں کے مراکز، دینی اداروں اور ہلال کمیٹی سے ہمارا معاہدہ اور باہمی رابطہ ہوگا ان کا اعلان بھی ہمارے لیے قابلِ قبول ہوگا۔

(۶) ماہرینِ فلکیات نے اپنی معلومات اور حساب کے لحاظ سے جن علاقوں میں ہلال کا نظر آنا ناممکن بتایا ہو اس علاقہ میں اگر کوئی چاند دیکھنے کا دعویٰ کرے اور شہادت دے تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔

(۷) فلکیاتی حساب کے مطابق چاند نظر آنے کے قوی امکان کی صورت میں انتظامات کے لیے عوام کو

پہلے سے باخبر کرنے کے لیے اس کو استعمال کیا جائیگا اور اعلان عینی شہادت پر موقوف ہوگا۔

(۸) یہ رہنما اصول سال کے بارہ مہینوں کے لیے یکساں رہیں گے۔

دنیا کا ایک ہی مطلع "Global Moon Sighting" اور مندرجہ بالا اصول وضوابط کے متعلق آنجناب کی گراں قدر رائے سے مطلع فرمائیں۔ آنجناب سے تصویب یا ترمیم کا مشورہ مطلوب ہے۔

نیز اس بارے میں بھی ارشاد فرمائیں کہ جو ممالک کینیڈا سے ۶۔۵ گھنٹے آگے ہیں مثلاً ساؤتھ افریقہ وغیرہ وہاں اگر ان کے غروبِ آفتاب کے بعد چاند کی رؤیت ثابت ہوسکی اور وہاں کے علماء کرام نے فیصلہ کرلیا اور ہمیں اطلاع دی تو کیا ہم اپنے غروبِ آفتاب سے پہلے اس کا اعلان کرسکتے ہیں؟

حضرت والا سے امید ہے کہ جلد جواب سے نوازیں گے۔ والسلام۔

الجواب: ہم نے فتاویٰ دار العلوم زکریا میں لکھا ہے کہ بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کا اعتبار ہے، یہ متاخرین کا قول ہے اور اس کے دلائل بھی وہاں نقل کیے گئے ہیں، لیکن دوسرا قول ظاہر الروایہ ہے، اس کو بھی ملکی اتحاد کی خاطر اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ بہتر اور اچھا ہے، جنوبی افریقہ میں یہاں کے علماء نے بے شمار مصالح کے پیش نظر پہلے قول کو اختیار کیا ہے، اور آپ حضرات بہت سارے مصالح کی خاطر ظاہر الروایہ کو اختیار کرسکتے ہیں، اور یہ تلفیق نہیں ہے بلکہ دونوں اقوال مذہب میں موجود ہیں۔

بلادِ قریبہ اور بعیدہ میں ظاہر الروایہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسرے ملک کی معتبر رؤیت کینیڈا والوں کے لیے حجت ہے، اس پر آپ جیسے اہل علم کے سامنے دلائل لکھنے کی ضرورت نہیں ہیں، کیونکہ یہ دلائل آپ کے سامنے واضح ہیں، تاہم دو تین دلائل لکھ لیتے ہیں:

وعن شمس الأئمة الحلواني: أنه لا عبرة لاختلاف المطالع، وهو الظاهر. (شرح تحفة الملوك لمحمد بن عبداللطيف المعروف بابن الملك: ۲/۲۶۴ ۱)۔

اس کی تعلیقات میں ہے: **وهو المذهب، وعليه الفتوىٰ كما في أكثر المعتبرات، كذا في مجمع الأنهر.** (۱/۲۹۱)۔

حاشية الطحطاوي على الدر میں ہے: **فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب إذا ثبت**

عندهم رؤية أولئک بطريق موجب کما مر، کذا في الدر، وأطلق المصنف ؒ فيشمل ما إذا کان بينهما تفاوت بحيث يختلف المطالع أو لا. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار:۱/۴۴۹)۔

اس نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے دوسرے ممالک کی صحیح مستند اطلاع پر رمضان اور عید کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔اب نمبروار مختصر جوابات لکھے جاتے ہیں:۔

(۱) ۲۹ تاریخ کو چاند دیکھنے کا اہتمام ضرور ہونا چاہئے۔

(۲) احادیث اور فقہ کی روشنی میں یہ مسئلہ بھی درست ہے کہ ماہِ رمضان اور عید کا فیصلہ عینی شہادت پر ہونا چاہئے۔

(۳) مطلع صاف ہونے کی صورت میں خبر مستفیض ہونا ضروری ہے۔اگر ہلال کمیٹی کے ارکان کو دس آدمیوں کی شہادت پر اطمینان ہوجائے اور شہادت خلافِ ظاہر نہ ہو تو ان کی شہادت کو قبول کر کے اعلان کرنا درست ہوگا۔امام ابو یوسف ؒ نے ۵۰ آدمی فرمایا، خلف بن ایوب نے فرمایا: بلخ میں ۵۰۰ آدمی بھی کم ہیں، لیکن اس میں قاضی کی رائے کا اعتبار ہے۔

قدر ذلک أبويوسف ؒ بخمسين رجلاً، وقال خلف بن أيوب ؒ: خمس مئة ببلخ قليل والأولى أن يفوض إلى راي القاضي. (الفتاوى السراجية، ص۱۶۸)۔

(۴) اختلافِ مطالع معتبر نہ ہونے پر فتویٰ دے کر دوسرے ممالک کی خبر مستفیض لے سکتے ہیں بشرطیکہ اس ملک کا فیصلہ خلافِ ظاہر نہ ہو۔کیونکہ بعض ممالک میں رؤیت کا اعلان ہونے کے بعد دوسرے دن بھی چاند نظر نہیں آتا۔اور کبھی چھ سات گھنٹے کے چاند کی رؤیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

(۵) جن ممالک کے ساتھ آپ کا معاہدہ ہے ان ممالک کی رؤیت بھی قبول کر سکتے ہیں، بشرطیکہ خلافِ ظاہر نہ ہو اور امکانِ رؤیت کے حدود کے اندر ہو۔

(۶) جہاں ہلال دیکھنا ممکن ہو وہاں کی خبر رؤیت کو قبول نہیں کرنا چاہئے، الا یہ کہ مطلع صاف ہو اور بہت سارے لوگوں نے واقعی رؤیت کرلی ہو۔

شرح منظومہ ابن وہبان میں ابن الشحنہ الحلبی فرماتے ہیں: **ولمحقق متأخري الشافعية الشيخ**

الإمام تقي الدين السبكيؒ في هذه المسئلة تصنيف ، مال فيه إلى اعتماد قولهم (الموقتين)لأن الحساب قطعي. (شرح منظومة ابن وهبان لابن الشحنة الحلبي ،ص۹۲)۔ یعنی شیخ تقی الدین سبکیؒ (۶۸۳۔۷۵۶ھ) حساب کے قطعی ہونے کے قائل ہیں۔اکثر فقہاء منجمین کے اقوال کو تسلیم نہیں کرتے ،لیکن آجکل ان کا قول نفی میں ماننا چاہئے جب وہ کہیں کہ رؤیت ممکن نہیں تو رؤیت نہیں ہوتی۔

(۷) یہ شق بھی بالکل درست ہے،جس دن رؤیت کا زیادہ امکان ہو اس دن رؤیت کا زیادہ اہتمام کرنا چاہئے۔

(۸) سال کے بارہ مہینوں کی رؤیت کا اہتمام کرنا چاہئے تاکہ شعبان ،رمضان اور عیدین کی رؤیت کے اہتمام کی عادت بن جائے ،نیز جو ممالک کینیڈا سے ۶۔۵ گھنٹے مقدم ہیں ان کے غروبِ آفتاب اور چاند کی رؤیت ہو جانے کے بعد آپ آئندہ کل کے لیے رمضان یا عید کا اعلان کر سکتے ہیں۔لیکن اگر عید الفطر کا اعلان عصر کے وقت کیا جائے تو اس دن کا روزہ پورا کیا جائیگا۔

إذا رأوا هلال الفطر فى النهار أتموا صوم ذلك اليوم . (الفتاوى السراجية،ص۱۶۹)۔

یہ فتویٰ ارسال کرنے کے بعد شکاگو ہلال کمیٹی کی طرف سے کچھ اشکالات سامنے آئے جس پر درجِ ذیل چند تجاویز تحریر کی گئیں۔مزید فائدہ کی خاطر ملاحظہ کیجئے:

(۱) اگر ہمارے فتوے سے علماء دیو بند اور عوام میں مزید اختلاف پڑتا ہو تو ہم کینیڈا والے علماء کو یہی مشورہ دیں گے کہ اپنے سابقہ طریقہ کار کو جاری رکھیں اور نئے تجربات میں پڑ کر اختلاف کی خلیج کو مزید وسعت نہ دیں۔

(۲) اگر ہلال کمیٹی کے حدود اتنے وسیع ہیں کہ وہ پورے معتدل شمالی حصے کو شامل ہوں تو شمالی امریکہ کے خطے کی رؤیت کو معیار مان لینا چاہئے۔

(۳) اگر کینیڈا والے حضرات نے ایک سال سعودیہ کا اس وجہ سے اعتبار کر لیا کہ اس سال رؤیت کا امکان تھا اور دوسرے سال امکان نہ ہونے کی وجہ سے سعودیہ کی بات کو رد کر دیا تو عوام میں علماء کا وقار گر جائیگا، کیونکہ عوام ان تدقیقات کو نہیں جانتے کہ رؤیت کے امکان ہونے یا نہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اور کسی اور ملک کو معیار بنائیں تو اس کی اتنی اہمیت نہیں ہوگی کہ خواص وعوام اس پر متفق ہو سکیں اور اگر کسی بھی ملک کی خبر کو مان

لیں تو پھر ہر ملک کے متعلق تحقیق مشکل ہوگی کہ وہاں رؤیت کا کیا طریقہ کار ہے اور کیا انتظام ہے؟

(۴) کینیڈا کی کمیٹی کو چاہئے کہ ملک کے اطراف کے ائمہ اور علماء کی اکثریت کی رائے معلوم کریں، اگر وہ اپنے سابقہ طریقہ کار کو مفید سمجھتے ہوں تو اسی پر کاربند رہیں۔ فقط والسلام۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہلال کمیٹی کا سربراہ بریلوی ہو تو اس کے فیصلہ کا حکم:

سوال: اگر ہلال کمیٹی کا سربراہ کوئی بریلوی عالم ہو تو اس کا فیصلہ قبول کیا جائیگا یا نہیں؟

الجواب: تقویٰ دار بریلوی فسق عملی میں مبتلا نہیں بلکہ اکثر ان کے عقائد میں انحراف پایا جاتا ہے، اور اس کا سبب دین میں تعمق اور غلو ہے، اسی وجہ سے ان کو جھوٹ کے ساتھ متہم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ اپنے آپ کو دین کے سچے وارث اور دوسروں سے زیادہ پرہیزگار سمجھتے ہیں، جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دینے سے احتراز کرتے ہیں، لہذا فقہاء کرام کی تصریح کے مطابق ان کی شہادت اور فیصلہ درست اور قابل قبول ہے۔

البتہ ایسا بریلوی جس کے عقائد حد کفر تک پہنچ چکے ہوں تو پھر اس کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

علامہ سید احمد طحطاوی رقمطراز ہیں:

قوله تقبل من أهل الأهواء ، قال في المغرب أهل الأهواء : من زاغ عن طريقة أهل السنة والجماعة وكان من أهل القبلة ، وإنما قبلت لأن فسقهم من حيث الاعتقاد وما أوقعه فيه إلا تدينه ...وأهل الأهواء ليسوا بطائفة بعينها بل يطلق على كل من خالف السنة بتأويل فاسد. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۳/ ۲۴۰، كوئٹه)۔

قال في الشامية: لأن فسقهم من حيث الاعتقاد وما أوقعهم فيه إلا التعمق والغلو في الدين والفاسق إنما ترد شهادته لتهمة الكذب . (فتاوى الشامي: ۵/۴۷۲،سعيد)۔

قال في رد المحتار: قوله لا تكفر، فمن وجب إكفاره منهم فالأكثر على عدم قبوله كما في التقرير وفي المحيط البرهاني وهو الصحيح وما ذكره في الأصل محمول عليه ، بحر. (فتاوى الشامي: ۵/۴۷۲،سعيد)۔

اورقضاء مثل شہادت کے ہے، جب شہادت قبول ہوگی تو فیصلہ بھی قبول ہوگا۔

قال في الدر: وشرط أهليتها شرط أهليته، فإن كلاً منهما من باب الولاية والشهادة أقوى لأنها ملزمة على القاضي والقضاء ملزم على الخصم فلذا قيل حكم القضاء يستقى من حكم الشهادة، ابن كمال، والفاسق أهلها فيكون أهله. وقال في رد المحتار: وأفصح بهذه الجملة دفعاً لتوهم من قال: إن الفاسق ليس بأهل للقضاء فلا يصح قضائه لأنه لايومن عليه لفسقه وهو قول الثلاثة واختاره الطحاوي، قال العيني: وينبغي أن يفتى به خصوصاً في هذا الزمان، أقول: لو اعتبر هذا لانسد باب القضاء خصوصاً في زماننا فلذا كان ما جرى عليه المصنف هو الأصح كما في الخلاصة وهو أصح الأقاويل كما في العمادية، نهر، وفي الفتح: والوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذوشوكة وإن كان جاهلاً فاسقاً وهو ظاهر المذهب عندنا وحينئذٍ فيحكم بفتوى غيره. (فتاوی الشامی: ۵/۳۵۵،سعید)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابتداءمیں مسلمانوں پرلازم ہے کہ غیرفاسق اورغیراہل بدعت کومنصبِ قضاء کے لیے منتخب کریں، لیکن اگرحکومتِ اسلامیہ اہل بدعت کوقاضی مقررکردےتووہ قاضی بن جائیگااوراس کا جوبھی فیصلہ قرآن وسنت اوراجماع کے خلاف نہ ہو،وہ نافذ ہوگااورمسلمانوں پراس کاماننا ضروری ہوگا۔علاوہ ازیں ہلال کمیٹی کے فیصلے کامدارایک شخص پرنہیں ہوتا بلکہ اکثریت پرہوتاہے کمیٹی کا سربراہ صرف اعلان کا کام انجام دیتاہے یابعض دوسرے معاملات میں بنیادی رول ادا کرتاہے۔فتاویٰ شامی میں ہے:

وصرح ابن الكمال بأن من قلد فاسقاً يأثم وإذا قبل القاضي شهادته يأثم...وعبارة الدررحتى لو قبلها القاضي وحكم بها كان آثماً لكنه ينفذ، وفي الفتاوى القاعدية: هذا إذا غلب على ظنه صدقه وهومما يحفظ. (فتاوی الشامی: ۵/۳۵۶،سعید)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بے ریش کی گواہی قبول کرنے کا حکم:

سوال: رؤیتِ ہلال کے ثبوت کے لیے بے ریش شخص کی گواہی قابلِ قبول ہوگی جوشرعی ڈاڑھی نہ رکھتا

ہو؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بقدر یک مشت ڈاڑھی رکھنا واجب ہے، پس جو شخص اتنی مقدار ڈاڑھی نہیں رکھتا وہ مرتکبِ کبیرہ اور فاسق ہے، اصلاً اس کی گواہی نا قابلِ قبول ہے، لیکن فقہاء نے فرمایا کہ معاشرہ کے انحطاط اور عمومِ بلویٰ کے سبب اگر شرعی ڈاڑھی والا گواہ موجود نہ ہو اور قاضی کو اس کی دیانت داری اور سچائی پر یقین یا غالب گمان ہو تو قبول کر سکتا ہے، نیز جب آسمان صاف ہو تو قاضی ایک دو آدمیوں کی گواہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ جمِ غفیر کی گواہی پر فیصلہ کرے۔ ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وشرط أهليتها شرط أهليته... الفاسق أهلها فيكون أهله لكنه لايقلد وجوباً ويأثم مقلده كقابل شهادته به يفتي وقيده في القاعدية: بما إذا غلب على ظنه صدقه فليحفظ درر. واستثنى الثاني الفاسق ذا الجاه والمروءة فإنه يجب قبول شهادته بزازية. وفي الشامية: وعبارة الدرر: حتى لوقبلها القاضي، وحكم بها كان آثماً لكنه ينفذ وفي الفتاوى القاعدية: هذا إذا غلب على ظنه صدقه وهومما يحفظ، قلت: والظاهر أنه لا يأثم أيضاً لحصول التبين المأمور به في النص تأمل قال ط: فإن لم يغلب على ظن القاضي صدقه بأن غلب كذبه عنده أو تساويا فلا يقبلها أى لا يصح قبولها أصلاً، هذا ما يعطيه المقام. (فتاوى الشامي: ۳۵٦/۵، سعید)۔

قال في الدرر: وفي الفتاوى القاعدية: هذا إذا غلب على ظنه صدقه وهومما يحفظ. (دررالحكام في شرح غررالاحكام: ۴۰۴/۲، كتاب القضاء)۔

قال في البدائع: إن القاضي لو تحرى الصدق في شهادة الفاسق يجوز له قبول شهادته ولايجوز القبول من غير تحر بالإجماع. (بدائع الصنائع: ۲۷۰/٦، سعید)۔

(وكذا في شرح المجلة للاتاسي: ۲۸۳/۵، المادة: ۱۷۰۵، والبحرالرائق: ۲۱۳/۸، دار المعرفة)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

رؤیتِ ہلال میں حکومت کے خلاف گواہی کا حکم:

سوال: پاکستان کے شمالی صوبے میں کبھی کبھی شعبان یا رمضان کے آخری دنوں میں گواہ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے لوگوں سے ایک دن پہلے چاند دیکھا تھا۔کیا ایسے گواہوں کی گواہی شرعاً قبول ہوگی یا نہیں؟

الجواب: پاکستان کے شمالی صوبے میں بعض علماء اور عوام نے چاند کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اور حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ اپنی کمیٹیوں کو یکسر موقوف کر کے حکومت کی قائم کردہ کمیٹی پر اعتماد کریں۔تاہم سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ گواہ دور سے آئے ہوں تو ایسی شہادت قبول ہے ورنہ نہیں۔

خلاصۃ الفتاوی میں ہے: **وإذا شهد الشهود على هلال رمضان في اليوم التاسع والعشرين أنهم رأوا هلال رمضان قبل صومهم بيوم إن كانوا في هذا المصر ينبغي أن لاتقبل شهادتهم لأنهم تركوا الحسبة وإن جاء وا من مكان بعيد جازت شهادتهم لانتفاء التهمة .**

(خلاصة الفتاوى: ۱/۲۵۰). (وكذا في البحر الرائق: ۲/۲۸۷،دار المعرفة، و فتح القدير: ۲/۳۲۳،ط: دار الفكر، و فتاوى الشامي: ۲/۳۸۵،ط: سعيد).

لیکن اِس زمانہ میں وسائل کی کثرت کی وجہ سے دور سے آنے کا عذر قابلِ قبول نہیں ہونا چاہئے اور قاضی کو ایسی شہادت نہیں لینی چاہئے۔واللہ ﷻ اعلم۔

چاند کے چھپنے کے ایام:

سوال: چاند مہینے میں زیادہ سے زیادہ کتنے دن چھپتا ہے، اور سال میں ۲۹ دن کے مہینے زیادہ ہے یا ۳۰ دن کے، اور ۲۹ دن کے مہینے مسلسل کتنے ممکن ہے اور ۳۰ دن کے مسلسل کتنے ہو سکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ہر ماہ میں چاند دو دن چھپتا ہے اور زیادہ سے زیادہ تین دن، لیکن محققین کی رائے کے مطابق عموماً زیادہ سے زیادہ دو ہی دن چھپتا ہے، اور ایک دن چھپنا تو ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ آلوسی قاضی بغداد و ماہر فلکیات اپنی نامور تفسیر میں فرماتے ہیں:

والمنازل جمع منزل والمراد به المسافة التي يقطعها القمر في يوم وليلة وهي عند أهل الهند سبعة وعشرون...فاحتالوا في ضبطها فنظروا أولاً إلى القمر فوجدوه يعود إلى وضع له من الشمس في قريب من ثلاثين يوماً ويختفي آخر الشهر لليلتين أو أقل أو أكثر فأسقطوا يومين من زمان الشهر فبقي ثمانية وعشرون وهو زمان ما بين أول ظهوره بالعشيات مستهلاً أول الشهر وآخر رؤيته بالغدوات مستتراً آخره . (روح المعاني :۲۳/۱٦،سورة يس)۔

موسوعة الافلاک والاوقات میں استاذ ابو یمن خلیل احمد عبد اللطیف الکیر نوری لکھتے ہیں:

إن القمر يمر أمامها في آخر يوم من أيام الشهر القمري لأنه يكون منحمقاً يومها فلا يرى، فيرى هلالاً بعد ذلک اليوم إذا کان بينه وبين الشمس ۱۲ درجة (أعنی ۲۴ ساعة) کالعرجون ولکن في أکثر الأحوال لا يرى الهلال إلا بعد ۱۵ درجة (اعنی ۳۰ ساعة) فيرى هلالاً لأنه قد ابتعد قليلاً عن نفطة الصعود . (موسوعة الافلاك والاوقات ،ص ٥٤،ط: بيروت ،لبنان)۔

مذکورہ بالاعبارت سے واضح ہوتا ہے کہ فقط دو رات چاند چھپتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔

نیز حضرت مولانا موسیٰ روحانی بازی صاحبؒ نے بھی اسی کی تصریح فرمائی ہے۔ملاحظہ ہو:

مجموعی وقفہ جس میں چاند پوشدہ رہتا ہے ٦۰ گھنٹے نہیں بلکہ ۴۸ گھنٹے یا اس سے کچھ کم ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ چاند مہینہ کی آخری تاریخوں میں مسلسل ۳ صبح غائب ہو، حالانکہ چاند بقولِ محققین عموماً دو دن ہی غائب رہتا ہے۔(فلکیاتِ جدیدہ،ص ۳۵۳،حصہ دوم)۔

البتہ جلالین کے حاشیہ میں بحوالہ کمالین مذکور ہے کہ چاند دو دن چھپتا ہے اور کبھی کبھی تین دن۔ وأقل ما يخفى ولا يرى صباحاً ولا مساء ليلتان وأكثره ثلاث ليالٍ. (۱۷۰/۲،رقم الحاشیہ ۲۳)۔

لیکن سابقہ حوالوں سے معلوم ہوا کہ یہ بات درست نہیں۔

فائدہ: علمائے ہیئت کے نزدیک قمری مہینہ کی ابتدا چاند کے محاق میں ہونے سے شروع ہو جاتی ہے جبکہ وہ نا قابلِ رؤیت ہوتا ہے حالانکہ شریعت نے قمری مہینہ کی ابتدا رؤیت قرار دی ہے اور یہ محاق سے مشرقی جانب

چند درجہ طے کرنے سے ہوتی ہے۔ملاحظہ ہوموسوعۃ الافلاک میں ہے:

وفي آخر يوم من الشهر القمرى يكون قد بلغ نقطة الصعود وأصبح بين الأرض والشمس على استقامة واحدة وقد غمر الظلام كامل وجهه المتجه نحونا ويكون قد غاب تحت الأفق مع مغيب الشمس فلا يرى ويقال لحالته تلك حالة الاقتران فيدعى المحاق ، وهذا هو وقت القران والعلماء يحسبون ابتداء الشهر القمرى من هذا الوقت ولكن الشرع قد بين أن الشهر القمرى يبتدأ من وقت رؤية الهلال لا غير، والقمر يأخذ لقطع ٣٦٠ درجة ۲۴ ساعة ۴۹ دقيقة فيأخذ ۴۹ دقيقة زائدة من الشمس لأنها تأخذ ۲۴ ساعة فقط فلذا يبدو الهلال فى آخر المواقع الجغرافية فى اليوم الثانى فبان أن المطالع تختلف ، اليوم صار هذا عيناً مدللاً . (موسوعة الافلاك،ص ۵۵)۔

فلکیاتِ جدیدہ میں ہے:

حالتِ اجتماع نئے چاند کی عمر کا مبدأ ہے، پھر۲۴ گھنٹے تک وہ آفتاب سے مشرق کی طرف نکل کر۱۲ویں یا۱۳ویں درجہ میں نظر آنے کے قابل ہوجائیگا۔(فلکیاتِ جدیدہ،ص۳۵۱،حصہ دوم)۔

کامل اور ناقص مہینوں کی تعداد:

سال میں ۲۹ دن کے مہینہ اور ۳۰ دن کے کبھی برابر برابر ہوتے ہیں اور کبھی ۳۰ دن کے سات اور ۲۹ دن کے پانچ ہوتے ہیں، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ کامل مہینے سات سے زیادہ نہیں ہوں گے اور ناقص چھ سے زیادہ نہیں اور یہ بات علمائے ہیئت کے نزدیک مسلم ہے۔چنانچہ علامہ سبکی ماہر فلکیات فرماتے ہیں:

وقوله صلى الله عليه وسلم" الشهر" ليست الألف واللام فيه للعموم حتى يكون قضية كلية ، بل قضية جزئية ، وهي هنا تشبه مايسميه المنطقيون مهملة وهي في قوة جزئية كأنه قال: قد يكون ، وعلم الحساب يقتضى لأجل الكسر الذى ذكرناه في عدد أيام السنة القمرية وتكميله ، تارة تكون الأشهر الكاملة فى السنة ستة والناقصة مثلها ، وتارة تكون الكاملة سبعة والناقصة خمسة ، فلا تكون الناقصة أكثر من ستة ، ولا تكون الكاملة أكثر

من سبعة ، وهذا أمر مقطوع به في علم الهيئة ، وليس في الشرع ما يرده وسيكون لنا عودة إلى ذلك . (العلم المنشور فی اثبات الشهور،ص ٢٤، للامام تقی الدین السبکی)۔

اور ناقص ماہ مسلسل تین ہو سکتے ہیں اور کامل چار ہو سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہو فلکیاتِ جدیدہ میں ہے:

نوٹ: ۲۹،۲۹ کے مہینے مسلسل تین ہی جمع ہو سکتے ہیں۔ بقولِ علامہ برجندی اور پروفیسر پکرنگ وغیرہ تین سے زیادہ مہینے ۲۹ کے جمع نہیں ہو سکتے۔ مگر پروفیسر موسیو فے وغیرہ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی چار بھی ۲۹،۲۹ کے جمع ہو سکتے ہیں۔

نوٹ: ۳۰،۳۰ کے متواتر مہینے زیادہ سے زیادہ چار جمع ہو سکتے ہیں۔ (فلکیاتِ جدیدہ،ص ۳۴۵و۳۴۶،حصہ دوم)۔

پروفیسر محمد الیاس اپنی کتاب ''استرونمی آف اسلامک کیلنڈر'' میں لکھتے ہیں:

۲۹ دن کے مہینے مسلسل ۳ ہو سکتے ہیں۔ اور ۳۰ دن کے مہینے مسلسل چار ہو سکتے ہیں۔ (استرونمی آف اسلامک کیلنڈر،ص ۱۵۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

رمضان میں ڈائلیسس کی وجہ سے روزہ کا حکم:

سوال: اگر مریض آدمی رمضان میں خون کی صفائی کرائے جس کو ڈائلیسس (dialysis) کہتے ہیں، تو اس کی وجہ سے روزہ فاسد ہو جائے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فسادِ صوم کے لیے ضروری ہے کہ مفطرات میں کوئی شئی منفذ اصلی کے ذریعہ جوفِ معدہ یا جوفِ دماغ تک پہنچ جائے لیکن بصورتِ مسئولہ ڈائلیسس میں رگوں کے خون کی صفائی ہوتی ہے یعنی رگوں سے خون مشین میں منتقل ہو کر صاف ہو کر دوبارہ رگوں میں داخل ہو جاتا ہے، بنابریں روزہ فاسد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ڈائلیسس کی حقیقت اور اس کی اقسام ملاحظہ کیجئے:

انسان کا گردہ جب بے کار ہو جاتا ہے تو اس وقت مصنوعی مشین کے ذریعہ خون کی صفائی کا کام انجام دیا

جاتا ہے اس کو ڈائلیسس کہا جاتا ہے۔

ڈائلیسس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ہیموڈائلیسس (Hemodialysis) اس میں مریض کا خون اس کے جسم سے باہر گردش کرتا ہے، پہلے آپریشن کے ذریعہ ایک نلکی جسم کی رگوں میں داخل کی جاتی ہے، اس نلکی کے ذریعہ جسم کا خون باہر مشین میں منتقل ہوتا ہے اور مشین میں جاکر ایک خاص قسم کے فلٹر سے صاف ہوکر دوسری نلکی سے جسم میں دوبارہ داخل ہوجاتا ہے، گویا مشین گردہ کا کام کرتی ہے یعنی خون کے فاسد اور خراب مادوں کو نکال دیتی ہے، اس عمل کو ''ہیموڈائلیسس کہتے ہیں۔ عام طور پر یہی طریقہ رائج ہے۔

(۲) پیریٹونیل ڈائلیسس (Peritoneal Dialysis) جراثیم کی صفائی کے لیے سیال دوائی [جوگلوکوز یا دوسری چیزوں کی شکل میں ہوتی ہے] کو انسان کے جسم میں پیڑو کی جھلی سے نلکی کی مدد سے پیٹ کے اس جوف میں داخل کیا جاتا ہے، جو معدہ اور آنت کے پاس ہوتا ہے، یہ جوف فلٹر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس طور پر کہ سیال دوائیں اس جوف میں کچھ دیر رہ کر خراب مادوں کو جذب کرلیتی ہیں اور پھر دوسری نلکی کے ذریعہ خراب خون کے ساتھ باہر نکال دی جاتی ہیں، اس طریقہ کار کو 'پیریٹونیل ڈائلیسس کہتے ہیں۔

(ماخوذ از انٹرنیٹ ''میڈیکل نیوز ٹوڈے''، ویب سائٹ ''What is Dialysis'' کے نام سے ایک مقالہ ایک ڈاکٹر ''Christian Nordqvist'' کی نگرانی میں ۲۹/ جون ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے)۔

فسادِ صوم کے لیے جوفِ بطن میں کسی چیز کا داخل ہونا شرط ہے۔

جوفِ بطن کی تحقیق ملاحظہ کیجئے:

انسان کے پیٹ میں دو قسم کے جوف ہیں: (۱) معدے اور آنتوں کا جوف اس کو انگریزی میں المنٹری کینال (Alimentary canal) کہتے ہیں۔

(۲) وہ جوف جو سینے کے نیچے ہوتا ہے اور اس میں معدہ، آنتیں قائم رہتی ہیں یعنی معدے وغیرہ کے اطراف والا جوف، اس کو انگریزی میں ابڈامینل کیویٹی (Abdominal cavity) کہتے ہیں۔

اب فسادِ صوم کے لیے کونسے جوف میں داخل ہونا مراد ہے اس کی وضاحت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد فرماتے ہیں:

اس جوف (یعنی جوفِ بطن) سے مراد معدے اور آنتوں کا جوف (Alimentary canal) ہے، اگرچہ بطن کا اطلاق اس جوف پر بھی ہوتا ہے جو سینے سے نیچے ہوتا ہے اور جس میں اعضائے رئیسہ مثلاً: معدہ، آنتیں، مثانہ، رحم، گردے وغیرہ قائم ہوتے ہیں یعنی وہ جوف جس کو (Abdominal cavity) کہتے ہیں، لیکن یہاں وہ مراد نہیں ہے۔اس پر اگرچہ کوئی تصریح نظر سے نہیں گزری لیکن اول یعنی الیمنٹری کینال (Alimentary canal) مراد لینے کی تائید مندرجہ ذیل عبارات سے ہوتی ہے:

(۱) **أما الحقنة والوجور فلأنه وصل إلى الجوف ما فيه صلاح البدن** . (فتاوی قاضي خان علی هامش الهندية: ۱/ ۲۱۰) . (حقنہ کرنے اور منہ میں قطرے ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ جوف میں ایسی چیز پہنچی ہے جو مفیدِ بطن ہے)۔

(۲) **وما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ عن المخارق الأصلية كالأنف والأذن والدبر بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومه** . (بدائع الصنائع: ۲/ ۹۳) . (جوفِ بطن یا جوفِ دماغ میں ناک، کان اور مقعد جیسے قدرتی سوراخوں سے کوئی چیز پہنچ جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے)۔

(۳) **ولو أقطر في إحليله لم يفطر عند أبي حنيفةؒ وقال أبويوسفؒ يفطر...فكأنه وقع عند أبي يوسفؒ أن بينه وبين الجوف منفذاً ولهذا يخرج منه البول ووقع عند أبي حنيفةؒ أن المثانة بينهما حائل والبول يترشح منه** . (الهداية: ۱/ ۲۲۰) . (اگر مرد نے پیشاب کی نالی میں قطرے ٹپکائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا، جبکہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک ٹوٹ جاتا ہے، گویا امام ابویوسفؒ کے نزدیک مثانہ اور جوفِ بطن کے درمیان منفذ ہے اس لیے جوفِ بطن سے پیشاب مثانہ میں اس منفذ کے ذریعہ جاتا ہے، جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جوفِ بطن اور پیشاب کی نالی کے درمیان مثانہ حائل ہوتا ہے اور پیشاب اس سے قطرے بن کر ٹپکتا ہے)۔

اگر جوف سے مراد دوسرا معنی یعنی (Abdominal cavity) مراد ہوتا تو پھر امام ابوحنیفہؒ اور امام

ابو یوسفؒ کے درمیان اختلاف نہ ہوتا، کیونکہ مثانہ تو بلاشک وشبہ اس میں واقع ہی ہے،اور اس میں کسی شئی کا داخلہ جوفِ بطن ہی میں داخلہ شمار ہوتا،لیکن جب اختلاف واقع ہوا ہے تو معلوم ہوا کہ جوفِ بطن سے فقہاء کی مراد معدہ اور آنتوں کا جوف ہے۔(مریض ومعالج کے اسلامی احکام،ص ۱۴۸۔۱۴۹)۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ جوف کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فسادِ صوم کے لیے مفطر کا جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں بذریعہ منفذ اصلی پہنچنا ضروری ہے،مطلقاً کسی عضو کے جوف میں یا عروق (شرائیں واوردہ) کے جوف میں پہنچنا مفسدِ صوم نہیں۔فقہاء کی عبارتیں دو طرح پر تقریباً بلکہ حقیقۃً اس دعوے کی تشریح کرتی ہیں:

اول تو یہ کہ فقہاء نے زخم پر دوا ڈالنے کو مطلقاً مفسد نہیں فرمایا بلکہ جائفہ یا آمہ کی قید لگائی ہے، کیونکہ انھیں دو قسموں کے زخموں سے دوا جوفِ دماغ یا جوفِ بطن کے اندر پہنچتی ہے،ورنہ جوفِ عروق کے اندر تو دوسری قسموں کے زخموں سے بھی پہنچ جاتی ہے۔

دوسرے بہت سی جزئیات فقہیہ مسلمات فقہاء میں سے ایسی ہیں جن میں دوا وغیرہ مطلقاً جوفِ بدن میں تو پہنچ گئی لیکن چونکہ جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں نہیں پہنچی اس لیے اس کو مفطر ومفسد صوم نہیں قرار دیا جیسے مرد کے پیشاب گاہ کے اندر دوا یا تیل وغیرہ چڑھانے سے باتفاقِ ائمہ ثلاثہ روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

اگر دوا مثانہ تک پہنچ جائے تب بھی امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مفسد صوم نہیں امام ابو یوسفؒ جو مثانہ میں پہنچ جانے کو مفسد قرار دیتے ہیں وہ بھی اس بنا پر کہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ مثانہ اور معدہ کے درمیان منفذ ہے جس سے دوا پہنچ جاتی ہے ورنہ نفس مثانہ میں پہنچنے کو وہ بھی مفسد نہیں فرماتے۔

اسی طرح اگر کان میں پانی ڈالے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا۔کما صرح بہ فی الدر المختار والخلاصہ حالانکہ کان بھی ایک جوف ہے۔اسی طرح اگر کوئی انگور وغیرہ کو ایک تاگہ میں باندھ کر نگل جائے اور پھر معدہ میں پہنچنے سے پہلے کھینچ لے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

الغرض اگر مطلق جوفِ بدن میں کسی شئی کا پہنچانا بلاخلاف مفسد ہوتا تو خود پیشاب گاہ بھی ایک جوف ہے اور مثانہ تو بدرجہ اولیٰ جوف ہے اور حلق بھی جوف ہیں۔ان میں پہنچانا بلاخلاف مفسد صوم ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ

مطلقاً جوفِ بدن میں مفطر چیزوں کا پہنچنا مفسد نہیں بلکہ خاص جوفِ دماغ اور جوفِ بطن مراد ہیں۔(امداد المفتین، جلد دوم،ص ۴۱۱، ط: دارالاشاعت)۔

مفتی رفیع صاحب المقالات الفقہیہ میں فرماتے ہیں:

يتحصل من المسائل والجزئيات التي ذكرها الفقهاء في فساد الصوم أن الجوف المعتبر في نفسه عند الحنفية والمالكية هي المعدة والحلق والأمعاء ، أما الأجواف الأخر التي توجد في باطن الجسم الإنساني، فما كان له مسلك إلى أحد هذه الثلاثة . بحيث إذا وصل شيء من الخارج إلى هذا الجوف وصل إلى أحد هذه الثلاثة عادة، إما مباشرة وإما بواسطة جوف آخر. فهو أيضاً جوف معتبر تبعاً لها، فيأخذ حكمها ، وما لا يكون كذلك ، فليس بجوف معتبر عندهم ، لا أصالة ولا تبعاً ، فإذا وصل إلى الجوف المعتبر شيء من المفطرات من منفذ معتبر وصولاً معتبراً فسد الصوم . (المقالات الفقهية،ص ٨٥، الفصل الثالث فی بيان الجوف).

وينظر: (امداد الفتاویٰ:۲/۱۷۴۔۱۷۸،وخیر الفتاویٰ:۴/۷۴)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ڈائلیسس کی مذکورہ بالا دونوں قسموں سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اس لیے کہ اس کی وجہ سے جوفِ معدہ میں کوئی چیز داخل نہیں ہوئی۔البتہ دوسری قسم پیریٹونیل ڈائلیسس میں سیال دوائی کی وجہ سے آدمی کے جسم کو تقویت پہنچتی ہو اور کھانے پینے سے مستغنی رہتا ہو تو کراہت سے خالی نہیں۔

تنبیہ: شیخ بن باز رحمہ اللہ کے نزدیک ڈائلیسس کے عمل سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے جیسا کہ فتاوی اللجنۃ الدائمۃ (۱۰/۱۸۹۔۱۹۰) میں مذکور ہے،اور شیخ عثیمین نے اس مسئلہ میں تفصیل بیان کی ہے کہ اگر سیال دوائی سے جسم کو تقویت پہنچتی ہے تو مفسد ہے ورنہ نہیں جیسا کہ فتاوی نور علی الدرب میں مرقوم ہے۔لیکن ان کے فتاویٰ سے ہمارا اتفاق نہیں۔ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی بھی مفسدِ صوم نہیں ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

روزہ کی حالت میں عورت کے لیے گڈی استعمال کرنے کا حکم:

سوال: روزہ کی حالت میں ٹیمپون (tampon) یعنی روئی کی گڈی جو عورتیں شرمگاہ میں استعمال کرتی ہیں، اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر گڈی رکھتے وقت خشک تھی تو روزہ فاسد نہیں ہوگا اور اگر دوا وغیرہ سے تر ہو اور تری یا دوائی اوپر تک پہنچ جائے تو روزہ فاسد ہو جائیگا۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو أدخل أصبعه في إسته أو المرأة في فرجها لايفسد وهو المختار إلا إذا كانت مبتلة بالماء أو الدهن فحينئذٍ يفسد لوصول الماء أو الدهن هكذا في الظهيرية . (الفتاوی الهندية: ١/٢٠٤)۔

قال في الدر المختار: أو أدخل أصبعه اليابسة فيه ، أي دبره أو فرجها ولو مبتلة فسد . ولو أدخلت قطنة إن غابت فسد وإن بقي طرفها في فرجها الخارج لا . (الدر المختار: ٢/٣٩٧، سعيد)۔

وقال في حاشية الطحطاوي: والظاهر أن الإدخال لا يفسد إلا إذا وصل إلى محل الحقنة. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ٦٧٦، قديمی).

اور اگر گڈی دوا کے ساتھ رکھی ہے لیکن روزہ شروع ہونے سے قبل رکھی ہے تو روزہ کی حالت میں اس کا باقی رہنا مفسدِ صوم نہیں ہے۔ فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

روزہ شروع ہونے سے پہلے داخل فرج میں رکھی ہوئی دوا سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، ہاں بحالتِ صوم دوا رکھنے سے روزہ ٹوٹ جائیگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/۲۵۷)۔

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

اگر روزہ کی حالت میں دوا رکھی جائے، تب روزہ ٹوٹ جائے گا، فقہاء کے یہاں اس کی صراحت موجود ہے، لیکن اگر پہلے سے دوا رکھی گئی ہو اور روزہ کی حالت میں باقی رہے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، یہ ایسا

ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص رات کے وقت غذا یا دوا کھائے اور روزہ شروع ہونے کے بعد بھی وہ معدہ میں موجود رہے۔(کتاب الفتاویٰ:۳/۳۸۱)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

فدیہ دینے کے بعد صحت یاب ہونے پر قضا کا حکم:

سوال: میری بہن جو امریکہ میں رہتی ہے پچھلے رمضان میں بیمار تھی اور ایسی بیماری میں مبتلا تھی کہ ہر چھ گھنٹے کے درمیان دوائی لینی پڑتی تھی،اس وجہ سے وہ ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو فدیہ دیتی تھی،اب وہ تندرست ہوگئی،کیا اس پر ان روزوں کی قضا لازم ہے یا نہیں؟ جبکہ فدیہ ادا کرچکی ہے۔بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ آپ کی بہن صحت یاب ہوگئی اور روزہ رکھنے پر قادر ہو چکی ہے لہذا اس پر روزوں کی قضا لازم ہے،روزے پر قادر ہونے کے بعد فدیہ کافی نہیں ہے،ہاں جو پہلے دیا جا چکا اس کا ثواب مل جائے گا لیکن روزوں کی قضا کرلے۔ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

ولو قدر على الصوم يبطل حكم الفداء لأن شرط الخلفية استمرار العجز. (فتح القدير: ٢/٢٧٧،دار الفكر)۔

فتاوی الشامی میں ہے:

ومتى قدر أي الفاني الذي أفطر وفدى قضى لأن استمرار العجز شرط الخلفية.

(فتاوى الشامي: ٢/٤٢٧،سعيد)۔وكذا في الفتاوى الهندية: ١/٢٠٨)۔

قال في تحفة الملوك : فإن قدر على الصوم بعد الفدية قضى. (تحفة الملوك ،ص١٤٧،رقم المسألة: ٢٥٢)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

احادیث سے افطار کی دعا کا ثبوت:

سوال: بوقتِ افطار یہ دعا پڑھتے ہیں: " **اللّٰهم لک صمت وبک آمنت وعليک توكلت وعلى رزقک أفطرت فتقبل منی**" کیا یہ دعا حدیث سے ثابت ہے یا نہیں اور اگر ثابت ہے تو

کونسے کلمات ثابت ہیں؟

الجواب: یہ دعا مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف کتبِ حدیث میں مختلف صحابہ کرام سے مروی ہے، بعض طرق مرفوع ہیں اور بعض مرسل، البتہ ان میں سے اکثر طرق ضعیف ہیں۔ ہاں محدثین کے یہاں یہ امر بھی مسلم ہے کہ فضائل میں ضعیف حدیث پر عمل کی اجازت ہے۔ احادیث ملاحظہ کیجئے:

(۱) عن معاذ بن زهرة : أنه بلغه أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا أفطر قال: ”اللّٰهم لک صمت وعلى رزقک أفطرت“.

أخرجه الإمام البيهقي في الكبرى (۸۳۹۲) **وأبو داود في سننه** (۲۳۵۸) **وفي مراسيله برقم** (۹۹،ص۱۲٤)، **و عبد اللّٰه بن المبارک فی ”الزهد“**(۱٤۱۰) و(۱٤۱۱)، **وابن السنی فی عمل اليوم والليلة** (٤۸۰) **وابن أبي شيبة** (۳/۱۰۰)، **والبغوی** (۱۷٤۱) **من طرق عن حصين بن عبد الرحمن ، عن معاذ بن زهرة.**

قال ابن الملقن فی ”البدر المنير“ (۵/۷۱۰)**: هذا إسناد حسن لكنه مرسل، معاذ بن زهرة لم يدرک النبي صلى الله عليه وسلم . قال الشيخ محمد عوامة : هذا مرسل بإسناد حسن .** (مصنف ابن ابی شیبة: ۹۸۳۷/۳۲۹/٦)۔

قلت: بل ضعيف ، فإنه مع إرساله فيه جهالة معاذ بن زهرة، فإنهم لم يذكروا له راوياً عنه سوى حصين هذا وأورده ابن أبي حاتم فی الجرح والتعديل ولم يذكر فيه جرحاً ولا تعديلاً وقد ذكره ابن حبان فی التابعين من الثقات ومع ذلک فلم يوثقه فی التقريب وإنما قال: مقبول يعنی عند المتابعة كما نص عليه فی المقدمة : السادسة من ليس له من الحديث إلا القليل ولم يثبت فيه ما يترک حديثه من أجله وإليه الإشارة بلفظ مقبول حيث يتابع وإلا فلين الحديث . (التقریب،ص۱۰)۔

لیکن شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ ورعاہ نے حافظ صاحبؒ کی اس خاص اصطلاح کو انوکھی اور عجیب قرار دیا ہے۔

قال الشيخ :استفسار ثالث :متى نقول عن هذا ”مقبول“وعن ذاک ”لين الحديث“؟

... وإن قال قائل: إن المصنف قد كفانا مئونة ذلک فحكم على من له متابع بالقبول، وعلى من لا متابع له باللين، قلنا: إن هذا حكم فرضي متعذر، ولاسيما إذا لاحظنا أن للراوی أكثر من حديث، واستقراء أحاديث كل راو وتتبعها كلها، ثم الفحص التام عن متابع لكل حديث منها، فإنه أمر متعذر جداً.

ويزداد الأمر تعذراً وإشكالاً حين ملاحظة وجود متابع على بعض الأحاديث، وعدم وجود متابع على بعضها الآخر، فكيف تكون عبارة المصنف حينئذٍ فی حق هذا الراوی؟!

وأما قول القاری الكريم وما موقفه من قول المصنف فی التقريب عن الوليد بن زوران: لين الحديث، والوليد هذا راوی حديث أنس في تخليل اللحية فی الوضوء، وقد تابعه عليه ثابت البناني، كما قاله المصنف نفسه فی النكت على ابن الصلاح (۴۲۲/۱) ونقل كلامه تلميذه السخاوی في فتح المغيث (۷۲/۱)۔

ويزيدک الأمر غرابة أن المصنف قال عن الوليد: وثقه ابن حبان ولم يضعفه أحد، وقد توبع ومع ذلک قال عنه "لين الحديث" وشرطه هنا فی التقريب عدم المتابع، وأن يكون فيه كلام لكنه لم يثبت فيه!! فلِم لم يقل عنه "مقبول"... (التقريب بتحقيق الشيخ محمد عوامه، ص ۴۸)۔

وللمزيد راجع: (المصنف لابن ابی شيبة مع تعليقات الشيخ محمد عوامة (۲۷۹/۱، و ۳۲۹/۶ ط: المجلس العلمی)۔

قال الشيخ شعيب: والوليد روى عنه جمع من الثقات. (تعليقات الشيخ على سنن ابی داود: ۱/۱۰۱/۱۴۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ معاذ بن زہرہ پر کسی نے جرح نہیں کی اور ابن حبان نے توثیق کی ہے لیکن وہ مجاہیل کی توثیق میں مشہور ہیں۔

مزید براں شیخ بشار عواد نے مجہول قرار دیا ہے۔ قال في تحرير التقريب: بل مجهول، تفرد بالرواية عنه حصين بن عبد الرحمن، وذكره ابن حبان فی الثقات، وحديثه الواحد الذی

أخرجه أبوداود مرسل . (۶۷۳۱/۳۸۹/۳)۔

قال الشيخ شعيب في تعليقاته على مراسيل أبي داود (رقم:۹۹،ص۱۲٤) ما نصه:معاذ بن زهرة ، ويقال: معاذ أبوزهرة ، ذكره ابن حبان في ثقاته (۴۸۲/۷) ولم يروعنه غيرحصين . و هو ابن عبد الرحمن السلمي . وأورده البخاري في تايخه الكبير (۳٦٤/۷) وابن أبي حاتم (۲٤۸/۸) فلم يذكرا فيه جرحاً ولا تعديلاً ، وباقي رجاله ثقات ، وهو في سنن أبي داود (۲۳۵۸).

وأيضاً ذكره الشيخ شعيب في تعليقاته على سنن أبي داود (۲۳۵۸/٤۱/٤) وزاد فيه مانصه: وأخرجه ابن سعد في الطبقات (۱۸۹/٦) من طريق سفيان الثوري، عن حصين ،عن معاذ ، عن الربيع بن خثيم قوله . فجعله من قول الربيع بن خثيم ، وليس من قول النبي صلى الله عليه وسلم والظاهر أنه هو الصواب .

(۲) " اللّٰهم لک صمت ، وعلى رزقک أفطرت، فتقبل مني، إنک أنت السميع العليم ".

أخرجه الطبراني في الكبير (۱۲۷۲۰)، والدارقطني في سننه (۲٦/۱۸۵/۲)، وابن السني في عمل اليوم والليلة (٤۸۱) كلهم من طريق عبد الملک بن هارون بن عنترة عن أبيه عن جده عن ابن عباس رضی اللہ عنہ .

قلت: هذا إسناد ضعيف جداً . وفيه: عبد الملک بن هارون وقد ضعفوه ، قال الدارقطني: هو وأبوه ضعيفان ، وقال يحيى: عبد الملک كذاب ، زاد السعيدي : دجال، وقال ابن حبان : وضاع .

(۳) عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ أن النبي صلى الله عليه وسلم ،كان إذا أفطر قال: بسم اللّٰه ، اللّٰهم لک صمت وعلى رزقک أفطرت تقبل مني ، إنک أنت السميع العليم".

أخرجه الإمام الطبراني في الدعاء (۹۱۸، باب القول عندالافطار).

إسناده ضعيف ، فيه داود بن الزبرقان وهومتروک .

وأيضاً أخرجه في الأوسط (۷۵۴۵)، وفي الصغير (۵۱/۲)، وقال : لم يرو هذا الحديث عن شعبة إلا داود بن زبرقان تفرد به إسماعيل بن عمرو ، ولا كتبناه إلا عن محمد بن إبراهيم .

وأورده الإمام السيوطيؒ في جامع الأحاديث بلفظ: إذا قرب إلى أحدكم طعامٌ فليقل: بسم الله ، والحمد لله ، اللّٰهم لک صمت وعلى رزقک أفطرت وعليک توكلت سبحانه وبحمدک ، تقبل مني إنک أنت السميع العليم ، وعزاه إلى الدارقطني في الافراد عن أنس ﷺ . لكن إسناده ضعيف ، فيه ضعيفان : إسماعيل بن عمرو البجلي وداود بن الزبرقان .

قال الملا علی القاریؒ فی المرقاة: وأما ما اشتهر على الألسنة : اللّٰهم لک صمت وبک آمنت وعلى رزقک أفطرت ، فزيادة وبک آمنت ، لا أصل لها وإن كان معناها صحيحاً وكذا زيادة : وعليک توكلت . (المرقاة:۲۵۸/۴)۔

بذل المجہود کے حاشیہ میں شیخ تقی الدین ندوی نے لکھا ہے کہ "وبک آمنت" اور "وعلیک توکلت" کی اصل نہیں ہے۔ قال: وفي روضة المحتاجين : ما اشتهر على الألسنة من زيادة "وبک آمنت" كذا زيادة "وعليک توكلت" لا أصل لها ، وإن كان معناها صحيحاً انتهى . ويظهر منه أن الزيادة ثابتة في رواية أخرى . (بذل المجهود:۵۰۰/۸،رقم الحاشية :۲، ط:دار البشائر الاسلامية). واللہ ﷻ اعلم۔

صائم کے لیے ماء البحر سے وضو کا حکم:

سوال: اگر کوئی روزہ دار وضو کرنا چاہے اور سمندر کے پانی سے وضو کرے تو کیا اس نمکین پانی سے مضمضہ کر سکتا ہے؟ اگر کرلے تو کوئی کراہت ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء نے جہاں وضواور غسل میں غرغرہ کومستحب کہاوہاں اس حکم سے صائم کومستثنیٰ کیا کہ اس کے لیے یہ مکروہ ہے،لیکن جس جگہ سمندر کے پانی سے یاماء مالح سے وضوکا ذکر کیاوہاں صائم کا استثناء منقول نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ سمندر کے نمکین پانی سے وضومکروہ نہیں اور جس جگہ کسی چیز کے چکھنے کومکروہ لکھا ہے وہاں چونکہ اس کا ذائقہ مزاج کے موافق ہے اس لیے مکروہ ہے اور ماءالبحر کا ذائقہ موافق طبیعت نہیں اور فقہاء نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زوقِ شئی کے مکروہ کی علت تعریض الصوم للفساد قرار دی۔جبکہ یہ بات ماءالبحر میں نہیں ہے بایں وجہ اس میں کراہت نہیں ہے۔

قال في البحر: وكره ذوق شيء ومضغه بلا عذر لما فيه من تعريض الصوم للفساد.
(البحر الرائق: ۲/ ۳۰۱،دار المعرفة)۔

(وكذا في الجوهرة: ۲/۴۲، والهداية: ۱/ ۲۲۰، وحاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،ص۶۷۹، قديمي)۔

بدائع الصنائع میں ہے:

والماء المطلق هوالذى تتسارع أفهام الناس إليه عند إطلاق اسم الماء كماء الأنهار والعيون والآبار وماء السماء وماء الغدران والحياض والبحار فيجوز الوضوء بذلك كله سواء كان في معدنه أوفى الأواني لأن نقله من مكان إلى مكان لايسلب إطلاق اسم الماء عنه وسواء كان عذباً أو ملحاً لأن الماء الملح يسمى ماء على الإطلاق ، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: خلق الماء طهوراً لا ينجسه شيء إلا ما غير لونه أو طعمه أو ريحه والطهور هو الطاهر في نفسه المطهر لغيره وقال الله تعالىٰ : وأنزلنا من السماء ماء طهوراً . (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵،سعيد).

وقال في حاشية الطحطاوي: قال ابن سيده فى المحكم: البحر الماء الكثير ملحاً كان أو عذباً وقد غلب على الملح فيكون التنصيص عليه دفعاً لمظنة توهم عدم جواز التطهير به لأنه مر منتن كما توهم بعض الصحابة ، وفى الخبر من لم يطهره ماء البحر فلا طهره الله . (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ،ص ۲۰). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

رمضان میں عمداً روزہ نہ رکھنے سے کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے ماہِ رمضان میں عمداً روزہ نہیں رکھا تو اس شخص پر کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسے شخص پر صرف قضا واجب ہے کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

قال في الهداية: ومن لم ينو في رمضان كله لا صوماً ولا فطراً فعليه قضاء ه ...ومن أصبح غير ناوٍ للصوم فأكل لا كفارة عليه عند أبي حنيفةؒ...ولأبي حنيفةؒ أن الكفارة تعلقت بالإفساد وهذا امتناع إذ لا صوم إلا بالنية. (الهداية:۱/۲۲٤). (وكذا في الفتاوى الهندية:۱/۲۱۵، وتبيين الحقائق:۱/۳٤۱، وتحفة الملوك ،ص۱٤۸، رقم المسئلة: ۲۵۷). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ایامِ تشریق کے روزہ کی قضا کا حکم:

سوال: اگر کسی نے ایامِ تشریق میں روزہ رکھا پھر اس کو معلوم ہوا کہ یہ روزہ ناجائز ہے لہذا اس نے توڑا، کیا اس کی قضا واجب ہوگی یا نہیں؟ اسی طرح سورج نکلتے وقت نماز شروع کی اور توڑ دی تو قضا واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عید کے دن اور ایامِ تشریق نفل روزہ توڑنے پر قضا نہیں اور طلوعِ شمس اور غروبِ شمس کے وقت نفل نماز شروع کر کے توڑنے پر قضا واجب ہے۔ پھر روزہ اور نماز کے درمیان تین فرق علماء نے بیان فرمائے ہیں:

(۱) نماز کے لیے تکبیر تحریمہ ہے اور صوم کے لیے تحریمہ نہیں ہے، تو نماز کی تحریمہ توڑنے کے نتیجہ میں قضا ہے۔

(۲) اوقاتِ مکروہہ میں نماز کی کراہت پر اتفاق نہیں بلکہ بعض ائمہ کے نزدیک بعض نمازوں کی گنجائش ہے اور ایامِ نحر اور عیدین کے روزے کی کراہیت پر اتفاق ہے، جب متفقہ مکروہ توڑے تو قضا نہیں۔

(۳) صوم شروع سے لیکر آخر تک ایک ہی حقیقت ہے، جبکہ نماز ایک حقیقت نہیں، بلکہ مختلف ارکان کا

مجموعہ ہے: قیام، رکوع، سجود اور قعود یہ الگ الگ ارکان ہیں، تو جب روزہ شروع کیا تو ابتداہی سے پوری حقیقت میں کراہت متحقق ہوگئی لہذا توڑنے پر قضا نہیں بخلاف نماز کے کہ اگر قیام کو شروع کیا تو رکوع اور سجود میں کراہت نہیں آئی اس لیے نماز میں قضا ہے اور صوم میں نہیں۔

چنانچہ علامہ کشمیریؒ العرف الشذی میں رقمطراز ہیں:

وكنت متردداً في وجه الفرق بين شروع الصلاة فی الأوقات المكروهة فإنها يجب قضاؤها...وبين شروع الصوم فی الأيام الخمسة المكروهة فإنه لا قضاء فيه إن لم ينذر وقال البعض: إن فی الصوم إذا أمسک ساعة فبعدها تكون الأجزاء متكررة بخلاف الصلاة فإنه ما لم يركع ركعة واحدة لا يقال له إنه مصلٍ فإذا صلى ركعة واحدة فقد أدى قدراً معتداً به فلا ينبغی إلغاؤه، ولم يكن هذا شافياً حتى رأيت فی البدائع عن أبي بكر العياضی وجهين:

أحدهما: أن عدم جواز الصوم فی الأيام الخمسة متفق عليه لا يشذ عنهم شاذ وأما جواز الصلاة فی الأوقات المكروهة فمختلف فيه ...

وثانيهما: أن المصلي إذا شرع فی الصلاة وكبر فصارت تحريمته بمنزلة النذر بخلاف الصوم فإنه إذا شرع فلم يتلفظ بشيء فلم يكن الشروع بمنزلة النذر وفی النذر حقيقة يلزمان أی الصوم والصلاة ويجب الإفساد والقضاء، وهاهنا بحث طويل للحافظ ابن تيميةؒ وأطنب إطناباً ...(العرف الشذی:۱/۱۷۱).

قال فی البدائع: ومنهم من فرق بينهما فقال: إن النهي عن الصلاة في هذه الأوقات ثبت بدليل فيه شبهة العدم وهو خبر الواحد، وقد اختلف العلماء في صحته وروده فكان في ثبوته شک وشبهة وما كان هذا سبيله كان قبوله بطريق الاحتياط والاحتياط في حق إيجاب القضاء على من أفسد بالشروع أن يجعل كأنه ما ورد بخلاف النهی عن الصوم لأنه ثبت بالحديث المشهور، وتلقته أئمة الفتوى بالقبول فكان النهی ثابتاً من جميع الوجوه فلم

يصح الشروع فلم يجب القضاء بالإفساد والفقيه الجليل أبو أحمد العياضي السمرقندي ذكر هذه الفروق وأشار إلى فرق آخر وهو أن الصوم وجوبه بالمباشرة وهو فعل من الصوم المنهي عنه فأما الصلاة فوجوبها بالتحريمة وهي قول وليست من الصلاة فكانت بمنزلة النذر، والله أعلم . (بدائع الصنائع: ۱/۲۹۱،سعید).

مزید دلائل کے لیے دیکھئے: (فتح القدير: ۲/۳۸۷، وفتاوى الشامي: ۱/۳۷۳،سعيد، والبحر الرائق: ۱/۲۴۹، وحاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،ص۱۸۵، والفتاوى الولوالجية: ۱/۲۲۹، وعمدة الفقه: ۳/۱۸۷).

واللہ ﷻ اعلم۔

ماہِ رجب میں روزہ کا حکم:

سوال: ماہِ رجب میں روزہ رکھنے کی کوئی فضیلت حدیث شریف میں آئی ہے یا نہیں؟

الجواب: ماہِ رجب میں روزہ کے بارے میں دوقسم کی روایات مروی ہیں (۱) پہلی قسم روزہ رکھنے کی فضیلت میں لیکن تقریباً تمام روایات ضعیف ہیں۔(۲) دوسری قسم روزہ رکھنے کی ممانعت والی روایات۔

پہلی قسم روزہ رکھنے کی فضیلت میں روایات کی تحقیق ملاحظہ کیجئے:

(۱) أخرج الإمام البيهقي في شعب الإيمان (۳۵۲۰) **بسنده عن عبد العزيز بن سعيد، عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صام يوماً من رجب كان كصيام سنة ومن صام سبعة أيام غلقت عنه سبعة أبواب جهنم، ومن صام ثمانية أيام فتحت له ثمانية أبواب الجنة، ومن صام عشرة أيام لم يسأل الله عزوجل شيئاً إلا أعطاه، ومن صام خمسة عشر يوماً نادى منادٍ من السماء: قد غفرت لك ما سلف فاستأنف العمل قد بدلت سيئاتكم حسنات، ومن زاد زاده الله عزوجل، وفي شهر رجب حمل نوح في السفينة، فصام نوح، وأمر من معه أن يصوموا، وجرت بهم السفينة ستة أشهر إلى آخر ذلك لعشر خلون من المحرم.**

قلت: إسناده ضعيف، قال الهيثمي في المجمع: وفيه عبد الغفور وهومتروک. وعثمان بن مطر الشيباني ضعيف.

وأيضاً أخرجه في فضائل الأوقات (رقم:۹) والطبراني في الكبير (۶/۶۹/۵۵۳۸)، والأصبهاني في الترغيب والترهيب (رقم:۱۸۲۲) وعبد العزيز الكتاني في فضائل رجب والبخاري في الضعفاء.

(۲) صوم أول يوم من رجب كفارة ثلاث سنين، والثاني كفارة سنتين، والثالث كفارة سنة، ثم كل يوم شهر.

أخرجه أبومحمد الخلال في فضائل رجب عن ابن عباس رضي الله عنه كما في الجامع الصغير للإمام السيوطي (۵۰۵۱) ورمز له بالضعف.

(۳) وعن أنس بن مالک رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن في الجنة نهراً يقال له: رجب أشد بياضاً من اللبن وأحلى من العسل من صام من رجب يوماً سقاه الله من النهر.

أخرجه الإمام البيهقي في شعب الإيمان (۳۵۱۹)، وفي فضائل الأوقات (۸)، وابن حبان في المجروحين (۲/۲۳۸).

قال ابن الجوزي: لايصح فيه مجاهيل، لا ندرى من هم. (العلل المتناهية، رقم:۹۱۲) وقال الذهبي: والخبرباطل. (الميزان، رقم ۸۷۹۷ فی ترجمة منصور بن يزيد).

وللمزيد من البحث راجع: (تبيين العجب بماورد في شهر رجب للحافظ ابن حجر العسقلانيؒ).

(۴) عن سلمان الفارسي رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: في رجب يوم وليلة من صام ذلک اليوم وقام تلک الليلة كمن صام من الدهر مائة سنة وهولثلاث بقين من رجب وفيه بعث الله محمداً صلى الله عليه وسلم.

أخرجه البيهقي في شعب الإيمان (۳۵۳۰)، وقال: روى ذلک بإسناد آخر أضعف من

هذا. وأيضاً في فضائل الأوقات(١١)، والديلمى فى الفردوس (٤٣٨١).

قال ابن حجر: هذا الحديث منكر إلى الغاية وهياج هوابن بسطام التيمى الهروى وروى عن جماعة من التابعين وضعفه ابن معين وقال داود: تركوه وقال الحافظ: الملقب بجزرة منكرالحديث لا يكتب من حديثه إلا للاعتبار ولم أكن أعلمه بهذا حتى قدمت هراة فرأيت عندهم أحاديث مناكير كثيرة وقال الحاكم أبوعبد الله هذه الأحاديث التي رواها صالح من حديث الهياج الذنب فيه لابنه خالد والحمل فيها عليه وقال يحيى بن أحمد بن زياد الهروى كل ما أنكره على الهياج فهو من جمع ابنه انتهى كلامه. (تبيين العجب، ص٢١).

(۵) وأخرج ابن الجوزيؒ فى العلل المتناهية (٣٥٦/٢٢٦/١) عن أبي هريرة ﷺ قال: من صام يوم ثمانى عشرة من ذى الحجة كتب الله له صيام ستين شهراً ...فأنزل الله عزو جل اليوم أكملت لكم دينكم و من صام يوم سبعة وعشرين من رجب كتبت له صيام ستين شهراً ...، قال أبوبكر بن ثابت اشتهر هذا الحديث برواية حبشون وكان يقال إنه انفرد به وقد تابعه عليه أحمد بن عبد الله بن العباس بن سالم المعروف بابن النبرى قال: أنا علي بن سعيد الشامي قال أنا ضمرة فذكره مثل ما تقدم أونحوه. وقال المؤلف: وهذا حديث لا يجوز الاحتجاج به ومن فوقه إلى أبى هريرة ﷺ ضعفاء، ونزول الآية كان يوم عرفة بلا شك وذكر ذلك فى الصحيحين.

وأيضاً أخرجه ابن عساكر في تاريخ مدينة دمشق (٢٣٣/٤٢)، ويحيى بن حسين الشجرى في أماليه (٣١/١)، والخطيب البغدادى فى تاريخ بغداد (٤٣٩٢/٢٨٩/٨).

وللمزيد راجع: (فضائل رجب للخلال، وفضائل رجب لعبد العزيز الكتانى، وتبيين العجب لابن حجر العسقلانى، والأدب في رجب للملا على القارى، وفضائل الأوقات للإمام البيهقى، و فضائل رجب وشعبان ورمضان للقزوينى).

(۲) ممانعت والی روایات ملاحظہ کیجئے:

أخرج الإمام ابن ماجه في سننه (۱۷٤۳) بسنده عن ...أنه عليه الصلاة والسلام نهى عن صيام رجب .

إسناده ضعيف جداً ، فيه داود بن عطاء ؛ قال البخاری وغيره : متروک .

قال الشيخ فؤاد عبد الباقي: في إسناده: داود بن عطاء، وهو ضعيف متفق على ضعفه. (التعليقات على ابن ماجه:۱/٥٥٤/۱۷٤۳).

وأيضاً أخرجه الطبراني في الكبير (۱۰/۳٤۸/۱۰٦۸۱) **وابن الجوزي في الواهيات** (۹۱۳) **والبيهقي في الفضائل .**

ملاعلی قاریؒ نے اس حدیث کا یہ جواب دیا کہ یہ ممانعت خاص ہے اس صورت کے ساتھ جبکہ رجب کا روزہ واجب سمجھ کر رکھا جائے، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا۔ (کمافی الادب فی رجب)۔

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ کراہت اندیشہ ضعف کی علت کی بنا پر ہے یعنی جو شخص رجب کے روزوں کی وجہ سے کمزور ہو جائے اور رمضان کے فرض روزوں پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے رجب وشعبان دونوں کے روزے رکھنا مکروہ ہے۔ (کمافی روایۃ امالی الشجریہ)۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں چند آثار منقول ہیں:

عن خرشة بن الحرقال: رأيت عمر ﷺ يضرب أكف الناس في رجب ، حتى يضعوها في الجفان ، ويقول: كلوا ، فإنما هو شهر كان يعظمه أهل الجاهلية .

وعن سفيان ، عن زيد بن أسلم قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صوم رجب؟ قال: اين أنتم من شعبان ! هذا حديث مرسل رجاله ثقات ، لكن كان يحيى القطان يفضل مراسيل معاوية بن قرة على مراسيل زيد بن أسلم .

وعن أنس ﷺ قال: لا تكن اثنينياً ولا خميسياً ، ولا رجبياً . وعن عاصم بن محمد ، عن أبيه قال: كان ابن عمر ﷺ إذا رأى الناس وما يعدون لرجب ، كره ذلک. (المصنف لابن ابى شيبة:٦/٣٣٤، ط: المجلس العلمى).

امدادالفتاویٰ میں ہے:

چونکہ احتمال تھا کہ بعض لوگ جو رجب کی تعظیم کرتے تھے اور اب مشرف باسلام ہوگئے تھے شاید وہ لوگ یا ان کی دیکھادیکھی اور لوگ اس طرح کی تعظیم کے قصد سے اس میں روزہ نہ رکھنے لگیں، اس لیے شارع علیہ السلام نے اس کی ممانعت فرمادی، جس طرح بعض احادیث میں صوم یوم السبت سے نہی آئی ہے، حالانکہ اطلاق سے دلائل ونیز اجماع سے اس کا جواز ثابت ہے، وہاں بھی یہی وجہ ہے کہ یہود کے دیکھادیکھی تخصیص صوم کو ذریعہ تعظیم نہ بنائیں، اسی طرح صیام رجب کی نہی کو سمجھنا چاہئے۔ پس اس حیثیت سے تو یہ منہی عنہ ٹھہرا۔ دوسری حیثیت رجب میں صرف شہر حرام ہونے کی ہے، جو اس میں بقیہ اشہر حرم میں مشترک ہے، پہلی حیثیت سے قطع نظر کرکے صرف اس دوسری حیثیت سے اس میں روزہ رکھنے کو مندوب فرمایا گیا پس دونوں حدیثوں میں تعارض نہ رہا۔ (امدادالفتاویٰ:۲/۱۱۶)۔

حضرت تھانویؒ ۲۷ر رجب کے روزے کے بارے میں فرماتے ہیں:

اس ماہ کی ۲۷ تاریخ میں یہ اعمال مروج ہیں، (۱) روزہ جس کی روایات پر شیخ دہلویؒ نے ماثبت بالسنہ میں سخت جرح کی ہے۔ صرف ایک روایت کو جو کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً وارد ہے۔ جس میں اس روزہ کو برابر ساٹھ ماہ کے روزوں کے کہا گیا ہے۔ شیخ نے سب سے امثل اور غنیمت کہا ہے لیکن پھر بھی ختم روایت پر فرمایا: **فهذه أحاديث ذكرت فيما حضر عندنا من الكتب ولم يصح منها على ما قالوا شيء وغايته الضعف وجلها موضوع**۔ مگر شیخ ہی نے ایک حدیث بروایتِ ابن ابی شیبہ وطبرانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صوم رجب پر لوگوں کے ہاتھوں پر مارتے تھے اور جبراً کھانے میں ڈلواتے تھے۔ کہ یہ ماہ جاہلیت میں معظم تھا اسلام میں متروک ہوگیا خیر اگر کوئی روزہ ہی رکھے تو ایک تو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہ سمجھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا سمجھے۔

دوسرے اس کو ہزاری یعنی ہزار روزہ کے برابر ثواب میں نہ سمجھے کہ اس میں منقول کی تغییر ہے۔

تیسرے اس کو حدیثِ صحیح کے برابر نہ سمجھے، غایت سے غایت ضعیف سمجھ لے ... باقی نفس صوم رجب بے اصل نہیں ہے۔ (امدادالفتاویٰ:۲/۱۱۷۔۱۱۸)۔

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

ستائیسویں رجب کے روزہ کو جو عوام ہزار روزہ کہتے ہیں اور ہزار روزوں کے برابر اس کا ثواب سمجھتے ہیں اس کی کچھ اصل نہیں ۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند، جلد دوم، ص ۴۹۲)۔

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

ستائیسویں رجب کے بارے میں جو روایات آئی ہیں وہ موضوع اور ضعیف ہیں، صحیح اور قابل اعتماد نہیں لہذا ستائیسویں رجب کا روزہ عاشوراء کی طرح مسنون سمجھ کر کہ ہزار روزوں کا ثواب ملے گا اس اعتقاد سے رکھنا ممنوع ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ ستائیسویں رجب کا روزہ رکھنے سے منع فرماتے تھے۔ (فتاوی رحیمیہ: ۸۸/۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عورت کی اندامِ نہانی میں آلہ داخل کرنے سے روزے کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت کی شرمگاہ میں کینسر کی تشخیص کے لیے ایک مخصوص آلہ (speculum) داخل کیا جائے، تو اس صورت میں روزہ فاسد ہو جائیگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر اس آلہ پر تری ہو تو روزہ فاسد ہو جائیگا اور اگر خشک داخل کرے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا، البتہ نکالکر دوبارہ داخل کرنے سے روزہ فاسد ہو جائیگا اور قضا لازم ہوگی۔

قال في البحر الرائق: وفي الظهيرية: ولو أدخل خشبة أو نحوها وطرفاً منها بيده لم يفسد صومه، قال في البدائع: وهذا يدل على أن استقرار الداخل في الجوف شرط لفساد الصوم وكذا لو أدخل أصبعه في استه أو أدخلت المرأة في فرجها هو المختار إلا إذا كانت الأصبع مبتلة بالماء أو الدهن فحينئذٍ يفسد لوصول الماء أو الدهن. (البحر الرائق: ۲۷۹/۲، باب مايفسد الصوم ومالايفسده، ط: كوئٹه).

(وكذا في الفتاوى الهندية: ۲۰٤/۱، وفتاوىٰ محموديه: ۱٤۳/۱۰، وجديد فقهى مسائل: ۱۸۳/۱، واحسن الفتاوىٰ: ٤٤٧/٤).

وقال في حاشية الطحطاوي: والظاهر أن الإدخال لايفسد إلا إذا وصل إلى محل الحقنة. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ٦٧٦،قديمی). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مسافر کا گھر واپس آ کر عمداً کھانے سے کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص سفرِ شرعی کے ارادہ سے گھر سے نکلے اور وہ روزہ دار ہو، پھر درمیانِ سفر سے سفرِ شرعی کو پورا کیے بغیر واپس آ کر روزہ توڑ دے تو اس پر کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب: استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر کفارہ لازم نہ ہو، اور وجہِ استحسان یہ ہے کہ وہ آدمی مسافرِ شرعی بن گیا تھا، اور مسافر کے لیے حالتِ سفر میں صوم وفطر میں اختیار ہے، مسافر اگر سفر میں روزہ توڑ دے تو اس پر کفارہ واجب نہیں ہوتا، لہٰذا اس پر بھی کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

لیکن قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس آدمی پر کفارہ واجب ہو اور وجہِ قیاس یہ ہے کہ وہ شخص درمیان میں سفر چھوڑ کر واپس وطن آ گیا اور مقیم کے حکم میں ہو گیا اور مقیم عمداً روزہ توڑ دے تو اس پر کفارہ واجب ہوتا ہے لہٰذا اس پر بھی کفارہ واجب ہوگا، اور اس مسئلہ میں فتویٰ قیاس پر ہے۔ یعنی کفارہ واجب ہوگا۔

قال في الدر المختار: إلا إذا دخل مصره لشيء نسيه فأفطر فإنه يكفر ، وقال في الشامية: أى قياساً لأنه مقيم عند الأكل حيث رفض سفره بالعود إلى منزله وبالقياس نأخذ ، خانية، فتزاد هذه على المسائل التى قدم فيها القياس على الاستحسان .

(الدر المختار مع رد المحتار: ٤٣١/٢،سعيد). (وكذا فی مجمع الانهر: ٣٦٦/١، بيروت، والفتاوی الهندية: ٢٠٧/١، والمحيط البرهانی: ٥٦٦/٢). **واللہ ﷻ اعلم۔**

رمضان کا قضا روزہ توڑنے پر کفارہ کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ اگر کسی نے رمضان شریف کا قضا روزہ شوال میں رکھا اور طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے توڑ دیا، تو اب اس پر کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: رمضان المبارک کے ادا روزے کے علاوہ کوئی اور روزہ توڑنے پر کفارہ واجب نہیں ہوتا فقط قضا واجب ہوتی ہے۔

قال في البحر الرائق: وبإفساد صوم غير رمضان أي لا كفارة في إفساد صوم غير أداء رمضان لأن الإفطار في رمضان أبلغ في الجناية لهتك حرمة الشهر فلا يلحق به غيره لا قياساً إذ هو ممتنع لكونه على خلاف القياس ولا دلالة لأن إفساد غيره ليس في معناه . (البحر الرائق: ۲/۲۷۸).

وقال في الفتاوى السراجية: إذا أفطر في صوم القضاء لا كفارة عليه. (الفتاوى السراجية،ص۱۶۸). (وكذا في فتح القدير: ۲/۳۴۱،وفتاوى الشامي: ۲/۴۰۴،سعيد).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

رمضان کے ادا روزہ کے علاوہ اور کسی قسم کا روزہ توڑ دینے سے کفارہ واجب نہیں ہوتا اور رمضان کا قضا روزہ توڑنے سے بھی کفارہ واجب نہیں ہوتا۔(عمدۃ الفقہ:۳/۲۸۶)۔واللہ ﷻ اعلم۔

دانتوں میں سے کھانے کا ریزہ نکال کر کھانے سے روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے روزے کی حالت میں دانتوں میں سے کھانے کا ریزہ نکال کر کھالیا یا نکالے بغیر کھالیا تو اس کا روزہ ٹوٹ گیا یا نہیں؟ اور کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: (۱) دانتوں میں سے کھانے کا ریزہ یا گوشت کا ریشہ وغیرہ منہ سے نکالے ہوئے بغیر دانتوں سے نکال کر کھالیا تو دیکھنا چاہئے اگر چنے سے کم ہے تو روزہ نہیں ٹوٹا اور اگر چنے کے برابر یا اس سے زیادہ ہے تو روزہ ٹوٹ گیا صرف قضا ہے۔(۲) اور اگر یہ ریزہ یا ریشہ وغیرہ منہ سے نکالا اور پھر کھایا اور نگل لیا تو روزہ ٹوٹ جائیگا چنے سے کم ہو یا زیادہ یا برابر اس میں بھی قضا ہے کفارہ نہیں ۔(۳) اگر تل کے برابر کسی چیز کو منہ میں خوب چبایا یہاں تک کہ منہ میں گم ہوا اور حلق میں اس کا ذائقہ محسوس نہ ہوا تو روزہ نہیں ٹوٹا۔(۴) اگر کوئی چیز چکھ لی اور اس کا ذائقہ حلق میں پایا لیکن وہ چیز حلق میں نہیں گئی تو روزہ نہیں ٹوٹا۔(۵) اگر تل کھایا تو اصح قول کے موافق

کفارہ ہے۔ ملاحظہ ہو فتاوی عالمگیری میں مرقوم ہے:

وإن أكل ما بين أسنانه لم يفسد إن كان قليلاً وإن كان كثيراً يفسد و الحمصة وما فوقها كثير و ما دونها قليل ، وإن أخرجه وأخذه بيده ثم أكل ينبغي أن يفسد كذا في الكافي وفي الكفارة أقاويل قال الفقيه: و الأصح لا تجب الكفارة كذا في الخلاصة ، وإذا ابتلع سمسمة بين أسنانه لا يفسد صومه لأنه قليل وإن ابتلع من الخارج يفسد وتكلموا في وجوب الكفارة و المختار أنها تجب إذا ابتلعها و لم يمضغها كذا في الغياثية و فتاوى قاضيخان ، وهو الأصح كذا في محيط السرخسي ، وإن مضغها لا يفسد إلا أن يجد طعمها في حلقه وهذا حسن جداً فليكن الأصل في كل قليل مضغه كذا في فتح القدير. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۰۲-۲۰۳، الباب الرابع فيما يفسد وما لا يفسد).

و للاستزادة انظر: (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص۶۶۲، قديمي، وفتح القدير: ۲/۳۳۲، دار الفكر، والدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۱۵، سعيد، وتبيين الحقائق: ۱/۳۲۴).

قال في الدر المختار: وأكل مثل سمسمة من خارج يفطر ويكفر في الأصح . (الدر المختار: ۲/۴۱۵، سعيد).

فتح القدیر میں ہے: **وإذا ابتلع السمسمة حتى فسد هل تجب الكفارة قيل لا ، والمختار وجوبها لأنها من جنس ما يتغذى به وهو رواية عن محمد .** (فتح القدير: ۲/۳۳۳، دار الفكر)۔

وقال في الدر: إلا إذا أخرجه من فمه فأكله ولا كفارة لأن النفس تعافه ، وفي الشامية : قوله لأن النفس تعافه ، فهو كاللقمة المخرجة وقدمنا عن الكمال أن التحقيق تقييد ذلك بكونه ممن يعاف ذلك . (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۱۵، سعيد).

محقق ابن ہمامؒ نے اس مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے: **والتحقيق أن المفتي في الوقائع لا بد له من ضرب اجتهاد ومعرفة بأحوال الناس وقد عرف أن الكفارة تفتقر إلى كمال الجناية فينظر في صاحب الواقعة إن كان ممن يعاف طبعه ذلك أخذ بقول أبي يوسف وإن كان ممن لا أثر لذلك عنده أخذ بقول زفر .** (فتح القدير: ۲/۳۳۳، دار الفكر).

وینظر : (البحر الرائق : ۲/۲۷۲، المكتبة الماجدية، و الفتاوى السراجية، ص ۱٦۷). **واللہ ﷻ اعلم۔**

نسیاناً جماع کرنے کے بعد عمداً روزہ توڑنے پر کفارہ کا حکم:

سوال: اگر کسی نے روزہ میں نسیاناً جماع کیا اور اس کو مسئلہ معلوم تھا کہ اسطرح کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا پھر اس نے عمداً افطاری کر لی تو قضا کے ساتھ کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

دین کی باتیں میں لکھا ہے: اگر مسئلہ جانتا ہو اور پھر بھول کر ایسا کرنے کے بعد عمداً افطار کر دے تو جماع کی صورت میں کفارہ بھی لازم ہوگا اور کھانے کی صورت میں صرف قضا ہے۔ (دین کی باتیں، ص ۲۱۶)۔

کیا اسطرح کا فرق ہے یا کھانے پینے اور جماع سب کا ایک ہی حکم ہے؟ ہدایہ میں صرف کھانے کے بارے میں لکھا ہے کہ کفارہ لازم نہ ہوگا: **ومن أكل في رمضان ناسياً وظن أن ذلك يفطره فأكل بعد ذلك متعمداً عليه القضاء دون الكفارة، لأن الاشتباه استند إلى القياس فتحقق الشبهة وإن بلغه الحديث وعلمه فكذلك في ظاهر الرواية، وعن أبي حنيفةؒ أنها تجب وكذا عنهما لأنه لا اشتباه فلا شبهة، وجه الأول قيام الشبهة الحكمية بالنظر إلى القياس فلا ينتفي بالعلم كوطء الأب جارية ابنه.** (الهداية: ۱/۲۲٦)۔ **بینوا توجروا۔**

الجواب: بصورتِ مسئولہ نسیاناً کھانے، پینے اور جماع کے بعد عمداً ان افعال کو کرنے سے فقط قضا واجب ہوگی کفارہ واجب نہیں ہوگا، اور تینوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ اس مسئلہ کی نظیر کو دیکھ شبہ پیدا ہو گیا، اور کفارہ شبہات سے ساقط ہو جاتا ہے۔ **ولأن الكفارة تندرئ بالشبهات** . (البناية: ٤/٥٣).

نظیر اس کی یہ ہے کہ یہ افعال روزہ کے منافی ہیں اور عمداً کرنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے تو سہواً کرنے سے بھی فاسد سمجھا گیا، نیز امام مالکؒ کے نزدیک سہواً کھانے سے بھی روزہ فاسد ہو جاتا ہے، اور مسئلہ معلوم ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق مرتب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ باپ نے بیٹے کی باندی سے ہمبستری کر لی تو اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی، چاہے اس کو باندی کے حرام ہونے کا مسئلہ معلوم ہو یا نہ ہو۔

ملاحظہ ہو الدر المختار میں ہے:

أو أكل أو جامع ناسياً ... فظن أنه أفطر فأكل عمداً للشبهة ولو علم عدم فطره لزمته الكفارة إلا فى مسألة المتن فلا كفارة مطلقاً على المذهب لشبهة خلاف مالك خلافاً لهما كما فى المجمع وشروحه فقيد الظن إنما هو لبيان الاتفاق وفى الشامى: لأنه ظن في موضع الاشتباه بالنظير، وهو الأكل عمداً لأن الأكل مضاد للصوم ساهياً أو عامداً فأورث شبهة وكذا فيه شبهة اختلاف العلماء، فإن مالكاً يقول: بفساد صوم من أكل ناسياً وأطلقه فشمل ما لو علم أنه لم يفطره بأن بلغه الحديث أو الفتوى أو لا، وهو قول أبي حنيفةؒ وهو الصحيح ...قوله إلا فى مسألة المتن، وهي ما لو أكل وكذا لو جامع أو شرب ،لأن علة عدم الكفارة خلاف مالكؒ وخلافه فى الأكل والشرب والجماع كما فى الزيلعى والهداية وغيرهما. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۲/۴۰۲،سعید).

المحيط البرهانى میں مرقوم ہے:

قال محمدؒ: فى الجامع الصغير: إذا أكل أو شرب أو جامع في نهار رمضان ناسياً، وظن أن ذلك يفطره، فأكل بعد ذلك متعمداً، فلا كفارة عليه، وإنما لم تجب الكفارة لمكان الشبهة، والشبهة نوعان: شبهة اشتباه بالنظير، وهو أن يجد لما ظن، واشتبه عليه نظير أو شبهة حكمية، وقد وجد لما اشتبه نظيراً، وهو الأكل حالة العمد، لأن أكل الناسي ينافى الإمساك فى الظاهر كأكل العامد، وكذلك وجدت الشبهة الحكمية، فإن الصوم قد فسد بالأكل الأول عند أهل المدينة، وأنه قياس غير مهجور، فصار شبهة فى الاستحسان. وعن أبي حنيفةؒ: أنه إن بلغه الحديث لزمه الكفارة؛ لأنه علم أن القياس متروك، فلا يعتبر القياس سبباً للشبهة في حقه، وفي رواية أخرى عنه لا تلزمه الكفارة على كل حال، وهو الصحيح. (المحيط البرهانى: ۲/۳۹۷).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

اگر کسی نے بھول کر کچھ کھایا یا پیا یا مجامعت کی اور اس کو یہ گمان ہوا کہ اس سے اس کا روزہ ٹوٹ گیا پھر اس

نے عمداً کھالیا تو اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا یعنی صرف قضالازم ہوگی اور اگر وہ جانتا ہے کہ بھول کر کھانے پینے وغیرہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا تب بھی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کفارہ لازم نہیں ہوگا یہی صحیح ہے۔اور یہی ظاہر الروایہ ہے....۔(عمدۃ الفقہ :۳/۳۲۰)۔

وللاستزادة راجع : (الفتاوى الهندية: ۲۰۹/۱، والبناية في شرح الهداية: ۱۰۸/۲، وبدائع الصنائع: ۲/ ۱۰۰، سعيد، وعمدة الفقه:۳/ ۳۲۰)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

کفارۂ ظہار میں مقدماتِ جماع کا حکم:

سوال: کفارۂ ظہار میں مقدماتِ جماع کا حکم جماع کی طرح ہے یا اس سے مختلف ہے؟

الجواب: کفارۂ ظہار میں مقدماتِ جماع بحکمِ جماع ہیں، یعنی جس طرح کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع حرام ہے اسی طرح مقدمات ولوازماتِ جماع بھی حرام ہیں۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها حرمة الاستمتاع بها من المباشرة والتقبيل واللمس عن شهوة والنظر إلى فرجها عن شهوة قبل أن يكفر لقوله عزوجل : من قبل أن يتماسا ، وأخف ما يقع عليه اسم المس هو اللمس باليد إذ هو حقيقة لهما أعنى الجماع واللمس باليد لوجود معنى المس باليد فيهما ولأن الاستمتاع داعٍ إلى الجماع فإذا حرم الجماع حرم الداعى إليه إذ لولم يحرم لأدى إلى التناقض ولهذا حرم فى الاستبراء وفى الإحرام...ولأن هذه الحرمة إنما حصلت بتشبيه امرأته بأمه فكانت قبل انتهائها بالتكفير وحرمة الأم سواء وتلك الحرمة تمنع من الاستمتاع كذا هذه ...الخ. (بدائع الصنائع: ۲۳٤/۳، سعيد).

وكذا فى البناية فى شرح الهداية:٥/٥٤٢، ٥٣٥، والبحر الرائق: ٤/ ١٠٤). **واللہ ﷻ اعلم۔**

کفارۂ صوم میں خون نظر آنے سے تسلسل کا حکم:

سوال: ایک عورت نے رمضان کے مہینہ میں عمداً روزہ توڑ ڈالا، لہٰذا اس پر کفارہ واجب ہوا، اس نے مسلسل ساٹھ روزے رکھنے شروع کردئے پھر اس کی عادت کے موافق خون آیا تو تیسرے دن اس نے روزہ نہیں رکھا اور تیسرے دن اس کو بالکل خون نہیں آیا، سوال یہ ہے کہ اس کے کفارہ کا تسلسل ختم ہوا یا نہیں؟

الجواب: علامہ شامیؒ کی عبارت " **وإذا أفطرت على ظن أنه يوم حيضها فلم تحض الأظهر وجوب الكفارة** ". (رد المحتار:۲/۴۱۳، سعید) کے مفہومِ مخالف سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت کو خون آیا اور بظاہر حیض کا ہی خون ہو پھر بعد میں پتا چلا کہ یہ استحاضہ ہے تو اس سے تسلسل نہیں ٹوٹنا چاہئے، کیونکہ علامہ شامیؒ کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ عورت کا گمان ہو کہ یہ حیض کا دن ہے، لیکن خون نہیں آیا اور صورتِ مسئولہ میں خون آیا ہے تو یہ عورت افطار میں معذور ہے، نیز علامہ رافعیؒ نے قاضیخان سے نقل کیا ہے کہ اگر عورت کے خیال میں سورج غروب ہوا اور حقیقت میں غروب نہیں ہوا تھا یا حیض کا دن سمجھ کر افطار کیا اور حیض نہیں آیا تھا یا مرض کا دن تھا اور افطار کیا تو تسلسل ساقط نہیں ہوا۔ علامہ رافعیؒ کی عبارت درجِ ذیل ہے:

لكن قد صحح قاضيخان في شرح الجامع الصغير سقوط الكفارة فى المسئلتين وشبههما بمن أفطر وأكبر ظنه أن الشمس غربت ثم ظهر عدمه . (التحریر المختار علی رد المحتار: ۲/۱۴۹، سعید). **واللہ ﷻ اعلم۔**

غروبِ آفتاب کے گمان سے افطار کرنے پر تسلسل کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے رمضان کا روزہ عمداً توڑ دیا تھا، اب اس نے کفارہ کے مسلسل روزے رکھنے شروع کیے، اتفاقاً ایک دن مغرب کی اذان سے پہلے بریلویوں کی مسجد سے صلاۃ والسلام کی آواز سنی اور اس نے غلطی سے اس کو اذان سمجھ کر روزہ افطار کرلیا، حالانکہ ابھی غروب نہیں ہوا تھا تو کیا یہ شخص از سر نو روزے رکھے گا یا نہیں؟ یعنی اس کا تسلسل ٹوٹے گا یا نہیں؟

الجواب: علامہ رافعیؒ نے قاضیخان سے نقل کیا ہے کہ اگر کسی کے خیال میں سورج غروب ہوا اور

حقیقت میں غروب نہیں ہوا تھا تو تسلسل ساقط نہیں ہوا۔ علامہ رافعیؒ کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

لكن قد صحح قاضيخان في شرح الجامع الصغير سقوط الكفارة في المسئلتين وشبههما بمن أفطر وأكبر ظنه أن الشمس غربت ثم ظهر عدمه . (التحرير المختار على رد المحتار: ۲/ ۱٤۹، سعيد). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

یوم النحر اور ایام تشریق کی وجہ سے تسلسل کا حکم:

سوال: جن کفاروں میں مسلسل روزے رکھنا ضروری ہے اگر ان روزوں کے درمیان یوم النحر اور ایام التشریق آجائے تو تسلسل باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ان ایام کی وجہ سے تسلسل قائم نہیں رہے گا۔

امام محمدؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

قلت : أرأيت إن وافق صيامه ذلك يوم النحر وأيام التشريق ويوم الفطر فأفطر وهذه الأيام لا بد من أن يفطر فيها كيف يصنع قال: يستقبل الصيام لأنه مفطر في هذه الأيام وهذه الأيام ليست بأيام صوم . (المبسوط :۲/ ۲۱۷، ط: ادارة القرآن والعلوم الاسلامية).

قال في البدائع : وكذلك لو أفطر يوم الفطر أو يوم النحر أو أيام التشريق فإنه يستقبل الصيام سواء أفطر في هذه الأيام أو لم يفطر لأن الصوم في هذه الأيام لايصلح لإسقاط ما في ذمته لأن ما في ذمته كامل والصوم في هذه الأيام ناقص لمجاورة المعصية إياه والناقص لاينوب عن الكامل . (بدائع الصنائع: ٥/ ۱۱۱، سعيد).

وينظر: (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ٤۷٦، سعيد، والبحر الرائق: ۲/ ۲٥۸، والمبسوط للامام السرخسيؒ: ۷/ ۱۳). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

صوم عاشورا کے درجات:

سوال: ماہِ محرم میں عاشورا کے ساتھ دوسرے دنوں کوملانے کا کیا حکم ہے؟ اوراس کے کتنے درجات ہیں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: عاشورا کے ساتھ نویں یا گیارہویں کا روزہ ملانا مستحب ہےاوراس کے چاردرجات ہیں:

(۱) پہلا درجہ: نویں، دسویں اور گیارہویں کا روزہ رکھنا۔ یہ سب سے افضل ہے۔

أخرج الإمام البيهقي في شعب الإيمان(۳۵۱۱) **عن ابن عباس ﷺ قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: صوموا يوم عاشوراء وخالفوا اليهود فيه صوموا قبله يوماً وبعده يوماً.**

قال الهيثمي: وفيه محمد بن أبي ليلى وفيه كلام. (۱۸۸/۳).

وأيضاً أخرجه أحمد (۲٤۱/۱،رقم: ۲۱۵٤) **، وتمام في فوائده** (رقم:۸۷) **، والبزار** (رقم:۵۲۳۸) .

قال الشيخ عبد الحق الدهلوى فى اللمعات: ومراتب صوم محرم سه است وأفضل آن است كه روزه دارد روز نهم ودهم ويازدهم همچنين آمده است درحديث أحمد وبزار عن ابن عباس ﷺ ، دوم نهم ودهم ، سوم دهم تنها . (اشعة اللمعات:۱۰۵/۲، ط: المكتبة الرشيدية).

بعض شراح نے فرمایا کہ اس روایت میں واو بمعنی مع ہےاور دیگر نسخوں میں واو کی جگہ او ہے۔کمافی المرقاۃ۔(۲۸۸/۴ط:ملتان)۔اور یہ اس لیے کہ یہود کے ساتھ مخالفت ان میں سے ایک سے حاصل ہوجاتی ہے۔

(۲) دوسرادرجہ: نویں اور دسویں کا روزہ رکھنا۔ملاحظہ ہومسلم شریف میں ہے:

عن ابن عباس ﷺ عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال: لئن بقيت إلى قابل لأصومن التاسع . وفي رواية عنه : فإذا كان العام المقبل إن شاء اللّٰه ، صمنا اليوم التاسع . (رواه مسلم: ۳۵۹/۱).

(۳) تیسرادرجہ: دسویں اور گیارہویں کا روزہ رکھنا۔کتبِ احادیث میں یہ روایت بکثرت وارد ہوئی ہے: **عن ابن عباس ﷺ عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال: صوموا يوم عاشوراء ، وخالفوا**

الیھود ، صوموا قبله یوماً أو بعده یوماً . (صحیح ابن خزیمة :۲/۱۰۰٦،رقم: ۲۰۹۵).

چونکہ نویں کے روزے کی تمنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اس لیے نو محرم کے روزے کا دوسرا درجہ ہوا اور گیارہویں کا تیسرا درجہ ہے۔

(۴) چوتھا درجہ: صرف دس محرم کا روزہ رکھنا۔اس کی فضیلت بھی احادیثِ مبارکہ میں وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلم شریف کی روایت میں ہے: **وصیام یوم عاشوراء احتسب علی اللّٰه أن یکفر السنة التي قبله .** (مسلم شریف : ۱/۳٦۷).

علامہ سید بنوریؒ معارف السنن میں فرماتے ہیں:

وحاصل الشریعة : أن الأفضل (۱) صوم یوم عاشوراء وصوم یوم قبله وصوم یوم بعده ، ثم الأدوَن منه : (۲) صوم عاشوراء وصوم یوم قبله أو(۳) صوم یوم بعده، ثم الأدون منه: صوم عاشوراء منفرداً ، والصور الثلاث کلها عبادات بعضها فوق بعض . (معارف السنن:٥/٤٣٤).

پھر اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ صرف دس محرم کا روزہ مکروہ ہے یا نہیں؟ تو بعض حضرات نے تشبہ کی وجہ سے مکروہ لکھا ہے لیکن اب تشبہ نہ ہونے کی وجہ سے عام فقہاء نے بلا کراہت جائز فرمایا ہے۔کما فی البدائع۔ نیز دسویں کے ساتھ نویں ملانا مستحب ہے اور خلافِ مستحب مکروہ نہیں ہے،اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے خلاف کرنے سے کراہت لازم نہیں آتی ،مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا تھی کہ حطیم ، بیت اللہ میں شامل ہو لیکن ایسا نہیں ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ صرف دس محرم کا روزہ اب مباح یا خلافِ اولیٰ ہے مکروہ نہیں ہے،اور جن فقہاء نے مکروہ فرمایا اس کا مطلب بھی مکروہ تنزیہی ہے جو خلافِ اولیٰ کے مترادف ہے۔جیسا کہ مفتی نظام الدین صاحبؒ نے نظام الفتاویٰ میں فرمایا ہے اور اس پر مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے دستخط بھی موجود ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (نظام الفتاویٰ،ص۳٦۸۔۳۷۱،ومعارف السنن:۵/۴۳۴۔۴۳۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

کئی روزوں کا فدیہ ایک شخص کو دینے کا حکم:

سوال: ایک شخص کا انتقال ہوااس کے رمضان المبارک کے چھ روزے باقی تھے اب اس کے گھر والے روزوں کا فدیہ دینا چاہتے ہیں تو کیا ایک ہی شخص کو چھ روزوں کا فدیہ دینا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ متعدد روزوں کا فدیہ ایک فقیر کو دے سکتا ہے، اسی طرح ایک روزے کا فدیہ بھی متعدد فقیروں کو دینا جائز اور درست ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

قال في الدر المختار: ولو ماتوا بعد زوال العذر وجبت وفدى عنه وليه كالفطرة قدراً.
وفي الشامية: قوله قدراً أي التشبيه بالفطرة من حيث القدر إذ لايشترط التمليك هنا بل تكفي الإباحة بخلاف الفطرة وكذا هي مثل الفطرة من حيث الجنس وجواز أداء القيمة وقال القهستاني: وإطلاق كلامه يدل على أنه لو دفع إلى فقير جملة جاز ولم يشترط العدد ولا المقدار لكن لودفع إليه أقل من نصف صاع لم يعتد به وبه يفتي. (الدر المختار مع ردالمحتار:۲/۴۲۴،سعید).

الفقه الحنفي میں ہے:

وتدفع القيمة إلى الفقراء الذين يصح دفع الزكاة إليهم، ولو أعطى فدية يومين لفقير واحد صحت. (الفقه الحنفي في ثوبه الجديد:۱/۴۴۳).

قال في الشامية: وبلا تعدد فقير أي بخلاف نحو كفارة اليمين للنص فيها على التعدد فلو أعطى هنا مسكيناً صاعاً عن يومين جاز لكن في البحر عن القنية عن أبي يوسفؒ فيه روايتان وعند أبي حنيفةؒ لا يجزيه كما في كفارة اليمين وعن أبي يوسفؒ لو أعطى نصف صاع من بر عن يوم واحد لمساكين يجوز قال الحسن وبه نأخذ ومثله في القهستاني.

(فتاوى الشامي: ۲/۴۲۷،سعید).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

کئی روزوں کے فدیہ کا اناج یا قیمت ایک فقیر کو دینا جائز ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۰/۱۹۱، جامعہ فاروقیہ)۔

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

لیکن اگر ایک ہی دفعہ ایک محتاج شخص کو ایک سے زیادہ دنوں کا فدیہ ادا کرے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ صورت بھی درست ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔(کتاب الفتاویٰ:۳/۴۱۴)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

قضا روزے کے ساتھ عاشورا کی نیت کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے رمضان المبارک کے کچھ روزے باقی تھے، دس محرم کو عاشوراء کے دن قضا روزہ رکھا اور اس میں عاشورا کی نیت بھی کرلی تو یہ درست ہوگا یا نہیں؟ یعنی عاشورا کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ جائز ہے اور رمضان کا قضا روزہ بھی ادا ہو جائے گا اور عاشورا کا ثواب اور اس کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے گی۔ملاحظہ ہو علامہ سید حمویؒ الاشباہ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

قيل: يستفاد منه أجزاء النية عن الاثنين وعرفة لحصول المقصود فيه أيضاً كما لايخفى، انتهى، وفيه تأمل، أقول: في فتح القدير: صام في يوم عرفة مثل قضاء أو نذر أو كفارة و نوى معه الصوم عن يوم عرفة أفتى بعضهم بالصحة و الحصول عنهما انتهى. ومنه يستفاد الحكم الذي لم يذكره المصنفؒ بالطريق الأولى. (غمز عيون البصائر: ١٤٧/١، السادس في بيان الجمع بين عبادتين).

لیکن احسن الفتاویٰ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ ثواب وفضیلت نفل روزے کے ساتھ مخصوص ہو تو قضا روزے میں نیت کرنے سے حاصل نہیں ہوگی جیسے: شش شوال کے روزے اور اگر مطلق صوم کے لیے ہو تو حاصل ہو جائے گی جیسے: یوم عرفہ و نصف شعبان کا روزہ۔ملاحظہ ہو احسن الفتاویٰ میں ہے:

حدیث مسلم: **من صام رمضان ثم أتبعه ستاً من شوال كان كصيام الدهر**، سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ روزے غیر رمضان کے مراد ہیں، نیز صیامِ دہر کے ثواب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہر نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ہے، اس حساب سے رمضان کا مہینہ دس ماہ کے قائم مقام ہوا، پورے سال سے دو ماہ رہ گئے، اس کی تکمیل

کے لیے شوال کے چھ روزے ہیں، جو ساٹھ روز (دوماہ) کے قائم مقام ہیں، اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ نفل روزے مراد ہیں، ان ایام میں قضا روزوں سے یہ فضیلت حاصل نہ ہوگی۔

صومِ عاشوراء کی مشروعیت بطورِ شکرانہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فضیلت بھی نفل روزے کے ساتھ مخصوص ہے، اس روز قضا روزہ رکھنے سے یہ ثواب نہ ملے گا،

نصفِ شعبان ویوم عرفہ کے روزے میں تطوع کی قید کہیں سے ثابت نہیں ہوتی، اگرچہ ایسے فضائل کا ورود بالعموم نوافل ہی کے لیے ہے، مگر روایات کے الفاظ مطلق ہیں، ظاہر الفاظ کے پیش نظر ان دونوں میں قضا روزہ رکھنے سے حصولِ فضیلت بعید نہیں، بالخصوص جبکہ انا عند ظن عبدی بی کی بشارت بھی ہے،

بعض علماء نے عدمِ فضیلت پر یوں استدلال کیا ہے کہ فرض میں نیتِ نفل صحیح نہیں، یہ استدلال اس لیے تام نہیں کہ یہاں نیتِ نفل کا مسئلہ نہیں، بلکہ بحث یہ ہے کہ فضیلت موعودہ صرف نفل ہی کے لیے ہے یا مطلق صوم کے لیے خواہ نفل ہو یا فرض، **ونظیرہ ما حرر ابن عابدین**: **أنه ينال فضل التهجد بقضاء الفوائت بعد العشاء**، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ (احسن الفتاویٰ: ۴/۴۳۰)۔

بہر حال شرح اشباہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روزے میں فرض وواجب کے ساتھ ہر قسم کے نفل کی نیت ہو سکتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے ساتھ موافق ہے، اللہ تعالیٰ تہجد کی نیت سے سونے اور تہجد کے لیے اتفاقاً جاگنے کو تہجد کا قائم مقام بناتے ہیں، مریض اور مسافر کے ترکِ نوافل کو نوافل کا قائم مقام بناتے ہیں، اس لیے شرحِ اشباہ میں مذکور قول اقرب الی الرحمۃ ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شیخ فانی کے لیے مسنون اعتکاف کا حکم:

سوال: ایک بوڑھا شخص جو شیخ فانی ہونے کی وجہ سے یا سخت بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا، لیکن اعتکاف میں بیٹھنا چاہتا ہے تو اس کا مسنون اعتکاف ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مسنون اور واجب اعتکاف دونوں کے لیے روزہ شرط ہے بایں وجہ اس بوڑھے شخص کا مسنون اعتکاف درست نہیں ہوگا، ہاں نفل اعتکاف ہو جائے گا۔

قال في الشامية : ومقتضى ذلك أن الصوم شرط أيضاً في الاعتكاف المسنون ، لأنه مقدر بالعشر الأخير ، حتى لو اعتكفه بلا صوم لمرض أو سفر ينبغي أن لايصح عنه ، بل يكون نفلاً ، فلا تكون به إقامة سنة الكفاية . (فتاوى الشامي: ٢/ ٤٤٢، سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

یہ اعتکاف سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے، اگر بغیر روزہ کے یہ اعتکاف کیا تو یہ اعتکافِ مسنون نہیں ہوگا، بلکہ نفل بن جائے گا۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۰/۲۲۰،جامعہ فاروقیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

معتکف کا محرابِ مسجد میں داخل ہونے کا حکم:

سوال: مسجد کا محراب مسجد میں داخل ہے یا نہیں؟ معتکف اگر محراب میں داخل ہوجائے تو اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ محرابِ مسجد، شرعی مسجد میں داخل ہے بنابریں معتکف کا محراب میں جانا درست ہے اس کی وجہ سے اعتکاف میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مرقوم ہے:

وإن كان المحراب من المسجد كما هي العادة المستمرة . (البحرالرائق:٢/ ٢٦).

في الفتاوى الهندية: داخل المحراب له حكم المسجد . (الفتاوى الهندية:٥/ ٣٢١).

وكذا في فتاوى الشامي : ١/ ٦٤٦،سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

معتکف کا ہاتھ دھونے کے لیے باہر نکلنے کا حکم:

سوال: کھانا کھانے کے بعد یا چائے پینے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے معتکف کا مسجد سے باہر جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مذہبِ احناف میں راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق معتکف کا کھانا کھانے یا چائے پینے کے بعد مسجد سے باہر صرف ہاتھ دھونے کے لیے نکلنا درست نہیں ، اگر نکلا تو اس کا اعتکاف فاسد ہوجائے گا۔البتہ

صاحبین کے نزدیک معتکف اگر آدھے دن سے کم بلاعذر مسجد سے باہر رہے تو بھی اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔اور محقق ابن ہمامؒ نے صاحبینؒ کے قول کو استحسان بالضرورۃ فرما کر اس قول کی ترجیح کی طرف میلان ظاہر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

فإن خرج من المسجد لغير عذر فسد اعتكافه في قول أبي حنيفةؒ وإن كان ساعة وعند أبي يوسفؒ محمدؒ لا يفسد حتى يخرج أكثر من نصف يوم قال محمدؒ قول أبي حنيفةؒ أقيس وقول أبي يوسفؒ أوسع ، وجه قولهما إن الخروج القليل عفو وإن كان بغير عذر بدليل أنه لو خرج لحاجة الإنسان وهو يمشي متأنيا لم يفسد اعتكافه ومادون نصف اليوم فهو قليل فكان عفواً، ولأبي حنيفةؒ أنه ترك الاعتكاف باشتغاله بضده من غيرضرورة فيبطل اعتكافه لفوات الركن وبطلان الشيء بفوات ركنه يستوى فيه الكثير و القليل ... (بدائع الصنائع:۲/۱۱۵،سعید).

وفى الفتاوى الهندية: قال الإمام السرخسيؒ : قولهما أيسر على المسلمين هكذا فى الخلاصة . (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۲).

قال في الهداية: ولو خرج من المسجد ساعة بغيرعذر فسد اعتكافه عند أبي حنيفةؒ لوجود المنافي وهو القياس، وقالا: لا يفسد حتى يكون أكثر من نصف يوم وهو الاستحسان لأن فى القليل ضرورة . (الهداية:۱/۲۳۰).

محقق ابن ہمامؒ کا میلان صاحبینؒ کے قول کی ترجیح کی طرف ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

قوله وهو الاستحسان ، يقتضي ترجيحه لأنه ليس من المواضع المعدودة التي رجح فيها القياس على الاستحسان ، ثم هو من قبيل الاستحسان بالضرورة ،كما ذكره المصنف...الخ. (فتح القدير:۲/۳۹۶،ط:دارالفکر).

وللاستزادة راجع : (المبسوط للامام السرخسى : ۳/۲۱۴،ط:بیروت،والجوهرة النيرة ، باب الاعتكاف).

چونکہ آج کل ایسے لوگ اعتکاف کرتے ہیں جو اکثر بے احتیاطی کا شکار ہو جاتے ہیں اس لیے اگر تھوڑی دیر کے لیے کوئی شخص نکلا تو صاحبینؒ کے قول مطابق اس کا اعتکاف نہیں ٹوٹے گا اور سنتِ مؤکدہ کا ثواب ختم نہیں ہوگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اجتماعی اعتکاف اور اس کے لیے دعوت کا حکم:

سوال: بعض صوفی حضرات لوگوں کو اپنے پاس اعتکاف کی دعوت دیتے ہیں، کیا اعتکاف کے لیے دعوت دینا صحیح ہے یا نہیں؟ دعوت کے نتیجہ میں کافی سارے لوگ اعتکاف کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور مسجد میں رونق ہو جاتی ہے اور مختلف اعمال سے مسجد آباد رہتی ہے۔

الجواب: صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اعتکاف کی طرف متوجہ فرمایا اور اپنے ساتھ اعتکاف کرنے اور شب قدر تلاش کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتکاف فرمایا، نیز اعتکاف کے لیے دعوت کا مقصد وعظ ونصیحت، شب قدر کی تلاش اور عوام الناس کو دنیا کے مشاغل سے فارغ کر کے اللہ کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں روایت ہے:

عن أبي سلمة قال: انطلقت إلى أبي سعيد الخدري فقلت: ألا تخرج بنا إلى النخل نتحدث فخرج فقال: قلت: حدثني ماسمعت من النبي صلى الله عليه وسلم في ليلة القدر قال: اعتكف رسول الله صلى الله عليه وسلم العشر الأول من رمضان واعتكفنا معه فأتاه جبريل فقال: إن الذى تطلب أمامك فاعتكف العشر الأوسط فاعتكفنا معه فأتاه جبريل فقال: إن الذى تطلب أمامك فقام النبي صلى الله عليه وسلم خطيباً صبيحة عشرين من رمضان فقال: من كان اعتكف مع النبي صلى الله عليه وسلم فليرجع فإني أريت ليلة القدر وإني نسيتها وإنها في العشر الأواخر في وتر... (رواه البخاري، رقم:۸۱۳، باب السجود على الانف والسجود على الطين).

وفي رواية له عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يعتكف في العشر الأوسط من رمضان فاعتكف عاماً حتى إذا كان ليلة إحدى وعشرين وهي الليلة التي يخرج من صبيحتها من اعتكافه قال: من كان اعتكف معي فليعتكف العشر الأواخر... (رواه البخاري، رقم: ۲۰۲۷،باب الاعتكاف في العشرالاواخر).

وفي رواية له عنه قال: اعتكفنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ...قال: من كان اعتكف فليرجع إلى معتكفه ... (رواه البخاري،رقم: ۲۰۴۰،باب من خرج من اعتكافه عندالصبح).

فتاوی الشامی میں ہے:

وأما أفضل الاعتكاف ففي المسجد الحرام...ثم ما كان أهله أكثر . (فتاوى الشامي: ۲/۴۴۱، سعيد، وكذا في البحرالرائق: ۲/۳۰۱).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: ويلازم التلاوة والحديث والعلم والتدريس وسير النبي صلى الله عليه وسلم. (الفتاوى الهندية:۱/۲۱۲).

اور یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف جاری رکھا اور عشرۂ اولیٰ اور ثانیہ کا اعتکاف چھوڑ دیا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ جب لیلۃ القدر کا احتمال پورے رمضان میں ہے تو پھر پورے ماہ کا اعتکاف مطلوب ومقصود ہوا ہاں عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف مسنون اور باقی ماہ کا مندوب ہوگا۔

السنن الکبری میں روایت ہے:

عن عبد الله بن عمر رضي الله عنه قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا أسمع عن ليلة القدر فقال: هي في كل رمضان... ورواه سفيان وشعبة عن أبي إسحاق موقوفاً على ابن عمر رضي الله عنه ولم يرفعاه إلى النبي صلى الله عليه وسلم . (السنن الكبرى : ۴/۳۰۷).

اوجز المسالک میں ہے: وكونها مختلفة برمضان ممكنة في جميع لياليه وهو قول ابن عمر رضي الله عنه . (اوجزالمسالك : ۵/۳۷۴).

ومثله في شرح المسلم للنووي (۱/۳۶۹) وعمدة القارى (۸/۲۵۳) ابن ماجہ کے حاشیہ میں

ہے: **وقيل في جميع شهر رمضان** . (۱۹۰/۳).

شامی میں ہے: **ليلة القدر في رمضان دائرة لكنها تتقدم وتتأخر** . (۴۵۲/۲).

اخیرۂ عشرہ کا اعتکاف مسنون ہے اور باقی مندوب ہے۔

اوجز المسالک میں ہے:

وقال أبوداود عن أحمد لا أعلم عن أحد من العلماء خلافاً أنه مسنون انتهى.
(اوجز المسالك : ۴۰۸/۵).

اعلاء السنن میں ہے:

قال المؤلف: دلالته على مواظبة الاعتكاف كما هو الأصل في لفظ كان ظاهرة فهو سنة مؤكدة . (اوجز المسالك:۱۸۰/۹).

قال في الهندية : وينقسم إلى واجب... وإلى سنة مؤكدة وهو في العشر الأخير من رمضان وإلى مستحب وهو ما سواهما هكذا في فتح القدير . (الفتاوى الهندية: ۲۱۱/۱).

عمدۃ القاری میں ہے:

وذهب أكثر أهل العلم إلى ذلك بل إلى استحباب الاشتغال بالعلم وحضور مجالس العلم لأن ذلك من أفضل القرب . (عمدة القارى: ۲۷۲/۸). **واللہ ﷻ اعلم۔**

عورتوں کے لیے اجتماعی اعتکاف کا حکم:

سوال: کیا یہ بات درست ہے کہ عورتیں رمضان کے آخری عشرہ میں کسی مکان میں جمع ہو جائیں جس میں کوئی غیر محرم نہ ہو اور اس طرح اعتکاف کریں کہ ان میں ایک عالمہ فاضلہ ہو جو دوسری عورتوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے اور ان کے شوہر مسجد میں اعتکاف کریں، تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عورت کو اصل حکم یہ ہے کہ اپنے گھر کے کونے میں جو نماز کے لیے مخصوص ہو اعتکاف کرے، لیکن اگر شوہر راضی ہو اور چند خواتین مل کر ایک عالمہ فاضلہ کو تعلیم وتعلم اور وعظ ونصیحت کے لیے

منتخب کرلے اور اس مقصد کے لیے جمع ہوجائیں جس میں فتنہ وغیرہ کا کوئی خدشہ نہ ہو اور پردہ وغیرہ کا مکمل اہتمام کریں تو اس اجتماعی اعتکاف کی اجازت ہوگی۔

صحیح احادیث میں عورتوں کے جمع ہونے کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم، يعتكف في العشر الأواخر من رمضان فكنت أضرب له خباء فيصلي الصبح ثم يدخله فاستأذنت حفصةؓ عائشةؓ أن تضرب خباء فأذنت لها فضربت خباء فلما رأته زينب ابنة جحش ضربت خباء فلما أصبح النبي صلى الله عليه وسلم رأى الأخبية فقال: ما هذا فأخبر فقال النبي صلى الله عليه وسلم آلبر ترون بهن فترك الاعتكاف ذلك الشهر ثم اعتكف عشراً من شوال.

(رواه البخاري، رقم: ۲۰۳۳، باب اعتكاف النساء)۔

ازواجِ مطہرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کی خاطر اجتماعی اعتکاف کے لیے مسجد میں خیمے لگائے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درج ذیل چند وجوہات کی بنا پر اس کو پسند نہیں فرمایا۔

عمدۃ القاری میں مرقوم ہے:

وقال القاضي عياض: إنما قال هذا الكلام إنكاراً لفعلهن لأنه خاف أن يكن مخلصات في الاعتكاف بل أردن القرب منه المباهات به ولأن المسجد يجمع الناس ويحضره الأعراب والمنافقون وهن محتاجات إلى الدخول والخروج فيبتذلن بذلك ولأنه إذا رآهن عنده في المسجد فصار كأنه في منزله بحضوره مع أزواجه وذهب المقصود من الاعتكاف وهو التخلي عن الأزواج ومتعلقات الدنيا أو لأنهن ضيقن المسجد بأخبيتهن ونحوها. (عمدة القاری: ۲۷٦/۸، ط: ملتان)۔

(وكذا في فتح الباري: ۲۷٦/۴ وفي شرح الزرقاني: ۲۸۱/۲، ط: بيروت، وشرح النووي على مسلم: ٦۹/۸، ط: بيروت)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

معتکف کا بیماری کے عذر سے ہسپتال جانے کا حکم:

سوال: ایک شخص سنت اعتکاف میں تھا اور بیمار ہوگیا، اس کے گھر والے اس کو ہسپتال لے گئے، تو اس کا مسنون اعتکاف ٹوٹ گیا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسجد سے نکلنے کی وجہ سے اس شخص کا اعتکاف فاسد ہوگیا، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک اگر نصف یوم سے کم مسجد سے باہر رہا تو اعتکاف فاسد نہیں ہوا، محقق ابن ہمامؒ نے اس قول کو استحسان بالضرورۃ کہہ کر اس کی ترجیح کی طرف اشارہ کیا ہے اور امام سرخسیؒ نے اس قول کو ایسر علی المسلمین بتایا ہے، بنابریں عوام الناس کے اعتکاف کی حفاظت کے لیے اس قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔
ملاحظہ ہو فتح القدیر میں مرقوم ہے:

قوله وهو الاستحسان ، يقتضي ترجيحه لأنه ليس من المواضع المعدودة التي رجح فيها القياس على الاستحسان ، ثم هو من قبيل الاستحسان بالضرورة ، كما ذكره المصنف... الخ. (فتح القدير: ۲/ ۳۹٦، ط: دار الفكر).

وللاستزادة راجع : (المبسوط للامام السرخسي : ۳/ ۲۱٤، ط: بيروت، والجوهرة النيرة ، باب الاعتكاف).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

اگر مجبوراً نکلنا پڑ رہا ہے تو گنہگار نہ ہوگا اور صاحبینؒ کے مسلک کے مطابق اگر نصف یوم سے زیادہ باہر نہ رہے تو اعتکاف فاسد نہ ہوگا، ایسی مجبوری کی حالت میں اس مسلک پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۲۱۱/۵)۔
مفتی سعید پالنپوری صاحب فرماتے ہیں:

اگر معتکف عذر کے بغیر مسجد سے نکل گیا تو امام اعظمؒ کے نزدیک فوراً اعتکاف ٹوٹ جائیگا اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر اکثر دن مسجد سے باہر رہا تو ٹوٹ جائیگا اور آدھے دن سے پہلے لوٹ آیا تو اعتکاف باقی رہے گا، اور امام محمدؒ نے امام اعظمؒ کے قول کو قیاس کے مطابق اور امام ابو یوسفؒ کے قول کو گنجائش والا قول قرار دیا لہذا

لوگوں کو امام اعظمؒ کے قول کے مطابق مسئلہ بتانا چاہئے، لیکن اگر کوئی مسجد سے نکل گیا اور نصف یوم سے پہلے واپس آ گیا تو امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق فتوی دینا چاہئے اور آئندہ کے لیے مسجد سے نہ نکلنے کی تاکید کرنی چاہئے۔ (تحفۃ الالمعی: ۱۸۲/۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

چند متفرق مسائل:

مسئلہ: (۱) آٹے کی مشین میں کام کرنے والے کے منہ اور حلق میں جو آٹا بے اختیار چلا جاتا ہے اس سے روزہ نہیں جاتا۔ **قال في الجوهرة : وإن دخل حلقه غبار الطاحونة أو غبار العدس و أشباهه أو الدخان أو ما سطع من غبار التراب بالريح أو بحوافر الدواب لم يفسد صومه لأن هذا لايمكن الاحتراز عنه .** (الجوهرة النيرة ،١٦٩،كتاب الصوم ، امدادیه).

(وكذا في الفتاوى الهندية: ٢٠٣/١، وحاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ،ص:٦٦٠، قديمي، وعمدة الفقه:٢٦٤/٣ ،ط:مجددیه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مسئلہ: (۲) خوشبو سونگھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن قصداً عود وغیرہ کے دھویں لینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ **قال في مراقي الفلاح : لا يكره للصائم شم رئحة المسک ، والورد ونحوه ...ومن أدخل بصنعه دخاناً حلقه بأي صورة كان الإدخال فسد صومه سواء كان دخان عنبر أو عود أو غيرهما حتى من تبخر ببخور فآواه إلى نفسه واشتم دخانه ذاكراً لصومه أفطر لإمكان التحر زعن إدخال المفطرجوفه و دماغه.** (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي،ص٦٥٩، ٦٦٠،قديمي).

واللہ ﷻ اعلم۔

مسئلہ: (۳) اگر لیڈی ڈاکٹر رحم کی صفائی کیلئے آلات استعمال کرے یا ڈاکٹر پیشاب یا معدہ کی نالی صاف کرنے کے لیے آلات استعمال کرے اور عموماً ان پر تیل یا ویزلین یا چکناہٹ لگاتے ہیں تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن فسادِ صوم کا حکم اس وقت لگایا جائے گا جب کہ تری یا دوائی موضع حقنہ تک پہنچ جائے۔

قال في البحر الرائق : وفي الظهيرية : ولو أدخل خشبة أو نحوها وطرفاً منها بيده لم يفسد صومه ، قال في البدائع: وهذا يدل على أن استقرار الداخل في الجوف شرط لفساد

الصوم وكذا لو أدخل أصبعه في استه أو أدخلت المرأة في فرجها هو المختار إلا إذا كانت الأصبع مبتلة بالماء أو الدهن فحينئذٍ يفسد لوصول الماء أو الدهن . (البحرالرائق: ۲/ ۲۷۹،باب مایفسدالصوم ومالایفسده،ط: کوئٹه) . (وكذا فی الفتاوی الهندية: ۱/ ۲۰٤، وفتاویٰ محمودیه : ۱۰/ ۱٤۳، وجدید فقهی مسائل: ۱/ ۱۸۳، واحسن الفتاویٰ: ٤/ ٤٤۷).

قال في الشامية: قوله : و لو مبتلة فسد ، لبقاء شيء من البلة في الداخل وهذا لو أدخل الأصبع إلى موضع المحقنة . (فتاوی الشامی:۲/ ۳۹۷،سعید).

(وكذا في مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوی، ص٦٧٦،ط:قديمي، والنهرالفائق:۲/ ۲٤،قديمي، والدر المختار:۲/ ۳۹۷،سعید، وخلاصة الفتاوی). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مسئلہ: (۴) اگرڈاکٹرنے کسی مریض کے مقعد کے راستے میں دواڈالی اوروہ مقامِ حقنہ تک پہنچ گئی جومقعد کےسوراخ سے چارانگلیوں کے برابراوپر ہےتوروزہ ٹوٹ گیاورنہ نہیں ٹوٹا۔

مسئلہ: (۵) بواسیر کے مسوں کودھونے کے بعد چڑھایایادوالگائی توروزہ نہیں ٹوٹا کیونکہ یہ چار سے پانچ یا چھ انگلیوں کی بالائی سے نیچے ہوتے ہیں۔دلائل (مسئلہ۴و۵):

قال في الدر المختار: ولو بالغ في الاستنجاء حتى بلغ موضع الحقنة فسد وهذا قلما يكون ولوكان فيورث داء عظيماً .

وفي الشامية: قوله حتى يبلغ موضع الحقنة ، هي دواء يجعل في خريطة من أدم يقال لها المحقنة ، ثم في بعض النسخ المحقنة بالميم وهي أولى، قال في الفتح : والحد الذى يتعلق بالوصول إليه الفساد قدر المحقنة ، أى قدر ما يصل إليه رأس المحقنة التي هي آلة الاحتقان وعلى الأول فالمراد الموضع الذى ينصب منه الدواء إلى الأمعاء . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۲/ ۳۹۷،باب مایفسدالصوم،سعید).

(وكذا في البحرالرائق: ۲/ ۲۹۹،دارالمعرفة،والفتاوی الهندية:۱/ ۲۰٤).

قال العلامة ظفر أحمد التهانویؒ: قلت: وبثور البواسير التى تخرج وقت الاستنجاء إنما تكون داخلة قدر الأصبع والقدر الذي يصل إليه رأس المحقنة هوخمسة أصابع إلى

ستة لا يكون أقل من ذلك كما أفاده الطبيب الحاذق القاضي بشير الدين اللكنوي فالبلة الكائنة على تلك البثور لا تبلغ قدر المحقنة أصلاً فلزم القول بعدم فساد الصوم بتلك البلة والله أعلم ، وقول الدر : ولو الأصبع مبتلة فسد قيد الشامي بما لو أدخل الأصبع إلى موضع المحقنة . (۱٥۸/۲). (امدادالاحکام:۱۲۸/۲)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:(٦) دل کا مریض اگر مجبوری کی وجہ سے زبان کے نیچے گولی رکھے اور دوا کا لعاب حلق سے نیچے نہ اترے تو روزہ نہیں گیا۔

قال في الشامية : قوله كره مضغ علك... أنه معلل بعدم الوصول ، فإن كان مما يصل عادة حكم بالفساد لأنه كالمتيقن . (فتاوى الشامي: ٤١٦/٢، سعيد).

ہاں چونکہ صورتِ مسئولہ میں مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا ہے اس لیے کراہت بھی نہیں ہوگی۔

(۷) جو دوا بھاپ کے ذریعہ مشین یا دیہاتی طریقہ پر اندر کھینچ لے تو روزہ فاسد ہو جائیگا۔

قال في مجمع الأنهر: من تبخر ببخور فاستشم دخانه فأدخله حلقه ذاكراً لصومه أفطر . (مجمع الانهر: ۳٦۱/۱).

مزید ملاحظہ ہو: (مریض ومعالج کے اسلامی احکام،ص۱٦۸)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

روزہ دار بیوی کے ساتھ ہم بستری سے کفارہ کا حکم:

سوال: ایک شخص رمضان میں دن کے وقت دبئی سے آیا اس نے سفر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا تھا دوپہر کو اپنے کمرہ میں آرام کرنے کے لیے گیا جب روزہ دار بیوی اس کے پاس گئی، تو اس نے بوس کنار کے بعد اس کے ساتھ ہم بستری کی شوہر کا روزہ نہیں تھا، بیوی پر قضا ہے یا کفارہ ہے یا دونوں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر بیوی نے شوہر کے ساتھ رضامندی سے ہم بستری کی تھی تو اس پر قضا اور کفارہ دونوں ہیں اور اگر شوہر نے زبردستی کی تھی (زبردستی ابتداء میں ہو یا آخر تک ہو) تو بیوی پر صرف قضا ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

من جامع عمداً في أحد السبيلين فعليه القضاء والكفارة ولايشترط الإنزال في المحلين كذا في الهداية وعلى المرأة مثل ما على الرجل إن كانت مطاوعة وإن كانت مكرهة فعليها القضاء دون الكفارة وكذا إذا كانت مكرهة في الابتداء ثم طاوعته بعد ذلک كذا في فتاوى قاضيخان. (الفتاوی الهندية: ۱/ ۲۰۵، النوع الثانی مایوجب القضاء والکفارة).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ابواب الحج سے متعلق متفرق مسائل:

حالتِ احرام میں سلی ہوئی لنگی استعمال کرنے کا حکم:

سوال: بعض حضرات کھلی ہوئی چادر استعمال کرنے کے عادی نہیں ہوتے اور حالتِ احرام میں اکثر ستر کھلنے کا قوی اندیشہ رہتا ہے تو کیا ایسے حضرات کے لیے سلی ہوئی لنگی استعمال کرنے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حالتِ احرام میں جو سلے ہوئے کپڑے پہننا ممنوع ہے اس سے مراد وہ لباس ہے جو پورے بدن یا بدن کے کسی عضو کے مطابق بنا ہوا ہو اور سلائی یا بنائی کے ذریعہ یا کسی اور طریقہ سے بدن یا کسی عضو کا احاطہ کرلے اور اس کو معمول کے مطابق پہنا جائے اور یہ بات لنگی میں نہیں ہے بنابریں لنگی کا استعمال حالتِ احرام میں جائز ہوگا، البتہ چونکہ سلے ہوئے کے ساتھ کچھ مشابہت ہوتی ہے اس لیے حالتِ احرام میں لنگی کا استعمال خلافِ اولیٰ کے قبیل سے ہوگا۔

قال العلامة الملا علی القاری في شرح اللباب : وعقد الإزار والرداء أی ربط طرف أحدهما بطرف الآخر، وأن يخله أی كل واحد منهما بخلال كنحو إبرة ، وشدهما بحبل ونحوه من رباط ومنطقة . (شرح اللباب ،ص۱۳۳،فصل فی مکروهات الاحرام ،ط:بیروت)۔

قال فی الدر المختار: فإن زرره أو خلله أو عقده أساء ولا دم عليه . وقال في فتاوى الشامي: وكذا لو شده بحبل ونحوه لشبهه حينئذٍ بالمخيط . (الدر المختار مع فتاوی الشامی: ۲/۴۸۱، سعید).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

ستر کھلنے کا اندیشہ ہوتو احرام کی چادر سی لینے کی گنجائش ہے، بلاضرورت سینا مکروہ ہے، غنیۃ الناسک میں ہے: **عقد الإزار والرداء بأن يربط طرف أحدهما بطرفه الآخر شرح وأن يخلله بخلال أو**

یشده بحبل و نحوه .

(غنية الناسك ،ص ٤٧ ، فصل في مكروهات الاحرام ومحظوراته التي لا جزاء فيها سوى الكراهة).

معلم الحجاج میں ہے: مسئلہ: تہبند کے دونوں پلوں کو آگے سے سینا مکروہ ہے اگر کسی نے ستر عورت کی خاطر حفاظت کی وجہ سے سی لیا تو دم واجب نہ ہوگا۔(معلم الحجاج ص ۱۲۸، مکروہاتِ احرام) فقط واللہ اعلم بالصواب۔(فتاویٰ رحیمیہ: ۴/ ۲۰۶، ط: دیوبند)۔

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

اگر چادر کو گرہ لگائی یا تہبند کو رسی کے ساتھ ایک دن تک باندھے رکھا تو یہ مکروہ ہے کیونکہ یہ سلے ہوئے کپڑے کے مشابہ ہو جاتا ہے اور اس پر کچھ جزا واجب نہیں ہوگی اس لیے کہ اس طرح کپڑے کا سلائی کے ساتھ بدن کو محیط ہونا نہیں پایا جاتا۔(عمدۃ الفقہ: ۴/ ۴۹۴)۔

دوسری جگہ مذکور ہے:

حلبیؒ نے اپنے مناسک میں ذکر کیا ہے کہ اس کا اصول یہ ہے کہ جو لباس انسان کے تمام بدن یا بدن کے بعض حصے کے موافق بنایا گیا ہو اس طرح پر کہ وہ سلائی کے ذریعہ یا بعض حصوں کو بعض حصوں کے ساتھ چپکانے سے یا کسی اور طرح سے (مثلاً بنائی سے) کل بدن یا بدن کے بعض حصہ کو ڈھانپ لے اور وہ خود بخود جسم پر ٹھہرا رہے ایسا لباس احرام کی حالت میں پہننا منع ہے۔(عمدۃ الفقہ: ۴/ ۱۳۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حج میں جمع بین الصلاتین کے درمیان تکبیر تشریق کا حکم:

سوال: حجاجِ کرام عید الاضحیٰ کی شب میں مزدلفہ میں مغرب وعشاء جمع کرتے ہیں، اور مسئلہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان سنتیں نہیں ہیں تو کیا تکبیر تشریق، تلبیہ وغیرہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق دونوں نمازوں کے درمیان سنن ونوافل پڑھنے کی ممانعت ہے اور ہر ایسے کام کی ممانعت ہے جس سے خلل واقع ہوتا ہو اور عرفاً فصل سمجھا جاتا ہو، لیکن معمولی فصل مستثنیٰ ہے اس میں کوئی حرج نہیں بنابریں تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے اور تلبیہ پڑھنا سنت ہے۔ کیونکہ اس سے

معمولی فصل ہوتا ہے۔فقہاء کی عبارات ملاحظہ کیجئے:

قال في الدر المختار: ولم يصل بينهما شيئاً على المذهب. وقال في فتاوى الشامي: أى ولا السنة الراتبة قال فى اللباب : وإن أخر الإمام صلاة العصر لا يكره للمأموم التطوع بينهما إلى أن يدخل الإمام فى العصر، قوله على المذهب ، وهو ظاهر الرواية ، شرنبلالية ، وهو الصحيح فلو فعل كره وأعاد الأذان للعصر لانقطاع فوره فصار كالاشتغال بينهما بفعل آخر بحر أى كأكل وشرب فإنه يعيد الأذان سراج ، وما فى الذخيرة والمحيط والكافى من استثناء سنة الظهر فخلاف الحديث وإطلاق المشايخ ، فتح ،

[تنبيه] أخذ من هذا العلامة السيد محمد صادق بن أحمد بادشاه أنه يترك تكبير التشريق هنا، وفى المزدلفة بين المغرب والعشاء لمراعاة الفورية الواردة فى الحديث ، كمانقله عنه الكازروني في فتاواه .

قلت: وفيه نظر فإن الوارد فى الحديث" أنه صلى الله عليه وسلم صلى الظهر ثم أقام فصلى العصر ولم يصل بينهما شيئاً " ففيه التصريح بترك الصلاة بينهما ولا يلزم منه ترك التكبير ولا يقاس على الصلاة لوجوبه دونها ولأن مدته يسيرة حتى لم يعد فاصلاً بين الفريضة والراتبة .

والحاصل : أن التكبير بعد ثبوت وجوبه عندنا لا يسقط هنا إلا بدليل وما ذكر لايصلح للدلالة كما علمته هذا ما ظهر لي والله أعلم. (فتاوى الشامي: ۲/ ۵۰٤،سعيد).

غنية الناسك میں مرقوم ہے:

ولا يشتغل بشيء آخر من أكل وشرب وغيرهما إلا أنه يأتى بتكبير التشريق مرة عند قيامه للعشاء بوجوبه ضياء الأبصار فإن تطوع أو تشاغل بما يعد فصلاً فى العرف كره .

(غنية الناسك ،ص۸۷،باب احكام المزدلفة ،ط: ادارة القرآن،کراتشی)۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ زبدۃ المناسک میں فرماتے ہیں:

مسئلہ: امام کے ساتھ ظہر وعصر کو ایک اذان دو تکبیر کے ساتھ ظہر کے وقت اکٹھا پڑھے اور بیچ میں ظہر اور عصر کے کچھ نہ پڑھے دو رکعت سنت بھی ترک کرے، مگر تکبیراتِ تشریق کہہ لے۔(زبدۃ المناسک ص۱۵۹، وقوفِ عرفہ کا بیان، ط: مکتبہ اشرفیہ، بمبئی)۔

وللمزيد ينظر: (إرشاد الساري إلى مناسك الملا علي القاري للشيخ عبد الغني المكي الحنفي، ص ۲۱۴-۲۱۶، فصل في الجمع بين الصلاتين بعرفة، ط: بيروت). **واللہ ﷻ اعلم۔**

حرمین شریفین میں تہجد کی جماعت میں شرکت کا حکم:

سوال: حرمین شریفین میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں نمازِ تراویح کے بعد تقریباً نصف شب کے بعد نمازِ تہجد با جماعت ہوتی ہے، اور متونِ معتبرہ میں مسئلہ مرقوم ہے کہ نفل کی جماعت مکروہ ہے تو کیا احناف اس جماعت میں شرکت کر سکتے ہیں؟ بعض حضرات شدت سے منع کرتے ہیں، جبکہ بعض حضرات حضرت مدنیؒ کا حوالہ دیکر شرکت کی اجازت دیتے ہیں۔ مذہب احناف میں قولِ فیصل کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مذہب احناف میں اصح قول کے مطابق نفل نماز با جماعت پڑھنا مکروہ ہے، متونِ معتبرہ میں یہی مرقوم ہے، نیز ہمارے اکثر اکابرؒ کا فتویٰ بھی اسی کے مطابق ہے۔ البتہ علامہ شامیؒ کا رجحان اس طرف ہے کہ مکروہ سے مراد مکروہِ تنزیہی ہے یعنی خلافِ اولیٰ کے قبیل سے ہے، بنابریں حرمین شریفین میں تہجد کی جماعت میں شرکت کرلیں تو کوئی حرج نہیں، خصوصاً معتکفین کے لیے شریک ہونے میں راحت ہے۔

علامہ شامیؒ کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

والنفل بالجماعة غير مستحب لأنه لم تفعله الصحابة في غير رمضان، وهو كالصريح في أنها كراهة تنزيه، تأمل. (فتاوى الشامي: ۲/۴۹، مطلب في كراهة الاقتداء، سعيد).

بعض دیگر کتبِ فقہ سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ رمضان کے علاوہ میں نفل کی جماعت مستحب نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو الجوہرۃ میں ہے:

قوله: ولا يصلي الوتر في جماعة في غير شهر رمضان، لأنه لم يفعله الصحابة رضي

اللہ تعالیٰ عنهم بجماعة في غير شهر رمضان ...وفی الینابیع : إذا صلى الوتر مع الإمام في غير رمضان يجزئه ولا يستحب ذلک ، والله أعلم ۔(الجوهرة النيرة:۱/ ۳۹۱،باب قيام شهر رمضان).

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا تفصیلی فتویٰ ملاحظہ کیجئے:

الجواب: فتح القدیر جلدِ اول کتاب الاستسقاء ص ۳۳۸ میں ہے: **وقد صرح الحاكم أيضاً في باب صلاة الكسوف من الكافي بقوله : و يكره صلاة التطوع جماعة خلا قيام رمضان وصلاة الكسوف هذا خلاف ما ذكر شيخ الإسلامؒ** ، جلد أول ردالمحتار ص ۲۲۳ میں ہے: **قلت ويؤيده أيضاً ما فی البدائع من قوله إن الجماعة فی التطوع ليست بسنة إلا في قيام رمضان (وفيه) والنفل بالجماعة غير مستحب لأنه لم يفعله الصحابة ﷺ في غير رمضان .**

مذکورہ بالا نصوص میں قیامِ رمضان کی تصریح فرمائی گئی ہے اس کی تخصیص تراویح کے ساتھ نہیں کی گئی ہے چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیسری شب میں اور صحابہ کرام سے آخر شب تک نوافل با جماعت منقول ہیں جیسا کہ موطا امام مالک وغیرہ میں بکثرت مروی ہے اس لیے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھی جائیں مراد ہوں گی خواہ تراویح میں خواہ تہجد میں اوائل شب میں ہوں یا اواخر میں سب میں جماعت کی اجازت ہوگی۔

موطا امام محمدؒ ص ۱۱۱ میں ہے: **قال محمدؒ : بهذا نأخذ لا بأس بالصلاة في شهر رمضان أن يصلى الناس تطوعاً بإمام لأن المسلمين قد أجمعوا على ذلک . الخ. فتح الباری جلد رابع ص ۲۱۷ باب فضل من قام فی رمضان** میں ہے : **أی قام لياليه مصلياً والمراد من قيام الليل ما يحصل به مطلق القيام كما قدمناه فی التهجد سواء وذكر النووی أن المراد بقيام رمضان صلاة التراويح أنه يحصل بهذا المطلوب من القيام لا أن قيام رمضان لا يكون إلا بها وأغرب الكرماني، فقال: اتفقوا على أن المراد بقيام رمضان صلاة التراويح الخ .**

عینی شرح بخاری ج۵ ص ۳۵۴ میں ہے: **قال الكرماني: اتفقوا على أن المراد بقيام الليل صلاة التراويح قلت : قال النووی : إن المراد بقيام رمضان صلاة التراويح ولكن**

الاتفاق من أين أخذه بل المراد من قيام الليل ما يحصل به مطلق القيام سواء كان قليلاً أو كثيراً ، وقال العيني، في الجلد الأول ص ۲۳۳ من كتاب الإيمان من عمدة القارى ما نصه: ومعنى من قام رمضان من قام بالطاعة في ليالي رمضان ويقال : يريد صلاة التراويح وقال بعضهم: لايختص ذلک بصلاة التراويح بل في أى وقت صلى تطوعاً حصل له ذلک الفضل . الخ .

نصوص مذکورہ بالا سے امورِ ذیل معلوم ہوتے ہیں (۱) جماعت نوافل کی کراہت مطلقاً نہیں ہے بلکہ اس سے کچھ مستثنیات بھی ہیں (۲) مستثنیات میں لفظ قیامِ رمضان اور کسوف کو ذکر کیا گیا (۳) امام محمد وحاکم وصاحبِ بدائع وغیرہ متقدمین نے لفظ قیام رمضان ذکر فرمایا ہے جو مخصوص بالتراویح نہیں ہے (۴) قیامِ رمضان کو مخصوص بالتراویح قرار دینا قولِ مرجوح ہے جو کہ علامہ کرمانی اور علامہ نووی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے اس کے خلاف حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور امام عینیؒ تمام نوافل کو خواہ تراویح ہو یا تہجد ہو یا دیگر نوافل فرمارہے ہیں اور امام نووی کے قول کو مؤول قرار دیتے ہوئے اپنے قول کی طرف لوٹاتے ہیں اور کرمانی کے قول کو غریب اور مخدوش قرار دیتے ہیں اور یہ امر مدلول مطابقی بھی ہے،... پس رمضان کے جملہ نوافل کی جماعت خواہ بالتداعی ہو یا بلا تداعی سب کی سب ماذون فیہ بلکہ مستحب ہوگی اور تحت ترغیب " من قام رمضان "الحدیث داخل ہوگی۔اس پر نکیر کرنا غیر صحیح ہوگا بلکہ جملہ طاعات طواف، نفل یا عمرہ وغیرہ اسی میں محسوب اور مرغوب فیہ قرار دیئے جائیں گے کماذکرہ العینی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ہم نے قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ العزیز کا عمل بھی مکہ معظّمہ میں اسی پر پایا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ العزیز کا بھی یہی معمول تھا۔اور حرمین شریفین میں قدیم سے عمل سنت عشریہ وغیرہ کا جو کہ بالخصوص شوافع کا اور چالیس رکعت کا عمل جو کہ موالک کا معمول بہ تھا اور اہل مکہ کا قدیمی عمل ہر ترویحہ پر اسبوع طواف اس کا مؤید ہے، واللہ اعلم ۔(مخطوطاتِ مبارکہ ص ۱۰۳)،(فتاوی شیخ الاسلام ص ۴۳۔۴۵، بعنوان: رمضان میں تہجد کی جماعت)۔

کتاب المسائل میں مفتی سلمان منصور پوری صاحب رقمطراز ہیں:

تراویح کے علاوہ نفل نماز (مثلاً تہجد وغیرہ) کی جماعت کرنا مکروہِ تنزیہی ہے؛ البتہ اگر مقتدی ۲،۳ ہوں تو کوئی کراہت نہیں۔ **والنفل بالجماعة غير مستحب لأنه لم تفعله الصحابة في غير رمضان وهو كالصريح في انها كراهة تنزيهة.** (شامي زكريا: ۲/ ۵۰۰، بيروت، و ۲/ ۴۳۷، هنديه: ۱/ ۸۴) **وإن كان متطوعاً فالجماعة فيه مكروهة كراهة تنزيهية إلا في شهر رمضان.** (حاشية العلامة ابي الوفاء الافغاني على كتاب الآثار: ۱/ ۲۴۸). (کتاب المسائل: ۱/ ۴۱۶، ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب رقمطراز ہیں:

رہا مسئلہ رمضان کا تو اس بارے میں فقہاء کی تصریح یہ ملتی ہے کہ رمضان میں وتر اور نوافل وتطوعات باجماعت اہتمام کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے، اب بعض علماء کی رائے عام اصول کے پیش نظر یہ ہے کہ یہاں نوافل وتطوع سے مراد صرف تراویح ہے، دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس میں تہجد بھی شامل ہے، اس لیے بعض اکابر علماء کا معمول رمضان میں تہجد کی نماز باجماعت ادا کرنے کا رہا ہے، علماء کا اختلاف رحمت ہے، اس لیے ہمارے لیے دونوں راہیں کھلی ہیں، چاہے رمضان میں تہجد کی نماز باجماعت ادا کریں یا تنہا تنہا۔

اس کے بعد بطورِ خلاصہ چند امور مذکور ہیں:

۲۔ رمضان المبارک میں تہجد کی نماز میں جماعت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر کچھ لوگ پسند نہ کریں اور وہ گھر پر یا مسجد میں اپنی نماز تنہا ادا کریں تو انھیں برا کہنا یا مطعون قرار دینا بہت بری بات ہے۔ ۳...... رمضان میں تہجد کی جماعت سے روکنا مناسب نہیں ہے۔ ۴...... رمضان کی حد تک میری رائے میں امام تہجد کی امامت کریں تو کوئی حرج نہیں۔ (فتاویٰ قاضی، ص ۶۹-۷۰)۔

فتاویٰ دار العلوم دیوبند (جلد ۴ ص ۲۲۳، کبیر) میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے تداعی کے ساتھ نفل کی جماعت کو مکروہِ تحریمی تحریر فرمایا ہے اس پر مفتی ظفیر الدین صاحبؒ نے حاشیہ میں حضرت مدنیؒ کا موقف نقل کرنے کے بعد فرمایا: مفتی علام نے بدعت کے لفظ کی وجہ سے مکروہ تحریمی لکھدیا جیسا کہ پہلے مسئلہ میں انھوں نے بحث کی ہے لیکن علامہ شامیؒ نے بدائع وغیرہ کی جو عبارت نقل کی ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ سنت واستحباب کے خلاف ہے چنانچہ اخیر میں وہ خود لکھتے ہیں: "**وهو كالصريح في أنها كراهة**

تنزيهية" لیکن اگر تہجد کو نوافل رمضان میں شمار کیا جائے اور یقیناً وہ نوافل ہی ہیں اور رمضان میں جماعت کر لی تو کراہت بھی نہیں۔ واللہ اعلم، ظفیر۔ (حاشیہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۴/۲۲۳، رقم الحاشیہ ۲، ط: دار الاشاعت)۔

پہلے موقف (مکروہِ تحریمی) کے دلائل کے لیے ملاحظہ کیجئے: (فقہی مقالات، جلدِ دوم، از ۳۷ تا ۵۶، بعنوان؛ رمضان میں نفل کی جماعت، از شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)۔

(نوٹ: یہ مسئلہ فتاویٰ دار العلوم زکریا جلدِ دوم میں مختصراً آچکا ہے لیکن دوسرے موقف "خاص طور پر حضرت مدنیؒ کے موقف" کی وضاحت کے لیے دوبارہ ذکر کر دیا، اس کو تکرار نہ سمجھے بلکہ فائدہ جدیدہ سمجھ کر مطالعہ کیا جائے)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حجاج کا منیٰ سے خارج مزدلفہ میں قیام کرنے کا حکم:

سوال: آج کل حجاج کی کثرت کی وجہ سے اور منیٰ کے تنگ دامنی کا شکار ہونے کی وجہ سے بہت سارے خیمے مزدلفہ میں لگائے گئے ہیں تو کیا منیٰ سے خارج مزدلفہ میں قیام کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: منیٰ میں قیام سنت ہے اور خارجِ منیٰ قیام کرنے سے اگرچہ سنت ادا نہ ہوگی تاہم جگہ کی تنگی کی مجبوری کی وجہ سے مزدلفہ میں قیام کرنے کی نوبت آجائے تو درست ہے حج میں کوئی خرابی لازم نہیں آئے گی۔

ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں ہے:

ويسن أن يبيت بمنى ليالي أيام الرمي فلو بات بغيرها متعمداً كره ولا شيء عليه عندنا. (غنية الناسك، ص ٩٥، فصل في العود الى منى)۔ (وكذا في شرح اللباب للملاعلي القاري، ص ٢٦٠، ط: بيروت).

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عمداً بلا عذر کسی اور جگہ قیام کرنا مکروہ ہے لیکن عذر ہو تو کراہت نہیں ہوگی۔

عمدۃ الفقہ میں ہے:

کم از کم ۱۱/۱۲ ذی الحجہ کی راتیں منیٰ میں گزارنا سنت ہے اور منیٰ کے علاوہ کسی اور جگہ گزارنا مکروہِ تنزیہی ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۴/۴۵۲)۔

فتاویٰ علماء البلد الحرام میں مرقوم ہے:

...إذا بحثتم وتم البحث ولم تجدوا مكاناً في منى كونوا عند آخر خيمة من خيام الناس...فإن المقصود من المبيت أن يكون الإنسان عند آخر خيمة حتى يكون مع الحجيج ونظير ذلک : ما إذا امتلأ المسجد من الجماعة وصار الناس يصلون حول المسجد فإنه لا بد أن تتواصل الصفوف وأن يكون كل صف يلي الصف الآخر حتى تكون الجماعة جماعة واحدة ؛ فالمبيت نظير هذا . (فتاوى علماء البلد الحرام، ص ۹۹۱).

وللمزيد راجع : (الفتاوى المهمة، ص ۸۵۱). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

اژدحام کی وجہ سے عورتوں کی طرف سے رمی کرنے کا حکم:

سوال: ازدحام کے عذر کے پیش نظر اگر عورتیں خود رمی نہ کریں بلکہ ان کی طرف سے ان کے مرد رمی کرلیں یا اور کوئی رمی کرلے تو حج میں کوئی خلل واقع ہوگا یا نہیں؟ نیز کوئی دم وغیرہ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: حج ایک ایسی عبادت ہے کہ شریعت نے عذر وعجز اور مجبوری کے وقت پورے حج کی نیابت کو جائز قرار دیا ہے، بنابریں عذر اور عجز کی وجہ سے رمی میں نیابت بدرجہ اولیٰ درست ہوگی، پھر فقہاء کے ہاں نیابت فقط مریض اور معذور ہی کے لیے درست ہے، اور اس کی تعیین کے لیے بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں: (۱) ایسا معذور اور مریض کہ کنکری پھینکنے کی بھی طاقت نہ ہو۔ (۲) کنکری پھینکنے کی استطاعت ہو لیکن جمرات تک چلنا انتہائی دشوار اور نا قابل برداشت ہو، جبکہ آج کل جمرات کے احاطہ میں پیدل چلے بغیر چارہ نہیں۔

باقی محض اژدحام کی وجہ سے رمی میں نیابت درست نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے رمی کے اوقات میں جو وسعت رکھی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے صحیح وقت کا انتخاب کر کے اس میں بوڑھے، ضعیف اور عورتیں بآسانی رمی کا عمل انجام دے سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں مذکور ہے:

(تنبيه) قد تبين مما قدمنا أنهم جعلوا خوف الزحام عذراً للمرأة ولمن به علة أو ضعف في تقديم الرمي قبل طلوع الشمس أو تأخيره إلى الليل لا في جواز النيابة عنهم

لعدم الضرورة فلو لم يرموا بأنفسهم لخوف الزحام تلزمهم الفدية ، والله سبحانه وتعالىٰ أعلم . (غنية الناسك في بغية المناسك ،ص ۱۰۰، فصل في الترتيب بين الجمار الثلاث،ط:ادارة القرآن).

زبدۃ المناسک میں مرقوم ہے:

مسئلہ: اور عورت کو یہ جائز نہیں ہے کہ فقط اژدحام کی وجہ سے اس کی طرف سے نیابۃً رمی کرائی جائے سوا کسی اور عذر بیماری وغیرہ کے جس کی وجہ سے وہ خود رمی نہ کرسکتی ہو، اژدحام کی وجہ سے اس کے لیے جمرۃ العقبہ خواہ کسی اور دن کی رمی میں یہ تاخیر کی رخصت میں اُس کی رعایت کی گئی ہے اور مرض کی حالت میں مرد عورت دونوں کو اجازت ہے، پس عورت کو محض تنگی وہجوم کثرت لوگوں کے دوسرے سے نیابۃً رمی کرانا جائز نہیں، اگر خود جا کر رمی نہ کرے گی تو جزا لازم ہوگی۔ (زبدۃ المناسک،ص۱۸۴)۔

جدید فقہی مباحث میں مرقوم ہے:

اس بابت تمام ہی مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ مجبوری اور معذوری کے وقت رمی جمرات کے لیے دوسرے اشخاص کو نائب بنانا درست ہے، اور عذر کی حد بندی کرتے ہوئے بیشتر حضرات نے صراحت کی ہے کہ عذر کی حد یہ ہے کہ معذور شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہ ہو اور مقامِ رمی تک از خود جانے کی صلاحیت وطاقت نہ رکھتا ہو تو ایسا شخص شریعت کی نگاہ میں معذور تصور کیا جائے گا، اسی طرح تمام ہی حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ محض اژدحام جوازِ نیابت کے لیے عذر قرار نہیں پائے گا، نیز اس حکم میں مرد وخواتین سب برابر ہیں۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

حضراتِ علمائے کرام چونکہ نیابت فی الرمی کے حق میں اژدحام کو مطلقاً عذر نہیں مانتے تو اس کا لازمی مطلب یہی نکل سکتا ہے کہ ان حضرات کے یہاں اژدحام سے پیدا شدہ صورتِ حال بھی ایسا عذر نہیں ہوگا جس سے رمی میں نیابت جائز ہو جائے اسطرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ عذر جو مبیح نیابت فی الرمی ہے وہ منحصر اور مخصوص ہے بس اسی عدمِ استطاعت علی الرمی کے ساتھ۔

چنانچہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ رمی جمرہ کی جگہ گو محدود ہے مگر وقت میں وسعت ہے، اس لیے وقت کی وسعت سے فائدہ اٹھا کر اژدحام کی اذیت سے بچا جا سکتا ہے، اگر وقتِ مستحب وجواز کی رعایت نہ ہو سکے

توضعیفوں اور عورتوں کے لیے طلوعِ شمس کے قبل یا غروبِ شمس کے بعد رات میں رمی کرنے کی اجازت ہوگی، گویا ان حضرات کے یہاں اژدحام اس حد تک عذر ہے کہ وقتِ مکروہ میں رمی بلا کراہت صحیح ہو جائے گی مگر نیابت کی گنجائش بہر حال نہ ہوگی۔ (جدید فقہی مباحث: ۱۳/۲۳، و۵۵)۔

دوسری رائے:

تقریباً اکیس مقالہ نگار حضرات کا خیال ہے کہ یہ عذر بھی مبیح نیابت ہوسکتا ہے کہ جب ازدحام سے ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ اس اژدحام کے اندر کسی بھی مرض کے مریض یا بوڑھے کمزور مرد وعورت کے لیے اپنی کمزوری کے سبب قوتِ مدافعت کی کمی کی بنا پر کچل جانے، یا گر کر کسی عضو کے ٹوٹ پھوٹ جانے، یا دب جانے سے ایسی اذیتِ شدیدہ کا ظن غالب ہو جائے جو عادۃً نا قابل برداشت ہو تو ایسا ازدحام بھی ایک عذر ہوگا اور ان کے لیے رمی میں نائب بنانا جائز ہوگا۔ (جدید فقہی مباحث: ۱۳/۵۶)۔

مزید ملاحظہ کیجئے: (خیر الفتاویٰ: ۴/۱۵۸، وفتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۶/۵۵۴، باب جنایات)۔

لیکن اژدحام والا مسئلہ پرانے زمانہ میں تھا، کثرت سے حادثات رونما ہوتے تھے اور جمرات پر گویا ایک قیامتِ صغریٰ قائم ہوتی تھی، فی زماننا اژدحام والی بات نا قابل قبول ہے کیونکہ آج کل سعودیہ نے جمرات کو چند منزلوں میں تقسیم کردیا ہے اور ہر ایک منزلہ کے لیے آمد ورفت کا راستہ بھی متعین کردیا ہے جس کی وجہ سے عام طور پر اژدحام نہیں ہوتا اور بآسانی رمی کر کے واپس آسکتے ہیں۔ بنا بریں محض اژدحام کی وجہ سے نیابت درست نہیں ہوگی۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں دم واجب ہوگا۔

ہاں اگر اژدحام نا قابلِ برداشت ہو اور موت وشکست کا خطرہ ہو تو پھر نیابت درست ہوگی جیسے گزشتہ سال ۱۴۳۶ھ میں اژدحام میں بے ترتیبی سینکڑوں لوگوں کے لیے پیغامِ موت ثابت ہوئی۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حالتِ حیض میں دخولِ حرم کا حکم:

سوال: میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ ابھی مدینہ منورہ میں ہوں، گزشتہ کل سے میرا حیض شروع ہوا، جمعرات کو ہم عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ جا رہے ہیں اور مکہ مکرمہ میں پانچ دن کا قیام ہے اب میں عمرہ کس طرح

ادا کروں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: آپ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی بجائے جدہ جانے کی نیت کریں، اور جدہ میں کسی ہوٹل یا کسی رشتہ دار کے پاس کچھ دیر یا ایک دن ٹھہر کر صرف آپ بغیر احرام کے مکہ مکرمہ چلی جائیں اور دوسرے اہل خانہ مدینہ منورہ سے احرام باندھ لیں، پھر آپ مکہ مکرمہ پہونچ کر خوب ذکر وتسبیحات پڑھتی رہیں، اور اگر مکہ مکرمہ میں پاک ہو جائیں تو وہاں مسجدِ عائشہ سے احرام باندھ کر عمرہ ادا کرلیں۔

ملاحظہ ہو شرح لباب المناسک میں ہے:

ومن جاوز وقته أي الذي وصل إليه حال كونه يقصد مكاناً في الحل كبستان بني عامر أو جدة مثلاً بحيث لم يمر على الحرم و ليس له عند المجاوزة قصد أن يدخل الحرم بعد دخول ذلك المكان، ثم بدا له أي ظهور أي حارث أن يدخل مكة أي أو الحرم، ولم يرد نسكاً حينئذٍ فله أن يدخلها أي مكة وكذا الحرم بغير إحرام، وفيه إشكال إذ ذكر الفقهاء في حيلة دخول الحرم بغير إحرام أن يقصد بستان بني عامر ثم يدخل مكة، وعلى ماذكره المصنفّ وقررناه لم تحصل الحيلة كما لايخفىٰ، فالوجه في الجملة أن يقصد البستان قصداً أوّلياً ولايضره قصده دخول الحرم بعده قصداً ضمنياً أوعارضياً، كما إذا قصد مدني جدة لبيع وشراء أو لا، ويكون في خاطره أنه إذا فرغ منه أن يدخل مكة ثانياً. (لباب المناسك مع شرحه: ص٩٦، بيروت۔ وغنية الناسك: ٣٢).

ارشاد الساری میں ہے:

قال في ردالمحتار عند قول صاحب الدر: وهذه حيلة الآفاقي يريد دخول مكة بلا إحرام، ثم إن هذه الحيلة مشكلة، لما علمت من أنه لا يجوز له مجاوزة الميقات بلا إحرام ما لم يكن أراد دخول مكان في الحل لحاجة، وإلا فكل آفاقي يريد دخول مكة لا بد أن يريد دخول الحل .... قال العلامة الرافعي في تقريره: قوله: لكن ينافيه قولهم ثم بدا له دخول مكة الخ، يندفع الإشكال في هذه المسئلة بأن المجوز لدخول مكة غير محرم أحد

أمرين: الأول: أن يقصد الحل لحاجة، ثم يبدو له دخول مكة، وهذا ما ذكره في الكافي واللباب والبدائع. والثاني: أن يقصد دخول الحل قصداً أوّلياً مع قصد دخول مكة قصداً ضمنياً، وهو ما أشار له في البحر، وذكره في شرح اللباب، وهو مرادهم بالحيلة. (ارشاد الساری الی مناسك الملا علی القاری علی هامش شرح اللباب:۹۷، فصل فی مجاوزة الميقات بغيراحرام ، بيروت).

غنیۃ الناسک میں ہے:

وعن هذا قيل: إن حيلة آفاقي يريد دخول مكة لحاجة بلا إحرام أن يقصد البستان لكن لا تتم الحيلة إلا لمن يقصد البستان قصداً أوّلياً بحيث لا يكون سفراً إلا لأجله. (غنية الناسك فی بغية المناسك :۳۲، مطلب دخول الآفاقي الحل لحاجة).

حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا عمرہ حیض کی وجہ سے باقی رہ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مقامِ تنعیم جا کر احرام باندھ کر عمرہ ادا کرلے۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في أشهر الحج...قالت: فدخل عليّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم وأناْ أبكي فقال: مايبكيك ياهنتاه! قلت: سمعت قولك لأصحابك فمُنِعتُ العمرة قال: وما شأنك قلت: لا أصلي، قال فلا يضرك...حتى نزل المحصب ونزلنا معه فدعا عبد الرحمن بن أبي بكر رضي الله عنه فقال: اخرج بأختك من الحرم فلتهل بعمرة ثم افرغا ثم ائتيا هاهنا فإني انتظركما...الخ. (رواه البخاری:۱/۲۱۲، كتاب المناسك،ط:فيصل).

حضرت شاہ صاحبؒ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أمرها النبي صلى الله عليه وسلم بعد الحج أن تعتمر من التنعيم . (فيض البارى : ۸۵/۳، كتاب المناسك). واللہ تعالیٰ اعلم۔

حج میں نیت تبدیل کرنے کا حکم:

سوال: (الف) ایک شخص حج کے لیے آیا میقات سے اس نے قران کا احرام باندھا بعد میں مکہ مکرمہ

پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس کے ساتھیوں نے تمتع کا احرام باندھا ہے تو اس نے طواف شروع کرنے سے پہلے تمتع کی نیت کر لی، اب اس کا کیا حکم ہے؟ (ب) اسی طرح ایک شخص نے تمتع کا حرام باندھا اور عمرہ کا طواف کرنے سے پہلے قران کی نیت کر لی تو درست ہے یا نہیں؟ (ج) نیز آفاقی قران یا تمتع کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد افراد کی نیت کر سکتا ہے یا نہیں؟ (د) نیز افراد کی نیت سے احرام باندھ کر قران یا تمتع کرنا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حج قران کی نیت کرنے کے بعد تمتع یا افراد کی نیت کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے خواہ طوافِ عمرہ شروع کرنے سے پہلے نیت کرے یا بعد میں۔

(الف) صورتِ مسئولہ میں قارن نے تمتع کی نیت کر لی اور عمرہ کے بعد حلق کرالیا تو اس پر دو دم واجب ہو گئے پھر بھی حج کے احرام سے نہیں نکلا پھر اگر ایامِ حج شروع ہونے پر حج کا احرام باندھا تو دو حج کا احرام ہوا اور افعال شروع کرنے سے ایک حج چھوٹ گیا، بنابریں رفضِ حج کی وجہ سے تیسرا دم لازم ہوا اور آئندہ سال ایک حج اور عمرہ کی قضا لازم ہوگی۔

بشرطیکہ حج قران کے احرام کے دوران حلق کرانے کے بعد دیگر جنایات کا مرتکب نہ ہوا ہو۔

شرح اللباب میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

وهذه أفعال العمرة بكمالها إلا أنه ممنوع من التحلل عنها لكونه محرماً بالحج معها فيتوقف تحلله على فراغه من أفعاله أيضاً...ثم يقيم حراماً أي محرماً لأن أوان تحلله يوم النحر، فإن حلق يكون جنايته على إحرامين لما في المحيط والمنتقى عن محمد، فإن طاف لعمرته ثم حلق فعليه دمان، ولا يحل من عمرته بالحلق. (شرح اللباب، ص۲۸۹، فصل في بيان اداء القران، ط: بيروت).

قال في الدر المختار: فلو حلق لايحل من عمرته ولزمه دمان. وفي الشامية: قوله بلا حلق، لأنه وإن أتى بأفعال العمرة بكمالها إلا أنه ممنوع من التحلل عنها لكونه محرماً بالحج ...قوله ولزمه دمان لجنايته على إحرامين، بحر وهو الظاهر. (الدر المختار مع ردالمحتار: ۲/۵۳۲، باب القران، سعيد).

وقال فی شرح اللباب: فعليه ثلاثة دم للرفض فإنه يرفض إحداهما، ويمضی فی الأخری، ويقضی حجة وعمرة مكان التی رفضها. (شرح اللباب، ص۳۲۲).

زبدۃ المناسک میں ہے:

مسئلہ: پھر جب طواف کرے تو اول طواف عمرہ کا کرے رمل اضطباع کے ساتھ پھر سعی عمرہ کی کرے اور حلق نہ کرے کہ احرامِ حج میں ہے، اگر حلق کر بھی لیا تو بھی حلال نہ ہوگا اور (اس حلق کرنے کی وجہ سے) دو دم جنایت اور دو دم احرام کے دینے واجب ہوں گے۔ (زبدۃ المناسک، ص۲۹۳، قران کا بیان)۔

(ب) بصورتِ مسئولہ تمتع کی نیت سے آنے والے شخص نے طوافِ عمرہ کے اکثر چکر لگانے سے پہلے قران کی نیت کر لی تو اس کا قران صحیح ہوگیا، ہاں عمرہ کا طواف مکمل کرنے یا اکثر چکر لگانے کے بعد قران کی نیت درست نہیں ہوگی۔ ملاحظہ ہو ملا علی قاریؒ شرحِ لباب میں فرماتے ہیں:

فصل في شرائط صحة القران، الأول أن يحرم بالحج قبل طواف العمرة كله أو أكثره وهو أربعة أشواط صحيحة فلو أحرم به بعد أكثر طوافها لم يكن قارناً أی شرعياً وإن كان قارناً لغوياً. (شرح اللباب، ص۲۸۵، ط: بیروت).

عمدۃ الفقہ میں حضرت مولانا سید زوار حسینؒ صاحب رقمطراز ہیں:

حج قران کے لیے پانچ شرطیں ہیں؛ (۱) عمرہ کا پورا یا اکثر طواف یعنی چار پھیرے کرنے سے پہلے حج کا احرام باندھ لینا پس اگر طوافِ عمرہ کا اکثر حصہ یعنی چار پھیرے کرنے کے بعد حج کا احرام باندھا تو وہ شخص شرعی طریقے پر قارن نہیں ہوگا بلکہ متمتع ہو جائے گا جبکہ اس نے عمرہ کا اکثر طواف حج کے مہینوں میں کیا۔ (عمدۃ الفقہ: ۴/۲۶۱)۔

(ج) بصورتِ مسئولہ حج قران یا حج تمتع کی نیت سے احرام باندھنے کے بعد حج افراد کی کوئی شکل باقی نہیں رہتی، کیونکہ عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد رفض احرام درست نہیں ہے۔

قال فی شرح اللباب: لا يجوز فسخ العمرة بجعلها حجاً عند الثلاثة أی من الأئمة أو الأربعة أی جميعهم بناء علی أن المسألة فيها روايتان عن الإمام أحمد، والله أعلم. (شرح

اللباب،ص۳۲۹).

علامہ سرخسیؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

والإفراد بالحج أن يحج أولاً ثم يعتمر بعد الفراغ من الحج أو يؤدى كل نسك في سفر على حدة أو يكون أداء العمرة في غير أشهر الحج . (المبسوط:٤/٤٤،ط: دارالفكر).

(د) افراد کی نیت سے احرام باندھنے کے بعد تمتع ممکن نہیں ہے کیونکہ تمتع کے لیے ضروری ہے کہ اشہر حج میں پہلے عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ ادا کیا جائے،اس کے بعد حج کا احرام باندھے،اور مذکورہ صورت میں پہلے حج کا احرام باندھ چکا ہے اب اس کو فسخ کرنا درست نہیں ہے۔

كما في شرح اللباب : ولا يجوز ولا يصح فسخ إحرام الحج إلى العمرة عند الثلاثة أى عندنا وعند مالكؒ والشافعيؒ خلافاً لأحمدؒ ...وهو أن يفسخ نية الحج بعد ما أحرم به ويقطع أفعاله ويجعل إحرامه وأفعاله للعمرة . (شرح اللباب،ص۳۲۹).

ہاں افراد کی نیت سے احرام باندھنے کے بعد طوافِ قدوم سے پہلے قران کرنا درست ہے،البتہ ایسا کرنا برا ہے کیونکہ قارن کے لیے سنت یہ ہے کہ حج اور عمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھے یا عمرہ کا احرام حج پر مقدم کرے۔ملاحظہ ہو شرح اللباب میں ہے:

... ومع الإساءة إذا أحرم بأحدهما لأنه يسن أن يحرم بهما منه (ولا تقديم إحرام العمرة على الحج) أى على إحرامه (فإن قدمه عليه قبل طواف القدوم يصير قارناً مسيئاً) أى لمخالفته السنة فيكره فعله لأن السنة تقديم إحرام العمرة على الحج (وعليه دم الشكر) أى اتفاقاً لأنه في الجملة جمع بين العبادتين ولو مع الإساءة (وإن كان) أى أدخلها عليه (بعد الشروع فيه) أى بعد شروعه في طواف القدوم (ولو شوطاً فهو أكثر إساءة من الأول) أى لأنه أخره غاية التأخير حتى أدخلها بعد شروعه في أفعال حجه (و عليه) أى مع هذا (دم شكر) عند شمس الائمة فيأكل منه (وقيل :جبر) وهوقول صاحب الهداية ، وفخر الإسلام فلا يأكل منه. (شرح اللباب ،ص۲۸۷) . (وكذا في غنية الناسك ،ص۱۰۸،باب

القرآن)۔ مزید ملاحظہ کیجئے: (علمی مکاتیب،ص ۱۷۷۔۱۸۳)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

جدہ میں مقیم شخص کے لیے حج وعمرہ کا احرام جدہ سے باندھنے کا حکم:

سوال: ایک شخص جدہ میں مقیم ہے وہاں پر کاروبار وغیرہ کرتا ہے، اب وہ شخص حج، عمرہ کے لیے جانا چاہتا ہے تو حج اور عمرہ کا احرام کہاں سے باندھے گا؟ کیا اپنے گھر سے احرام باندھنا ضروری ہے؟ یا مکہ مکرمہ آکر احرام باندھنا بھی درست ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسے شخص کے لیے اپنے گھر سے ہی حج عمرہ کا احرام باندھنا افضل ہے، اور اگر اپنے گھر سے نہیں باندھا تو حدودِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے باندھنا لازم اور ضروری ہے ورنہ گنہ گار ہوگا اور دوبارہ حل میں واپس آکر احرام باندھنا ضروری ہوگا اور اگر واپس نہیں آیا اور حرم میں احرام باندھ کر عمرہ یا حج کیا تو ایک دم واجب ہوگا۔ملاحظہ ہو شرح اللباب میں ہے:

فصل في الصنف الثاني، وهم الذين منازلهم في نفس الميقات، أو داخل الميقات إلى الحرم فوقتهم الحل أي فميقاتهم جميع المسافة من الميقات إلى انتهاء الحل للحج والعمرة وهم في سعة أي جواز و رخصة، وعدم لزوم كفارة ما لم يدخلوا أرض الحرم أي بلا إحرام، و من دويرة أهلهم أفضل أي لهما، ولهم دخول مكة بغير إحرام إذا لم يريدوا نسكاً و إلا أي: وإن أرادوا نسكاً فإن النفي إثبات، فيجب أي الإحرام حينئذٍ. (شرح اللباب،ص ۹۲،باب المواقيت).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر کوئی حل یا حرم کا رہنے والا مسلمان مکلّف یعنی عاقل بالغ شخص حج کا ارادہ کرے اور اپنے میقات سے بلا احرام آگے چلا جائے اس کے بعد وہ احرام باندھے یا نہ باندھے وہ گنہگار ہوگا اور اس پر آفاقی کی طرح اپنے میقات پر واپس آنا واجب ہے اور اگر وہ اپنے میقات پر واپس نہ لوٹا تو اس پر دم واجب ہوگا۔(عمدۃ الفقہ :۴/۱۰۸، میقات کا بیان)۔

نوٹ: بعض کتابوں میں یہ مسئلہ مرقوم ہے کہ حرم میں احرام باندھنے کے بعد میقات کی طرف نہیں لوٹا لیکن وقوفِ عرفہ کے لیے میدانِ عرفات چلا گیا جو کہ خارجِ حرم ہے تو اس سے دمِ مجاوزت ساقط ہوگیا۔ (ملاحظہ کیجئے: ارشاد الساری، ص۹۲-۹۳، وفتاوی الشامی: ۲/۴۷۸، سعید وغیرہ)۔

لیکن دیگر کتب (مثلاً شرح اللباب، وغیرہ) میں یہ مرقوم ہے کہ افعالِ حج شروع کرنے سے پہلے لوٹنا واجب ہے اگر افعالِ حج شروع کر چکا تو دم ساقط نہیں ہوگا، اور وقوفِ عرفہ سے پہلے ہی افعالِ حج شروع ہو جاتے ہیں نیز میدانِ عرفات جانا ادائیگی رکن کے لیے ہے نہ کہ تلافی واجب کے لیے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہاں حرم سے نکلنا دوامِ احرام کے لیے ہے ابتدائے احرام کے لیے نہیں ہے بنابریں دم ساقط نہیں ہونا چاہئے۔

وللمزيد راجع: (ارشاد الساری الی مناسك الملا علی القاری، ص۹۲-۹۳، وغنية الناسك فی بغيه المناسك، ص۲۷، ۲۸، باب المواقيت، وعمدة الفقه: ۴/۱۰۱، وزبدة المناسك، ص۶۱، وفتاوی الشامی: ۲/۴۷۸، سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

جدہ میں رہنے والے کے لیے تمتع وقران کا حکم:

سوال: ایک شخص جدہ میں قیام پذیر ہے وہ شخص وہاں سے تمتع یا قران کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ یا فقط افراد کرنا ضروری ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مقامی لوگوں کے لیے فقط افراد متعین ہے تمتع اور قران کرنا ان کے لیے جائز اور درست نہیں ہے۔ ہاں جدہ میں قیام پذیر شخص چاہے وہ ملازمت کرتا ہو یا تجارت وغیرہ کے سلسلہ میں آیا ہو ایسے شخص کے لیے تمتع وقران کرنے کی گنجائش ہے۔ ملاحظہ ہو شرح اللباب میں مذکور ہے:

(لا قران لأهل مكة) أی حقيقة أو حكماً (ولا لأهل المواقيت وهم الذين منزلهم في نفس الميقات) وكذا من حاذاهم من غيرهم (ولا لأهل الحل وهم الذين بين المواقيت والحرم) وهذا لقوله تعالىٰ: ﴿ ذلک لمن لم يكن أهله حاضری المسجد الحرام ﴾ [البقرة:۱۹۶]، **والإشارة إلى التمتع، وفي معناه القران.** (شرح اللباب، ص۲۹۶، فصل فی قران المكی).

وقال فيه : ليس لأهل مكة أى المقيمين بها وأهل المواقيت أى نفسها وما حاذاها ومن بينها وبين مكة أى بين الحل من داخل المواقيت وبين الحرم المحترم تمتع للآية المذكورة فمن تمتع كان عاصياً أى لمخالفته الآية ومسيئاً أى في فعله لتركه السنة . (شرح اللباب ،ص۳۰۲،فصل فی تمتع المکی).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اہل حل یعنی حدودِ مواقیت وحدودِ حرم کے درمیانی علاقہ میں رہنے والوں کے لیے بھی قران حلال نہیں ہے۔(عمدۃ الفقہ:۴/۲۶۵)۔

نیز مذکور ہے: اہل مکہ اور اہل مواقیت یعنی جو عین میقات یا محاذاتِ میقات کے رہنے والے ہیں اور داخل مواقیت یعنی مواقیت ومکہ مکرمہ کے مابین علاقہ کے رہنے والوں یعنی اہل حل واہل حدودِ حرم کے لیے تمتع کرنا مشروع ودرست نہیں ہے۔(عمدۃ الفقہ:۴/۲۷۷)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

جنھوں نے وہاں (جدہ یا مکہ کو) وطنِ اصلی نہیں بنایا صرف ملازمت یا تجارت وغیرہ کے لیے وہاں مقیم ہیں وہ قران اور تمتع کر سکتے ہیں...قال فی الشامية : في بيان شروط التمتع نقلاً عن اللباب التاسع عدم التوطن بمكة فلو اعتمر ثم عزم على المقام بمكة أبداً لا يكون متمتعاً وإن عزم شهرين أى مثلاً وحج كان متمتعاً (وبعد سطر)الحادى عشر أن يكون من أهل الآفاق والعبرة للتوطن فلو استوطن المكى فى المدينة مثلاً فهو آفاقي وبالعكس مكي ... (احسن الفتاویٰ:۴/۵۱۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

فرض نماز میں اضطباع باقی رکھنے کا حکم:

سوال: ایک شخص طواف کر رہا تھا جس میں اضطباع سنت ہے لیکن طواف کے درمیان فرض نماز کی تکبیر شروع ہوگئی،اب سب صفوں میں کھڑے ہوگئے تو یہ شخص بھی صف میں کھڑا ہو گیا اور اضطباع بھی باقی تھا کسی نے

بتایا کہ مونڈھے کوڈھانک کرنماز پڑھواس نے ایسا ہی کیا، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ اس کا یہ عمل درست تھا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: علمی مکاتیب میں لکھا ہوا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی صریح عبارت نہیں ملی، لیکن اصولی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اولاً: اضطباع سنت ہے۔ثانیاً یہ سنت طواف کے چکروں کے لیے ہے، اس سے پہلے یا بعد میں نہیں ہے۔ثالثاً: مونڈھا کھلا رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔لہذا دورانِ طواف اگر جماعت کھڑی ہو جائے تو نماز پڑھتے ہوئے اضطباع باقی نہ رکھنا چاہئے۔اوراضطباع باقی نہ رکھنے سے طواف میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، البتہ نماز کے بعد بقیہ طواف پورا کرتے ہوئے دوبارہ اضطباع کرلینا چاہئے۔

في مناسک الملا علی القاری: (ص۱۲۹) :

إذا أراد الشروع فيه أی فی الطواف بعده سعی، فإنه حينئذٍ يسن الاضطباع والرمل له، ينبغي أن يضطبع قبله أی قبل شروعه فيه بقليل، وليس كما يتوهمه العوام من أن الاضطباع سنة جميع أحوال الإحرام، بل الاضطباع سنة مع دخوله فی الطواف علی ما صرح به الطرابلسي وغيره، لكن قال: ولو اضطبع قبل شروعه فی الطواف بقليل فلا بأس به، وهذا يقتضی أفضلية المعية.

واعلم أن الاضطباع سنة في جميع أشواط الطواف كما صرح به ابن الضباع، فإذا فرغ من الطواف فيترک الاضطباع حتی إذا صلی رکعتی الطواف مضطبعاً يكره لكشف منكبه. (علمی مکاتیب لمولانا مرغوب احمد لاجپوری، ص۱۸۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ہجوم کی وجہ سے مسعیٰ میں طواف کرنے کا حکم:

سوال: بہت سی مرتبہ ہجوم کی وجہ سے بعض لوگ مسجدِ حرام کی چھت پر مسعیٰ میں پہنچ جاتے ہیں اور طواف کا کچھ حصہ مسعیٰ میں ادا کرلیتے ہیں تو کیا مسعیٰ میں طواف کرنے سے طواف ادا ہو جائیگا یا نہیں؟ یہ بھی یاد رہے کہ مسعیٰ مسجدِ حرام سے خارج ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ہر قسم کے طواف کے لیے یہ شرط ہے کہ مسجدِ حرام کے اندر سے خانہ کعبہ کے گرد ہو خواہ مسجدِ حرام کی چھت کے اوپر سے ہو، پس اگر مسجدِ حرام کے باہر سے طواف کیا جائے گا تو طواف نہیں ہوگا، اور باتفاقِ علماء مسعیٰ مسجدِ حرام سے خارج ہے بنابریں مسعیٰ میں طواف کرنے سے طواف ادا نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو شرح اللباب میں مذکور ہے:

فصل في مكان الطواف: (مكانه حول البيت لا فيه) أى لا في داخله (داخل المسجد) أى سواء كان قريباً من البيت أو بعيداً عنه بعد أن يكون فى المسجد (و يجوز) الطواف (فى المسجد) أى في جميع أجزاءه (ولو من وراء السوارى) الاسطوانات (وزمزم) وكذا المقامات (ولو طاف على سطح المسجد ولو مرتفعاً عن البيت) أى من جدرانه كما صرح به صاحب الغاية (جاز) لأن حقيقة البيت هو الفضاء الشامل لما فوق البناء من الهوى ... ولو طاف خارج المسجد ، فمع وجود الجدران لا يصح إجماعاً ، وأما إذا كانت جدرانه منهدمة فكذا عند عامة العلماء . (شرح اللباب، ص١٦٥).

عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل میں مذکور ہے:

المجمع الفقہی الاسلامی کے اجلاس میں اس موضوع پر غور کیا گیا اور اکثریت کی رائے سے طے پایا کہ سعی گاہ مسجدِ حرام کی عمارت میں آجانے کے بعد بھی مسجد کے حکم میں نہیں ہوگا، اور نہ اس پر مسجد کے احکام جاری ہوں گے، اس لیے کہ وہ خود ایک مستقل مشعر (شعار کا مقام) ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إن الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت أو اعتمر فلا جناح عليه أن يطوف بهما.** [سورئہ بقرہ: ۵۸] جمہور فقہاء جن میں ائمہ اربعہ داخل ہیں یہی رائے رکھتے ہیں، مسجدِ حرام کے امام کی اقتدا کرتے ہوئے مسعیٰ میں نماز پڑھنا اسی طرح جائز ہے جس طرح دیگر پاک جگہوں پر جائز ہے، مسعیٰ میں حائضہ عورت اور جنبی شخص کا ٹھہرنا اور سعی کرنا جائز ہے، اگرچہ سعی میں بھی طہارت مستحب ہے۔ (عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا حل، ص۲۶۴)۔

تحفہ حجاج میں مرقوم ہے:

اگر طوافِ زیارت کے سارے چکر میں یا تین سے زیادہ میں مسعیٰ کو گزرا ہے تو اس کی قضا کرنی لازم

ہے،اور ۱۲/ تاریخ تک اس کی قضا نہ کی ،یا طوافِ وداع نہ کیا، یا اور کوئی نفل طواف نہ کیا تو تاخیر کی وجہ سے ایک دم واجب ہوگا،اور طواف کو قضا بھی کرنا ہوگا۔

اگر زندگی میں اس طواف کو نہ کرسکا تو موت سے پہلے بدنہ، یعنی اونٹ کی قربانی کی وصیت اس پر واجب ہوگی۔ (مسائل حج وعمرہ،ص ۳۹۶)۔

اور طوافِ زیارت کے ذمہ میں رہتے ہوئے عورت سے قربت بھی حرام رہے گی ،اگر عورت سے ایک مجلس میں کئی بار جماع کئے تو ایک دم واجب ہوگا،اور اگر متعدد مجلس میں جماع کئے تو ہر جماع کے بدلے میں ایک ایک دم واجب ہوگا۔ (زبدہ،ص ۲۷۵)۔

(تنبیہ: ہاں اگر اس نے اپنے آپ کو حلال سمجھ کر مختلف مجالس میں مختلف جنایات کا ارتکاب کیا ہو تو صرف ایک ہی دم واجب ہوگا۔ **قال في غنية الناسک : وإذا اختلف جنس الجناية تعذر التداخل إلا إذا فعلها على قصد رفض الإحرام ، فإن المحرم إذا نوى رفض الإحرام ، فجعل يصنع ما يصنعه الحلال من لبس الثياب والتطيب والحلق والجماع وقتل الصيد ، فعليه دم بجميع ما ارتكب** . (غنية الناسك ،ص ۱۲۹ ،باب الجنايات).)۔

اگر چار چکر صحیح طور پر مسجدِ حرام میں کئے ،اور تین چکر یا اس سے کم میں مسعیٰ کو گزرا ہے تو طوافِ زیارت تو ادا ہوگیا،مگر ہر چکر کے بدلے میں ایک صدقہ دینا واجب ہے۔(زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک،ص ۲۷۵)۔مستفاد از تحفہ حجاج،ص ۳۲)۔

مزید ملاحظہ ہو: (عمدۃ الفقہ: ۴/ ۱۶۸،وغنیۃ الناسک،ص ۵۷، ۵۸،باب فی ماہیۃ الطّواف)۔واللہ ﷻ اعلم۔

طواف کے دوران نجاستِ حکمیہ سے پاکی کا حکم:

سوال: دورانِ طواف نجاستِ حکمیہ یعنی حدیثِ اصغر وحدثِ اکبر سے پاک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ یعنی اگر کوئی شخص بے وضو یا جنابت کی حالت میں طواف کرلے تو وہ طواف شمار ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صحیح قول کے مطابق طواف کے دوران نجاستِ حکمیہ سے پاک ہونا واجب ہے اگر کوئی

شخص جنابت کی حالت میں یا بے وضو ہونے کی حالت میں طواف کرے گا تو گنہگار ہوگا اور جنابت یا حیض ونفاس کی حالت میں کیے ہوئے طواف کا اعادہ واجب ہوگا اور بے وضو طواف کرنے سے اعادہ مستحب ہے، اور دونوں صورتوں میں اعادہ نہ کرنے پر جزا واجب ہوگی، اور اس کی تفصیل درجِ ذیل ہے:۔

معلم الحجاج میں مذکور ہے:

مسئلہ: اگر پورا یا اکثر طوافِ زیارت بے وضو کیا تو دم دے اور اگر طوافِ قدوم یا طوافِ وداع یا طوافِ نفل یا نصف سے کم طوافِ زیارت بلا وضو کیا تو ہر پھیرے کے لیے آدھا صاع صدقہ دے اور اگر تمام پھیروں کا صدقہ دم کے برابر ہو جائے تو کچھ تھوڑا سا کم کردے اور اگر ان تمام صورتوں میں وضو کر کے طواف کا اعادہ کر لیا تو کفارہ اور دم ساقط ہو جائے گا۔

مسئلہ: اگر پورا یا اکثر طوافِ زیارت جنابت یا حیض ونفاس کی حالت میں کیا تو بدنہ "یعنی ایک اونٹ یا ایک گائے سالم" واجب ہوگا اور اگر طوافِ قدوم یا طوافِ وداع یا طوافِ نفل ان حالتوں میں کیا تو ایک بکری واجب ہوگی اور ان سب صورتوں میں طہارت کے ساتھ طواف کا اعادہ کر لینے سے کفارہ ساقط ہو جائے گا۔

مسئلہ: جو طواف جنابت یا حیض ونفاس کی حالت میں کیا ہو اس کا اعادہ واجب ہے اور جو بے وضو کیا ہے اس کا اعادہ مستحب ہے۔ (معلم الحجاج، ص ۱۸۵، واجباتِ حج میں کسی واجب کو ترک کرنا)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

طواف کے دوران جمعہ کا خطبہ شروع ہو جائے:

سوال: طواف کے دوران اگر جمعہ کا خطبہ شروع ہو جائے تو طواف کو جاری رکھنا درست ہے یا موقوف کر کے خطبہ سنے؟ اگر موقوف نہیں کیا تو گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ درمیانِ طواف خطبہ شروع ہو جائے تو طواف موقوف کر کے دھیان اور توجہ کے ساتھ خطبہ سننا واجب ہے طواف جاری رکھنے سے خطبہ سننے میں خلل واقع ہوگا اس لیے طواف موقوف کرنا چاہیے ورنہ گنہگار ہوگا۔ ملاحظہ ہو شرح اللباب میں ہے:

فصل في مكروهاته (أي الطواف)...والطواف عند الخطبة أي مطلقاً لإشعاره

بالإعراض ولو كان ساكتاً وإقامة المكتوبة فإن ابتداء الطواف حينئذٍ مكروه بلا شبهة .

(شرح اللباب، ص۱۸۳). (وكذا في غنية الناسك، ص۶۸).

تحفہ حجاج میں بحوالہ مجموعہ فتاویٰ دار العلوم کراچی مرقوم ہے:

خاموشی سے کان لگا کر خطبہ سننا واجب ہے، اور خطبہ جمعہ کے دوران طواف کرنے سے چونکہ خطبے کے سننے میں خلل واقع ہوتا ہے، لہٰذا اس دوران طواف کرنا منع ہے، اس سے بچنا لازم ہے۔ (تحفہ حجاج، ص۴۷)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

دورانِ طواف بیت اللہ شریف پر نگاہ ڈالنے کا حکم:

سوال: طواف کرتے وقت بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا کیسا ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: بحالتِ طواف بیت اللہ شریف کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا خلافِ ادب ہے کوئی ناجائز یا حرام نہیں ہے بلکہ طواف کرنے والے کے لیے ادب یہ ہے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں تا کہ طواف میں دلجمعی حاصل ہو جائے۔ ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں ہے:

و ينبغي أن لا يجاوز بصره محل مشيه كالمصلي لا يجاوز بصره محل سجوده لأنه الأدب الذي يحصل به اجتماع القلب . (غنية الناسك، ص۶۵، فصل في مستحبات الطواف).

تحفہ حجاج میں بحوالہ مجموعہ فتاویٰ دار العلوم کراچی، ص۲۵۶/۲ مرقوم ہے:

طواف کی حالت میں بیت اللہ کی طرف چہرہ اور نگاہ کرنا حرام یا مکروہ نہیں ہے، بلکہ خلافِ ادب ہے۔ ادب یہ ہے کہ طواف کرنے والا دورانِ طواف اپنی نظر چلنے کی جگہ رکھے، تا کہ اِدھر اُدھر دھیان نہ بٹے، اور یکسوئی سے طواف ادا ہو جائے۔ (تحفہ حجاج، ص۴۷)۔ (وکذا فی احسن الفتاویٰ: ۵۴۸/۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دورانِ طواف بیت اللہ کی طرف سینہ یا پیٹھ کرنے کا حکم:

سوال: دورانِ طواف بیت اللہ شریف کی طرف سینہ یا پیٹھ کرنے سے طواف میں کوئی خرابی لازم آئے

گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر پورا طواف بیت اللہ شریف کی طرف سینہ یا پیٹھ کرنے کی حالت میں ادا کیا تو طواف مکروہِ تحریمی ہوا، اور اس کا اعادہ لازم ہے، اگر اعادہ نہیں کیا تو دم واجب ہوگا۔ لیکن اگر طواف کا کچھ حصہ اس طرح ادا کیا تو بھی مکروہِ تحریمی ہوگا اور اتنے حصہ کا اعادہ لازم ہوگا، البتہ اعادہ نہ کرنے کی صورت میں دم واجب نہیں ہوگا، ہاں ہر شوط کے بدلے میں صدقہ فطر کی مقدار ادا کردے، اور اگر تمام ملکر دم کے برابر ہوجائے تو کچھ کم کردے، اور آئندہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو شرح اللباب میں مذکور ہے:

وأما ما في الكبير من أنه ذكر في منسک الرومي عن السروجي وليس شيء من الطواف يجوز مع استقبال البيت إلا قبالة الحجر، انتهى. وهو غلط منه لأنه إنما ذكره السروجي عن الشافعية وقد صرح في الغاية ومنسک السنجاري، ولو استقبل البيت بوجهه وطاف معترضاً وجعل البيت عن يمينه ومشى القهقرى أو مر معترضاً مستدبر البيت لايبطل عندنا...ولا يخفى أن ما نقل عن السروجي يمكن حمله على ما يوافق المذهب بأن يقال: معنى لا يجوز يحرم لتركه الواجب...والحاصل أن وجوب التيامن يفيد أن من أتى بخلافه من الصور المذكورة المخالفة للتيامن في الهيئة والكيفية يحرم عليه فعله ويجب عليه الإعادة أو لزوم الجزاء. (شرح اللباب، ص١٦٩، فصل في واجبات الطواف).

غنية الناسک میں ہے:

فصل وأما محرماته...و أداء شيء من الطواف مع استقبال البيت، قيل إلا قبالة الحجر الأسود في ابتداء الطواف خاصة. (غنية الناسك، ص٦٧).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

بیت اللہ شریف کو اپنے سینہ کے سامنے کیا، یا بیت اللہ شریف کی طرف پیٹھ کی اور آڑا چل کر یعنی داہنے یا بائیں پہلو کی طرف چل کر طواف کیا یا اور کسی بھی طرح سے طواف کیا تو اس کا طواف صحیح ہوجائے گا اور احرام سے

حلال ہونے کے لیے ایسا طواف ہمارے نزدیک معتبر ہوجائے گا لیکن ترک واجب کی وجہ سے اس پراس کی جزا لازم ہوگی۔حاصل یہ ہے کہ داہنی طرف سے طواف شروع کرنے کے علاوہ جتنی بھی صورتیں ہیئت وکیفیت کے اعتبار سے مذکور ہوئیں ان کا کرنا اس پر حرام ہے اوراس پراس طواف کا اعادہ لازم ہے اوراگر اعادہ نہیں کرے گا تو جزا لازم ہوگی۔یعنی جب تک مکہ مکرمہ میں ہے اس پراعادہ واجب ہے اگر اعادہ نہ کیا اوراپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ گیا تو اب اس پر دم واجب ہے۔(عمدۃ الفقہ :۴/۲/۱۷۲،واجباتِ طواف)۔(وکذافی زبدۃ المناسک،ص۱۲۱)۔

عمدۃ الفقہ میں ہے:

طواف کے لیے دوکلیہ قاعدے: (۱)اگرفرض (یاواجب) یانفل (سنت وتطوع) طواف ایسے طریقہ پر کیا کہ جس سے طواف میں نقص لازم آتا ہے تو اس پر جزا یعنی دم یا صدقہ واجب ہوگا اوراس نے اس طواف کا اعادہ کرلیا تو اس سے تمام صورتوں میں بالاتفاق جزا ساقط ہوجائے گی...

(۲)جن صورتوں میں پورے طواف میں دم واجب ہوتا ہے ان میں طواف کے اکثر حصہ میں بھی دم ہی واجب ہوگا، کیونکہ اکثر حصہ کل کا قائم مقام ہوتا ہے اوراس کے اقل حصہ میں جنایت کے ہلکا ہونے کی وجہ سے صدقہ واجب ہوگا سوائے عمرہ کے طواف کے کہ اس کے کثیر وقلیل دونوں کا ایک حکم ہے۔(عمدۃ الفقہ :۴/۵۳۸)۔

تنبیہ: تحفہ حجاج میں بحوالہ مجموعہ فتاوی دار العلوم کراچی یہ مرقوم ہے کہ اگر طواف کا کچھ حصہ بیت اللہ کی طرف سینہ یا پیٹھ کر کے ادا کیا تو گنہگار ہوگا توبہ لازم ہے لیکن کچھ واجب نہیں۔(تحفہ حجاج،ص۶۸،بحوالہ مجموعہ فتاویٰ دار العلوم کراچی،غیر مطبوعہ)۔

لیکن ہمارے خیال میں شرحِ لباب کی مذکورہ عبارت اور مذکورہ بالا دوقاعدوں کی روشنی میں صدقہ فطر واجب ہونا چاہئے۔لہذا تحفہ حجاج کی یہ بات بظاہر ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔واللہ ﷻ اعلم۔

احرام میں سلے ہوئے پٹے والی چادر کے استعمال کا حکم:

سوال: احرام کی ازار اگر ایسی ہو کہ اس پر کمر بند (بیلٹ) سیا گیا ہو تو کیا ایسا احرام پہننا جائز ہوگا یا نہیں؟ اس بیلٹ کے سینے کا مقصود ازار کے کھلنے سے حفاظت ہے اور اندر جیب بھی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حالتِ احرام میں جو سلے ہوئے کپڑے پہننا ممنوع ہے اس کا اصول یہ ہے کہ جو لباس انسان کے تمام بدن یا بدن کے بعض حصہ کے موافق بنایا گیا ہو اس طرح پر کہ وہ سلائی کے ذریعہ یا بعض حصوں کو بعض حصوں کے ساتھ چپکانے سے یا کسی اور طرح سے بدن یا کسی عضو کا احاطہ کرلے اور وہ خود بخود جسم پر ٹھہرار ہے ایسا لباس احرام کی حالت میں پہننا منع ہے، بنابریں مذکور اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا تہبند پہننا ممنوع ہوگا۔ ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں ہے:

لو لبس الطيلسان ولم يزره لعدم الاستمساك بنفسه ولهذا يتكلف في حفظه فلو زره فهو لبس المخيط لحصول الاستمساك بالزر مع الإحاطة بالخياطة . (غنية الناسك، ص٤٤).

فتح القدیر میں ہے:

لبس المخيط ان يحصل بواسطة الخياطة اشتمال على البدن واستمساك فأيهما انتفى انتفى لبس المخيط... وكذا إذا لبس طيلسان من غير أن يزره عليه لعدم الاستمساك بنفسه فإن زر القباء أو الطيلسان يوماً لزمه دم لحصول الاستمساك بالزر مع الاشتمال بالخياطة . (فتح القدير: ٣/ ٣٠،دارالفكر،وكذا فى البحرالرائق: ٣/ ٦،مكتبه ماجديه).

وقال فى البدائع : ولأن لبس المخيط من باب الارتفاق بمرافق المقيمين والترفه فى اللبس وحال المحرم ينافيه . (بدائع الصنائع: ٢/ ١٨٤،سعيد)۔

وكذافى الدرالمختارمع رد المحتار: ٢/ ٤٨٩،سعيد،وجواهرالفقه: ٤/ ١٠٩،دارالعلوم كراچى)۔

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر کسی محرم نے طیلسان پہنا اور اس کو گھنڈی (تکمہ) یعنی بٹن نہیں لگائی تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اس طرح یہ خود بخود جسم پر نہیں ٹھہرا رہتا لہذا اس کی حفاظت میں تکلف وعمل کی ضرورت پڑتی ہے پس اگر اس کو تکمہ لگایا تو اب یہ سلے ہوئے کپڑے کا پہننا ہو جائے گا کیونکہ سلائی کے ذریعہ احاطہ بدن کے ساتھ ساتھ اس کا تکمہ کے ذریعہ جسم پر ٹھہرنا بھی حاصل ہو گیا۔ (عمدۃ الفقہ :۴/ ۱۳۹،محرمات وممنوعاتِ احرام)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

رکن یمانی کو بوسہ دینے کا حکم:

سوال: رکن یمانی کو بوسہ دینے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: دورانِ طواف ہر چکر میں رکن یمانی کا استلام کرنا مستحب ہے اوراس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے یا صرف دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے رکن یمانی کو مس کرنا۔

لیکن بوسہ دینا جائز ہوگا یا نہیں اس بارے میں مختلف اقوال ہیں: اکثر کتبِ فقہ میں یہ قول منقول ہے کہ رکن یمانی کو بوسہ نہ دے۔ بعض کتابوں میں یہ مرقوم ہے کہ بوسہ دینا سنت نہیں ہے، اور علامہ شامیؒ نے فرمایا ایک قول یہ ہے کہ بوسہ دینا سنت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ بدعت ہے۔ سراجیہ وغیرہ میں مذکور ہے کہ اصح قول کے مطابق بوسہ نہ دے۔

البتہ کتبِ حدیث کی ورق گردانی سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بوسہ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اگرچہ روایات ضعیف ہیں، بنابریں احادیث کی روشنی میں اعدل الاقوال یہ ہوگا کہ رکن یمانی کو بوسہ دینا جائز بلکہ مستحب ہے ہاں روایات کے ضعف کے پیش نظر سنت نہیں کہیں گے۔ اور ہر شوط میں نہیں بلکہ احیاناً کر لینا چاہئے۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن ابن عباس ﷺ أن رسول اللّٰہ صلى الله عليه وسلم: قبل الركن اليماني ووضع خده عليه . أخرجه ابن خزيمة في صحيحه(۲۷۲۷)، **و الحاكم في المستدرك** (۱٦۷۵)، **وقال : هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه ، والدارقطني في سننه** (۲٤۲)، **وعبد بن حميد في مسنده**(٦۳۸) **وقال الهيثمي في المجمع** (٥٤۸۱) **رواه أبويعلى وفيه عبد اللّٰہ بن مسلم بن هرمز وهو ضعيف .**

عن ابن عمر ﷺ قال: كان رسول اللّٰہ صلى الله عليه وسلم لا يدع أن يستلم الركن اليماني والحجر في كل طوفة قال: وكان عبد اللّٰہ بن عمر ﷺ يفعله . (رواه ابوداود، رقم: ۱۸۷۸، باب استلام الارکان).

شرح اللباب میں ہے:

فصل في مستحباته : استلام الركن اليماني أى من غير قبلة و وضع جبهة . (شرح اللباب ،ص۱۷۷).

قال الإمام محمد في المبسوط : واستلام الركن اليمانى حسن وتركه لا يضر . (المبسوط:۲/۴۰۵،باب الطواف).

قال العلامة الشامي: وفى الدر المنتقى: واختلف في تقبيل الركن اليماني فقيل: سنة وقيل : بدعة . (فتاوى الشامي: ۳۸۴/۶،سعید).

قال فى الدرالمختار: واستلم الركن اليمانى وهو مندوب لكن بلا تقبيل وقال محمد : هو سنة ويقبله والدلائل تؤيده ويكره استلام غيرهما. وقال فى الشامية: والدلائل تؤيده اى تؤيد قوله بكونه سنة وبأنه يقبله لكن فى شرح اللباب أن ظاهر الرواية الأول كما فى الكافى والهداية وغيرهما وفى الكرمانى وهو الصحيح وفى النخبة ما عن محمد ضعيف جداً وفى البدائع : لا خلاف في أن تقبيله ليس بسنة وفى السراجية: ولا يقبله في أصح الأقاويل. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۲/۴۹۸،سعید).

وينظر: (بدائع الصنائع:۲/۱۴۷-۱۴۸،فصل فى بيان سنن الحج ،سعيد).

نیز فقہاء کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کوئی فقہی مسئلہ حدیث کے موافق ہوتو اس سے عدول نہیں کرنا چاہئے اس کی روشنی میں بھی رکن یمانی کو بوسہ دینا مستحب ہوگا۔

قال في شرح المنية : ولا ينبغي أن يعدل عن الدراية إذا وافقتها رواية على ما تقدم عن فتاوىٰ قاضيخان ، ومثله ما ذكر فى القنية . (فتاوى الشامى:۱/۴۶۴،سعید).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا،جلدِ دوم،ص۷۰۱)۔

حدیث شریف کی دوسری توجیہ:

بعض شراحِ حدیث نے اس حدیث شریف کی یہ توجیہ بیان فرمائی ہے کہ یہاں بھی تقبیل سے مراد حجر اسود

کی تقبیل ہی ہے یعنی رکن یمانی کا فقط استلام ہے تقبیل نہیں ہے، اور اس توجیہ میں آسانی ہے ورنہ ویسے ہی حجر اسود پر شدید ہجوم ہوتا ہے کہیں رکن یمانی پر بھی شروع نہ ہوجائے۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث الابواب والتراجم میں فرماتے ہیں:

وقال القسطلاني ؒ: وحديث ابن عباس ﷺ أن النبي صلى الله عليه وسلم قبل الركن اليماني ووضع خده عليه رواه جماعة منهم ابن المنذر والحاكم وصححه وضعفه بعضهم وعلى تقدير صحته فهو محمول على الحجر الأسود وإذا استلمه قبل يده على الأصح عند الشافعية والحنابلة ومحمد بن الحسنؒ من الحنفية. (الابواب والتراجم،١٣٥). **واللہ ﷻ اعلم۔**

طواف کے دوران بیت اللہ شریف کو چھونے کا حکم:

سوال: طواف کے دوران ٹھہرنا اور کعبہ شریف کے غلاف کو پکڑ کر دعا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: طواف کی سنن میں سے ایک سنت یہ ہے کہ طواف پے در پے کیا جاوے، یعنی بلا کسی حاجت وضرورت کے درمیان میں وقفہ نہ کیا جائے ورنہ مکروہ ہوگا، بنابریں صورتِ مسئولہ میں خلافِ سنت طواف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہوگا۔

مزید براں طواف کرنے والے کا سینہ بیت اللہ کی طرف ہوگا، اور فقہاء کی تصریح کے مطابق طواف کے درمیان ایسا کرنا مکروہ ہے، لہٰذا ایسے شخص کو طواف مکمل کرنے کے بعد بیت اللہ شریف کا غلاف پکڑ کر دعا کرنی چاہئے۔ یہی اولیٰ اور بہتر ہے۔ ملاحظہ ہو شرحِ لباب المناسک میں ہے:

والموالاة أى المتابعة بين الأشواط أى أشواط الطواف، وكذا أشواط السعى ... والظاهر أن يراد بها الموالاة العرفية إلا أنه لا يقع فيه مطلق الفاصلة لتجويزهم الشرب ونحوه في أثناء الطواف. (شرح اللباب،ص١٧٦،فصل فی سنن الطواف). (وكذا فی غنية الناسك،ص٦٤).

غنية الناسك میں مرقوم ہے:

فصل في مكروهات الطواف... والوقوف للدعاء في أثناء الطواف فی الأركان أو في

غيره لأن الموالاة بين الأشواط وأجزاء الأشواط سنة مؤكدة . (غنية الناسك،ص٦٧).

وينظر: (شرح اللباب،ص١٦٩، فصل في واجبات الطواف،وغنية الناسك،ص ٦٠،فصل في واجبات الطواف). **واللہ ﷻ اعلم۔**

طواف کے ہر شوط میں حجر اسود کا استلام کرنے کا حکم:

سوال: کیا حجر اسود کا استلام طواف کے ہر شوط میں کرنا ضروری ہے؟ نیز استلام کرتے وقت رفع یدین اور استقبالِ حجر بھی ضروری ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: طواف کی ابتدا میں اور آخر میں استلام کی سنیت زیادہ مؤکد ہے درمیان طواف ہر شوط میں استلام مستحب ہے، لہٰذا اگر کسی نے طواف کے شروع یا آخر میں استلام کو ترک کیا تو یہ مکروہ عمل ہوا لیکن اگر درمیان میں ترک کیا تو تارکِ مستحب ہوگا، اور اس کا طواف بلا کراہت صحیح ہو جائے گا۔

نیز بوقتِ استلام رفع یدین اور استقبالِ حجر کا بھی یہی حکم ہے۔ بلکہ اس میں زیادہ خفت ہے۔

ملاحظہ ہو شرح لباب المناسک میں ہے:

فصل في سنن الطواف: استلام الحجر مطلقاً أى من غير قيد الأولية والآخرية، والأثنائية، وإن كان بعضها آكد من بعض، بل قيل: يستحب فيما عدا طرفيه ...ورفع اليدين عند التكبير مقابلة الحجر أى في الابتداء للخلاف في الأثناء ...واستقبال الحجر في ابتدائه أى بخلاف استقباله في أثنائه فإنه مستحب . (شرح اللباب،ص١٧٦).

غنیۃ الناسک میں مذکور ہے:

واستقبال الحجر الأسود بالوجه في ابتداءه وأما في أثناءه فمستحب ...ورفع اليدين عند التكبير حال استقبال الحجر في الابتداء ...واستلام الحجر في أوله وآخره وأما فيما بينهما فسنة مستحبة قال في شرح الطحاوى: وإن افتتح الطواف باستلام الحجر وختم به وترك الاستلام فيما بين ذلك أجزأه وإذا تركه رأساً فقد أساء . (غنية الناسك،

ص ٦٣، فصل فی سنن الطواف). (وکذا فی عمدۃ الفقہ :۴/۱۸۰)۔

البتہ بدائع الصنائع میں لکھا ہے کہ ہر شوط میں استلام مسنون ہے۔ ملاحظہ ہو:

ويستلم الحجر في كل شوط يفتتح به إن استطاع من غير أن يؤذي أحداً لماروي أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان كلما مر بالحجر الأسود استلمه ولأن كل شوط طواف على حدة فكان استلام الحجر فيه مسنوناً كالشوط الأول . (بدائع الصنائع: ۲/ ۱٤٧، سعيد). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

دورانِ طواف وضوٹوٹ جانے کا حکم:

سوال: اگر دورانِ طواف کسی کا وضوٹوٹ گیا اور وضو کرنے کے لیے گیا، تو آنے کے بعد پھر سے طواف شروع کرے یا جہاں سے روکا تھا وہیں سے شروع کرے؟ اسی طرح فرض نماز شروع ہوجائے تو نماز کے لیے چلا جائے تو بعد نماز کے ازنو شروع کرے گا یا وہیں سے جاری رکھے گا؟

الجواب: مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اگر اکثر طواف پورا کرلیا تھا تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہیں سے شروع کرے جہاں پر روکدیا تھا، اور اگر از سرنو دوبارہ شروع کیا تو بھی درست ہے، اور اگر اکثر طواف نہیں ہوا تھا بلکہ ایک دو چکر ہوئے تھے تو اس صورت میں استیناف مستحب اور بنا بھی جائز ہے۔ ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں مرقوم ہے:

ولو خرج من الطواف أو من السعي إلى جنازة أو مكتوبة أو تجديد وضوء ثم عاد بنى لو كان ذلك بعد إتيان أكثره ولو استأنف لا شيء عليه فلا يلزمه إتمام الأول لأن هذا الاستيناف للإكمال بالموالاة بين الأشواط ويستحب الاستيناف في الطواف إذا كان ذلك قبل إتيان أكثره . (غنية الناسك، ص٦٨، فصل في مكروهات الطواف).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

طواف کے درمیان جہاں وضوٹوٹا ہے وہیں سے وضو کرنے کو چلا جائے اور وضو کر کے دوبارہ وہیں سے

طواف شروع کر کے سات چکر پورے کرلے، وضوٹوٹ جانے کی وجہ سے پہلے کئے جانے والے چکر ضائع نہیں ہوں گے، بلکہ ان کوشمار کرتے ہوئے سات چکر پورے کرے گا۔(کتاب الفتاوی:۴/۴۷)۔واللہ ﷻ اعلم۔

دوگانہ کو جمع کر کے پڑھنے کا حکم:

سوال: کئی طواف کی نمازیں جمع کر کے ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو یہ عمل جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر کسی عذر کی وجہ سے ایسا کرتا ہے مثلاً طواف مکروہ اوقات میں کیے ہیں، تو اوقاتِ مکروہہ میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے لہذا مکروہ وقت نکلنے کے بعد پڑھنا واجب ہے، لیکن بلا عذر ایسا کرتا ہے تو ترکِ سنت کی وجہ سے مکروہ ہے، کیونکہ طواف اور دوگانہ کے درمیان موالاۃ سنت ہے یعنی ہر طواف کے بعد دوگانہ ادا کرے پھر دوسرا طواف شروع کرے۔

نیز عصر اور فجر کی نماز کے بعد طواف کرلیا تو آفتاب نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے بھی طواف کی دو رکعتیں نہ پڑھے طلوعِ آفتاب کے بعد جب وقت مکروہ ختم ہو جائے تو صلاۃِ طواف پڑھ لے۔

ملاحظہ ہو شرحِ لباب المناسک میں ہے:

فصل في مكروهاته...والجمع بين أسبوعين فأكثر من غير صلاة بينهما لما يترتب عليه من ترك السنة ، وهي الموالاة بين الطواف وصلاته لكل أسبوع عند أبي حنيفة ومحمد سواء انصرف عن شفع أو وتر ، وعند أبي يوسف لا بأس به إذا انصرف عن وتر وإن فعل صلى لكل أسبوع ركعتين ، فلو انصرف عن شفع كره اتفاقاً إلا في وقت كراهة الصلاة لأنه لا كراهة حينئذٍ بالجمع شفعاً ووتراً اتفاقاً لكن يؤخر ركعتي الطواف إلى وقت مباح . (شرح اللباب،ص۱۸۳). (وكذا في غنية الناسك،ص٦٢،وعمدة الفقه:٤/١٩٠،مكروهات طواف).

واللہ ﷻ اعلم۔

حرم شریف سے عمرہ کا احرام باندھنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے مکہ مکرمہ سے عمرہ کا احرام باندھا، کیونکہ یہ شخص مکہ مکرمہ میں مقیم تھا، اس نے عمرہ مکمل کرلیا اور حلال بھی ہوگیا، اب اس کے ذمہ کیا واجب ہے؟ سنا ہے کہ اس کو حرم سے باہر جانا چاہئے تھا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور پر لازم تھا کہ حرم سے باہر تنعیم یا کسی اور جگہ جا کر احرام باندھتا لیکن ایسا نہیں کیا اور عمرہ پورا کرلیا بنابریں اس پر ایک دم واجب ہوا جو حرم کے ساتھ خاص ہے۔

قال ابن الهمام في فتح القدير: وإذ أحرم المكي للعمرة من الحرم فعليه دم إن لم يعد إلى ميقاته على ما عرف. (فتح القدير: ۳/۱۱٤، دارالفكر).

(وكذا في البحرالرائق: ۳/۵۰، وفتاوی الشامي: ۲/٤۷۹، سعيد، وبدائع الصنائع: ۲/۱٦۷، سعيد).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

پس مکہ مکرمہ یا حدودِ حرم کا رہنے والا شخص زمین حرم سے عمرہ کا احرام باندھے گا تو اس پر دم (قربانی) واجب ہوگا کیونکہ اس نے اپنے میقات کو ترک کردیا ہے حالانکہ وہ میقات بالاجماع ثابت ہیں۔ (عمدۃ الفقہ: ۴/ ۹٦، اہل حرم کا میقات)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

طوافِ زیارت کے بعد سعی میں رمل کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص طوافِ زیارت کے بعد سعی کرنا چاہتا ہے اور طوافِ زیارت سلے ہوئے کپڑوں میں کرتا ہے تو کیا اس طواف میں رمل کرے گا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور سلے ہوئے کپڑوں میں رمل کرے گا۔

قال في شرح اللباب: فيطوف سبعة أشواط بلا رمل فيه وسعي أي وبلا سعي بعده أي بعد الطواف إن قدمهما أي الرمل والسعي لأنهما لم يشرعا إلا مرة وإلا أي وإن لم يقدمهما رمل فيه وسعى بعده وإن قدم السعي لا الرمل سقط الرمل، وأما الاضطباع فساقط

مطلقاً في هذا الطواف. (شرح اللباب،ص۲۵٦،باب طواف الزيارة).

وكذا في غنية الناسک وزاد فيه بقوله: لأنه قد تحلل من إحرامه وقد لبس المخيط.

(غنية الناسك،ص٩٤،باب طواف الزيارة).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر کسی نے حج کی سعی طوافِ زیارت سے پہلے کرلی ہے تو طوافِ زیارت میں رمل نہ کرے اگر چہ اس نے سعی کے ساتھ والے طواف میں رمل نہ کیا ہو اور اگر حج پر روانگی سے قبل کے طواف میں رمل کرلیا لیکن سعی نہیں کی تو وہ طوافِ زیارت میں رمل بھی کرے۔ (عمدۃ الفقہ :۴/۱۸۰)۔ (وکذا فی معلم الحجاج ،ص۲۰٦)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حج کے بعد بجائے سر کے ڈاڑھی کا حلق کرلیا:

سوال: ایک آدمی نے حج کیا، حج کے افعال مکمل کرنے کے بعد حلاق کے سامنے بیٹھ گیا اور بجائے سر کے ڈاڑھی کا حلق کرالیا تو اس پر کوئی کفارہ یا دم واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر ڈاڑھی کا چوتھائی حصہ یا اس سے زیادہ کا حلق کرالیا تو اس پر دم کے لازم ہونے میں علماء کا اختلاف ہے لیکن اصح قول کے مطابق شخص مذکور پر دم لازم ہوگا۔ اور اگر چوتھائی سے کم ڈاڑھی کا حلق کرایا تو صدقہ واجب ہوگا، نیز ڈاڑھی کا حلق کرانا بڑا گناہ ہے خصوصاً حج کے بعد تو آدمی کے احوال اور درست ہوجانے چاہئے کیونکہ اس کو علماء نے حج مبرور کی علامت میں سے قرار دیا ہے۔

شرحِ لباب المناسک میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

(ولو قص أظفاره أو شاربه أو لحيته أو طيب قبل الحلق فعليه موجب جنايته) فيه أنه إذا كان شيء ما ذكر قبل الحلق لكنه في أوانه لا يوجب شيئاً كما نقله ابن الهمامؒ عن المبسوط معللاً لكنه مناقض بما نقله عنه المصنف في الكبير، حيث قال: وعبارة المبسوط ليس على الحاج إذا قصر أن ياخذ شيئاً من لحيته أو شاربه أو أظفاره أو يتنور فإن فعل لم يضره، ثم علله بما مر، ثم ذكر في آخر اللباب وإذا لم يبق على المحرم غير التقصير فبدأ

بقص أظفاره فعليه كفارة ، وذلك لأن إحرامه باق مالم يحلق أو يقصر ففعله يكون جناية على الإحرام و يؤيده ما في خزانة الأكمل إذا لم يبق على المحرم إلا التقصير فبدأ بقلم الأظفار أو قص الشارب أو أخذ اللحية لزمه كفارة لذلك ، وفي الكافي وليس للمحرم أن يقلم أظفاره قبل الحلق أو التقصير لبقائه في الإحرام ، وفي المحيط : أبيح له التحلل فغسل رأسه بالخطمي وقلم أظفاره قبل الحلق فعليه دم لأن الإحرام باقٍ، في حقه لأنه لا يتحلل إلا بالحلق ، لكن ذكر الطحاوي: أنه لا دم عليه عند أبي يوسفؒ ومحمدؒ ، لأنه أبيح له التحلل فيقع به التحلل، فدل على أن المسألة خلافية بين الائمة الثلاثة ، ويؤيده ما في الفتح: ولو غسل رأسه بالخطمي بعد الرمي قبل الحلق يلزمه دم على قول أبي حنيفةؒ على الأصح ، لأن إحرامه باقٍ ، لا يزول إلا بالحلق ، والحاصل أن قول أبي حنيفةؒ هذا هو الأصح، بل قال الجصاص: لا أعرف فيه خلافاً ، والصحيح أنه يلزمه الدم . (شرح اللباب ، ص ۲۵۱،۲۵۲،فصل فی الحلق و التقصير).

قال في الفتاوى الهندية: وإذا حلق ربع لحيته فصاعداً فعليه دم وإن كان أقل من الربع فصدقة ،كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۴۳،الفصل الثالث فی حلق الشعروقلم الاظفار).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

حلق یا قصر کے بعد لبوں اور ناخنوں کو کاٹنا مستحب ہے اور اگر حلق کرانے سے پہلے اپنے ناخن یا لبوں یا ڈاڑھی کو کاٹا یا خوشبو استعمال کی تو اس کی وجہ سے اس پر کفارۂ جنایت واجب ہوگا۔ (عمدۃ الفقہ :۴/ ۲۵۰)۔

معلم الحجاج میں مذکور ہے:

حج کے مقبول ہونے کی علامت یہ ہے کہ حج کے بعد اعمالِ صالحہ کا اہتمام اور پابندی زیادہ ہوجائے اور دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طرف رغبت بڑھ جائے اور پہلی حالت سے بہتر ہوجائے اس لیے حج کے بعد اپنے اعمال واخلاق کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہئے اور طاعات وعبادات میں خوب سعی کرنی چاہئے ۔

معصیت اور اخلاقِ رذیلہ سے نفرت اور اجتناب کرنا چاہئے۔(معلم الحجاج،ص۴۰۹)۔واللہ ﷻ اعلم۔

کچھ کنکریاں جیب میں رہ جانے پر رمی کا حکم:

سوال: ایک عورت حج کے لیے گئی، عید کے دن کی رمی کے لیے کنکریاں اپنے جیب میں رکھ لی، رمی کے بعد ہوٹل واپس آئی اور کپڑے بدل لیے، بعد میں گھر آنے کے بعد ان کپڑوں کو دیکھا تو دو کنکریاں رہ گئی تھیں اب اس عورت پر کوئی جزا واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر یقینی طور پر معلوم ہے کہ واجب رمی کی دو کنکریاں رہ گئی تھیں، تو چونکہ چار سے زائد کی رمی ہو چکی ہے اس وجہ سے رمی ادا ہوگئی البتہ سات کی تکمیل نہ ہونے کی وجہ سے ہر کنکری کے عوض صدقہ فطر کی مقدار ادا کرنا لازم ہوگا اور یہ صدقہ حرم کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ حرم سے باہر دینا بھی جائز ہے البتہ حرم کے مساکین پر خرچ کرنا افضل ہے۔ملاحظہ ہو شرحِ لباب المناسک میں ہے:

التاسع إتمام العدد أو إتيان أكثره ، وفيه أن هذا ركن الرمي لا شرطه فلو نقص الأقل منها أى من السبعة بأن رمى أربعة ، وترک ثلاثة أو أقل لزمه جزاؤه مع الصحة أى مع صحة رميه لحصول ركنه . (شرح اللباب،ص۲۷۵،فصل فی احکام الرمی).

وفيه أيضاً: وإن ترک الأقل أو أخره كحصاة أوحصاتين أو ثلاثة فى اليوم الأول ... فعليه لكل حصاة صدقة إلا أن يبلغ ذلک دماً فينقص منه . (شرح اللباب،ص۳۹۶،فصل فی الجناية فی رمی الجمرات).

وفي غنية الناسک : فلو ترک الأقل من سبعة يوم النحر...أجزأه وعليه لكل حصاة صدقة. (غنية الناسك،ص۱۰۱،فصل فی واجبات الرمی).

وفى شرح اللباب : ولايشترط فى التصدق به أى بلحمه عدد المساكين ...ولا فقراء الحرم فلو تصدق به على غيرهم أى غير فقراء الحرم ...جاز وفقراء الحرم أفضل، أى مطلقاً . (شرح اللباب، ٤٣٥).

وللمزيد ينظر: (ردالمحتار: ۵۱۳/۲،سعيد،والفتاوى الهندية:۲۴۷/۱).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر رمی کا اقل حصہ ترک کر دیا یعنی پہلے دن (دسویں ذی الحجہ) کو ایک یا دو یا تین کنکریاں چھوڑ دیں... تو اس پر ہر کنکری کے بدلے صدقہ دینا واجب ہے۔ (عمدۃ الفقہ:۵۴۵/۴)۔وکذا فی معلم الحجاج،ص۲۸۸)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

متمتع کے لیے حج کا احرام منیٰ سے باندھنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے حج تمتع کیا اور عمرہ کی تکمیل کے بعد ایامِ حج میں منیٰ سے حج کا احرام باندھا اور حج کیا تو منیٰ سے اس کا احرام صحیح ہوا یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد مکہ میں مقیم ہونے کی وجہ سے اہل مکہ کے حکم میں ہے اور اہل مکہ کے لیے میقات پورا حرم ہے حج کے احرام کے لیے اور منیٰ حرم شریف میں داخل ہے بنا بریں اس کا احرام صحیح ہے اور حج بھی صحیح ہو گیا، ہاں حج کا احرام مسجدِ حرام سے باندھنا افضل ہے۔

ملاحظہ ہو شرحِ لباب المناسک میں ہے:

فصل في الصنف الثالث وهم من كان منزله في الحرم ، كسكان مكة ومنى فوقته الحرم للحج ومن المسجد أفضل أو من دويرة أهله...وكذلك أي مثل حكم أهل الحرم كل من دخل الحرم من غير أهله وإن لم ينو الإقامة به كالمفرد بالعمرة والمتمتع أي من أهل الآفاق والحلال أي وكغير المحرم من أهل الحل إذا دخله أي الحرم لحاجة أي غير إرادة للنسك . (لباب المناسك مع شرحه،ص۹۳).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اہل حرم سے مراد وہ لوگ ہیں جو حدودِ حرم کے اندر رہتے ہیں خواہ وہ وہاں کے مستقل باشندے ہوں یا دوسری جگہ سے آئے ہوں اور خواہ وہ مقیم ہوں یا مسافر، پس جو لوگ مکہ معظّمہ میں یا حدودِ حرم میں کسی اور جگہ مثلاً

منی وغیرہ میں رہتے ہوں حج کے لیے ان کا میقات حدودِ حرم کے اندر کی تمام سرزمین ہے اس میں جہاں سے چاہیں احرام باندھ لیں لیکن مسجد الحرام یعنی بیت اللہ شریف کی مسجد سے احرام باندھنا افضل ہے اس کے بعد ان کو اپنے گھروں سے احرام باندھنا افضل ہے... حج تمتع کرنے والا آفاقی شخص بھی اہل حرم کے حکم میں ہے۔(عمدۃ الفقہ:۴/۹۶۔۹۸،اہل حرم کا میقات)۔

اور منی مکہ مکرمہ سے تین ساڑھے تین میل ہے۔(عمدۃ الفقہ:۴/۴۳۸)۔

زبدۃ المناسک میں ہے:

منی مکہ معظّمہ سے ایک فرسخ ہے۔(زبدہ،ص۱۵۵)۔

اور ایک فرسخ تین شرعی میل کا ہوتا ہے جس کے تقریباً ۴۸۶۴ء۵ کلومیٹر بنتے ہیں۔اور منی حدودِ حرم میں داخل ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

سفر حج میں ایک مرد کا چند عورتوں کے لیے محرم ہونا:

سوال: حج یا عمرہ کے سفر میں ایک مرد کتنی عورتوں کے لیے محرم بن سکتا ہے؟ یعنی ایک مرد کے ساتھ کتنی محرم عورتیں سفر کرسکتی ہیں؟ (ب) کیوں عورت ہر جگہ تنہا سفر کرتی ہے جب کہ حج وعمرہ کے لیے محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے؟ (ج) اگر کسی عورت نے بغیر محرم کے حج کیا تو اس کا حج ادا ہوا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: (الف) بصورتِ مسئولہ ایک مرد کے ساتھ وہ تمام عورتیں سفر کرسکتی ہیں جن کے لیے یہ شخص شرعی محرم بنتا ہے۔مثلاً: بیوی، بہن، ماں، بیٹی، خالہ، پھوپھی، ساس، دادی، نانی، وغیرہ۔(ب) ہر سفر شرعی میں محرم کا ہونا ضروری ہے۔چاہے حج عمرہ کا سفر ہو یا کوئی اور، بلا محرم شرعی سفر طے کرنا عورت کے لیے ناجائز ہے۔(ج) اگر کسی عورت نے بلا محرم کے حج کرلیا تو وہ گنہگار ہوئی اور کراہتِ تحریمی کے ساتھ حج ادا ہوا اور آئندہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔دلائل ملاحظہ کیجئے: شرح لباب المناسک میں مرقوم ہے:

الرابع: أی من شرائط الأداء في خصوص حق النساء المحرم الأمين، وهو كل رجل مأمون عاقل بالغ مناكحتها حرام عليه بالتأبيد سواء كان بالقرابة أو الرضاعة والصهرية

بنکاح أو سفاح فی الأصح کذا ذکره الکرخیؒ وصاحب الهدایة في باب الکراهة ، وذکر قوام الدین شارح الهدایة أنه إذا کان محرماً بالزنا ، فلا تسافر معه عند بعضهم ، وإلیه ذهب القدوری ، وبه نأخذ، انتهی . (شرح اللباب ،ص ٦٠).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ومنها المحرم للمرأة شابة کانت أو عجوزاً إذا کانت بینها و بین مکة مسیرة ثلاثة أیام هکذا فی المحیط وإن کان أقل من ذلک حجت بغیر محرم کذا فی البدائع والمحرم الزوج ومن لا یجوز مناکحتها علی التأبید بقرابة أو رضاع أو مصاهرة کذا فی الخلاصة . (الفتاوی الهندیة: ١/٢١٨).

(ب) بخاری شریف کی روایت میں ہے: عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أن النبي صلی الله علیه وسلم قال: لا تسافر المرأة ثلاثة أیام إلا مع ذی محرم . (صحیح البخاری: ١/١٤٧، باب کم یقصر الصلاة).

حدیثِ مذکور کی شرح کرتے ہوئے علامہ عینیؒ عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

ذکر ما یستنبط منه : احتج به أبوحنیفةؒ وأصحابه وفقهاء أصحاب الحدیث علی أن المحرم شرط في وجوب الحج علی المرأة إذا کانت بینها وبین مکة مسیرة ثلاثة أیام ولیالیها وبه قال النخعیؒ والحسن البصریؒ والثوریؒ والأعمشؒ فإن قلت: الحج لم یدخل الذی نهی عنه النبي صلی الله علیه وسلم وأنه محمول علی الأسفار غیر الواجبة والحج فرض فلا یدخل في هذا النهی قلت: النهی عام في کل سفر ویؤیده ما رواه البخاری ومسلم فقال مسلم: حدثنا أبوبکر بن أبي شیبة وزهیر بن حرب کلاهما عن سفیانؒ قال أبوبکر حدثنا سفیان بن عیینةؒ قال: حدثنا عمروبن دینار عن أبی معبد قال: سمعت ابن عباس رضی اللہ عنہما یقول: سمعت النبي صلی الله علیه وسلم یخطب لایخلون رجل بامرأة إلا ومعها ذومحرم ولا تسافر المرأة إلا مع ذی محرم فقام رجل فقال: یا رسول الله إن امرأتي حاجة وإني اکتتبت في غزوة کذا وکذا قال: انطلق فحج مع امرأتک . . .

قال الطحاوي: اتفقت الآثار التي فيها مدة الثلاث كلها عن النبي صلى الله عليه وسلم في تحريم السفر ثلاثة أيام على المرأة بغير محرم .(عمدۃالقاری:۵/۳۸۶_۳۸۷،دار الحدیث ملتان).

قال ابن بطال في شرح البخاري: وهذا عام في كل سفر ، فمن ادعى أن ذلک في بعض الأسفار دون بعض فعليه الدليل . (شرح صحیح البخاری لابن بطال:۳/۸۶).

وينظر: (فتاوی الشامی: ۶/۳۶۰،و۲/۱۲۰،سعید).

(ج) وقال في إرشاد الساري: ولو حجت بغير محرم جاز حجها بالاتفاق كما لو تكلف رجل مسألة الناس وحج ، ولكنها تكون عاصية ، ومعنى قولهم : لا يجوز لها أن تحج بغير محر م لا يجوز لها الخروج إلى الحج ، وأما الحج فيجوز. (ارشادالساری الی مناسك الملاعلی القاری،ص ۶۱).

وقال في الدرالمختار: ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة . وقال في الشامية: قوله مع الكراهة أى التحريمية للنهي في حديث الصحيحين . (الدرالمختارمع رد المحتار: ۲/۴۶۵،سعید).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

اگرعورت نے بغیرمحرم یاشوہر کے حج کیاتواس کاحج بالاتفاق جائز ہے لیکن وہ محرم یاشوہر کے بغیرحج کی طرف نکلنے کی وجہ سے گنہگار ہوگی پس کراہتِ تحریمی کے ساتھ جائز ہوگا۔ (عمدۃ الفقہ:۴/۵۳)۔واللہ ﷻ اعلم۔

نابالغ بچوں کے حج اورعمرہ کاحکم:

سوال: نابالغ بچوں کے حج یاعمرہ کاکیاحکم ہے؟نیز احرام میں سلاہوا کپڑاپہننا ممنوع ہے یاسخت سردی کی وجہ سے سلے ہوئے کپڑے پہنا سکتے ہیں؟ کیاعمرہ کی نیت بچوں کے اولیاءکریں گے یاوہ خودنیت کریں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: بالغ ہونا یہ حج کے وجوب اور فرض کی جگہ واقع ہونے کی شرط ہے، حج ادا ہونے کے جواز اور صحت کی شرط نہیں، پس نابالغ پر حج فرض نہیں ہے، خواہ وہ نابالغ سمجھدار ہو یعنی ناپاک اور پاک میٹھی اور کڑوی چیز میں تمیز کرسکتا ہو اور جانتا ہو کہ اسلام نجات کا سبب ہے یا تمیز نہ کرسکتا ہو، پس اگر سمجھ دار نابالغ نے خود حج کیا یا ناسمجھ نابالغ کے ولی نے اس کی طرف سے احرام باندھا اور اس لڑکے نے حج ادا کیا تو اس کا حج نفلی ہوگا، حج فرض ادا نہیں ہوگا کیونکہ وہ فرض حج کا مکلّف نہیں ہے، یعنی اگر کسی بچے نے بلوغ سے پہلے حج کیا تو یہ حجۃ الاسلام یعنی فرض حج نہیں ہوگا بلکہ نفلی حج ہوگا اور اس کے ولی کو چاہئے کہ اس نابالغ کو ممنوعاتِ احرام کے ارتکاب مثلاً سلا ہوا کپڑا پہننے اور خوشبو لگانے سے روکے لیکن اگر اس نابالغ سے کسی ممنوع احرام کا ارتکاب ہوا تو اس نابالغ یا اس کے ولی پر کچھ جزا لازم نہیں ہوگی۔ (عمدۃ الفقہ: ۳۰/۴)۔

معلم الحجاج میں ہے:

مسئلہ: اگر نابالغ بچہ ہوشیار اور سمجھدار ہے تو وہ خود احرام باندھے اور افعالِ حج ادا کرے، اور مثل بالغ کے سب افعال کرے، اگر ناسمجھ اور چھوٹا بچہ ہے تو اس کا ولی اس کی طرف سے احرام باندھے۔

مسئلہ: چھوٹا بچہ ناسمجھ اگر خود افعال ادا کرے یا خود احرام باندھے تو یہ افعال اور احرام صحیح نہیں ہوں گے۔ البتہ سمجھ دار بچہ اگر خود احرام باندھے اور افعال خود ادا کرے تو صحیح ہو جائیں گے۔

مسئلہ: سمجھ دار بچہ کی طرف سے ولی احرام نہیں باندھ سکتا۔

مسئلہ: بچہ سمجھدار جو افعال خود کرسکتا ہو خود کرلے اور اگر خود نہ کرسکے تو اس کا ولی کردے البتہ نمازِ طواف بچہ خود پڑھے اس کی طرف سے ولی نہ پڑھے اور اگر بچہ خود طواف کی نماز نہیں پڑھ سکتا تب بھی ولی اس کی طرف سے نہ پڑھے " لا يصلي أحد عن أحد و لا يصوم أحد عن أحد "۔

مسئلہ: سمجھدار بچہ خود طواف کرے اور ناسمجھ کو ولی گود میں لیکر طواف کرائے یہی حکم وقوفِ عرفات اور سعی ورمی وغیرہ کا ہے۔

مسئلہ: ولی کو چاہئے کہ بچہ کو ممنوعاتِ احرام سے بچائے لیکن اگر کوئی فعل ممنوع بچہ کرلے گا تو اس کی جزا واجب نہ ہوگی نہ بچہ پر اور نہ ولی پر۔

مسئلہ: جب بچہ کی طرف سے احرام باندھا جائے تو اس کے بدن سے سلے ہوئے کپڑے نکال دئے جائیں اور چادر ولنگی اس کو پہنا دی جاوے۔

مسئلہ: بچہ پر حج فرض نہیں ہے اس لیے یہ حج نفل ہوگا۔

مسئلہ: بچہ کا احرام لازم نہیں ہوتا اگر تمام افعال چھوڑ دے یا بعض چھوڑ دے تو اس پر کوئی جزا اور قضا واجب نہ ہوگی۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (لباب المناسك مع شرحه، ص ١٢٤، فصل فی احرام الصبی، وغنیة الناسك، ص ٤٣، فصل فی احرام الصبی).

مذکورہ عبارات اور مسائل کی روشنی میں تقریباً تمام سوالات کے جوابات آ چکے ہیں۔ اور جہاں تک سلے ہوئے کپڑے پہنانے کا مسئلہ ہے تو سخت سردی کی وجہ سے سلے ہوئے کپڑوں کی جگہ ہر قسم کے گرم بغیر سلے ہوئے کپڑے ملتے ہیں وہی پہنا دئے جائیں تاہم سلے ہوئے کپڑوں کے پہننے سے جزا لازم نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

گھر سے نماز پڑھ کر میقات پر نیت کرنے کا حکم:

سوال: میں عمرہ کے لیے جا رہا ہوں تو احرام کی نیت سے پہلے ہوائی جہاز میں داخل ہونے سے پہلے نماز پڑھنا درست ہے؟ یعنی احرام کی چادریں اور نیت میقات سے پہلے ہو جائے اور نماز گھر سے ادا کر لی جائے تو یہ درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب: احرام کی دوگانہ سننِ احرام میں سے ہے اوقاتِ مکروہہ کے علاوہ کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں، اور اس کے بعد فوراً نیت کرنا یہ مستحب ہے اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ احرام کی نیت سے پہلے پڑھ لی جائے تاہم کسی مصلحت یا عذر کی وجہ سے بہت پہلے پڑھ لے تب بھی کوئی کراہت نہیں ہوگی۔ نیز احرام کے کپڑے پہننے سے اور نماز دوگانہ پڑھنے سے آدمی محرم نہیں بنتا بلکہ نیت اور تلبیہ پڑھنے سے احرام میں داخل ہوتا ہے۔

شرحِ لباب المناسک میں ہے:

ثم يتجرد عن الملبوس المحرم على المحرم ويلبس من أحسن ثيابه...ثم يصلي ركعتين بعد اللبس أى لبس الإزارين وكذا بعد التطيب ينوى بهما أى بالركعتين سنة الإحرام ليحرز فضيلة السنة، ولو أطلق جاز ...ويستحب إن كان بالميقات مسجد أى مأثور أن يصليهما فيه أى لتحصل له زيادة بركة المكان ولو أحرم بغير صلاة جاز أى جاز إحرامه لا فعله لترك السنة... وإذا سلم أى فرغ من صلاته فالأفضل أن يحرم أى يشرع فى الإحكام وهو جالس مستقبل القبلة في مكانه فيقول بلسانه أى استحباباً . (شرح اللباب، ص ١١٠).

وفي إرشاد الساري: قوله ويتجرد : عده من المستحبات لأنه ليس بواجب قبل الإحرام ولم يتوقف انعقاده عليه . (ارشادالساری،ص ١٠٩).

انعقادِ احرام کے لیے دو چیزیں شرط ہیں (۱) نیت (۲) تلبیہ یا جو تلبیہ کے قائم مقام ہو۔

قال في غنية الناسک: إن التزامها لا يتحقق إلا بالنية مع الذكر أو الخصوصية ... والمراد بالذكر التلبية ونحوها وبالخصوصية ما يقوم مقامها من تقليد البدنة مع السوق . (غنية الناسك،ص ٣٣، فصل فى ماهية الاحرام و شرائطه).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

احرام کی سنتیں نو ہیں... (۶) احرام کی سنت کی نیت سے دو رکعت نماز ادا کرنا...

احرام کے مستحبات بہت ہیں... (۶) اگر نماز دوگانہ احرام پڑھے تو احرام کی نیت کا نماز احرام کے بعد متصل ہی ہونا اور دونوں میں زیادہ فاصلہ نہ ہونا۔ (عمدۃ الفقہ، ص ۱۲۱و۱۲۳)۔

مزید ملاحظہ ہو: (معلم الحجاج، ص ۱۰۹۔۱۱۴)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حالتِ احرام میں مچھر مارنے کی وجہ سے کفارہ کا حکم:

سوال: امسال بعض حاجیوں نے مچھر مارے تو اس کی وجہ سے کوئی جزا وغیرہ واجب ہوگی یا نہیں؟ نیز ان کا یہ فعل صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ کوئی جزاوغیرہ واجب نہیں ، اوراس فعل کی وجہ سے کوئی گناہ بھی لازم نہیں آتا۔ بخاری شریف میں روایت ہے:

عن عبد الله بن عمر وسأله رجل عن المحرم قال: شعبة أحسبه بقتل الذباب فقال: أهل العراق يسألون عن قتل الذباب وقد قتلوا ابن بيت رسول الله صلى الله عليه وسلم ...
(رواه البخاري:۱/۵۳۰).

قال في المختار: ويجوز له قتل البراغيث والبق والذباب والحية والعقرب ...
(المختار، ص۱٤٥،فصل في بيان مايجوز للمحرم ان يفعل ومالايجوز).

وقال العلامة السرخسيؒ في المبسوط : وليس على المحرم في قتل البعوض والذباب والنمل والحلمة والقراد شيء . (المبسوط،ص۱۹۱/۵،بيروت).

وللمزيد راجع : (تبيين الحقائق:۲/۶۸،ملتان،والبحرالرائق:۲/۳۳،ط: كوئته).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

اسی طرح دیگر موذی جانوروں اورحشرات الارض کے حل وحرم اوراحرام میں قتل کرنے سے کوئی جزا واجب نہیں ہوگی اوراس فعل پرکوئی گناہ لازم نہیں ہوگا۔وہ جانور یہ ہیں:... مچھر، پسو، کھٹمل، مکھی پروانہ (پتنگا) ... (عمدۃ الفقہ:۵۵۲/۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

حالتِ احرام میں جھینگر مارنے کی وجہ سے کفارہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے احرام کی حالت میں تین جھینگر (cockroach) ماردئے اس پرصدقہ کی کیا مقدارواجب ہے۔بینواتوجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ جھینگر حشرات الارض کے قبیل سے ہےاورفقہاء کی تصریحات کے مطابق حشرات الارض کومارنے سے کوئی جزاواجب نہیں ہوتی۔ملاحظہ ہوشرحِ لباب المناسک میں مرقوم ہے:

فصل فيما لا يجب شيء بقتله في الإحرام والحرم ...ولا شيء مطلقاً أي قليلاً ولا

كثيراً ، سواء في الحل اوالحرم محرماً أو غيره...ولا بشيء بقتل هوام الأرض أي حشراتها في الحل والحرم والإحرام ، ولاجزاء بقتلها ، ولا إثم على فعلها...والصرصر قال صاحب القاموس: الصرصور دويبة كالصرصر. (شرح اللباب ،ص٤١٨).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

اسی طرح دیگر موذی جانوروں اور حشرات الارض کے حل وحرم اور احرام میں قتل کرنے سے کوئی جزا واجب نہیں ہوگی اور اس فعل پر کوئی گناہ لازم نہیں ہوگا۔وہ جانور یہ ہیں:... کنکھجورا،جھینگر،مچھر،پسو،کھٹمل،مکھی پروانہ (پتنگا)... چھپکلی، کیکڑا،صرصر (ایک قسم کا چھوٹا کیڑا)وغیرہ موذی جانوروحشرات الارض کو مار دینے سے کوئی جزاواجب نہیں ہوتی اس لیے کہ یہ شکار نہیں ... (عمدۃ الفقہ :۵۵۲/۴)۔

مزید ملاحظہ ہو: (معلم الحجاج،ص۲۹۱)۔واللہ ﷻ اعلم۔

عمرہ کے بعد بلاحلق گھر واپس آنے کا حکم:

سوال: جنوبی افریقہ سے ایک عورت گزشتہ سال عمرہ کے لیے گئی،عمرہ ادا کرنے کے بعد قصر کرنا بھول گئی اور واپس اپنے گھر لوٹ آئی،گزشتہ سال سے وہ اسی حالت میں ہے اب وہ کیا کرے؟اگر وہ اپنے گھر پر بال کاٹ لے تو وہ احرام سے نکل جائے گی یا نہیں؟اور اس پر کیا واجب ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: احرامِ عمرہ سے نکلنے کے لیے قصر کرنا عورت پر ضروری تھا،اور قصر نہیں کیا تو مسلسل احرام میں ہے،اب اس عورت پر ضروری ہے کہ یہاں جنوبی افریقہ میں اپنے گھر پر قصر کرلے اور احرام سے نکل جائے اور اس کی وجہ سے ایک دم لازم ہوگا،نیز وہ عورت اب تک مسلسل احرام کی حالت میں رہی تو مختلف جنایات کا ارتکاب بھی کیا ہوگا لیکن چونکہ وہ اپنے آپ کو حلال کی طرح سمجھتی تھی بنابریں تمام جنایات کی طرف سے ایک دم کافی ہوگا یعنی کل دودم واجب ہوں گے جو حرم کے ساتھ مخصوص ہوں گے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

لأن الحلق أو التقصير واجب...فلا يقع التحلل إلا بأحدهما ولم يوجد فكان إحرامه

باقیاً . (بدائع الصنائع: ۲/ ۱٤۰، سعید).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

و تجب شاة بتأخير النسک عن مكانه كما إذا خرج من الحرم وحلق رأسه سواء كان الحلق للحج أو العمرة . (الفتاوى الهندية: ۱/۲٤۷).

قال في شرح اللباب: يختص حلق الحاج بالزمان والمكان أي عند أبي حنيفة، ... وحلق المعتمر بالمكان... والمكان الحرم والتخصيص للتضمين لا للتحلل فلو حلق أو قصر في غير ما توقت به لزمه دم، ولكن يحصل به التحلل في أي مكان وزمان أتى به بعد دخول وقته أي أوان تحلله . (شرح اللباب، ص۲٥۳).

قال في غنية الناسک: وإذا اختلف جنس الجناية تعذر التداخل إلا إذا فعلها على قصد رفض الإحرام، فإن المحرم إذا نوى رفض الإحرام، فجعل يصنع ما يصنعه الحلال من لبس الثياب والتطيب والحلق والجماع وقتل الصيد، فعليه دم بجميع ما ارتكب . (غنية الناسك، ص۱۲۹، باب الجنايات). **واللہ ﷻ اعلم۔**

متمتع کا حج بدل کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص جنوبی افریقہ سے حج کے لیے گیا ہوا ہے، اس نے تمتع کی نیت کی تھی، اور وہاں پہنچ کر عمرہ ادا کر چکا ہے، ابھی اس کو کسی کی طرف سے حج بدل کے لیے کہا جا رہا ہے جبکہ پہلے وہ اپنا فرض حج کر چکا ہے تو کیا حج بدل کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ اور اگر درست ہے تو آمر پر جنوبی افریقہ سے حج کرانے کا خرچہ لازم ہوگا یا وہیں سے کرانے کا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور کے میقات سے باہر جانے پر بھی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تمتع باطل نہ ہوگا، بنابریں یہ شخص دوسرے کی طرف سے حج بدل نہیں کرسکتا، حج بدل کے لیے کسی اور کو آمر کے وطن سے بھیجنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں:

محمد ، عن يعقوب ، عن أبي حنيفةؒ في كوفي قدم مكة بعمرة في أشهر الحج، ففرغ منها وقصر ، ثم اتخذ مكة أو البصرة داراً ، ثم حج من عامه ذلك ، قال: فهو متمتع .

وقال العلامة اللكنوى فى النافع الكبير: قوله فهو متمتع ، أما إذا اتخذ بمكة داراً فلأنه ترفق بنسكين في سفر واحد في أشهر الحج ، وأما إذا اتخذ البصرة داراً فكذلك ، وذكر الطحاوي أن هذا قول أبي حنيفةؒ ، أما على قولهما لا يكون متمتعاً ؛ لأن صورة التمتع أن يكون عمرته ميقاتية وحجه مكية ، وهذا قد أحرم لكل واحد منهما من الميقات، فلا يكون متمتعاً، وذكر الجصاص أنه لا خلاف فيه ، وهو قول الكل كما ذكرنا ههنا، ووجهه أن شبهة السفر الأول قائمة ما لم يعد إلى وطنه، فوجب الدم نسكاً، لأن الأصل فى العبادة هو الإيجاب احتياطاً . (الجامع الصغير مع النافع الكبير،ص۱۵۷،باب فى التمتع،ط: عالم الكتب).

قال في الجوهرة : أما إذا رجع إلى غير بلده كان متمتعاً عند أبي حنيفةؒ ويكون كأنه لم يخرج من مكة وعندهما لا يكون متمتعاً . (الجوهرة: ۱۳۳/۲،باب التمتع).

(وكذا فى المبسوط للامام السرخسيؒ: ۳۳۴/۴،ط: بيروت، وتبيين الحقائق: ۵۰/۲،باب التمتع، وغنية الناسك،ص۱۱۴).

وقال العلامة الشامي: وأثر الخلاف يظهر في لزوم الدم وغلطه الجصاص في نقل الخلاف بل يكون متمتعاً اتفاقاً لأن محمداً ذكر المسألة ولم يحک فيها خلافاً قال أبو اليسر وهو الصواب وفى المعراج : أنه الأصح . (فتاوى الشامى: ۵۴۲/۲،سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

زوجِ ثانی کے بیٹے کے ساتھ حج میں جانے کا حکم:

سوال: ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا، پھر اس نے دوسری شادی کی اس زوجِ ثانی کے چار بیٹے ہیں، جو شادی شدہ نہیں، پھر چند ماہ کے بعد زوجِ ثانی کا بھی انتقال ہوگیا، اب یہ عورت ان چار بیٹوں میں سے ایک کے ساتھ حج میں جانا چاہتی ہے، جبکہ زوجِ اول کے ساتھ اپنا فرض حج کر چکی ہے، تو کیا اس عورت کے لیے اپنے سوتیلے بیٹے کے ساتھ سفرِ حج کو جانا جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ زوجِ ثانی کا بیٹا محرم ہے بنابریں اس کے ساتھ سفرحج میں جانے کی اجازت ہے ہاں نوجوان ہو اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو نہیں جانا چاہئے اور حتی الامکان خلوت سے بھی اجتناب کرنا چاہئے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ولا تنكحوا ما نكح أباؤكم من النساء﴾ [سورة النساء:۲۲].

قال العلامة الآلوسي: ويستقل في إثبات هذه الحرمة نفس النكاح أعنى العقد إن كان صحيحاً ولا يشترط الدخول، وإلى ذلك ذهب ابن عباس رضي الله عنه، فقد أخرج عنه ابن جرير، والبيهقي أنه قال: كل امرأة تزوجها أبوك دخل بها أو لم يدخل بها فهي عليك حرام، وروى ذلك عن الحسن، وابن أبي رباح، وإن كان النكاح فاسداً فلا بد في إثبات الحرمة من الوطء أو ما يجرى مجراه من التقبيل والمس بشهوة مثلاً. (روح المعاني:۲٤٦/٤).

قال في الفتاوى الهندية: والمحرم الزوج ومن لا يجوز مناكحتها على التأبيد بقرابة أو رضاع أو مصاهرة كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۲۱۹/۱).

وكذا في البحر الرائق: ۳۳۹/۲،ط:دار المعرفة،والجوهرة: ۷۷/۲).

وقال في المحيط البرهاني: والمحرم في حق المرأة شرط، شابة كانت أو عجوزاً إذا كان بينها وبين مكة مسيرة ثلاثة أيام ...والمحرم: الزوج، ومن لا يجوز له مناكحتها على التأبيد برضاع أو صهرية؛ لأن المقصود من المحرم الحفظ؛ لأن النساء عرضة للفتنة والزوج يحفظها، وكذا سائر محارمها يحفظونها، ولا يطمع فيها إذا لم تجزمنا كحتها على التأبيد. (المحيط البرهاني:۶۹۱/۲،فصل ۱، في بيان شرائط الوجوب).

وقال في الشامية: لكن قال في شرح اللباب: ذكر قوام الدين شارح الهداية أنه إذا كان محرماً بالزنى فلا تسافر معه عند بعضهم وإليه ذهب القدوري وبه نأخذ وهو الأحوط في الدين والأبعد عن التهمة. (فتاوی الشامی:۴٦٤/۲،سعید).

فتاویٰ رحیمیہ میں ساس کے بارے میں مرقوم ہے کہ جوان ہو تو احتیاط کی ضرورت ہے:

مگر آج کل فتنہ کا زمانہ ہے، سسرالی رشتہ سے احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً جب کہ جوان ہوں۔ (فتاویٰ

رحیمیہ:۸/۲۸۷)۔ وکذا فی معلم الحجاج،ص۹۵،وعزیز الفتاوی:۳/۵۷۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بدنہ کی جگہ سات بکری دینے کا حکم:

سوال: ایک عورت نے حالتِ حیض میں طوافِ زیارت کرلیا،مفتی حضرات نے اس کوایک اونٹ ذبح کرنے کے لیے کہا،اس نے اونٹ کی جگہ سات دنبوں کوذبح کرلیا تو یہ جائز ہے یانہیں؟بینواتوجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اونٹ کی جگہ سات دنبے ذبح کرنا کافی نہیں ہے۔بڑے جانور مثلاً اونٹ یا گائے وغیرہ کاذبح کرنالازم ہے۔ملاحظہ ہوفتاوی اسعدیہ میں مرقوم ہے:

سوال: عمن وجب عليه بدنة ، هل يجزيء عنه سبعة دماء من الغنم أم لا ؟ أفتونا .

الجواب: لا بد من البدنة ؛ لإطلاق العلماء رحمهم الله تعالىٰ في تعيين البدنة ولم يقل أحد منهم غير هذا كما يقولون فيمن وجب عليه هدي يجب عليه دم أو سبع بدنة . والله أعلم. (الفتاوى الاسعدية : ١/٤٨،كتاب الحج، ط: دارالفارابى للمعارف).

فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے:

سوال: جس حاجی پر بدنہ لازم ہووہ اس کی جگہ سات بکرے ذبح کرسکتا ہے یانہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں بجائے بدنہ کے سات بکرے ذبح کرنے کی گنجائش نہیں،اونٹ یا گائے جیسے بڑے جانور کوذبح کرنا ضروری ہے۔فتاوی اسعدیہ میں ہے: **سوال: عمن وجب عليه بدنة الخ...** (فتاوی رحیمیہ:۴/۲۳۴،ط:دیوبند)۔واللہ ﷻ اعلم۔

حرمین میں پہلے کہاں جانا چاہئے؟

سوال: حرمین میں سے پہلے کہاں جانا چاہئے؟ مکہ معظّمہ یامدینہ منورہ؟بینواتوجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگرپہلی بار حاضری کا موقع ملا ہےتو مکہ معظّمہ جانا افضل ہے ورنہ اختیار ہے ہاں مدینہ منورہ پہلے جانا بہتر ہوگا،البتہ اگر مدینہ طیبہ کے راستے سے گزرہوتو بہرصورت مدینہ طیبہ کی حاضری مقدم

ہے۔ملاحظہ ہوشرحِ لباب المناسک میں ہے:

(فيبدأ بالحج ثم بالزيارة)...(إن لم يمر بالمدينة في طريقه) أى كاهل الشام (وإن مر بها بدأ بالزيارة لا محالة) لأن تركها مع قربها يعد من القساوة و الشقاوة ، وتكون الزيارة حينئذٍ بمنزلة الوسيلة وفي مرتبة السنة القبلية للصلاة... وقد روى الحسن عن أبي حنيفةؒ أنه إذا كان الحج فرضاً فالأحسن للحاج أن يبدأ بالحج ثم يثنى بالزيارة وإن بدأ بالزيارة جاز...(وإن كان الحج نفلاً فهو بالخيار) أى إذا كان آفاقياً (بين البداء ة بالمختار) أى بزيارته صلى الله عليه وسلم ...(وبين أن يحج أولاً ليطهر من الأوزار فيزور الطاهر طاهراً)

...(شرح اللباب،ص۵۵۳،باب زيارة سيدالمرسلين).

(وكذا في غنية الناسك ،ص ۲۰۱ ، خاتمة في زيارة قبر سيد المرسلين صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ، والدر المختار مع ردالمحتار: ۶۲۷/۲،سعيد، وحاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، ص۷۴۵،قديمى، ومجمع الانهر فى شرح ملتقى الابحر:۴۶۳/۱، والفتاوى الهندية: ۲۶۵/۱).

اعلاء السنن میں مرقوم ہے:

قلت: وقوله صلى الله عليه وسلم " من حج البيت فلم يزرني فقد جفاني"...وفيه إشعار ببداية الحج ثم إتيان المدينة للزيارة كما لا يخفى، وهو اختيار إمامنا أبي حنيفةؒ ، ففي فتاوى أبى الليث السمرقندى: روى الحسن بن زيادؒ عن أبي حنيفةؒ أنه قال: الأحسن للحاج أن يبدأ بمكة ، فإذا قضى نسكه مر بالمدينة ، وإن بدأ بها جاز...واختلف السلف في أن الأفضل البداء ة بالمدينة قبل مكة أو بمكة قبل المدينة ، وأن ممن اختار البداء ة بالمدينة علقمةؒ ، والأسودؒ ، وعمروبن ميمونؒ من التابعين ، ولعل سببه عندهم كما قال السبكى إيثار الزيارة ، من وفاء الوفاء (۴۱۱/۲).(اعلاء السنن:۵۰۱/۱۰، زيارة قبرالنبى صلى الله عليه وسلم ،ادارة القرآن، كراتشى).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

اگر یہ پہلا حج ہے تو پہلے مکہ معظّمہ جانا افضل ہے،ورنہ پہلے مدینہ طیبہ کی حاضری افضل ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:

۱۰/۴۴۲، جامعہ فاروقیہ)۔

معلم الحجاج میں مرقوم ہے:

مسئلہ: جس شخص پر حج فرض ہو اس کو حج سے پہلے زیارت کرنا جائز ہے بشرطیکہ حج فوت ہونے کا خوف نہ ہو مگر بہتر اس کے لیے پہلے حج کرنا ہے اور حج نفل کرنے والے کو اختیار ہے کہ چاہے پہلے حج کرے یا زیارت کرے اور جس شخص کے راستے میں حج کے لیے آتے ہوئے مدینہ منورہ پڑتا ہو جیسے شام کی طرف سے آنے والے ان کو پہلے ہی زیارت کرنی چاہئے۔ (معلم الحجاج ص۳۷۳)۔

(وکذا فی عمدۃ الفقہ:۴/۶۸۹، زیارتِ شریفہ کے احکام)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حرمین میں سے کونسا افضل ہے؟

سوال: حرمین میں سے کونسا افضل ہے؟ مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ؟ بینوا توجروا۔

الجواب: یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ (زادھما اللّٰہ شرفاً وتعظیماً) تمام بلاد سے افضل ہیں۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں میں کون افضل ہے۔

ہمارے نزدیک مکہ مکرمہ مدینہ منورہ سے افضل ہے یہی مذہب امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک مدینہ منورہ افضل ہے، لیکن یہ اختلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد مبارک کے ماسوا میں ہے، زمین کا وہ حصہ جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے ملا ہوا ہے وہ بالاتفاق تمام مقامات سے افضل ہے حتی کہ مسجدِ حرام وکعبہ، عرش وکرسی سے بھی افضل ہے۔ (معلم الحجاج ص۳۶۹، سفر مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً)۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے مجموعۃ الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ یہ رائے سب سے پہلے قاضی عیاضؒ نے ظاہر کی ان سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی: **قال: وأما " التربة " التي دفن فيها النبي صلى الله عليه وسلم فلا أعلم أحداً من الناس قال: إنها أفضل من المسجد الحرام، أو المسجد النبوی، أو المسجد الأقصى؛ إلا القاضي عياضؒ، فذكر ذلک إجماعاً، وهو قول لم يسبقه إليه أحد فيما علمناه، ولا حجة عليه، بل بدن النبي صلى الله عليه وسلم أفضل من المساجد.**

(مجموعة الفتاوى : ٢٧/٣٧).

ہمارے مشائخ نے قاضی عیاض کی رائے کو لیا ہے ابن تیمیہ کے نظریہ کو نہیں لیا۔

قال الإمام النوويؒ في شرح صحيح مسلم: قوله صلى اللّٰہ عليه وسلم:" صلاة في مسجدي هذا أفضل من ألف صلاة فيما سواه إلا المسجد الحرام" اختلف العلماء في المراد بهذا الاستثناء على حسب اختلافهم في مكة والمدينة أيتهما أفضل ؟ ومذهب الشافعيؒ وجماهير العلماء : أن مكة أفضل من المدينة ، وأن مسجد مكة أفضل من مسجد المدينة ، عكسه مالك وطائفة ...قال القاضي عياض : أجمعوا إلى أن موضع قبره صلى اللّٰہ عليه وسلم أفضل بقاع الأرض، وأن مكة والمدينة أفضل بقاع الأرض، واختلفوا في أفضلهما ماعدا موضع قبره صلى اللّٰہ عليه وسلم، فقال عمر رضي الله عنه وبعض الصحابة ومالكؒ وأكثر المدنيين: المدينة أفضل ، وقال أهل مكة والكوفة والشافعيؒ وابن وهبؒ وابن حبيبؒ المالكيان : مكة أفضل ، قلت: ومما احتج به أصحابنا لتفضيل مكة حديث عبد اللّٰہ بن عدى بن الحمراء رضى اللّٰہ عنه أنه سمع النبى صلى اللّٰہ عليه وسلم وهو واقف على راحلته بمكة يقول: " واللّٰہ إنك لخير أرض اللّٰہ واحب أرض اللّٰہ إلى اللّٰہ ، ولولا إني أخرجت منك ما خرجت " رواه الترمذى والنسائى وقال الترمذى : هو حديث حسن صحيح ، وعن عبد اللّٰہ بن الزبير رضى اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم: صلاة في مسجدي هذا أفضل من ألف صلاة فيما سواه من المساجد إلا المسجد الحرام وصلاة فى المسجد الحرام أفضل من مائة صلاة في مسجدي" حديث حسن رواه أحمد بن حنبل فى مسنده ، والبيهقى وغيرهما بإسناد حسن ، واللّٰہ أعلم . (شرح صحيح مسلم:١/٤٤٦).

(وكذا فى اخبار مكة للفاكهى:٣/٢٦٩).

شرح لباب المناسک میں ہے:

فصل: أجمعوا على أن أفضل البلاد مكة والمدينة زادهما اللّٰہ شرفاً وتعظيماً ، ثم

اختلفوا فيما بينهما أى فى الأفضل منهما ، وكان الأولى أن يقول: اختلفوا أيهما أفضل، فقيل: مكة فضل من المدينة ، وهو مذهب الائمة الثلاثة ، وهو المروى عن بعض الصحابة وقيل: المدينة أفضل من مكة وهوقول بعض المالكية ومن تبعهم من الشافعية قيل هو المروى عن بعض الصحابة ، ولعل هذا مخصوص بحياته صلى الله عليه وسلم أو بالنسبة إلى المهاجرين من مكة ، وقيل : بالتسوية بينهما هذا قول مجهول لا منقول ولا معقول...والخلاف فيما عدا موضع القبر المقدس وكذا فى بيت المستأنس ، فإن الكعبة أفضل من المدينة ما عدا الضريح الأقدس بالاتفاق ، وكذا الضريح أفضل من المسجد الحرام بلا خلاف بل قال الجمهور: فما ضم أعضاء ه الشريفة فهو أفضل بقاع الأرض بالإجماع أى بالاتفاق النقلي أو بالإجماع السكوتي حتى من الكعبة أى عند بعضهم ومن العرش أى أيضاً على ما صرح به بعضهم فقد نقل القاضي عياض وغيره الإجماع على تفضيل ما ضم الأعضاء الشريفة حتى على الكعبة المنيفة وإن الخلاف فيما عداه ،ونقل ابن عقيل الحنبلي أن تلك البقعة أفضل من العرش، وقد وافقه السادة البكريون على ذلک .

(لباب المناسك مع شرحه،ص۵۸۲).

ابوعبداللہ محمد بن اسحاق المکی الفاکہی (م۲۷۲ھ) نے اپنی نامور کتاب" أخبار مكة "میں چند اشعار نقل کیے ہیں:

يا أيها المدني أرضک فضلها ۞ فوق البلاد وفضل مكة أفضل

أرض بها البيت المحرم قبلة ۞ للعالمين له المساجد يعدل

حرم حرام أرضها وصيودها ۞ والصيد في كل البلاد محلل

وبها المشاعر والمناسک كلها ۞ وإلى فضيلتها البرية ترحل

وبها المقام وحوض زمزم مترعاً ۞ والحجر والركن الذى لا يرحل

والمسجدالعالى الممجد والصفا ۞ والمشعران ومن يطوف ويرمل

هل فى البلاد محلة معروفة ۞ مثل المعرف أو محل يحلل

أومثل جمع في المواطن كلها ۞ أومثل خيف منى بأرض منزل

وبمكة الحسنات يضعف أجرها ۞ وبها المسيء عن الخطيئة يسأل

ما ينبغي لك أن تفاخر يا فتى ۞ أرضاً بها ولد النبي المرسل

إلى قوله:

فضل المدينة بين ولأهلها ۞ فضل قديم نورها يتهلل

من لم يقل إن الفضيلة فيكم ۞ قلنا كذبت وقول ذلك أرذل

لا خير فيمن ليس يعرف فضلكم ۞ من كان يجهله فلسنا نجهل

في أرضكم قبر النبي وبيته ۞ والمنبر العالي الرفيع الأطول

وبها قبور السابقين بفضلهم ۞ عمر وصاحبه الرفيق الأفضل

(اخبار مكة: ۲/ ۲۸۸، ذكر المقام بمكة والجوار بها).

حافظ ابن عبد البرؒ نے فرمایا کہ امام مالکؒ نے ایک روایت نقل کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ افضل ہے لیکن ان کا مشہور مذہب یہ ہے کہ مدینہ منورہ افضل ہے۔ ملاحظہ ہو:

وقد روى مالكؒ ما يدل على أن مكة أفضل الأرض كلها ولكن المشهور عن أصحابه في مذهبه تفضيل المدينة حدثنا عبد الرحمن بن يحيى...عن عبد الله بن وهب قال: حدثني مالك بن أنسؒ أن آدم لما أهبط إلى الأرض بالهند أو السند قال: يارب هذه أحب الأرض إليك أن تعبد فيها قال: بل مكة فسار آدم حتى أتى مكة ...الخ.

(التمهيد: ۲/ ۲۸۹، ط: مؤسسة القرطبه).

وللاستزادة انظر: (فتح الملهم: ٦/ ۳۰۲، وفتاوى الشامي: ۲/ ٦۲٦، سعيد، وفتح القدير: ۳/ ٦، دار الفكر وحاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص ٧٤١، قديمي، والبحر الرائق: ۳/ ٤٠). **واللہ ﷻ اعلم۔**

نماز میں کعبہ کی طرف منہ کرنے پر عبادت کا شبہ:

سوال: بعض غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ جیسے ہم اصنام کی طرف منہ کر کے اصنام کی عبادت کرتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی کعبہ کی طرف منہ کر کے کعبہ کی عبادت کرتے ہیں، اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: ہم کعبہ کو مسجود اور معبود نہیں سمجھتے صرف استقبالِ قبلہ کرتے ہیں وہ بھی بعض حالات میں ساقط ہو جاتا ہے جس کی وجوہات درجِ ذیل ہیں:

(۱) قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں تحری ہے اور اگر بعد نماز کے تحری غلط ثابت ہوئی تب بھی نماز ہوگئی، نیز نوافل میں شہر سے باہر قبلہ کا التزام نہیں ہے، سفر وغیرہ میں جس طرف سواری کا رخ ہو نماز پڑھنا جائز ہے۔

(۲) تمام عالم کے مسلمانوں کے اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے کعبہ کی سمت مقرر کی گئی ہے۔

(۳) کعبہ مقصود بالذات ہوتا تو اس کی تصویر کی طرف نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

(۴) کعبہ کے اندر اور اس کے اوپر نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ اس میں کعبہ کی طرف پشت ہوگی۔

(۵) ہوائی جہاز میں نماز پڑھتے وقت فقط سمت کا لحاظ رکھا گیا ہے ورنہ کعبہ تو جہاز سے بہت نیچے ہے۔

(۶) اگر کعبہ نعوذ باللہ منہدم ہو جائے تب بھی اس کی جہت کی طرف نماز جائز ہے۔

(۷) جو مکہ مکرمہ سے باہر رہتا ہے تو نفس کعبہ اس کا قبلہ نہیں بلکہ جہتِ کعبہ قبلہ ہے۔

نیز ملاحظہ ہو: (احکام اسلام عقل کی نظر میں، ص ۵۵)۔

معارف القرآن میں حضرت مولانا ادریس صاحب رقمطراز ہیں:

ہم خانہ کعبہ کی عبادت اور پرستش نہیں کرتے اور نہ ہم خانہ کعبہ کو معبود اور مسجود سمجھتے ہیں ہم عبادت صرف خدا کی کرتے ہیں البتہ منہ قبلہ کی طرف کرتے ہیں چنانچہ لفظ استقبالِ کعبہ اور لفظ بت پرستی خود اس پر شاہد ہے، استقبال کے معنی صرف اس کی طرف منہ کرنے کے ہیں اور بت پرستی کے معنی یہ ہیں کہ بت معبود ہیں ہاں اگر اہل اسلام کعبہ پرستی کے قائل ہوتے تو اعتراض بجا تھا۔

دوم: یہ کہ اہل اسلام کے نزدیک نماز کے صحیح ہونے کے لیے فقط کعبہ کی طرف منہ ہو جانا کافی ہے استقبال

کی نیت بھی ضروری نہیں، مقصود معبود ہے اس کی نیت ضروری ہے، جہت ِقبلہ اس کا وسلیہ ہے اور وسیلہ کی نیت ضروری نہیں، معاذ اللہ اگر خانہ کعبہ کی عبادت ہوتی تو معبود کی نیت ضروری ہوتی۔

سوم: یہ کہ نماز کے شروع سے لے کر اخیر تک کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو خانہ کعبہ کی تعظیم پر دلالت کرے شروع سے اخیر تک ہر لفظ اور ہر فعل حق تعالیٰ کی تعظیم اور کبریائی اور اس کی حمد وثنا اور تسبیح اور تقدیس ہی پر دلالت کرتا ہے اول سے اخیر تک خانہ کعبہ کا نام تک نہیں آتا اور بت پرستی میں ان پتھروں اور مورتوں کی تعظیم ہوتی ہے جن کو آپ مہادیو اور شب وغیرہ بتاتے ہیں غرض یہ کہ بت پرستی کو نماز سے کیا نسبت۔

چہارم: یہ کہ خانہ کعبہ ان اینٹوں اور پتھروں کا نام نہیں اور نہ انہدام کعبہ کے بعد نماز موقوف ہو جاتی ہے اسی وجہ سے جس زمانہ میں خانہ کعبہ اور اس کی دیواریں منہدم ہوئیں نماز بدستور قدیم جاری رہی اگر دیوار کعبہ مسجود ومعبود یا مقصود ہوتی تو اس زمانہ میں نماز موقوف رہتی بہت ہوتا تو یہ کہ بعد تعمیر ایام گزشتہ کی عبادت قضا کی جاتی اور بت پرستی میں ظاہر ہے کہ بت ہی معبود و مسجود اور مقصود ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شوالے یا مندر سے بتوں کو اٹھا کر کہیں اور رکھ دیں تو پھر سارے فرائض وہیں ادا ہوتے ہیں مکانِ اول کو کوئی نہیں پوچھتا۔

اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی خانہ کعبہ کی چھت پر نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہے اگر کعبہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو اُس کے اوپر چڑھ کر نماز درست نہ ہوتی اس لیے کہ خانہ کعبہ اب اس کے سامنے نہیں نیز معبود پر چڑھنا گستاخی ہے، معترضین نے اپنے اوپر قیاس کیا ہوگا کہ وہ گائے اور بیل کو دیوتا اور معبود بھی سمجھتے ہیں پھر ان پر سوار بھی ہوتے ہیں اور سامان بھی لادتے ہیں اور اگر دیوتا جلدی جلدی نہیں چلتا تو پیچھے سے اس کے ڈنڈے بھی مارتے ہیں؛ ''بریں عقل ودانش بباید گریست''۔

پنجم: خانہ کعبہ کو اہل اسلام بیت اللہ کہتے ہیں، اللہ یا خدا نہیں کہتے اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مکان کی طرف جاتا ہے تو مکین مقصود ہوتا ہے اور وہاں جا کر جو آداب ونیاز بجالاتا ہے تو ہر شخص اُس آداب اور نیاز کو صاحبِ خانہ کے لیے سمجھتا ہے جیسے تخت کی طرف جھک کر سلام کرنا تو وہ سلام صاحبِ تخت کو ہوتا ہے خود تخت کو نہیں ہوتا اور بت پرست اپنے بتوں کو خانہ خدا یا تختِ خدا نہیں سمجھتے بلکہ وہ بت خود مقصود اور معبود ہوتے ہیں اور ان کو مہادیو یا شب یا گنیش وغیرہ سمجھ کر اُن کی عبادت کرتے ہیں۔ (معارف القرآن:۲/۱۷۔۱۸)۔

یہ تحریر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ کی ایک کتاب ''قبلہ نماز'' کا خلاصہ ہے۔

مزید تفصیل کے لیے اس کتاب کی مراجعت مفید ہوگی۔واللہ ﷻ اعلم۔

ربیع الاول تک حاجی سے دعا کرانے کا حکم:

سوال: حج کے بعد ربیع الاول تک یا چالیس دن تک حاجی کی دعا قبول ہوتی ہے، یہ بات حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر حدیث میں ہے تو اس کا درجہ کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بہت ساری احادیث میں حاجی کی دعا کے قبول ہونے کا اور اس سے دعا کرانے کا تذکرہ ہے، بعض روایات میں آتا ہے کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے دعا کرائی جائے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفاً یہ بات مروی ہے کہ ربیع الاول کے پہلے عشرہ تک حاجی کی دعا قبول ہوتی ہے البتہ یہ روایت لیث بن ابی سلیم کی وجہ سے ضعیف ہے۔ملاحظہ فرمایئے؛ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

(۱) حدثنا عبد السلام بن حرب، عن ليث ، عن مجاهد ، قال: قال عمر ﷺ: يغفر للحاج ، ولمن استغفر له الحاج ، بقية ذى الحجة ، والمحرم ، وصفراً ، وعشراً من شهر ربيع الأول . (مصنف ابن ابی شیبۃ:۲۹/۸/۱۲۸۰۰).

وفي سنده ليث ابن أبى سليم والجمهور على تضعيفه .

(۲)عن عبد الله بن عمر ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا لقيت الحاج فسلم عليه وصافحه ومره أن يستغفر لک قبل أن يدخل بيته فإنه مغفور له . (اخرج الامام احمد فی مسنده رقم: ۵۳۷۱).

قال الشيخ شعيب : إسناده ضعيف جداً . وقال الهيثمى (۱۶/۴) **فيه محمد بن البيلمانى، وهو ضعيف ، انتهى. وقال ابن حبان : حدث عن أبيه بنسخة كلها موضوعة لايجوز الاحتجاج به.** (الضعفاء:۲/۲۶۴).

قال الشيخ المناوي فى فيض القدير (۴۳۷/۱)**: وظاهر الحديث أن طلب الاستغفار**

منــه مـؤقت بما قبل الدخول فإن دخل فات لكن فى الإحياء عن عمر رضي الله عنه...فينزل الحديث على الأولوية فالأولى طلب ذلک منه حال دخوله فلعله يخلط أو يلهو .

المقاصد الحسنة میں علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں:

(۳) حـديـث: "يـغـفـر للحاج ولمن استغفرله الحاج". البزار والطبرانی فی الصغير عـن أبی هريرة رضي الله عنه بـه مـرفـوعـاً وهـو عـنـد ابن خزيمة في حصيحه والحاكم في مستدركه والبيهـقـی بـلـفظ " اللّهم اغفر للحاج ولمن استغفرله الحاج " وقال الحاكم إنه على شرط مسـلـم وتـعقب بأن فی سنده شريكاً القاضی ولـم يخرج له إلا فی المتابعات ولكن له شاهد عـنـد التيـمـی في ترغيبه عن مجاهد مرسلاً ، ونحوه ما عند أحمد في مسنده عن أبی موسى الأشعری رضي الله عنه قـال: إذا رجـع يـعـنـی الـحـاج مـن الـحج المبرور رجع وذنبه مغفور ودعاؤه مستـجـاب " إلـى غير ذلک من الآثار حسبما بينته فی الأمالی...ولمسدد في مسنده وأبی الشيـخ فـی الثواب وغيرهما عن عمر رضي الله عنه ... وهـو مـن رواية ليث بن أبي سليم وهوضعيف عن المهاجر بن عمرو الشامی عن عمر رضي الله عنه وهو فيما أظنه منقطع ويشهد له ماجاء عن يوسف بـن أسبـاط عـن يـاسين الزيات وهو ضعيف أنه قال: يغفر للحاج ولمن استغفر له الحاج فی ذی الحجة والمحرم وصفر وعشرين من ربيع الأول أورده الدينوری فی الجزء الثانی عشر مـن مـجـالسـتـه ومثله لا يقال رأياً فحكمه إن ثبت الرفع ، ويمكن أن تكون حكمته أن أكثر الـحـاج يـصـل إلـى مـكة في أول ذی الحجة أو قبله بيسير ومعلوم أن الحسنة بعشر أمثالها فيـجـعل لكل يوم من عشر ذی الحجة ما عدا يوم الوقوف لمزيد الثواب فيه عشرة أيام فبلغ ذلک تسـعين يوماً القدرالمذكور فی حديث عمر رضي الله عنه ويحتمل أن يكون ذلک أقصى زمن ينتهی فيه القاصد مكة بعد حجه لبلده غالباً... (المقاصدالحسنة،ص۷٤۲،رقم:۱۳٤۷).

امام ابویوسفؒ نے امام صاحبؒ سے محرم کے آخر تک دعا قبول ہونے کی روایت نقل فرمائی ہے۔ملاحظہ ہو:

(۴) قـال: حـدثـنـا يـوسفؒ ، عـن أبيـه ، عـن أبي حنيفةؒ ، عن شيخ من بنی ربيعة ، عن

معاوية بن إسحاق القرشي، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الحاج مغفور له ولمن استغفر له إلى انسلاخ المحرم . (الآثار لابی یوسف:۲/۲۹/۵۱۰).

قوله إلى انسلاخ المحرم أي إلى فراغ شهر محرم الحرام ، فإنه كان أبعد مسافة من مكة ، في تلك الأيام . (شرح مسندابی حنیفة:۱/۳۴۷).

(۵) أخرج الإمام البيهقي عن ابن عباس رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم: خمس دعوات يستجاب لهن... دعوة الحاج حين يصدر . (شعب الایمان :۳/۱۸۲). واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیت المقدس سے احرام باندھنے کی فضیلت:

سوال: جنوبی افریقہ سے بہت سارے حضرات حرمین شریفین کے ساتھ بیت المقدس جاتے ہیں، پھر بیت المقدس سے عمرہ یا حج کا احرام باندھتے ہیں اور یہ حدیث بیان کرتے ہیں: "**من أهل بالحج من بيت المقدس غفر له ما تقدم من ذنبه**"، کیا یہ حدیث ثابت ہے یا نہیں؟ اور کیا فقہاء نے بیت المقدس سے احرام باندھنے کی فضیلت کے بارے میں کچھ تحریر فرمایا ہے یا نہیں؟ کیا یہ فضیلت فقط حج کے لیے ہے یا عمرہ کے لیے بھی ہے؟ نیز اس سلسلہ میں کوئی اور روایات یا تائیدات موجود ہوں تو بتلا دیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مذکورہ بالا روایت کتبِ حدیث میں مروی ہے البتہ ضعیف ہے، نیز ہمارے فقہاء نے بھی اس فضیلت کو بیان فرمایا ہے، اور یہ فضیلت حج، عمرہ دونوں کے لیے مروی ہے اور بعض صحابہ کرام کے عمل سے بھی ثابت ہے۔ حدیث شریف اور اس پر کلام ملاحظہ کیجئے:

(۱) أخرج الإمام ابن ماجه في سننه (۳۰۰۱) **قال: حدثنا أبوبكر بن أبي شيبة حدثنا عبد الأعلى، عن محمد بن إسحاق عن يحيى بن أبي سفيان عن أمه أم حكيم بنت أمية** (مجهولة الحال) **عن أم سلمة زوج النبي صلى الله عليه وسلم قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من أهل بعمرة من بيت المقدس غفر له** .

وأيضاً أخرجه أبويعلى في مسنده (۶۹۰۰)، **وابن أبي شيبة في مصنفه** (۱۲۸۳۷)،

وضياء الدين المقدسى فى فضائل بيت المقدس(٥٨) والطبرانى فى الكبير (١٠٠٦).

قال الشيخ بشار: إسناده ضعيف لجهالة أم حكيم بنت أمية ولاضطرابه فقد اختلف الرواة في متنه وإسناده اختلافاً كثيراً، وقال ابن القيم وغير واحد من الحفاظ : إسناده ليس بالقوى . (تعليقات الشيخ بشارعلى سنن ابن ماجه: ٤/٤٢٨).

حكيمة بنت أمية ؛ ذكرها ابن حبان فى الثقات(٤/١٩٥)، وقال ابن حجر: مقبولة. وقال الشيخ بشار عواد : بل مجهولة الحال فقد روى عنها واحد أو اثنان فقط وذكرها ابن حبان وحده فى الثقات. (تحريرالتقريب: ٤/٤١٠/٨٥٦٦).

(٢) أخرج الإمام أبوداود في سننه (١٧٤١) قال: حدثنا أحمد بن صالح حدثنا ابن أبى فديك عن عبد الله بن عبد الرحمن بن يحنس عن يحيى بن أبي سفيان الأخنسى عن جدته حكيمة (مجهولة الحال) عن أم سلمة رضى الله عنها زوج النبي صلى الله عليه وسلم أنها سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول:" من أهل بحجة أوعمرة من المسجد الأقصى إلى المسجد الحرام غفرله ما تقدم من ذنبه وماتأخر"، أو" وجبت له الجنة " شك عبد الله أيتهما قال. قال: أبوداود : يرحم الله وكيعاً أحرم من بيت المقدس يعنى إلى مكة . إسناده ضعيف، لجهالة حال حكيمة .

وأيضاً أخرجه الدارقطنى (٢١٢، باب المواقيت) ، وأخرجه أحمد (٦/٢٩٩/٢٦٦٠٠) والبيهقى (٥/٣٠/٨٧٠٨)، والطبرانى فى الأوسط (٦/٣١٩/٦٥١٥).

ولمزيد من البحث راجع: (البدرالمنير:٦/٩٣،٩٤،والتلخيص الحبير:٢/٥٠٣/٩٧٤،والمقالات القصار فى فتاوى الاحاديث والاخبار، الاستقصاء ببيان صحة حديث "من اهل بحجة اوعمرة من المسجدالاقصى، والعلل للدارقطنى: ١٥/٢٥٤/٤٠٠٢).

(٣) أخرج الطبراني فى الأوسط (١٠/١٠٩/٩٢٣٢) بسنده عن نافع عن ابن عمر رضى الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من أحرم من بيت المقدس دخل مغفوراً".

قال الهيثمي في المجمع (۲۱۶/۳،دارالفکر): **هكذا وجدته في نسختين رواه الطبراني في الاوسط وفيه غالب بن عبيد الله العقيلي وهو متروك .**

بعض صحابہ کرام سے بھی بیت المقدس سے احرام باندھنا ثابت ہے۔ملاحظہ کیجئے:

عن نافع ، عن ابن عمر رضي الله عنه أنه أهل من بيت المقدس . (مسند الامام الشافعي: ۱۶۹۹/٤٣٠/١).

وعن يوسف بن ماهك أن عبد الله بن أبي عمار أخبره أنه أقبل مع معاذ بن جبل رضي الله عنه وكعب الأحبار في أناس محرمين من بيت المقدس بعمرة ...الخ. (السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٠٠١١/٣٣٧).

وينظر: (فضائل بيت المقدس، للشيخ ضياء الدين المقدسي الحنبلي ،ط: دارالفکر)۔

فقہاء میں سے علامہ ابن نجیم مصریؒ نے البحر الرائق (۳۴۳/۲،دارالمعرفۃ) میں اور محقق ابن ہمامؒ نے فتح القدیر (۴۲۸/۲،دارالفکر) میں اور علامہ سرخسیؒ نے مبسوط (۳۰۱/۴،بیروت) میں اور علامہ زیلعی نے تبیین الحقائق (۷/۲،امدادیہ،ملتان) میں اور علامہ شامی نے فتاوی الشامی (۴۷۸/۲،سعید) میں مذکورہ بالا حدیث ذکر فرما کر اس سے استدلال فرمایا ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

بعض علماء کا یہ کہنا درست نہیں کہ عرفہ ایک ہے تو بقرہ عید سعودی عرب کے ساتھ ہونا ضروری ہے:

سوال: بعض ملکوں کے علماء کہتے ہیں کہ عرفہ ایک ہے دو نہیں ہو سکتے یعنی جب سعودی عرب میں عرفہ کا دن ہو اور حاجی عرفات پر وقوف کرتے ہوں اسی دن ہمارا بھی عرفہ ہوگا،اس لیے وہ حضرات بقرہ عید میں سعودی عرب کے ساتھ اتفاق ضروری قرار دیتے ہیں تو کیا عرفہ اور عرفات ایک ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: واضح ہو کہ عرفہ اور عرفات دو لفظ ہیں: عرفات اس مکان کو کہتے ہیں جہاں پر حاجی ۹ ذی الحجہ کو وقوف کرتے ہیں اور حج کا ایک اہم رکن ادا کرتے ہیں۔اور عرفہ کے دو معنی ہیں: (۱) زمان؛ اليـــــوم

التاسع من ذی الحجة ،یعنی ماہِ ذی الحجہ کی نویں تاریخ۔(۲)مکان یعنی میدانِ عرفات۔احادیث میں دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

شریعتِ مطہرہ نے عرفہ کے روزے کومندوب قرار دیا ہے اس سے مراد یوم عرفہ ہے یعنی زمان مراد ہے کہ ہر ملک میں قمری حساب سے نویں ذی الحجہ کوروزہ رکھنا مندوب ہوگا،سعودی عرب کی نویں تاریخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں جیسے ہر ملک کا باشندہ اپنے ملک کے اوقات کے حساب سے نمازیں ادا کرتا ہے اوقات کا تعلق زمانہ سے ہے سعودی عرب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حج کی کتابوں میں ایامِ حج کے اسماء مذکور ہیں: یوم الزینة (ساتویں ذی الحجہ) یوم التروية (آٹھویں) یوم عرفة (نویں ذی الحجہ) یوم النحر (دسویں ذی الحجہ عید کا دن) یوم القر (گیارہویں ذی الحجہ) یوم النفر الأول (بارہویں ذی الحجہ) یوم النفر الثاني (تیرہویں ذی الحجہ)ان ایام میں روزہ کا تعلق یوم عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ سے ہے، حاجیوں کے وقوف اور میدانِ عرفات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

قال ابن حجرؒ في فتح الباری: تنبيه: لستة أيام متوالية من أيام ذی الحجة أسماء : الثامن: يوم التروية ، التاسع ؛ عرفة ، والعاشر: النحر، والحادي عشر: القر، والثاني عشر: النفر الأول ، والثالث عشر؛ النفر الثاني ، وذكر مكي بن أبي طالب أن السابع يسمى يوم الزينة . (فتح الباری :۳/۵۷۵،باب الخطبة ایام منی).

وينظر: (فتاوی الشامی : ۲/۵۰۳، مطلب فی الرواح الی عرفات،سعید، وفتح الوهاب للشیخ زکریاالانصاری:۱۰۰۱۷، واعانة الطالبین:۲/۱۳۶).

عرفہ کا اطلاق زمان اور مکان دونوں پر ہے۔ملاحظہ کیجئے:

قال فی المغرب: عرفات ؛ علم للموقف ويقال لها عرفة أيضاً ، ويوم عرفة ؛ التاسع من ذی الحجة . (المغرب:۲/۵۵).

وقال فی المعجم الوسيط : عرفات ؛ جبل قريب من مكة وموضع وقوف الحجيج ،

وهو على اثنى عشر ميلاً من مكة ، ويوم عرفات ؛ اليوم التاسع من ذى الحجة . (المعجم الوسيط، ص ۵۹۵).

بخاری شریف میں روایت ہے:

عن جبير بن مطعم ﷺ قال: أضللت بعيراً لي فذهبت أطلبه يوم عرفة ورأيت النبي صلى الله عليه وسلم واقفاً بعرفة فقلت: هذا والله من الحمس فما شأنه ههنا. (رواه البخارى، رقم: ١٦٦٤،باب الوقوف بعرفة).

مسلم شریف میں ہے:

عن أبي قتادة ﷺ أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: صيام يوم عرفة أحتسب على أن يكفر السنة التي قبله والسنة التي بعده . (رواه مسلم: ١/٤٣٦).

ترمذی شریف میں مذکور ہے:

عن علي بن أبي طالب ﷺ قال: وقف رسول الله صلى الله عليه وسلم بعرفة فقال: هذه عرفة وهو الموقوف وعرفة كلها موقف... (رواه الترمذى ،١٧٧، باب ماجاء ان عرفة كلها موقف).

مزید ملاحظہ کیجئے: (نظام الفتاوی،ص۴۱۴-۴۱۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ابواب النکاح سے متعلق متفرق مسائل؛

خطبہ نکاح کھڑے ہو کر پڑھنے کا حکم:

سوال: خطبہ نکاح پڑھنے کا سنت طریقہ کیا ہے؟ کیا کھڑے ہو کر بہتر ہے یا بیٹھ کر؟ بینوا توجروا۔

الجواب: کتبِ احادیث کی ورق گردانی سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات دو قسم کے ہوتے تھے۔(۱) جمعہ، عیدین اور استسقاء کے خطبات۔(۲) ان خطبات کے علاوہ دیگر خطبات۔

پہلی قسم کے خطبات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک طریقہ کھڑے ہو کر پڑھنے کا تھا، اور آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی یہی ثابت ہے بنابریں اس قسم کے خطبات میں مسنون طریقہ کھڑے ہو کر پڑھنا ہے۔ کیونکہ نہ کھڑے ہونے والے پر نکیر بھی ثابت ہے۔

دوسری قسم کے خطبات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر پر بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہے لہذا اس قسم میں مسنون طریقہ یہ ہوگا کہ بیٹھ کر پڑھا جائے۔

پہلی قسم کے دلائل وشواہد:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يخطب قائماً ثم يقعد ثم يقوم كما تفعلون الآن. (رواه البخاري، رقم: ۹۲۰، باب الخطبة قائماً).

وعن أبي خيثمة عن سماک قال: أنبأني جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يخطب قائماً ثم يجلس ثم يقوم فيخطب قائماً فمن نبأک أنه كان يخطب جالساً فقد كذب فقد والله صليت معه أكثر من ألفي صلاة. (رواه مسلم، رقم: ۲۰۳۳، باب ذكر الخطبتين).

عن أبي عبيدة عن كعب بن عجرة رضی اللہ عنہ قال: دخل المسجد وعبد الرحمن بن أم

الحكم يخطب قاعداً فقال: انظروا إلى هذا الخبيث يخطب قاعداً وقال الله تعالىٰ: ﴿ وإذا رأوا تجارة أو لهواً انفضوا إليها وتركوك قائماً . (رواه مسلم، رقم: ۲۰۳۸).

عن جابر رضي الله عنه قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم فطر أو أضحى فخطب قائماً ثم قعد قعدة ثم قام . (رواه ابن ماجه، رقم: ١٢٨٩).

قال في الشامية : (كالعيد) أى بأن يصلي بهم ركعتين يجهر فيهما بالقراءة بلا أذان ولا إقامة ثم يخطب بعدها قائماً على الأرض معتمداً على قوس أو سيف أو عصا خطبتين عند محمدؒ وخطبة واحدة عن أبي يوسفؒ . (فتاوى الشامي: ٢/١٨٤، سعيد).

ان خطبات کے علاوہ دیگر خطبات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر پر بیٹھ کر خطبہ دینا ثابت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں بخاری شریف میں روایت ہے:

روى البخارى عن ابن عباس رضي الله عنه قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم وعليه ملحفة متعطفاً بها على منكبيه وعليه عصابة دسماء حتى جلس على المنبر فحمد الله وأثنى عليه ... (البخاري، رقم: ۳۸۰۰).

وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالىٰ عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم جلس على المنبر فقال: إن عبداً خيره الله ... الخ. (رواه البخاري، رقم: ۳۹۰٤).

وعن ابن عمر رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم اصطنع خاتماً من ذهب وكان يلبسه فيجعل فصه في باطن كفه فصنع الناس خواتيم ثم إنه جلس على المنبر فنزعه ... (رواه البخاري، رقم: ٦٦٥١).

وفي رواية لمسلم... فلما قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاته جلس على المنبر وهو يضحك فقال: ليلزم كل إنسان مصلاه ثم قال: أتدرون لم جمعتكم... (رواه مسلم، رقم: ٢٩٤٢، باب قصة الجساسة).

وعن أبي سعيد الخدرى رضى الله تعالىٰ عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم جلس

ذات یوم علی المنبر وجلسنا حوله . (رواه البخاری، ۱٤٦٥، باب الصدقة علی الیتامی).

وأن صهيباً مولى العتواريين حدثه أنه سمع أبا سعيد الخدري وأباهريرة يخبران عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه جلس على المنبر ثم قال: والذي نفسي بيده ثلاث مرات ثم سكت فأكب كل رجل منا يبكي حزيناً ... (اخرجه الحاکم فی المستدرک، رقم: ۷۱۹، باب فی فضل الصلوات الخمس).

وعن ابن عمر ﷺ قال: لما قدمت درة ابنة أبي لهب المدينة مهاجرة نزلت دار رافع بن المعلى الزرقي...فأتت رسول الله صلى الله عليه وسلم فجئت إليه...وقال: اجلسي ثم صلى بالناس الظهر ثم جلس على المنبر ساعة ثم قال: أيها الناس ...الخ. (شرح مشکل الآثار، رقم:۵۲۱۳).

نیز منبر بنانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تشریف فرما کر استراحت حاصل کریں۔

چنانچہ بخاری شریف میں ہے: **عن جابر رضي الله تعالىٰ عنه أن امرأة قالت: يا رسول الله ألا أجعل لک شيئاً تقعد عليه فإن لي غلاماً نجاراً قال: إن شئت فعملت المنبر.** (رواه البخاری رقم:٤٤٩).

خلاصہ یہ ہے کہ جمعہ، عیدین اور استسقاء کے علاوہ کسی اور خطبہ کا منبر پر کھڑے ہوکر پڑھنا ثابت نہیں ہے اسی وجہ سے ہمارے اکابر علماء کا طریقہ بھی یہی رہا ہے کہ ان مذکورہ خطبات کے علاوہ دیگر خطبے منبر پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

اس خطبہ کا کھڑے ہوکر پڑھنا کسی کتاب میں نہیں دیکھا بیٹھ کر پڑھنے کا معمول ہے دوسری جگہ فرماتے ہیں: جائز تو کھڑے ہوکر بھی ہے اور بیٹھ کر بھی ہے جو شخص کھڑے ہوکر خطبہ نکاح کو مسنون کہے دلیل اس کے ذمہ ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۰/۵۹۲، جامعہ فاروقیہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ خطبہ نکاح میں سنت طریقہ یہ ہے کہ بیٹھ کر وقار اور سنجیدگی کے ساتھ پڑھا جائے۔

واللہ ﷻ اعلم۔

گواہوں کے ایجاب وقبول نہ سمجھنے پر نکاح کا حکم:

سوال: ایک شخص کا نکاح ایک لڑکی کے ساتھ ہوا مجلس عقد میں گواہ موجود تھے، لیکن گواہوں کی زبان مختلف ہونے کی وجہ سے ایجاب وقبول کا معنی ومطلب نہ سمجھ سکے تو کیا نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ہمارے فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں، اور اصل بات یہ ہے کہ شاہدین کا ایجاب وقبول سمجھنا ضروری ہے، لیکن اگر کسی نے ایسے شاہدین کی موجودگی میں نکاح کیا جو زبان نہیں سمجھتے ہیں تو نکاح کو فساد سے بچاتے ہوئے دوسرے قول پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس قول پر بھی بہت سارے علماء نے فتویٰ دیا ہے۔ جانبین کی آراء درجِ ذیل ملاحظہ کیجئے:

قال في البحر الرائق: واختلف أيضاً في فهم الشاهدين كلامهما فجزم في التبيين بأنه لو عقد بحضرة هنديين لم يفهما كلامهما لم يجز وصححه في الجوهرة ، وقال في الظهيرية : والظاهر أنه يشترط فهم أنه نكاح واختاره في الخانية فكان هو المذهب، فالحاصل أنه يشترط سماعهما معاً مع الفهم على الأصح لكن في الخلاصة إذا تزوج امرأة بالعربية والزوج والمرأة يحسنان العربية والشهود لايعرفون العربية اختلف المشايخ فيه والأصح أنه ينعقد . (البحر الرائق: ۳/۸۸، کتاب النکاح).

قال في الخانية : فإن سمعا كلام العاقدين ولم يعرفا تفسيره قيل : بأنه يصح والظاهر خلافه وعن محمد إذا تزوج امرأة بحضرة تركيين أو هنديين لم يعرفا كلام العاقدين قال: إن أمكنهما أن يعبرا ما سمعا جاز وإلا فلا . (الفتاوی الخانیة: ۱/۳۳۲).

قال في الدرر: فلا ينعقد بحضور الأصمين وهنديين لم يفهما كلامهما. (درر الحكام في شرح غرر الاحكام: ۱/۳۲۹).

فتح القدير میں ہے:

ثم الشرط أن يسمعا معاً كلامهما مع الفهم...لو تزوجها بحضرة هنديين لم يفهما لم

یجز وعنه إن أمكنهما أن يعبرا ما سمعا جاز وإلا ، لا ، وحكى فى فتاوى قاضيخان خلاف فيه وجعل الظاهر عدم الجواز. (فتح القدير: ۲۰٤/۳،دار الفکر).

وينظر: (تبيين الحقائق: ۹۹/۲،امدادیہ ملتان).

وقال في مجمع الأنهر: والشهود لايعرفون العربية الأصح أنه ينعقد وفى النصاب وعليه الفتوىٰ. (مجمع الانہر: ۳۲۱/۱).

وقال فى الشامية بعد نقل كلام البحر ما نصه: ووفق الرحمتي بحمل القول بالاشتراط على اشتراط فهم أنه عقد نكاح والقول بعدمه على عدم اشتراط فهم معانى الألفاظ بعدفهم أن المراد عقد النكاح . (فتاوی الشامی: ۲۳/۳،سعید).

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عقدِ نکاح کا علم کافی ہے ایجاب وقبول کے الفاظ کے معانی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر گواہوں کو اتنا بھی علم نہ ہو کہ یہ عقدِ نکاح کی مجلس ہے اور نکاح ہو رہا ہے تو پھر نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ لیکن علامہ رافعیؒ بزازیہ سے نقل فرماتے ہیں:

لكن فى البزازية : تلفظت المرأة بالعربية زوجت نفسي من فلان ولا تعرف ذلك وقال فلان: قبلت والشهود يعلمون أو لا يعلمون صح النكاح قال فى النصاب وعليه الفتوىٰ . (تقریرات الرافعی:۱۸۱/۳،سعید).

بزازیہ کی عبارت اس طرح ہے: **تزوجها بالعربي وهما يعقلان لا الشهود قال فى المحيط: الأصح أنه ينعقد .** (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة:۱۱۸/٤).

وينظر: (خلاصة الفتاوی: ۱٤/۲، والفتاوی التاتارخانیة:۶۰۹/۲،ولسان الحکام: ۳۱۶/۱). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مجبوری میں بلا شہود نکاح کا حکم:

سوال: اگر سمندری جہاز ٹوٹ جائے اور اس کے ایک تختے پر ایک مرد وعورت رہ جائیں اور کسی جزیرے میں پہونچے، جہاں پر کوئی تیسرا مسلمان موجود نہ ہو اب یہ زنا سے بچنے کے لیے کیا تدبیریں کریں، متعہ

حرام ہے، نکاح کے لیے شہادت ضروری ہے اور زنا کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے، پس چہ باید کرد؟

الجواب: یہ مسئلہ مودودی صاحب کا فرضی مسئلہ ہے جب کوئی مرد وعورت ایسی جگہ میں رہ جائیں تو ان کو اپنی جان بچانے اور کھانے پینے کی فکر کرنی چاہئے ہم بستری کی خواہش کہاں ہوگی، تاہم اگر ایسا واقعہ ہو جائے اور کسی قسم کے گواہ میسر نہ ہوں اور وہ نکاح میں دلچسپی رکھتے ہوں اور زنا میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو صورتِ مسئولہ میں ان کو امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق بغیر گواہوں کے نکاح کر لینا چاہئے، بوقتِ ضرورت امام مالکؒ کے قول پر عمل کرنے کی اجازت ہے جیسے مفقود وغیرہ کے مسائل میں ہمارے علماء نے امام مالکؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔

قال في الشامية : مطلب في الإفتاء بمذهب مالكؒ في زوجة المفقود ؛ قوله : (خلافاً لمالكؒ) فإن عنده تعتد زوجة المفقود عدة الوفاة بعد مضي أربع سنين...لكنه اعترض على الناظم بأنه لا حاجة للحنفي إلى ذلك أي لأن ذلك خلاف مذهبنا فحذفه أولى. وقال في الدر المنتقى: ليس بأولى لقول القهستاني: لو أفتى به في موضع الضرورة لا بأس به على ما أظن . قلت: ونظير هذه المسألة عدة ممتدة إلى الطهر التي بلغت برؤية الدم ثلاثة أيام ثم امتد طهرها فإنها تبقى في العدة إلى أن تحيض ثلاث حيض وعند مالكؒ تنقضي عدتها بتسعة أشهر. وقد قال في البزازية : الفتوى في زماننا على قول مالكؒ، وقال الزاهدي: كان بعض أصحابنا يفتون به للضرورة . (فتاوى الشامي: ٢٩٦/٤،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وذكر في الذخيرة : ولو قضى بجواز النكاح بغير شهود نفذ قضاؤه وهكذا في جامع الفتاوى . (الفتاوى الهندية: ٣٦٢/٣).

مذہبِ احناف کے مطابق بغیر گواہوں کے نکاح نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولا ينعقد نكاح المسلمين إلا بحضور شاهدين...اعلم أن الشهادة شرط في باب النكاح لقوله عليه السلام: لا نكاح إلا بشهود وهو حجة على مالكؒ في اشتراط الإعلان

دون الشهادة . (الهداية: ۲/۳۰٦،شركة علمية).

قال في البدائع : قال عامة العلماء : إن الشهادة شرط جواز النكاح وقال مالكؒ: ليست بشرط وإنما الشرط هو الإعلان . (بدائع الصنائع: ۲/۲٥۲،سعيد).

قال القهستاني: لو أفتى بقول مالكؒ في موضع الضرورة ينبغي أن لا بأس به . (حاشية الطحطاوی علی الدر المختار:۲/٥۰۸). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ایجاب وقبول کی مجلس مختلف ہونے پر نکاح کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ایک لڑکی سے نکاح درجہ ذیل طریقہ پر کیا دو مسلمان گواہوں نے شوہر کے ایجاب کو الگ مجلس میں سنا پھر یہ گواہ لڑکی کے پاس آئے اور اس کا قبول دوسری مجلس میں سنا تو کیا نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ مجلس نکاح کا متحد ہونا ضروری ہے اگر ایجاب وقبول کی مجلس مختلف ہوگئی تو نکاح منعقد نہ ہوگا، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں ایجاب وقبول کی مجلس کے مختلف ہونے کی وجہ سے نکاح منعقد نہیں ہوا۔ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وأما الذي يرجع إلى مكان العقد فهو اتحاد المجلس إذا كان العاقدان حاضرين وهو أن يكون الإيجاب والقبول في مجلس واحد حتى لو اختلف المجلس لا ينعقد النكاح ... هذا إذا كان العاقدان حاضرين فأما إذا كان أحدهما غائباً لم ينعقد حتى لو قالت امرأة بحضرة شاهدين : زوجت نفسي من فلان وهو غائب فبلغه الخبر فقال: قبلت أو قال رجل بحضرة شاهدين تزوجت فلانة وهي غائبة فبلغها الخبر فقالت: زوجت نفسي منه لم يجز وإن كان القبول بحضرة ذينک الشاهدين ، وهذا قول أبي حنيفةؒ ومحمدؒ . (بدائع الصنائع: ۲/۲۳۲، سعيد).

وللمزيد ينظر : (الدر المختار:۳/١٤، سعيد ، والفتاوى الهندية :١/١٦٩).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

ایجاب وقبول سے متعلق شرائط؛ مجلس کا متحد ہونا یہ ضروری ہے کہ ایجاب وقبول ایک مجلس میں ہو اگر ایجاب کے بعد اور قبول سے پہلے مجلس بدل جائے تو ایجاب بیکار ہو جائے گا اور قبولیت معتبر نہ ہوگی۔ (مجموعہ قوانین اسلامی، ص ۴۰)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

موبائل پر بذریعہ میسیج نکاح کرنے کا حکم:

سوال: ایک ہندوستانی شخص نے فلپین کی ایک نومسلم خاتون کے ساتھ درجِ ذیل طریقہ پر نکاح کیا؛

لڑکے نے ہندوستان سے دو گواہوں کے سامنے ایجابِ نکاح کا میسیج بھیجا، اس عورت نے فلپین سے دو گواہوں کے سامنے قبولِ نکاح کا میسیج کیا، اس طریقہ پر نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور کا نکاح منعقد نہیں ہوا، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مجلس نکاح کا متحد ہونا ضروری ہے کہ جس میں دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول ہوں اور گواہ دونوں کو ایک ہی مجلس میں سن لیں، بنابریں دوبارہ نکاح کیا جاوے اور آسان طریقہ یہ ہے عورت کسی کو وکیل بنادے اور وکیل لڑکی کی طرف سے مجلس نکاح میں دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرلیں۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

... فأما إذا كان أحدهما غائباً لم ينعقد حتى لو قالت امرأة بحضرة شاهدين : زوجت نفسي من فلان وهو غائب فبلغه الخبر فقال: قبلت أو قال رجل بحضرة شاهدين تزوجت فلانة وهي غائبة فبلغها الخبر فقالت: زوجت نفسي منه لم يجز وإن كان القبول بحضرة ذينك الشاهدين ، وهذا قول أبي حنيفةؒ ومحمدؒ . (بدائع الصنائع: ٢٣٢/٢، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (الدر المختار مع رد المحتار: ١٢/٣، سعيد، وقاموس الفقه: ٢٢٥/٥، و كتاب الفتاوىٰ: ٣٠٦/٤، انٹرنیٹ وغیرہ پرنکاح). واللہ تعالیٰ اعلم۔

نکاح خواں کا بلا اجازتِ وکیل نکاح پڑھانے کا حکم:

سوال: ہم نے ایک مجلس نکاح میں نکاح خواں کا ایک نیا طریقہ دیکھا، نکاح خواں نے نہ وکیل سے نکاح پڑھانے کی اجازت لی اور نہ وکیل سے یہ پوچھا کہ کیا آپ نے فلانہ کا نکاح فلان سے کردیا ہے بلکہ وکیل سے پوچھے بغیر دلہا سے کہا میں نے فلانہ آپ کے نکاح میں دیدی، کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ بینوا ولکم الاجر الجزیل۔

الجواب: وکالت کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ نکاح خواں لڑکی کے وکیل سے کہدے کہ آپ نے فلانہ لڑکی کا نکاح فلان لڑکے کے ساتھ کردیا ہے، وکیل کہدے ہاں میں نے کردیا ہے اس طریقہ میں وکیل اپنی وکالت سے سبکدوش ہوگیا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نکاح خواں وکیل سے اجازت لے اور یہ کہدے کہ میں نے فلانہ لڑکی فلان کے نکاح میں دی ہے، اس طریقہ میں نکاح خواں وکیل الوکیل بن گیا اور قاضیخان کی عبارت کی روشنی میں یہ طریقہ بھی صحیح ہے۔

تیسرا طریقہ جو سوال میں مذکور ہے اس میں مولوی صاحب نہ وکیل ہے اور نہ وکیل الوکیل ہے بلکہ فضولی ہے اور فضولی کا کیا ہوا نکاح اجازت پر موقوف ہے، صورتِ مسئولہ میں جب ایجاب وقبول کے بعد وکیل نے مبارک باد دی اور مبارک باد لی اور اس کے بعد بیوی شوہر کے ساتھ ہم بستر ہوئی تو اجازت پائی گئی اور نکاح منعقد ہوا لیکن یہ طریقہ صحیح نہیں بلکہ واجب الاصلاح ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ قاضیخان مذکور ہے:

قال: والوكيل بالتزويج ليس له أن يوكل غيره فإن فعل فزوج الثاني بحضرة الأول جاز . (فتاوى قاضيخان على هامش الفتاوى الهندية: ٣/٤٦، فصل في التوكيل بالنكاح).

وللمزيد ينظر: (البحر الرائق: ٣/٣٦٠، دار المعرفة، والدر المختار: ٥/٥٢٨، سعيد، والاختيار لتعليل المختار: ١/٢٥).

قال في المحيط البرهاني : حلف بطلاق كل امرأة يتزوجها ، فزوجه رجل امرأة بغير

أمره فأجاز هو قولاً أو فعلاً ... لأن الإجازة في الانتهاء بمنزلة الإذن في الابتداء من حيث إن العاقد بالإجازة يصير نائباً عن المجيز من ذلك الوقت ، وفعل النائب كفعل المنوب عنه فيصير متزوجاً من ذلك الوقت . (المحيط البرهاني:۳۱۹/۳، نكاح الفضولي ، رشيديه).

وفي الشامية: إذا أجاز نكاح الفضولي بالفعل يجوز . (فتاوى الشامي:۱٤۲/۲ ،سعيد، و كذا في ۱۲/۳ ،سعيد ، و لسان الحكام،ص ۳۱٦، الفصل الثالث عشر في النكاح).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

اصل مسئلہ یہ ہے کہ وکیل بالنکاح خود نکاح پڑھائے ، بلا اجازتِ موکلہ دوسرے کو نکاح پڑھانے کی اجازت دینے کا اس کو اختیار نہیں ہے۔ اگر وکیل بالنکاح نے بلا اجازتِ موکلہ دوسرے کو نکاح پڑھانے کی اجازت دیدی اور اس نے نکاح پڑھا دیا تو بعض کے نزدیک یہ نکاح فضولی ہوگا۔ اور دلہن کی قولی یا فعلی اجازت پر موقوف ومنعقد ہوگا۔ اور بعض فقہاءؒ اس کے قائل ہیں کہ وکیل اول مجلس نکاح میں موجود ہو تو نکاح نافذ ولازم ہوجائے گا، اور یہی مختار ومعمول بہا ہے۔ **الوكيل بالتزويج ليس له أن يوكل غيره فإن فعل فزوجه الثاني بحضرة الأول جاز** . (فتاوى قاضي خان:۵۸۰/۳)... (فتاویٰ رحیمیہ:۲۹۰/۴،۲۹۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

توأمین کے لیے نکاح کا حکم:

سوال: توأمین جو ساتھ ملے ہوئے ہوں ان کے لیے شادی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

یعنی دونوں کے جسم چسپیدہ ہوتے ہیں؛ بعض کے کمر سے، بعض کے پیٹ سے، بعض کے پیٹھ سے اور بعض کے سر وغیرہ سے۔

اگر کوئی مرد ان سے شادی کرنا چاہیں تو کیا دو بہنوں کو جمع کرنے کے حکم میں ہوگا؟

اور اگر کوئی عورت ان سے شادی کرنا چاہیں تو کیا دو شوہروں کو بہ یک وقت جمع کرنے والی کہلائیگی؟

نیز توأمین کے اتصال کے اعتبار سے بعض مرتبہ شرمگاہ بھی ایک یا دونوں کے لیے الگ الگ ہوتی ہیں۔ تو اگر الگ الگ ہو تو شادی کرنے والا یا والی متعین کر سکتے ہیں کہ کس کے ساتھ شادی کریں گے؟ اور اگر ایک ہی شرمگاہ

میں دونوں شریک ہوں تو بچہ کا نسب کس سے ثابت ہوگا؟

اور اگر توأمین شادی نہیں کر سکتے ہیں تو اپنی شہوت کو پورا کرنے کے لیے کونسا حلال طریقہ استعمال کریں۔

بینوا توجروا۔

الجواب: اس قسم کے توأمین کی کوئی مثال پیش کی جائے کہ کہاں ہے، تو پھر اس کے بارے میں علمائے کرام اور ڈاکٹر حضرات مل کر کچھ مشورہ کریں گے۔

اگر ایک ہو تو پھر مسئلہ آسان ہے، اور اگر دو ہوں تو آپریشن کے ذریعہ الگ ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر الگ ہو سکتے ہیں تو پھر مسئلہ حل ہوا، اور اگر نہیں ہو سکتیں اور دو لڑکیاں ہیں تو پھر شریعت نے یہ بتلایا ہے کہ جو نکاح کی استطاعت نہ رکھے تو وہ روزے رکھے، روزہ اس کے لیے علاج ہے، اور شریعت میں اس کی نظیر خنثیٰ مشکل ہے، خنثیٰ مشکل کا نکاح نہ مرد سے ہو سکتا ہے نہ عورت سے، اور خنثیٰ مشکل روزے رکھے گا، نیز تسکین شہوت کے لیے دوائیاں استعمال کریں، شہوت کے شیر کو جب جگایا جاتا ہے تو سوتا نہیں اور جب سلایا جائے تو جاگتا نہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو صبر کے نتیجہ میں اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

جو شخص نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کے لیے حدیث شریف میں روزہ رکھنے کی ترغیب وارد ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن عبد الرحمن بن يزيد قال: دخلت مع علقمة والأسود على عبد الله فقال عبد الله كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم شباباً لا نجد شيئاً فقال لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج ومن لم يستطع فعليه بالصوم فإنه له وجاء. (رواه البخاري: ۲/۷۵۸).

حدیث شریف میں کسی کے ستر دیکھنے دکھانے کی ممانعت وارد ہوئی ہے:

عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده قال: قلت: يا رسول الله عوراتنا ما نأتي منها وما نذر؟ قال: احفظ عورتك إلا من زوجتك أو ما ملكت يمينك، قلت: يا رسول الله أرأيت إن كان القوم بعضهم من بعض؟ قال: إن استطعت أن لا تريها أحداً فلا ترينها، قلت:

یارسول اللّٰہ فإن کان أحدنا خالیاً ؟ قال: فاللّٰہ أحق أن یستحیی منہ من الناس . (رواہ ابن ماجہ: ۲/۱۳۸، باب التستر عند الجماع).

امام سیوطیؒ نے جامع الاحادیث میں ایک منقطع روایت نقل فرمائی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

عن سعید بن جبیر قال: أتی عمر بن الخطاب بامرأۃ قد ولدت ولداً لہ خلقتان بدنان وبطنان وأربعۃ أید و رأسان وفرجان ھذا فی النصف الأعلی فأما فی الأسفل فلہ فخذان وساقان ورجلان مثل سائر الناس فطلبت المرأۃ میراثھا من زوجھا وھو أبو ذلک الخلق العجیب فدعا عمر ﷺ بأصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فشاورھم فلم یجیبوا فیہ بشيء فدعا علي بن أبي طالب ﷺ فقال علي ﷺ: إن ھذا أمر یکون لہ نبأ فاحبسھا واحبس ولدھا واقض مالھم وأقم لھم من یخدمھم وأنفق علیھم بالمعروف ففعل ذلک عمر ﷺ ثم ماتت المرأۃ وشب الخلق وطلب المیراث فحکم لہ علي ﷺ بأن یقام لہ خادم خصي یخدم فرجیہ ویتولی منہ ما تتولی الأمھات مالایحل لأحد سوی الخادم ثم إن أحد البدنین طلب النکاح فبعث عمر ﷺ إلی علي ﷺ فقال لہ یا أبا الحسن ما تجد في أمر ھذین إن اشتھی أحدھما شھوۃ لخالفہ الآخر و إن طلب الآخر حاجۃ طلب الذی یلیہ ضدھا حتی أنہ في ساعتنا ھذہ طلب أحدھما الجماع فقال علي ﷺ: اللّٰہ أکبر إن اللّٰہ أحلم وأکرم من أن یری عبداً أخاہ وھو یجامع أھلہ ولکن عللوہ ثلاثاً فإن اللّٰہ یقضي قضاء فیہ ما طلب ھذا إلا عند الموت فعاش بعدھا ثلاثۃ أیام ومات فجمع عمر ﷺ أصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فشاورھم فیہ قال: بعضھم اقطعہ حتی تبین الحي من المیت وتکفنہ وتدفنہ فقال عمر ﷺ: إن ھذا الذي أشرتم لعجب أن تقتل حیاً لحال میت وضج الجسد الحی فقال: اللّٰہ حسبکم تقتلوني وأنا أشھد أن لا إلہ إلا اللّٰہ وأن محمداً رسول اللّٰہ اقرأ القرآن فبعث إلی علي ﷺ فقال لہ : یا أبا الحسن احکم فیما بین ھذین الخلقین فقال علي ﷺ: الأمر فیہ أوضح من ذلک أسھل وأیسر الحکم أن تغسلوہ وتحنطوہ وتکفنوہ مع ابن أمہ یحملہ الخادم إذا

مشي فيعاون عليه أخاه فإذا كان بعد ثلاث جف فاقطعوه جافاً ويكون موضعه حي لا يألم فإنه اعلم أن الله لا يبقى الحي بعده أكثر من ثلاث ليال يتأذى برائحة نتنه وجيفته ففعلوا به ذلك فعاش الآخر ثلاثة أيام ومات فقال عمر ﷺ: يابن أبي طالب فما زلت كاشف كل شبهة و موضح كل حكم . أبوطالب المذكور، ورجاله ثقات إلا أن سعيد بن جبير لم يدرک عمر ﷺ. (جامع الاحاديث :۲۹/۲٦۳،رقم: ۳۲۱۱۲، من مسند علی بن ابی طالبؓ).

نکاحِ خنثی سے متعلق فقہاء کی عبارات ملاحظہ کیجئے:

قال في فتاوى الشامي: هو عند الفقهاء عقد يفيد ملك المتعة أي حل استمتاع الرجل من امرأة لم يمنع من نكاحها مانع شرعي فخرج الذكر والخنثى المشكل ...قوله فخرج الذكر والخنثى المشكل، أي أن إيراد العقد عليهما لا يفيد ملك استمتاع الرجل بهما لعدم محليتهما له، وكذا على الخنثى لامرأة اولمثله، ففي البحر عن الزيلعي في كتاب الخنثى: لو زوجه أبوه أو مولاه امرأة أو رجلاً لا يحكم بصحته حتى يتبين حاله أنه رجل أو امرأة فإذا ظهر أنه خلاف ما زوج به تبين أن العقد كان صحيحاً ، وإلا فباطل ، لعدم مصادفة المحل وكذا إذا زوج خنثى من خنثى آخر لا يحكم بصحة النكاح حتى يظهر أن أحدهما ذكر والآخر أنثى . (فتاوى الشامي: ۳/٤،سعيد).

و ينظر: (البحر الرائق: ۸/٤۷۳، كتاب الخنثى ، والفتاوى الهندية:٦/٤۳۹، ومسائل فقهية معاصرة، ص۳۲۱-۲۳۹، بعنوان : الاحكام الشرعية المترتبة على التوائم المتلاصقة (السياميين)).

فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں ہے:

سوال: دولڑکیاں یکجا پیدا ہوئیں اورایک دوسرے سے چسپیدہ ہیں ایک پیشاب پاخانہ کو جاوے تو دوسرے کو بھی اس کے ساتھ جانا لازمی ہے،اب وہ لڑکیاں بڑی عمر کی ہیں اور شادی کرنا چاہتی ہیں اور ایک شخص ان سے شادی کرنے پر رضامند ہوا،لہذا اگر اس شخص کے ساتھ شادی کردی جاوے تو آیتِ کریمہ ﴿ **وأن تجمعوا بين الأختين** ﴾ کے خلاف ہوگا یا نہیں؟

الجواب: جب کہ وہ دونوں لڑکیاں باہم چسپیدہ ہیں اور ایک دوسرے سے منفک نہیں ہوسکتیں تو جب تک ان کو آپریشن وغیرہ کے ذریعہ سے علیحدہ نہ کیا جاوے اس وقت تک ان کا نکاح کسی مرد سے جائز نہیں ہے کیوں کہ اگر دونوں لڑکیوں سے ایک مرد کا نکاح ہو تو اس میں جمع بین الاختین لازم آتا ہے جو آیت ﴿ وأن تجمعوا بين الأختين ﴾ سے حرام ہے اور اگر ایک سے کیا جاوے تو وہ علیحدہ نہیں ہوسکتی اور شوہر کو اس سے استمتاع حلال نہیں اور استمتاع مقصود ہے، درمختار کتاب النکاح میں ہے: هو عقد يفيد ملك المتعة أى حل استمتاع الرجل من امرأة لم يمنع من نكاحها مانع شرعي، الخ۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند: ۷/۵۰۱، مدلل ومکمل)۔

آپریشن کے ذریعہ توأمین کو علیحدہ کرنے کا حکم:

فتاویٰ فقہیہ معاصرہ میں مرقوم ہے:

السؤال: هل يجوز إجراء عملية جراحية لفصل أحدهما عن الآخر ؟

الجواب: الحالة الأولى : إذا غلب على ظن الجراحين حياتهما وجب إجراء العملية لهما ؛ ليستقل كل واحد منهما عن الآخر، وإن غلب على الظن موتهما أو موت أحدهما فأرى تحريم إجراء العملية ؛ لأنها تسبب هلاك نفس بإمكانها أن تعيش دون ضرر تامّ .

أما الحالتان الأخريتان : فإن كان الفرع لا عقل له مستقلاً فمثله كمثل الثالولة والعضو الزائد ، فإن حصل ضرر للأساس ببقائه جاز فصله ، وإن لم يحصل ضرر للأساس حرُم فصلُه ، أما إذا كان له عقل مستقل فأرى تحريم فصله لأمرين :

١ ـ أنه لايستطيع العيش وحده ؛ لعدم وجود قوائم له تساعده على الذهاب والإياب والعمل ، ولربما تكون له يد واحدة ، وبالتالي يكون عالة على غيره .

٢ ـ قد يموت من جراء الفصل ، وهو نفس كاملة ، ولا ضرر بوجوده ملتصقاً ، أو يحصل ضرر أقل من ضرر الموت . وهذا ما ظهر لي في حالات التوأمين ، والله أعلم .

(فتاوى فقهية معاصرة ،ص۲۳۹)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے کا حکم:

سوال: (الف) اگر ولی کی اجازت کے بغیر نکاح ہو جائے تو بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ناجائز ہے فقط امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے تو ہم امام ابوحنیفہؒ کے قول کو کیوں لیتے ہیں، ان کے پاس مضبوط دلائل نہیں ہیں، دوسرے ائمہ کے پاس دلائل ہیں؟ اس کا کیا جواب ہے؟

(ب) غیر کفو میں نکاح منعقد ہونے سے متعلق ظاہر الروایہ پر فتویٰ ہونا چاہئے یا متاخرین کے قول پر؟

(ج) اگر کسی لڑکی نے غیر کفو میں نکاح کر لیا تو فسخ کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور کفاءت کا معیار کیا ہے؟ بینوا بالتفصیل توجروا بالأجر الجزيل۔

الجواب: (الف) مسئلہ مذکورہ بالا میں امام ابوحنیفہؒ متفرد ہیں، لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ امام صاحبؒ کے پاس مضبوط دلائل نہیں ہیں، بلکہ اس مسئلہ میں امام صاحبؒ کے پاس مضبوط دلائل موجود ہیں۔

قرآن اور احادیث سے چند دلائل ملاحظہ کیجئے:

(۱) **قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿وإذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن﴾** [البقرة:۲۳۲].

(۲) **وقال تعالیٰ: ﴿فإذا بلغن أجلهن فلا جناح عليكم فيما فعلن في أنفسهن بالمعروف﴾** [البقرة:۲۳٤].

(۳) **قال تعالیٰ: ﴿فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره﴾** [البقرة:۲۳۰].

مذکورہ بالا تمام آیاتِ مبارکہ میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ عورت خود اپنا نکاح کر سکتی ہے۔

احادیث سے دلائل ملاحظہ کیجئے:

(۴) **عن القاسم بن محمد أن عبد الرحمن بن يزيد الأنصاري ومجمع بن يزيد**

الأنصاري أخبراه أن رجلاً منهم يدعى خذاماً أنكح ابنة له فكرهت نكاح أبيها فأتت النبي صلى الله عليه وسلم فذكرت ذلك له فرد عنها نكاح أبيها فتزوجت أبا لبابة بن عبد المنذر فذكر يحيى أنه بلغه أنها كانت ثيباً . (اخرجه الامام احمد ،رقم: ۲۶۷۸۹،وابن ماجه، رقم:۱۸۷۳،والدارمی فی سننه،رقم:۲۱۹۱،وابن ابی شیبة ،رقم: ۱۶۲۰۳).

وقال بشار عواد وحسين سليم أسد: إسناده صحيح . وقال الشيخ شعيب: إسناده صحيح على شرط البخاري . (التعليقات على مسنداحمد وسنن الدارمی،سنن ابن ماجه).

وأخرج البخاري عن عبد الرحمن ومجمع ابني يزيد بن جارية عن خنساء بنت خذام الأنصارية أن أباها زوجها وهي ثيب فكرهت ذلك فأتت رسول الله صلى الله عليه وسلم فرد نكاحه . (البخاری،رقم:۵۱۳۸،و۶۹۶۹).

(۵) وعن ابن بريدة عن أبيه قال : جاء ت فتاة إلى النبي صلى الله عليه وسلم ، فقالت : إن أبي زوجني ابن أخيه ليرفع بي خسيسته قال: فجعل الأمر إليها ، فقالت: قد أجزت ما صنع أبي ، ولكن أردت أن تعلم النساء أن ليس إلى الآباء من الأمر شيء . وفى الزوائد: إسناده صحيح . (رواه ابن ماجه ،رقم: ۱۸۷۴،والدارقطنی ،رقم: ۴۵ کتاب النکاح،واسحاق بن راهویه فی مسنده ،رقم:۱۳۵۹).

(۶) وعن ابن عباس ﷺ أن جارية بكراً أتت النبي صلى الله عليه وسلم فذكرت أن أباها زوجها وهي كارهة ، فخيرها النبي صلى الله عليه وسلم . (رواه ابن ماجه ،رقم: ۱۸۷۵، وابوداود، رقم:۲۰۹۸،واحمد،رقم:۲۴۶۹).

قال الشيخ شعيب: إسناده صحيح على شرط البخاري .

(۷)...عن أم سلمة قالت: ولدت سبيعة الأسلمية بعد وفاة زوجها بنصف شهر فخطبها رجلان: أحدهما شاب والآخر كهل فحطت إلى الشاب فقال الكهل: لم تحلل وكان أهلها غيباً ورجا إذا جاء أهلها أن يؤثروه بها فجاء ت رسول الله صلى الله عليه وسلم

فقال: قد حللت فانكحي من شئت. (رواه ابن حبان فی صحیحه،رقم: ٤٢٩٧).

قال الشيخ شعيب: إسناده صحيح على شرطهما.

(٨) روى البخاري عن أنس ﷺ قال: جاء ت امرأة إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم تعرض عليه نفسها قالت: يا رسول الله ألك بي حاجة ... (رواه البخاری: ٧٦٧/٢،قدیمی).

(٩) عن أم سلمة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: دخل على رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد وفاة أبي سلمة فخطبني إلى نفسي فقلت يا رسول الله إنه ليس أحد من أوليائي شاهداً فقال: إنه ليس منهم شاهد ولا غائب يكره ذلك قالت: قم يا عمر فزوج النبي صلى الله عليه وسلم ... (شرح معانی الآثار:٨/٢).

اس وقت عمر بن ابی سلمہ نابالغ تھے اس لیے ان کا نکاح کرانا شرعاً معتبر نہیں۔

قال: عمر هذا ابنها وهو يومئذٍ طفل صغير غير بالغ. (شرح معانی الآثار:٨/٢).

(١٠) عن الحكم قال: كان علي إذا رفع إليه رجل تزوج امرأة بغير ولى فدخل بها أمضاه. (رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه، رقم:١٦٢٠٦).

وعن أبي قيس أن امرأة من عائذ الله يقال لها سلمة بنت عبيد زوجها أمها وأهلها، فرفع ذلك إلى علي ﷺ فقال: أليس قد دخل بها؟ فالنكاح جائز. (سنن سعید بن منصور،رقم: ٥٥٧).

وفي رواية البيهقي: عن علي ﷺ أنه أجاز نكاح امرأة زوجتها أمها برضا منها. (السنن الکبری، رقم: ١٤٠١٩).

(١١) عن ابن عباس ﷺ أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الأيم أحق بنفسها من وليها والبكر تستأذن في نفسها وإذنها صماتها. (رواه مسلم :٤٥٥/١).

"ایم" کے معنی بے شوہر عورت کے ہیں، حنفیہ کے نزدیک یہ لفظ دوشیزہ اور شوہر دیدہ دونوں کو شامل ہے۔

(١٢) عن عائشةؓ زوج النبي صلى الله عليه وسلم أنها زوجت حفصة بنت عبد الرحمن المنذر بن الزبير وعبد الرحمن غائب بالشام ... (شرح معانی الآثار:٦/٢).

(۱۳) عن سعید بن المسیب قال: قال عمر بن الخطاب ﷺ: لا تنکح المرأة إلا بإذن ولیها أو ذی الرأی من أهلها أو السلطان. (اخرجه البیهقی فی الکبری، رقم: ۱۴۰۱۱، ومالك فی المؤطا، رقم: ۱۰۹۳، والدارقطنی، رقم: ۳۲، کتاب النکاح).

مفتی تقی عثمانی صاحب دام فضلہ فرماتے ہیں:

اس مسئلہ میں حنفیہ کو بہت زیادہ نشانہ ملامت بنایا گیا ہے اس لیے کہ اس میں امام ابوحنیفہ ؒ متفرد ہے... حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بھی امام ابوحنیفہ ؒ کا مسلک متفرد ہونے کے باوجود نہایت مضبوط قوی اور راجح ہے۔ (درسِ ترمذی: ۳/۳۷۴)۔

وللاستزادة ینظر: (اعلاء السنن: ۱۱/۶۵۔۷۰، وفیض الباری: ۴/۲۸۶، باب من قال: لا نکاح الا بولی، والمبسوط للامام السرخسیؒ: ۵/۱۰۷، وعمدة القاری: ۱۴/۷۹، ودرس ترمذی: ۳/۳۷۳۔۳۸۲، ورسائل اعظمی، ص ۴۴۰).

حدیث شریف: ''أیما امرأة نکحت بغیر إذن موالیها فنکاحها باطل'' کا واضح اور بے غبار مطلب:

بعض لوگوں کو بچپن سے وہ حدیث یاد ہوتی ہے جس میں بغیر ولی کے نکاح کو باطل کہا گیا ہے۔ اس حدیث پر کلام سے قطع نظر حدیث کے باطل سے فقہاء والا باطل مراد نہیں، بلکہ باطل کے ایک معنی بے فائدہ ہے:

﴿ ربنا ما خلقت هذا باطلاً ﴾ اے اللہ آپ نے یہ آسمان وزمین بے فائدہ نہیں بنایا، بلکہ اس میں حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔

اسی طرح جو نکاح اولیاء کی ناراضگی کے ساتھ ہو اس میں رشتہ داروں سے میل ملاپ نہ ہونے کی وجہ سے شادی کے فوائد سے محرومی ہوتی ہے۔

نیز باطل کے ایک معنی فانی ہے حضرت لبید کا شعر ہے:

ألا کل شيء ما خلا الله باطل ❁ وکل نعیم لا محالة زائل

ماسوی اللہ ہر شئی فانی ہے اور ہر نعمت زائل ہونے والی ہے، اسی طرح جو نکاح بغیر اولیاء کے یا اولیاء کی

ناراضگی کے ساتھ ہووہ اکثر جلدی ختم ہوجاتا ہے،لڑکی والدین اور رشتہ داروں کے بائیکاٹ کی وجہ سے نکاح سے اُکتاجاتی ہے اورطلاق کا مطالبہ کرتی ہے یا جھگڑے شروع کرتی ہے باطل اورفاسدوغیرہ کی اصطلاحات بعدمیں فقہاء نے ایجادکی ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

ظاہرالروایہ کے مطابق غیرکفومیں نکاح منعقدہوجاتاہے:

الجواب: (ب) مذہب احناف میں ظاہرالروایہ کے مطابق غیرکفومیں نکاح منعقدہوجاتاہے اور امام حسن بن زیادؒ کی روایت کے مطابق منعقدنہیں ہوتا۔متاخرین علماءجیسے علامہ شامیؒ وغیرہ نے امام حسن بن زیادؒ کی روایت کومفتی بہ قراردیاہے لیکن بعض دوسرے فقہاءمثلاً: امام قاضیخانؒ، برہان الائمہ اوردیگرمشائخ نے ظاہرالروایہ پرفتویٰ دیاہے۔مجمع الفقہ الاسلامی الہندکابھی یہی فیصلہ ہے۔اس کی مختصروضاحت پہلے بھی آچکی ہے۔مزیدکچھ دلائل اورملاحظہ کیجئے:

قال في فتاوى قاضيخان: إذا زوجت المرأة نفسها من غير كفء كان للأولياء حق الفسخ ما لم تلد منه... (فتاوى قاضيخان على هامش الفتاوى الهندية: ١/٣٥١).

وقال في الفتاوى البزازية : ولو زوجت بلا إذن الولي من غير كفء، يفتى في زماننا برواية الحسنؒ عن الإمامؒ، أنه لا يجوز النكاح لأن كل قاضٍ لا يعدل، ولا كل شاهدٍ يعدل ، ولا كل واقعٍ يدفع ويرفع فكان الاحتياط في إبطال النكاح...وذكر برهان الأئمة : إن الفتوى في جواز النكاح بكراً كانت أو ثيباً على قول الإمام الأعظم لقوة دليل الإمام قال الله تعالىٰ: ﴿فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن﴾. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ٤/١١٨،الخامس في الاكفاء).

قال في خلاصة الفتاوى: المرأة إذا زوجت نفسها غير كفء هل لها أن تمتنع نفسها حتى يرضى الأولياء أفتى الفقيه أبو الليثؒ أن لها ذلک وإن كان خلاف ظاهر الرواية وكثير من مشايخنا أفتوا بظاهر الرواية ليس لها أن تمتنع . (خلاصة الفتاوى : ٢/١٣، رشيدية).

قال في الدر: (ويفتى) في غير الكفء (بعدم جوازه أصلاً)، والمختار للفتوى

(لفساد الزمان)...وقال في الشامية: قوله وهو المختار للفتوى) وقال شمس الائمة وهذا أقرب إلى الاحتياط كذا في تصحيح العلامة قاسم ...(الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۵٦،سعيد).

(وكذا في الفتاوى الهندية: ۱/۲۹۲،وبدائع الصنائع: ۲/۲٤۷، سعيد،والبحر الرائق: ۳/۱۲۸،وكفايت المفتي: ۵/۲۰۹، دار الاشاعت).

ظاہر الروایہ کی وجوہِ ترجیح:

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ دونوں قول مفتی بہ ہیں لیکن چند وجوہات کی بنا پر ظاہر الروایہ کو ترجیح دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) علامہ شامیؒ نے علامہ ابن نجیم مصریؒ سے نقل فرمایا ہے کہ فتویٰ میں اختلاف ہو جائے تو ظاہر الروایہ کو ترجیح ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو شرح عقود رسم المفتی میں ہے:

الفتوى إذا اختلفت كان الترجيح لظاهر الرواية . (شرح عقود رسم المفتي،ص٦٧،بشریٰ).

(۲) ظاہر الروایہ کے موافق صاحبین کا بھی ایک قول مروی ہے اور جس روایت پر ائمہ ثلاثہ حنفیہ متفق ہوں وہ فتویٰ کے لیے راجح ہے۔

قال في الدر المختار: ما اتفق عليه أصحابنا في الروايات الظاهرة يفتى به قطعاً .

(الدر المختار: ۱/٦۹،مقدمة، سعيد).

اور صاحبین کا امام کے ساتھ متفق ہونا درجِ ذیل کتب میں مصرح ہے:

(الفتاوى الهندية: ۱/۲۹۲،وفتح القدير: ۳/۲۵٦،دار الفكر،ورمز الحقائق: ۱/۲۰۰،والبحر الرائق: ۳/۱۲۸، والكفايه، والبزازية: ٤/۱۱۸).

(۳) ظاہر الروایہ دلیل کے لحاظ بھی قوی اور مضبوط ہے۔ جیسا کہ برہان الائمہ فرماتے ہیں:

وذكر برهان الأئمة : إن الفتوى في جواز النكاح بكراً كانت أو ثيباً على قول الإمام الأعظم لقوة دليل الإمام قال الله تعالىٰ: ﴿فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن﴾ . (الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ٤/۱۱۸،الخامس في الاكفاء).

(۴) متون میں یہی مذکور ہے اور اس پر بہت سارے مشائخ نے فتویٰ دیا ہے۔ فقہاء کرام نے اس بات

کی تصریح فرمائی ہے کہ جب تصحیح مختلف ہو تو متون کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ علامہ شامیؒ علامہ ابن نجیم مصریؒ سے نقل فرماتے ہیں: **إذا اختلف التصحيح والفتوى فالعمل بما في المتون أولى**. (فتاوی الشامی:۳/۸۹،سعید،والبحر الرائق:۳/۱۴۲،دار المعرفة،مجمع الانهر:۱/۵۰۳).

(۵) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے رسالہ وصل السبب ضمیمہ نہایات الارب میں لکھا ہے کہ: اصل قولِ امام صاحب وہی ہے جو ظاہر مذہب ہے اور ظاہر مذہب چھوڑنا بدونِ قوتِ دلیل جائز نہیں ہے۔(ص۴) اور یہاں قوتِ دلیل تو درکنار سرے سے دلیل ہی نہیں ہے، لہٰذا بقولِ حضرت موصوف اس قول (روایتِ حسنؒ) پر عمل کی اجازت نہیں۔

(۶) حضرت امام شافعیؒ کی تصریح اس کے مطابق ہے: **ليس نكاح غير الكفاء حراماً فأرد به النكاح وإنما هو تقصير بالمرأة والأولياء فإذا رضوا صح** . (فتح الباری:۹/۱۰۴،والمجموع شرح المهذب:۱۶/۱۸۴).

نیز ہمارے اکابر علمائے کرام کے فتاویٰ بھی اسی کے موافق ہیں۔ان حضراتِ اکابر کی عبارات پہلے گزر چکی ہیں فقط حوالہ جات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(کفایت المفتی:۵/۲۰۹،دارالاشاعت،ومجموعہ قوانین اسلامی،ص۹۸،ومجمع الفقہ الاسلامی کا گیارہواں سمینار منعقدہ اپریل ۱۹۹۹ء۔جدید فقہی مباحث:۱۷/۲۵۱،وکتاب الفسخ والتفریق کے حاشیہ میں قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کا تفصیلی فتویٰ۔(۱۲۰)۔

غیر کفو میں نکاح کی چند مثالیں:

(۱) حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ وضباعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح:

دخل رسول الله صلى الله عليه وسلم على ضباعة بنت الزبير فقال لها...وكانت تحت المقداد بن الأسود ﷺ . (بخاری شریف،رقم:۵۸۹)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چچازاد بہن حضرت ضباعہؓ کا نکاح حضرت مقداد کندیؓ سے کردیا تھا، اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت مقدادؓ قبیلہ کندہ سے تعلق رکھتے تھے اور یہ قبیلہ قریشی نہ تھا۔بنابریں وہ

حضرت ضباعہ کے کفونہیں تھے۔ نیز اس قبیلہ کے افراد کو عرب لوگ بافندگی (کپڑا بننے) کا طعنہ دیا کرتے تھے، حضرت معاویہ بن خدیج کندیؓ کی نسبت ابن النساجہ اور اشعث بن قیسؓ کی نسبت حائک بن حائک وغیرہ الفاظ تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں۔

(۲) حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے:

قدم النبي صلى الله عليه وسلم المدينة وكانت زينب بنت جحش رضى الله تعالىٰ عنها ممن هاجر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وكانت امرأة جميلة فخطبها رسول الله صلى الله عليه وسلم على زيد بن حارثة فقالت: لا أرضاه وكانت أيم قريش قال: فإني قد رضيته لك فتزوجها زيد رضي الله عنه. (المستدرك للحاكم:٤/٢٨).

حضرت زینب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور حضرت زید کلبی تھے، مگر غلامی کی زندگی بسر کر چکے تھے، اسی لیے حضرت زینب اور ان کی بہن، حضرت زید سے نکاح کو پسند بھی نہ کرتی تھیں، بلکہ ابتدا میں جب حضرت نے مشورہ دیا تو بہت برہم ہوئیں، لیکن سورۂ احزاب کی ایک آیت کے نزول کے بعد بہت پشیمان ہوئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خود ہی کہلا بھیجا کہ آپ جس سے چاہیں میرا نکاح کر دیجئے۔

(۳) حضرت ہند رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح حضرت سالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے:

...عن عائشة رضى الله تعالىٰ عنها زوج النبى صلى الله عليه وسلم أن أبا حذيفة بن عتبة بن ربيعة بن عبد الشمس وكان ممن شهد بدراً مع رسول الله صلى الله عليه وسلم تبنى سالماً وأنكحه بنت أخيه هند بنت الوليد بن عتبة بن ربيعة وهو مولى لامرأة من الأنصار ...(رواه البخاری:٢/٥٧٠،قديمی).

حضرت سالمؓ فارسی النسل غلام تھے، یعنی عربی بھی نہ تھے مگر حضرت ابوحذیفہ قریشی نے ان کا نکاح اپنی بھتیجی ہند سے کر دیا تھا۔

(۴) حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح:

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ معروف ومشہور صحابی ہے اصلاً وہ حبشی غلام تھے، اوران کی شادی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف قریشی کی بہن سے ہوئی تھی، اورایک شادی ان کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنولیث میں کرادی تھی۔

عن أبي الحسن عن حنظلة بن أبي سفيان الجمحي عن أمه قالت: رأيت أخت عبد الرحمن بن عوف تحت بلال . (السنن الكبرى للبيهقى:۲۲۲/۷،والدارقطنى :٤٦٢/٤).

عن زيد بن أسلم مرسلاً : إن بني بكير أتوا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقالوا: زوج أختنا من فلان فقال: أين أنتم عن بلال ، فعادوا فأعاد ثلاثاً فزوجوه قال: وكان بنوبكير من المهاجرين من بني ليث . (اخرجه البيهقى فى الكبرى،رقم:١٤١٦٠،٢٢٢/٧،وابوداود فى مراسيله ، رقم:٢٢٩).

(۵) حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن کا نکاح اشعثؓ سے:

عن مصعب بن عبد اللّٰه قال: وأم فروة بنت أبي قحافة أخت أبي بكر الصديق عمة عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها...زوجها أبوبكر الأشعث بن قيس فولدت له محمداً وإسحاق وحبابة وقريبة . (المستدرك للحاكم:٨٠/٤،ومجمع الزوائد: ٤١٥/٩،دارالفكر).

اشعث بن قیس کندی تھے،اوران کوحائک بن حائک کہا جاتا تھا،بایں ہمہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی بہن ام فروہ کا نکاح ان سے کردیا تھا،روایت میں ہے کہ اشعث کے بیٹے محمد وغیرہ ام فروہ کے بطن سے تھے۔

(٦) حضرت ابوہند حجام کا نکاح بنو بیاضہ میں:

عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها أن أباهند مولى بني بياضة كان حجاماً حجم النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم:...وأنكحوا أبا هند وأنكحوا إليه . رواه الطبراني في الأوسط وفيه عبد الواحد بن إسحاق الطبراني ولم أعرفه وبقية رجاله ثقات. (مجمع الزوائد: ٣٧٧/٩،دارالفكر).

حضرت ابوہند غلام تھے اور پچھنا لگانے کا کام کرتے تھے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس قبیلہ کو

جن کے وہ غلام تھے حکم دیا تھا کہ ان کی شادی اپنے قبیلہ میں کردو۔

(۷) حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔

عن فاطمة بنت قيسؓ أن أبا عمرو بن حفص طلقها البتة وهوغائب...فلما حللت ذكرت له أن معاوية بن أبي سفيان وأبا جهم خطباني فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أما أبوجهم فلا يضع عصاه عن عاتقه وأما معاوية فصعلوك لا مال له انكحي أسامة بن زيد فكرهته ثم قال: انكحي أسامة فنكحته فجعل الله فيه خيراً واغتبطت. (رواه مسلم ،رقم: ١٤٨٠،باب المطلقة ثلاثاً لانفقة لها).

حضرت فاطمہؓ ایک قریشی خاتون تھیں،اور حضرت معاویہؓ وغیرہ جیسے قریشی حضرات ان کے خواستگار ہو چکے تھے،مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشیوں کے مقابلہ میں حضرت اسامہؓ کو جو قریشی نہ تھے بلکہ آزاد شدہ غلام کے لڑکے تھے ترجیح دی اور باوجودیکہ فاطمہؓ اس رشتہ کے لیے آمادہ نہ تھیں،صراحۃً ناراضگی ظاہر کر چکی تھیں،مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر ان کو آمادہ کر دیا کہ تم کو خدا اور رسول کا حکم ماننا بہتر ہے،حضرت فاطمہؓ کا بیان ہے کہ آگے چل کر یہ رشتہ ایسا مبارک ثابت ہوا کہ عورتیں مجھ پر رشک کرتی تھیں۔

ولی کو فسخ نکاح کا اختیار:

الجواب: (۳) شریعتِ مطہرہ میں مصالحِ نکاح کو باقی رکھنے اور مستقبل کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے نکاح میں کفاءت کا اعتبار کیا گیا ہے،چنانچہ فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں عورت کا حق ہے وہیں پر ولی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر کوئی عورت غیر کفو میں نکاح کر لے اور ولی کو عار محسوس ہوتی ہو یا یہ محسوس ہو کہ عورت نے نادانی میں فیصلہ کر لیا ہے آگے چل کر نباہ نہ ہو سکے گا تو ولی کو قاضی کے پاس معاملہ پیش کر کے فسخ نکاح کا اختیار رہوگا۔ملاحظہ ہو المبسوط میں ہے:

وإذا زوجت نفسها من غير كفء فقد الحقت الضرر بالأولياء فيثبت لهم حق الاعتراض لدفع الضرر عن أنفسهم كما أن الشفيع له حق الأخذ بالشفعة لدفع الضرر عن نفسه ... (المبسوط :٥/١٣،ادارة القرآن).

بدائع الصنائع میں ہے:

حتى لو زوجت نفسها من غير كفء من غير رضا الأولياء لا يلزم وللأولياء حق الاعتراض كان في الكفاءة حقاً للأولياء لأنهم ينتفعون بذلك ألا ترى أنهم يتفاخرون بعلو نسب الختن ويتعيرون بدناءة نسبه فيتضررون . (بدائع الصنائع:۲/۳۱۸،سعید).

قال في الأحوال الشخصية : وإنما اعتبرت الكفاءة بين الزوجين لأن النكاح يعقد للعمر و يشتمل على أغراض ومقاصد كالازدواج والصحبة والألفة وتأسيس القرابات ولاينتظم ذلك عادة إلا بين الأكفاء ولأنهم يتعيرون بعدم الكفاءة فيتضرر الأولياء به...

والكفاءة حق الولي و حق المرأة فلو أسقط كل منهما حقه فالأمر ظاهر ولو أسقط واحد منهما حقه بقي حق المرأة . (الاحوال الشخصية:۱/۱۷۰،ط: دارالسلام).

تاہم اگر کسی لڑکی نے غیر کفو میں نکاح کرلیا تو اگر لڑکا دیندار اور اچھے اخلاق والا ہو تو ولی کو چاہئے کہ خواہ مخواہ فسخ نہ کریں، اس لیے کہ اصل تو دینداری اور خوش اخلاقی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں ہے:

قال صلى الله عليه وسلم: إذا خطب إليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه ان لاتفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد عريض. أقول: ليس في هذا الحديث أن الكفاءة غير معتبرة كيف و هي مما جبل عليه طرائف الناس ، و كاد يكون القدح فيها أشد من القتل ، والناس على مراتبهم والشرائع لا تهمل مثل ذلك ، ولذلك قال عمر رضي الله عنه : لأمنعن النساء إلا من أكفائهن ، ولكنه أراد إلا يتبع أحد محقرات الأمور نحو قلة المال ورثاثة الحال ودمامة الجمال ... بعد أن يرضى دينه وخلقه ، فإن أعظم مقاصد تدبير المنزل الاصطحاب في خلق حسن، وأن يكون ذلك الاصطحاب سبباً لصلاح الدين . (حجة الله البالغة: ۲/۲۱۷،ط: قديمی).

قال في البدائع : وعندنا الأفضل اعتبار الدين والاقتصار عليه . (بدائع الصنائع:

۲/۳۱۷،سعید)۔

وقال في المبسوط : وتاويل الحديث الآخر الندب إلى التواضع وترك طلب الكفاء ة لا الالتزام به وبه نقول: إن عند الرضاء يجوز العقد. (المبسوط: ۲۳/۵،ادارۃ القرآن)۔

خلاصہ یہ ہے کہ کفاءت بحیثیتِ حقوق اللہ نہیں ہے بلکہ بحیثیت حق العبد ہے اور وہ بھی جوازی ہے نہ کہ وجوبی۔(رسائل اعظمی،ص۴۳۹)۔واللہ ﷻ اعلم۔

کفاءت کا معیار:

احناف کے نزدیک کفاءت چھ چیزوں میں معتبر ہیں: **(۱) کفاءت فی الدین۔** لڑکا دینداری اور تقویٰ میں لڑکی کے ہم پلہ ہو۔(مجموعہ قوانین اسلامی،ص،وجدید فقہی مسائل ۷۰/۳)۔

(۲) کفاءت فی المال:۔ شوہر بیوی کی حیثیت کے مطابق نفقہ وغیرہ پر قادر ہو۔اور دونوں کی مالی حیثیت میں ایسا فرق نہ ہو جو لڑکی کے لیے باعثِ عار بنے۔تفصیل ملاحظہ ہو۔(الاحوال الشخصیۃ:۱۸۱/۱،وجدید فقہی مسائل:۷۲/۳)۔

(۳) کفاءت فی الحرفۃ:۔ امام ابوحنیفہؒ کا مشہور قول یہی ہے کہ صنعت وحرفت اور پیشہ معاش میں کفاءت کا اعتبار نہیں ہوگا،قاضی ابو یوسفؒ کے نزدیک ایسے پیشہ کے لوگ جن کے پیشوں کو حقیر سمجھا جاتا ہو دوسرے پیشہ کے لوگوں کے لیے کفو نہیں ہو سکتے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: (جدید فقہی مسائل:۸۲/۳،ومجموعہ قوانین اسلامی،دفعہ:۱۱۸،والفتاوی الہندیۃ:۲۹۱/۱ والاحوال الشخصیۃ:۱۸۵/۱،وبذل المجہود:۸/۷)۔

(۴) کفاءت فی الاسلام:۔ اہل عرب کے بارے میں حکم یہ ہے کہ نو مسلم اور خاندانی مسلمان ایک دوسرے کے کفو ہیں،البتہ اہل عجم کا حکم یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام قبول کیا اور اس کے والدین کافر ہوں وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ایسے شخص کا کفو نہیں بن سکتا جس کے خاندان میں دو پشتوں سے اسلام ہو۔

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مسائل:۷۵/۳،ومجموعہ قوانین اسلامی،ص۹۷،والاحوال الشخصیۃ:۱۷۹/۱)۔

اصل بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کا مدار عرف پر ہے۔

(۵) کفاءت فی الحریۃ:۔ غلام آزاد عورت کا کفونہیں ہوسکتا۔البتہ حریت کا اعتبار صرف عجمیوں میں ہوتا ہے۔ **قال في البحر: الحرية والإسلام فهما معتبران في حق العجم.** (البحر الرائق: ۳/۱۴۱، دار المعرفة).

(۶) کفاءت فی النسب:۔ نسب میں کفاءت کا اعتبار عرب خاص کر قریش اور عجم کے ان خاندانوں میں کیا جائے گا جنھوں نے اپنے نسب کو محفوظ رکھا ہے بقیہ سارا عجم ایک دوسرے کا کفو ہے۔(مجموعہ قوانین اسلامی، ص۹۶)۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (بدائع الصنائع:۲/۳۱۸،سعید،والمبسوط:۵/۲۳،ادارۃ القرآن،ورسائل اعظمی،۴۳۳، وجدید فقہی مسائل:۳/۹۰)۔واللہ ﷻ اعلم۔

انٹرنیٹ پر ویڈیو کال سے خلوتِ صحیحہ کا حکم:

سوال: میاں بیوی نکاح کے بعد انٹرنیٹ پر ویڈیو کال کریں تو کیا یہ خلوتِ صحیحہ میں شامل ہوگا یا نہیں؟ نیز ویڈیو کال کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نکاح کے بعد ویڈیو کال کے ذریعہ بات چیت کرنا خلوتِ صحیحہ کے زمرہ میں نہیں آتا، کیونکہ خلوتِ صحیحہ کی تعریف یہ ہے کہ میاں بیوی ایسے مکان میں جمع ہوجائیں جہاں حسی، طبعی یا شرعی رکاوٹ مانع وطی موجود نہ ہو، جبکہ ویڈیو کال میں اس کا تحقق نہیں ہوتا۔ملاحظہ ہو''الفتاوی الہندیہ''میں ہے:

الخلوة الصحيحة أن يجتمعا في مكان ليس هناك مانع يمنعه من الوطء حساً أوطبعاً كذا في فتاوى قاضيخان . (الفتاوى الهندية:۱/۳۰٤).

الدرالمختار میں ہے:

و الخلوة ... بلا مانع حسي كمرض لأحدهما يمنع الوطء و طبعي كوجود ثالث عاقل ... وشرعي كإحرام لفرض أو نفل . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۳/۱۱٤).

ویڈیو کال کا حکم:

ویڈیو کال ممنوعاتِ شرعیہ سے خالی ہو مثلاً غیر محرم کو دیکھنا، سامنے والے کا بے ستری میں ہونا وغیرہ، تو فی نفسہ اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ اسکرین پر جو تصویر نظر آتی ہے وہ اصل صورت کا عکس ہے تصویر نہیں ہے، لیکن آج کل یہ پروگرام زیادہ تر فضولیات اور ممنوعات پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

مزید ملاحظہ ہو: (تقریر ترمذی، جلدِ دوم، ص:۳۵۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ازواجِ مطہرات کے ولیمہ کی کیفیت:

سوال: ازواجِ مطہرات کے ولیمہ کی کیا کیفیت تھی؟ یعنی کھانا کیا ہوتا تھا اور تقریباً کتنے افراد شریکِ طعام ہوتے ہیں؟ نیز حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ولیمہ کو بھی نہ بھولے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور رزواجِ مطہرات کے ولیمہ کی کیفیت مختلف اوقات کے اعتبار سے مختلف ہوتی تھی، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ولیمہ:

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ولیمہ کے بارے میں صرف ایک روایت ملتی ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ ذبح فرمایا تھا اور ایک قول کے مطابق دو اونٹ۔

شرکائے ولیمہ کی تعداد:

نیز اس میں عدد کا بھی ذکر نہیں ہے لیکن بظاہر اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس میں بڑی تعداد ہوگی اس لیے اونٹ بڑا جانور ہے لہذا کھانے والے بھی زیادہ ہوں گے۔

قال في السيرة الحلبية: باب تزويجه صلى الله عليه وسلم خديجة بنت خويلد رضي الله تعالىٰ عنها أولم عليها صلى الله عليه وسلم نحر جزوراً وقيل جزورين. (السيرة الحلبية:۱/۱۲۹، داراحياء التراث العربی).

(۲) ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ولیمہ:

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ولیمہ کے بارے میں دوقسم کی روایات ملتی ہیں ؛ پہلی قسم کی روایات میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر سے جفنہ بھیجا گیا، اوردوسری قسم کی روایات میں قدح اورلبن کا تذکرہ آتا ہے اوردونوں میں کوئی تعارض بھی نہیں ہے کیونکہ جفنہ بڑے پیالے کو کہتے ہیں اورقدح بھی پیالے کو کہتے ہیں ممکن ہے کہ دونوں سے ایک ہی مراد ہو یا دونوں کو بھیجا ہو۔

شرکائے ولیمہ کی تعداد:

اورشرکت کرنے والوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ،حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اوران کی چند سہیلیاں تھیں۔ملاحظہ کیجئے: (مسند احمد:۴۲/۵۰۴،رقم:۲۷۵۶۹ مع تعلیقات الشیخ شعیب،والسیرۃ الحلبیۃ:۲/۳۴۱،وسبل الہدی والرشاد:۹/۵۵،وشرح الزرقانی علی المواہب:۴/۲۳۲)۔

(۳)ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ولیمہ:

بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک اہلیہ محترمہ کا ولیمہ دو مد جو سے فرمایا،حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ غالب گمان یہ ہے کہ یہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ولیمہ تھا،اوراس کی تائید میں ابن سعد کی ایک روایت پیش کی ہے،طبرانی میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کے ولیمہ میں کھجوراورگھی کھلایا تھا البتہ ابن حجرؒ نے اس کوراوی کا وہم قراردیا ہے۔

دلائل ملاحظہ فرمائیے: (فتح الباری:۹/۲۳۹،الطبقات لابن سعد:۸/۹۲،وسبل الہدی والرشاد:۱۱/۸۹،و۹/۵۵،ومرقاۃ المفاتیح:۶/۲۵۲،مکتبہ امدادیہ)۔

(۴)ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ولیمہ:

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ولیمہ سے متعلق دوقسم کی روایات ملتی ہیں ؛ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری ذبح کرکے صحابہ کرام کو گوشت ،روٹی کھلائی،اوردوسری روایت میں ہے کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مختلف چیزوں سے بنا ہوا حلوہ بھیجا تھا وہ صحابہ کرام کو کھلایا تھا،لیکن دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ پہلے گوشت اورروٹی کھلائی اورکھانے کے درمیان حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حلوہ لائے تو بعد میں وہ بھی کھلایا۔

شرکائے ولیمہ کی تعداد:

حافظ ابن حجرؒ کے قول کے مطابق تقریباً ہزار افراد نے کھانا تناول فرمایا (فتح الباری)، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نے مجھے بلانے بھیجا تو تین سو کے قریب افراد کو بلایا (مسلم)، اور ابن سعد کی روایت میں ہے ۷۱ یا ۷۲ تھے لیکن اس کی سند میں محمد بن عیسیٰ العبدری ضعیف ہیں، ممکن ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جب تین سو کو بلایا اس سے پہلے دوسرے حضرات کھانے سے فارغ ہو کر چلے گئے ہوں۔ بنابریں یہ ابن حجرؒ کے قول کے منافی نہیں ہے۔

حوالہ جات ملاحظہ کیجئے: (مشکوٰۃ شریف، ص ۲۷۸، وفتح الباری: ۹/ ۲۲۷، دار نشر الکتب الاسلامیۃ، وسبل الہدی والرشاد: ۱۱/ ۲۰۲، وطبقات ابن سعد: ۸/ ۱۰۴، ومسلم شریف: ۱/ ۴۶۱، ولسان المیزان: ۷/ ۴۲۶)۔

(۵) ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ میں ہوا، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی نے آپ کا نکاح پڑھایا، اور بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پڑھایا، پھر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی نے ولیمہ کا کھانا کھلایا اور دوسری بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ثرید کھلایا۔

شرکائے ولیمہ کی تعداد:

اور مہاجرین صحابہ کو کھلایا تھا اس لیے تعداد بھی اسی کے قریب تھی۔ (ماخوذ از سبل الہدی والرشاد: ۱۱/ ۱۹۵، والاستیعاب: ۴/ ۱۸۴۴)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں:

نیز اس میں اشکال نہ ہو کہ اگر یہ ولیمہ کا کھانا تھا تو زفاف سے پہلے کیسے دیا گیا اس لیے کہ بعض علماء زفاف سے قبل بھی ولیمہ کے قائل ہے گو جماہیر علماء کے نزدیک زفاف کے بعد ہوتا ہے اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعہ میں پہلے دینے کی وجہ ظاہر ہے کہ نکاح حبشہ میں ہوا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تھے زفاف میں دیر تھی اس لیے نجاشی یا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ولیمہ کی سنت ادا کر دی تاخیر مناسب نہ

سمجھی۔ (کفایت المفتی: ۵/۱۵۷، دارالاشاعت)۔

(۶) ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ولیمہ:

حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ولیمہ کے بارے میں صحیحین میں مذکور ہے کہ ولیمہ میں حلوہ کھلایا گیا، اور بخاری کی ایک روایت میں ہے تمر (چھوارے)، اقط (پنیر) اور سمن (گھی) کا ذکر ہے اور ترمذی وغیرہ میں سویق (ستو)، تمر (چھوارے) کا ذکر ہے لیکن اس میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ حلوہ میں چھوارے، پنیر اور گھی وغیرہ ملایا جاتا ہے اور کبھی کبھی ستو بھی ڈالے جاتے ہیں۔

شرکائے ولیمہ کی تعداد:

نیز حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ولیمہ خیبر سے واپسی کے وقت ہوا تھا اور اس وقت مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۱۶۰۰ تھی لہٰذا اقرین قیاس یہی ہے کہ شرکت کرنے والے افراد بھی اسی کے قریب قریب ہوں گے۔

ملاحظہ کیجئے: (مشکوٰۃ شریف: ۱/ ۲۷۸، وتحفۃ الاحوذی: ۴/ ۱۶۳، دارالفکر، ومرقاۃ المفاتیح: ۶/ ۲۵۴، ط: امدادیہ، وشرح الزرقانی علی المواہب: ۲/ ۲۳۱، وسبل الہدیٰ والرشاد: ۱۱/ ۲۱۳، وطبقات ابن سعد: ۸/ ۱۲۵، دارصادر بیروت)۔

(۷) ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ولیمہ:

حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ولیمہ کے بارے میں کوئی صریح روایت یا ذکر نہیں ملا، البتہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک بکری سے زیادہ کا ولیمہ فرمایا ہوگا اس لیے کہ اس وقت کے حالات فراخی والے تھے۔

شرکائے ولیمہ کی تعداد:

کیونکہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ولیمہ عمرۃ القضا سے واپسی پر ہوا تھا اور اس وقت صحابہ کرام کی تعداد تقریباً ۲ ہزار یا اس سے کچھ زیادہ تھی، بنابریں شرکاء کی تعداد بھی اسی کے قریب ہونی چاہئے۔

دیکھئے: (فتح الباری: ۹/ ۲۳۷)۔

ازواجِ مطہرات میں سے حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

اور حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ولیمہ کا تذکرہ دستیاب نہیں ہوا۔

جنتی عورتوں کی سردار حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ولیمہ کی کیفیت:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ولیمہ فرمایا جس میں سادگی کے ساتھ جو میسر آیا کھلا دیا، ولیمہ میں جو کی روٹی، کھجوریں، حریرہ، پنیر، مینڈھے کا گوشت تھا۔ (مواہب اللدنیہ مع شرح الزرقانی:۲/۷، وطبرانی کبیر، رقم:۱۹۸۶۲، والسنن الکبری للنسائی:۱۰۰۱۶، ومسند احمد :۱۴۳/۳۸، رقم:۲۳۰۳۵، وسبل الھدی والرشاد:۱۱/۴۲، ۵۳، والبدایہ والنہایہ:۷/۳۶۶، دار المعرفۃ، وطبقات ابن سعد:۸/۲۰، دار صادر)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مصادرومراجع

فتاوی دارالعلوم زکریا جلدسوم

القرآن الکریم تنزیل من رب العلمین

الف

إمداد الفتاح شرح نور الإیضاح للفقیه حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی، ۱۰۶۹ھ بیروت

آپ کے مسائل اوران کاحل مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ شہادت ۱۴۲۱ھ مکتبہ لدھیانوی

اتحاف السادة المتقین فی شرح احیاء علوم الدین للسید محمد بن محمد الحسینی، دار الفکر

الأبواب والتراجم حضرت شیخ مولانا محمد زکریاؒ ایچ ایم سعید کمپنی

الاختیار لتعلیل المختار للفقیه عبد الله بن محمود الموصلی بیروت

الاستذکار للشیخ ابی عمر یوسف بن عبدالله بن محمد بن عبد البر النمری القرطبی

اسنی المطالب فی شرح روض الطالب لشیخ الاسلام ابی یحیی زکریا الانصاری دارالکتب العلمیة بیروت

آکام المرجان فی أحکام الجان للقاضی بدرالدین محمد بن عبد الله الشبلی الحنفی، ۷۶۹ھ آرام باغ کراچی

آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام حضرت مفتی محمد شفیعؒ کراچی

إعانة الطالبین ابوبکر عثمان بن محمد التوفیقیة

الاعجوبة فی عربیة خطبة العروبة حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ و۱۳۱۴ت۱۳۹۶ھ

ابوداود للحافظ سلیمان بن اشعث ابو داود السجستانیؒ و۲۰۲ت۲۷۵، کتب خانه مرکز علم کراچی

احسن الفتاویٰ حضرت مولانا مفتی رشید احمدؒ ایچ ایم سعید کمپنی

احکام القرآن ابو بکر محمد بن عبد الله ابن العربی دار الفکر

اوجز المسالک شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا المهاجر المدنیؒ مکتبه امدادیه ملتان

امدادالفتاوی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مکتبہ دارالعلوم کراچی

الاذکار ابو زکریا محی الدین بن شرف النووی و۶۳۱ت۶۷۶، دار الکتب العربیه بیروت

احیاء علوم الدین للامام ابی حامد محمد بن محمد الغزالی ت۵۰۵ھ ، دار الفکر
ابن ماجه للامام ابی عبد الله محمد بن یزید بن ماجه القزوینیؒ و ۲۰۹ ت۲۷۳ قدیمی کتب خانه
امداد الاحکام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ومفتی عبد الکریم گمتھلویؒ مکتبہ دار العلوم کراچی
اسلامی فقہ مولانا مجیب اللہ ندوی لاہور
آثار السنن علامه محمد علی النیموی ت ۱۳۲۲ صدیقیه کتب خانه
اعلاء السنن للشیخ ظفر احمد العثمانی التهانویؒ ادارة القرآن کراچی
الأشباه و النظائر زین الدین بن ابراهیم ابن نجیم الحنفی ت ۹۷۰ ادارة القرآن کراچی
امداد المفتین حضرت مفتی محمد شفیعؒ و۱۳۱۴ ت۱۳۹۶ دار الاشاعت
انجاح الحاجة حاشیة ابن ماجه الشیخ عبد الغنی المجددی الدهلوی ۱۲۹۵ قدیمی کتب خانه
ارشاد الساری الی مناسک الملا علی القاری حسین بن محمد المکی الحنفی بیروت
ارواء الغلیل فی تخریج احادیث بناء السبیل للشیخ ناصر الدین الالبانی الکمتب الاسلامی
احکام القرآن حضرت مفتی محمد شفیعؒ
احکامِ میت ڈاکٹر عبد الحی
احکام المیت و القبور للحافظ ابن رجب
اوزانِ شرعیہ حضرت مفتی محمد شفیعؒ
اہم فقہی فیصلے قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ ادارۃ القرآن
ایضاح المسائل مفتی شبیر مرادآبادی
ایضاح النوادر مفتی شبیر مرادآبادی
اشعة اللمعات شیخ عبد الحق محدث دہلوی مجددیہ والمکتبۃ الرشیدیہ
انمول حج مفتی سید مصلح الدین بروڈوی
احکام القرآن ابوبکر جصاص الوازی سهیل
احکام القرآن مولانا ظفر احمد عثمانی ادارة القرآن
الاوسط للشیخ ابی بکر محمد بن ابراهیم بن المنذر النیسابوری
اتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب للامام الحافظ زین الدین عبد الرؤوف المناوی موقع الوراق
اکمال اکمال المعلم للامام محمد بن خلیفة الوشتانی الابی دار الکتب العلمیة بیروت لبنان
اعدل الاقوال فی مسئلة الهلال مفتی عبد المنعم

الاختيارات العلمية شيخ الاسلام ابن تيميةؒ

اسلام کانظام عشروزکوۃ مولانا خالدسیف اللہ رحمانی

اقتضاء الصراط المستقيم للعلامة احمد بن عبد الحليم ابن تيميةؒ مكتبة الرشد الرياض

الاكمال الامير الحافظ ابن ماكولا دار الكتاب الاسلامی

اخبارمكة ابوعبدالله محمد بن اسحاق المكی الفاكهی

احکام اسلام عقل کی نظر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ

الاحوال الشخصية للشيخ محمد قدری باشا

الاستيعاب فی معرفة الاصحاب للشيخ ابی عمر يوسف بن عبدالله بن محمد بن عبد البر النمری القرطبی

الاموال القاسم بن سلام الهروی

الاسماء والصفات للامام البيهقی بيروت القاهرة

استرونمی آف اسلامک کیلنڈر پروفیسر محمد الیاس [Astronomy of islamic calendar]

الأدب في رجب للعلامة الشيخ علی بن سلطان محمد القاری م ۱۰۱۴ھ المكتب الاسلامی

الامالی الشجرية للشيخ يحيی بن حسين الشجری موقع الوراق

باء

البناية شرح الهداية للعلامة بدرالدين العينیؒ فيصل آباد

(صحيح) البخاری ابو عبد الله محمد بن اسماعيل البخاریؒ و۱۹۴ ت۲۵۶ فيصل پبليكيشنز، ديوبند

بذل المجهود المحدث خليل احمد السهارنفوریؒ ت۱۳۴۶ ندوة العلماء لكهنؤ

البداية و النهاية الحافظ اسماعيل ابن كثير القرشی الدمشقیؒ ت۷۷۴ دار المعرفة

بہشتی زیور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی دارالاشاعت

بہشتی گوہراصلی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی دارالاشاعت

بداية المجتهد ابو الوليد محمد بن احمد القرطبی دار نشر الكتب

البجيرمی علی الخطيب للشيخ سليمان بن محمد التوفيقية

البحر الرائق للشيخ زين الدين ابن نجيم مصری المكتبة الماجدية

بلوغ المرام الحافظ ابن حجر العسقلانیؒ جمعية احياء التراث الاسلامی

بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع علاء الدين أبوبكر بن مسعود الكاسانی ت۵۸۷ سعيد كمپنی

بحث ونظر زیرنگرانی حضرت قاضی مجاھد الاسلام صاحب قاسمیؒ
بدائع الفوائد للعلامة ابن القيم الجوزية
بوادرالنوادر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ادارہ اسلامیات
بدر المنتقى فى شرح الملتقى على هامش مجمع الانهر للفقيه علاء الدين الحصكفى دارالفكر
البدرالمنير فى تخريج الاحاديث والآثار الواقعة فى الشرح الكبير للشيخ سراج الدين ابن الملقن الرياض

تاء

تهذيب التهذيب ابو الفضل احمد بن على بن حجر العسقلانيؒ ت۸۵۲ دار الكتب العلمية بيروت
تحفة الأحوذى ابو العلى محمد بن عبد الرحمن مباركپوريؒو۱۲۸۳ ت۱۳۵۳ دار الفكر
ترمذى ابو عيسى محمد بن عيسى بن سورة الترمزيؒو۲۰۹ ت۲۷۹ فيصل پبليكيشنز،ديوبند
التاج والإكليل لمختصر الخليل للشيخ محمد بن يوسف العبدرى دارالفكر
تعليق الألبانى على الترمذى و ابى داؤد وابن ماجه و صحيح ابن خزيمه محمد ناصر الدين المكتب الاسلامى
التعليق الحسن العلامه النيموى صديقيه كتب خانه
التعليق الممجد العلامه عبد الحى اللكهنوى بتحقيق الدكتور تقى الدين ندوى دمشق
تهذيب الكمال الحافظ جمال الدين ابو الحجاج يوسف المزّى و۶۵۴ ت۷۴۲ مؤسسة الرسالة
تاريخ بغداد الحافظ ابو بكرأحمد بن على الخطيب البغدادى و۳۹۳ت۴۶۳ الكتب العلمية
تقريب التهذيب احمد بن على بن حجر العسقلانى و۷۷۳ت۸۵۲ دار نشر الكتب الاسلامية
التذكرة فى احوال الموتى وامور الاخرة محمد بن احمد بن ابى بكر الانصارى القرطبى دار الريان للتراث
تحرير التقريب الدكتور بشار عواد معروف والشيخ شعيب الرنؤوط موسسة الرسالة بيروت
تاج العروس السيد محمد المرتضى الزبيدى مطبعه خيريه
تنوير الابصار العلامه شمس الدين محمد بن عبد الله التمرتاشىؒ ۹۳۹ت۱۰۰۴ سعيد كمپنى
تلبيس ابليس (مترجم) علامہ ابن جوزی (مترجم علامہ ابومحمد عبدالحق اعظم گڑہی) کتب خانہ مجیدیہ
التفسير المظهرى قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ ت۱۲۲۵ بلوچستان بک ڈپو
التمهيد ابو عمر يوسف بن عبد الله بن عبد البر النمرى و۳۶۸ت۴۶۳ مكتبة المؤيد
تفسیر عثمانی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مدینہ منورہ
الترغيب و الترهيب حافظ ذكى الدين عبد العظيم بن عبد القوى المنذرى م۶۵۶ھ دار احياء التراث

تفسير ابن أبی حاتم للامام الحافظ عبدالرحمن ابن أبی حاتم الرازی المكتبة العصرية
تكملة فتح الملهم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مكتبة دار العلوم كراچی
التعليقات على نصب الراية للشيخ محمد عوامة المكتبة المكية
التعليقات على ابن ماجه الدكتور بشار عواد معروف دار الجيل بيروت
تعليم الاسلام حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی تاج کمپنی لاہور
تنقيح الفتاوى الحامدية للسيد العلامة محمد امين ابن عابدين الشامي دار الاشاعة العربية
تالیفاتِ رشیدیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ م۱۳۲۳ھ ادارہ اسلامیات لاہور
تذكرة الموضاعات أبو الفضل محمد بن طاهر بن على المقدسى ت۵۰۷ مير محمد كتب خانه كراچی
تبيين الحقائق للعلامه فخر الدين عثمان بن على الزيلعی مكتبه امداديه ملتان
تذكرة الرشيد حضرت مولانا محمد عاشق الہیؒ مکتبہ عاشقیہ
التعليقات على مشكوٰة للشيخ ناصرالدين ألالبانی المكتبة الاسلامی
التعليقات على تهذيب الكمال للدكتور بشار عواد معروف مؤسسة الرسالة
التعليقات على المصنف لابن ابی شيبة للشيخ محمد عوامه حفظه الله و رعاه المجلس العلمی
التحرير المختار للعلامة عبدالقادر الفاروقی الرافعی ايج ايم سعيد كمپنی
تفسير ابن كثير للحافظ اسماعيل ابن كثير القرشی الدمشقی ت۷۷۴ دارالسلام
التحرير فی اصول الفقه مع التقرير و التحرير للعلامة الشيخ ابن همام مع الحلبی دار الكتب العلمية بيروت
تاريخ مدينة دمشق ابو القاسم ابن هبة الله الشافعی دارالفكر
تحفة الفقهاء علاء الدين السمرقندی دارالكتب العلمية
التعليقات على كتاب الحجة حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب دارالمعارف النعمانیہ
التعليقات على المستدرک صالح اللحام
التعليقات على شعب الايمان مختار احمد
تاريخ مكة المكرمة للامام ابی الوليد محمد الأزرقی الرياض
التعليقات على سنن الترمذی للدكتور بشار عواد
التعليقات على مسند الامام احمد للشيخ شعيب الارنؤوط القاهرة
تنزيه الشريعة المرفوعة ابو الحسن على بن محمد بن عراق الكنانی دارالكتب العلمية
التعليقات على سنن ابن ماجه للشيخ محمد فؤاد عبد الباقی

التلخیص الحبیر للحافظ ابن حجر العسقلانی
ترتیب المدارک وتقریب المسالک للشیخ القاضی ابوالفضل عیاض الیحصبی
تحریراتِ حدیث حضرت مولانا حسین علی پنجابی
تلخیص المستدرک للامام شمس الدین الذهبی
التعلیقات علی سنن الترمذی للشیخ محمد شاکر
التعلیقات علی سنن الترمذی مصطفیٰ حسین الذهبی
التعلیقات علی سنن الترمذی للشیخ محمود محمد محمود حسن
تحفة الأشراف بمعرفة الاطراف للامام جمال الدین یوسف بن عبد الرحمن المزی المکتب الاسلامی
تسکین الصدور حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ مکتبہ صفدریہ
التفسیر الوسیط محمد بن سید الطنطاوی
تبصیر المنتبه بتحریر المشتبه للعلامة ابن حجر العسقلانی
توضیح المشتبه فی ضبط اسماء الرواة و انسابهم و القابهم و کناهم ابن ناصر الدین الدمشقی
تفسیر المنار للشیخ محمد رشید علی رضا
التصحیح والترجیح للشیخ قاسم بن قطلوبغا بیروت
التعلیقات علی شرح تحفة الملوک للشیخ سائد بکداش دارالبشائر الاسلامیة
تحفة الملوک للفقیه محمد بن ابی بکر عبد القادر الرازی دار البشائر الاسلامیة
تبیین العجب بما ورد فی شهر رجب للشیخ الحافظ ابن حجر العسقلانیؒ
التعلیقات علی مسند ابی حنیفةؒ للعلامة الشیخ لطیف الرحمن القاسمی المکتبة الامدادیة
تحفة الالمعی مفتی سعید احمد پالنپوری
تحفہ حجاج مولانا مرغوب احمد لاجپوری
تقریر ترمذی مفتی محمد تقی عثمانی

ثاء

الثمر الدانی صالح عبد السمیع الأزهری دار الفکر
الثقات ابن حبان

جیم

جواہر الفقہ حضرت مفتی محمد شفیعؒ مکتبہ دار العلوم کراچی
الجامع الصغير جلال الدين بن أبى بكر السيوطى ت ۹۱۱ دار الكتب العلمية بيروت
الجوهر النقى على هامش السنن الكبرى علاء الدين بن على بن عثمان ابن التركمانى ت۷۴۵ دار المعرفة
جامع الأحاديث جلال الدين عبد الرحمن السيوطى ت ۹۱۱، دار الفكر
الجوهرة النيرة أبو بكر بن على بن محمد الحدادى ت ۸۰۰ مكتبة امدادية
جدید فقہی مسائل مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
جدید فقہی مباحث قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
جواہر الفتاوی مفتی عبد السلام صاحب چاٹگامی
جلالین علامہ جلال الدین محلی وعلامہ جلال الدین سیوطی
الجزء اللطيف فى الاستدلال بالحديث الضعيف مفتی رضاء الحق صاحب زمزم پبلشرز
الجامع لاحكام القرآن للشيخ ابى عبد الله محمد بن احمد الانصارى الخزرجى القرطبى دارعالم الكتب
جامع المسانيد و السنن للامام الحافظ عمادالدين ابن كثير الدمشقى الشافعى دارلفكر
جامع الرموز شمس الدين محمد الخراسانى القهستانى المطبعة الكريمة
جامع احكام الصغار على هامش الفصولين للعلامه الاستروشنى اسلامى كتب خانه
الجامع الصغير للامام محمد بن الحسن الشيبانىؒ عالم الكتب

حاء

حاشية امداد الفتاح محقق شيخ عبد الكريم العطا بيروت
حاشية مؤطا امام مالک مولانا اشفاق الرحمن كاندهلوى آرام باغ كراچى
حاشية الدسوقى شمس الدين محمد عرفه الدسوقى دار الفكر
حاشية تبيين الحقائق للشيخ احمد الشبلى امداديه
حواشى الشيروانى شهاب الدين احمد بن حجر الهيتمى دار الفكر
حلية الأولياء حافظ أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصفهانى ت ۴۳۰ دار الفكر
حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح للعلامه السيد أحمد الطحطاوى مير محمد كتب خانه كراچى
الحاوى للفتاوى جلال الدين السيوطى ت ۹۱۱، فاروقى كتب خانه
حاشية الجمل للشيخ سليمان الجمل دار الفكر

حاشیة لامع الدراری حضرت شیخ محمد زکریاؒ سعید کمپنی

حاشیة نشر المرجان مولانا عبداللہ بیج پیری

حاشیة الشرنبلالی علی درر الحکام للعلامہ حسن بن عمار الشرنبلالی استنبول

حاشیة عبد الفتاح علی سنیة رفع الیدین فی الدعاء شیخ عبد الفتاح ابو غدةؒ حلب

حاشیة فیض الباری حضرت مولانا بدرعالم میرٹھی

حاشیة مسند الامام الشافعی دار الکتب العلمیة

الحظ الاوفر فی الحج الاکبر للشیخ الملا علی القاری بیروت

حاشیہ مسائل ومعلومات حج وعمرہ محمد معین الدین احمد صاحب

حاشیة الهدایة للشیخ إلٰهداد الجونفوری شرکة علمیة

حاشیة الترغیب و الترهیب مصطفی محمد عماره داراحیاء التراث العربی بیروت لبنان

حاشیة صحیح البخاری للشیخ المحدث احمد علی السهارنفوری

حاشیة سنن ابن ماجه للشیخ محمد بن عبد الهادی السندی

حاشیة کنز الدقائق مولانا محمد احسن الصدیقی النانوتوی مکتبه امدادیه ملتان

حاشیة کتاب الفسخ و التفریق قاضی مجاهد الاسلام قاسمی صاحبؒ

حلال و حرام مولانا خالد سیف اللّٰه رحمانی

حاشیة الاسعاد عبد الهادی محمد بن فرسه الدمشقی

الحاوی الکبیر علامه ابو الحسن الماوردی

حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار علامه سید أحمد الطحطاوی مکتبة العربیة کوئٹه

حجة الله البالغة للمحدث الکبیر الشاه ولی الله قدیمی کتب خانه

حاشیة تقریب التهذیب للشیخ محمد عوامة حفظه الله تعالیٰ دار ابن حزم

حاشیة بذل المجهود للشیخ تقی الدین الندوی دار البشائر الاسلامیة

حاشیة فتاویٰ دارالعلوم دیوبند للمفتی ظفیر الدین دارالاشاعت

خاء

خیر الفتاوی مولانا خیر محمد جالندھری ودیگر مفتیانِ خیر المدارس شرکت پرنٹنگ لاہور

خلاصة الفتاوی شیخ طاهربن عبد الرشید البخاری مکتبه رشیدیه کوئٹه

خزائن السنن مولانا سرفراز خان صفدرؒ
خلاصة الوفاء بأخبار دار المصطفى علامه سمهودیؒ
خطبات الاحکام لجمعات العام حضرت مولانا تھانویؒ
خصائل النبوی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ دارالاشاعت

دال

الدر المنثور عبد الرحمن جلال الدّين السيوطيؒ و ۸۴۹ ت ۹۱۱ دار الفكر
الدر المختار علامه علاء الدين محمد بن على حصكفيؒ و ۱۰۲۵ ت ۱۰۸۸ ایچ ایم سعید کمپنی
درر الحكام في شرح غرر الأحكام قاضي منلا خسرو حنفي معارف نظارت جليلة
درس ترمذی مفتی محمد تقی عثمانی کراچی
الدر الثمين لابن العاشر المالكي دار الفكر
دین کی باتیں (خلاصہ بہشتی زیور) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
دلائل النبوة للامام البيهقي دار الكتب العلمية
دلائل النبوة ابو نعيم الاصفهاني

ذال

ذخائر العقبى احمد بن عبد الله الطبري

راء

روح المعاني شهاب الدين السيد محمود الآلوسي البغداديؒ ت ۱۲۷۰ التراث القاهرة
رد المحتار المعروف بالشامي لخاتمة المحققين محمد امين ابن عابدين ت ۱۲۵۲ ایچ ایم سعید کمپنی
روضة الطالبين الإمام النووي المكتب الإسلامي
رسائل ابن عابدين العلامه الشاميؒ سهيل اكيڈمی
رفع المناره لتخريج احاديث التوسل و الزيادة محمود سعيد ممدوح دار الامام ترمذی
راہِ سنت مولانا سرفراز خان صاحب صفدرؒ مکتبہ صفدریہ
رؤیت ہلال وفوٹو کے احکام حضرت مفتی محمد شفیعؒ دارالمعارف کراچی
رحمة الله الواسعة مفتی سعید پالنپوری

رسائل الاعظمی للشیخ المحدث الکبیر حبیب الرحمن الاعظمی زمزم پبلشرز
راہِ عمل مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی

زاء

زاد المعاد فی هدی خیر العباد شمس الدین أبو عبد الله الزرعی و ۶۹۱ ت ۷۵۱ مؤسسه الرسالة
زبدة المناسک مع عمدة المناسک فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مکتبہ اشرفیہ

سین

سلسلة الاحادیث الضعیفة للشیخ محمد ناصر الدین الالبانیؒ المکتب الاسلامی
سلسلة الأحادیث الصحیحة محمد ناصر الدین الألبانی مکتبة المعارف الریاض
السنن الکبری للنسائی أحمد بن شعیب النسائی
سیر اعلام النبلاء شمس الدین محمد بن أحمد بن عثمان الذهبی و۶۷۳ت۷۴۸ مؤسسة الرسالة
سنن الدارمی عبدالله بن عبد الرحمن الدارمی السمرقندی و ۱۸۱ ت۲۵۵ قدیمی کتب خانه
سنن الدارقطنی الحافظ علی بن أبی بکر الدارقطنی و ۳۰۶ ت ۳۸۵ مکتبة المتبنی القاهرة
السنن الصغری للبیهقی الامام البیهقی
سنن سعید بن منصور سعید بن منصور الخراسانی ت۲۲۷ الدار السلفیة الهند
السنن البکری الحافظ ابو بکر احمد بن الحسین بن علی البیهقی دار المعرفة
السعایة العلامه اللکهنوی سهیل اکیڈمی
سبل الهدی و الرشاد فی سیرة خیر العباد محمد بن یوسف الشامی
السوال والجواب فی آیات الکتاب للشیخ عطیة سالم
سماعِ موتی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ مکتبہ صفدریہ
السیرة الحلبیة للشیخ علی بن برهان الدین الحلبی دارالمعرفة

شین

شرح النقایة الحافظ علی بن محمد سلطان القاری الحنفی ت ۱۰۱۴ سعید کمپنی
شرح الطیبی شرف الدین حسین بن محمد بن عبد الله الطیبی ت۷۴۳ ادارة القرآن
شرح المجلة محمد خالد الاتاسی رشیدیه

شرح الوقایه عبد الله بن مسعود بن تاج الشریعة مطبع مجیدی
شرح عقود رسم المفتی فقیه العصر ابن عابدین المعروف بالشامی مکتبه اسعدی ومکتبه بشریٰ
شعب الایمان الامام ابو بکر احمد بن الحسین البیهقی و ۳۸۴ت ۴۵۸ الدار السلفیة الهند
شرح معانی الآثار ابو جعفر احمد بن محمد بن سلمة بن سلامة الطحاویؒ ایچ ایم سعید کمپنی
شرح المسلم للنووی ابو زکریا یحیی بن شرف الدین النووی و ۶۳۱ ت ۶۷۶ دار احیاء التراث
شفاء السقام فی زیارة خیر الانام العلامه السبکی
الشرح الکبیر للشیخ ابن قدامه المقدسی بیروت
شرح الصدور للحافظ جلال الدین السیوطی ت ۹۱۱، دار المؤید الریاض
شرح الزرقانی للعلامة محمد بن عبد الباقی الزرقانی المالکیؒ دار احیاء التراث بیروت
شرح مختصر الخلیل للشیخ محمد علیش دار الفکر
شرح الهدایة للشیخ سعدی چلپی
الشرح الکبیر علع هامش الدسوقی ابو البرکات سید احمد الدردیر المالکی
شرح النقایة للشیخ الیاس زاده سعید
شرح العنایة للعلامه اکمل الدین البابرتی دارالفکر
شرح الزرقانی علی مواهب اللدنیة محمد بن عبد الباقی الزرقانی المصری المالکی
شرح المهذب للامام النووی دار الفکر
شبِ براءت کی حقیقت مفتی تقی عثمانی میمن اسلامک پبلشرز
شرح القواعد الفقهیة للشیخ احمد بن الشیخ محمد الزرقا دار القلم دمشق
شرح منظومة ابن وهبان للشیخ ابن الشحنة الحلبی الوقف المدنی دیوبند
شرح تحفة الملوک للشیخ محمد بن عبد اللطیف بن ملک دارالبشائر الاسلامیة
شرح مسند أبی حنیفةؒ للشیخ الملا علی القاری

صاد

صحیح و ضعیف سنن الترمذی للشیخ محمد ناصر الدین الألبانی
صحیح ابن حبان محمد بن حبان بن احمد ابو حاتم التمیمی موسسة الرسالة بیروت
صحیح ابن خزیمه محمد بن اسحاق بن خزیمة النیشاپوری المکتب الاسلامی

ضاد

ضبط ولادت کی عقلی و شرعی حیثیت مفتی محمد شفیع صاحب

الضعفاء للامام البخاری

طاء

الطبقات الکبری محمدابن سعدؒ دار صادر بیروت

الطرائف و الظرائف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

عین

عرف الشذی علیٰ هامش سنن الترمذی العلامه المحدث الکبیر انور شاه الکشمیری فیصل دیوبند دهلی

عمدة الرعاية علی شرح الوقاية مولانا عبد الحی لکھنوی المجیدی کانفوری

عصر حاضر کے فقہی مسائل مولانا بدرالحسن القاسمی حیدرآباد

عارضة الأحوذی الإمام ابن العربی المالکی دار الکتاب العربی

عمل الیوم و اللیلة أبو عبد الله أحمد بن شعیب النسائی ت۳۰۳ دار الفکر

عجالة الراغب المتمنی فی تخریج ابن السنی أبو اسامه بن سلیم بن عبد الهلالی دار ابن حزم

عمدۃ الفقہ حضرت مولانا زوار حسین صاحب مجددیہ

عمل الیوم و اللیلة أبوبکرأحمدبن محمدبن اسحاق ابن السنی دائرة المعارف العثمانیة

عون المعبود محمد شمس الحق العظیم آبادی دار الکتب العلمیة

العنایة شرح هدایة أکمل الدّین محمد بن محمود البابرتیؒ ت ۷۸۶

عمدة القاری فی شرح البخاری بدر الدین محمد محمود بن احمد العینیؒ دار الحدیث ملتان

عزیز الفتاویٰ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب

عقیدة المؤمن ابوبکر الجزائری

علل الحدیث للشیخ ابی محمد عبد الرحمن ابن ابی حاتم الرازی

عقائد الشیعة فی المیزان محمد کامل هاشمی

العبر فی خبر من غبر العلامه الذهبی

علوم البلاغة احمد مصطفی المراغی دار الکتب العلمیة بیروت

العلل المتناهية للشيخ عبد الرحمن بن علی بن الجوزی دارالكتب العلمية بيروت
عطر ہدایہ "حلال وحرام کے احکام" بحر العلوم حضرت مولانا فتح محمد صاحب لکھنوی زمزم پبلشرز
علمی مکاتیب مولانا مرغوب احمد لاجپوری
العلل الواردة فی الاحاديث النبوية للشيخ ابی الحسن علی بن عمر الدارقطنی دارطيبة الرياض
العلم المنشور فی اثبات الشهور للامام تقی الدين السبکی

غين

غمز عيون البصائر للشيخ احمد بن محمد الحموی ادارة القرآن
غنيه المتملی فی شرح منية المصلی للشيخ ابراهيم الحلبی ت ۹۵۶ سهيل اكيڈيمی لاهور
غنية الناسک فی بقية المناسک العلامه المحقق محمد حسن الشاه ادارة القرآن كراچی

فاء

فتاویٰ حقانیہ مفتیانِ کرام دارالعلوم حقانیہ دارالعلوم حقانیہ
فتاویٰ مفتی محمود مولانا مفتی محمود صاحب ملتان لاہور
فتح الباری شرح صحيح البخاری ابن رجب الحنبلی دار ابن جوزی
فتاوی واحدی علامه عبد الواحد سيوستانی سندھی كوئٹه ،پاكستان
الفتاوی السراجية ابو محمد سراج الدين علی بن عثمان آرام باغ كراچی وزمزم پبلشرز
الفتاوی السراجية علی هامش قاضی خان ابو محمد سراج الدين علی بن عثمان كوئٹه
فتاویٰ خلیلیہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
فتاویٰ عثمانی مفتی تقی عثمانی صاحب کراچی
فتاویٰ محمودیہ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کتب خانہ مظہری کراچی
فتح الباری فی شرح البخاری حافظ ابن حجر عسقلانیؒ و۷۷۳ت ۸۵۲ دار نشر الكتب الاسلامية
فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (کبیر) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کتب خانہ امدادیہ دیوبند
فتح الملهم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مكتبه دار العلوم كراچی
فيض القدير الحافظ محمد المدعو بعبد الرؤف المناویؒ دار الفكر
الفتاوی الهندية للشيخ نظام الدين وجماعة من علماء الهند الاعلام بلوچستان بک ڈپو
فتاویٰ رحیمیہ مفتی سید عبد الرحیم لاجپوریؒ مکتبہ رحیمیہ مکتبۃ الاحسان دیوبند

فتح القدیر　کمال الدین محمد بن عبد الواحد السیواسی ابن همام ت ۶۸۱　دار الفکر

فیض الباری　حضرت مولانا انور شاہ کشمیری م ۱۳۵۲ھ　مطبعہ حجازی القاهرة

فتاویٰ رشیدیہ　حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ م ۱۳۲۳ھ　مکتبہ رحمانیہ لاہور

فتح باب العناية　للشیخ العلامة علی بن سلطان محمد القاری

فتاوی قاضی خان　فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی الفرغانی ت ۵۹۲　بلوچستان بک ڈپو

الفقه الاسلامی و أدلته　الدکتور وهبة الزحیلی　دار الفکر

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (مع امداد المفتین) حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وحضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ

فتاوی تاتارخانیة　عالم بن علاء انصاری اندرپنی دهلوی ت ۷۸۶　ادارة القرآن

فتاوی اللکهنوی　أبو الحسنات عبد الحی اللکهنوی و ۱۲۶۴ ت ۱۳۰۴　دار ابن حزم کراچی

الفتاوی البزازیة　حافظ الدین محمد بن محمد بن شهاب البزاز الکردی ۸۲۷　بوچستان بک ڈپو

الفقه علی مذاهب الأربعة　شیخ عبد الرحمن الجزائری　دار الفکر

فتاویٰ فریدیہ　حضرت مفتی فرید صاحب　اکوڑہ خٹک

الفردوس بمأثور الخطاب　ابو شجاع الدیلمی　دار الکتب العلمية

فقه الزکاة　للشیخ یوسف القرضاوی

الفتاوی الولوالجیة　للفقیه ظهیر الدین عبد الرشید بن ابی حنیفة الولوالجی　دار الکتب العلمية

الفقه الحنفی و ادلته　للشیخ اسعد محمد سعید الصاغرجی　دار الکلم الطیب دمشق

فتح الوهاب　للشیخ زکریا بن محمد بن احمد الانصاری　دارالکتب العلمية بیروت

الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید　عبد الحمید محمود طهماز　دار القلم دمشق

فتح المعین　ابو السعود السید محمد المصری الحنفی

فضائل اعمال　شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ

فتاویٰ دارالعلوم زکریا　مفتی رضاء الحق صاحب　زمزم پبلشرز

فتاوی علماء البلد الحرام مرتب خالد بن عبدالرحمن الجریسی

فتح المغیث　للعلامه السخاوی

فتح الملک المعبود　امین محمد خطاب

فتاوی اللجنة الدائمة للبحوث العلمية و الافتاء

فروع الکافی (شیعة)

فتاوی الأزهر فتاوی اعلام المفتین لدار الافتاء المصریة

فتاویٰ بینات مکتبہ بینات کراچی

فضائل بیت المقدس للشیخ ضیاء الدین المقدسی الحنبلی دار الفکر

فتاوی نور علی الدرب للشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز

فقہی مقالات مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

الفتاوی المهمة للشیخ عبد اللہ بن عبد العزیز بن باز

فضائل الاوقات للامام احمد بن الحسین ابی بکر البیهقی مکتبة المنارة مکة المکرمة

فضائل رجب للشیخ عبد العزیز الکنانی

فضائل شهر رجب للشیخ ابی محمد الخلال دار ابن حزم

فضائل رجب وشعبان ورمضان للشیخ القزوینی

الفوائد للشیخ ابی القاسم تمام بن محمد الرازی مکتبة الرشد

فتاوی قاضی مجاهد الاسلام قاضی پبلشرز

فقه العبادات للشیخ السید سابق

فتاوی فقهیة معاصرة عبد الملک بن عبدالرحمن السعدی دار النور

الفلک المشحون للشیخ عبد الحیی اللکهنوی

فلکیاتِ جدیدہ حضرت مولانا موسیٰ روحانی بازی

فتاویٰ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرتب مفتی سلمان منصور پوری مکتبہ دینیہ دیوبند

قاف

القاموس الوحید مولانا وحیدالزمان کیرانوی حسینیہ دیوبند

قواعد الفقه مولانا عمیم الاحسان دار الکتاب دیوبند

قرة العین عبد اللہ بن محمد الغماری بیروت

القول المسدد الحافظ ابن حجر العسقلانی

قاعدة جلیلة فی التوسل و الوسیلة للعلامه ابن تیمیة

القول الراجح للمفتی غلام قادر النعمانی

قبلہ نما حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحبؒ

کاف

کتاب الدعاء أبو القاسم سلیمان بن أحمد الطبرانی و ۲۶۰ ت ۳۶۰ دار الکتب العلمیة بیروت

کتاب الحجة الامام ابوحنیفةؒ

کنز العمال علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الهندی ت ۹۷۵ مؤسسة الرسالة

کفایت المفتی مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دہلویؒ دارالاشاعت کراچی

کشف الخفاء شیخ اسماعیل بن محمد العجلونی ت ۱۱۶۲ دار احیاء التراث بیروت

کتاب الروح شمس الدین ابو عبد الله ابن قیم الجوزیه دار الفکر

کشاف القناع عن متن الاقناع منصور بن یونس بن ادریس البهوتی دار الفکر

کتاب الام الإمام الشافعی بیروت

کتاب الخراج الإمام ابو یوسف ادارة القرآن

کتاب الفتاوی مولانا خالد سیف اللّٰہ رحمانی زمزم

کنز الدقائق ابو البرکات النسفی امدادیة ملتان

کتاب الحجة علی اهل المدینة الامام محمد بن الحسن الشیبانی

الکامل فی ضعفاء الرجال للشیخ عبد الله بن عدی الجرجانی دارالفکر

کتاب الانساب المتفقة محمد بن طاهر بن علی ابن القیسرانی م ۵۰۷ھ

کتاب الانساب للامام ابی سعید عبدالکریم بن محمد بن منصورالتمیمی السمعانی م ۵۶۲ھ بیروت

کتاب الآثار للامام ابی یوسفؒ

کتاب الزهد للشیخ عبد الله بن المبارک بن واضح المروزی دار الکتب العلمیة بیروت

الکشاف للشیخ ابی القاسم محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی بیروت

الکنی والاسماء للشیخ ابی بشر محمد بن احمد الدولابی دار ابن حزم

کتاب القبس للشیخ ابن العربی

کتاب المسائل مفتی سلمان منصورپوری کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

لام

لسان العرب للامام محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری م ۷۱۱ ھ مکتبة دار الباز مکة المکرمة

لامع الدراری حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایچ ایم سعید کمپنی

لسان المیزان ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی ت۸۵۲، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة والإفتاء للشیخ احمد بن عبد الرزاق الدّویش ریاض
لباب المناسک الامام السندیؒ بیروت
اللباب فی شرح الکتاب للفقیہ عبد الغنی الدمشقی المیدانی دارالکتاب العربی
اللباب فی علوم الکتاب للشیخ ابی حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی دارالکتب العلمیة بیروت
لسان الحکام فی معرفة الاحکام للشیخ ابراهیم بن ابی الیمن الحنفی ابن الشحنة دارالفکر

میم

مشکاة المصابیح ابو عبد الله محمد بن عبد الله خطیب طبریزیؒ قدیمی کتب خانہ کراچی
المرقاة شرح مشکاة الملا علی القاریؒ مکتبہ امدادیہ ملتان
مسلم شریف ابو الحسن مسلم بن حجاج القشیریؒ و۲۰۶ت ۲۶۱ مکتبة الاشرفیة دیوبند
مختصر التحفة المرغوبة فی أفضلیة الدعاء بعد المکتوبة للشیخ محمد قاسم السندی حلب
مختصر القدوری ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی سعید
المحیط البرهانی محمود صدر الشریعة ابن مازة البخاری الریاض
منحة الخالق حاشیة البحر الرائق للعلامة الشامی کوئٹہ
ماہنامہ ندائے شاہی جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد
منظومة ابن وهبان للشیخ عبدالوهاب بن احمد بن وهبان الدمشقی الوقف المدنی دیوبند
منتخب نظام الفتاوی حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمی اصلاحی کتب خانہ دیوبند
المقاییس والمقادیر عند العرب الشهیدة نسیبة محمد فتحی الحریری دار المعارف دیوبند
مغنی المحتاج محمد بن محمد الخطیب الشربینی التوفیقیة
معرفة السنن والآثار الإمام البیهقی جامع الحدیث
مطالب اولی النهی فی شرح غایة المنتهی مصطفی السیوطی الرحیبانی المکتب الاسلامی
مظاہر حق جدید نواب قطب الدین خان دہلوی دارالاشاعت
المستدرک الحافظ ابو عبد الله محمد بن عبد الله ت۴۰۵ دار الباز للنشر والتوزیع۔ مکة المکرمة
مجمع الزوائد الحافظ نور الدین علی بن أبی بکر الهیثمیؒ ت۸۰۷ دار الفکر
مسند الامام احمد بن حنبل الاما م احمد بن حنبل الشیبانیؒ و۱۶۴ ت ۲۴۱، دار الفکر

معارف القرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ت۱۳۹۶ ادارۃ المعارف کراچی
مصنف ابن ابی شیبة الحافظ ابو بکر عبد الله بن محمد بن أبی شیبة العبسی ت۲۳۵ ادارة القرآن کراچی
المجموع شرح المهذب ابو زکریا یحی بن شرف الدین النووی و ۶۳۱ ت۶۷۲ دار الفکر
میزان الاعتدال الحافظ محمد بن أحمد بن عثمان الذهبی ت۷۴۸ دار الفکر العربی
المعجم الکبیر الحافظ ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی و ۲۶۰ ت ۳۶۰ مکتبه ابن تیمیه
مصباح اللغات ابو الفضل مولانا عبد الحفیظ بلیاوی قدیمی کتب خانه کراچی
مختصر المعانی العلامة سعد الدین التفتازانی سعید کمپنی
مجموعة الفتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنوی میر محمد کتب خانہ
المحلیٰ ابو محمد علی بن احمد سعید بن حزم الاندلسی دار الباز مکة المکرمه
مسند ابوعوانه ابو عوانه یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی دار المعرفة
مقالات الکوثری شیخ محمد زاهد الکوثری ت ۱۳۷۱ دار شمسی
المغنی عن حمل الأسفار علیٰ هامش احیاء العلوم للعلامه زین الدین أبی الفضل العراقی ت۸۰۶ دار الفکر
المقاصد الحسنة شمس الدین محمد بن عبد الرحمن السخاوی دار الکتب العلمیة
مسند أبی داؤد الطیالسی أبو داود سلیمان بن داود الفارسی الطیالسی ت۲۰۴ دار المعرفة
المعجم الأوسط أبو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی ت۳۶۰ مکتبة المعارف
مسند أبی یعلی شیخ الاسلام أبو یعلی أحمد بن علی الموصلی و ۲۱۰ ت۳۰۷ مؤسسة علوم القرآن
من فضائل سورة الاخلاص وما لقارئها أبو محمد الحسن بن محمد الخلال و ۳۵۲ ت ۴۳۹ مکتبة لینه القاهرة
المعجم الصغیر ابو القاسم سلیمان بن أحمد الطبرانی و ۲۶۰ ت ۳۶۰ المکتب الاسلامی
المبسوط شمس الائمة ابو بکر محمد احمد السرخسی دار المعرفة بیروت
مصنف عبد الرزاق أبو بکر عبد الرزاق بن همام الصنعانی و۱۲۶ ت ۲۱۱ ادارة القرآن کراچی
المؤطا الامام مالک بن انسؒ
مراقی الفلاح للشیخ حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی ت ۱۰۶۹ مصطفی البانی الحلبی
المغنی (فی فقه الحنبلی) للامام عبد الله بن احمد بن قدامة المقدسی الحنبلی دار الکتب العلمیة
معارف السنن للعلامه محمد یوسف البنوریؒ
مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر عبد الله بن شیخ محمد دامادافندی دار إحیاء التراث
مسند الحمیدی ابوبکر عبد الله بن الزبیر الحمیدی سملک ڈابھیل الهند

مالابدمنہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ
ماہنامہ ''الحق'' جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
ماہنامہ الفاروق زیر سرپرستی مولانا سلیم اللہ خان صاحب کراچی
ماہنامہ العصر جامعہ عثمانیہ پشاور ۲۰۰۷ء
ماہنامہ ''البینات'' ۱۳۸۷ھ ازحضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ
منهاج السنن حضرت مفتی فرید صاحب
المختار للفقيه عبدالله بن محمود بن مودود الموصلي الحنفي
المبسوط (فی فقه الشافعی) احمد جنک حیدر آباد
المقالات الفقهية حضرت مفتی رفیع عثمانی صاحب مکتبه دار العلوم کراچی
مجلة المجمع الفقهي الاسلامي رابطة العالم الاسلامي مكة المكرمة
مجله المآثر بیادگار محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی
معلم الفقہ ترجمہ مجموعۃ الفتاویٰ جناب مولوی برکت اللہ صاحب لکھنوی آرام باغ کراچی
معلم الحجاج حضرت مولانا مفتی سعید احمد مفتی مظاہر العلوم سہارنپور مع حاشیہ از حضرت مولانا قاری شیر محمد سندھی صاحب ادارۃ القرآن
المسلک المتقسّط فی منسک المتوسّط للملا علی القاری بیروت
مجالس حکیم الامت مرتب حضرت مفتی محمد شفیعؒ
المعجم الوسيط ابراهيم مصطفى / احمد الزيات / حامد عبد القادر /محمد النجار
معجم البلدان ياقوت بن عبدالله الحموى دار الفكر
مسند الامام الشافعي الامام محمد بن ادريس ابوعبدالله الشافعي دار الكتب العلمية
محاسن اسلام حضرت حکیم الامتؒ
الموضوعات العلامه ابن الجوزى
ميزان الاعتدال الحافظ شمس الدين محمد بن احمد بن عثمان الذهبى
مجموعة المؤلفات للشيخ عبد الوهاب النجدى
معرفة الصحابة ابو نعيم الاصبهانى دار الكتب العلمية
مسند عبد بن حميد عبد بن حميد بن نصر الكسى القاهرة
مكالمة بين المذاهب مولانا ولى خان المظفر مكتبه فاروقيه
مجموعہ قوانین اسلامی قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

المفهم لما اشكل من تلخيص كتاب مسلم الامام القرطبى بيروت
المنتظم العلامه ابن الجوزى
معجم ابن عساكر ابو القاسم على بن الحسن بن هبة الله الشافعي
مختصر تاريخ دمشق ابن منظور موقع الوراق
مفاهيم تجب ان تصحح السيد محمد بن علوى الماكى
معجم الشعراء الامام المرزبانى
مسائل فقهية معاصرة عبدالملك بن عبدالرحمن السعدى دارالنور
المواهب اللدنية بالمنح المحمدية للعلامة احمد بن محمد القسطلا نى المكتب الاسلامى
مجموعة الفتاوى للشيخ تقى الدين ابى العباس احمد بن عبدالحليم بن تيمية الحرانى
معارف القرآن حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی
المجروحين من المحدثين والضعفاء والمتروكين للامام محمد بن حبان ابى حاتم البستى
موسوعة الافلاك والاوقات للشيخ ابى ايمن خليل احمد عبد اللطيف الكيرنوى بيروت لبنان
مریض ومعالج کے اسلامی احکام ڈاکٹر مفتی عبدالواحد (ایم بی بی ایس) مجلس نشریاتِ اسلام
المراسيل للحافظ ابى داود سليمان بن اشعث السجستانى مع تعليقات الشيخ شعيب مؤسسة الرسالة
الموسوعة الفقهية الكويتية لجنة من العلماء الكبار الكويت

نون

نصب الرايه جمال الدين ابو محمد عبد الله بن يوسف الزيلعى الحنفى المكتبه المكية
نيل الاوطار للشيخ محمد بن على بن محمد الشوكانىؒ ادارة القرآن كراچى
نهاية المحتاج الى شرح المنهاج شمس الدين محمد بن أبى العباس دار الفكر
نسائى شريف ابو عبد الرحمن احمد بن شعيب النسائىؒ و ۲۱۵ ت ۳۰۳ قديمى كتب خانه
نور الايضاح للعلامه حسن بن على الشرنبلالى مجيديه
نظام الفتاوى حضرت مفتی نظام الدین اعظمی
النهر الفائق سراج الدين عمر بن ابراهيم ابن نجيم المصرى قديمى
النحو الوافى مع الحواشى للشيخ عباس حسن ت: ۱۳۹۸ھ دار المعارف
نخب الافكار للعلامه بدر الدين العينى الوقف المدنى

نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ

نتائج الافکار شمس الدین قاضی زاده آفندی دار الفکر

النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة لیوسف بن تغری بردی بن عبد الله م۸۷۴ھ

واو

الوافی بالوفیات لصلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی دار احیاء التراث بیروت

وفیات الاعیان و ابناء ابناء الزمان ابوالعباس شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان بیروت

هاء

الهداية للامام ابی الحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ و ۵۱۱ت ۵۹۳ مکتبة شرکة علمية

ياء

اليواقيت الغالية فی تحقيق الاحاديث العالية للشيخ محمد يونس السهارنفوری